Regd. No. H/HD 593.

Monthly SHADAAB Hyd.

11-5-147, RED HILLS, HYD-500 004.

Vol 1 No 12 NOVEMBER 1984.

مکتبہ شاداب

۱۱-۵-۱۷۴ اردو ہال، حیدر آباد ۵۰۰۰۰۵ - آندھرا پردیش - انڈیا۔

"مکتبہ شاداب" کے قیام کا پہلا مقصد رسالہ "شاداب" کا مالی استحکام ہے لیکن دوسرا اہم تر مقصد عاشقانِ اردو کی اہم ترین ضروریات کی تکمیل بھی ہے۔ آج اردو کا عمدہ لٹریچر بہ آسانی دستیاب نہیں ہوتا اور اردو کے صاحبان ذوق خصوصاً ریسرچ اسکالرس کو اپنی لہذا ضرورت کی اردو کتابیں بڑی مشکل سے ملتی ہیں بلکہ کسی ایک جگہ ان کا دستیاب ہونا تو محال ہے۔ مکتبہ شاداب اس بات کی کوشش کرے گا کہ ہندوستان اور بیرون ہند کی قدیم و جدید کتب اور رسائل ایک جگہ مہیا کرے۔ اس وقت بھی مکتبہ شاداب کے ذخیرہ میں اردو عربی اور فارسی کی "نادر و نایاب کتابوں کا اسٹاک موجود ہے۔ جن میں سے چند اہم کی فہرست درج کی جا رہی ہے۔ قدیم و جدید رسائل کا بھی کافی بڑا اسٹاک ہے؛

اگر آپ کے ذخیرہ۔ رسائل میں کچھ کمی ہے تو ہمیں مطلع کیجیے۔ کوشش کی جائے گی کہ آپ کے ذخیرہ کو مکمل کر دیا جائے۔

نیز کسی قسم کی علمی و ادبی خدمات درکار ہوں یا اس سلسلہ میں کوئی معلومات حاصل کرنا چاہیں تو مکتبہ شاداب کو یاد فرمائیے۔ مکتبہ رضاکارانہ یہ خدمت انجام دے گا

نمبر	نام کتاب	مصنف	سنہ		
۱	محبوب السلاطین	محمد حسین خاں	۱۳۱۱ھ	..	۱۰۰
۲	یادگار دربار	مولوی فیروز الدین	۱۹۱۳ء	..	۸۰
۳	محبوب الادب	مترجم سید جلال	۱۳۱۷ھ	..	۱۰۰
۴	محاربہ عظیم تاریخ بغاوت ہند	پنڈت کنھیا لال	۱۲۷۷ء	..	۱۰۰
۵	تاریخ مجلس اتحاد المسلمین	سید علی شبیر حاتمی	۱۹۴۱ء	..	۲۰
۶	مولانا آزاد ایک سیاسی ڈائری	اثر بلد یحییٰ انصاری	۱۹۸۲ء	..	۶۰
۷	حسرت موہانی ایک سیاسی ڈائری	" " "	"	..	۲۰
۸	آدھی رات کو آزادی	مترجم سعید سہروردی	"	..	

(سلسلہ پشت ٹائٹیل پر)

علمی، ادبی، دینی و سماجی اقدار کا نمائندہ

ماہنامہ شاداب حیدرآباد

فروری ۱۹۸۴ء

جلد (۱) ــــــ شمارہ (۳)

مجلس مشاورت

- ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور
- یوسف ناظم
- ڈاکٹر منشاء الرحمن منشاؔ
- محمد منظور احمد منظور
- اے جی فاروقی
- ڈاکٹر محمد یوسف الدین
- منیر احمد صدیقی

ایڈیٹر

محمد قمر الدین صابری

زر تعاون: فی پرچہ 5 روپیہ

زر سالانہ	ہندوستان میں 55/ روپے	پاکستان سے 150/ سکہ پاکستانی	دیگر ممالک سے US 45
” دو سالہ	” 100/ ”	” 275/ ”	85
” معاونین تاحیات	” 1000/ ”	” 2000/ ”	500

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ: ۱۲۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد 500004

ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد میں طبع کروا کر ۱۲۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا

فہرست

حرفِ اوّل

"شاداب" کا تیسرا شمارہ پیش ہے۔ ہماری کوششیں جاری ہیں کہ اسے خوب سے خوب تر بنایا جائے۔ قارئین کا تعاون ہمیں حاصل ہے۔ یقین ہے کہ کامیابی کی منزل جلد ہی حاصل ہوگی۔

انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کا سالانہ کنونشن ۷ اور ۸ جنوری ۱۹۷۳ء کو اردو ہال حمایت نگر میں منعقد ہوا۔ سالانہ اجتماعات کے مقابلہ میں سال حال کنونشن کا لب و لہجہ مختلف تھا۔ یہاں اس امر کا اعادہ کیا گیا کہ اردو دستور ہند میں مندرجہ ملک کی (۱۵) قومی زبانوں میں سے ایک ہے اور آندھرا پردیش میں اردو کو اسٹیٹ کی دوسری زبان کا مقام حاصل ہے وہیں اردو کے دیرینہ حل طلب مسائل موجودہ حکومت کی اردو سے سرد مہری اور بے تعلقی اور اس سے پیدا ہونے والے بحران کا بھی جائزہ لیا گیا اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل کی نشاندہی بھی کی گئی۔ جس میں اردو کی مرثیہ خوانی کی بجائے عملی اقدامات کرنے کی بات کی گئی۔ موجودہ دور ایک جمہوری دور ہے۔ جب تک مؤثر طریقہ پر اپنے مطالبات پیش نہ کیے جائیں ان کے منظور کیے جانے کا امکان کم ہوتا ہے۔ ضرورت ہے کہ پورے زور اور ایقان کے ساتھ اردو کے مسائل کو ارباب حل و عقد کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ تمام اردو والوں کی تائید و حمایت ان مسائل کے لیے حاصل ہے اور انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اردو کا ایک بنیادی مسئلہ اردو کی تعلیم کا مسئلہ ہے۔ آندھرا پردیش میں اردو میڈیم مدارس قائم ہیں مگر یا انگریزی میڈیم مدارس میں اردو کی متوازی جماعتیں موجود ہیں۔ لیکن ہر جگہ معیار تعلیم نہایت درجہ گرا ہوا ہے۔ گو اس پستی کے متعدد وجوہ ہیں لیکن اردو والے خود اگر کمر ہمت باندھ لیں تو بڑی حد تک اس پست معیار تعلیم سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اردو میڈیم کے رزیڈنشل اور پبلک اسکول قائم کیے جائیں۔ جہاں اردو کی موثر تعلیم کے ساتھ ساتھ تلگی، ہندی اور انگریزی پر خصوصی توجہ کی جائے۔ جب اردو والوں کے بچے اپنی مادری زبان میں ابتدائی تعلیم بہتر اصولوں پر حاصل کریں گے اور ساتھ ہی تلگی، ہندی اور انگریزی سے بھی اچھی طرح واقف ہوں گے۔ تو اعلیٰ تعلیم میں بھی نمایاں امتیاز حاصل کر سکیں گے۔

سکندر علی وجد جامعہ عثمانیہ کے مایہ ناز سپوت تھے اور اورنگ آباد (مہاراشٹرا) کے لیے وجہ نازش۔ ان کی ذات میں ایک بانکپن اور شاعری میں نرالاپن تھا۔ ایک صاحب طرز شاعر جو سماج و دلی کے بعد جھومتے ہوئے ارض دکن سے اٹھے اور پورے ہندوستان کی اردو دنیا پر چھا گئے۔ اور سبھوں سے اپنی شاعری کا سکہ منوا لیا۔ ۱۶ مئی ۱۹۸۳ء کو اسی ارض جنت میں ابدی نیند سو گئے۔ اردو والوں کا فرض ہے کہ وجد کی شخصیت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنا خراج عقیدت پیش کریں۔ "شاداب" نے طے کیا ہے کہ اپنا ماہ مئی کا شمارہ بطور وجد نمبر پیش کرے۔ تمام اہل قلم سے خواہش ہے کہ وجد کے بارے میں اپنی تخلیقات "شاداب" کو روانہ کریں۔ نیز ان کے دوست احباب عزیز، واقف کار حضرات سے درخواست ہے کہ ان کے بارے میں اپنی معلومات لکھ بھیجیں، اور ان کے خطوط "شاداب" کو عنایت فرمائیں جو مناسب استفادہ کے بعد اصل بہ حفاظت واپس کر دیئے جائیں گے۔

○○○

لیڈی ایولن کیبولڈ زینب
مترجم محسن بن شبیر

سفرنامۂ حرمین

جدہ : بندرگاہ سعید ۲۲ر فروری ۱۹۳۳ء - قاہرہ کی ریل گاڑی (مجھے چھوڑ کر) نگاہ سے ابھی جا رہی ہے اور ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ یہاں ملاقاتیوں اور جان پہچان والوں سے میرے سب تعلقات اب منقطع ہو گئے۔ مجھے مصر سے محبت ہے لیکن اب حجاز مجھ کو کھینچ رہا ہے۔ میں سوئز جانے والی ریل کی منتظر ہوں اور جدہ میری منزل مقصود ہے

سوئز پہنچنے پر لوگوں نے مجھے بندرگاہ توفیق جانے کی صلاح دی۔ یہاں مجھے سورم نامی اطالوی جہاز ملا - جہاز پر میں نے دیکھا کہ اور مسافروں میں سر اینڈریو انگریزی سفیر متعینہ جدہ اور میکنیز کے پاشا (والی) بھی شامل ہیں۔

۲۴ر فروری : آج صبح میں پاشاہ سے ملنے گئی اور عربی میں بات چیت کرنے کی مشق کرنے لگی - دل تو پاشاہ کو بہت حیرت ہوئی پھر وہ خوشی خوشی مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ یہ ایک مہینہ قبل مراکو سے چلے تھے۔ دو ہفتے قاہرہ میں رہنے کے بعد یہاں پہنچے ہیں، پہلی مرتبہ حج کو جا رہے ہیں۔ مکہ جانے سے قبل دو ہفتے مدینے میں گذاریں گے۔ اس کے بعد شام و فلسطین جائیں گے اور جون کے مہینے میں اپنے داماد کے پاس جو پیرس کی مسجد میں امام ہے، جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

۲۶ر فروری : گرمی کے چار دن سمندر میں چلنے کے بعد ہم جدہ پہنچے۔ مسٹر عبداللہ فلبی اور ان کی بیگم صاحبہ نے از راہ مہربانی مجھے اپنے مکان میں ٹھیرنے کے لئے فرمایا ہے۔ مسٹر فلبی مسلمان ہو گئے ہیں سلطان ابن سعود کے قابل اعتماد دوست ہیں۔

۲۷ر فروری : میں علی الصبح موذن کی موثر اور دل کش آواز سے جاگی۔ اس نے غنودگی کے عالم میں ایک دفعہ مجھے چونکا دیا کہ میں ارض اسلام میں ہوں، موذن کی آواز سننے والوں کے دلوں پر اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ بلا شبہ قرآن کی عربی میں ایک جادو ہے اور اس کلام پاک کا پڑھنا دنیا میں سامعین

پر ایک کیفیت طاری کر دیتا ہے۔

۲۸ فروری: سلطان ابن سعود اپنے دارالخلافہ ریاض واقع نجد گئے ہوئے ہیں۔ یہ مقام یہاں سے اونٹ پر سولہ دن کا رستہ ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ شاید کچھ دنوں تک ان کو وہ خط نہ مل سکے جو ان کے وزیر مقیم لندن ہز اکسلنسی شیخ حافظ وہاب نے (میرے بارہ میں) تحریر کیا ہے۔ جب تک وہ خط سلطان تک پہنچے، مجھے صبر و تامل کرنا پڑے گا۔

جدّے میں میرا وقت مونگے کی چٹانوں کے درمیان شارک مچھلیوں سے بچ بچا کر سمندر میں نہانے اور موٹر میں بیٹھ کر ریگستان کے سپاٹے لگانے میں اچھی طرح گذر رہا ہے۔ جن دنوں حجاز پر سابق سلطان حسین کی حکومت تھی، فرنگیوں کو جدّہ کی چار دیواری سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ موجودہ بادشاہ کے زمانے میں وہ قید اٹھ گئی ہے۔ یہاں شکار کے لئے جنگلی مرغیاں اور خرگوش ہیں اور نہانے کے لئے نیز سمندر کا خوشنما کنارہ۔ آتے جاتے ہم کو بہت سے حاجی موٹروں میں، اونٹوں پر اور غریب پیادہ پا مدینے کو جاتے ملتے ہیں۔ دور دراز ملکوں کے بعض مسکین حاجیوں کو چلتے ہی چلتے رستے میں برسوں گذر جاتے ہیں۔ میرے میزبان نے مجھ سے بیان کیا کہ مدینہ کی زیارت کے لئے جب وہ موٹر میں جا رہے تھے تو ایک دن انہوں نے دیکھا کہ ایک مرد، اس کی بیوی اور لڑکا سامان کے گٹھڑ سروں اور پیٹھ پر رکھے تپتی ریت میں گھسٹتے چلے جا رہے ہیں۔ انہوں نے موٹر روک کر انہیں بٹھا لیا۔ جب ان لوگوں نے شکریہ کے ساتھ اپنی گٹھریاں اور پوٹلیاں موٹر میں رکھیں تو ان کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس سامان میں چھوٹے چھوٹے تین بچے بھی تھے۔ ان لوگوں کو گھر سے نکل کر منزل مقصود تک پہنچنے میں کئی سال لگے تھے اور اس مدت میں یہ بچے رستے ہی میں پیدا ہوئے تھے۔

۲ مارچ: آج ہم ریگستان کی اس پگڈنڈی پر جو مکّہ جاتی ہے، موٹر میں کچھ دور تک نکل گئے، اگرچہ اب کی دفعہ جاڑوں میں کچھ بارش نہیں ہوئی پھر بھی اونٹوں کو سوکھی گھاس، خار دار جھاڑیوں میں کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے۔ امریکہ کے ایک انجینیر نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آب پاشی سے یہاں کی زمین قابلِ زراعت بن سکتی ہے۔ دو برس ہوئے اس نے پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹا سا کنواں کھدوایا تھا اب وہ خطہ ہری ہری گھاس اور کھیتوں سے لہلہا رہا ہے۔

۴ مارچ میرے میزبان جمعہ کی نماز میں شرکت کے لئے آج صبح مکہ گئے ہیں۔ ان کا لباس معمولی عربوں کا سا ہے یعنی عبا اور اس پر جبّہ، سر پر کوفیہ اور عقال۔ آج شام کو معلوم ہوا کہ سلطان میری درخواست پر غور فرما رہے ہیں۔ مجھے لوگوں نے مشورہ دیا کہ میں سلطان کے فرزند امیر فیصل والی حجاز

مسرور ہوں ۔ نائب معتمد خارجہ بھی جدے آرہے ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔

۵ مارچ : نائب معتمد خارجہ ہز ایکسلنسی فواد حمزہ نے مجھ سے ملاقات فرمائی۔ یہ ایک وجیہ شامی
ہیں۔ انگریزی اچھی بولتے ہیں۔ انہوں نے مجھے مدد دینے کا وعدہ کیا اور والئ حجاز کے نام
میرا خط لے کے گئے واپس ہو گئے۔ سلطان نے یہ حکم دے رکھا ہے کہ کوئی فرنگی نومسلم جب تک وہ کم سے
کم ایک سال تک جدے میں بحیثیت امیدوار قیام نہ کرے حرم میں داخل نہیں ہو سکتا۔ بدنصیبی سے
کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ بعض اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے مکے گئے اور اپنے واقعات سفر بڑے پیرائے
میں شائع کیے ہیں۔ مہمان نوازی کے بدلے میں سیاحوں کے اس سلوک پر عربوں کی شکایت حق بجانب ہے۔

۸ مارچ : میں آج صبح مصطفٰے ناظر، مسٹر فلبی کے ایرانی النسل ملازم کے ساتھ جدے کے بازار
دیکھنے گئی۔ بازار میں جاپان کا مال موجود ہے البتہ سرخ و سیاہ مونگے کے نفیس ہار یقیناً یہیں کی صنعت
ہیں۔ جدے کی گلیوں کے نکڑوں پر سوزنیاں بچھائے روپے پیسوں کے ڈھیر لئے صراف بیٹھے ہیں —
مصطفٰے کہتا ہے کہ جب اذان ہوتی ہے تو یہ لوگ اپنا مال یوں ہی کھلا چھوڑ کر نماز پڑھنے چلے جاتے ہیں۔ ان کو
اطمینان ہے کہ کسی کی مجال نہیں جو اسے چھو سکے۔ منجملہ دوسری اصلاحوں کے جو موجودہ سلطان نے کی ہیں ایک
یہ چوری کا انسداد بھی ہے جو قطعاً موقوف ہو گئی ہے۔ چور کا ایک ہاتھ کاٹ ڈالنا معقول سزا ہے اور ایسی
سخت بھی نہیں ہے جیسی کہ ایک صدی قبل انگلستان میں بھیڑ کے چور کو پھانسی کی سزا دی جاتی تھی۔ سلطان
ابن سعود نے سعودی عربستان کو جو بیش بہا نعمتیں عطا فرمائی ہیں ان میں اس ملک کا کامل امن و امان کچھ
معمولی نعمت نہیں ہے۔

۱۰ مارچ : آج مسز اینڈرسن ایک ڈچ خاتون ہمیں چند آزاد شدہ لونڈیوں کو دکھانے کیلئے لے گئیں
یہ عورتیں ایک مالدار سوداگر کے مکان میں مفت رہتی ہیں، اس کے کمروں کے سامنے ایک صاف صحن ہے۔
ایک ایک کمرے میں دو دو عورتیں مقیم ہیں اور دھلائی کے کپڑے دھو کر اور بعض دوسری مزدوریاں کر کے
اچھی طرح گزر چلا لیتی ہیں۔ ان لونڈیوں میں زیادہ تر سوڈان کی ہیں اور اپنی موجودہ حالت پر
خوش و مطمئن ہیں۔ اس مکان کے صحن کے بیچوں بیچ ایک کنواں ہے اور کچھ درخت اور پھلواریاں بھی ہیں۔
ایک بلی، چند بکریاں اور کچھ کبوتر بھی پلے ہوئے ہیں یہاں میں نے ایک بڈھی عورت کو دیکھا جو فاقے
سے قریب المرگ ہو گئی تھی، وہ اس درجہ خوددار تھی کہ اس کو کچھ مزدوری نہ ملی اور چاروں تک فاقے
کرتے کرتے ادھ مری ہو گئی مگر کسی سے اپنی حالت بیان نہ کی۔ دوسری عورتوں کو جب اس کی خبر ہوئی تو
انہوں نے اس کی جان بچائی۔ جب ہم نے اسے دیکھا، اسے بڑی خوش مزاج بڈھی پایا۔ ہمارے سامنے

دو خوب صورت عورتیں ان سے اور ملنے آئی تھیں، شہر میں ایسے کئی محلے تھے جن میں آزاد شدہ اور بے کس عورتیں رہتی ہیں۔

۱۲ مارچ: آج خبر ملی کہ مجھے حج و زیارت مدینہ کی اجازت مل گئی۔ میں اس قدر عرصہ دراز تک امید و بیم کی حالت میں رہی ہوں کہ میں بمشکل اس کی قدر کر سکتی ہوں کہ آخر میری زبردست آرزو پوری ہوگئی۔

۱۳ مارچ: میرے سفر کا سب سامان ہو گیا۔ مدینہ یہاں سے ڈھائی سو میل ہے اور چونکہ یہاں کوئی سڑک نہیں ہے اس لئے اندیشہ ہے کہ ایک دن میں وہاں پہنچ سکوں گی۔ میری میزبان نے اس خیال سے کہ شاید مجھے ریگستان میں سونا پڑے، ایک کمبل اور ایک تکیہ مجھے دے دیا ہے۔ اس کے علاوہ توشہ کی ٹوکری مرغ کے چوزوں کا سالن، کچھ انڈے، روٹی اور سوڈا واٹر کی ایک بوتل میرے ساتھ کر دی ہے۔ چائے تو رستے میں مجھے ہر جگہ مل ہی جائے گی۔ ہر کاروان سرائے میں اعلیٰ درجہ کی سبز یا سرخ چائے کی فنجانیں بکتی ہیں۔ لیموں اور پودینہ بھی ملتا ہے جو مجھے بکری کے دودھ سے زیادہ مزیدار معلوم ہوتا ہے۔ میرے عربی کے ایک استاد ابوبکر ناظر نے جن کا بھائی مصطفےٰ ناظر میرے ساتھ مدینے چل رہا ہے، رسوم زیارت کے متعلق مجھے آخری سبق پڑھا دیا۔ اب میں عربی کپڑے پہننے کی مشق کر رہی ہوں اور برقعہ اوڑھنا سیکھ رہی ہوں۔ یہاں آنے کے بعد جن لوگوں سے میری ملاقات ہوئی اب مجھے وہ خدا حافظ کہنے اور دعائے سلامتی کرنے کے لئے آ رہے ہیں۔ میرے میزبان کلکتے میں ہیں۔ ان کی بیوی کہہ رہی ہیں کہ کل جلدی اٹھ کر تم کو رخصت کروں گی۔ میں کہہ رہی ہوں یہ زحمت کیوں کرتی ہو۔ اب میں سوتی ہوں۔ لیکن سفر سر پر سوار ہے۔ نیند آنے کی امید نہیں۔

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے

جہانِ آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اقبالؒ

مولانا عبدالکریم پاریکھ

جزیہ کی حقیقت

جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی اور اب ان کا حال یہ ہے کہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ان کا ایمان نہیں رہا۔ اور اللہ نے اور اس کے رسول نے جس چیز کو حرام کیا ہے اسے حرام نہیں جانتے اور سچے دین کو قبول نہیں کرتے ان سے بھی جنگ کرو، یہاں تک کہ اپنے جان و مال کی حفاظت کیلئے تم کو اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں اور اپنی بڑائی چھوڑ دیں۔ (سورہ توبہ آیت ۲۹)

قرآن کریم میں یہ بیان ہے اہل کتاب کا جن کے پاس توریت شریف اور انجیل شریف موجود تھی، لیکن اپنے نبیوں کو خدا کا بیٹا اور شریک بنا دیا اور اپنے پیروں، فقیروں کو حاجت روا مشکل کشا بنا دیا۔ یہ بھی مشرک بن گئے۔ اور حرام کاموں میں مبتلا تھے۔ اور صرف نام کے اہل کتاب مشہور تھے۔ ان کے بارے میں حکم ہوا کہ اللہ پر ایمان لائیں اور آخرت پر۔ اور اللہ کی منع کی ہوئی چیزیں چھوڑ دیں۔ اور سچا دین قبول کریں۔ جو ان کتابوں میں بھی بیان ہوا ہے۔ یہ لوگ اس حکم کو نہ مانیں پھر ان کو مسلمانوں کے علاقہ میں رہنے بسنے کے لیے جزیہ ادا کرنا ہوگا۔ اگر اپنے ہاتھوں جزیہ دے کر ماتحت بن کر رہنا چاہیں تو رہیں ورنہ چلے جائیں۔ ورنہ ان سے جنگ کی جائے۔

جزیہ اسے کہتے ہیں کہ کوئی شخص اسلام قبول نہ کرے اور مسلمانوں کے ملک میں رہنا چاہے تو ایک آدمی سے پانچ آنے یا دس آنے یا سوا روپیہ ماہانہ وصول کیا جائے۔ یعنی سالانہ حساب لگایا جائے تو پونے چار روپے یا ساڑھے سات روپے یا زیادہ سے زیادہ پندرہ روپیہ ایک ایک برس کا دے کر مسلمانوں کے ملک میں اطمینان سے رہے۔ اس پر فوجی ذمہ داری بھی نہیں اور زکوٰۃ بھی ان پر لازم نہیں جبکہ مسلمانوں پر ملک کی حفاظت کے علاوہ سالانہ زکوٰۃ جو مال کا چالیسواں حصہ ہے ادا کرنا لازم ہے۔ اور یہ ہر مسلمان پر فرض ہے اگر وہ صاحب مال ہو اس طرح جزیہ دینے والے بہت سستے داموں چھوٹ گئے۔ مسلمان اگر ایک لاکھ روپیوں کا مالک ہے تو سالانہ ڈھائی ہزار روپے ادا کرے گا۔ اس کے مقابلے میں ذمی یعنی جزیہ دینے والا سالانہ

یادہ سے زیادہ پندرہ روپے ادا کرے گا۔ اب جو کوئی جزیہ پر اعتراض کر کے مسلمانوں کو ظالم بتائیں یا غیروں پر جزیہ لاد دیا اور ایسے ہی دوسرے الزام لگائیں۔ انہیں جان لینا چاہیے کہ جزیہ دے کر غیر مسلم کو مالی فائدہ زیادہ رہتا ہے ــــ یا زکوٰۃ دے کر اور فوجی ذمہ داری ادا کر کے مسلمانوں کو؟ ــــ آج تو دنیا کی بہت سی حکومتیں مسلمانوں سے وہ تمام ٹیکس وصول کرتی ہیں جو دوسروں سے حاصل کرتی ہیں اور مسلمانوں سے ہر طرح کی خدمات بھی لیتی ہیں اور مسلمانوں کی حفاظت بھی نہیں کر سکتیں۔ ایسے کو کیا حق ہے کہ جزیہ پر اسلام کو طعنہ دیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ جزیہ تندرست آدمی سے لیا جائے گا۔ بیمار ہو، بہت بوڑھا ہو، اپاہج ہو اس سے جزیہ وصول نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اس کی مالی امداد کی جائے گی کہ مسلمانوں کے علاقے میں دکھی نہ رہے۔ اور ہر طرح سے جزیہ دینے والوں کی جان و مال کی حفاظت مسلمانوں پر لازم ہے۔

جو شخص اسلامی حکومت کو جزیہ اپنے ہاتھ دے آیا وہ Nationality Certificate کا حق دار بن گیا یا اس کا ویزا، یا ناگریکتا پتر حاصل کر لیا۔

ملک پر کبھی جنگی حالت طاری ہو تو جزیہ دینے والے پر فوجی خدمات لاگو نہیں اور مسلم ملک میں رہنے والے جزیہ دینا نہ چاہیں تو کوئی زور نہیں، اپنا علاقہ جہاں پسند ہو چلے جائیں۔ جزیہ صرف تندرست، قابل جنگ مرد سے لیا جائے گا۔ عورت، معذور، اپاہج لوگ، بے روزگار، غلام، مفلس، تارک الدنیا، درویش اور پادری وغیرہ سے بھی جزیہ نہیں لیا جائے گا اب آواز دو انصاف کو کہ جزیہ دینے والا نفع میں رہا یا مسلمان؟

خوب یاد رہے کہ مسلمان اس دنیا میں آخرت بنانے کے لیے کام کرتا ہے۔ اسے اس کی پرواہ نہیں کہ آخرت بنانے پر اس کی دنیا کتنی کچھ نقصان میں ہے اس لیے جزیہ دینے والے دنیا میں نفع میں رہے اور مسلمانوں نے آخرت کا سودا کر لیا۔

ڈاکٹر مغنی تبسم

لالۂ صحرا
اقبال کا ایک علامتی پیکر

اسلوب اگر فن کار کی شخصیت کا اظہار ہے تو ہم کو اس شخصیت کی تلاش اس لسانی آفاق میں کرنا چاہیے جس کی مرحلہ وار تخلیق فن کار کے لیے خود اس کی شناخت کا وسیلہ بنتی ہے اقبال کا تخلیقی سفر آدمِ اوّل کی حیرت سے شروع ہوتا ہے۔ عالمِ فطرت میں پہلی بار اپنی آنکھیں کھولیں وہ ہر مظہرِ فطرت کو حیرت سے دیکھتا اور اس کی حقیقت کو جاننے کی کوشش کرتا ہے اس کے پاس علم حاصل کرنے کا واحد وسیلہ مظاہرِ فطرت سے اپنی فطرت کا موازنہ اور مقابلہ ہے۔ اس عمل میں اسے کامیابی اس لیے نہیں ہوتی کہ وہ خود اپنی فطرت سے آگاہ نہیں۔ اس کی مثال اس آئینے کی ہوتی ہے جس کے مقابل بھی آئینہ رکھا ہے۔ یہاں سے اس کے سفر کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ جب اسے ایک تاریخی انسان ہونے کا احساس ہوتا ہے اور وہ خود کو ایک خاص جغرافیائی ماحول میں تاریخ کے ایک مخصوص موڑ پہ کھڑا ہوا پاتا ہے۔ اپنی اس محدود شناخت سے وہ مطمئن نہیں ہوتا اور گردشِ ایام کو ماضی کی طرف دوڑا کر اس منزل پر لے جاتا ہے جہاں تاریخ و تہذیب کا آغاز ہوا تھا۔ وہاں سے حال کی طرف لوٹتے ہوئے وہ اس مقام پر پہنچتا ہے جسے انسانی تہذیب کا نقطۂ عروج کہا جاتا ہے۔ یہیں اسے اپنی خودی اور اس کے غیر محدود امکانات کا عرفان حاصل ہوتا ہے اور اس کی حیرت عشق سے مبدل ہو جاتی ہے۔ اقبال کی شعر کے لسانی آفاق میں حیرت سے عرفانِ ذات تک یہ سفر ایسی علامتوں کی جستجو اور تخلیق کی صورت میں ظاہر ہوا جس سے وہ خود کو مطابقت دے سکے۔ اقبال کی علامتیں ایک طویل اسلوبیاتی کش مکش اور لسانی جدلیت کی آفریدہ ہیں جس کا اظہار بیشتر ان کی تمثیلوں، تشبیہوں اور استعاروں

کے تلازمات میں رد و بدل اور ردو قبول کی صورت میں ظاہر ہوا ہے اور جو ایک طرح سے خود اقبال کی شخصیت اور شعور کے نشوونما اور ارتقا کی آئینہ دار ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اقبال کی شاعری کی ایک اہم علامت "لالۂ صحرا" کا مطالعہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اقبال کے قارئین سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ ان کی فرہنگ شعر کا بڑا ذخیرہ اردو اور فارسی کی عشقیہ شاعری سے ماخوذ ہے جس میں مناظر فطرت بالخصوص باغ اور گلستان سے تعلق رکھنے والے لفظیات حاوی ہیں۔ ایک شاعر کی حیثیت سے پہچانے جانے اور خود کو پہچاننے کی ابتدا ان لفظیات کے تلازموں کو تبدیل کرنے کی سعی سے ہوئی۔ 'لالہ' کا استعارہ فارسی اور اردو غزل کے لیے نامانوس نہیں تھا۔ لالہ کو حافظ نے ایک رند، عاشق اور شہید کی صورت میں دیکھا اور بعض اشعار میں لالہ سے خود کو مماثل بھی کیا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

گشادہ نرگس رعنا ز حسرت آب از چشم
نہادہ لالہ ز سودا بجان و دل صد داغ

ز شوق نرگس مست بلند بالائی
چو لالہ با قدح افتادہ بر لب جویم

با صبا در چمن لالہ، سحر می گفتم
کہ شہیدان کہ اند این ہمہ خونین کفنان

اردو غزل میں لالہ کے روایتی تلازموں کے ساتھ چند نئے مضامین بھی ملتے ہیں مثلاً غالب کے یہ شعر:

رنگ تمکین گل و لالہ پریشاں کیوں ہے
گر چراغان سر رہ گذر باد نہیں

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

اقبال نے لالہ کے استعارے کا استعمال سب سے پہلے اس شعر میں کیا ہے۔

اٹھائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے

چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

چمن، لالہ، نرگس، گل اپنے گوناگوں تلازموں کے ساتھ علامتی رتبے کو پہنچ جاتے ہیں اگر ہم اسے نظم کے متن سے الگ کر لیں۔ ابتدائی دور کے کلام ہی میں یہ شعر بھی ملتا ہے۔

تمیز لالہ و گل سے ہے نالۂ بلبل

جہاں میں وا نہ کوئی چشمِ امتیاز کرے

ایک طرح سے یہ غالب کے شعر کا جواب ہے کہ ہر رنگ میں بہار کا اثبات ہونا چاہیے۔ لیکن اقبال کے شعر میں وحدتِ شہود سے زیادہ وحدتِ انسانیت کا تصور ابھرتا ہے جب کہ نالۂ بلبل سے شاعر کی فریاد مراد لی جا سکتی ہے۔

اقبال نے بہت سے اشعار میں لالہ کو لغوی مفہوم میں برتا ہے جس سے ہم صرفِ نظر کرتے ہوئے صرف استعاراتی استعمال کا جائزہ لیں گے۔ اقبال کے کلام میں رند اور عاشق کی حیثیت سے لالہ کا کردار تین مدارج میں بٹ گیا ہے۔ وہ ایک مثالی لالہ ہے جو خونیں جگر آتش نفس عاشق ہے جس کا پیراہن بھی بیک وقت خونیں و آتشیں ہے۔ خونیں کی صفت کے ساتھ زندگی عشق اور شہادت کے تلازماتِ خیال مربوط ہیں۔

صد نیستاں کاشت تا یک نالہ رست

صد چمن خوں کرد تا یک لالہ رست

سرِ خاکِ شہیداں برگ ہائے لالہ می پاشم

کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد

اور حضرت شبیر کے بارے میں کہتے ہیں۔

بر زمینِ کربلا بارید و رفت

لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت

اس کے مقابلے میں لالہ کا آتش بجاں اور آتش قبا ہونا اس کو ایک معنی خیز اور جامع استعارہ بناتا ہے۔ عشق کی گرمی اور حرارت کے ساتھ کہیں یہ اسرارِ جاں کی بے حجابی کہیں آلائشوں سے پاک ہو کر اور کہیں یہ نورِ عرفان بن کر چراغ کا استعارہ بن جاتا ہے۔ یہ وہ لالہ ہے جو زبانِ حال سے کہتا ہے۔

آں شعلہ ام کہ صبح ازل در کنار عشق
شعلہ از نمود بلبل و پروانہ می تپید

افزودں ترم ز مہر بہ ہر ذرۂ تن زنم
گردوں شرار خویش ز تاب من آفرید

یہی لالہ جو اسرار حیات کا محرم ہے جب مثالی تہذیبی اقدار کا حامل بن جاتا ہے تو اس کی شان ہی نئی جلوہ گر ہوتی ہے۔ اسی لیے اقبال اس کو مردِ لالہ کہتے ہیں۔ وہ اپنے سراپا ناز سے برآمد ہوکر شوق کو مہمیز کرتا ہے۔ مرد کس لالہ دراصل لالہ صحرا ہے جو اقبال کی شاعری میں علامت کی سطح سے تبدیل پاکر تہذیب حجاز کا استعارہ بن گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں تہذیب حاضر کو اقبال نے ایسے لالہ زار سے تشبیہ دی ہے جس کے لالے پریدہ رنگ، تشنہ کام اور داغِ تمنا سے محروم ہیں۔ وہ اپنے سرد دل سے ان کی آگ تیز کرنا چاہتے ہیں اور خدا سے دعا مانگتے ہیں کہ وہ انھیں نم شبنم یعنی نعمت توفیق سے سرفراز کرے تاکہ وہ تشنہ کام نہ رہیں۔ اقبال کے شعور کے ارتقا کی یہ وہ منزل ہے جہاں وہ خود کو تنہا اور اجنبی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ لیکن انھیں لالہ صحرا کی صورت میں اپنا مثیل اور نظیر مل جاتا ہے اور وہ اس علامت کو پالیتے ہیں جس سے وہ خود کو identify کرسکیں۔ وہ کہتے ہیں

من مثال لالۂ صحرا ستم
در میان محفلی تنہا ستم

اور

در جہان مثل چراغ لالۂ صحرا ستم
نے نصیب محفلے نے قسمت کاشانہ

لالہ صحرا سے شاعر کا یہ خطاب اس علامت کی ماہیت اور شاعر کی ذات سے اس کی مطابقت کی بنیادوں پر کسی قدر روشنی ڈالتا ہے۔

بھٹکا ہوا راہی میں بھٹکا ہوا راہی تو
منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی
خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و کمر ورنہ
تو شعلۂ سینائی میں شعلۂ سینائی

تو شاخ سے کیوں پھوٹا میں شاخ سے کیوں ٹوٹا
اک جذبۂ پیدائی، اک لذتِ یکتائی

آخر میں وہ اس تمنا کا اظہار کرتا ہے۔

اے بادِ بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی و دلسوزی سرمستی و رعنائی

لالۂ صحرائی کی علامت میں صحرا کا لاحقہ سہ گانہ تلازمے رکھتا ہے:

(۱) صحرا بمعنی فطرت (۲) صحرائے عرب (تہذیب حجاز) اور تیسرے صحرائے عصرِ حاضر (لادینی تہذیب)

اقبال اپنی اولین اور فطری مطابقت فطرت کے لالۂ صحرا میں پاتے ہیں۔ لیکن ان کی مجبوری یہ ہے:

ایں آہِ جگر سوزی در خلوتِ صحرا بہ
لیکن چہ کنم کاری با انجمنی دارم

اس لیے وہ تہذیب اور تاریخ کا فرد ہونے کی حیثیت سے اس لالۂ صحرا کو اپنا رفیق بناتے ہیں جن کی طرف انھوں نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔

از دمِ سیراب آں امی لقب
لالہ است از ریگِ صحرائے عرب

یعنی

لالۂ صحرا جسے کہتے ہیں تہذیب حجاز

لیکن اس مطابقت اور ہم آہنگی کے ساتھ وہ خود کو ایک ایسے لالہ کی صورت میں دیکھتے ہیں جس کا مسکن تہذیبِ حاضر کا صحرا ہے۔

اسی لالۂ صحرا کو جاوید نامے کا 'زندہ رود' یہ پیام دیتا ہے۔

اے لالۂ صحرائی تنہا نتوانی سوخت
ایں داغِ جگر تابی بر سینۂ آدم زن

رشید الدین

حالی کا تنقیدی شعور

اُردو ادب میں حالی کی شخصیت بڑی پہلو دار ہے۔ وہ ایک شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔ مصلحِ قوم بھی ہیں اور مجتہد عصر بھی۔ روایتی اور گھسی پٹی ڈگر سے ہٹ کر انھوں نے جو غزلیں لکھیں اور جدید موضوعات پر جو نظمیں سپردِ قلم کیں وہ اردو شاعری کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔ نثر میں انھوں نے سوانح نگاری کی بنا ڈالنے کے علاوہ تنقید نگاری کی بھی نیو ڈالی۔ ان کا مقدمہ شعر و شاعری جدید تنقید کی سب سے پہلی کڑی ہے۔ انھوں نے اپنے دیوان کا جو مقدمہ "شعر و شاعری" کے عنوان سے لکھا تھا اس کا مقصد محض اس زمانے کے عوام اور خواص کو جدید رجحانات سے آگاہ کرنا اور انھیں ان کی مروجہ روش سے ہٹا کر جدید شاعری کے لیے تیار کرنا تھا۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے انھوں نے اُردو میں تنقید کی بنیاد ڈال دی اور ایک شاعر ہوتے ہوئے اردو کے سب سے پہلے نقاد ہونے کا شرف حاصل کیا۔

لفظ تنقید نقد سے مشتق ہے جس کے معنی تولنا، جانچنا، پرکھنا ہے۔ ادب میں یہ ایک صنف ہے جس میں شعری و نثری تخلیقات کو کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ اس کے چند مسلمہ اصول ہوتے ہیں۔ صرف ذاتی پسند یا ناپسند پر کسی تخلیق کا تجزیہ تنقید نہیں کہلا سکتی۔ تعریض یعنی کسی تخلیق کی تعریف محض یا تنقیص یعنی کسی تخلیق کی صرف مذمت تنقید نہیں کہلا سکتی بلکہ یہ ان دونوں سے الگ ہوتی ہے۔ اور اس میں غیر جانب داری کے ساتھ کسی تخلیق کا جائزہ شرط اولین ہے۔

تنقید کی ابتدا یونان سے ہوئی ہے۔ اس کے بعد اہل روم کا نمبر آتا ہے۔ پہلے علماء کے فیصلے اٹل سمجھے جاتے تھے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں علوم و فنون کی ترقی کی وجہ سے تنقید علماء کی گرفت سے آزاد ہوئی۔ اس کے بعد فن تنقید نے بہت ترقی کی۔ اردو میں تنقید یورپ سے آئی۔ اس کے بعد اردو تنقید پر مارکسی تنقید کا زبردست اثر پڑا۔ مارکس کے نزدیک زندگی جدلیاتی تنقید ہے اور ادب کو بھی یہی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ادب زندگی کی تنقید ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو

بھی کئی مارکسی تنقید نگار پیدا ہوئے جن میں احتشام حسین کا نام سرفہرست ہے۔

اردو میں تنقید کی ابتداء ارادتاً نہیں کی گئی بلکہ یہ ایک امر اتفاق ہے اور اس کا سہرا ایک شاعر کے سر ہے جس نے اپنی شاعری کی وکالت کرتے ہوئے نادانستہ طور پر اردو میں تنقید کی ابتدا کی حالی نے اپنے دیوان کا مقدمہ لکھتے ہوئے قدیم اردو شاعری کی جو برائی کی اور شاعری میں جدید رجحانات کی جو وکالت کی اس نے بڑی شہرت حاصل کی اور اس زمانے میں اس پر بڑی لے دے ہوئی۔ اس زمانے میں زیادہ تر اس کی مخالفت کی گئی۔ لیکن اچھے لوگوں نے اس کا اچھا اثر بھی قبول کیا۔ بعد میں زمانے نے اس پر مہر صداقت ثبت کردی۔ اور یہ مقدمہ علحدہ طور پر کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اور آج تک شائع ہوتا چلا آرہا ہے اور زبان و ادب کے طالب علم اس سے اپنے شعور و آگہی میں اضافہ کر رہے ہیں۔

سوال یہ ہوتا ہے کہ آخر حالی نے اپنے مقدمہ میں کیا لکھا ہے۔ انھوں نے دراصل اپنے مقدمہ میں پہلے شاعروں یا شاعری کے کوچہ میں نیا نیا قدم رکھنے والوں کو چند مشورے دیئے ہیں۔ اور آخر میں اس زمانے کی مروجہ اصناف غزل رباعی، قصیدہ، مرثیہ اور مسدس وغیرہ کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور بتایا ہے کہ ان اصناف کو نئے زمانے کے لحاظ سے کس طرح برتنا چاہیے۔

حالی کا خیال تھا کہ شاعری کے کوچہ میں اس شخص کو ہی قدم رکھنا چاہیے جس کی فطرت میں قدرت نے شاعری کا ملکہ ودیعت کیا ہو ورنہ تمام کاوشیں اور کوششیں رائیگاں ہوجائیں گی اور فن شاعری مفت میں بدنام ہوگا۔ ان کا کہنا تھا کہ یوں تو ہر فن اور پیشہ میں کمال حاصل کرنے کے لیے فطرت، مناسبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن شاعری میں اس کی کچھ زیادہ ہی ضرورت ہے۔

حالی اس خیال کے حامی تھے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے حقیقت اور راستی پر نظر رکھنی چاہیے۔

راستی سیدھی سڑک ہے جس میں کچھ کھٹکا نہیں
کوئی رہرو آج تک اس راہ میں بھٹکا نہیں

ان کا خیال تھا کہ شاعر بننے کے لیے سب سے پہلے استعداد اور پھر نیچر کا مطالعہ کرنا اور اس کے ساتھ کثرت سے اساتذہ کا کلام دیکھنا اور میسر آسکے تو ان لوگوں کی صحبت سے مستفید ہونا چاہیے جو شعر کا صحیح ذوق رکھتے ہوں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے وضاحت کرتے ہوئے نیچرل شاعری کا وہ باب لکھ دیا ہے جو اردو تنقید میں خاصے کی چیز ہے۔ پہلی بار انھوں نے مغرب کے اثرات کو اس کے ذریعہ اردو میں روشناس کرانے کی کوشش کی۔ حالی نے صاف

طور پر لکھا ہے کہ شاعری میں جھوٹ، بہتان، مبالغہ، افترا، خوشامد، بے معنی ادعا، بے جا تعلی، الزام تراشی، لایعنی شکوہ، بے محل باتیں اور اس قسم کے خیالات سے جو راستی اور صداقت کے منافی ہوں بچنا چاہیے۔

حالی کا خیال تھا کہ شاعری میں زبان کو صفائی اور درستگی کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں انھوں نے صنائع بدائع پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ محاورہ اور روزمرہ کا فرق بتایا ہے۔ ضرب المثل اور تلمیح کی اہمیت واضح کی ہے۔ آج ہمیں ان کے یہ بیانات از کار رفتہ معلوم ہوں گے لیکن اس زمانے میں ان کی بڑی ضرورت تھی بلکہ ایک لحاظ سے آج بھی ہے۔

حالی کا یہ بھی خیال تھا کہ جب تک دل میں جذبہ یا احساس خود بخود جوش نہ مارے شاعری کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہیے۔ اس بارے میں مختلف لوگ مختلف ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ شاعری فن کا اظہار بھی ہو سکتا ہے اور احساس کا بھی۔ خیال کی وضاحت بھی ہو سکتی ہے اور فکر کا پرتو بھی۔ جہاں تک جذبات و احساسات کا تعلق ہے جوش ضروری ہے تاکہ شاعر کی طبیعت میں خود بخود تحریک پیدا ہو، لیکن خیال و فکر کی شاعری وقتی تحریک کی محتاج نہیں ہوتی۔ تاہم حالی سے اتنا اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ ولولہ شاعری کو جادو بیانی عطا کر سکتا ہے جس کی مثال جوش کی شاعری ہے۔

ویسے تو حالی نے اپنے مقدمہ میں اس زمانے کے مروجہ تمام اصناف سخن پر اظہار خیال کیا ہے۔ لیکن غزل چونکہ اس زمانے کی سب سے زیادہ مروجہ اور سب سے زیادہ مقبول صنف تھی اس لیے حالی نے سب سے زیادہ اسی کے بارے میں لکھا ہے۔ ان کے دور تک پہنچتے پہنچتے غزل مخصوص مضامین کے لیے مختص ہو کر رہ گئی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب غزل گویوں کے لیے مواد ہے نہ اسلوب۔ اسی لیے حالی نے بطور خاص کہا تھا کہ غزل کو بہ اعتبار مضامین اور خیالات جہاں تک ممکن ہو وسعت دینی چاہیے۔ حالی ساحل پر کھڑے ہو کر ڈوبنے والوں کو بچانے کا طریقہ بتانے والے مصلح نہیں تھے بلکہ وہ خود دریائے شاعری کے شناور تھے۔ اسی لیے انہوں نے اپنی غزلوں میں اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ یہ ضرور ہے کہ بعض اوقات اصلاح کے جوش میں انھوں نے غزل کے نام سے ایسے اشعار لکھ دیئے جو غزل کے نہیں نظم کے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ؎

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے
نہیں اس میں لگتی ہے محنت زیادہ
فرشتوں سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

عام طور پر ایسی ہی غزلوں کو سامنے رکھ کر لوگوں نے نئی غزل کا مذاق اڑانے کی کوشش کی۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ حالی تجربہ میں مختلف طریقے آزما رہے تھے۔ اس لیے سپاٹ اور پھیکے اشعار کا بھی سرزد ہو جانا لازمی تھا لیکن انہوں نے بعض غیر معمولی تغزل کے شعر نئے خیالات اور نئے اسلوب کے ساتھ نہایت کامیابی کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ ان کی یہی کامیاب غزلیں ہیں جنہوں نے اردو غزل کو بند گلی سے نکالا اور اقبال اور اس کے بعد کے شعراء کے لیے نئی غزل کی شاہراہ فراہم کی۔ غزل کے سلسلہ میں حالی یہ بھی کہتے ہیں کہ چونکہ اس کا پیمانہ مختصر ہوتا ہے اور بات دو مصرعوں میں مکمل ادا کرنی ہوتی ہے۔ اس لیے سادگی اور صفائی کی اس میں سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور یہ سادگی اور صفائی مشق و مزاولت کے بغیر نہیں پیدا ہو سکتی یہی وجہ ہے کہ حالی نے اس زمانے کے شعراء سے گل و بلبل کی شاعری چھوڑنے کی التماس کی تھی تو وہ انہیں بہت ناخوش گوار گزری تھی۔

حالی نے اپنا مقدمہ ان الفاظ پر ختم کیا ہے:

"اب ہم اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ اس کی نسبت یہ امید رکھنا کہ ہمارے دیرینہ سال شاعر جن پر قدیم شاعری کا رنگ چڑھا ہوا ہے اس مضمون کی طرف التفات کریں گے یا اس کو قابل اعتنا سمجھیں گے۔ محض بے جا ہے۔ اور یہ خیال کرنا بھی فضول ہے کہ جو کچھ اس میں لکھا گیا ہے وہ سب واجب التسلیم ہے۔ البتہ ہم کو اپنے نوجوان ہم وطنوں سے جو شاعری کا چسکا رکھتے ہیں اور زمانے کے تیئں پہچانتے ہیں یہ امید ہے کہ وہ شاید اس مضمون کو پڑھیں اور کم سے کم اس قدر تسلیم کریں کہ اردو شاعری کی موجودہ حالت بلاشبہ ترمیم اور اصلاح کی محتاج ہے۔ ہم نے اپنی ناچیز رائیں جو اس مضمون میں شاعری کی اصلاح سے متعلق ظاہر کی ہیں گو ان میں سے ایک رائے بھی تسلیم نہ کی جائے لیکن اس مضمون سے ایک خیال پھیل جائے کہ فی الواقع ہماری شاعری اصلاح طلب ہے تو ہم

سمجھیں گے کہ ہم کو پوری کامیابی حاصل ہوگئی کیونکہ ترقی کی پہلی سیڑھی
اپنے تنزل کا یقین ہے۔"

مقدمہ کے اختتام سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں حالی کا روئے سخن زیادہ تر نوجوانوں سے تھا اور اس زمانے کے نوجوانوں نے ہی ان کی بات دھیان سے سنی۔ حالی نے جو اصلاحی خیالات پیش کیے تھے۔ ان کے زمانے ہی میں ان کی خاصی پذیرائی ہو چکی تھی جس کا خود انھیں بھی اعتراف تھا اور محض اسی خیال کے پیش نظر انہوں نے یہ شعر کہا تھا ؎

حالی اٹھا ہلا کے محفل کو
آخر اپنا کیا تو سنے

حالی کے تنقیدی شعور کے تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں بھی ان کی وہی خوب سے خوب ترکی جستجو کار فرما تھی۔ حالی اپنے زمانے کے سماجی، معاشی اور ثقافتی حالات سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ سیاسی حالات سے بھی مطمئن نہیں تھے۔ لیکن اس معاملے میں وہ مجبور تھے۔ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ اتنا بڑا غدر ناکام ہو چکا تھا اور انگریزوں کی جڑیں ہندوستان میں اور مضبوط ہو چکی تھیں۔ اس لیے انہوں نے سوچا کہ جو چیز بس میں نہیں اس کے لیے کوشش کرنا فضول ہے۔ البتہ جو چیز ممکن ہے اس کے مقدور بھر کوشش کرنی چاہیے۔

حالی پر ایک اعتراض کیا جاتا ہے کہ تنقید کے تعلق سے انھوں نے اپنے خیالات مغرب سے مستعار لیے ہیں۔ یہ ان کے اپنے خیالات نہیں تھے۔ حالی کو انگریزی نہیں آتی تھی۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے۔ البتہ عربی اور فارسی میں ان کی استطاعت قابل رشک تھی۔ پھر ان کو ذہن رسا پایا تھا۔ اس لیے جو بات اچھی ہوتی تھی اسے اپنے ذہن اور شعور سے تاڑ لیتے تھے۔ یہاں بھی یہی معاملہ ہوا۔ اپنے دیوان کا مقدمہ لکھنے بیٹھے تو انہوں نے اس زمانے کی مروجہ شاعری پر اعتراضات کیے۔ اور اس میں تبدیلی کی ضرورت پر زور دیا۔ یہی تحریر بعد میں تنقید کا درجہ اختیار کر گئی۔ اب اس میں حالی کا کیا قصور ہے۔

ویسے یہ تو ماننا پڑے گا کہ حالی ایک ذہین آدمی تھے اور زمانے کی نبض پہچانتے تھے۔ ان میں اچھے برے کی تمیز کا مادہ تھا اور اسی چیز نے انھیں اردو کا پہلا تنقید نگار بنا یا۔ ظاہر ہے ان کے مقدمہ میں بہت سی خامیاں ہیں لیکن اردو کی پہلی تنقیدی کوشش ہونے کی وجہ سے ہمیں انھیں نظرانداز کر دینا چاہیے۔ ویسے اس میں آج بھی بہت سی کام کی باتیں ملتی ہیں۔

مصطفیٰ شروانی

مولانا محمد علی - ایک بیباک رہنما اور صحافی

لندن کے سینٹ جمیس پیلس میں راونڈ ٹیبل کانفرنس کے چوتھے عام اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے مولانا محمد علی نے ۱۹ ر نومبر ۱۹۳۰ء کو اپنی معرکتہ الآرا تقریر میں کہا تھا:

" میں اور میرا بھائی پہلے اشخاص تھے جنھیں لارڈ ریڈنگ نے جیل بھیجا، مجھے اس معاملہ میں ان سے کوئی شکایت نہیں ہے لیکن میں بھی وہی اختیار چاہتا ہوں تاکہ اگر ہندوستان میں لارڈ ریڈنگ کسی جرم کے مرتکب ہوں تو میں بھی انہیں جیل بھیج سکوں"

پھر اسی تقریر میں مولانا محمد علی نے ہندوستان کی غیر مشروط آزادی کی یوں مانگ کی تھی:

" میں آپ سے درجہ مستعمرات لینے نہیں آیا ہوں، میں ڈومنین اسٹیٹس کا قائل نہیں ہوں۔ میں کامل آزادی کے عقیدہ کا پابند ہوں "

اپنی یہ تقریر محمد علی نے کرسی پر بیٹھ کر اس معذرت کے ساتھ کی تھی کہ ان کے اطبا نے دو قدم چلنے کی ممانعت کی تھی اور انہیں جتنے پیچیدہ امراض لاحق تھے ان کے ساتھ سات میل کا سفر بھی غیر ممکن تھا۔ لیکن اس کے باوجود سات ہزار میل کا سفر اپنی مسلسل علالت کے دوران صرف ہندوستان کی آزادی کی خاطر برداشت کیا۔

یکم جنوری ۱۹۳۱ء کو مولانا محمد علی نے اپنی قیام گاہ ہائیڈ پارک ہوٹل کے کمرہ سے مسٹر ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم برطانیہ کے نام چھ ٹائپسٹ کے ذریعہ طویل خط (۲۰) صفحے کا لکھوایا جس میں ہندوستان کی تحریک آزادی کے سلسلہ میں ہندو مسلم موقف کی وضاحت کی تھی۔ یہ اہم خط مولانا محمد علی کی آخری تحریر تھی۔ اور ان کی ۱۹ ر نومبر ۱۹۳۰ء کی تقریر اور یکم جنوری ۱۹۳۱ء کی اسی تحریر کے ساتھ مولانا محمد علی کی ہندوستان کو آزاد کرانے کی لڑائی ختم ہوگئی اور لندن کے ہائیڈ پارک ہوٹل کے اسی کمرہ میں ۳ جنوری ۱۹۳۱ء کی شب کو محمد علی نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اسلام کی پہلی قبلہ گاہ بیت المقدس میں جگہ پائی۔

بقول اقبالؔ " سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت "

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اولڈ بائز لاج میں تینوں کی متعدد تختیاں نصب ہیں۔ ان میں یہ تختیاں
محمد علی و شوکت علی کے نام کی بھی ہیں۔ ایک پر "چھندواڑہ" ایک پر "نینی" اور ایک پر "لینسڈون"
کندہ ہے۔ ایک بار محمد علی اپنے ایک انگریز دوست مسٹر ہوپ کو مسلم یونیورسٹی دکھانے علی گڑھ لے گئے۔
وہاں اولڈ بائز لاج پر اپنے اور مولانا شوکت علی کے نام کی یہ تین تختیاں دکھا کر مسٹر ہوپ سے مولانا
محمد علی نے کہا کہ یہ تینوں تختیاں مجھے اور میرے بھائی کو انگریزوں کے تین جگہ قید کرنے کی یادگار ہیں۔
پھر محمد علی نے مسٹر ہوپ سے کہا کہ ابھی اس میں ایک اور تختی کا اضافہ ہونا باقی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ
اس تختی پر میرے بڑے بھائی شوکت علی کا نام نہیں ہوگا بلکہ صرف میرا (محمد علی کا) نام یوں ہوگا۔
"MOHAMMAD ALI OF THE ROPE" مولانا محمد علی کے انگریز دوست مسٹر ہوپ نے جب حیرت
سے دریافت کیا تو محمد علی نے بتایا کہ جب آپ کی انگریز حکومت مجھے راولپنڈی جیل میں پھانسی دے گی
اور میری نعش رسی سے کھول کر اتاری جائے گی اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اولڈ بائز لاج کی اسی
عمارت میں جو تختی نصب کی جائے گی اس کا مضمون ہوگا "NOHAMMAD ALI OF THE ROPE" محمد علی کا
انگریز دوست مسٹر ہوپ اس انوکھی تجویز کو سن کر سناٹے میں آگیا تھا۔

۱۸۹۶ء میں محمد علی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (جو اس زمانہ میں ایم اے او کالج تھا) سے بی اے
کرنے کے بعد لندن جاکر آئی سی ایس کے امتحان میں شرکت کی مگر ناکام لوٹے تھے۔ پھر دوبارہ انگلستان گئے
اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری لے کر آئے۔ رام پور میں ملازمت ملی پھر بڑودہ اسٹیٹ میں
ملازم ہوئے اور سات سال بڑی نیک نامی سے ریاست کی خدمت کی۔ ۱۹۱۱ء میں ملازمت چھوڑ کر کلکتہ
گئے اور وہاں سے انگریزی روزنامہ "کامریڈ" نکالا جس کے سرورق پر ولیم مارس کی مشہور نظم کا یہ متاثر
کرنے والا بند لکھا جاتا تھا:

" STAND UPRIGHT SPEAK THY THOUGHT
DECLARE THE TRUTH THOU HAST, THAT ALL MAY SHARE
BE BOLD, PROCLAIM IT EVERY WHERE
THEY ONLY LIVE WHO DARE "

لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند کی بیگم نے اپنی سوانح میں لکھا ہے کہ ان کے لئے وہ دن بڑی بے چینی کا ہوتا
جس روز "کامریڈ" کا کوئی شمارہ تاخیر سے وائسرائے ہاؤس پہنچتا یا نہ پہنچتا۔ اور ایڈیٹر "کامریڈ" مولانا
محمد علی کے متعلق مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم اپنی ذاتی ڈائری (ادارۂ اشاعت اردو حیدرآباد ۱۹۴۳ء) میں لکھتے ہیں:

"اگست ۱۹۱۲ء کا زمانہ ہے۔ "مسلم یونیورسٹی" کا غلغلہ ہر طرف برپا ہے۔ ہر زبان
پر اس کا تذکرہ ہے۔ کانسٹیٹیوشن اسمبلی کی کمیٹی (مجلس وضع آئین) اپنا کام شروع کر چکی
ہے۔ اب کمیٹی کا اجلاس لکھنؤ میں طلب ہوا ہے اور راجہ صاحب محمود آباد کے زیر صدارت
انہی کے قصر قیصر باغ میں ہو رہا ہے۔ راجہ صاحب اپنے وسیع ڈرائنگ روم میں بیٹھے
ہیں سامنے بہت بڑا لمبا میز ہے۔ دو رویہ کرسیوں کی لمبی قطار' میز کے ایک گوشہ
میں ایک جوان رعنا اعلیٰ درجہ کے انگریزی سوٹ میں ملبوس منڈھی ہوئی داڑھی
اور نکیلی مونچھوں کے ساتھ بیٹھا ہے۔ ذہانت اس کی ایک ایک ادا سے نمایاں' مجبوں
کی نظریں اس کی طرف بار بار اُٹھ رہی ہیں اور کان اس کی آواز پر لگے ہوئے ہیں۔ وہ
بولا تو سب ہنسنے لگے وہ کھڑا ہوا تو کوئی ہنسا اور کوئی بگڑا لیکن متوجہ سب ہی ہوگئے۔
یہ تھا "کامریڈ" کا شہرۂ آفاق ایڈیٹر محمد علی جس کی جادو نگاری کا سکہ اس وقت بھی
ہر دل میں بیٹھ چکا تھا۔"

محمد علی "کامریڈ" میں تحریروں اور تقریروں کی وجہ سے اور ان کے ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی
ت' بقول خود محمد علی کے "مسلمانوں کی سب سے پہلی نمائندہ "سیاسی انجمن" (ہمدرد ۱۷ جون ۱۹۲۷ء)
یاد ڈالنے پر نومبر ۱۹۱۵ء میں پہلے لینسڈاون پھر چھندواڑہ میں پانچ سال کے لئے قید کر دئے گئے اور اب
یوں محمد علی اور شوکت علی کو ہندوستان کی سیاسیات میں نمایاں حیثیت حاصل ہونے لگی۔ ۱۹۰۷ء
سلم لیگ کے اجلاس کے دوران محمد علی چھندواڑہ میں قید تھے اس لئے ان کی تصویر کرسی صدارت پر
ئی تھی۔ اس صدارت کے متعلق خود مولانا محمد علی نے کہا ہے۔

یہ صدر نشینی ہو مبارک تمہیں جوہر — لیکن صلۂ روز جزا اور ہی کچھ ہے

لندن ٹائمز نے ۱۹۱۱ء میں "CHOICE OF THE TURKS" (ترکوں کی پسند) کے عنوان سے ایک
شائع کیا تھا جس میں ترکوں کو دھمکی دی گئی تھی کہ وہ اپنا رویہ تبدیل کریں ورنہ عواقب کیلئے تیار
۔ جب یہ مضمون محمد علی نے پڑھا تو سب سے پہلے انہیں یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں ترک اس "تلخ و ترش"
سکتے ہوئے مضمون کو پڑھ کر برطانیہ سے جنگ کرنے پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۱۱ء کا "کامریڈ"
چکا تھا۔ محمد علی اس کے لئے ایک افتتاحیہ لکھ چکے تھے۔ لیکن لندن ٹائمز کے اس مقالہ کو پڑھنے
پہلے سے تیار کیا ہوا افتتاحیہ روک کر اپنا وہ معرکۃ الآرا مقالہ لکھا جس کا عنوان دیا گیا'
"THE CHOICE OF THE TU" - یہ مقالہ محمد علی نے بقول خود ان کے لگاتار چالیس گھنٹے کی

محنت شاقہ برداشت کر کے لکھا اور اس تمام عرصہ میں ایک منٹ بھی نہ سوئے اور ۱۹ کالم کا مضمون اس ۲۶ ستمبر ۱۹۱۴ء کے "کامریڈ" میں شائع ہوا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ۳ نومبر ۱۹۱۴ء کو برطانیہ اور ترکی کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو کلکتہ میں محمد علی کے "کامریڈ" پریس کی ضمانت ضبط ہوئی اور دس برس کے لئے "کامریڈ" بند ہو گیا تھا ۔

۱۹۲۳ء کو محمد علی کو انڈین نیشنل کانگریس کی صدارت کے لئے منتخب کیا گیا اور ۲۶ دسمبر ۱۹۲۳ء کو کاکی ناڈا کے کانگریس کے جلسہ میں اپنا وہ بے باک خطبہ پڑھا جس کا عنوان تھا THE NATION ۔ جس میں ہندو مسلم اتحاد پہ زور دیا گیا اور آزادئ ہند کی لڑائی میں دونوں مذاہب کے عوام سے نظم و اتحاد قائم رکھنے کی پرزور اپیل کی گئی ہے ۔

اگر انگریزی روزنامہ "کامریڈ" محمد علی کی بے باک صحافت کا آئینہ دار رہا تو ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء سے شائع ہونے والا اردو روزنامہ "ہمدرد" اردو داں طبقہ کے لئے ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں مہمیز ثابت ہوا ۔ محمد علی کی صحافت کے متعلق ان کے دیرینہ رفیق کار قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں :

> "ہر روز شام کو شعبۂ ادارت کے اراکین کی ایک مجلس مشاورت چیف ایڈیٹر کے کمرہ میں منعقد ہوتی تھی اس مجلس میں مرحوم (مولانا محمد علی) اپنے ہر مددگار کے لئے ایک مضمون تجویز کرتے تھے ۔ پھر اس مضمون کے متعلق کتابوں کی ایک فہرست لکھا کرتے تھے ۔ بہت سی کتابیں اپنے کتب خانہ سے نکال کر دیتے تھے ۔ ان کے خاص خاص ابواب اور صفحات کی نشاندہی کرتے تھے اور بار بار اس اصول کو ذہن نشین کرایا کرتے تھے کہ لکھنے سے پہلے اور لکھنے سے زیادہ پڑھنے کی ضرورت ہے ۔ بعض دفعہ دس بارہ کتابیں پڑھنے کے بعد ایک اداریہ لکھنا ہوتا تھا ۔"

محمد علی کے روزنامہ "ہمدرد" کے صفحات ملک اور ملت اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے وقف تھے ۔ "ہمدرد" کی ۹ مئی ۱۹۲۵ء کی اشاعت میں اپنے ایک ٹیکسی میں عید کی نماز کے لئے عیدگاہ جانے کا تذکرہ یوں کیا ہے کہ مولانا ظفر خان کے ہمراہ نماز عید کے لئے گئے ۔ راستہ میں خلافت کے لئے چندہ کا تذکرہ رہا ۔ واپسی پر جب ٹیکسی والے "ہندو بھائی" کو کرایہ کے پیسے دیئے تو اس نے پیسے واپس کر کے کہا " یہ رقم میری طرف سے اس چندہ میں داخل کر لیجئے" ۔ اس واقعہ کے بعد محمد علی لکھتے ہیں " وہ لوگ جو سمجھتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں میں نہ آج اتفاق ہے نہ کبھی ہو سکتا ہے انہیں اس خلوص اور محبت کے ثبوت سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے" ۔
مولانا محمد علی کی زندگی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے گذری مگر ملک و قوم کی بھلائی اور بہتری

ہمیشہ آواز اٹھاتے رہے۔ ایک بار کی قیدِ تنہائی میں اس ابتلاء اور آزمائش کے دور پر یوں نغمہ زن ہیں

ارض و سما نہ کوہ وجبل تاب لا سکے — وہ ہم تھے ہیں کہ بارِ امانت اٹھا سکے
پھر مستزاد قید پہ تنہائی بھی تو کیا — ہے بات جب کہ یادِ خدا بھی نہ آ سکے
[illegible] زور شوق دعنوں میں دہر مگر — اتنا تو ہے کہ عرش کو اب بھی ہلا سکے

"ہمدرد" کی ۱۷ جنوری ۱۹۲۵ء کی اشاعت میں لکھتے ہیں:

"غالباً قارئین "ہمدرد" اس سے ناواقف نہیں کہ بیجا پور میں تقریباً ڈیڑھ سال میں بالکل خلاف قاعدہ قیدِ تنہائی میں رکھا گیا تھا اور اسی باعث مجھے بیرونی دنیا کے حالات نہ معلوم ہو سکے ترکوں پہ کیا گذری، ہندوستان کے تارکین تعاون پر کیا گذری۔ جس وقت میں والٹیر میں پکڑا گیا تھا اور کراچی لایا گیا تو یونانی فوجیں انگورہ کے قریب تک پہنچ چکی تھیں اس کے بعد کے واقعات پر قیدِ تنہائی نے پوری طرح پردہ ڈال دیا۔ الحمدللہ کہ تھوڑے ہی عرصہ بعد ترکوں کی فتوحات کی خبریں قیدِ تنہائی میں بھی ملنا شروع ہو گئیں اور میری وہ غزلیں اس وقت کے سرور و شادمانی کی شاہد ہیں"۔

عالم میں آج دھوم ہے فتحِ مبین کی — سُن لی خدا نے قیدیٔ گوشہ نشین کی
آخر کو لے کے عرش سے فتح و ظفر گئی — مظلوم کی دعا بھی کہیں بے اثر گئی؟

ہندو مسلم اتحاد کا جو ثبوت محمد علی کا روزنامہ "ہمدرد" دیتا رہا اس کی ایک مثال "ہمدرد" کا ۱۸ جون ۱۹۲۵ء کا اداریہ ہے جس کا عنوان تھا "آہ رخصت جہاں سے داس ہوا" اور وہ اداریہ کیا ہے داس کی موت پر نوحہ ہے جس میں اپنے دیرینہ رفیق کار چترنجن داس کے انتقال پر محمد علی نے آنسو بہائے ہیں۔ "خداوند کریم ہماری حبِ آزادی کا امتحان کر رہا ہے۔ یونہی دشواریاں کیا کم تھیں اور کام کرنے والوں کی کہاں کثرت لیکن بظاہر خداوند کریم ہم میں سے ہر شخص کو آزما رہا ہے"۔ یہ الفاظ آج بھی اتنے ہی صحیح معلوم ہوتے جتنے آج سے ۶۰ سال پہلے تھے۔ فرق صرف نام اور کام کا ہے۔ پھر ایسے ہی تاثر کے ساتھ ۱۷ جنوری ۱۹۲۸ء کی اشاعت میں حکیم اجمل خاں کی وفات پر اس شعر سے آنسو بہاتے ہیں:

یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے — کہ خم کے خم بھرے ہیں مے سے اور میخانہ خالی ہے

شعر خود مولانا محمد علی پر صادق آتا ہے جن کی ۳ جنوری ۱۹۳۱ء کو وفات ہوئی۔

اسو۔ شاکرہ

انگلستان میں سماجی خدمات

مسز سلیمہ سیف الدین جو آج کل شہر لندن میں ایشین اسپشلسٹ کی حیثیت سے کارگزار ہیں پچھلے دنوں اپنے رشتہ داروں سے ملاقات کے لیے حیدرآباد آئی تھیں۔ لندن اب ہندوستانیوں کے لیے اجنبی شہر نہیں رہا ہے ہزاروں لاکھوں ہندوستانی وہاں بس گئے ہیں اور ان کے ذریعے لندن کے بارے میں بہت کچھ پڑھنے اور سننے میں آتا ہے۔ ہم نے مسز سلیمہ سیف الدین سے بات چیت کی۔ انھوں نے جو باتیں بتائیں وہ کافی دلچسپ اور نئی معلوم ہوئیں ہمیں امید ہے کہ قارئین بھی اس بیان کو پسند کریں گے۔

سلیمہ کا تعلق حیدرآباد بلکہ جنوبی ہند کے ایک قدیم مسلم گھرانے سے ہے۔ کم عمری میں وہ اپنے والدین کے ساتھ پاکستان چلی گئیں۔ جہاں ان کے والد جو حیدرآباد سیول سروس سے تعلق رکھتے تھے اچھے عہدہ پر مامور ہوگئے۔ لیکن سلیمہ کو پھر حیدرآباد آنا پڑا۔ ان کی شادی حیدرآباد میں ہو گئی۔ اکثر تو ہندوستانی لڑکے اور لڑکیاں پاکستانی جوڑے سے شادی کے بعد پاکستان منتقل ہو جاتے ہیں۔ مگر سلیمہ کے شوہر یہیں رہے۔ سلیمہ بھی یہیں رہیں۔ کچھ دن وہ علی گڑھ میں رہیں۔ لیکن حالات کچھ ایسے ہوئے کہ ان کے شوہر تلاش معاش میں انگلستان چلے گئے سلیمہ کو بھی ان کے ساتھ جانا پڑا۔ وہاں ان لوگوں نے شہر لوٹن میں رہایش اختیار کرلی۔ سلیمہ اس وقت صرف انٹر کامیاب تھیں اور ان کو دو چھوٹے بچے بھی تھے۔ ان کے شوہر انگلستان میں لائبریری سروس سے متعلق تھے۔ جب ذرا یکسوئی ہوگئی تو سلیمہ نے سوچا کہ وہ خود اپنے لیے کوئی کام تلاش کرلیں۔

ایک دن وہ کسی کام سے باہر نکلیں۔ جب ٹاؤن ہال پر سے گذریں تو انھیں Ramnely

Advice Service under Social Service Department

کا بورڈ دکھائی دیا۔ سلیمہ فطرتاً نڈر اور حوصلہ مند ہیں۔ شکل و صورت اور رنگ سے بھی یورپین تو نظر آ
دکھائی دیتی ہیں اس لیے شاید انہیں لندن میں وہ احساس کمتری نہیں ہوتا جو عام طور سے انگلستان
میں دوسرے رنگ دار باشندوں کو ستاتا ہے۔ چنانچہ بورڈ کو دیکھتے ہی سلیمہ اس آفس میں چلی گئیں
گئیں اور اپنے لیے کسی مناسب ملازمت میں رہنمائی کی درخواست کی۔ اس دفتر کی انچارج خاتون
نے جو انگریز تھیں ان کی اچھی پذیرائی کی اور انہیں کئی پتے دیے جہاں انہیں کوئی ملازمت مل سکتی
تھی۔ خود اپنے ہیڈ آفس کا بھی پتہ دیا۔ مزید بات چیت میں سلیمہ کو اس دفتر کا کام ہی زیادہ
پسند آیا۔ انھوں نے پہلی فرصت میں ہیڈ آفس سے ربط پیدا کیا اور کسی ملازمت کی خواہش
کی۔ جواب میں انہیں ایک سادہ فارم ملا۔ اس فارم میں درخواست گذاروں کے بارے میں کافی
تفصیلات پوچھی گئی تھیں۔ خاص طور سے خاندانی پس منظر اور زبان دانی کے بارے میں
سوالات پوچھے گئے۔ اس فارم میں سلیمہ نے حیدرآباد دکن میں اپنے خاندان کی علمی اور سماجی
خدمات کا ذکر کیا۔ خاص طور سے یہاں کی ، اگزیبیشن سوسائٹی اور سالانہ انڈسٹریل اگزیبیشن
کے بارے میں بتایا اور یہ کہ ان کے والد اور دوسرے رشتہ داروں نے اس کی داغ بیل میں
جو حصہ لیا تھا اس کا ذکر کیا۔ اعلیٰ تعلیم کا موقعہ نہ ملنے کے باوجود ہند و پاکستان میں مختلف شہروں
میں رہائش کی وجہ کئی زبانوں سے واقف ہو گئی تھیں۔ یعنی اردو انگریزی کے علاوہ وہ ہندی،
پنجابی اور سندھی بول سمجھ لیتی تھیں، تلگو، فارسی اور عربی سے بھی کان آشنا تھے۔ فارم میں
انھوں نے اپنی زبان دانی کی تفصیل بھی لکھ دی۔ کئی ایشیائی زبانوں سے واقفیت ان کے
بہت کام آئی۔ چند ہی دنوں میں ان کی درخواست کا جواب آگیا۔ سلیمہ کو ان کی پسند کا کام
یعنی Neighbourhood Service تو نہیں مل سکی۔ البتہ اگر وہ پسند کریں تو انہیں
Family Advice Service کا کام دیا جا سکتا ہے۔ سلیمہ تو کچھ کرنا چاہتی تھیں۔
بڑی خوشی سے انھوں نے یہ نیا کام قبول کر لیا اور اسی دفتر میں کام شروع کر دیا جہاں وہ
ملازمت کی تلاش میں مشورہ کے لیے گئی تھیں۔ بچوں کی کم عمری اور گھریلو ذمہ داریوں کے پیش نظر
انہیں پارٹ ٹائم کام دیا گیا اس میں بھی آنے جانے کے اوقات میں ان کی سہولت اور پسند
کا خیال رکھا گیا۔ اگرچہ ان کے پاس سماجی خدمات کی کوئی ڈگری نہیں تھی۔ لیکن خاندانی پس منظر

اور یونیورسٹی انڈر گریجویٹ ہونے کی وجہ انہیں کوالیفائیڈ Qualified Staff میں شامل کیا گیا صرف چھ ماہ کی پروبیشنری (Probationary) کے بعد انہیں مستقل بھی کر دیا گیا۔ مسلسل چھ سال تک وہ بڑے خلوص اور تندہی کے ساتھ اس دفتر میں کام کرتی رہیں۔ جہاں انہیں کافی مقبولیت ملکی اور غیر ملکی لوگوں میں حاصل ہوئی۔ اسی درمیان میں جب ان کی انچارج انگریز خاتون کسی اور جگہ منتقل ہو گئیں تو سلیمہ کو ہی ان کے اچھے ریکارڈ کی وجہ اس دفتر کا انچارج بنا دیا گیا۔ لوٹن کے باشندوں کے لیے فلاحی یا سماجی رہبری ان کا کام تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا یونٹ تھا۔ کوالیفائڈ یا اعلیٰ عہدہ دار صرف دو تھے باقی کلرکل یا نان کوالیفائڈ اسٹاف تھا۔ جب ایک کوالیفائڈ عہدہ دار خاتون چلی گئیں تو سلیمہ کو ان کی جگہ مل گئی۔ لوٹن میں امیگرنٹ لوگ خاص کر ہندوستانی، پاکستانی باشندے زیادہ تھے اس لیے سماجی رہبری کے لیے ایک امیگرنٹ کی حیثیت سے سلیمہ کو چنا گیا تھا۔ سلیمہ اپنے فرائض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتی تھیں۔ ان کے مفوضہ کاموں میں ضرورت مند اور پریشان حال افراد کی مناسب رہبری شامل تھی کہ کیسے اور کہاں وہ اپنے ذاتی مسائل کے حل ڈھونڈھ سکتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ ملازمت کی تلاش میں رہ نمائی کے لیے آتے تھے یا پھر خواتین اپنے گھریلو مشکلات کے لیے آیا کرتی تھیں ان کی پریشانی کی اصل وجہ کھوج نکالتیں اور پھر انہیں مناسب مشورہ دیتیں۔ سلیمہ کا کہنا ہے کہ بسا اوقات عورتیں اپنی گھریلو پریشانیوں کی تفصیل رو دھو کر کہہ سنا دیتی ہیں تو ان کے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے اور انہیں ایک طرح کا اطمینان ہو جاتا ہے اور خود ہی اپنے طرز عمل کا فیصلہ کر سکتی ہیں۔ سلیمہ کا خیال ہے ایک ہندوستانی ہونے کے ناطے انہیں لوگوں سے ملنے جلنے بولنے سننے کی عادت ہے۔ جو عام طور سے انگریز خواتین میں نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ خلوص اور صبر سے پریشان حال خواتین کے مسائل کو سنتیں اور ہمدردانہ انداز میں خود انہیں کو ان کے مسائل کا حل ڈھونڈھنے میں مدد کرتیں۔ یہی ان کی مقبولیت کا راز تھا۔

اب سلیمہ کے بچے بڑے ہو گئے تھے۔ زندگی میں ایک استقامت بھی آگئی تو انہیں اپنی قابلیت بڑھانے کا خیال آیا۔ انھوں نے سوشیل ایجوکیشن کے ایک ادارے میں Certificate course for social work, Qualification

Social Work Education Course میں داخلہ کی درخواست بھیجی۔ اس کورس کی ٹریننگ Stanmore میں واقع ایک کالج میں ہوا کرتی ہے جہاں داخلہ میں سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ یعنی ایک سو درخواست گذاروں میں سے ہر سال صرف بیس افراد کو داخلہ ملتا ہے۔ اتفاق سے اس سال کالج کے اتھارٹیز یہ چاہتے تھے کہ ایشیائی اقلیتی نسل کے کسی طالب علم کو بھی داخلہ دیا جائے اسی کی وجہ سلیمہ کے انتخاب میں سہولت ہو گئی۔ تاہم داخلہ کے لیے کئی مرحلے طے کرنے پڑے۔ یکے بعد دیگرے انہیں تین ٹسٹ پاس کرنے پڑے جو یہ تھے۔

1. Psychological temperament test نفسیاتی رجحان کا ٹسٹ

2. English language test انگریزی زبان کا ٹسٹ۔

3. General Interview عام انٹرویو۔

ان تینوں مقابلوں سے وہ بخوبی گزر گئیں۔ اس کے بعد ان سے کہا گیا کہ کہیں سے بھی مضامین پڑھ کر اس پر اظہار خیال کریں۔ سلیمہ نے لائبریری جا کر ایک انسائیکلو پیڈیا سے Delinquency پر مضمون پڑھا اور اس پر تفصیل سے اپنی رائے لکھ بھیجی۔ یہ مضمون پسند کر لیا گیا۔ اس کے بعد جنرل انٹرویو ہوا اور انہیں اس سرٹیفکیٹ کورس میں داخلہ مل گیا۔ ان کے نصاب میں Social policy اور Social law کے مضامین بھی شامل تھے۔ کورس سے متعلق مختلف موضوعات پر انہیں اپنے دوران تعلیم میں جملہ ۱۲ Assignments تیار کرنے پڑے۔ اس کے علاوہ سپروائزر کی نگرانی میں عملی کام انجام دینا پڑتا۔ سہولت یہ رہی کہ کسی امتحان کی ضرورت نہ پیش آئی۔ کالج اتھارٹیز کا کہنا کہ اس کورس میں طلباء اسی استعداد کے لیے جاتے ہیں اور اس طریقہ سے کام کرایا جاتا ہے کہ ان کی قابلیت کی مزید جانچ کی ضرورت نہیں۔ یہ کورس صرف سرٹیفکیٹ کورس تھا مگر ٹریننگ کی مدت پورے دو سال تھی۔ ختم تعلیم کے بعد سلیمہ کو لوٹن اپنی سابقہ ملازمت پر لوٹ جانا تھا۔ مگر اسی درمیان لوٹن کے فیملی اڈوائیس سنٹر کو اس کے انتظامیہ نے بند کر دیا۔ سلیمہ بے روزگار ہو گئیں۔ اب انہوں نے پھر اشتہار دیکھنی شروع کر دی۔

انگلستان میں اسٹاف کے انتخاب کا ایک دلچسپ طریقہ یہ ہے کہ مختلف کمپنیاں یا ادارے ایک کھلی شام open evening کا اعلان کرتے ہیں اور ملازمتوں کی تفصیل بتاتے ہیں۔ ان ملازمتوں کے خواہشمند شریک ہوتے ہیں۔ اس بارے میں سلیمہ نے

سمجھا یا کہ ایک چائے پارٹی ہوتی ہے جس میں انتظامیہ اور ملازمت کے خواہش مند کھلے دل سے کھلے اور خوش گوار ماحول میں آپس میں ملتے اور ایک دوسرے کو پرکھتے ہیں۔ انتظامیہ اپنے حسب پسند افراد کو ملازمت کے لیے چن لیتا ہے۔

سلیمہ کو ایک ایسی ہی کھلی شام کا اشتہار نظر آیا جو لندن میں ان کی موجودہ ملازمت کے انتخاب کے لیے ہونے والا تھا۔ یعنی یہ کھلی شام لندن میں ایک Asian specialist for Asian Community کے انتخاب کے لیے منعقد کی جارہی تھی۔ سلیمہ کو یہ کام پسند آیا کیونکہ یہ ان کی لوٹن والی ملازمت کے کام سے ملتا جلتا تھا۔ قسمت آزمائی کے لیے وہ اس "کھلی شام" میں شریک ہو گئیں اور اپنے طرز عمل سے اس میں منتخب ہو گئیں۔ حالانکہ اب کے بھی ان کے پاس یونیورسٹی ڈگری نہیں تھی، مگر سابقہ تجربہ اور زبان دانی کی وجہ انہیں اس ملازمت کے لیے چن لیا گیا۔

اس عہدہ کی ذمہ داری یہی تھی کہ ایشیائی مہاجرین کے مسائل کو سمجھا جائے اور انہیں حل کیا جائے۔ یہ مسائل مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ سلیمہ نے جلد ہی سرد میں جا نکلی اور پہلے کی طرح خوش اسلوبی اور تندہی سے لندن جیسے عظیم الشان شہر میں اپنے ہی جیسے ایشیائی باشندوں کی خدمت اور رہنمائی کر رہی ہیں۔

سلیمہ کا کہنا ہے کہ انگریز مرد، عورتیں تنہائی کا شکار ہوتے ہیں۔ فرصت کی کمی کام کی زیادتی اور الگ گھر کی روایت کی وجہ ہندوستانی مشترکہ گھروں میں حاصل بہت سی سہولتوں سے محروم رہتے ہیں۔ پھر چھوٹی سی عمر میں والدین کی راست رہنمائی سے الگ ہو کر اپنی زندگی آپ بنانے کے سلسلہ میں ان پر جو جسمانی اور ذہنی بوجھ پڑتا ہے۔ وہ اکثر و بیشتر ذہنی بیماریوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ انہیں اپنی ملازمت کے دوران اس کی کئی مثالیں ملیں۔ ایک خاص کیس جس کو انہوں نے اپنی سوشیل ورک ٹریننگ کے دوران حل کیا انہوں نے تفصیل سے بتایا کہ یہ انگریز خاتون اپنی بدمزاجی کی وجہ سے مشہور تھی۔ مختلف شوہروں سے اس کے کچھ بچے تھے۔ جو سب اس سے بیزار تھے۔ موجودہ شوہر بھی اس کا ساتھ دیتا تھا۔ بیٹی جو دوسرے شوہر سے تھی ماں کی بدمزاجی اور برے برتاؤ سے تنگ آکر متعلقہ محکمہ میں رجوع ہوئی کہ اسے ماں سے علاحدہ کر دیا جائے، سلیمہ کو یہ کیس دیا گیا۔ جب وہ اس خاتون کے گھر پہنچی تو ان کے ساتھ بھی بدمزاجی اور سختی سے پیش آئیں۔ اور چیخ و پکار شروع کر دیں۔ سلیمہ نے ہندوستانی

ہونے کے ناطے بات چیت میں پہل کی۔ اور اس خلوص و ہمدردی سے اس سے برتاؤ کیا کہ خاتون کو اپنا طرزِ عمل بدلنا ہی پڑا۔ کئی دوستانہ ملاقاتوں کے بعد خاتون میں تبدیلی آئی۔ میاں اور بچوں سے ان کا طرزِ عمل بدل گیا۔ اتنا کہ بچی نے کہہ دیا کہ وہ اب ماں کے ساتھ ہی رہے گی۔ سلیمہ کہتی ہیں کہ اس خاتون نے سلیمہ کے بارے میں کہا کہ کسی نے مجھے انسان سمجھا ہی۔ یہ جملہ سلیمہ کو اپنی محنت کا معاوضہ معلوم ہوا۔ بعد میں بھی کچھ عرصہ تک ان خاتون کے خطوط نیو ایئر کارڈ سلیمہ کو آتے رہے۔

ہندوستان میں بسنے والے ہندوستانی باشندوں کے مسائل دوسرے ہوتے ہیں۔ غربت اور بے روزگاری ان کے خاص مسائل ہیں۔ غذائی اور سماجی عادتوں کی وجہ وہ اکثر مزمن امراض Chronic Diseases کا شکار ہوتے ہیں اور پھر انگلستان کے ماحول کی تنہائی بھی ان کو بھگتنی پڑتی ہے۔

سلیمہ نے لندن اور انگلستان کے دفتری ماحول کے بارے میں بھی کچھ بتایا۔ وہاں مردوں اور عورتوں کی پنشن کی عمر میں فرق ہے۔ مردوں کو ۶۵ سال میں اور عورتوں کو ۶۰ سال کی عمر میں پنشن مل جاتی ہے۔ اس سلسلے میں وہاں کی عورتوں کا احتجاج جاری ہے۔

ملازمت میں شامل ہونے کے لیے ہندوستان کی طرح کوئی حدِ عمر مقرر نہیں ہے۔ جس کی وجہ ناپسند ملازمت سے چپکے رہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر عمر میں لوگ پرانی ملازمت کو چھوڑ کر نئی ملازمت اختیار کر لیتے ہیں اور آجرین کو بھی ابتدائی دور میں تجربہ کار ملازم مل جاتے ہیں۔ البتہ وظیفہ کے لیے دو تین سال باقی ہوں تو نئی ملازمت ملنا ذرا دشوار ہوتا ہے۔ ملازمت میں شامل ہوتے ہی تنخواہ جاری ہو جاتی ہے۔ عام طور سے ہر پندرہ دن میں تنخواہ ملتی ہے۔ اسٹاف چاہے تو گھر پر چیک حاصل کر سکتا ہے یا پھر بینک میں ان کے کھاتے میں جمع کر دیا جاتا ہے۔

اسٹاف کے کسی ایک فرد کا انتخاب صرف اعلیٰ افسر نہیں کرتا بلکہ پورے ارکان اسٹاف جن کے ساتھ کام کرنا ہوتا ہے۔ اس انتخاب میں حصہ لیتے ہیں۔ اسی طرح افسر کے انتخاب میں بھی پورا اسٹاف شامل رہتا ہے۔ کسی کھلی شام میں سب مل کر اپنے افسر کو منتخب کرنے میں اپنی رائے دیتے ہیں۔

ملازمتوں کے مختلف زمرے ہوتے ہیں۔ سیول سروس کا اپنا باوقار مقام ہوتا ہے

اس کے علاوہ سنٹرل اور لوکل گورنمنٹ علیحدہ ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ گریجویٹ، نان گریجویٹ پروفیشنل کوالیفائیڈ اور نان کوالیفائیڈ اسٹاف کی بھی الگ حیثیت ہوتی ہے۔ تنخواہیں کافی ہوتی ہیں۔ ٹیکس بھی اسی مناسبت سے عائد کیے جاتے ہیں۔ لیکن قرضہ اور الاؤنس وغیرہ کی کافی سہولتیں دی جاتی ہیں۔

لندن اور دوسرے علاقوں میں الاؤنس میں فرق ہوتا ہے۔ ترقی دینے میں کھلے دل اور کھلے ذہن سے کام لیا جاتا ہے۔ ڈگریوں پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا بلکہ واقعی کام کو دیکھا جاتا ہے۔ دفتر کا ماحول بھی خوشگوار ہوتا ہے۔ مسائل کے حل کے لیے لنچ اور پارٹیوں سے کام لیا جاتا ہے۔ خصوصی تنخواہوں اور پنشن کے لیے پیروکاری کی ضرورت نہیں ہوتی یہ سلیمہ کے تجربات تھے جو انہوں نے کافی طویل ملازمت سے حاصل کیے۔ وہ صحیح معنوں میں اچھی بیوی اور اچھی ماں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باشعور اور ذمہ دار شہری کے طور پر انگلستان میں سماجی خدمت میں اپنا ایک خصوصی مقام حاصل کر چکی ہیں جو ان کی محنت، لگن اور کام سے خلوص کا نتیجہ ہے۔

جامعہ دارالعرفان کا مرتّبہ آسان دینی تعلیمی نصاب

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں پھولو   جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو
پر قول یہ حضرت اکبر کا رہے یاد   اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

عصری تعلیم اور ٹکنیکل تعلیم کے ساتھ اپنے طور پر قرآن مجید سمجھ کر پڑھنے کے علاوہ سیرت النبی اور اسلامی احکام کا مطالعہ بھی تدریجی طور پر جاری رہے تو انشاء اللہ ہم دین و دنیا کی نعمتوں اور برکتوں سے کماحقہ مستفید ہوتے رہیں گے اسکے لیے جامعہ دارالعرفان کے مرتبہ آسان نصاب سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

سیرت النبی کے امتحانات کے لیے مختصر سیرت النبی کی دو کتابیں ڈھائی روپیہ اور ایک روپیہ میں حاصل کی جاسکتی ہیں جو ادارہ ہذا کی جانب سے شائع ہوئی ہیں۔

ماہ جنوری کے آخری ہفتہ میں سیرت النبی کے زبانی و تحریری اور ماہ اگست میں آسان قرآنی امتحانات کے لیے تیار رہیں تفصیلات دفتر جامعہ دارالعرفان لال ٹیکری سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ خواجہ حمید احمد منتظم جامعہ دارالعرفان

عابد صدیقی

قومی ترقی اور باخبر سماج کی تشکیل

دنیا کے نامور دانشور اور صحافی ڈاکٹر میکلوہان نے کہا تھا کہ کسی پیغام کے مقابلے میں اس کو پہنچانے والے واسطہ یا میڈیم کو نمایاں اہمیت حاصل ہے کیونکہ پیغام خواہ کچھ بھی ہو اگر اس کے لیے مناسب میڈیم استعمال نہ کیا جائے تو وہ فرد یا سماج پر زیادہ اثرات مرتب نہ کر پائے گا۔ ہر موثر میڈیم ہمارے علم اور افکار کو وسعتیں فراہم کرتا ہے بلکہ غور و فکر کے سانچوں کو تبدیل کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ ذرائع ابلاغ کے ارتقاء کی پوری تاریخ کا جائزہ لیں تو اس نظریہ کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ روایتی ذرائع ابلاغ سے لے کر الکٹرانک ترسیلی نظام تک میڈیم نے ہمیشہ انسانی قافلوں کی رہنمائی کی ہے۔ چنانچہ آج الکٹرانک کے ترسیلی نظام کے باعث دنیا کی وسعتیں ایک مختصر سی کائنات میں سمٹ گئی ہیں۔

ان محیر العقول ترقیاتی سرگرمیوں کے باوجود ہمارا ملک ذرائع ابلاغ کے شعبہ میں ترقی پذیر ملکوں کی صفوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ابھی ملک کی آبادی کی اکثریت اخبار، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی نعمتوں سے تقریباً محروم ہے۔ ان کے لیے ملک میں رونما ہونے والے واقعات بیرونی ملکوں کی صورت حال اور ہماری معاشی سیاسی اور سماجی زندگی کے نشیب و فراز کو جاننے کے ذرائع انتہائی محدود ہیں۔ حکومت نے عوام کے لیے کئی منصوبے اور پروگرام شروع کر رکھے ہیں لیکن ان کا پورا علم عوام کو نہیں ہے۔ دیہی علاقوں میں یہ بت حال اور بھی افسوس ناک ہے۔ وہاں کے عوام اپنی لاعلمی کے باعث درمیانی لوگوں کے استحصال اور مفادات کا شکار ہوتے ہیں۔ اگرچہ کچھ دیہی علاقے اب تعلیم سے آراستہ ہو رہے ہیں۔ اور اخبار بھی ان تک پہنچنے لگا ہے۔ لیکن اخبار چند محدود افراد تک پہنچتا ہے۔ پھر ہمارے اکثر اخبارات سیاسی حالات سے بھرپور ہوتے ہیں۔ ان میں سرکار کے منصوبے اور ترقیاتی سرگرمیوں کے لیے جگہ کم ہوتی ہے۔ ہماری تعلیم کی شرح ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق صرف ۳۶٫۱۷ فیصد ہے۔ تعلیمی پسماندگی کے ماحول میں ایک باخبر سماج کی تشکیل کی خاطر

نہایت مشکل کام ہے۔ جدید دور میں صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ملکوں کو ہم باخبر معاشرے موسوم کرتے ہیں لیکن ترقی پذیر ملکوں میں یہ شعور ترقی کے لیے زیادہ ناگزیر ہے۔ کم صنعتی سماج کو صنعتی بنانا فرسودہ روایات اور توہمات سے نکال کر ان کے ذہن و فکر کو زیادہ عصری بنانا اور ان کی طرز زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش ہماری قومی ترقی کے استحکام کے لیے ناگزیر شرائط کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جمہوری ملکوں میں عوام کی بے خبری جمہوریت کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ جب عوام باخبر ہوں گے تب ہی وہ فیصلہ کا اپنا حق مناسب طور پر استعمال کر سکیں گے۔ انہیں فیصلہ کا جتنا حق حاصل ہے اتنا انہیں اپنے ملک کے حالات سے باخبر رہنے کا بھی حق حاصل ہے۔ بیسویں صدی کے آخری ربع سے دراصل اسی باخبر سماج کے آغاز کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ آج دنیا بھر میں علم کی رفتار ہوا سے قدم ملا رہی ہے کوئی ایسی چیز نہیں جو انسان کی تحقیق و تجسس اور باریک نگاہوں سے بچ سکی ہو ہر دن ایک نئی ایجاد اور ایک نئی دریافت سے علم کے خزانے معمور ہوتے ہی جا رہے ہیں اس لیے آج ہمارے والدین کو یہ شکایت ہے کہ بچوں پر تعلیم کا بوجھ بہت زیادہ عائد ہو گیا ہے جو ان کے دور میں نہیں تھا۔ درحقیقت ہمارے ملک کی حقیقی ترقی کے لیے حکومت کی جانب سے اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ پورے ہندوستانی سماج کو ہر اعتبار سے باخبر رکھا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے جنگی خطوط پر کام لیا جا رہا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں منعقدہ ریاستی وزرائے اطلاعات کی کانفرنس میں مرکزی وزیر اطلاعات مسٹر ایچ کے ایل بھگت نے کہا کہ جاریہ منصوبہ کے اختتام تک ملک کی ۷۰ فیصد آبادی ایک خصوصی منصوبہ کے تحت ٹی وی پروگراموں سے استفادہ کر سکے گی اس منصوبہ پر ۶۸ کروڑ روپیہ کا تخمینہ لیا گیا ہے۔

توقع ہے کہ انسات۔۱ (بی) کے ساتھ ہی اس نئے منصوبہ کی عمل آوری کا آغاز ہو جائے گا۔ انسات۔۱ (بی) سے ۱۹۰ ٹی وی ٹرانسمیٹرس مربوط کر دیئے جائیں گے اور اس طرح پورے ملک میں ٹیلی ویژن پروگرام کی سہولت کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ ٹیلی ویژن موجودہ دور میں ایک موثر اور طاقتور میڈیم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے اس پر زیادہ توجہ ضروری ہے۔ خاص طور پر ہمارے ملک میں جہاں ناخواندگی اب بھی زیادہ ہے اور اوسط خواندہ لوگوں میں بھی اخبار اور رسائل کے مطالعہ کا اس قدر شوق نہیں ہے۔ ٹی وی انہیں معلومات بہم پہنچانے، حالات سے باخبر رکھنے اور ان کی ذہنی تربیت و تفریح کے سامان کا باعث ہو سکتا ہے۔ چنانچہ حکومت نہ صرف

ملک بھر میں ٹی وی پروگراموں کی نشریات کا انتظام کیا جا رہا ہے بلکہ دیہی علاقوں میں کمیونٹی ٹی وی سیٹس بھی فراہم کیے جا رہے ہیں۔ چنانچہ چھ ریاستوں میں تقریباً چار ہزار کمیونٹی ٹی وی سیٹس فراہم کرنے کے لیے گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں ریاستی حکومتوں سے بھی خواہش کی گئی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ سیٹس خرید کر دور دراز کے دیہی علاقوں میں بھجوائیں تاکہ عوام کی ایک بڑی تعداد ٹی وی کے قومی پروگراموں سے استفادہ کر سکے۔ ٹی۔ وی لوگوں میں تعلیم کو عام کرنے کا بھی بہت بڑا ذریعہ ہے اس کے علاوہ ٹیلی ویژن تیار کرنے والی کمپنیوں کی بھی حکومت کی جانب سے خاطر خواہ حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔

ٹیلی ویژن کے قومی پروگرام میں وقت کا اضافہ، علاقائی زبانوں کے پروگراموں کے لیے درکار وقت کی فراہمی اور بعض دیگر امور سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت اس کام کے سلسلہ میں کس قدر سنجیدہ ہے۔

ٹیلی ویژن کو ترقی دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ریڈیو کی اہمیت سے انکار کیا جا رہا ہے بلکہ ریڈیو پر بھی خاطر خواہ توجہ دی جا رہی ہے۔ چنانچہ ۱۹۸۴ء کے دوران میں آل انڈیا ریڈیو مزید کئی ٹرانسمیٹرس قائم کرے گا اور کڑپہ ریڈیو اسٹیشن ایک سو کلو واٹ طاقتی ٹرانسمیٹر کے ذریعہ کڑپہ کے علاوہ محبوب نگر، اننت پور، کرنول، نیلور، چتور، پرکاشم اور کرناٹک کے ضلع کولار کا احاطہ کرے گا۔

ملک میں اخبارات اور فلم پر عام طور سے خانگی کنٹرول ہے جبکہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر سرکار کا کنٹرول ہے اس لیے حکومت چاہتی ہے کہ ان دو اہم ذریعوں کو موثر طور پر استعمال کیا جائے تاکہ ملک کے کونے کونے میں عوام کو ان منصوبوں سے واقف کرایا جا سکے جو ملک کی ترقی، کامیابی اور خوشحالی کے لیے طے کیے گئے ہیں۔ آج ہمارے ملک کی ایک بڑی آبادی ملک میں ہونے والی تیز رو تبدیلیوں سے واقف ہے۔ ہمارے معصوم عوام اور بالخصوص دیہاتوں میں بسنے والے نوجوان مفادات حاصلہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ فرقہ پرستوں کے دام فریب میں آ جاتے ہیں اور ان قوتوں کے اکسانے پر اپنی سیکولر روایات اور مشترکہ قدروں کو پامال کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ صورت حال اب تک شہروں میں تھی لیکن اب فرقہ پرستی کا سیلاب دیہاتوں تک بھی پہنچ رہا ہے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کی مدافعت ضروری ہے۔ صبح سے شام تک ریڈیو ٹیلی ویژن کے ذریعہ قومی ترقی کے ساتھ ساتھ ہمیں اس کلچر کو بھی پیش کرنا ہوگا جس کلچر کی نمو

میں ہندو مسلمان، سکھ اور دوسروں کے خون کی چمک اور پسینہ کی خوشبو صاف جھلکتی نظر آتی ہے۔ قومی یک جہتی کے بغیر ہماری قومی ترقی کا تصور کبھی نہیں کیا جا سکتا اس لیے حکومت ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ قومی یک جہتی کی مناسب تشہیر کا پروگرام رکھتی ہے۔ ٹی وی کی توسیع کے بعد ۲۶ کروڑ ہی عوام اس الکٹرانک میڈیم کے ذریعہ اس پیغام کو دیکھ اور سن سکیں گے جو ہر ہندوستانی دل کی دھڑکن ہے۔

ہندوستانی سماج کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ یہ ابھی تک روایتوں کا اسیر ہے اور مذہب، زبان، علاقہ اور ذات پات کے نام پر استحصال پسند قوتیں بہ آسانی اسے اپنے دام میں پھانس لیتی ہیں۔ چور بازاری، رشوت ستانی، جہیز کا لین دین اور دوسری کئی برائیاں ہمارے سماج میں نفوذ پکڑ چکی ہیں۔ ان برائیوں کے خاتمہ کے لیے عوام کو باشعور رکھنا اور ان کی ذہنی تربیت کا کام کرنا ضروری ہے۔ اس میں سے اکثر امور محض نا واقفیت کا نتیجہ ہیں۔ ایک باخبر اور باشعور شہری ہی ان تمام برائیوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لیے موجودہ ہندوستانی سماج کو باخبر منظم اور متحرک رکھنے کے لیے ہمارے ذرائع ابلاغ کو موثر رول ادا کرنا ہوگا۔ تاکہ ہم بھی ترقی یافتہ ملکوں کے معاشروں کی طرح ایک باخبر سماج informed society کہلائیں گے۔ ہماری ساری کوششیں اسی منزل کے حصول کی متلاشی ہیں۔ آزادی کے ۲۷ ویں سال میں قدم رکھتے ہوئے ہر ذمہ دار شہری کو سوچنا ہوگا کہ وہ ملک کی ترقی میں کس حد تک اپنا حصہ ادا کر سکتا ہے۔ جب تک ہم کسی تحریک کا حصہ نہیں بن جاتے ہیں اس کے ثمرات سے استفادہ کا حق نہیں پہنچتا ـــــ کیا اس قومی احساس کو پیدا کرنے کے لیے باخبر سماج کی ضرورت درپیش نہیں ہوگی!!

۸۸

جلتے تو تھے چراغ مگر روشنی نہ تھی
تم آگئے تو رونق کاشانہ ہو گئی

وہ کسی کے ہیں میں کسی کا ہوں مگر ایک ربط ہے آج تک
وہی احتیاط نگاہ ہے، وہی احتیاط کلام ہے

دل کی بربادی بھی کتنی کیف آگیں تھی شہید
اس نے جب نظریں جھکالیں میں اسے دیکھا کیا (شہید بدایونی)

شیخ رحمٰن اکولوی

ڈاکٹر عبدالغفور سے ایک انٹرویو

س ۔ اپنی تعلیم و تربیت اور ملازمت کے بارے میں کچھ بتائیے ۔

ج ۔ بی ۔ ایس ۔ سی (آنرس)

عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ سائنس میں بذریعہ اُردو ہوئی ۔ پھر یہ سلسلہ سیول سروس کی کلاسس تک جاری رہا ۔ عملی تربیت برٹش انڈیا میں ہوئی اور بالآخر یو ۔ این ۔ او کی فیلوشپ پر ختم ہوئی ۔ فیڈرل سیکوریٹی ایجنسی واشنگٹن (ڈی ۔ سی) نے پبلک ویلفیر اڈمنسٹریشن کا ڈپلوما اور میرٹ اوارڈ عطا کیا ۔ تعلیم کا سلسلہ ابھی ختم ہوا ہے نہ ہو گا ۔ تعلیم سے بڑھ کر تربیت ہوتی ہے ۔ میرے والد محترم نے اس ضبط و تنظیم سے میری تربیت کی کہ مجھے اپنی زندگی میں وہ سب ملا جس کی میں تمنا کر سکتا تھا اور ایسی کوئی حسرت نہیں ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ سے گلہ کر سکوں ۔ ابھی حال ہی میں بمبئی یونیورسٹی نے مجھے اپنے اردو مقالے " اردو طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ " پر پی ایچ ڈی تفویض کی ہے ۔

سچ پوچھیے تو میں نے ملازمت کی ہی نہیں ۔ اور نہ افسری کی ہے ۔ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو اہلکار یا در خدمت گذار سمجھا ۔ سیول سروس کا رکن ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو سیول سرونٹ ہی سمجھا بعد کو یہ انڈین اڈمنسٹریٹیو سروس میں تبدیل کر دی گئی ۔ اس لحاظ سے ایڈمنسٹریٹر کا روپ دھار لیا اور بالعموم جس طرح کی ذمہ داریاں عاید کی جاتی ہیں میں نے سنبھالیں ۔

س ۔ آپ کی پہلی مزاحیہ تخلیق کون سی ہے ؟ مزاح نگاری کی طرف طبیعت کس طرح مائل ہوئی ؟

ج ۔ بچپن میں نشر گاہ لاسلکی حیدرآباد سے کچھ نہ کچھ ہنسنے ہنسانے کی باتیں سن لیا کرتا ۔ پہلا مضمون شیر کا شکار تھا ۔ یہ خیر نہ تو میرا تھا نہ میں نے شکار کیا تھا ۔ بلکہ اپنے بزرگوں کے ساتھ رہ کر جو کچھ دیکھا تھا اُس کے مضحک پہلو بیان کیے تھے ۔ پھر انگریزی میں سوشیالوجی ۔ انتھراپالوجی میں تصنیف کا سلسلہ چلتا رہا ۔ اور یہ کمند اس وقت ٹوٹی جب دوران ملازمت اتنی تبدیلیاں ہوئیں کہ کوئی مضمون

یا موضوع قابو میں نہیں رہا۔ تب تو اپنے عشق اُردو کی طرف رجوع ہونا پڑا۔ طنز و مزاح کی طرف میں نے توجہ مرکوز نہیں کی بلکہ طنز و مزاح نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں نے پایا کہ ہر قدم پر آدمی کو مزاح و ظرافت ملتے ہیں بشرطیکہ اس کے مزاح کی حس تازہ دم رہے اور اس میں حسِ لطیف کی کمی نہ ہو۔ ہمارے کسی عزیز کی ننھی منی لڑکی اپنے والدین کے ساتھ آئی تو ہم نے کہا۔ "اسے بھی اگر کچھ چاکلیٹ تو دینا۔ ملاقات کی گرم جوشی میں ہماری بیگم نے یہ بات ٹھیک سے نہیں سنی پھر سلسلۂ گفتگو ایسا چلا کہ سب ہی مصروف ہوگئے۔ کچھ دیر بعد اس بچی نے چاکلیٹ والی بات یاد دلانے کی خاطر کہا "انکل کی بات تو کوئی سنتا ہی نہیں"۔ اس طرح کے سیکڑوں واقعات اور مضحکات ہوتے رہتے ہیں جنھیں طنز و مزاح۔ ظرافت۔ بذلہ سنجی وغیرہ کی صنف میں جکڑا جاسکتا ہے۔ اور جن سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔

س۔ آپ کی تصنیف شگوفہ زار کو ناقدین نے سراہا ہے۔ خود آپ کا اپنی تخلیق کے متعلق کیا خیال ہے؟

ج۔ میں نے محسوس کیا کہ ناقدین جب طنز و مزاح پر لکھتے ہیں تو صرف یہ بتاتے ہیں کہ شفیق الرحمٰن کی تحریروں میں کیا خاص بات ہے۔ راجہ مہدی علی خاں کی پیروڈی کیسی ہے۔ رضا نقوی واہی کا مزاحیہ کلام کس نوعیت کا ہے۔ کرشن چندر کا انداز بیان کیسا ہے اور شاعروں اور ادیبوں کے چٹکلے بتاڈالتے ہیں۔ ان کو طنز و مزاح کے کسی خاص فریم ———— میں نہیں بٹھاتے۔ اس ضرورت اور اس کی کمی کو پورا کرنے کی میں نے کوشش کی ہے۔ جس کو سب نے سراہا اور سنگ میل قرار دیا۔ شگوفہ زار کو میں شاہکار نہیں اپنا کارنامہ ضرور سمجھتا ہوں۔

س۔ ادب میں نئی نسل کے نام پر جو جھگڑا کھڑا ہوگیا ہے اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔

ج۔ نئی نسل کیا چیز ہے۔ نئے اور پرانے میں حد فاصل کہاں ہے کوئی نہیں بتا سکتا۔ خط استوا کی طرح یہ بھی ایک نظریاتی حد بندی ہے۔ ہے بھی اور نہیں بھی۔ جہاں اختلاف رائے ہو تو وہ دیوار کھڑی ہو جاتی ہے۔ ایک طرف روایتی دقیانوسی خیالات والے صف آرا ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف نئی سوچ۔ اپج اور جولانی طبع والے۔ میری رائے میں نئی نسل والے وہ ہیں کہ جو فراریت کی طرف مائل ہیں۔ جو پرانی باتوں اور پرانے ماحول سے بور ہو چکے ہیں۔ بعض کسی ضرورت کے تحت۔ بعض خواہ مخواہ اسی طرح کہ جیسے اچھے بھلے گھرانے میں نوجوان ہپّی بن جاتے ہیں۔ ہمارے نوجوان طبقہ میں بغاوت کے جذبات ابھرتے ہیں۔ اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ان کا تعلق نئی نسل سے ہے، بہت سارے کرتب دکھاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ ان کی کرامات ہیں۔ اور وہ ان کے مظہر ہیں بلکہ مظہر العجائب

ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی انفرادیت اور شخصیت کو پہلے قدم سے ہی منوانا چاہتا ہے۔ جن میں خداداد صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ بے شک کامیاب ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اپنی لکیر آپ پیٹتے ہیں اور دوسروں کو لکیر کا فقیر سمجھتے ہیں۔

س۔ فن اور مواد میں آپ کے نزدیک کیا فرق ہے؟

ج۔ فن اور مواد میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ فن صلاحیت کا مظہر ہوتا ہے۔ وہ فن کا کو بڑا بناتا ہے۔ اہلیت کو اجاگر کرتا ہے۔ جس پر فن کاری اور صناعی کی مدد سے شاندار عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے بشرطیکہ اس کا استعمال چابکدستی سے کیا جائے۔ ورنہ وہ ایک پلندہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

س۔ موضوع کے انتخاب کے محرکات کون کون سے ہیں؟

ج:۔ موضوع کا جہاں انتخاب ہوتا ہے وہاں پر ان کے اطراف ایک فصیل کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور پھر اپنی فکر و دانش کو اسی میں محصور کرنا پڑتا ہے۔ البتہ کبھی کبھی مشاہدہ موضوع کو از خود پیش کر دیتا ہے یوں بھی ہوا ہے، پر مزاج کی رگ پھڑکتی ہے تو شعور موضوع کا ایک ہیولا کھڑا کر دیتا ہے۔ اس لیے یہ امر واقع ہوتا ہے۔ تجربہ، صورت، واقعہ یا سانحہ ایک طرح کی امیجری کر دیتا ہے۔ اس وقت جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ تناظر یا خاکہ نگاری کا پیکر اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی تمثیل اس طرح دیا جا سکتی ہے کہ کسی کی نظروں کے سامنے ایک مچھلی رکھ دی جائے اور اس سے کہا جائے کہ اس پر ایک مضمون لکھے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں وہ مچھلی کے ظاہری اور جسمانی تصور کو الفاظ کا جامہ دے سکے گا۔ برخلاف اس کے کوئی اور صاحب بصیرت اپنے مشاہدہ، اپنے تصور، اپنی امیجری کے زور پر کچھ باتیں شعور اور لاشعور اور فکر سے دماغ میں سجاتا ہے۔ پھر اسلوب تحریر اور نگارش قرطاس کے کچھ صفحے کالے کرتا ہے۔ موضوع خود بہ خود سنورتا ہے اور بالآخر ایک انشائیہ۔ افسانہ یا شعری تخلیق جنم لیتے ہیں۔ یہ ہے اصل موضوع۔

س۔ کیا آپ نے کبھی اپنے فن کا محاسبہ کیا ہے؟

ج۔ اپنی تحریروں اپنے مزاج کا محاسبہ میں خود کرنے بیٹھوں تو اتنی ساری دماغی الجھنوں میں مبتلا ہو جاؤں گا کہ آئندہ قلم اٹھانا بھی محال ہو جائے گا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہر شخص روزانہ یا وقتاً فوقتاً اپنے ضمیر کو للکارتا ہے۔ ذرا یہ تو بتا ناکہ میں نے کیا گناہ کیے ہیں۔ میں نے تو ہمیشہ قلم برداشتہ لکھا ہے۔ اور لکھنے کے بعد ایک نظر صرف اس غرض سے ڈالی ہے کہ کہیں کوئی ایسی بات ضبط قلم میں تو نہیں

اتنی جو کسی کے دل کو دکھ پہونچائے یا کسی اور معیار سے گھٹی ہوئی ہو۔

س : یہ کہاں تک صحیح ہے کہ صنف طنز و مزاح کو اب تک کوئی نقاد نہیں ملا ہے ؟

ج : اردو کے طنزیہ یا مزاحیہ ادب کو نقاد کی چنداں ضرورت ہی نہیں اس لیے کہ یہ جب روز مرّہ سے متعلق ہوگی تو پھر ہر قاری اور سامع اس کا نقاد ہے۔ اس لیے یہ خیال عام ہوگیا ہے کہ ادب کی اس صنف کے لیے کوئی نقاد نہیں البتہ میں یہ ضرور کہوں گا کہ طنز و مزاح کی اصناف اقسام یا انواع کی درجہ بندی اب تک نہیں کی گئی۔ میری شگوفہ زار اس سلسلہ کی پہلی کاوش ہے۔ اسی لیے کہ نقادوں نے مخصوص ادیبوں کی پذیرائی کی یا ان کی خامیاں چن کر نکالیں۔ کسی نے تنقید نہیں کی۔

س : مزاح کے محرکات کیا ہیں ؟

ج : خوش مزاجی، خوش مذاق اور شگفتگی، مزاح کے محرکات ہیں بذاتِ خود مزاح نہیں۔ شئے لطیف یا مزاح کی حس بھی محرکات ہیں۔ انہیں سے بذلہ سنجی پیدا ہوتی ہے۔ البتہ طنز کی قدریں علٰحدہ ہیں۔ وہ اصل میں جذبات و احساسات کے الٹ ہیں اور ان سے مزاح نہیں بلکہ ایک طرح کی بدمزگی پیدا ہوتی ہے۔

س : وِٹ (WIT) کی تعریف ؟

ج : وِٹ (WIT) بذلہ سنجی کا نام ہے اور یہ مزاح کی اعلیٰ ترین صنف ہے۔ جب تک آدمی دانش ور اور نہ ہو اس کی فکر اعلیٰ نہ ہو یہ صنف کسی کے قابو میں نہیں رہتی۔ اس کے لیے حاضر دماغی بھی لازمی ہے۔

س : آپ کن مزاح نگاروں سے متاثر ہیں ؟

ج : سچ پوچھیے تو میں مزاح نگاروں سے نہیں روز مرّہ کی عملی زندگی میں جو مزاح، ظرافت اور لطافت پائی جاتی ہے۔ اس سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہوں۔ مشاہدہ اور سماعت اپنے تابع ہوں تو ہر طرف مزاح ملتا ہے۔ ویسے میں ہر مزاح نگار کے اسلوب اور اس کی فکر و دانش سے متاثر ہوں اس لیے تو میں نے کامیابی سے تجزیہ کیا ہے۔

س : ادب میں جنس کی اہمیت پر روشنی ڈالیے ؟

ج : جنس زندگی کا لازمی جُز ہے۔ اس کو ادب سے علٰحدہ کرنا گناہ عظیم کا ارتکاب ہے۔ زندگی کی حقیقت پر کسی طرح پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ البتہ زبان و الفاظ کا صحیح انتخاب اور فحش نگاری سے اجتناب ضروری ہے۔ اسی طرح حسن و عشق بھی لوازمات زندگی میں سے ہیں ادب سے اس کو خارج نہیں کیا جاسکتا۔

س : کیا آپ اردو کے مستقبل سے مطمئن ہیں ؟

ج : اردو کے مستقبل سے میں ہر طرح مطمئن ہوں۔ بالخصوص (ہندی) فلموں نے اس کو زبردست سہارا دیا ہے۔ غزل، قوالی اور گیت کی مقبولیت اس کا ثبوت ہے۔

س : نثری نظم اور آزاد غزل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج : نثری نظم اور آزاد غزل کے تعلق سے میں اپنی رائے یہاں پیش نہیں کرنا چاہتا اس لیے کہ یہ موضوع ابھی اس دور سے گذر رہا ہے جہاں غائر مطالعہ کی ضرورت ہے اور سچ پوچھیے تو میں اس خصوص میں کسی قسم کی رائے دینے کا اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا۔

س : ایک عام خیال ہے کہ اردو اکاڈمیاں اردو کے کاز کے لیے کوئی ٹھوس کام نہیں کر سکی ہیں؟ اس ضمن میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج : یہ غلط ہے کہ اردو اکاڈمیوں کے ذریعہ کوئی ٹھوس کام نہ ہو سکا۔ جو اس خیال کے حامی ہیں آخر بتائیں تو سہی کہ اکاڈمیوں کو کیا نہیں کرنا چاہیے۔ اور کیا کرنا چاہیے۔ اردو ترقی بورڈ پر یہ الزام کیوں نہیں ۔۔۔ لوگ اس کی کارکردگی سے خوش ہیں تو اکاڈمیاں بھی تو وہی کر رہی ہیں۔ ریاستی اردو ٹکسٹ بورڈ ۔۔۔ کارکردگی پر کیوں نکتہ چینی نہیں کی جاتی۔ اکاڈمیوں سے کیا توقعات وابستہ ہیں۔ کوئی اس کی ۔۔۔ صراحت کرے تو اردو کے کاز کا بھلا ہوگا۔ البتہ ہمارا مطمح نظر اور مقصد بلکہ لائحہ عمل یہ ہونا چاہیے ۔۔۔ اردو کو عوام الناس میں مقبول کریں۔ اعلیٰ سطح پر ریسرچ مقالہ نگاری وغیرہ یونیورسٹی کے تفویض ۔۔۔ رنا چاہیے۔

اردو بولنے سمجھنے والوں کو رسم الخط سکھا کر ریڈرشپ بڑھانا ہمارا فرض اولین ہونا چاہیے۔ ۔۔۔ سلسلے میں اردو کا لکس۔ لنگوا فون بہت زیادہ کارآمد ہوں گے۔ ۔۔۔ یڈیا میں ویڈیو کیسٹ بہت زیادہ ممد و معاون ہوں گے۔ چنانچہ میں نے اردو انگریزی میں ایسے ۔۔۔ یسٹ تیار کیے ہیں جن کے ذریعہ آدھ گھنٹہ کے سبق کو ۴/۳ بار دیکھ کر اردو رسم الخط بآسانی ۔۔۔ یکھا جا سکتا ہے۔ یہ کمرشیل طریقہ پر پیش کیا جانا ضروری ہے تاکہ مغربی ممالک میں مقیم اور متوطن ۔۔۔ ردو داں اور ان کے بچوں کو سہولت میسر ہو۔

مقبول و معروف شعراء، ادباء دیبوں کو رقمی ایوارڈ کے عطا کرنے پر ان کے اعزاز میں کوئی ۔۔۔ ضافہ نہیں ہوتا۔ وہی رقم اردو کی ریڈرشپ کو بڑھانے پر خرچ ہونی چاہیے۔ البتہ اردو کے ۔۔۔ تعلیم یافتوں کو یونیورسٹی سے اعزازی پی ایچ ڈی یا ڈی لٹ زیادہ سے زیادہ تعداد میں عطا کیے جائیں۔ ۔۔۔ یہی مقصد پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کے ماسوا ہمیں چاہیے کہ ہم بار بار مذاکرے، مباحثے، مقالے ۔۔۔ دستے چاہئیں نہ کہ شخصیاتی۔

یوسف ناظم

تین خط

بکوان سے متعلق

(۱)

محترمہ! تسلیمات۔

کل کے اخبار میں کشمیری روغن جوش سے متعلق آپ کی تحریر پڑھی۔ نہایت خوب صورت ڈش ہے۔ اسے بغیر کھائے ہی اتنا مزا آیا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ یہ ڈش آپ کے ذہن میں آئی کیسے۔ کاش سب کو ایسا ذہن رسا ملتا۔ ارادہ ہے کہ اس سال کے دوران یہ ڈش ضرور پکا کر کھائی جائے لیکن اس میں چند باتیں وضاحت طلب ہیں۔ زحمت نہ ہو تو وضاحت کر دیجیے گا۔ آپ نے بکری کا گوشت استعمال کرنے کی ہدایت کی ہے۔ بازار میں پوچھا تو معلوم ہوا صرف بکرے کا گوشت بکتا ہے۔ ہر دکان دار نے یہی کہا کہ وہ اچھا گوشت تو دے گا لیکن گارنٹی نہیں دے سکے گا کہ گوشت بکری ہی کا ہے۔ ہو سکتا ہے بکرے کا ہو۔ میرا خیال ہے بکرے کا گوشت استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ دونوں کے گوشت میں ایسا کیا زیادہ فرق ہوگا۔

ہینگ کا ڈھیلا بھی مل جائے گا (آپ نے ڈھیلا ہی استعمال کرنے کے لیے لکھا ہے۔ یہ لفظ شاید آپ نے اس مصرع سے لیا ہوگا ع

کوئی ڈھیلے سے شمارے مرے دلوانے کو

لیکن اس کا سائز لکھ دیجیے گا جیسا کہ آپ نے دار چینی کے تعلق سے لکھ دیا ہے کہ ایک ایک انچ کے ۴ ٹکڑے ہوں۔ میں احتیاط کروں گا کہ دار چینی کے ٹکڑے ایک ایک انچ ہی کے ہوں۔ فٹ پٹری سے ناپ لوں گا) اور کوشش کروں گا کہ عروض کی کوئی غلطی نہ ہو۔ آپ نے پھینٹی ہوئی دہی بھی تجویز کی ہے۔ پھر دہی شکل ہو گئی۔ بازار میں کہیں بھی مونث دہی نہیں ملتی۔ یہاں تو

صرف وہی لکھتا ہے۔ ممکن ہے لکھنؤ میں بکتی ہو۔

آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس روغن جوش کو تندوری روٹی سے کھایا جائے۔ آخر کیوں۔؟ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ خود کھائیے اور احباب کو کھلائیے۔ اس کی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آئی۔ احباب ہی سے کیوں نہ کہا جائے کہ وہ اسے تیار کریں اور ہمیں بلالیں۔

ناچیز

روشن جہاں

(۲)

محترمہ۔ آداب

آپ نے "سبزی قورمہ" سے متعلق جو لٹریچر فراہم کیا ہے۔ یقین ہے کہ وہ کافی مقبول ہوگا۔ گوشت کافی مہنگا ہو گیا ہے تو کوئی خاص بات نہیں۔ کیونکہ ہر چیز مہنگی ہو گئی ہے۔ اچھا بھی تو نہیں ملتا۔ اس لیے خیال ہے کہ اب ہم آئندہ صرف سبزی کا قورمہ ہی کھایا کریں گے۔ ترکیب بھی آسان ہے یعنی پکانے کی ترکیب۔ آپ نے ۲ منٹ بھوننے اور ۳ منٹ پکانے کی اجازت دی ہے۔ یہ مناسب وقت ہے۔ اب دیکھیے نا۔ کشمیری روغن جوش کو دو گھنٹے تک دھیمی آنچ پر رکھنا پڑتا ہے۔ یہ بھی کوئی پکانا ہوا۔ آخر ان دو گھنٹوں میں ہم کیا کرتے رہیں گے۔ یہ پانچ منٹ والا سبزی کا قورمہ تو بڑے کام کی چیز ہے۔ آپ نے البتہ ترکاریوں کے انتخاب کے معاملے میں بڑی پیچیدگی پیدا کر دی۔ بیگن بھی آپ نے درمیانی سائز کے تجویز کیے ہیں اور آلو بھی درمیانی سائز کے۔ کیا آپ ان کا سائز نہیں بدل سکتیں۔ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ سبزیوں کو درمیانی سائز کے ٹکڑوں میں کاٹ لیا جائے۔ درمیانی سائز کے آلوؤں اور درمیانی سائز کے بینگنوں کو درمیانی سائز کے ٹکڑوں میں کیسے کاٹا جائے گا اور یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر آپ کو اس سائز پر کیوں اصرار ہے۔ ایک اور بات — آپ نے املی کے عرق پر بھی بہت زور دیا ہے۔ اس سے تو کھانسی ہو جائے گی۔ میں نے سوچا ہے اسے املی کے عرق کے بغیر ہی تیار کیا جائے۔ آپ نے یہ اچھا کیا کہ احباب کو بلانے کا مشورہ نہیں دیا۔

ناچیز

روشن خاں

(۳)

محترمہ۔ تسلیم۔

آپ نے پرانے باسمتی چاول کے زردے کی کیا اچھی ڈش تجویز کی ہے۔ میرے سپیشل ہمی دستر خوان۔

پک دستر خوان۔ رضیہ کا شاہی دستر خوان اور اس قسم کی کئی کتابیں موجود ہیں۔ ان کے مطالعے سے کافی جی بہلتا ہے۔ لیکن چاول کا زردہ بالکل نئی ڈش معلوم ہوئی۔ میں اب تک یہ سمجھتا تھا کہ زردہ چاول کے بغیر بھی تیار ہو سکتا ہے۔ اب غلط فہمی دور (بلکہ بہت دور) ہو گئی۔ آپ نے اس زردے میں سنترے کے چھلکے بھی استعمال کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ سنترے تو ایک خاص موسم میں پیدا ہوتے ہیں بلکہ سنترے فیملی پلاننگ کا شکار ہو گئے ہیں اور موسم میں بھی بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ ناگپور کے سنترے تو شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ اور اتنے مہنگے کہ خریدنے والے کی صورت اتر جاتی ہے۔ لیکن اب اتنے مہنگے نہیں معلوم ہوں گے کیونکہ اب تو چھلکے بھی زردے میں استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ یہ بتائیے اگر ان چھلکوں کو سکھا کر سوکھے کیا یوں کے ساتھ رکھا گیا تو یہ قابل استعمال رہیں گے یا نہیں؟ ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ زردہ صرف سنتروں کے موسم میں کھایا جائے۔

آپ نے یہ ڈش تیار کی ہی ہو گی۔ کتنے میں تیار کی جاتی ہے۔ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ آپ نے بھی مشورہ دیا ہے کہ یہ زردہ دوستوں کو بھی کھلایا جائے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کھانا پکانے کی ترکیب میں دوست احباب کہاں سے آجاتے ہیں۔ اگر یہ اتنے ہی ضروری ہیں تو انہیں اشیاء کی فہرست میں شامل کرنا چاہیے۔ کھانا پکانے کی ترکیب میں یہ زیب نہیں دیتے۔

ناچیز

روشن خاں

غبار ہو کے بھی آسی بھر گئے آوارہ :: جنونِ عشق سے ممکن نہیں ہے چھٹکارا

(آسی غازی پوری)

ضبط ہم سے مشکل تھا، ہو گئی خطا آخر :: اسقدر حسیں چہرہ اسقدر قریں چہرہ

(عیال میرٹھی)

اندھیری رات میں تارے فلک پر جب چمکتے ہیں

ہزاروں زرنگار آنچل تصور میں جھلکتے ہیں (ام حسن)

دل کا ہر گوشہ تمہاری یاد سے آباد ہے :: مجھ کو سب کچھ بھول جانے پر بھی سب کچھ یاد ہے

(عندلیب شادمانی)

ڈاکٹر محمد اعظم

ذیابطیس

پیٹ کے اندر بانقراس (لبلبہ) Pancreas ایک عضو ہے جو انسولین (Insuline) نامی ہارمون کا اخراج کرتا ہے جس سے بدن میں شکر کی مقدار میں باقاعدگی برقرار رہتی ہے۔ انسولین کی مقدار میں کمی یا اس کے اثر کی کمی سے خون میں شکر کی زیادتی ہو جاتی ہے۔ اور اس کا پیشاب سے اخراج ہوتا ہے نتیجتاً مرض ذیابطیس پیدا ہوتا ہے۔ حالت صحت میں ۲۴ گھنٹوں میں ۴۰ تا ۵۰ یونٹ انسولین بنتی ہے انسولین کی کمی سے جسم میں اور کئی تبدیلیاں آتی ہیں۔ کاربوہائیڈریٹ پروٹین، فیٹ، الیکٹرولائٹس اور پانی کا نظام بگڑ جاتا ہے۔ خون میں شکر وافر مقدار میں ہونے کے باوجود جسم کو شکر کی کمی لاحق ہو جاتی ہے Peripheral tissues میں گلوکوز کے استعمال کے لئے انسولین کا ہونا ضروری ہے لہذا انسولین کی کمی سے گلوکوز کا استعمال کم ہو جاتا ہے نتیجتاً جسم پروٹین اور فیٹ سے گلوکوز کے حصول کی کوشش کرتا ہے جگر سے گلوکوز کا اخراج ہوتا ہے - فیٹ کی تحلیل بڑھ جاتی ہے۔ اس طرح انسولین کی کمی سے پروٹین اور فیٹ کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، وزن کی کمی (Ketosis) کا پیدا ہونا اسی کا نتیجہ ہے۔ پیشاب سے شکر کا اخراج جسم سے پانی اور الیکٹرولائٹس کے نقصان اور کمی کا ذمہ دار ہے چھوٹی اور بڑی شریانوں میں خرابی پیدا ہو جانے سے شکر کی بیماری کے مریض کے گردے اور اعصاب میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں فالج ہارٹ اٹیک اور بیرون کی سٹرن جیسی خوفناک پیچیدگیاں بھی اسی کا نتیجہ ہو سکتی ہیں لہذا خون کا زیادہ میٹھا پن خطرناک ہے۔

اس مرض کی دریافت کے دعویدار چین مصر اور ہندوستان ہیں لیکن تمام شہادتیں اس امر کی تائید کرتی ہیں کہ سنسکرت کی قدیم کتابوں میں اس مرض کا حوالہ ملتا ہے ان کتابوں کا سنسکرت سے عربی میں ترجمہ ہوا پھر لاطینی میں۔ اس طرح یہ مغربی سائنس کا جز بن گیا۔ تین مشہور آیورویدک اطبا چرک، سسروتا اور واگ بھٹ نے اپنی کتابوں میں اس مرض کا ذکر کیا ہے

جیسے کہ کتاب کے مطابق چینی طبیبوں کی توجہ ان مریضوں کی طرف راغب ہوئی جن میں سوسروتا کا کہنا ہے کہ ان کی وجہ میں

میں پیشاب شیریں ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک یونانی اور رومی طبیب اس مرض سے لاعلم تھے۔ سترہویں صدی عیسوی کے اواخر میں اس مرض کے معالجہ میں غذا اور کاربوہائیڈریٹ کی کمی پر توجہ دی گئی اور اٹھارویں صدی کے اواخر میں پیشاب اور خون میں شکر کی موجودگی پر تحقیق کی گئی۔ مزید تحقیق کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ یہ مرض دراصل شکر کے استحالہ کا مرض ہے اور یہ نقص گردے اور پیشاب تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ عمومی ہوتا ہے۔

سب سے پہلے Von Heringe اور Minkovoski نے ۱۸۸۹ء میں Pancreas اور مرض ذیابیطس کے باہمی تعلق کا نظریہ پیش کیا۔ اس نے کتے کی جراحی کے ذریعہ کئے گئے۔ Pancreas کو نکال دیا جس سے ذیابیطس پیدا ہو گیا۔ ۱۹۰۱ء میں Opie نے یہ دریافت کیا کہ ذیابیطس کے مریض کا Pancreas دیکھنے میں غیر طبعی معلوم ہوتا ہے۔ اس مرض کے معالجہ کے لئے Pancreatic extract حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ بعد ازاں ۳۰ جولائی ۱۹۲۱ء کو درمیانی شب Best اور Bainting نے کتے میں Pancreas کی نالی کو بند کر کے تجربات کئے جس کی وجہ سے Pancreatic Juice کا راستہ بند ہو گیا جس سے ذیابیطس کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ان دونوں سائنس دانوں نے Pancreatic extract کو ایسے کتے کے جسم میں داخل کیا جس کا Pancreas پہلے ہی سے نکال دیا گیا تھا اور جو ذیابیطس کوما (coma) کی حالت میں تھا۔ Pancreatic extract کے داخل کرنے کے ایک گھنٹہ بعد شکر کی سطح خون میں گھٹ گئی اور کتا کوما سے صحت یاب ہو گیا۔ انسولین کی دریافت ہو گئی اور Bainting نے اس کے صلہ میں نوبل انعام حاصل کیا۔ ۱۹۲۶ء میں Abel نے انسولین کو قلمی شکل میں حاصل کیا۔ ۱۹۵۸ء میں کیمیا کے نوبل انعام یافتہ Fredric Sanga نے انسولین کی کیمیائی ساخت کی مکمل توضیح کی۔ ۱۹۶۷ء میں ایک اور نوبل انعام یافتہ Dorothy Hodgkin نے انسولین میں امینو ایسڈز کے طبعی خصوصیات کی گروہ بندی کی۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسولین کی دریافت و تیاری کے سلسلے میں سائنس دانوں نے تین نوبل انعام حاصل کئے۔ بہر حال ابھی تک انسولین کے اخراج کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوئی ہیں اور یہ بھی ٹھیک طریقے سے معلوم نہ ہو سکا کہ ذیابیطس کے دو نوع اور ماقبل دو نوع انسولین کی پیدائش اور اخراج میں تواتر کس طرح پیدا ہوتا ہے۔

ذیابیطس میں مبتلا ہونے والوں کی تعداد کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے ۱۹۸۵ء کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا میں ۱۲ کروڑ سے زیادہ لوگ اس مرض سے متاثر تھے جبکہ یہ ایک اندازہ ہے۔ کیونکہ تشخیص شدہ مریضوں کی تعداد غیر تشخیص شدہ مریضوں کی تعداد سے دگنی ہے اس مرض کا پھیلاؤ مغربی اور ترقی یافتہ ممالک میں زیادہ پایا جاتا ہے مثلاً کینیڈا اور جاپان میں ۵ فیصد اور ہندوستان میں ۲ فیصد۔ ایک تحقیق کے مطابق یہ مرض ۵ تا ۹ سالہ عمر والوں میں ۰.۵ فیصد ۲۰ تا ۲۹ سالہ لوگوں میں ایک فیصد اور اسی طرح بڑھتے بڑھتے ۴۰ سال سے زائد عمر والوں میں ۴ فیصد تک پہنچ جاتا ہے۔ ہندوستان کی شہری آبادیوں کے ۶.۲ فیصد مرد اور ۱۲.۶ فیصد خواتین اور دیہی علاقوں کے ۸.۱ فیصد مرد اور ۳.۷ فیصد خواتین اس مرض کا شکار ہیں۔ کیرالا کے کچھ قصبوں میں یہ مرض ۱۶ فیصد تک پہنچ گیا ہے۔ نیز یہ مرض سبزی خوروں میں بہ نسبت گوشت خوروں کے دوگنا ہوتا ہے چونکہ ان کی غذاؤں میں کاربوہائیڈریٹ کی وافر مقدار پائی جاتی ہے۔

ذیابیطس کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں۔ موروثی، وزن کی زیادتی، کام کی کمی، غذا کی زیادتی، تفکرات، موٹاپا اور انفیکشن۔ ایسے لوگ جن میں موروثی طور پر ذیابیطس ہونے کا احتمال ہو اگر وزن کی زیادتی، تفکرات، موٹاپا اور انفیکشن کا شکار ہو جائیں تو ذیابیطس وقوع پذیر ہوتی ہے۔ اگر شوہر اور بیوی دونوں شکر کی بیماری کے مریض ہیں تو ان کے تقریباً سب ہی بچے اس سے متاثر ہوتے ہیں اگر صرف شوہر یا بیوی اس مرض کا شکار ہوں تو سب بچے اس مرض کے پھیلاؤ میں حصہ لیتے ہیں یعنی carrier ہوتے ہیں۔ اور اگر ایک مرض میں مبتلا ہے اور دوسرا carrier ہے تو نصف تعداد میں بچے متاثر ہوں گے اور نصف carriers۔ اگر میاں اور بیوی دونوں carrier ہوں تو ایک چوتھائی مرض میں مبتلا ہوں گے، نصف carriers ہوں گے اور باقی چوتھائی غیر متاثرہ۔

حال ہی میں نو عمر بچوں کی ذیابیطس اور H.L.A tissue typing کے باہمی ربط کا علم ہوا ہے۔ ایسے بچے جن میں H.L.A Antigen پایا جاتا ہے اگر virus infection جیسے mumps کا شکار ہوں تو یہ ذیابیطس میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ یہ مرض ایک ہی محلہ اور ایک ہی کلاس روم کے کئی بچوں میں پھیل سکتا ہے۔ اسی لئے اسے خوشہ ذیابیطس clustered diabetis کہا جاتا ہے۔ کم عمری میں ہونے والی ذیابیطس کو Type 1 ذیابیطس کہا جاتا ہے اس سے ۲۰ فیصد مریض

متاثر ہوتے ہیں۔ اس میں خون میں انسولین کی کمی لاحق رہتی ہے۔ Type 2 ذیابطیس سے ۸۰ فی صد مریض متاثر ہوتے ہیں۔ ان کے خون میں انسولین خاطر خواہ مقدار میں پائی جاتی ہے۔ شاید خرابی اس کے عمل اور استعمال میں ہوتی ہو۔ ایسے مریض عموماً ۴۰ سال سے زیادہ عمر کے ہوتے ہیں۔ یہ خیال کہ ذیابطیس صرف امراء کا مرض ہے صحیح نہیں ہے۔ غریب اور کمزور طبقات میں بھی یہ مرض عام ہے۔

اس مرض کی تشخیص میں اکثر تاخیر ہوتی ہے اور بیشتر مریض اس سے بہت دنوں بعد باخبر ہوتے ہیں۔ ⅓ مریض ایسے ہوتے ہیں جن میں علامات یکدم نمایاں ہوتی ہیں مثلاً پیشاب کی زیادتی (مقدار و تعداد) پیاس کی زیادتی، بھوک کی زیادتی وزن کی کمی نیند کی زیادتی اور عام کمزوری۔ ایک تہائی مریض ایسے ہوتے ہیں جن میں علامات معمولی نوعیت کے ہوتے ہیں اور بتدریج پیدا ہوتے ہیں۔ اور عموماً نظر انداز کیے جاتے ہیں مثلاً غیر معمولی تکان، جسم میں درد، انگوٹھوں اور انگلیوں کا سُن ہوجانا، زخم کا دیر سے مندمل ہونا کم عمری میں دانت گرنا، بار بار عینک کی تبدیلی، باربار، بار بار موسمی بیماریوں کا شکار رہونا، عورتوں میں پیشاب کے مقام پر خراش، مردوں میں قوت باہ کی کمزوری، استادہ حالت میں چکر کا آنا، حاملہ عورتوں میں نومولود کے وزن میں غیر معمولی زیادتی ہیں۔ ایک تہائی مریض ایسے ہیں جو اس مرض کی پیچیدگی پیدا ہونے کے نتیجہ میں اپنے معالج سے رجوع ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک مریض کوما کی حالت میں دواخانہ میں شریک ہوتا ہے۔ کسی کے گردہ میں پیپ آنے سے گردہ کے اسپشلسٹ سے رجوع ہوتا ہے۔ بعض کی بینائی غیر معمولی طور پر کم ہوجاتی ہے۔ یا اچانک اندھاپن پیدا ہوجاتا ہے۔ جس سے وہ آنکھ کے ماہرین کے پاس رجوع ہوتا ہے۔ بعض اوقات ذیابطیس کی تشخیص پہلی بار فالج یا دل کے دورہ کے بعد ہوتی ہے۔ بعض کا مرض عمل جراحی سے قبل تشخیص پاتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مریض کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی اور اس کا مرض ریگولر میڈیکل چک اپ میں دریافت ہوتا ہے۔

مرض کی تشخیص کے لیے پیشاب اور خون کے امتحان کی رپورٹ درکار ہوتی ہے پیشاب کو چیونٹیاں لگنا ضروری نہیں ہے۔ پیشاب میں شکر کے بغیر بھی ذیابطیس ہوسکتی ہے اور پیشاب میں شکر ذیابطیس کے علاوہ اور دیگر حالات و امراض میں بھی آسکتی ہے پیشاب میں کبھی شکر اور Acetone پایا جاتا ہے۔ اگر ذیابطیس نہ ہو اور اسکی دوائیں دی جائیں تو اسکے نتائج

بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔

ذیابطیس میں جلد کا انفکشن عام ہے۔ چہرہ، سینہ، پیٹ، کمر کا زیرین حصہ، پیر کے انگوٹھے عام طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ اس کا راج پھوڑا شہرت رکھتا ہے۔ انفکشن کی بیماریاں خاص طور پر نمونیا، اور دق، گردہ کا انفکشن بھی بہت عام اور شدید ہوتا ہے۔ خون کا نالی اور بڑی شریانیں خراب ہو جانے کی وجہ سے آنکھ، گردہ، اعصابی نظام اور زیر متاثر ہو جاتے ہیں۔ ذیابطیس اندھے پن کا دوسرا اہم سبب ہے۔ موتیا بند اور نفسیاتی بیماریاں بھی عام ہیں۔ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں یہ موت کا تیسرا اہم سبب ہے ان مریضوں میں دل کا دورہ عام ہے۔

حاملہ عورتوں میں ذیابطیس حمل کے لیے ایک خطرہ ہے۔ حمل کے آخری ہفتوں میں **Ketoacidosis** کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ بچہ نسبتاً زیادہ وزنی ہوتا ہے۔ کبھی سیزرین زچگی ضروری ہو جاتی ہے۔ عام طور پر ٢٧ر٢٨ ہفتے گذرنے کے بعد E.C.S.O ضروری ہو جاتا ہے۔

ذیابطیس ایک قابل روک تھام بیماری ہے لیکن علاج میں مریض کا تعاون نہایت ضروری ہے۔ علاج کا مقصد یہ ہے کہ اس میں تکالیف کا ازالہ ہو، پیچیدگیوں کی روک تھام ہو، جسم کے معیاری وزن کو حاصل اور اسے قائم رکھا جائے۔ خون اور پیشاب میں موجود شکر پر قابو پایا جائے اور خون میں شکر کی کمی پیدا نہ ہونے دی جائے کیونکہ خون میں شکر کی کمی اس کی زیادتی سے کئی گنا زیادہ خطرناک ہے۔

ذیابطیس کے مقابلے کے لیے غذا کو مؤثر ترین ہتھیار کی حیثیت حاصل ہے، غذا کا مقصد موزوں مقدار میں تغذیہ رسانی ہے جو وزن میں اضافہ کے بغیر حرارت فراہم کرنے کے لیے استعمال ہو سکے۔ ایسے مریض کو وقت واحد میں زیادہ غذا نہیں کھانا چاہیئے۔
بلکہ اپنی غذا کو تین بڑے اور تین چھوٹے حصوں میں تقسیم کرنا ہوگا تاکہ جسم کو باقاعدہ وقفہ سے صرف ضرورت کے مطابق گلوکوز مہیا ہوتا رہے۔

غذائی اشیاء مثلاً گھی، تیل، مکھن، بالائی، بسکٹ، کیک، پیسٹری، پڈنگ، چاکلیٹ، آئس کریم، آلو، اروی، رتالو، موز، آم، انگور، پپیتا، پھل، چیکو، خربوزہ، کھجور، سیتا، مشروبات اور الکوحل پر پابندی ہوتی ہے۔ خشک میوہ، بادام، کاجو، پستہ، اخروٹ، کشمش، مونگ پھلی بھی اس تحدید میں شامل ہیں۔ موسمی، سنترہ، سیب، انار، جام، چاول، چپاتی، دالیں، انڈا، گوشت، مرغ، مچھلی، چقندر، دہی بتائی ہوئی مقدار سے زیادہ نہیں کھائی جا سکتی

کدو پالک، مولی، گوبھی، بند گوبھی، کھیرا، ککڑی، ٹماٹے، شلجم، پیاز، گاجر، کریلا، اور چقندر کے استعمال پر زیادہ تحدید نہیں ہے، ناشپاتی اور اناناس ایسے ہوتے ہیں جن میں کیلوریز نسبتاً کم ہیں۔ اگر چائے کم دودھ کے ساتھ بغیر شکر کے استعمال کی جائے تو اس پر بھی کوئی تحدید نہیں ہے اپنا وزن کم رکھیے، آہستہ چبا چبا کر کھائیے لیکن کم کھائیے۔ ذیابطیس کے مریض کو اپنی عمر، جنس، قد اور ساخت کے اعتبار سے اپنے معیاری وزن سے باخبر ہونا چاہیے۔ محدود کیلوریز کی غذا پابندی سے لی جانی چاہیے۔ یہ پابندی عمر بھر کے لیے ہے۔ پچاس فیصد مریض صرف غذا کے پرہیز اور وزن کو کم کرنے سے ہی ٹھیک ہوسکتے ہیں۔ پانچ چھ ہفتے بتائی ہوئی غذا پر سختی سے عمل کیا جائے اور اپنے وزن کو معیاری وزن تک گھٹا دیا جائے اور اس کے باوجود خون اور پیشاب میں شکر قابو میں نہ آئے تب دواؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔

ورزش ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔ خاص طور پر ذیابطیس کے مریضوں کے لیے ورزش علاج کا ایک جزو ہے۔ ورزش سے جسم میں شکر کا استعمال بڑھ جاتا ہے اور اس طرح خون میں شکر کی مقدار کم ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں ذیابطیس، ہائی بلڈ پریشر اور قلب کے امراض کے لیے یوگا کو بطور علاج رواج دیا جا رہا ہے۔

ذیابطیس کا دوا سے علاج ضروری ہو جائے تو مریض کو سرینج سے انسولین لینے کی ترتیب اور ترغیب دی جانی چاہیے۔ انسولین جلد کے نیچے یا گوشت کے اندر دی جاتی ہے نہ کہ جلد کے اندر ران کو لے، ہاتھ، پیٹ کے حصے عموماً استعمال میں آتے ہیں۔ بہت زیادہ ورزش اور کم غذا کے ساتھ زیادہ انسولین کا استعمال خطرے سے خالی نہیں۔ اس سے خون میں شکر کی کمی اک دم کمی ہو جاتی ہے اور اس کی علامات کی پہچان اور بلا تاخیر شکر کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ شکر کی کمی کی علامات شدید بھوک، پسینہ آنا، لرزہ، درد سر، بدن کا سفید پڑ جانا، بینائی کی کمی و اضطراب وغیرہ ہیں۔

ذیابطیس کے علاج میں گولیوں کا استعمال بے حد مقبول ہے ۳۰ فیصد مریض ان سے مستفید ہوسکتے ہیں، بازار میں کئی ناموں کی گولیاں ہیں اگر مریض خود اپنی پسند کی گولی منتخب کرلے اور اسے اندھا دھند استعمال کرے تو یہ خطرناک بات ہے۔

یہ سمجھنا قطعی غلط ہے کہ بدپرہیزی علاج انسولین گولیوں کی تعداد میں اضافہ کر لینا ہے ایسی ذہنیت والے مریض کا علاج مشکل ہے۔ مریضوں کو چاہیے کہ وہ ایسے خیال کو دل سے نکال دیں اور اپنے معالج کی تشخیص اور مشورے کے بغیر اپنا علاج آپ کرنے کی طرف ہرگز مائل نہ ہوں۔

اطہر نقوی

بلاسودی بنکنگ
ایک درویش صفت بنکر سے ملاقات

الائیڈ بنک آف پاکستان کے پریزیڈنٹ خادم حسین صدیقی ایک درویش منش انسان ہیں اور بنکنگ میں ان کا ایک منفرد اور مخصوص سٹائل ہے جس کی بنا پر وہ بنک کے عملہ میں ہی نہیں پبلک میں بھی مقبول ہیں، وہ مسلم کمرشیل بنک اور الائیڈ بنک پاکستان کے سینیر ڈائرکٹر اور پاکستان بنکنگ کونسل کے ہمہ وقتی ممبر بھی رہ چکے ہیں۔ بنکنگ کے پیشہ اور بنکنگ کے تعلیمی میدان میں آپ کی گرانقدر خدمات کے اعتراف میں انھیں اسٹیٹ بنک آف پاکستان کی طرف سے ایم اے مظفر گولڈ میڈل بھی دیا گیا ہے۔ وہ اسلامی کونسل کے اقتصادی ماہرین اور بینکرز کے پینل کے بھی رکن ہیں۔ اور بلاسودی بنک کاری کے نظام و فروغ میں انھوں نے نمایاں رول ادا کیا ہے۔ وہ اعلیٰ پایہ کے بنکار ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے عمدہ مقرر اور بہترین رائٹر بھی ہیں۔ خدمت خلق کا گہرا جذبہ رکھنے کی بنا پر وہ بیک وقت کئی رفاہی تنظیموں سے وابستہ ہیں، سوشیل کاموں میں ان کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ وہ صرف تین ماہ قبل کراچی لائنز کلب کے ممبر بنے تھے اور اب اس کے ڈائرکٹر منتخب ہو گئے ہیں۔ حال میں وہ لندن تشریف لائے تھے اس موقع پر سفیر نے انھیں انٹرویو کیا

س ۔ آپ کے دورہ برطانیہ کی غرض و غائت کیا ہے؟

ج ۔ میں اپنے رفقائے کار اور عملے کے ارکان کے ساتھ ہی نہیں، بلکہ اپنے بنک کے گاہکوں کے ساتھ بھی ذاتی طور پر رابطہ رکھنا پسند کرتا ہوں۔ اس سے ایک طرف باہمی اعتماد بڑھتا ہے

دوسری طرف کارکردگی سے کماحقہ آگاہی رہتی ہے۔ گزشتہ ایک سال کے عرصے میں یہاں الائیڈ بنک کے کام میں قریباً سو فیصد اضافہ ہوا ہے۔ جو کہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس لیے میرے لیے ضروری تھا کہ میں آکر اپنے رفقائے کار کو ذاتی طور پر مبارک باد دوں۔ پھر یہ ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں کی بینکنگ میں ترقی و فروغ کی نئی تدبیروں اور نئی حکمت عملیوں سے بھی استفادہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم نے پاکستان میں جو بلا سودی بینکاری کا نظام رائج کیا ہے۔ اس کی اعانت اور ترویج و اشاعت کے لیے بیرونی دنیا کو بھی اس نظام کی خصوصیات اور برکات سے آگاہ کرنا ضروری ہے۔ یہ دورہ انہی ملے جلے مقاصد کے لیے ہے۔

س : پاکستان میں سارے بنک نیشنلائزڈ ہیں، اس لیے ظاہر ہے کہ ان کے قاعدے قوانین اور طریق کار میں زیادہ فرق نہیں ہو سکتا، ان حالات میں آپ کا بنک دوسرے بنکوں سے کس طرح بہتر سروس پیش کر سکتا ہے، آخر آپ بہتر نتائج کس طرح پیش کر رہے ہیں۔

ج - ہم بنکنگ میں ذاتی تعلقات اور پرسنل سروس کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور دوسرے ادارے جو کام خاصی بڑی رقم خرچ کر کے انجام دیتے ہیں، ہم اپنی محنت کے بل بوتے پر معمولی خرچ پر انجام دے لیتے ہیں۔ اگر ہم سارے پاکستانی اخبارات و رسائل میں صرف ۴ × ۶ کا اشتہار دیں تو ڈیڑھ لاکھ روپے لاگت آتی ہے۔ اس کے مقابلے میں مختلف مقامات پر پریس کانفرنسیں کر لینے پر کوئی خاص خرچ نہیں اٹھتا لیکن ان کے اثرات اشتہارات سے بدرجہا زیادہ گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں نے بنک کو مقبول عام بنانے کے لیے یہی پریس کانفرنسوں کا طریقہ اپنایا۔ دوسرا کام یہ کیا کہ شہر شہر دورہ کر کے اپنے بنک کے گاہکوں کی میٹنگیں بلائیں اور ان کا اعتماد حاصل کیا۔ انھیں بتایا کہ اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود آپ کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دینے کے لیے پوری طرح کوشاں ہیں۔ بہر حال آپ ہماری سروس میں جو کمی پاتے ہیں اس کا برملا اظہار کریں کہ ہم اپنی کمزوریوں کو دور کر کے آپ کی اور بہتر خدمت انجام دے سکیں۔ اپنے گاہکوں سے رابطہ کے لیے میں نے پانچ ہزار خطوط انفرادی طور پر ٹائپ شدہ اپنے دستخطوں کے ساتھ بھجوائے۔ اس طرح کی کوششوں کے نتیجے میں ہماری بنکنگ میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔

س۔ کیا آپ کے بنک کا منافع دوسرے بنکوں سے زیادہ رہا ہے۔

ج - نیشنلائزڈ بنکوں میں الائیڈ بنک سب سے چھوٹا یونٹ ہے۔ اس لیے ظاہر ہے جو دوسرے بنکوں

کا منافع الاشتیۃ بنک سے زیادہ تھا

ہمارے بنک کی شرح منافع ۸ فی صد تھی جو کہ دوسرے بنکوں کی شرح منافع سے زیادہ ہے۔

س ۔ کیا پاکستان کے لوگ بلاسود بنکاری میں جوش و خروش سے حصہ لے رہے ہیں؟

ج ۔ جی ہاں اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف انہیں اطمینان ہوتا ہے کہ وہ بنکاری دینی حدود کے اندر کر رہے ہیں۔ دوسری طرف شرح منافع ½۸/۹ فیصد ہوتی ہے جبکہ عام سودی بنکنگ میں شرح منافع ½۶/۷ فیصد سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس سال ہمارے پاس غیر سودی بنکاری کے کھاتے ہیں۔ ۱۳۰۰ کروڑ رقم جمع ہوئی ہے۔ جو کہ ایک ریکارڈ ہے مجھے یقین ہے کہ بلا سود بنکاری میں اسی رفتار سے اضافہ ہوتا رہے گا۔

س ۔ ایک طرف سود بنکاری کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔ دوسری طرف آپ سودی کاروبار بھی چلا رہے ہیں۔ آخر آپ اس دورخی پالیسی کی کیا توجیہہ کرتے ہیں۔

ج ۔ بات یہ ہے کہ کوئی نیا نظام بھی بتدریج نافذ کیا جاتا ہے۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ پاکستان کے قیام کے ساتھ بلاسود بنک کاری کا نظام نافذ کر دیا جاتا۔ اس صورت میں کب سے پاکستان میں مکمل طور پر بلاسود بنک کاری کا نظام ہی کارفرما ہو گیا ہوتا۔ غنیمت ہے کہ جو کام پہلے سے ہونا چاہیے وہ اب ہو رہا ہے مجھے یقین ہے۔ آئندہ چند برسوں میں ہم پاکستان میں بنکنگ کو سود کی لعنت سے مکمل طور پر پاک کر لیں گے۔

س ۔ مگر ہماری معیشت میں غیر ملکی قرضوں کا زبردست مکمل عمل دخل ہے۔ آخر آپ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک ایسے اداروں سے بغیر سود کے لین دین کس طرح کریں گے۔

ج ۔ غیر ملکی بنکوں اور اداروں سے لین دین کرنے میں ہم بین الاقوامی بنکنگ کے قواعد کی پابندی پر مجبور ہیں۔ جب تک ہم بلاسود بنکنگ کے نظام کو پورے طور پر مستحکم کر کے دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی مقبول نہ بنالیں۔ دوسری قومیں اسے اپنانے پر تیار نہیں ہو سکتی ہیں۔

س ۔ کون کون سے اسلامی ملکوں میں اب تک بلاسودی بنکنگ شروع ہو چکی ہے اور اس کی ابتداء سعودی عرب، مصر اور عرب امارات وغیرہ میں سے کس ملک نے کی۔

ج ۔ بعض اسلامی ملکوں نے بلاسود بنکنگ شروع کی ہے۔ لیکن اسے حقیقی معنوں میں بلاسود بنک کاری کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ بس سود کا نام کمیشن رکھ دیا گیا ہے حقیقی معنوں میں بلاسود بنکاری پاکستان نے ہی شروع کی ہے۔ یہ بنکاری نفع یا نقصان میں برابر کی شرکت

کی بنیاد پر ہے۔

س ۔ آپ نے بلا سود بینک کاری کن شعبوں میں کی ہے۔ میرا مطلب ہے کہاں کہاں سرمایہ کاری کی گئی ہے۔

ج ۔ فی الحال ہم نے نسبتاً محفوظ شعبوں میں سرمایہ کاری کی ہے مثلاً گندم اور چاول کی ایکسپورٹ اور اسی قسم کے دوسرے کاموں اور حکومت کی زیر انتظام صنعتوں میں سرمایہ لگایا گیا ہے۔ لیکن ہمارا آئندہ پروگرام اس سرمایہ کاری کو وسیع کرنے کا ہے، اگلے مرحلے میں ٹیکسٹائل انڈسٹری کو مکمل طور پر بلا سود سرمایہ کاری کے نظام کے تحت لانا ہے۔ اسی طرح بتدریج اسلامی بنکاری کو زندگی کے ہر شعبے پر محیط کر دیا جائے گا۔

س ۔ چونکہ یہ سارا نظام بڑی حد تک اعتماد اور دیانت پر انحصار رکھتا ہے، اس لیے آپ کو یہ خدشہ نہیں ہے کہ بلا سود سرمایہ حاصل کرنے والی پارٹیاں نقصان دکھا کر بنک کو نقصان میں شریک بنانے کی سعی کریں گی۔ اس سلسلہ میں آپ کس طرح کے تحفظات پر تکیہ کرتے ہیں؟

ج ۔ بنکاری میں ایک عمر بتانے کے بعد بھی ہم اگر یہ نہ جان سکیں کہ کون سی پارٹیاں قابل اعتماد ہیں تو پھر ہم بینکر تو نہ ہوئے پھر ہم سارا کام اندھے اعتماد پر ہی نہیں چھوڑ دیتے بلکہ جہاں بنک سرمایہ کاری کرتا ہے وہاں اپنے نمائندے بھی مقرر کرتا ہے جو سارے منصوبے پر نظر ہی نہیں رکھتے بلکہ انتظامی امور میں بھی دخل رکھتے ہیں۔ اس لیے سرمایہ ڈوبنے کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ باقی کوئی بھی تجارت ہو اس میں نقصان کا احتمال تو ہوتا ہے۔ بعض اوقات بعض قدرتی اسباب کی بنا پر نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک تاجر کی طرح بینکر کی بھی پوری پوری کوشش یہی ہوتی ہے کہ بینک کو ہر حالت میں فائدہ ہی ہو۔

س ۔ برطانیہ اور دوسرے بیرونی ملکوں میں مقیم پاکستانیوں کی بلا سود بنکاری میں آپ کیا مدد کر رہے ہیں۔ اگر وہ یہاں سے پاکستان جا کر فیکٹری وغیرہ لگائیں تو کیا انہیں بلا سود قرضہ مل سکے گا۔

ج ۔ حکومت پاکستان نے بلا سود بینک کاری کے لیے وسیع پیمانے پر سہولتوں کا انتظام کر رکھا ہے۔ بینکرز ایکویٹی، انوسٹمنٹ کارپوریشن آف پاکستان، نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ، نیشنل ڈویلپمنٹ فنانس کارپوریشن، پاکستان، کویت فنانس کمپنی، پاکستان ہیبا ہولڈنگ ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن، یہ سارے ادارے بلا سود قرضہ مہیا کرتے ہیں۔ طریق کار یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ کاری کا کوئی بھی منصوبہ جب بنتا ہے تو سرمایہ کاری کی مدد کے لیے ان میں سے متعدد

اداسے مل کر ایک کنسورشیم بنا لیتے ہیں جس میں کوئی بنک بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اصل میں ایک ادارہ یا بینک کنسورشیم کا چیئرمین ہو جاتا ہے جو پورے منصوبے کی تکمیل اور اس کے طریقے پر چلنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ جو اصحاب پاکستان میں سرمایہ کاری کے خواہش مند ہوں ان کو اس سلسلے میں ساری معلومات اور ہماری پاکستانی سفارت خانوں سے مل سکتی ہے۔

س۔ بینکوں میں پیش آمدہ بدعنوانیوں کی رفتار کے ساتھ ساتھ پاکستان کے نادہندگان کی طویل فہرست کو دیکھتے ہوئے آپ بلاسود بینکاری میں رقومات ڈوبنے کا خطرہ نہیں کرتے؟

ج۔ پچھلے کچھ عرصے سے سپیشل کورٹس اور قاضی کورٹس کے ذریعہ بدعنوان افسروں اور کارکنوں کو عبرت ناک سزائیں دلوائی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں نادہندوں سے بھی رقومات بڑی حد تک وصول کر لی گئی ہیں۔ اس پس منظر میں ہم سمجھتے ہیں کہ اب پہلے جیسی بدعنوانیوں اور نادہندگیوں کا امکان بہت کم ہے۔ بہرحال اس سلسلے میں ہم پوری طرح چوکنا ہیں۔

س۔ بینکوں کے نیشنلائز ہونے سے بینکنگ میں کیا ایک جمود سا نہیں آگیا۔ کیا آپ اس امر سے اختلاف کریں گے کہ ایوب خاں مرحوم کا دور پاکستان کی صنعتی ترقی کا سنہری زمانہ تھا۔ اب سرکاری ہونے کی وجہ سے بینکوں میں مسابقت کا جذبہ بڑی حد تک ختم ہو گیا ہے۔ ان میں اگر بینکوں کو سرکاری تحویل سے آزاد کر دیا جائے تو بینکنگ اور اس کے ساتھ صنعتی واقتصادی ترقی کو فروغ ملے گا۔

ج۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایوبی عہد میں بینکنگ اور صنعتی ترقی کو بہت فروغ ملا مگر اس عہد میں بینکوں کے وسائل، بینک مالکان کی لگائی ہوئی صنعتوں اور ان کے اقتصادی پراجیکٹوں ہی میں استعمال ہوتے رہے۔ نتیجتاً بینک نیشنلائز ہونے پر بینک مالکان اپنا سرمایہ نکال کر بیرونی ملکوں میں چلے آئے۔ اب بینکاری کو قوم کی ہمہ گیر ترقی کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ زراعت، ڈیری فارمنگ وغیرہ کے شعبوں سے متعلقہ صنعتوں کی ترقی میں بھی بینک بھرپور حصہ لے رہے ہیں۔

س۔ اس وقت پاکستان میں کتنے غیر ملکی بینک کام کر رہے ہیں۔

ج۔ چوبیس غیر ملکی بینک کام کر رہے ہیں، جن کی ۵۳ برانچیں ہیں۔ چونکہ ان بینکوں پر ملک کی سوشل اور اقتصادی سروسز میں حصہ لینے کی پابندی نہیں ہے اس لیے وہ وہاں سرمایہ کاری کرتے ہیں جہاں کہ ان کو زیادہ فائدہ ہو۔ اسی طرح بجلی، ٹیلیفون، گیس، پی۔

وغیرہ کے بل اور فیسیں وصول کرنے سے بھی وہ آزاد ہیں لیکن ان کا کام آسان ہے اور وہ زیادہ ترقی کر رہے ہیں۔ یہ غیر ملکی بنک پاکستان کی بنکنگ کا دس فیصد حصہ ہے تاہم جبکہ ہمیں غیر منافع بخش سوشیل سروسز انجام دینے کے علاوہ سرمایہ کا ایک خاص حصہ زراعت اور ڈیری فارمنگ کے لیے وقف کرنا ہوتا ہے۔ بہرحال تمام باتوں کے باوجود ہم پرائیویٹ بنکوں کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ کہ ان سے مسابقت کے جذبہ کو تقویت ملتی ہے باقی یہ کہنا مشکل ہے کہ بنکوں کو ڈی نیشنلائز کیا جائے یا نہیں۔

س ۔ آپ کے خیال میں ملک کی صنعت، زراعت اور دیگر شعبوں کے فروغ و ترقی میں بنکنگ کا رول کس قدر اہمیت کا حامل ہے؟ اور ہمارے ملک میں بنکنگ اس سلسلے میں اپنے فرائض سے کس حد تک عہدہ برآ ہو رہی ہے۔

ج ۔ کسی بھی ملک کی صنعت، زراعت اور معیشت کے دوسرے شعبوں میں بنکنگ کا رول بہت نمایاں اور اہم ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں ایک وقت ایسا آیا تھا کہ بیشتر بنک منیجر نے سرمایہ مہیا کرنے کے لیے گاہکوں سے رشوت وصول کرنی شروع کر دی تھی۔ صرف وہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ بنکنگ پر اعتماد متزلزل ہوا ۔ مگر میں نے بنکنگ میں پائی جانے والی بدعنوانیوں کو ایک چیلنج کی طرح قبول کرتے ہوئے کچھ اپنے ہم خیال بنک افسروں کی مدد سے بنکنگ میں اخلاقیات اور دیانت کو بنیادی عناصر کی حیثیت سے داخل کرنے کے لیے جدوجہد کی اور کورسز میں ان امور کو زیر تربیت عملہ کے کردار کا لازمی حصہ بنانے پر توجہ کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان تربیتی مراحل سے گذرنے والے ارکان اور افسر مثالی کردار کے مالک ہیں اور وہ پاکستان یا مشرق وسطیٰ کے ملکوں میں جہاں جہاں بھی گئے ہیں اپنے کردار اور پیشہ ورانہ مہارت کی بدولت عزت کے مناصب پر فائز ہیں۔ اور میرے شاگرد جہاں جہاں بھی ہیں ۔ میں ان سے رابطہ رکھتا ہوں اور ان کے کردار کی نگرانی کا خیال رکھتا ہوں۔

س ۔ آپ اپنی زندگی کا کوئی خاص واقعہ سنائیں جس نے آپ پر کیا یادگار اثر چھوڑا ہو۔

ج میں اپنی عمر کے اس سال بھر کو زندگی کا بہترین حصہ خیال کرتا ہوں جو ہندوستان کی قید میں بسر ہوا۔ مشرقی پاکستان پر ہندوستانی افواج کے قبضہ کے وقت میں اور متعدد سویلین افسر بھی ہندوستان کے جنگی قیدی بن گئے تھے۔ ہم نے مہینہ بھر ادھر چھپ کر گذارنے کے بعد

اپنے آپ کو انڈین کراس کے حوالے کر دیا تھا۔ ریڈ کراس نے ہم تین سو کے لگ بھگ سویلین قیدیوں کو جن میں زیادہ تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی ــــــ رڑکی کے جنگی قیدیوں کے کیمپ میں پہنچا دیا۔ حبیب بینک لندن کے ہیڈ آفس پریذیڈنٹ احسان اللہ قاضی بھی میرے قیدی ساتھیوں میں شامل تھے۔

س۔ آپ دشمن کی قید کے زمانہ کو اپنی زندگی کا کیا حصہ کس طرح قرار دیتے ہیں۔

ج۔ یہاں مجھے پہلی مرتبہ یکسوئی سے عبادت کرنے اور قدرتِ خداوندی کے جلوے دیکھنے کے ساتھ انسانی فطرت کو تصنع اور خود فریبی کے لبادوں اور نقابوں سے آزاد و عریاں دیکھنے کا موقع ملا۔ اور پتہ چلا کہ حقیقت میں کون کیا ہے۔ یہاں میں نے ایک ڈائری بھی لکھی تھی جس میں میں نے زوال و شکست کے اسباب کا عینی شاہد کی حیثیت سے تجزیہ کیا تھا۔ میرے دوسرے سامان کے ساتھ یہ ڈائری بھی ہندوستانی فوج کے ہاتھ لگ گئی۔ یہ شدید بددیانتی ہوگی اگر میں یہ اعتراف نہ کروں کہ قید میں ہم سے نہایت اچھا سلوک روا رکھا گیا۔ میں نے وہاں اپنے قیدی ساتھیوں کو مایوسی اور شکستہ دلی سے بچانے کے لیے مختلف کھیلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ میں وہاں والی بال ٹیم کا کیپٹن تھا۔ مشاعروں اور قوالیوں کا اہتمام کیا۔ میں وہاں سے ایک رسالہ بھی نکالتا تھا جو میں خود ٹائپ کرتا تھا جس میں دینی و مذہبی تعلیمات، ادبی مضامین، چٹکلوں اور لطیفوں وغیرہ سے قید کے اداس ماحول کو زندگی سے وابستہ رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ چونکہ طباعت کی کوئی سہولت نہ تھی اس لیے ٹائپ شدہ کاغذوں پر مشتمل یہ رسالہ لوگ باری باری پڑھ لیتے تھے، غرضیکہ اس پریشان کن ماحول میں بھی ہم نے اپنے عزم و حوصلہ کے چراغوں سے افسردگی اور ظلمت کی رات کو تاباں و روشن رکھا۔ وہاں ایک دن ہندوستانی فوج کا ایک نوجوان سکھ میجر میرے پاس آیا اور سوال کیا کہ خادم حسین صدیقی آپ ہی ہیں۔ میرے اثبات میں جواب دینے پر کہنے لگا "میں نے آپ کی ساری ڈائری کا پڑھی ہے۔ اور بے حد متاثر ہوا ہوں۔ یہ آپ نے ۲۸ جون کے بعد ڈائری لکھنی کیوں بند کر دی؟" میں نے کہا معاہدہ کی بات چیت کے شروع ہوتے ہی جلدی پاکستان جانے کی امید پیدا ہو گئی اس لیے ڈائری لکھنے کی ضرورت نہ محسوس کی۔ دیکھنے لگا۔

آپ کی تحریر آپ کی ذہنی دیانت کی گواہ ہے۔ آپ مجھے سچ سچ بتائیں کہ اس زمانہ قید میں بھی ہمارے کسی افسر، سپاہی یا اہلکار نے آپ کی خواتین کی طرف بری نظر سے دیکھا؟ میں نے کہا یقیناً ہمیں ایسی کوئی شکایت کبھی نہیں پیدا ہوئی۔ کہنے لگا ہماری خواتین آپ کی قید میں ہوتیں تو کیا صورت حال یہی ہوتی یا اس سے مختلف؟ میں نے ندامت سے سر جھکا لیا۔

س : آپ کو رہائی کب ملی اور ڈائری کا کیا بنا؟

ج : میں چونکہ معذور بھی تھا اور ہنگامہ آرائی بھی زیادہ کرتا تھا اس لیے سال بھر کے بعد جب عورتوں اور بچوں کو رہا کیا گیا تو مجھے بھی ان کے ساتھ رہائی مل گئی اور سال کی قید کے بعد عید سے ایک دن پہلے ہم پاکستان پہنچ گئے۔ رہائی کے احکام لانے والے سکھ کیپٹن چڈھا نے جب میری چیزیں میرے حوالے کرتے ہوئے فہرست پر دستخط کرنے کو کہا۔ میں نے کہا جب تک ڈائری نہ ملے گی۔ دستخط نہیں کروں گا۔ اس نے بہت زور مارا کہنے لگا۔ "بادشاہو! کیوں ساڈی نوکری توں جواب دواؤ دا او" لیکن میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر بڑی دوڑ دھوپ کے بعد وہ کہیں سے ڈائری ڈھونڈ لایا۔ جو کسی مناسب وقت پر قوم کو پیش کر دی جائے گی۔

س : اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیے بنکنگ میں آپ کس طرح آئے۔

ج : میں لاہور میں ایک انتہائی غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ والد صاحب نے مجھے ابتدائی جماعتوں تک تعلیم دلوائی۔ پھر ٹیوشنز پر محلے کے بچوں کو پڑھا کر ایف اے تک تعلیم حاصل کی۔ اس دوران میں کچھ عرصہ خربوزے بھی بیچتا رہا۔ بعد ازاں ایک انشورنس کمپنی میں کام مل گیا۔ بنکنگ کا آغاز بنک آف انڈیا میں کلرکی سے کیا۔ عزم مستحکم اور رات دن کی مسلسل محنت کی بدولت اپنے کام میں خاصی مہارت حاصل کر لی۔ پھر حکومت پاکستان نے گریجویٹ بنکنگ کورس کو ٹریننگ کے لیے برطانیہ بھیجنے کے لیے ایک مقابلے کا امتحان منعقد کیا تو کامیاب ہونے والے امیدواروں میں میرا بھی نام شامل تھا۔ اس اسکیم کے تحت صرف ٹریننگ کے اخراجات حکومت نے ادا کرنے تھے۔ رہائش وغیرہ کے اخراجات خود برداشت کرنے تھے جو وقتی طور پر میرے ایک عزیز نے برداشت کیے۔ برطانیہ سے واپسی پر نیشنل بنک آف پاکستان میں بطور جونیئر آفیسر ملازمت شروع کی اور اپنی محنت اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آج اس مقام پر ہوں۔

س : آپ نے اپنے اپاہج ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟

ج ۔ لیکن ملازمت ہی میں میری ایک ٹانگ میں تکلیف شروع ہوئی۔ علاج کے لیے بہت گیا مگر سرجنوں کے مطابق سوائے پوری ٹانگ کاٹ دیئے جانے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اب میں مصنوعی ٹانگ سے کام چلا رہا ہوں۔ ٹانگ سے محرومی کے باوجود مجھے شاہراہ حیات پر مسلسل آگے بڑھنے میں کوئی دقت محسوس ہوتی۔ نہ ہی یہ کمی کبھی درگاہ رب العزت میں سجدہ ریز ہونے میں رکاوٹ بنی ہے۔

س ۔ آپ ایک ماہر بینکر ہی نہیں بلکہ اسم بامسمیٰ ہیں اور صحیح معنوں میں خادم خلق بھی ہیں۔ آپ کے نزدیک وہ کون سے درخشاں اصول ہیں کہ جن کو کامیاب زندگی کی ضمانت قرار دیا جاسکتا ہے۔

ج ۔ جس اصول پر میں نے عمل کیا اور نوجوانوں کو جس کی تلقین کرنا چاہوں گا وہ یہ ہے کہ اپنے فرائض اپنے ہی ضمیر کے اطمینان کی حد تک پورے کرو کامیابیاں تمہارے قدم چومیں گی۔

(سفیر لندن سے ماخوذ)

ذیابطیس کے مریضوں کیلئے شکر کے عام استعمال کے امکانات روشن

ہریانہ اگریکلچر یونیورسٹی میں حالیہ تحقیق سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ غذا میں ریشہ دار عناصر کی مقدار کی کمی سے ذیابطیس کا عارضہ پیدا ہوتا ہے۔ غذا کے کسی اور جزو حتیٰ کہ شکر سے بھی اس عارضہ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ محققین کا کہنا ہے کہ ایسی غذا جس میں ریشہ کی کافی مقدار ہو اس میں شکر شامل کی جائے تو خون کا شکر (گلوکوز) میں کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہوگا بلکہ شکر کے ساتھ زیادہ ریشہ والی غذا زیادہ مناسب ہے۔ غذائی ریشہ پودوں کے چند ناقابل ہضم اجزا پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کی کیمیائی ساخت ہر غذا میں مختلف ہوتی ہے۔ چنانچہ چاول میں یہ غذائی ریشہ تقریباً ۶۳ر۰ فیصد ہوتا ہے گیہوں میں ۱۷ر۲ فیصد اور باجرہ میں ۲۰ر۴ فیصد۔ اب تک ذیابطیس کے مریضوں کے شکر کے استعمال پر امتناع تھا اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ شکر کے استعمال سے خون میں شکر کا اضافہ ہوگا۔ لیکن اب یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ ریشہ دار غذا کے ساتھ شکر استعمال کی جائے تو خون کی شکر میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ نہ اس وجہ سے ذیابطیس کا عارضہ لاحق ہوتا ہے نہ اس میں اضافہ ہوتا ہے۔

قاضی جلیل احمد

البدر

(گذشتہ اشاعت میں اکتوبر ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ کے ایک دن پہلے، ایک مصری صحافی کے احساسات اور تجربات کو بیان کرکے مصر کی عام حالت پر عمومی طور سے اور جنگی تیاریوں پر خصوصیت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی۔ اب آنے والے ابواب کی تلخیص ملاحظہ فرمایئے)

شکست کے بعد

جون ۱۹۶۷ء کی جنگ عرب کے لیے عموماً اور مصر شام اور اردن کے لیے خصوصاً تباہ کن ثابت ہوئی۔ اس جنگ میں ان ملکوں کی مسلح قوت مکمل طور پر تباہ و برباد ہوگئی۔ اس سہل الحصول کامیابی نے اسرائیلی عزائم میں انقلابی تبدیلی پیدا کردی۔ کہاں تو آغاز جنگ کے وقت اشکول وزیراعظم اور موشے دایان وزیر جنگ دونوں ہی یہ کہتے سنائی دیتے تھے کہ اس جنگ کا مقصد ملک گیری نہیں ہے بلکہ اس خطرے کو دور کرنا ہے جو عرب فوجوں کے اسرائیلی سرحدوں پر اجتماع سے پیدا ہوگیا تھا۔ لیکن جوں ہی جنگ بند ہوئی اور اتنا بڑا علاقہ یوں بیٹھے بٹھائے ہاتھ لگا تو ان کی نیتوں میں فرق آگیا۔ اب انہیں عظیم تر اسرائیل کے خواب حقیقت میں بدلتے دکھائی دینے لگے۔ اب انہیں اسرائیل کی سلامتی صلح و آشتی میں نہیں بلکہ سامراج اور ملک گیری میں دکھائی دینے لگی۔ اس لیے اسرائیلی حکومت کی طرف سے صاف اعلان کردیا گیا کہ ۱۹۴۸ء کی جنگ بندی کے نتیجے میں اسرائیلی مملکت کی جو سرحدیں قائم ہوئی تھیں وہ اب ہمیشہ کے لیے مٹ چکی ہیں۔ اسرائیل کی سرحدیں اب وہی ہوں گی جو متعلقہ عرب حکومتوں سے ایک عہد نامہ صلح کے ذریعے طے پائیں گی اور کسی بھی عہدنامہ کے اجزائے لازم یہ ہوں گے کہ اس علاقہ کی ہر آبی شاہراہ سے اسرائیلی جہازوں کے بلا روک ٹوک گذر جانے کے حق کو تسلیم کیا جائے گا اور اسرائیل کے خلاف حالت جنگ ختم کردی جائے گی۔ بہ الفاظ دیگر نہ تو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔ نہ عرب حکومتیں اپنی ایک انچ زمین سے دستبردار ہونے کو

تجاویز ماننی ہوں گی۔ اور خود اسرائیل کو ایک ایک انچ علاقہ خالی کرنا ہوگا۔

اسرائیل کی اس ہٹ دھرمی نے عرب ملکوں کے لیے گفت و شنید کا کوئی موقعہ باقی ہی نہیں رکھا۔ اسرائیل کو تسلیم کر لینے، اس کے نہر سوئز اور خلیج عقبہ سے گزرنے کے حق کو مان لینے اور اس کے خلاف حالت جنگ ختم کرنے کا اعلان کرنے کے باوجود اگر عرب اپنا پورا علاقہ واپس نہ لے سکے جو پہلی جارحیت کے ذریعے اسرائیل نے ہتھیایا تھا تو پھر صلح کس بات کی۔ مجبوراً انہیں بھی اپنا موقف سخت کرنا پڑا کہ جب تک اسرائیل سارے مقبوضہ علاقوں کا تخلیہ نہ کر دے نہ تو اس سے کوئی صلح ہوگی اور نہ اسے تسلیم کیا جائے گا۔

خرطوم کانفرنس

عرب اور اسرائیل کے عزائم میں اس بعد المشرقین کی وجہ سے اب پہلی مرتبہ عرب حکومتوں کو اسرائیل کے خلاف کسی متحدہ اقدام کی بابت سنجیدگی سے غور کرنا پڑا۔ اب پہلی بار مصر، شام اور اردن کے علاوہ دیگر ممالک مثلاً سعودی عرب، لیبیا، کویت وغیرہ نے بھی اس امر کا اقرار کر لیا کہ ان پر بھی کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور یہ کہ ان کی دولت صرف محلوں، عیش گاہوں، فیشنی کاروں، اور زرق برق لباسوں ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ ایک مشترک دشمن کی جارحیت کو ختم کرنے کی غرض سے بھی صرف کی جانی چاہیے۔ دوسری طرف ناصر نے بھی اپنی انقلاب کو برآمد کرنے کی پالیسی جس سے سارے رؤسائے عرب نالاں تھے ترک کر دی اور ایک اقل ترین پروگرام کی بنیاد پر عرب قدامت پسندوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ خرطوم کانفرنس عربوں کے اسی نئے جذبے کا مظہر تھی۔ اس کانفرنس میں بجز شام کے تمام عرب ممالک کے سربراہوں نے شرکت کی اور یہ طے کیا کہ اسرائیل سے کسی قسم کی گفتگوئے صلح نہیں کی جائے گی۔ تاآنکہ وہ تمام مقبوضہ عرب علاقوں سے دستبردار نہ ہو جائے اور یہ کہ اسرائیل کی طرف سے انکار کی صورت میں یہ علاقے بزور شمشیر واپس لیے جائیں گے۔ اس کانفرنس میں پہلی مرتبہ تیل کو بطور ہتھیار استعمال کرنے کے سوال پر بھی غور کیا گیا۔ لیکن اس وقت شاہ فیصل اور دیگر رؤسائے عرب اس تجویز کے خلاف تھے۔ اس کے بجائے انہوں نے کانفرنس کے آگے یہ تجویز رکھی کہ وہ اپنی تیل کی دولت سے مصر اور اردن کے اس نقصان کی پابجائی کریں گے جو نہر سوئز کے بند ہونے کی وجہ سے مصر کو اور ویسٹ کا علاقہ ہاتھ سے نکلنے کی وجہ سے اردن کو پہنچا۔ ناصر اور شاہ حسین کو تیل پیدا کرنے والے ملکوں کی یہ تجویز بھی بہت غنیمت معلوم ہوئی۔ سعودی عرب، کویت اور لیبیا نے مل کر سو ملین پونڈ سالانہ اردن کو اس وقت تک ادا کرتے رہنا قبول کر لیا

جب تک یہ دونوں ممالک اپنے کھوئے ہوئے وسائل دوبارہ حاصل نہیں کر لیتے۔ اس کے جواب میں ناصر نے یمن کی فوجی امداد سے دست کشی اختیار کر کے وہاں سے اپنی فوجیں واپس بلالیں۔ اسی طرح فدائین کی تنظیم میں اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر انہیں سعودی پائپ لائن کو تباہ کرنے سے باز رکھا اور عرب ٹریڈ یونین والوں نے مغربی ممالک کو تیل کی فراہمی کا جو بائیکاٹ کر رکھا تھا اُسے ختم کروادیا۔

رزولیوشن ۲۴۲

سیکیورٹی کونسل کے حکم کی تعمیل میں گو اسرائیل نے جنگ بندی منظور کرلی لیکن سینائی کے محاذ پر فائرنگ کی گرج برابر سنائی دیتی رہی۔ اور اس سارے عرصے میں اقوام متحدہ میں سوویت یونین اور امریکہ ایک ایسے فارمولے کی کھوج میں لگے رہے جو عرب۔ اسرائیل کے اس تنازعے کو ختم کر سکے۔

لیکن عرب اسرائیل قائدین نے صلح کے تعلق سے جن شرائط کا اظہار کیا ان کی وجہ سے ایسا کوئی فارمولا بنتا نظر نہیں آتا تھا۔ یہ تگ و دو یونہی جاری تھی کہ ۲۲ نومبر ۱۹۶۷ء کو برطانیہ ایک ایسا مبہم فارمولہ پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا جس کی ہر فریق اپنے مفید مطلب توجیہہ کر سکتا تھا۔ اور اسی بنا پر رزولیوشن ۲۴۲ کے نام سے متفقہ طور پر سیکیورٹی سے منظور ہو گیا۔ اس قرارداد کے تحت یہ طے پایا کہ:

۱۔ اسرائیل ان علاقوں کا تخلیہ کر دے گا جو اس جنگ میں اس کے ہاتھ آئے تھے۔

۲۔ اسرائیل کے خلاف حالتِ جنگ ختم کر دی جائے گی اور ہر ملک کو محفوظ اور تسلیم شدہ حدود کے اندر امن و سلامتی کے ساتھ زندہ رہنے کا حق دیا جائے گا۔

۳۔ فریقین کو اس علاقے کے سارے آبی راستوں سے استفادہ کا حق ہوگا۔

۴۔ فلسطینی پناہ گزینوں کے مسئلے کا منصفانہ حل تلاش کیا جائے گا۔

۵۔ غیر فوجی منطقوں کے قیام کے ذریعہ اس علاقے کی ساری مملکتوں کے تحفظ کی ضمانت دی جائے گی۔

۲۳ نومبر ۱۹۶۷ء کو اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل او تھانٹ نے اس قرارداد کو جامہ پہنانے کے لیے فریقین سے گفت و شنید کی خاطر ڈاکٹر گنار یارنگ کو اپنا نمائندہ مقرر کر کے مڈل ایسٹ کے دورے پر روانہ کر دیا۔ شام نے یارنگ کے ساتھ گفتگو کرنے سے انکار کیا کیونکہ اس نے رزولیوشن ۲۴۲ کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا تھا۔ مصر اردن اور اسرائیل نے البتہ گفتگو پر رضامندی ظاہر کی۔ لیکن بہت جلد معلوم ہو گیا کہ ان کے نقاط نظر میں زمین

[illegible]

اسرائیل چاہتا تھا کہ فریقین کے مابین راست بات چیت ہو کر عہد نامہ صلح تکمیل پائے اور اس کے بعد اسرائیلی فوجیں مفتوحہ علاقوں کا صرف ان سرحدوں تک تخلیہ کریں گی جو صلح نامہ کے ذریعہ طے پائیں گی۔ اس کے برخلاف مصر اور اردن کی شرائط یہ تھیں کہ اسرائیل سب سے پہلے ۵ جون ۱۹۶۷ء کی سرحدوں تک پیچھے ہٹ جائے۔ اس کے بعد اقوام متحدہ کے ذریعہ شرائط صلح طے ہو کر صلح نامہ تکمیل پائے گا۔

یہ نہیں کہ اس سارے عرصے میں عربوں کا رویہ یوں ہی سخت گیر اور غیر لچکدار رہا ہو۔ خرطوم کانفرنس میں اسرائیل کو کسی طور تسلیم نہ کرنے کے عہد کے باوجود صدر ناصر نے پریسیڈنٹ ٹیٹو کے ذریعہ اسرائیل کو تسلیم کرنے اور سرحدوں پر غیر فوجی منطقے بنانے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی اور ساتھ ہی آبی شاہراہوں سے اسرائیل کے گزرنے کے حق کو تسلیم کرنے پر بھی راضی ہو گئے تھے لیکن اسرائیلی لیڈروں کو اب مفتوحہ علاقوں سے دستبردار ہونا بے معنی سا لگنے لگا تھا۔ مصر شام اور اردن میں اتنی طاقت نہ تھی کہ بزور اپنا کھویا ہوا علاقہ واپس لے سکتے۔ دفاعی نقطہ نظر سے یہ علاقہ اسرائیل کے لیے یوں مفید تھا کہ اس کی وسعت نے عربوں کے اسرائیل پر کسی اچانک حملے کا سدباب کر دیا تھا اور دوسری طرف یہ علاقہ ساری دنیا کے یہودیوں کی اسرائیل میں آبادکاری میں زبردست معاون ثابت ہو سکتا تھا۔ تیسرے اس علاقے نے انتہا پسند صہیونیوں کا وہ خواب بھی بڑی حد تک پورا کر دیا تھا۔ جہاں اسرائیل کے حدود کوہ نیترا سے قنطرہ تک اور تل ابیب سے دریائے اردن تک وسیع ہو گئے تھے۔ اور داؤد کا مقدس شہر یروشلم پھر ایک بار یہودی قبضے میں آ گیا تھا۔

عسکری تنظیم نو

اس میں شک نہیں کہ اس شرمناک اور رسوا کن شکست نے ایک لمحہ کے لیے ناصر کو پست کر دیا تھا لیکن اس کے اعلان استعفیٰ سے پیدا ہونے والے ہیجان نے اس کی ساری پست ہمتی دور کر دی۔ اور وہ اپنی بدحالی اور بے سروسامانی میں تنظیم نو کی جانب متوجہ ہو گیا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اسرائیل کے عزائم اور مغربی طاقتوں کے رجحانات واضح ہوتے گئے۔ ناصر نے محسوس کر لیا کہ مسئلے کے پرامن تصفیے کی کوئی سعی اس وقت تک بار آور نہ ہوگی جب تک مصری فوجیں ایک اور معرکہ کامیابی سے سر نہیں کر لیں گی۔ اس لیے روس کی بحالی اسلحہ کی تجویز کو اس نے بڑے اظہار استحسان کے ساتھ قبول کر لیا۔ روسی ... ہوائی جہاز، توپیں، چھوٹے خودکار آلات جب جہازوں میں لد کر مصری بندرگاہوں

میں پہنچ گئے۔ اور مصری فوجیں ایک بار پھر روسی پوش فوجوں سے تو اسلحہ و فتہ عسکر میں سنبھالا ہوتی چلی گئیں۔ لیکن اس مرتبہ روسی سامان جنگ کے ساتھ روسی ماہرین بھی وہاں بھیجے جانے لگے۔

مصری فوجوں کی خامیوں کو دور کرنے کے لیے پہلے تو ناصر نے کمانڈر انچیف کے عہدہ پر جنرل فوزی کو مامور کیا جو اپنی سخت گیری کے لیے مشہور تھا۔ فوزی نے خود ناصر کی مدد سے ایسے تمام افسروں کو فوج سے علیحدہ کر دیا جن کا پچھلا ریکارڈ کاہلی اور عدول حکمی سے مملو تھا اور ان کی جگہ بہتر کارکردگی رکھنے والے افراد کو ترقی دلوائی اور پھر روسی ماہرین کی زیر نگرانی ایک بے حد سخت ٹریننگ کا پروگرام شروع کر دیا۔ ایک سال کی مسلسل مشقت اور تربیت کے بعد بالآخر روسی ماہرین نے متفقہ طور پر ناصر کو رپورٹ دی کہ اپنی ٹریننگ کے اعتبار سے مصری فوج اب اس قابل ہے کہ اسرائیل کے کسی بھی حملے کی نہ صرف موثر مدافعت کر سکتی ہے بلکہ منہ توڑ جواب بھی دے سکتی ہے۔

جب پرامن تصفیے کی ساری ہی کوششیں یوں اکارت جاتی دکھائی دینے لگیں تو بالآخر ناصر نے بھی طے کر لیا کہ خواہ کچھ ہو جائے وہ اسرائیل کو سینائی میں چین کی سانس لینے نہیں دے گا۔ چنانچہ ۱۹۶۹ء کے موسم بہار میں جب نہر کے کنارے دور مار توپیں نصب ہو گئیں تو مصری فوجوں نے ہر روز اسرائیلی پیٹرول دستوں پر گولہ باری شروع کر دی۔ اسی طرح مصری فوج کے کمانڈو دستے سینائی میں گھس کر نہایت کامیابی سے اسرائیلی فوجی تنصیبات کو نقصان پہنچانے لگے۔ اسی گولہ باری اور کمانڈو مہمات سے بچاؤ کی غرض سے اسرائیل نے سینائی میں وہ قلعے تعمیر کیے جو بارلیولائن کے نام سے ساری دنیا میں مشہور ہوئے۔ مصری توپوں کے جواب میں اسرائیلی ہوائی جہازوں نے نہر کے کنارے کے شہروں پر زبردست بمباریاں کیں۔ یہاں تک کہ روس کے سربراہ کردہ سام ۲ میزائل بھی بے کار ہو کر رہ گئے۔ اور نہر کے کنارے ایک ایسی الیکٹرانک جنگ کا آغاز ہو گیا جس کی مقاومت مصر کے بس سے باہر تھی۔ مصر اور اسرائیل کی فوجوں کی حالت ایک دوسرے کے مقابلے میں ایسی ہو گئی جیسے کسی تیر کمان سے مسلح فوج کی مشین گنوں اور توپوں کے مقابلے میں ہو سکتی ہے۔

مصری فوج کی اس بے بسی پر ناصر بھنا گیا۔ روس کو اب مزید مصری دفاع سے یوں بے تعلقی کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ اس نے ترپ کی آخری چال چلنے کا عزم کر کے ماسکو کی راہ لی۔ ماسکو میں اس نے سوویٹ قائدین سے دو ٹوک کہہ دیا۔

"یہ نہ سمجھو کہ صرف مصر کو تمہاری ضرورت ہے اور تمہیں مصر کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسرائیل کی ہوائی تاختوں سے مصر تباہ ہوا جا رہا ہے اور تم اطمینان سے بیٹھے

[illegible]

لیکن اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ عرب حکومت ایسے شخص کے حوالے کر دی جائے جو ... ہو چکا ہو

ملک کے لیے ہو جائے گا۔

سوویت قائدین سمجھتے تھے کہ ایسا شخص صرف وہی ہے جو اپنی دھمکی اور عمل جاری رکھنے کے ساتھ جمال کے آپسی صلاح مشورے ہوتے رہے۔ ناصر کی حالت اس وقت ایسی تھی جیسے ... تھکی سی تھی جس کے پاس حالات پر قابو پانے کے لیے مزید کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ سوویت قائدین کو بالآخر ... اور جلد ہی سام تا سرزائل مصر پہنچ گئے۔ اور ساتھ ہی سرزائلوں کو اسرائیلی تاخت سے بچانے کے لیے بہترین روسی مگ بھی روانہ کر دیئے گئے۔ ان روسی جہازوں کے پہنچنے کے بعد اسرائیل کی اندرون ملک چڑھائی اور بمباریاں بند ہو گئیں۔ اصلی کا سارا زور اب سویز کنال پر صرف ہونے لگا۔

۲۸ ستمبر ۱۹۷۰ء کو جمال عبدالناصر کا انتقال ہو گیا اور مصر کی عنان حکومت انور سادات کے ہاتھ میں آئی۔ سادات کا خیال تھا کہ اگر اسرائیل کے جائز مطالبات تسلیم کر لیے جائیں تو اسرائیل بھی واقعیت پسندی پر آمادہ ہو جائے گا۔ ۷ اگست ۱۹۷۰ء کو راجرس پلان کے تحت نہر کے کنارے جنگ بندی تو ہو ہی چکی تھی۔ سادات نے اپنی طرف سے صلح پسندی کا اظہار کرنے کے لیے ۴ فروری ۱۹۷۱ء کو باقاعدہ طور پر یہ اعلان کیا کہ اگر اسرائیل جزوی طور پر بھی سینائی میں اپنی فوجوں کو پیچھے ہٹانے تو وہ نہر سویز کو جہاز رانی کے لیے کھولنے پر آمادہ ہے۔ لیکن اسرائیل کی طرف سے اس اعلان کی کوئی پذیرائی نہیں ہوئی۔ اسی طرح گنار یارنگ کی پیش کردہ حسب ذیل شرائط کو بھی سادات نے من و عن تسلیم کر لیا:

"۱۔ اسرائیل کے خلاف حالتِ جنگ کے تمام دعووں سے مصر دست بردار ہو جائے۔
۲۔ اسرائیل کے محفوظ اور تسلیم شدہ حدود میں امن و امان سے رہنے کے حق کو تسلیم کر لے۔ ۳۔ اس بات کی ذمہ داری قبول کر لے کہ مصری علاقے سے ایسی کوئی کارروائی نہیں ہو گی جس سے اسرائیلی شہریوں کی جان اور جائیداد کو نقصان پہنچے۔ ۴۔ اسرائیل کی خودمختاری کو تسلیم کر لے۔ ۵۔ اسرائیل کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کرے۔" ——— سادات نے ان تمام شرائط کو من و عن تسلیم کر لیا لیکن اسرائیل نے کسی صورت میں بھی اپنی فوجوں کو ۵ جون ۱۹۶۷ء سے قبل کی سرحدوں تک پیچھے ہٹانے سے صاف انکار کر دیا۔ تب سادات نے سوچا کہ پر امن ذرائع سے اس مسئلہ کا تصفیہ ممکن نہیں۔ ۵ اگست ۱۹۷۱ء کو جنگ بندی کی مدت ختم ہو چکی تھی لیکن سادات اس جنگ بندی ... اس مدت میں توسیع کرتے چلے جا رہے تھے ... [illegible] جنگ بندی کی مدت میں مزید توسیع سے انکار کر دیا۔ آنے والی جنگ کی ... [illegible]

ڈاکٹر ناصرہ

چھوٹی سی نیلی باسکٹ

-۱-

مشرقی گھاٹ کے پہاڑوں کے پیچھے سورج طلوع ہوا ہی چاہتا تھا۔ پوربی افق لال اور سنہرے رنگوں سے سورج کی ترتیب میں مصروف تھا۔ پہاڑوں کے دامن میں ندی کا بہتا ہوا پانی صبح کی ہوا میں دھان کے سرسراتے سرسبز کھیت۔ ان کھیتوں سے اوپر نیلے آسمان کے نیچے بے داغ سفید پروں والے بگلوں کی اڑتی قطاریں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فطرت کی پھیلی ہوئی یہ رعنائیاں بھی بگلوں کی طرح بے داغ ہیں۔

سکھشی کا نواس فرنگیپنس (خوشبو) ان گنت سفید پھولوں کی خوشبوؤں سے صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کو لبریز کررہا تھا۔ اور وہ خود میرے سامنے اپنے خوش نما مکان کے حسین ٹیرس پر سفید بے داغ لباس میں ملبوس میرے جوڑے میں ایک تازہ کھلے ہوئے سفید گلاب کو سجا رہی تھیں۔

میں نے ایک بھرپور نظر اردگرد ڈالی، میرے دل نے کہا خالق کائنات تو نے کتنی مکمل کائنات کی تخلیق کی ہے۔ خوبی در خوبی، حسن ہی حسن ۔

-۲-

سکھشی سے میری پہلی ملاقات مرتضیٰ نگر کے گرلز کالج میں ہوئی تھی۔ یہاں پر میرا نیا نیا تقرر ہوا تھا۔ جب میں کالج پہنچی تو آیا نے مجھے اسٹاف روم پہنچا دیا تھا۔ مجھے جانا تھا پرنسپل کی آفس میں۔ میری زبان سے آیا اور آیا کی زبان سے مجھے واقفیت نہ تھی۔ نئے اجنبی چہرے مجھے گھور رہے تھے اور اک چہرہ بھی ایسا نہ تھا جس پر التفات کی پرچھائیوں کا گمان ہوتا۔ ایسے میں سکھشی اپنی سیٹ سے اٹھ کر میرے پاس آئیں۔ اُجلا بے داغ لباس، چہرے اور جسم کی ساخت ایسی کہ کسی مضبوط چٹان کا ایک ٹکڑا ہو۔ کھلتا ہوا سانولا رنگ۔ بڑی ملائمت سے انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ وہ میرے لیے کیا کر سکتی ہیں؟

[illegible] ... پایا اور ... مجھے ...

سمجھایا کہ ان کی جسمانی ساخت ہی نہیں بلکہ ذہنی بناوٹ بھی چٹان کی طرح مضبوط ہے۔

ان سے متعلق بتایا گیا کہ بے حد کم عمری میں شادی ہوگئی۔ چھوٹی سی عمر میں ایک بچی کی ماں بن گئیں۔ اسی اثنا میں باپ کا انتقال ہوگیا۔ چھوٹے چھوٹے کئی بہن بھائی تھے۔ بے سہارا بہن بھائیوں کے لئے انہوں نے ملازمت کرنی چاہی۔ متمول شوہر کو پسند نہ آیا اور نہ خود اس نے کسی مالی اعانت کی سسرالی عزیزوں نے بھی حامی بھری۔ اب سکھشی کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو متمول شوہر کے ساتھ آرام و آسائش کی زندگی بسر کرے یا اس رشتے ہی کو منقطع کر کے بیوہ ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کا آسرا بنے۔ سکھشی نے دوسرا راستہ پسند کیا۔

جس وقت میری ملاقات سکھشی سے ہوئی ان کے سب بہن بھائی اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہو چکے تھے مرتضیٰ نگر میں وہ اپنی ماں اور بیٹی کے ساتھ جس کی شادی کی بات چیت چل رہی تھی رہا کرتی تھیں۔ خاموش طبع، سب سے الگ تھلگ سکھشی ایک ہر دلعزیز لیکچرار تھیں۔ کم آمیز اور کم گو ہونے کے باوجود ہر ضرورت مند کو اچھی صلاح دیا کرتی تھیں اور ہر طرح مدد بھی۔ وہ مجھے کسی بار بر کی ایسی مضبوط چٹان معلوم ہوتیں جس پر لائٹ ہاؤس بنا ہوا ہو۔

مرتضیٰ نگر کے گرلز کالج میں مادھوری سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ یہ اسی کالج کی پڑھی ہوئی طالبہ تھیں۔ ان کا تقرر اسی پرانت میں دوسری جگہ ہوا تھا اور دو تین تبادلوں کے بعد وہ اسی کالج میں آگئیں جہاں کہ وہ طالب علم تھیں۔ مادھوری نے یہاں آتے ہی گرلز کالج ہاسٹل کی بعض ذمہ داریاں بھی اپنے ذمہ لے لیں اور میری روم میٹ بنیں۔ وہ سکھشی کی شاگرد تھیں اور ان کی بے حد معتقد۔ چند ماہ بعد مادھوری کی شادی ہوگئی انہوں نے ہاسٹل چھوڑ دیا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد ان کا ایک اور بار تبادلہ ہوگیا۔

سکھشی ہمیشہ ٹیوشن بھی کرتی رہی تھیں۔ اس ساری رقم کو وہ پس انداز کیا کرتی تھیں۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ ایک خوبصورت سا مکان کسی عمدہ محلہ میں تعمیر کریں۔ اس شوق کی تکمیل کے لئے انہوں نے قیمتی ساڑیوں اور زیوروں سے ہمیشہ احتراز کیا۔ آخر انہوں نے ایک اچھے سے نئے بنے فیشن ایبل کالونی میں زمین خرید بھی لی تھی کہ ان کا تبادلہ ہوگیا۔ وہ کوشش کر رہی تھیں پھر مرتضیٰ نگر واپس آجائیں کہ میرا تبادلہ مرتضیٰ نگر سے اسی پرانت کی دوسری کالج میں ہوگیا۔

بنجارہ قبیلوں کے رواج کے متعلق سُنا کہ دو قبیلے پھرتے پھراتے کسی مقام پر ڈیرے ڈالتے ہیں دونوں قبیلوں میں شادی بیاہ کے رشتے ہوتے ہیں اور جب ڈیرے اٹھ جاتے ہیں تو نئی بیاہی دلہنیں اپنے سسرالی قبیلوں کے ساتھ جاتے ہوئے بلک بلک کر رونے لگتی ہیں۔ کیونکہ اتفاقاً خانہ بدوش قبائیلیوں میں میکہ والوں سے اسی وقت ملاقات ممکن ہے کہ پھرتے پھراتے ہی دو قبیلے پھر کسی میدان میں دوبدو ہو جائیں۔ آندھرا پردیش کے کالجوں میں کام کرتے ہوئے مجھے ہمیشہ یہی قبائلی زندگی یاد آیا کرتی ہے۔ ایک ہی کالج میں کام کرنے والے بے شمار لیکچرار ایک دوسرے سے بے حد قریب ہو جاتے ہیں لیکن تبادلہ ہو جانے کے بعد پھر قبائلی لڑکیوں کی طرح دوسرے سے شاذ ہی مل سکتے ہیں۔ اسی لئے جب کبھی کسی لیکچرار کا تبادلہ ہوتا تو پرانی کالج کے سب لیکچرار نئی کالج کے لیکچراروں کو زبانی پیام وسلام روانہ کرتے اور نئی کالج کے سارے لیکچرار تبادلہ ہو کر آنے والی لیکچرار سے لوٹ ٹوٹ کر ملتیں۔

اب کے تبادلہ ہو کر آنے والی لیکچرار مادھوی تھیں۔ ان سے ملاقات ہوئے کئی سال بیت چکے تھے مگر تعلیمی دنیا کے بنجاروں کے ذریعہ خبر ملتی رہی تھی کہ کئی جگہ انہوں نے کام کیا۔ ایک لڑکا اور لڑکی ساتھ ساتھ آئے دن تبادلے تکلیف دہ تھے۔ خصوصاً جب کہ بچوں کی تعلیمی زندگی کا آغاز ہو چکا تھا اسی لیے تعلیمی سال کے درمیانی مدت میں ان کا تبادلہ ہوتا تو وہ بچوں کو کسی ایسے ساتھی کے پاس چھوڑ دیتیں جن کے متعلق مادھوی کو یقین ہوتا کہ وہ بچوں کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار نہیں کریں گے۔

— ۴ —

مادھوی نے بتایا کہ بچوں کو لکشمی میڈم کے یہاں چھوڑ آئی ہیں۔ میڈم نے بے حد شاندار مکان تعمیر کیا ہے۔ شروع میں خیال کیا تھا کہ مکان صرف ان کی رہائش ہوگا۔ اس لئے تعمیر مکان کے وقت کوئی لحاظ اس امر کا نہیں رکھا گیا تھا کہ اگر ضرورت ہو تو اس کے کچھ حصہ کو پارٹیشن کے ذریعہ کرایہ پر اٹھا دیا جا سکے۔ بعد میں میڈم نے محسوس کیا کہ اتنے بڑے مکان کی دیکھ ریکھ اور اخراجات کے متعلق سوچے بنا انہوں نے اپنی آرزو کی تکمیل اندھا دھند کر لی ہے۔ لیکن اب کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ بے حد قریبی اور مخلص دوستوں کو پیئنگ گیسٹ کی طور پر رکھ لیا جائے۔ مادھوی تو ان کی بے حد عزیز شاگرد تھیں اور میڈم کا بے حد احترام کرتی تھیں۔ ضرورت دونوں کی تھی۔ مادھوی کے لئے کسی ایسے دوست کی جو ان بچوں کو صرف اپنے ساتھ رکھیں بلکہ مادھوی کے غیاب میں بچوں کی تعلیم و تربیت پر بھی توجہ دے سکیں۔ یہ کام لکشمی بخوبی کر سکتی تھیں۔ ان کی

لڑکی بھی بیاہ دی جس کے بعد دمینیہ پر پالیشن ہو چکی تھی اور اصان بھی اپنے لڑکے کے پاس چلی گئی تھیں۔ [illegible] تنہائی دور کرنے کے علاوہ گھر کے کچھ اخراجات کے لئے بھی رقم کی ضرورت تھی۔

مادھوی نے بتایا کہ میڈم نے بچوں کے اسکول میں داخلے، ان کی تدریسی کتابوں کی خرید اور ان کی دیکھ بھال کے لئے جو کچھ کیا ہے اس احسان کا بدل وہ کبھی نہ کر سکیں گی۔ اسی لئے میڈم کو بھی مالی تفکرات سے بچانے کے لئے حتی المقدور تعاون کرنا چاہتی تھیں۔ مکان کی دیکھ بھال کے سارے اخراجات جیسے بجلی، پانی اور نوکر وغیرہ پر جو کچھ خرچ ہوتا اس کا آدھا خرچ ادا کرنے پر رضامند تھیں۔ مادھوی کے یہاں بھی اس علاقے کے بیشتر متوسط طبقے کے لوگوں کی طرح سال بھر کا غلہ اور گھی ان کی زمینات سے آجایا کرتا تھا۔ مادھوی نے بچوں کی ضروریات سے کچھ زیادہ ہی چاول اور دالیں بھی منگوا کر میڈم کے یہاں بھجوا دیں۔ بچوں کے جیب خرچ کے نام سے بھی نقد رقم میڈم کے حوالے یہ کہہ کر کی تھی کہ اگر میڈم کو ضرورت ہو تو اس رقم سے مدد لے سکتی ہیں۔ مختصر یہ کہ مادھوی مطمئن تھیں۔ ان کے شوہر کی ملازمت مرتضیٰ نگر کے قریب ہی تھی۔ مادھوی کا پلان تھا کہ تہواروں کے دوران وہ کچھ دن چھٹی لے کر شوہر کے مستقر چلی جایا کریں گی اور بچوں کو بھی تہواروں کے زمانے میں وہیں بلوا کریں گی۔

ستمبر میں ونایک چترتھی کا تہوار تھا۔ مادھوی مرتضیٰ نگر جانا چاہتی تھیں اور وہاں سے بچوں کو ساتھ لے کر تہوار منانے شوہر کے مستقر جانے کا ارادہ کر رہی تھیں۔ اتفاقاً تہوار سے دو تین دن قبل ہی ان کے شوہر کو سرکاری کام سے دہلی جانا پڑا۔ اگرچہ سکھی نے مادھوی کو لکھا بھی کہ تہوار کے موقع پر "فریگرینس" چلی آئیں۔ وگھنیشور کی پوجا سال کا پہلا تہوار ہوتا ہے۔ اس تہوار کو وہ اپنے بچوں کے ساتھ فریگرینس میں منا کر لطف اندوز ہو سکتی ہیں۔ مگر مادھوی نے اخراجات کے خیال سے ملتوی کر دیا اور سکھی کو یہی لکھ بھیجا کہ "فریگرینس" میں بچے خوش ہیں اور بچوں کے پاس ماں سے زیادہ خیال رکھنے والی میڈم ہیں اس لئے گنیش کی پوجا کی بجائے وہ ایک روشن تہوار دیوالی پر زیادہ چھٹیاں لے کر مرتضیٰ نگر میں گزاریں گی۔ شاید دسہرہ میں مادھوی وہاں گئی ہوں۔ میں تو [illegible] کی وجہ سے پہلے شہر آگئی تھی۔ البتہ نومبر میں دیوالی کے تہوار پر مادھوی نے مرتضیٰ نگر جانے کی تیاریاں شروع کیں۔ بچوں کے لئے عمدہ کپڑے سلوائے، رخصت کی درخواست بھی [illegible] دیوالی سے دو دن پہلے پٹاخے خرید کر "فریگرینس" ساتھ لے جائیں گی۔ وہ [illegible] تنہا ہو گئے۔ [illegible]

ہاں پھر سے ساتھ ہی مرتضیٰ نگر چلے جائیں ... دونوں چل سکے ... وہاں ...
کر دیا۔

- ۵ -

مارچ میں میرا تبادلہ پھر مرتضیٰ نگر پر ہو گیا۔ اپریل کے پہلے ہفتہ میں گرما کی چھٹیوں کا آغاز ہوتا تھا۔ بس ایک ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ مجھے وہاں بتانا تھا اور سکھشی نے مجھے اپنے یہاں ٹھہرایا۔ لیکچراروں کے لئے مارچ کا آخری اور اپریل کا پہلا ہفتہ بڑا پر کیف ہوتا ہے۔ بچوں کو سالانہ امتحانات کی چھٹیاں ہو جاتی ہیں۔ پرچوں کی تنقیح کا کام کالج کا امتحان دینے والوں کا ختم ہو جاتا ہے۔ اور کالج کی حاضری کو اپنے اپنے پسندیدہ مشاغل سے خوش گوار بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کوئی عام مطالعہ پر جُٹ جاتا ہے۔ کوئی کڑھائی، سلائی، بُنائی میں مصروف ہو جاتا ہے تو کوئی گپ شپ میں وقت گنوا کر یا کرسی پر اونگھ کر لطف اٹھاتا ہے۔ اس طرح کالج سے واپسی کے بعد گھر میں اسباق کی تیاری پر صرف ہونے والا وقت ستانے اور گپ شپ میں بتایا جاتا ہے۔

غرض کہ ایسے ہی پر لطف دنوں میں میں مرتضیٰ نگر پہنچی تھی۔ میں کوشش کر رہی تھی کہ میرا تبادلہ میرے اپنے شہر پر ہو جائے اور یقین بھی تھا کہ کارروائی گرمی کی چھٹیوں میں مکمل ہو جائے گی۔ اسی لئے میں نے سکھشی کے خوب صورت گھر میں ان پر لطف دنوں کے گذارنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا۔ دو ایک لیکچرارس کو سکھشی بے حد پسند کرتی تھیں اور جو اُن کے محلے سے بے حد قریب رہا کرتی تھیں۔ رات کھانا سرِ شام ہی کھا کر یا پھر اپنا اپنا کھانا توشہ دانوں میں رکھ کر "فرنگی مینس" آجایا کرتی تھیں اور بڑا دلچسپ وقت گذرتا تھا۔

انہیں محفلوں میں گویا میں نے جنوبی ہند سے واقفیت حاصل کی تھی۔ خصوصاً وہ علاقے جنہیں کرناٹکا، سرکار اور رائل سیما کا نام دیا جاتا ہے۔ اب تک میرے کان دجلہ و فرات، گنگا و جمنا کے دوآبوں کی تہذیب و تمدن ہی سے آشنا تھے لیکن ان محفلوں میں مجھے پتہ چلا کہ کرشنا اور گوداوری کا دوآبہ بھی ویسا ہی وشال ہے، کنچی پٹوں میں ملفوف، سونے سے لدا ہوا اور موگرے کے پھولوں کی مہک سے بھرپور جذب ریشم میں لپٹا ہوا طلائی خواب ہے۔ وینا کے تاروں پر چھیڑا ہوا تیاگ راجا کا پر تقدس مدھر راگ ہے۔ گھنگھروؤں کی تال پر کچی پوڑی رقص کا حسین زیر و بم ہے۔ موسیقت سے بھرپور تلگو زبان میں گایا ہوا نغمہ ہے۔ چمپا کا پھول ہے، چاند کی ہنسی اور گوداوری ندی کا پر غضب جلال ہے۔ جس کو کسی تلگو شاعر نے یوں بیان کیا ہے "... ...

کیا کرتی، پکوڑے تلتی

اور پھر وقتاً فوقتاً سکھی اپنے ریڑھی بھر بھر کے تازہ تازہ ٹھنڈے پھل، گھر میں بنائے ہوئے طرح طرح کے شربتوں اور نئی ترکیبوں سے بنائے ہوئے نئے نئے ذائقوں والے میٹھوں اور آئس کریم اور فروٹ سلاد اور کسٹرڈ سے تواضع کیا کرتی۔ مکان کے گوشے گوشے میں خوشبوؤں کا ڈیرہ ہوتا۔ موتیا، چنبیلی، موگرا اور جوہی کے علاوہ کتنے سفید پھول کھلتے۔ جن کے تلگو نام بھی عجیب رسیلے ہوتے تھے۔ ایک پھول من مدھا بانا کہلاتا۔ تیر نیم کش کی طرح اردو میں اسی کا لفظی ترجمہ کچھ پڑیا کام دیو کے سے ہوسکتا ہے۔ رنگوں کے بیر کو یہاں رادھا منوہر کا نام دیا گیا ہے۔ مالتی ماکھی مالتی اور پاریجات وغیرہ رات بھر مہکا کرتے۔ ہارسنگھار کے پھولوں کو تلگو میں پاریجات کا نام دیا جاتا ہے۔ تلنگانہ میں پاریجات سے ایک دلکش کہانی منسوب ہے ۔ لارڈ کرشنا کی آٹھ بیویاں تھیں انہیں سب سے زیادہ عزیز تھیں رکمنی اور ستیہ بھاما، اور یہ دونوں مزاج میں جیسے ایک دوسرے کی ضد تھیں۔ رکمنی حلیم الطبع اور نرم و نازک دل کی مالک جب کہ ستیہ بھاما آتش بداماں شخصیت، اور کرشن ان کی زبان کی تیزی اور جھگڑوں سے بڑے خائف! ویسے چاہتے بھی خوب ہیں ۔۔ ایک مرتبہ دیولوک سے ہارسنگھار کے پھولوں کا ایک گچھا رکمنی (جنہیں تلگو ادب میں رادھا رکمنی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے) کو لا کر دیتے ہیں۔ دیولوک کے ایک منی جنہیں نارد منی کا نام دیا جاتا ہے اور جن کا خاص مشغلہ لوگوں کو آپس میں لڑوا کر لطف اٹھانا ہے، چنانچہ نارد منی جا کر سارا قصہ ستیہ بھاما سے جڑ دیتے ہیں۔ پھر جو کچھ ہوا اس کے متعلق "رکمنی پاریجات" کے نام سے تلگو ادب میں خاصا [illegible] اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اور اسی حکایت کی بناء پر عموماً ہارسنگھار کا پیڑ لوگ گھروں میں لگانے سے احتراز کرتے ہیں۔ غرض کہ ایسی ہی کئی نئی باتوں میں دو ہفتہ پلک جھپکتے ہی ختم ہو گئے۔

- ۶ -

" دوبارہ مرتضٰی نگر آنے سے قبل تم نے اور مادھوی نے ایک ہی جگہ کام کیا تھا، مادھوی کے بچے مرتضٰی نگر کو چھوڑ کر ماں کے پاس جب پہنچے تو تم بھی وہیں تھے سچ سچ بتانا میرے متعلق مادھوی کی کیا رائے ہے؟"

(باقی آئندہ)

غزل

شکیل بدایونی

سرگزشتِ دل کو رودادِ جہاں سمجھا تھا میں
مختصر سی بات کو اک داستاں سمجھا تھا میں
بن گیا میرے لیے اک اضطرابِ مستقل
اس محبت کو سکونِ قلب و جاں سمجھا تھا میں
وہ بھی میری گردشِ تقدیر کا اک دور تھا
جس کو اب تک انقلابِ آسماں سمجھا تھا میں
وادیٔ غربت میں یوں گم کردہ منزل تھا شکیل
رہزنِ منزل کو خضرِ کارواں سمجھا تھا میں

غزل

ترجمہ فاطمہ ضابط پروین

سرگذشتِ دل بہ فکرم بود رودادِ جہاں
بود حرفِ مختصر، کردم گمانِ داستاں
آں محبت شد برایم اضطرابِ دائمی
در گمانم بود آں الفت، سکونِ قلب و جاں
نیز آں یک دورۂ از گردشِ تقدیر بود
بود لیکن در گمانم، انقلابِ آسماں
منزلم در وادیٔ غربت چناں گم شد شکیل
رہزنِ منزل، بہ فکرم بود، خضرِ کارواں

○

رباعی

عبداللہ انصاری

خواہی کہ ترا رتبۂ ابرار رسد
مپسند کہ کس را ز تو آزار رسد
از مرگ میندیش و غمِ رزق مخور
کیں ہر دو بوقتِ خویش ناچار رسد

(ترجمہ) فاطمہ ضابط پروین

تم چاہو اگر رتبۂ ابرار ملے
یہ دیکھو، نہ دل کوئی بھی تم سے ٹوٹے
رکھو نہ غمِ رزق، نہ ڈر موت کا
ناچار وہ آئیں گے مگر موقت

شعر

صائب شیرازی

کوزۂ چشمِ حریصاں پر نہ شد
تا صدف قانع نہ شد پُر دُر نہ شد

فاطمہ ضابط پروین

یہ چشمِ حریصاں کا کوزہ پر ہو نہ سکا
جب تک کہ صدف قانع نہ ہوئی موتی سے کبھی پر نہ ہوا

جو چشمِ فطرت وہ رنگِ مصحف ہے
یہ ذکرِ جلی ہے یہ فکرِ خفی ہے

لبِ روشن اور زلفِ مشکیں کے آگے
یہ شب ہے یہ نور، سحر مخفی ہے

ہر اک قطرے میں طوفاں ہے عالم
بہ تنگ دل آہ شور دنی ہے

ادھر دیکھ لے، جسم شاق ہے گویا
وہ صورتِ انسانی ہے یا وہ مخفی ہے

وجود و عدم کہاں ہیں اللہ جانے
جو اثبات ہے اب وہی پھر نفی ہے

سبز پوشی ہے میری فکرِ براق
معانی مری طبع کی زرفشانی ہے

سعادت یہ قسم کھا کے آپ زر سے
مرا شغف کیا ہے کہ بل اطرفی ہے

پرنس سعادت جاہ بہادر

شاہکاروں کی یاد آتی ہے
ماہ پاروں کی یاد آتی ہے

غم کے ماروں کی یاد آتی ہے
بے قراروں کی یاد آتی ہے

جن کو ہم دائمی سمجھتے تھے
اُن بہاروں کی یاد آتی ہے

جن سے وابستہ تھی ضیائے حیات
اُن ستاروں کی یاد آتی ہے

داغ لالہ سہا نہیں جاتا
سبزہ زاروں کی یاد آتی ہے

اک تپش ہے کہ جلتے جاتے ہیں
سایہ داروں کی یاد آتی ہے

آنسو پی پی کے جی رہے ہیں رباب
غمگساروں کی یاد آتی ہے

عائشہ یوسف الدین رباب

تضمین بہ کلامِ اقبالؒ

ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خاں منشاؔ

[illegible] سمجھا تھا میں
[illegible] زمیں کو لامکاں سمجھا تھا میں
خاص میدانِ جنوں کیا ہے کہاں سمجھا تھا میں
"اپنی جولانگاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں
آب و گِل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں"

یہ مہ و انجم کی الٹی سیدھی راہوں کا طلسم
بالا تر از فہم ہے ان جلوہ گاہوں کا طلسم
چرخ کو سمجھا تھا میں اپنی ہی آہوں کا طلسم
"بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں"

چاروں جانب تھے فریبِ علم و آگاہی کے دام
سخت مشکل تھا سمجھنا کیا ہے قدرت کا نظام
کام آکر ہی رہا آخر جنونِ تیز گام
"عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں"

در حقیقت اور ہی دنیا ہے یہ دنیائے شوق
شوق کو کرتی ہے ظاہر کوششِ اخفائے شوق
بن گئی ظالم خموشی اپنی رمز افشائے شوق
"کہہ گئی رازِ محبت پردہ داری ہائے شوق
تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں"

دل میں فرطِ بے کلی تھی روح تھرائی ہوئی
شرم کے مارے نظر تھی میری شرمائی ہوئی
حشر کے دن واہ کیا اچھی پذیرائی ہوئی
"عرصۂ محشر میں میری خوب رسوائی ہوئی
داورِ محشر کو اپنا رازداں سمجھا تھا میں"

اے۔ جی۔ فاروقی

خوش آئند مستقبل

کچھ چاہت تھوڑی تھوڑی سی
کچھ انساں پہ بھروسہ تھوڑا سا
اک ہلکی سی گرمی ہمدردی کی
اک سرگرم خوشی مستقبل کی
برسوں کے جلتے ماہ و سال
خشک تپیدہ بے آب و گیاہ
بن جاتے ہیں اک خواب نیا
چاہت ہمدردی اور خوشی کا

یہ خواب نیا ہے عزم و ہمت کا
یہ خواب ہے خوش آئند مستقبل کا

اک مہک سی دمِ تحریر کہاں سے آئی
نامہ میں تیرے یہ تابش سی کہاں سے آئی
(احسان حسن حقی)

وہ آ بیٹھیں قدم قدم پہ دھڑکتیں نفس نفس
وہ جانے راہِ شوق میں وہ کب ملیں کہاں ملیں
(رضا حقی)

آسماں ابر سے گھر آئے غزل ہوتی ہے
زلف شانوں پہ بکھر جائے غزل ہوتی ہے

جام پر جام بہت آتے ہیں میخانے میں
چشم مے سے کوئی چھلکائے غزل ہوتی ہے

موسمِ گل کی لطافت تو مسلم ہے مگر
حُسنِ جاناں پہ بہار آئے غزل ہوتی ہے

چاند کے جلوے نظر آتے ہیں راتوں میں
چاندنی رخ کی بکھر جائے غزل ہوتی ہے

زخم تو روز ہی ملتے ہیں زمانے میں مگر
خوں جب آنکھوں سے ٹپک جائے غزل ہوتی ہے

حُسن ہی حُسن بہر گام ہے دنیا میں مگر
حُسنِ دلبر جو نظر آئے غزل ہوتی ہے

گرمیٔ وصل تو گرماتی ہے دل کو لیکن
ہجر کا درد جو مل جائے غزل ہوتی ہے

آج کے دور میں انساں نظر آتے ہیں کہاں
جب بھی انساں نظر آجائے غزل ہوتی ہے

طاری کتنا بھی طبیعت پہ رہے رنگ جمود
اک گل اندام جو دکھ جائے غزل ہوتی ہے

لطفِ محبوب تو منصور بڑی شے ہے مگر
ظلم جب حد سے گذر جائے غزل ہوتی ہے

ڈاکٹر محمد منصور خاں منصور

عربی سیکھو

اسم کی حالتیں

اسم کی تین حالتیں ہوتی ہیں اور وہ اسم کے آخری حرف کے اعراب کو تبدیل کر کے ظاہر کی جاتی ہیں۔

۱۔ مرفوعٌ۔ حالتِ رَفْعی یعنی پیش ـُـ والی حالت۔ ہر فاعل حالتِ رفعی میں ہوتا ہے۔

۲۔ منصوبٌ۔ حالتِ نَصْبی یعنی زبر ـَـ والی حالت۔ ہر مفعول حالتِ نصبی میں ہوتا ہے۔

۳۔ مجرورٌ۔ حالتِ جَرّی یعنی زیر ـِـ والی حالت۔ ہر مضاف الیہ حالتِ جری میں ہوتا ہے۔

نُورُ الشَّمْسِ يَنْفَعُ الشَّجَرَ (سورج کی روشنی شجر کو فائدہ پہنچاتی ہے)

نورُ (فاعل) حالتِ رفعی میں ہے۔ الشمسِ (مضاف الیہ) مجرور ہے۔ الشجرَ (مفعول) حالتِ نصبی میں ہے۔

شَرِبَ الْوَلَدُ اللَّبَنَ — لڑکے (فاعل) نے دودھ (مفعول) پیا

أَكَلَ الْحِمَارُ الْعَلَفَ — گدھے (فاعل) نے چارہ (مفعول) کھایا

طَبَخَتِ الْمَرْأَةُ الطَّعَامَ — عورت (فاعل) نے کھانا (مفعول) پکایا

فَتَحَ الْوَلَدُ الْبَابَ — لڑکے (فاعل) نے دروازہ (مفعول) کھولا

فَاطِمَةُ تُحِبُّ النَّظَافَةَ وَالتَّرْتِيبَ — فاطمہ (فاعل) پاکیزگی اور ترتیب (مفعول) کو پسند کرتی ہے

قَطَفَ الْغُلَامُ الزَّهْرَةَ — لڑکے (فاعل) نے پھول (مفعول) توڑا

حَبَسَ الشُّرْطِيُّ اللِّصَّ — کانسٹیبل (فاعل) نے چور (مفعول) کو قید کیا

عَبْدُ اللّٰهِ (خدا کا بندہ) — جَنَاحُ الطَّائِرِ (پرندہ کا پنکھ)

بَابُ الْمَسْجِدِ (مسجد کا دروازہ) — عِنَانُ الْفَرَسِ (گھوڑے کی لگام)

طَالِبُ عِلْمٍ (علم کا طالب) — وَرَقُ كِتَابٍ (کتاب کا صفحہ)

حروفِ جر

اگر کسی اسم کے پہلے حرف جر (preposition) آئے تو وہ اسم مجرور ہو جاتا ہے یعنی اس کے آخر حرف کو زیر دیتے ہیں۔ مثلاً:

اَلْبَيْتُ — فِي الْبَيْتِ (گھر میں) — اَلْأَرْضُ — عَلَى الْأَرْضِ (زمین پر)

اَلْمَيْدَانُ — مِنَ الْمَيْدَانِ (میدان سے) — اَلْمَسْجِدُ — إِلَى الْمَسْجِدِ (مسجد تک)

اَلْوَلَدُ — لِلْوَلَدِ (لڑکے کے لیے) — اَلْعِلْمُ — بِالْعِلْمِ (علم سے)

لِلدِّيْنِ (دین کے لیے) — إِلَى الْقِيَامَةِ (قیامت تک)

مِنَ الصَّغِيْرِ إِلَى الْكَبِيْرِ (چھوٹے سے بڑے تک) فِي اللَّعِبِ (کھیل میں)

اَلْقَلَمُ فِي الْجَيْبِ (قلم جیب میں ہے) اَلسَّمَكُ فِي الْمَاءِ (مچھلی پانی میں ہے)

اَلزَّهْرُ عَلَى الشَّجَرِ (پھول شجر پر ہے) اَلْأُسْتَاذُ عَلَى الْكُرْسِيِّ (استاد کرسی پر ہے)

اَلْقُرْآنُ هِدَايَةٌ لِلْإِنْسَانِ (انسان کے لیے قرآن ایک ہدایت ہے) — اَلْعَمَلُ ضَرُوْرِيٌّ لِلْعَالِمِ (عالم کے لیے عمل ضروری ہے)

اَلْقَلَمُ لَازِمٌ لِلْكِتَابَةِ (لکھنے کے لیے قلم ضروری ہے) — اَلْكِتَابُ لَازِمٌ فِي الْقِرَاءَةِ (پڑھنے کے لیے کتاب لازمی ہے)

اَلسَّلَامُ وَاجِبٌ عَلَى الصَّغِيْرِ (چھوٹے کے لیے سلام کرنا ضروری ہے) — اَلشُّكْرُ لَازِمٌ لِلْإِنْسَانِ (انسان کے لیے شکر کرنا لازمی ہے)

اَلْفَقِيْرُ وَاقِفٌ عَلَى الْأَرْضِ (فقیر زمین پر کھڑا ہے) — اَلْأَمِيْرُ جَالِسٌ عَلَى الْكُرْسِيِّ (امیر کرسی پر بیٹھا ہے)

عربی میں (۱۷) حروف جار ہیں۔ جو اس شعر میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔

بَا وَتَا وَكَافٌ وَلَامٌ وَوَاوٌ وَمُنْذُ مُذْ خَلَا ۔ رُبَّ حَاشَا مِنْ عَدَا فِيْ عَنْ عَلٰى حَتّٰى إِلٰى

با (ساتھ، سے، ذریعہ) تا (برائے قسم) کاف (مثل) لام (لئے۔ وجہ) واو (قسم) مُنْذُ (سے)

مُذْ (سے) خَلَا (سوائے) رُبَّ (کبھی) حَاشَا (سوائے) مِن (سے) عَدَا (سوائے) فِي

عَن (سے، متعلق) عَلٰى (پر، اوپر) حَتّٰى (یہاں تک) إِلٰى (تک)

حرفِ آخر

شاداب کے قارئین کا اپنا صفحہ

سب سے پہلے آپ کو ایک معیاری جریدے کی تخلیق پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ آپ کا مضمون قرآن کریم "تاریخی لحاظ سے دلچسپ ہے اور دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ "ذوالکفل" نہ صرف دلچسپ بلکہ تاریخی حوالوں سے مزین ہے البتہ قرین قیاس نہیں لگتا۔ گوتم سدھارت کو کپل وستو کوئی نہیں کہتا ... اس کا معرب ذوالکفل بن سکے۔ کپل نہیں بلکہ کپل وستو مقام کا نام ہے گوتم کا نہیں۔ اسی طرح ... ہنوں کو ملت ابراہیمی کہنا بعد مکانی سے صرف نظر کرنا ہے۔ "سفرنامہ حرمین" میں شاید آئندہ قسطوں ... عرب سوسائٹی کی جھلک نظر آئے اور اس طرح دلچسپ ہو جائے۔ ویسے بھی اہل یورپ کی زبانی تعریف سن کر مسلمان کچھ زیادہ ہی خوش ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے کے مقبول ہونے میں کچھ شک نہیں۔ "مصری کورٹ شپ" چغتائی کی شاید سب سے زیادہ غیر دلچسپ تخلیق ہوگی۔ البتہ اس سے شادی ... یاہ کے بارے میں اسلام کی ترقی پسندی کا ضرور اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے پڑھنے سے شاید ... ہتوں کا بھلا ہوگا۔ حیدرآباد کے فسادات پر قادری صاحب کی تحریر بہ حیثیت عالم دین وقت ... ا بڑی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ "اخبار کا آخری صفحہ" نہایت شگفتہ اور دلچسپ ہے ... لج کے زمانے سے یوسف ناظم کو بہ حیثیت ایک شاعر جانتا ہوں۔ ان کا یہ نیا رنگ خوب ہے۔ سراج اور رشید کیفی کی غزلیں اچھی ہیں۔ منشا اور خلیل شارق کی غزلیں بھی خوب ہیں۔ عمر خیام ... رباعی میں جس عالم [illegible] کی عکاسی کی گئی ہے کسی ترجمے میں وہ نظر نہیں آتی۔ ویسے دراج کا ترجمہ اچھا لگا جو ترجمہ کم عکاسی زیادہ ہے۔

قاضی جلیل احمد۔ لندن

"شاداب" کے اجرا پر مبارک باد قبول فرمائیے۔ حرف اول کے تحت بین السطور میں چھپے ہوئے درد کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس لیے چند کمزور پہلوؤں کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ عظیم بیگ چغتائی کے افسانہ "مصری کورٹ شپ" کا مرکزی کردار اپنی محبوبہ سے ملنے کے لیے شیخ اور نائب الشیخ کے سامنے احادیث پیش کرتا ہے اور جب ملتا ہے تو اس کا [illegible] رخصت کے وقت طویل مصافحہ بھی لیتا ہے احادیث پیش کرنے والا [illegible] اپنے مطلب کی [illegible] کے لیے کوئی سی احادیث کا سہارا لیتا ہے۔ ایک مضمون ذوالکفل پڑھ کر حیرت ہوئی

[illegible]

[illegible] کا مضمون پسند آیا۔ ڈاکٹر زینت اللہ جاوید سے تو تخلیقی رسمی اخذ انداز لیے ہوئے ہے [illegible] کی حیثیت کے تمہیدی کہانا نویسوں کو صفحۂ قرطاس پر لایا جاتا تو بڑا اچھا تھا۔ یوسف ناظم کہیں لکھے نہیں سمجھے۔ اس لیے "شاداب" میں بھی اپنا انداز لیے ہوئے ہیں۔ عربی سیکھنے کا سلسلہ جاری رکھیے تو بڑی خدمت ہوگی۔ رشید کیفی اور خشاد کی تخلیقات خوب ہیں۔ **ابوسالم۔ الیوت محل**

"شاداب" کا پہلا شمارہ ملا۔ رسالہ واقعی بہت اچھا ہے، ظاہری اور معنوی ہر دو لحاظ سے "شاداب" ہے۔ آپ نے جس معیار سے ابتدا کی ہے اس سے آپ کے عزم اور حوصلے کا اندازہ ہوتا ہے، مضامین کا تنوع بھی قابل داد ہے، عجیب بات ہے کہ اردو رسائل میں ادب کے سوا دوسرے موضوعات پر مضامین کی ایسی روایت ابھی تک نہیں بن سکی ہے۔ آپ یہ نیا رخ اختیار کیجئے۔ مختصر یہ کہ "شاداب" کی ترتیب، پیشکش اور مضامین میں انفرادیت موجود ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ **ڈاکٹر نثار احمد فاروقی۔ دہلی**

● "شاداب" دیکھ کر جی خوش ہوا، نہایت صاف ستھرا ذوقِ علم و ادب جھلک رہا ہے۔ ایک ایسے جریدے کی کمی تھی خاص کر حیدرآباد سے جو دنیا کے اہم ترین اردو علم و ادب اور تہذیب کے مراکز میں سے ایک ہے۔ "شاداب" کو اسی سلیقہ اور اسی معیار سے جاری رکھ پائیں تو یہ بڑی خدمت ہوگی۔ شاداب جیسے مرصع اور معیاری رسالہ کی اشاعت پر دلی مبارک باد۔ **ابوالفیض سحر۔ نئی دہلی**

● "شاداب" خوب ہے! "شاداب" کو دیکھ کر واقعی بڑی حیرت بھی ہوئی، معیاری اردو ماہنامہ کی اجرائی پر میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے۔ دیگر ماہناموں میں جو کسر رہ گئی ہے وہ آپ نے پوری کردی۔ "شاداب" میں مجھے وہ سب کچھ ملا جو ایک معیاری پرچہ میں ہونا چاہیے۔ شاداب ایک مکمل پرچہ ہے۔ اس کے معیار کو خدا برقرار رکھے۔ **حسینی جاوید۔ اورنگ آباد**

● ماہنامہ "شاداب" کا تازہ شمارہ موصول ہوا، یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے اپنے رسالہ کو "ادبیت" کے طلسم سے آزاد کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس وقت تقریباً ہر رسالہ افسانہ، نظم، غزل اور تنقید کے حدود میں اپنے آپ کو اس طرح محدود کرتا جا رہا ہے گویا اردو پڑھنے والوں کی دلچسپی کے لیے اب کوئی دوسرا موضوع بچا ہی نہیں۔ دراصل ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مختلف دلچسپی رکھنے والوں کے لیے خصوصی موضوعات پر پرچے نکالیں اس سے بڑا فائدہ یہ ہوگا اور پڑھنے والوں کو بھی اپنی دلچسپی کا رسالہ مل سکے گا۔ **[illegible]**

قاتع سیر وسیاحت برنز	کرنل ہنری مور	۱۸۷۵ء	-	۸۰
جلد اول				
انوس خیال (دیوان)	سید جلال الدین توفیق	۱۹۳۹ء	..	۶
موت تغزل (")	علی حیدر نظم طباطبائی	-	..	۳۰
ائے کشمیر (شیخ عبداللہ کی تقاریر وغیرہ)	غلام سرور فگار	-	..	۱۵
امۂ عشق	دیوان عابد	-	..	۱۵
برت کدۂ سندھ (سفرنامہ)	مترجم ضامن کنتوری	۱۹۰۳ء	..	۸۰
منم خانۂ عشق	امیر مینائی	۱۳۰۶ھ	..	۷۰
بانگ درا	اقبال	-	..	۲۰
گلدستۂ عشق	دیوان رند سید محمد خاں رند	۱۹۱۴ء	..	۴۰
یوان ناسخ	امام بخش ناسخ	۱۸۸۶ء	-	۴۵
فاروق حصہ اول ودوم	شبلی نعمانی	-	-	۸۰
س اقوام متحدہ اور اس کے کلیدی ملک	حبیب زین العابدین	-	..	۱۰
ھائی ہفتہ پاکستان میں (سفرنامہ)	مولانا عبدالماجد دریابادی	۱۹۵۵ء	..	۸
ان خواجہ معین الدین چشتی (فارسی)	-	۱۸۸۶ء	..	۴۵
ی اورنگ آبادی	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۱۹۸۱ء	-	۱۰۰
یرہ سرور (محمد خاں بہادر سرور)	مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	-	-	۱۰۰
ا خوبی	میرامن دہلوی "	-	-	۳۵
نزع القلوب (فارسی)	شارح مولانا محمد اکبر	-	-	۴۰
سائل طغرا (فارسی)		-	-	۲۰
طلع جگت	مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد	۱۳۲۲ھ	..	۳۰
رم اردسی	محمد عزیز مرزا	۱۹۲۴ء	..	۱۵
ب الرحمن تذکرۂ شعرائے دکن	عبدالجبار ملکاپوری	-	..	.
" " جلد اول	"	-	..	۱۵۰
" " " دوم	"	-	..	۱۵۰

MONTHLY SHADAA
REGD. No. H/HD 593
11-5-147, RED HILLS, HYD-500 C

FEBRUARY 1984.

مرے افکار کے گلشن میں جو پہنچے گا کوئی
دور تک منظرِ شاداب دکھائی دے گا

شاداب

حیدرآباد

قیمت : پانچ روپے

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد (۱) — مارچ سنہ ۱۹۸۴ء — شمارہ (۳)

مجلس مشاورت:

(ایڈیٹر)

محمد قمر الدین صابری

زر تعاون فی پرچہ: پانچ روپے

چندہ	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
	50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپیہ
سال	90 "	275 "	65 "	36 "	225 " "
تاحیات	1000 "	2,500 "	450 "	300 "	4,000 " "

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ، 147-5-11 ریڈ ہلز، حیدرآباد 500004

پرنٹر و پبلشر محمد قمر الدین صابری نے ... پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد میں طبع کروا کر ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا

حرفِ اوّل

شاداب کا چوتھا شمارہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ کوشش کی جارہی ہے مضامین کا تنوع قائم رکھا جائے اور اسے زیادہ سے زیادہ آپ کی پسند کے مطابق بنایا۔ اس سلسلے میں آپ کے تاثرات اور آرا پاکر خوشی ہوگی تاکہ ان کا لحاظ کرتے ہوئے مجلہ کو آگے بڑھایا جائے۔

اردو کے بارے میں کچھ ہل چل ہورہی ہے۔ بیانات، جلسے، سمینار اور کانفرنسیں اردو پریس کے ساتھ ہی غیر اردو پریس میں بھی کچھ چیزیں اس بارے میں نظر آرہی ہیں جو ایک آئند علامت ہے۔ وجہ چاہے کچھ رہی ہو، ضرورت ہے کہ اس کیفیت اور صورتِ حال سے اردو والے استفادہ کریں اور اردو کو پھیلانے اور آگے بڑھانے میں کچھ عملی اقدامات کی صورت پیدا کریں۔

کسی زبان کے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسی زبان میں تعلیم کا انتظام ہو۔ آندھرا پردیش خصوصاً شہر حیدرآباد میں کئی اردو میڈیم اسکول قائم ہیں۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اردو والے ان مدارس سے پورا پورا استفادہ نہیں نہیں کر رہے ہیں۔ ایک اہم نکتہ جو پیشِ نظر رکھنا ہے یہ ہے کہ اردو والے خود اپنے بچوں کو اردو میڈیم مدارس سے حتی الامکان دور رکھتے ہیں۔ ہر وہ شخص جو مالی حیثیت سے اس قابل ہو کہ اپنے بچوں کو انگریزی میڈیم مدارس میں تعلیم دلا سکے۔ مزید ایک خطیر رقم خرچ کر کے انھیں ایسے مدارس میں داخلہ دلاتا ہے۔ جو لوگ مالی اعتبار سے اس قابل نہیں ہیں کہ انگریزی میڈیم مدارس میں اپنے بچوں کو بھیج سکیں وہ بصورتِ مجبوری اردو میڈیم مدارس کا رخ کرتے ہیں اور اپنے بچوں کو وہاں بھیج کر پھر پلٹ کر نہیں دیکھتے کہ بچہ پڑھ رہا ہے یا نہیں بلکہ اسکول بھی پابندی سے جاتا ہے یا نہیں۔ نہ وہ اس بات کو ضروری سمجھتے ہیں کہ اپنے بچے کی تعلیم

کے بارے میں سوچیں انہیں روزانہ گھر میں پڑھنے کی تاکید کریں اور یہ دیکھیں کہ اسکول میں کچھ تعلیم ہو رہی ہے یا نہیں اور اگر ہو رہی ہے تو بچہ اس سے استفادہ کر رہا ہے یا نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اردو مدارس کے اساتذہ پڑھانے کی طرف مائل نہیں ہیں۔ اور طلباء تو پڑھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔

تعلیمی سوسائٹی "محفل علم و فن" نے شہر کے اردو مدارس کی بڑی تعداد کا سروے کیا۔ جس سے ظاہر ہوا۔ کہ طلباء انگریزی اور تلنگی میں تو کمزور ہی ہیں۔ انہیں اپنی مادری زبان اردو سے بھی کوئی واقفیت نہیں ہے۔ اکثر اپنا نام تک صحیح نہیں لکھ سکتے۔ اور تقریباً سبھی کو اپنے نام کے معنی معلوم نہیں ہیں بلکہ انہیں یہ بھی تعجب ہوتا ہے کہ نام کے بھی معنی ہوتے ہیں۔ اردو کتاب پڑھائی جائے تو بہ مشکل اٹک اٹک کر پڑھ لیتے ہیں لیکن ایک سطر کا مطلب بھی ان کے ذہن نشین نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ انگریزی اور تلنگی کے ساتھ ساتھ ریاضی اور سائنس بھی ان کے پلے نہیں پڑتے۔ اور سماجی علم کی اردو کتاب بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ S.S.C امتحان میں اچھے جواب لکھنے پر قادر نہیں ہوتے بلکہ اکثر نقل کرنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے۔

"محفل علم و فن" نے ہر اس ادارہ سے ربط پیدا کیا جو تعلیمی میدان میں سرگرم عمل ہے اور اردو میڈیم طلباء کے گھٹتے ہوئے معیار تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔ خود ایسی فری کوچنگ کلاسس قائم کیں جہاں بلا کسی فیس کے تعلیم دی جاتی ہے اور اسکول کے اوقات کے بعد ان طلباء کو امتحانی نقطۂ نظر سے تیار کیا جاتا ہے جو سال حال S.S.C کے امتحان میں شریک ہو رہے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ہر اس ادارے نے اس خصوص میں کام کرنے کی ضرورت ہی کو محسوس نہ کیا بلکہ اپنی طور پر عملی اقدام بھی کیے اور ایسی کوچنگ کلاسیں خود بھی چلا رہے ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک بیش بہا مدد ہے جو S S C کے امتحان میں شریک ہونے والے طلباء کو دی جا رہی ہے۔ لیکن صرف یہ ایک اقدام تعلیمی معیار کو بہتر نہیں بنا سکتا۔ ضرورت ہے کہ ابتدائی تعلیم کی بنیاد کو مضبوط بنایا جائے۔

اس سمت میں پہلا اقدام یہ ہے کہ ہر اردو پرائمری اسکول میں اردو صحیح طریقے سے لکھنے اردو پڑھنے پر توجہ دی جائے۔ روزانہ چند منٹ استاد اس کام کے لیے مختص کرے۔ ابتدائی کتاب کی ایک سطر یا چار پانچ لفظ بلیک بورڈ پر

ـ گراں کے صحیح طریقہ تحریر کو واضح کرے اور تمام بچّے اس ایک سطر یا چند الفاظ کو متعدد
مرتبہ اپنی تختیوں پر صحیح طریقہ سے سمجھ کر لکھیں۔ استاد ان الفاظ کے معانی بھی طلباء کو
بتادے اور اچھی طرح ذہن نشین کرادے۔ چند ماہ کی ایسی مشق کے بعد ہی یقین
ہے کہ طلباء اپنی کتابیں پڑھنے کے قابل ہو جائیں گے۔ صحیح طور پر لکھ سکیں گے،
در پڑھنے پر اس کا مطلب بھی ان کی سمجھ میں آ جائے گا۔ جب یہ بنیادی کمزوری دور
ہو جائے گی تو اسی طرح انگریزی اور تلنگی کی طرف بھی توجہ کی جا سکتی ہے اور اس طرح
یقین ہے کہ تعلیم میں طلبا کی دلچسپی بڑھے گی اور معیار تعلیم اچھا ہوتا جائے گا۔

"شاداب" کے پہلے دو شمارے ایسے سائز میں طبع کیے گئے جس کے مطابق
بازار میں کاغذ دستیاب نہیں ہے۔ نتیجتاً کراؤن سائز کا غذ حاصل کر کے ½ ورق کاٹ کر
مطلوبہ (رائل) سائز بنانے کے بعد استعمال میں لایا جا رہا تھا اور ادارہ شاداب اپنی
اس سائز کی خاطر یہ نقصان برداشت کر رہا تھا کہ یہ مشورہ دیا گیا کہ شاداب کو ½
کراؤن سائز پر شائع کیا جائے تو کاغذ بھی بہ آسانی دستیاب ہوتا ہے اور سائز بھی ایسا
موزوں اور مناسب ہے کہ مجلّہ کے پڑھنے میں بھی آسانی ہوتی ہے اور رکھنے میں بھی۔ نیز
رسالہ کی صورت بھی باقی رہتی ہے۔ سابقہ صفحہ میں ۲۹ سطریں اسی بین السطور کی ۲۵
سطریں موجودہ میں ہیں۔ اس بنا پر مواد میں جو کمی ہو گی اس کی تلافی کے لیے طے کیا گیا کہ تعداد
میں کمی کی جائے۔ مرمہ زر تعاون صفحہ اول پر درج کیا گیا ہے۔

مکتبۂ شاداب

—●— اردو کی معیاری علمی و ادبی کتابوں کا مرکز

—●— اردو کی کم یاب اور قدیم کتب جو بہ آسانی دستیاب نہ ہو سکتی ہوں نیز اردو کی
کتب چاہے پبلشروں کی شائع کردہ ہوں یا مصنفین نے خود چھپوائی ہوں ہم سے
طلب کیجیے۔

مکتبۂ شاداب - ۱-۵-۱۲۷ ریڈ ہلز، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴ (اے پی)

ڈاکٹر سید عبدالرحیم

مزاح گوئی دربارِ نبوی میں

ہنسنا ہنسانا انسانی فطرت کا خاصہ اور امتیاز ہے۔ اس کا زندگی میں بشاشت و لطافت، موانست و مقاربت، دل بستگی و دلجمعی نصیب ہوتی ہے۔ ہنسنے ہنسانے میں افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اعتدال و سلامتی کی راہ اختیار کرنی ضروری ہے۔ اس ضمن میں ہمیں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی سے کامل رہنمائی و رہبری ملتی ہے۔ مشکوٰۃ شریف میں دیگر ابواب کے ساتھ ایک باب "باب المزاح" بھی قائم کیا گیا ہے تاکہ امت مسلمہ اسوۂ نبوی کی روشنی میں مزاح گوئی کے اصول و آداب سمجھ کر برتنے والی بن سکے۔

ہنسانا اور دل خوش کرنا بہت بڑی عبادت ہے۔ لیکن دل خوش کرنے میں کسی دوسرے کی دل آزاری نہ ہو۔ کسی پر طعن و تشنیع نہ ہو۔ استہزا اور تحقیر نہ ہو۔ ابتذال اور پستی کا پہلو نہ ہو ورنہ نیکی برباد گناہ لازم کے مصداق دنیا و آخرت میں پکڑ کا سبب بن جائے گا۔ خالص صداقت و متانت سے مزاح گوئی کا لطف پیدا کرنا آسان کام نہیں اس کے لیے ذکاوت و فطانت کے ساتھ شرافتِ نفس کی بھی ضرورت ہے۔

حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقار و جلال کے سامنے صحابہ کرام رض دم بخود رہتے تھے۔ اور اپنے حالات و خیالات کھل کر پیش نہیں کر پاتے تھے صحابہ کرام رض کی دلبستگی و دلجمعی کی خاطر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کبھی ان سے مزاح بھی فرمایا ہے تاکہ قربت و موانست کی فضا پیدا ہو اور صحابہ اپنے حالات اور مافی الضمیر کھل کر پیش کر سکیں۔ حضور ص کبھی بچوں سے نوجوانوں سے کبھی ہم عمر ساتھیوں سے اور کبھی بوڑھی عورتوں سے خوش طبعی فرماتے تاکہ ہر عمر کا شخص آپ ص کو اپنے قریب تر سمجھنے لگے جس کے جواب میں صحابہ کرام رض بھی آپ ص سے مزاح فرماتے تھے۔ حدیث پاک میں وارد ہے کہ:

عن ابی ھریرۃ رض قالوا یا رسول اللہ انک تداعبنا قال

انی لا اقول الا حقا (رواہ ترمذی)

حضرت ابوہریرہ رض کہتے ہیں کہ صحابہ رض نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ بھی ہم سے خوش طبعی فرماتے ہیں، آپ نے فرمایا ہاں لیکن اس خوش طبعی میں بھی میں سچی بات کہتا ہوں۔"

اس حدیث پاک میں ہمیں مزاح گوئی یا خوش طبعی کا گراں قدر اصول ملتا ہے۔ آدمی خوش طبعی میں حقیقت کا اظہار کرے۔ جھوٹ اور طنز سے کام نہ لے۔ رعایت لفظی۔ چونکا دینے والی حقیقت اور حالات و افعال سے مزاح گوئی کا لطف پیدا کیا جا سکتا ہے۔

عن انس رض قال ان کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لیخالطنا حتی یقول لاخ لی صغیر یا ابا عُمَیر ما فعل النُغَیر کان له نُغَیر یلعب به فمات (متفق علیہ)

"حضرت انس رض کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے اختلاط فرمایا کرتے تھے یہاں تک کہ میرے چھوٹے بھائی سے یوں فرمایا کرتے تھے۔ عُمَیر تمہارا نُغَیر کیا ہوا (نغیر ایک چڑیا کا نام ہے) حضرت انس رض کے بھائی عُمَیر اس سے کھیلا کرتے تھے اور وہ مر گئی تھی۔ (بخاری ومسلم)"

وعنه ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال له یا ذا الاذنین (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"حضرت انس رض کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا "اے دو کان والے (ابوداؤد۔ ترمذی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مزاح گوئی کے موقعہ پر اس بات کا اظہار فرمایا کہ جس سے خوش طبعی کی باتیں کی جائیں اس سے خلوص و محبت سے دل لبریز ہو۔ اپنے قول و عمل سے اس کا اظہار ہو۔

وعنه ان رجلا من اهل البادیة کان اسمه زاهر بن حرام وکان یهدی صلی اللہ علیہ وسلم من البادیة فیجهزه رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اراد ان یخرج فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان زاهرا بادیتنا ونحن حاضروه وکان

النبی صلی اللہ علیہ وسلم یحبہ وکان ذمیما فاتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوما وھو یبیع متاعہ فاحتضنہ من خلفہ وھو لا یبصرہ فقال ارسلنی من ھذا فالتفت فعرف النبی صلی اللہ علیہ وسلم فجعل لا یالو ما الزق ظھرہ بصدر النبی صلی اللہ علیہ وسلم حین عرفہ وجعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول من یشتری العبد فقال یا رسول اللہ اذاً واللہ تجدنی کاسداً فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لکن عند اللہ بکاسد (رواہ فی شرح السنۃ)

"حضرت انس رضہ کہتے ہیں کہ جنگل کا رہنے والا ایک شخص جس کا نام زاہر بن حرام تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جنگل سے تحفہ کے طور پر کچھ لایا کرتا تھا (یعنی سبزی ترکاری وغیرہ) اور جب وہ جاتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے (سفر) کا سامان درست فرما دیتے تھے۔ آپ نے فرمایا زاہر رضہ ہمارا باہر کا گماشتہ اور ہم اس کے شہر کے گماشتہ ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بہت محبت فرماتے تھے وہ بدصورت شخص تھا ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم بازار میں تشریف لے گئے تو آپ نے زاہرؓ کو سودا بیچتے ہوئے دیکھا آپ نے اس کے پیچھے جا کر اس کی آنکھیں بند کرلیں کہ وہ دیکھ نہ سکے۔ زاہر رضہ نے کہا کون ہیں؟ مجھے چھوڑ دیں۔ پھر زاہرؓ نے کن انکھیوں سے دیکھ کر آپ کو پہچان لیا اور اپنی پشت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینۂ مبارک سے لگانے میں پوری کوشش کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کوئی اس غلام کو خریدتا ہے؟" زاہر رضہ نے عرض کیا "یا رسول اللہ! قسم ہے خدا کی آپ مجھ کو ناکارہ (بے قیمت) پائیں گے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" لیکن اللہ کے نزدیک تم ناکارہ (کم قیمت) نہیں ہو (شرح السنہ)"

وعنہ ان رجلا استحمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

... حاملك على ولد ناقة فقال ما اصنع بولد

الناقة فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم وهل

تلد الابل الا النوق (رواه الترمذي وابوداؤد)

"حضرت انس رضؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سواری طلب کی آپ صؐ نے فرمایا میں تمہیں سواری کے لیے اونٹنی کا بچہ دوں گا۔ اس شخص نے کہا میں اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کروں گا آپ صؐ نے فرمایا "اونٹ کو تو اونٹنی ہی جنتی ہے (ترمذی۔ ابوداؤد)

وعنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال لامراة عجوز انه لا تدخل

الجنة عجوز فقالت وما لهن وكانت تقرأ القرآن فقال

لها اما تقرئين القرآن إِنَّا أَنْشَأْنَاهُنَّ إِنْشَاءً فَجَعَلْنَا

هُنَّ أَبْكَارًا (رواه رزين وفي شرح السنة بلفظ المصابيح)

"حضرت انس رضؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بوڑھی عورت سے فرمایا کہ بڑھیا جنت میں نہیں جائے گی۔ بڑھیا نے عرض کیا "کیا سبب ہے کہ وہ جنت میں نہیں جائیگی" (بڑھیا قرآن پڑھی ہوئی تھی) آپ صؐ نے فرمایا کیا تو نے قرآن میں یہ آیت نہیں پڑھی إِنَّا أَنْشَأْنَاهُنَّ إِنْشَاءً فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَارًا (سورہ واقعہ ۳۶-۳۵) یعنی ہم پیدا کریں گے عورتوں کو (جنت میں) دوبارہ پیدا کرنا پس ہم بنا دیں گے ان کو کنواری (شرح السنہ)

عن النعمان بن بشير قال استاذن ابوبكر على النبي صلى

الله عليه وسلم فسمع صوت عائشة عاليا فلما دخل تناولها

ليلطمها وقال لا اراك ترفعين صوتك على رسول الله

صلى الله عليه وسلم فجعل النبي صلى الله عليه وسلم

يحجزه وخرج ابو بكر مغضبا فقال النبي صلى الله عليه

وسلم حين خرج ابو بكر كيف رايتني انقذتك من

الرجل قال فمكث ابو بكر اياما ثم استاذن فوجدهما

قد اصطلحا فقال لهما ادخلاني في سلمكما كما

ادخلتماني في حربكما فقال النبي صلى الله عليه وسلم قد فعلنا

(رواه ابوداؤد)

نعمان بن بشیر رض کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رض نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گھر آنے کی اجازت طلب کی۔ معاً انہوں نے حضرت عائشہ رض کی آواز کو سنا بلند بلند سے بول رہی تھیں۔ اندر داخل ہوکر حضرت ابوبکر رض نے حضرت عائشہ رض کا ہاتھ پکڑ لیا اور طمانچہ مارنے کا ارادہ کیا۔ اور فرمایا خبردار، آئندہ میں تجھ کو رسول اللہ صلعم کی آواز سے بلند آواز میں بولتا ہوا نہ دیکھوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو روکنا اور منع کرنا شروع کیا (یہاں تک کہ معاملہ رفع دفع ہوگیا) اس کے بعد حضرت ابوبکر رض غضب ناک حالت میں گھر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رض سے فرمایا "تم نے دیکھا ہم نے کیسے اس شخص یعنی حضرت ابوبکر رض کے ہاتھ سے بچا لیا" اس کے بعد کئی روز تک حضرت ابوبکر رض آپ کے پاس نہیں آئے۔ پھر ایک روز انھوں نے حاضر ہوکر اجازت طلب کی اور گھر میں جاکر دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہ رض دونوں صلح کی حالت میں بیٹھے ہیں حضرت ابوبکر رض نے دونوں کو مخاطب کرکے کہا

"مجھ کو اپنی صلح میں شامل کریجیے جس طرح آپ نے مجھ کو اپنی لڑائی میں شریک کیا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہم نے ایسا کیا (یعنی تم کو صلح میں شامل کرلیا۔ (ابوداود)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس ذات سے مزاح گوئی کے کلمات سن کر صحابہ کرام رض بھی آپ سے مزاح فرماتے تھے لیکن اس طرح کہ آپ کی مجلس کے وقار میں کچھ فرق نہیں آتا تھا۔ حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں کہ آپ کا ہنسنا صرف تبسم ہوتا تھا عبداللہ بن حارث رض کہتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تبسم کرنے والا نہیں دیکھا اور بعض اوقات آپ اس طرح بھی ہنسے کہ دندان مبارک ظاہر ہوگئے۔

مزاح گوئی کے چند واقعات صحابہ کرام رض کے درج کیے جاتے ہیں۔

عن عوف بن مالك الاشجعی قال اتیت رسول الله صلی الله علیه وسلم فی غزوة تبوك وهو فی قبة من ادم فسلمت فرد علی وقال ادخل فقلت اكلی یا رسول الله قال كلك فدخلت قال عثمان بن ابی العاتكه انما قال ادخل كلی من

عوف بن مالک اشجعی رضہ کہتے ہیں کہ غزوہ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت آپ ص چمڑے کے ایک خیمہ میں تشریف فرما تھے میں نے آپ کو سلام کیا آپ ص نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا اندر آجاؤ میں نے (مزاح کے طور پر) عرض کیا یا رسول اللہ صاحب کا سب آجاؤں؟ آپ نے فرمایا سب کا سب آجاؤ یعنی سارے بدن کو اندر لے آؤ چنانچہ میں خیمہ میں داخل ہوگیا۔ اس حدیث کے راوی حضرت عثمان بن ابی عاتکہ رضہ کہتے ہیں کہ عوف بن مالک رضہ نے یہ فقرہ اس لیے کہا تھا کہ خیمہ چھوٹا تھا (ابوداؤد)

حضرت صہیب رضہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ کھجور نوش فرما رہے تھے اور میری آنکھ دکھ رہی تھی۔ میں بھی ساتھ کھانے لگا۔ حضور ص نے فرمایا کہ آنکھ تو دکھ رہی ہے اور کھجوریں کھاتے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ حضور ص اس آنکھ کی طرف سے کھاتا ہوں جو تندرست ہے۔ حضور ص یہ جواب سن کر ہنس پڑے۔ (حکایات صحابہ۔ باب اول)

ایک مرتبہ حضور ص کی مجلس میں صحابہ کرام رضہ کھجوریں کھا رہے تھے۔ حضرت علی بھی ساتھ تھے۔ صحابہ کرام رضہ نے نظر بچا کر کھجور کی گٹھلیاں حضرت علی رضہ کے سامنے جمع کردیں اور عرض کیا کہ حضور ص دیکھیے حضرت علی رضہ نے کتنی کھجوریں کھائی ہیں۔ حضرت علی نے جواب دیا حضور ص میں کھجوریں کھاتا رہا اور گٹھلیاں نکالتا رہا۔ ان کھجوروں کا کیسے حساب کیا جائے گا جو گٹھلیوں سمیت کھائی گئی ہیں۔

محسن بھوپالی

نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھیے
منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

ریاض ——

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

لیڈی ایولن کبولڈ زینب

مترجم محسن بن شبیر

سفر نامۂ حرمین

مدینے کی طرف روانگی

۵ ر مارچ [illegible] نمازِ صبح کے بعد مدینے روانہ ہوئے۔ میں نے مدینے کی زیارت کے لیے بیس دن کے واسطے ایک موٹر کرایہ پر لی تھی۔ اس کا ڈرائیور رستے سے واقف ایک عرب تھا۔ میرے ہمراہ فلبی کا ملازم مصطفےٰ تھا۔ رہنمائی و خدمت گاری کسی کام میں اس کو عذر نہ تھا۔ تیسرا آدمی ہمارے ساتھ مسٹر فلبی کے باورچی کا باپ ایک غریب بڈھا سوڈانی تھا۔ جو حج کے لیے ڈنگلا سے آیا ہوا تھا۔

ہمارا پہلا پڑاؤ رابغ پر ہوا۔ یہاں سے ہم حدودِ ممنوعہ میں داخل ہوگئے اور ہمارے پاسپورٹ دیکھ بھال ہوئی۔ رابغ ایک بندرگاہ ہے۔ یہاں بھوک بند کردینے والی ایک عجیب غذا دیکھنے میں آئی اسے سُویق کہتے ہیں۔ سبز اناج کو بھون کر پیس لیتے ہیں اور اس میں کھجوریں ملادیتے ہیں، یہ حاجیوں کے مطلب کی چیز ہے، ذرا سی کھالیں تو بہت دیر تک سہارا ہو جاتا ہے۔ رابغ سے چل کر ہم تربوزوں کے کھیتوں اور نخلستانوں میں سے گذرے اور ایک سوکھے نالے کو عبور کرنے کے بعد پھر ایک بے آب و گیاہ ریگستان میں پہنچ گئے۔

جدے سے مدینہ ڈھائی سو میل ہے جسے طے کرنے میں پندرہ گھنٹے صرف ہوئے، اونٹ معمولی رفتار سے اسے دس دن میں طے کرتے ہیں۔ اور پیدل اکیس دن میں۔ فرنگی حساب سے رات دس بجے ہم مدینے کے دروازے باب عنبریہ پہنچے۔ پوچھ گچھ ہوئی، پاسپورٹ دیکھا گیا۔ شہر کے دروازے بند ہوئے بہت دیر ہوچکی تھی۔ مگر امیر مدینہ نے حکم دے رکھا تھا کہ جب میں یہاں پہنچوں اسی وقت شہر میں داخل ہونے کی اجازت دیدی جائے۔ اتنے میں وہ آدمی بھی آگیا جس سے ملنے کا حکم تھا۔ اس کی رہنمائی میں ہم شہر میں داخل ہوئے۔ سنسان گلیوں اور آنت کی تانت سڑکوں پر چلتے چلتے ہم ایک محراب کے پاس پہنچے جس میں ہماری موٹر نہیں گھس سکتی تھی

[illegible] اچھی [illegible] پیدل چلتے ہوئے ایک بلند مکان کے [illegible]
کافی کھٹکھٹانے کے بعد دروازہ کھلا۔ مجھے سیڑھیوں پر سے بالا خانے لے جایا گیا۔ ایک
چھوکری میرے لیے چائے، جس میں نمک اور شکر لائی کہ نمک ڈال کر دہی پیوں یا شکر ڈال کر۔
اس وقت پیاس کے مارے بری حالت تھی۔ اس چائے نے جان ڈال دی۔ اسی وقت مزور
جو مدینے کی زیارت کی دعائیں پڑھاتا ہے، آیا۔ صلاح یہ ٹھیری کہ نماز صبح کے لیے میں اس کے
ساتھ مسجد نبوی میں حاضر ہوں، یہ خیال کرتے کہ سونے کے لیے مجھے چار پانچ گھنٹے ملیں گے
میں لیٹ گئی اور جب آنکھیں بند کیں تو کسی حاجی کی قرات سنائی دی، وہ سورۂ یوسف پڑھ
رہا تھا۔ ان جادو بھرے لفظوں اور دلکش آواز سنتے سنتے میری آنکھ لگ گئی۔

مدینے کی صبح
۱۹ مارچ ۱۹۳۳ء

صبح اذان کی آواز سے میں جاگی۔ ایک کھڑکی میں سے مجھے بلند مینار اور آنحضرت کے مقبرہ کا سبز گنبد کچھ دھندلا دھندلا نظر آیا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے اچھی طرح برقعہ اوڑھ لیا اور مزور کے پیچھے پیچھے مسجد کو چلی۔ تنگ گلیوں کی گڑ بڑ میں سے گذرتی ہوئی میں ایک کھلی زمین پر پہنچی اور ایک بڑے دروازے میں سے ایک صحرا ایسا صحن میں داخل ہوئی۔ اور جلدی سے جوتے پھینک کر اس چوکھٹ سے آگے بڑھی جہاں تک بہت کم فرنگیوں کی رسائی ہوئی ہے اور کسی فرنگی عورت کو تو اس سے گذرنا نصیب ہی نہیں ہوا ہے۔ میرے بدن میں ایک سنسنی دوڑ گئی، میں اپنے رہنما کے پیچھے پیچھے بے شمار سنگین ستونوں میں سے گذرتی اور نمازیوں کے بیچ میں سے ہوتی ہوئی اس مقام پر پہنچی جسے روضہ کہتے ہیں۔ اور دو رکعت نماز پڑھی، یہاں بہت سے نمازی تھے، قرآن خوانی بھی ہو رہی تھی، بایں ہمہ مسجد کے آداب کے لحاظ سے ایک خاموشی کا عالم طاری تھا۔ پھر میں آنحضرت کے مرقد پر حاضر ہوئی یہاں مجمع اور زیادہ تھا، سب سلام پڑھ رہے تھے۔ میں نے بھی اپنے مزور کے ساتھ سلام پڑھا۔

گھر پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ کئی شخص مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ ان میں ایک تو علاقہ میکینز کا پاشاہ تھا جو میرے ساتھ سوئیز سے جدّہ آیا تھا۔ دو صاحب اور تھے جن سے مصر میں ملاقات ہوئی تھی اور ایک مصطفےٰ کے دوست سید ابو السعید مدینے کے رہنے والے تھے۔ صاحب سلامت اور مزاج پرسی کے بعد قبروں کے انہدام پر گفتگو ہوئی۔
تمام حاضرین کو اس پر اتفاق تھا کہ "قبروں پر دعائیں مانگنا اگرچہ آنحضرت ؐ کی تعلیم کے موافق

[illegible] تمام وہابیوں نے اس شخص کو [illegible] کو زندہ کرنے کی اسند میں جس کا قول [illegible] سے زیادہ سختی کی، قبروں پر منتیں ماننے کی جاہلانہ رسم کو مٹانے کے لیے کوئی دوسرا طریقہ [illegible] اختیار کیا جا سکتا تھا۔"

مدینہ کی عورتیں

۱۰ مارچ ۱۹۶۳ء

آج صبح میں اپنی ڈائری لکھ رہی تھی کہ مجھے اطلاع ملی کہ میرے [illegible] کے انتظار میں کچھ عورتیں نیچے بیٹھی ہوئی ہیں۔ میں خوشی خوشی ان کے پاس گئی۔ یہ پانچ عورتیں تھیں۔ ایک میرے دمشقی ملاقاتی کی بیوی بہت قبول صورت، ایک اس کی بہن اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ اور ایک کوئی اور مہنس مکھ بی بی تھیں۔ جب ان عورتوں نے اپنا اوپر کا سیاہ ساٹن کا ریشمی لباس اتار دیا تو میں نے دیکھا وہ نیچے مہریوں کے چوڑی دار چست پیجامے پہنے ہوئے تھیں جو دیکھنے میں کو اچھے معلوم ہوتے ہیں یہ عموماً دھاری دار مشر و یا سوتی کپڑے کے ہوتے ہیں۔ ان کے بدن میں لمبی آستینوں کا باڈیس، اس کے اوپر ڈھیلا ڈھالا جالی کا کرتہ۔ اور سر پر رنگین ریشمی کپڑے کا قصابہ تھا جس کا ایک سرا کندھے پر لٹکا رہتا ہے۔ یہ اپنے بال دو چوٹیوں میں گوندھتی ہیں اور ان میں کوئی خوش رنگ ربن یا موتی لگا ہوا موباف پڑا ہوا رہتا ہے۔ پوڈر اور گلگونہ کا [illegible] نہیں۔ ہاں آنکھوں میں سرمہ سب لگاتی ہیں، ان کے دانت بہت خوشنما تھے اور یہ بہت آراستہ پیراستہ تھیں۔ میرے ملک اور وہاں کی عورتوں کے حالات بڑی دل چسپی سے سن رہی تھیں۔ انھوں نے یہ بھی پوچھا کہ میں کب اور کیوں مسلمان ہوئی۔ دوپہر کے وقت جب ظہر کی اذان ہوئی میں نے انہیں مسجد چلنے کے لیے کہا، انھوں نے عذر کر دیا، جب میں واپس آئی تو دیکھا وہ میرے کمرے میں نماز پڑھ رہی تھیں، میں نے ان سے کھانے کے لیے کہا، کھانا آیا اور ہم سب ایک بڑے دستر خوان پر بیٹھ گئے، ترکاریاں اور تلا ہوا گوشت تھا، ہم نے ہاتھوں اور چمچوں سے کھایا جب کھا چکے تو ایک مجھوکری پانی کا لوٹا، چلمچی اور نرم تولیہ لائی اور ہمارے ہاتھ دھلائے میں چاہتی تھی کہ میرا دوپہر کا سونا ناغہ نہ ہو اور یہ اٹھنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ اس لیے میں نے ان سے لیٹنے کی اجازت مانگی اور کمبل پر سو گئی۔ جب میں جاگی تو دیکھا وہ ابھی تک میری میزبان سے جی لگا کر باتیں کر رہی ہیں۔ عرب عورتوں کا قاعدہ ہے کہ وہ کسی سے ملنے جاتی ہیں تو دن بھر اس کے ہاں ٹھیرتی ہیں۔ جب سہ پہر آئی تو میں انہیں اپنی میزبانوں سے باتیں کرتے چھوڑ کر مصطفےٰ کے ساتھ مدینہ طیبہ کی سیر کو پیدل روانہ ہو گئی۔

مدینہ کے بازار

مدینے کے چھتے ہوئے بازاروں کی خنکی، گلیوں کی دھوپ کی گرمی، پھلوں کے رنگ برنگ کپڑے اور بزرگوں کی سفید زرین عبائیں یہاں کے یہاں کے منظر کو دل فریب بنا دیتی ہیں، رستے والوں کی السلام علیکم کی آواز کانوں کو نغمہ کا کام دیتی ہے، دو ملاقاتیوں کا باہم سلام علیک کرنے میں پیش قدمی کرنا بہت ہی مسرت انگیز ہوتا ہے۔

"اگر کوئی تم کو سلام کرے تو اس کو نہایت خندہ پیشانی سے جواب دو، اللہ ہر بات کا حساب کرنے والا ہے۔" (قرآن سورہ ۴ آیت ۸۶)

آقا، ملازم، مال دار، غریب، عالم و جاہل سب ایک دوسرے کو یکساں تعظیم کے ساتھ سلام کرتے ہیں۔ اور کوئی اس کو کسر شان نہیں سمجھتا۔

شام کے وقت بازار کے کسی نکڑ پر یا کسی کھلی جگہ شفق کی روشنی میں تھوڑا سا مجمع داستان گو کی باتیں سننے کے لیے اکٹھا ہو جاتا ہے، داستان گوئی پرانا پیشہ ہے اور مشرق کے شہروں میں ہمیشہ پسند رہا ہے۔ اگرچہ سینما اور تھیٹروں نے زمانہ حال کے تہذیب یافتہ شہروں، قاہرہ والجزائر وغیرہ سے ان کو نکال باہر کر دیا ہے۔ تاہم میں نے مراکش کی جامع القضا میں مسلمانوں کو داستان گو کے قصے شوق سے سنتے دیکھا ہے، اب مدینے میں بھی یہ منظر دیکھنے میں آیا۔ داستان گو عموماً یا تو گھوڑی کی چوری کی کہانی یا الف لیلیٰ کی کوئی داستان یا زمانۂ جاہلیت کے شاعر عنترہ کا کوئی قصہ بیان کرتے ہیں یہ قصے عین تنت پر ختم کر دیئے جاتے ہیں۔ اور سامعین کو دوسری رات کے لیے مشتاق چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں عرب کے موجودہ سلطان کے شجاعانہ کارناموں کا مسالا بھی داستان گویوں کے ہاتھ لگ گیا ہے، سلطان عبدالعزیز ابن سعود کی عجیب و غریب سوانح عمری بڑے شوق سے سنی جاتی ہے۔ ریگستان کے ڈیروں کی مدھم روشنی میں اور قہوہ خانوں میں مشعل کے سامنے لوگ اس شہزادے کا سنسنی پیدا کر دینے والا ہوش ربا قصہ بڑی توجہ سے سنتے ہیں کہ کس طرح یہ گیارہ برس کی عمر میں اپنے وطن سے نکالا گیا، کس طرح اس کے باپ نے نجد کا تخت کھو دیا، کس طرح اس نے اپنے وطن کے پہاڑوں کی یاد میں بیمار رہ کر خلیج فارس کے بندرگاہ کویت میں آٹھ برس گزارے، کس طرح یہ انیس برس کی عمر میں صرف چالیس آدمیوں کے ساتھ اپنے ملک کو واپس آیا، کس طرح اس نے معجز نما بہادری کے ساتھ جو ارسطو کے قصوں کا سب سے زیادہ حیرت ناک ہے۔ اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کے پایہ تخت ریاض پر قبضہ کیا

کس طرح اس نے [illegible] حکومت قائم کی، کس طرح [illegible] ترکی [illegible] طاقت [illegible]
ابن رشید اور حجاز کے سابق سلطان شریف حسین کی فوجوں سے لڑتا رہا۔ اور کس طرح [illegible]
[illegible]۔ داستان کو جب زمانہ حال کے ان سچے واقعات کو بیان کرتا ہے تو وہ پچھلی کے پرانے قصوں سے بڑھ کر تعجب خیز معلوم ہوتے ہیں۔ اس شہزادے نے جس طرح ملک گیری میں کمال کیا ہے۔ اسی طرح ملک داری میں بھی یہ کمال رکھتا ہے۔ جیسا کہ میدان رزم کا شیر ہے اسی طرح بزم سیاست کا بھی شاطر ہے۔ اس نے ریگستان کے منتشر قبائل کو اتحاد و اخوت کی ایک زبردست زنجیر سے جکڑ دیا ہے جو ملک غالبًا دنیا بھر میں سب سے زیادہ بے آئین تھا۔ وہاں سے اس نے بے قاعدگی و رہزنی کو نیست و نابود کر دیا ہے۔ اور اب یہ بہ حیثیت محافظ حرمین الشریفین خود مختارانہ قوت کے ساتھ عرب پر حکومت کر رہا ہے۔

بقیع کی زیارت

۱۸ / مارچ ۱۹۳۳ء

قبرستان بقیع شہر کی فصیل سے ملحق اور مسجد نبوی سے کوئی تین چار سو قدم ہے۔ میں نے مزور کے ساتھ سلام اور فاتحہ پڑھی۔ مزور نے یہاں نو امہات المومنین کی قبریں مجھے دکھائیں، یہ قبریں کسی وقت ایک قبہ دار سفید عمارت میں محصور تھیں جن کو چند سال ہوئے وہابی سپاہیوں نے سنگ دلی کے ساتھ منہدم کر دیا، حضرت فاطمہ اور ان کے فرزند امام حسن کی قبریں بھی پاس پاس ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے مشاہیر کی قبریں تھیں لیکن تمام مزارات منہدم کر دیے گئے اور اب صرف چند پتھران کی آخری خواب گاہ کا پتہ دے رہے ہیں۔

آنحضرت صلعم نے متعدد عقد کیوں کیے

آنحضرت صلعم پر بعض لوگ آپ کی متعدد ازدواج کی وجہ سے اعتراض کرتے ہیں اس لیے یہ تحریر کر دینا مناسب ہے کہ آپ کی پہلی بیوی خدیجہ رض جو پچیس سال تک آپ کے ساتھ رہیں وہ عمر میں آپ سے بہت بڑی تھیں، بہ حیثیت ایک متاہل شخص کے آپ کی یہ زندگی کسی طرح قابل اعتراض نہیں ہے۔ خدیجہ کی وفات کے بعد جب کہ آپ کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی آپ نے عائشہ بنت ابوبکر رض سے شادی کی اور آپ کی آخری عمر میں صرف یہی ایک بیوی اصلی بیوی کہی جا سکتی ہیں، دوسری بیویاں بجز ایک کے سب بیوہ تھیں جن میں سے بعض کے شوہر اسلام کی خاطر شہید ہو چکے تھے اور وہ بے سہارا رہ گئی تھیں، پیغمبر اسلام کے ناکافی ذرائع آمدنی کے لحاظ سے ان بیواؤں کی کفالت کا ذریعہ صرف یہی تھا کہ آپ ان کے ساتھ

حضور کی اپنی محبت کے زیر سایہ ان کو بٹھا دیں۔ ان بیویوں میں کوئی بھی جوان نہ تھی وہ عورتیں تو ساٹھ ساٹھ برس سے زائد عمر کی تھیں، ایک حفصہ بنت عمرؓ تھیں۔ حضرت عمرؓ آنحضرتؐ کے رفیق خاص تھے جو آگے چل کر وہ اسلام کے خلیفہ ثانی بھی ہو گئے۔ حفصہ رضؓ کا شوہر جنگ میں مارا گیا تھا اور چونکہ وہ بہت بدمزاج تھیں اس لیے لوگ ان سے شادی کرنے سے گھبراتے تھے اور یہ اندازہ تھا کہ ان کو ساری عمر بیوگی کی زندگی بسر کرنی پڑے گی۔ وہ ابھی جوان تھیں اور عربوں کے دستور کے مطابق جوان عورت کا گھر میں بیٹھنا حضرت عمر کے خاندان کی بدنامی کا باعث تھا۔ جس کے رفع کرنے کے لیے حضرت عمر نے اولاً حضرت ابوبکر سے حفصہ رضؓ کے ساتھ نکاح کرنے کے لیے کہا، جب انھوں نے قبول نہ کیا تو حضرت عثمانؓ سے ذکر کیا وہ بھی حفصہؓ کی بدمزاجی کی وجہ سے کانوں پہ ہاتھ دھر گئے، حضرت عمر اس توہین کو گوارا نہ کر کے غصّہ کی حالت میں آنحضرت صؐ کے پاس گئے، حضور ؐ نے حضرت عمر کو ٹھنڈا کر دینے اور دوستوں کے ساتھ محبت قائم رکھنے کے خیال سے ان بی بی کے ساتھ خود نکاح کر لینے پر رضامندی ظاہر فرما دی جس سے مہاجرین مکہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور حضرت عمر کو اس بات کی بڑی خوشی تھا کہ ان کی لڑکی ان کے واجب التعظیم آقا کی بیوی بن گئی۔

شہدائے اُحد

آج سہ پہر کو مجھے موٹر میں پھرنے کی اجازت مل گئی اور میں اس میں بیٹھ کر جبل اُحد کی زیارت کے لیے گئی۔ یہ مدینہ سے چند میل ہے، میں نے وہ مقام دیکھا جہاں غزوہ احد کے موقعہ پر دونوں فوجوں نے مورچے بنائے تھے اور تیروں، نیزوں پتھروں سے لڑائی ہوئی تھی۔ ہم اس پہاڑ پر بھی چڑھے جس کے غار میں سے حضرت محمدؐ وابوبکرؓ و عمرؓ نے لڑائی کا معائنہ کیا تھا، حضرت حمزہ رضؓ جہاں شہید ہوئے تھے وہیں دفن کر دیئے گئے اور ستر مسلمان جو لڑائی میں مارے گئے تھے۔ وہ ان کی قبر کے پاس دفنا دیئے گئے۔ اب یہ قبر مٹی کا ایک ڈھیر ہے اور صرف چند پتھر ان شہیداں کی نشان دہی کر رہے ہیں۔ چٹان کے غار کے پاس سے نیچے کی طرف مدینے کا منظر بہت اچھا ہے اور یہاں سے یہ محصور میناروں والا خوب صورت شہر جس کے اطراف باغات، نخلستان اور پہاڑ پھیلے ہوئے ہیں نیلے آسمان کے نیچے بہت بھلا معلوم ہوتا ہے حکایات کے لحاظ سے قیامت یہیں بپا ہونے والی ہے۔ اس وقت تمام خلق اپنا حساب کتاب دینے کے لیے یہیں جمع ہوگی۔ اسلام صرف انسان ہی کے لیے فنا لازمی نہیں سمجھتا بلکہ دنیا کے ہر

ہر ذی روح کو زوال پذیر قرار دیتا ہے۔ یہ تعلیم ان لوگوں کی تسلی کا باعث ہے جو کسی کے مرنے پر آنسو بہاتے ہیں۔ قرآن میں ہے۔

"زمین پر نہ ایسا کوئی چرند ہے نہ پرند جو تمہارے مثل جان نہ رکھتا ہو۔ اس کتاب میں ہم نے کوئی چیز ایسی نہیں چھوڑی جس کا ذکر نہ کیا ہو۔ یہ سب خدا کی طرف پہنچائے جائیں گے۔"

جانوروں کے ساتھ اچھے سلوک کے بارے میں آنحضرت ؐ نے فرمایا ہے۔

"جانوروں کے بارے میں تم خدا سے ڈرتے رہو، جب وہ سواری کے قابل ہوں ان پر سوار ہو، جب وہ تھک جائیں ان پر سے اتر پڑو، بے زبان جانوروں کے ساتھ نیکی کرنے کا اور ان کے دانے چارے کے خیال رکھنے کا بھی تم کو اجر ملے گا۔"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"ایک ساعت خدا کی مخلوق پر غور کرنا ایک سال کی عبادت سے افضل ہے۔"

قرآن شریف میں ہے:

"تعریف خدا کے لیے زیبا ہے جس نے تمام چیزوں کے جوڑے بنائے ان چیزوں کے جو زمین میں اگتی ہیں، انسانوں کی جنس کے اور ان چیزوں کے جن کو وہ نہیں جانتے۔"

سائنس کی جدید ترین تحقیقات بھی یہی ہے کہ دنیا کی ہر چیز نر و مادہ کی صورت میں پیدا کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ پتھر، شیشے اور بجلی کا بھی جوڑا ہے۔

عالیؔ

یہاں کسی کو بھی کچھ حسب آرزو نہ ملا ٭ کسی کو ہم نہ ملے، کسی کو تو نہ ملا

حفیظ

نہیں عتاب زمانہ خطاب کے قابل ٭ ترا جواب یہی ہے کہ مسکرائے جا

منیر احمد صدیقی

حضرت مجدد الف ثانیؒ

حضرت مجدد الف ثانی جن کا اصلی نام احمد لقب بدر الدین اور کنیت ابو البرکات ہے ۱۴ شوال ۹۷۱ ہجری کو سرہند کے مقام پر پیدا ہوئے۔

شہنشاہ اکبر (۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء) کے بعد برصغیر میں الحاد و لا دینی طاقتوں نے بڑا زور پکڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا ملک مذہبی خلفشار اور بدعنوانیوں کا شکار ہو گیا۔ اکبر نے اپنی سیاسی مصلحتوں سے اسلام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا اور ہندو رسومات اور عقیدوں نے مسلمانوں کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے مسلمانوں کو راہ راست پر لانے اور اسلام کی صحیح تعلیم کو عام کرنے کا عزم کیا اور اس میں انھیں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔

حضرت مجدد الف ثانی نے شرع کی اشاعت کے علاوہ اسلام کی جو سب سے بڑی خدمت انجام دی وہ بدعت کے خاتمے کے لیے میدان عمل میں آنا اور بادشاہ وقت سے ٹکر لینا ہے۔ شریعت و طریقت کی تبلیغ کے علاوہ آپ نے برصغیر میں سلسلہ نقشبندیہ کی ترقی و ترویج کے لیے بڑا کام کیا۔ برصغیر میں الحاد و لا دینی کے پرآشوب دور میں آپ نے تجدید دین کا علم بلند کیا اور حق کی آواز برصغیر کے کونے کونے میں پہنچانے کا تہیہ کر لیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد مجدد الف ثانی رح کی خدمات اور کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ مجدد الف ثانی رح نے تن تنہا حالات کو سدھارنے کا بیڑا اٹھایا اور تصوف کے ایک ایسے سلسلے کی اشاعت کی جو ہندوستانی طریقوں میں شریعت کے قریب ترین تھا۔ برصغیر ہندوستان میں شروع ہی سے تصوف کا بڑا گہرا اثر رہا ہے اور مسلمانوں کا عام خیال یہی تھا کہ صوفیانہ سلسلے میں داخل ہوئے بغیر اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا ممکن نہیں ہے۔ آپ نے

سلسلہ نقشبندیہ کو عام کرنے کا ایک جامع پروگرام مرتب کیا اور تحریر و تقریر سے اپنے پیغام کو سارے برصغیر میں پہنچا دیا۔

"شیخ محمد اکرم نے "رود کوثر" میں لکھا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی رح نے عقیدہ وحدۃ الوجود کی نئی توجیہہ کی اور وحدت الشہود کا نظریہ قائم کرکے مسلمان صوفیاء اور علماء کے اختلاف کو بعینہ اس طرح رفع کیے جس طرح امام شافعی رح نے اہل الرائے اور اہل حدیث کے کیے۔

حضرت مجدد الف ثانی رح نے مکتوبات میں تحریر فرمایا ہے کہ مقام وحدت الوجود سالک کو ابتدائے سلوک میں پیش آتا ہے جس سے اسے گزر جانا چاہیے اور جہاں سے بالاتر مقام پر عروج کرتا ہے اس پر مقام وحدت الشہود منکشف ہوتا ہے جو شرع کے عین مطابق ہے۔

آپ نے طریقہ نقشبندیہ کی اشاعت، شریعت اور طریقت کی تطبیق اور بدعت کی مخالفت کے علاوہ جو اہم کام انجام دیا وہ اسلام کا عام احیائ ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی کی تصانیف کو اپنی زندگی میں بڑی مقبولیت حاصل ہوی اور دیکھتے ہی دیکھتے آپ کے سلسلہ تصوف کے ماننے والوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ آپ کی علمیت قابلیت اور مقبولیت بعض علماء اور دربار جہانگیری کے حکام کو ناگوار گذری اور آپ کے خلاف ایک محاذ قائم ہوگیا آپ نے تمام مخالفتوں کی پرواہ کیے بغیر اپنے مشن کو جاری رکھا۔ حضرت مجدد الف ثانی رح کی تعلیمات کا مسلمانوں پر بڑا اچھا اثر مرتب ہوا اور لوگوں میں عقائد کی اصلاح اور بدعت کے خاتمے کا خیال عام ہونے لگا تو آپ کے مخالفین نے بادشاہ وقت جہانگیر کو آپ کے خلاف بھکا دیا۔ جہانگیر نے آپ کو اپنے دربار میں طلب کیا اور سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ آپ نے سجدہ کرنے سے انکار کردیا۔ آپ نے کہا غیر حق کو کبھی سجدہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ جہانگیر اس بات پر ناراض ہوگیا اور آپ کو گوالیار کے قلعہ میں قید کردیا گیا۔ مجدد الف ثانی رح نے جہانگیر کو سجدہ کرنے سے انکار کرکے عملی طور پر یہ ثابت کردیا کہ وہ کوئی کام خلاف شرع نہیں کرسکتے خواہ اس کے لیے انھیں کتنی ہی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ آپ کے اس جرأتمندانہ اقدام نے اس دور میں اسلام کو ایک نئی جلا بخشی اور وہ مسلمان جو وقتی مصلحتوں کا شکار تھے وہ بھی اس کے حلقہ میں شامل ہوگئے۔

آپ نے جہانگیر کے حکم کی خلاف ورزی کرکے ایسی بلند ہمتی اور حوصلہ کی مثال قائم کی۔ جو تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گی اور اکبر کے زمانے میں برصغیر میں جو لادینی قوتوں نے سر اٹھایا تھا۔ مجدد الف ثانی رح نے اپنے علم اور عمل دونوں سے اس کی سرکوبی کی اور اسلام کی صحیح تعلیمات پر عمل...

مجتہدانہ طور پر تصفیہ کر لیا۔ علمائے کرام کی ایک بڑی تعداد اس بات پر متفق ہے کہ آپ نے الحادی اور بے دین طاقتوں کا قلع قمع کر دیا۔

دورانِ اسیری بھی آپ کا فیض جاری رہا۔ رفقائے زندان میں بھی تبلیغ کا کام کرتے رہے اور کئی لوگوں کو دائرۂ اسلام میں داخل کر لیا۔ قید سے رہائی کے بعد حضرت مجدد الف ثانی تقریباً چار سال تک بادشاہ کے لشکر میں رہے۔

حضرتِ مجدد الفِ ثانی رح نے سلسلہ نقشبندیہ کے بارے میں "جواہر مجددیہ" لکھا ہے۔ اس طریقہ کے تمام اصول و فروع میں اتباعِ سنت اور اجتناب بدعت پر بڑا زور دیا گیا ہے۔

مجدد الف ثانی رح ایک بلند پایہ عالم اور شیخ الطریقت تھے آپ تصوف کو احکام شریعت کی حدود میں لے آئے جو آپ کا بڑا کارنامہ ہے۔ اس سے تصوّف کی بنیادیں اور زیادہ مستحکم ہوئیں اور طریقت و شریعت کے اختلافات کم ہو گئے۔

آپ نے عربی و فارسی میں متعدد رسالے تحریر فرمائے جن میں قابل ذکر "رسالہ تہلیلیہ" "رسالہ اثبات نبوت"، "رسالہ ردِ روافض" ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی کے علمی تبحر کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ فیضی نے قرآن حکیم کی بے نقاط تفسیر عربی میں لکھی۔ جب مکمل ہوئی تو اس کا نام رکھنے میں انھیں دقت محسوس ہوئی۔ لیکن مجدد الف ثانی نے اس عقدہ کو فوراً حل کر کے اس کا نام "مسطع الالہام" رکھا۔

برصغیر ہندوستان میں حق کی آواز بلند کرنے والی اس مبارک و عظیم ہستی کا ۲۸ صفر سنہ ۱۰۳۴ھ کو وصال ہو گیا۔

۵۵

جاں نثار اختر

یہ تیرے خد و خال میں مریم کا تقدس　　　آنکھوں کو جھکا لوں تو عبادت سی لگے ہے

جگر مراد آبادی

یہ صحن و روش، یہ لالہ و گل، ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں

تخریبِ جنوں کے پردے میں تعمیر کے ساماں ہوتے ہیں

حسن الدین احمد

امیر خسرو کے عہد کا دہلی

یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ سات سو سال کے بعد ہندوستان میں امیر خسرو کی بازیافت کی کوشش منظم اور وسیع پیمانے پر ہورہی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اہم کام امیر خسرو کے عہد کے دہلی اور ان کی زندگی سے تعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنا ہے۔ ان معلومات سے اگر ایک طرف خسرو اور ان کے دور کو جاننے اور ان کے کلام کو اچھی طرح سمجھنے میں مدد ملتی ہے تو دوسری طرف یہ معلومات معاشرتی تاریخ کا قیمتی ذخیرہ ہیں۔

ذیل میں امیر خسرو کے عہد کے دہلی کی طرف ایک جھلک دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مواد کو کسی طرح مکمل تو نہیں کہا جاسکتا لیکن اس سلسلہ میں جو کام ہونا ہے اگر اس کی نشاندہی بھی ہوتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میں مقصد پورا ہوگیا۔

دہلی کو امیر خسرو کے عہد میں حضرت دہلی کہتے تھے یا صرف حضرت۔ امیر خسرو قران السعدین میں فرماتے ہیں:

حضرت دہلی کنف دین و داد
جنت عدن ست کہ آباد باد

دہلی کا اصلی نام دہلو تھا۔ امیر خسرو نے جلال الدین فیروز شاہ کو خطاب کرکے دہلو کا لفظ ایک شعر میں یوں باندھا ہے

یا تک ایم بخش اخر بعنصر ما بار گیم
یا بغرباں دہ کہ گرد دوں شیم و دہلو ردم

ملتان کے قیام کے دوران دہلی کو یاد کرکے دیوان تحفۃ الصغر میں لکھتے ہیں:

"ایک زمانہ میں میرا ٹھکانہ قبۃ الاسلام دہلی تھا جو تمام دنیا کے بادشاہوں کا قبلہ ہے۔ وہ دہلی جو آسمان کی بہن اور دنیا میں جنت کا ایک ٹکڑا ہے اس کی اونچی عمارتیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں اور سورج پر بھی سایہ ڈالتی ہیں۔"

یہاں "دنیا کے بادشاہوں کا ملجا و ماویٰ" ہے۔ امیر خسرو کے عہد میں خراسان، ایران، عراق، ماوراء النہر وغیرہ سے جو بادشاہ اور شہزادے بطور پناہ گزین ہندوستان آئے تھے ان کی تعداد کم و بیش پچیس تھی۔ ان کی سلطنتیں مغلوں کے ہاتھوں برباد ہوئی تھیں اور یہ شاہی مہمان تھے۔ چونکہ ہندوستان۔۔۔ بلا شبہ مغلوں کے حملوں کا کامیابی سے مقابلہ کر رہا تھا اس لیے اس کو محفوظ مقام اور سیاسی پناہ کے لیے موزوں سمجھا جاتا تھا۔

دہلی کے متعلق امیر خسرو قران السعدین میں لکھتے ہیں،

"اس کے اطراف دو میل تک باغات لگے ہوئے ہیں جمنا سے ان کی آبیاری ہوتی ہے۔"

دہلی کے باشندوں کے بارے میں کہتے ہیں:

"صنعت علم و ادب۔ آہنگ و ساز۔ نیزہ و پیکاں اور تیر اندازی کے فن میں بے بدل ہیں۔"

ابن بطوطہ امیر خسرو کے انتقال کے صرف نو سال بعد ۱۳۳۴ء میں دہلی آئے تھے۔ ان کے سفر نامے کے بموجب اس وقت کا دہلی ایک عظیم الشان شہر تھا مشرق میں کوئی شہر خواہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی اس کی عظمت کا نہیں تھا۔ اس کی عمارتوں میں خوب صورتی اور مضبوطی دونوں پائی جاتی تھیں۔ اس کی فصیل ایسی مبسوط تھی کہ دنیا بھر میں اس کی نظیر نہیں تھی اور اس میں کوٹھریاں اور مکانات بنے ہوئے تھے جن میں چوکیدار اور دروازوں کے محافظ رہتے تھے۔ اس فصیل کے اٹھائیس دروازے تھے جن میں چند یہ تھے۔

بدایوں دروازہ۔ مندوی دروازہ (جس کے باہر کھیت تھے) گل دروازہ (جس کے باہر باغ تھے) نجیب دروازہ۔ کمال دروازہ۔ غزنی دروازہ (جس کے باہر عیدگاہ تھی اور قبرستان تھے)

شہر کے سب دروازے رات کو بند ہو جاتے تھے۔ کچھ رات گزرنے کے بعد نوبت بجتی تھی۔ نوبت بجنے کے بعد کوئی شخص باہر نہیں نکل سکتا تھا اور نہ شہر میں داخل ہو سکتا تھا۔

امیر خسرو کے زمانے میں دہلی مختلف شہروں پر مشتمل تھا جو ایک دوسرے سے متصل واقع تھے۔ دہلی قدیم شہر تھا اور امیر خسرو کی پیدائش سے صرف باسٹھ سال قبل ۱۱۹۱ء میں سلطان شہاب الدین غوری نے فتح کیا تھا۔ جلال الدین فیروز خلجی نے دریائے جمنا سے قریب کیلوکھری کے پاس نیا شہر آباد کیا۔ کیلوکھری ایک گاؤں تھا۔ اولاً سلطان معز الدین کیقباد نے ۱۲۸۶ء میں ایک قلعہ بنوایا تھا اب ہمایوں کا مقبرہ اس قلعہ کے احاطہ میں ہے۔ سلطان جلال الدین فیروز خلجی شہر کے رئیسوں سے مطمئن نہ تھے اس لیے کیلوکھری میں رہائش اختیار کی اور اس کی تمام عمارتوں کو پورا کیا۔ دریا کے کنارے باغ لگوائے

امیر خسرو نے مسجد تعمیر کی [illegible] مسجد اور ایک مینار بنا کر شہر آباد کیا۔ اس کا [illegible] شہر [illegible] نے [illegible] امیر خسرو نے [illegible]
تجویز کیا۔ بادشاہ نے امیر خسرو سے فرمائش کی کہ قصر کا نام ایسا تجویز کیا جائے جس میں اس کا تاریخی (سنہ) کا ذکر بھی ہو اور شہر کا نام بھی آ جائے اور مقصود رعایا بھی سمجھ سکے۔ امیر خسرو نے کہا کہ کیلو کھڑی کیقباد کا مخفف ہے۔ لک یعنی عام ہری بمعنی خدا۔ امیر خسرو نے اس قلعہ کی تعمیر پر قران السعدین میں لکھا ہے۔

قصر معظم کہ بہشتی فراخ
روضۂ طوبیٰ در او و راہ شاخ

ایک شہر سیری تھا۔ اس کو دارالخلافہ بھی کہتے تھے۔ سلطان علاؤالدین اور قطب الدین مبارک شاہ اسی شہر میں رہتے تھے۔ ایک شہر تغلق آباد تھا۔ اس شہر اور قلعہ کو غیاث الدین تغلق نے ۱۳۲۱ء میں یعنی امیر خسرو کے آخری زمانہ میں بنانا شروع کیا تھا۔ امیر خسرو کی زندگی ہی میں یعنی ان کی وفات سے دو سال قبل قلعہ اور شہر بالکل تیار ہو گیا تھا۔

عمارتیں:

۱۔ جامع مسجد: اس مسجد کا نام مسجد قوت الاسلام تھا۔ جس کو سلطان قطب الدین ایبک نے ۱۱۹۱ء اور ۱۱۹۶ء کے درمیان بنایا تھا۔ ابتداءً یہ پانچ در کی تھی۔ ۱۲۳۰ء میں یعنی امیر خسرو کی پیدائش سے ۲۳ سال قبل سلطان شمس الدین التمش نے شمال اور جنوب دونوں جانب اس کی توسیع کی۔ سلطان علاءالدین خلجی نے ۱۳۰۰ء میں مشرقی جانب توسیع کی اور دروازہ تعمیر کروایا جو علائی دروازہ کہلاتا ہے۔ امیر خسرو نے قران السعدین میں بھی تھوڑا سا لکھا ہے۔

مسجد او جامع فیض الہٰ
زمزمہ خطبہ او تا بماہ

۲۔ قطب صاحب کی لاٹھ:

یہ مینار مسجد قوت الاسلام کے جنوب مشرقی گوشہ میں جمعہ کی اذان کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس کو قطب الدین ایبک نے بنانا شروع کیا تھا۔ شمس الدین التمش نے ۶۳۱ ہجری میں اس کی تکمیل کی۔

۳۔ مقبرہ سلطان شمس الدین التمش:

قطب صاحب کی لاٹھ کے پاس یہ مقبرہ ہے۔ یہ مقبرہ غالباً سلطانہ رضیہ نے بنوایا تھا۔ اس مقبرہ کی

[illegible]
آیات قرآنی کندہ تھے اور اچھی پچی کاری کی ہوئی تھی۔

۴۔ حوض شمسی:

قطب صاحب کے نواح میں سلطان شمس الدین التمش نے ۱۲۲۹ء میں یہ حوض بنایا۔ یہ حوض سنگ سرخ کا بنا ہوا تھا۔ اس کا طول دو میل اور عرض ایک میل تھا۔

امیر خسرو نے اس کی تعریف قران السعدین میں یوں کی ہے۔

در شکر سنگ میاں دو کوہ
آب گہر صف زدہ ودریا شکوہ

اس میں بارش کا پانی جمع ہوتا تھا اہل شہر اس کا پانی پیتے تھے۔ شہر کی عید گاہ بھی اس کے قریب تھی۔ جب حوض کے کنارے سوکھ جاتے تو اس میں نیشکر، ککڑی، تربوز اور خربوزے بو دیتے۔

۵۔ حوض خاص:

یہ حوض سلطان علاالدین خلجی نے بنوایا تھا۔ یہ حوض حوض شمسی سے بھی بڑا تھا۔ اس کے گرد اہل طرب رہتے تھے۔

۶۔ پرانا قلعہ:

راجہ اننگ پال نے جو ۱۰۶۰ء میں گدی نشین ہوا۔ اس قلعہ کی تعمیر کی۔ اس قلعہ کے دروازہ پر پتھر کے دو شیر بنے ہوئے تھے۔ جن کے پہلوؤں میں کانسے کے گھنٹے لٹکائے گئے تھے۔ جو بھی راست راجہ تک اپنی فریاد لے جانا چاہتا ان گھنٹوں کو بجاتا۔ یہ شیر امیر خسرو کے عہد میں موجود تھے۔ یہ قلعہ قطب مینار کے نواح میں تھا۔ اس کو لال کوٹ کہتے تھے۔ آج ہم جس قلعہ کو پرانا قلعہ کہتے ہیں۔ یہ شیر شاہ سوری کا بنایا ہوا ہے اور امیر خسرو کے عہد میں موجود نہ تھا۔

۷۔ قلعہ رائے پتھورا:

رائے پتھورا نے ۱۱۴۳ء میں یعنی امیر خسرو کی پیدائش سے ایک سو دس سال قبل یہ قلعہ تعمیر کیا۔ یہ قطب مینار کے نواح میں تھا۔ یہ قلعہ ایک عرصہ تک بادشاہوں کا دار الخلافہ رہا۔ سلطان شمس الدین التمش بھی قلعہ میں رہتے تھے۔ کیلو کھڑی کے پاس نیا شہر آباد ہوا تو یہ قلعہ پرانی دہلی کے نام سے مشہور ہوا۔

۸۔ قصر سفید :

قلعہ رائے پتھورا میں سلطان قطب الدین ایبک نے ایک محل بنوایا اور اس کا نام قصر سفید رکھا۔ اسی قصر میں سلطان ناصر الدین محمود سنہ ء میں تخت نشین ہوئے۔ ۱۲۶۰ء میں جبکہ خسرو کی عمر سات سال کی تھی ہلاکو خان کے سفیر نے بھی اسی قصر میں منعقد ایک دربار میں شرکت کی۔ اس دربار سے متعلق کہا جاتا ہے کہ اتنا بڑا دربار چشم فلک نے بھی نہ دیکھا ہوگا۔ سلطان غیاث الدین بلبن بھی اسی قصر میں تخت نشین ہوئے۔

۹۔ مسجد سیری :

سلطان قطب الدین مبارک شاہ نے جامع مسجد جس کو مسجد سیری کہتے تھے۔ تعمیر کی۔ علما اور مشائخ کو انھوں نے دعوت دی کہ جمعہ کی نماز یہاں پڑھیں شیخ نظام الدین اولیاء نے جو کیلو کھڑی کی مسجد میں نماز جمعہ کے لیے جایا کرتے تھے یہ جواب دیا کہ وہ مسجد جو میری جگہ سے قریب ہے مجھ پر زیادہ حق رکھتی ہے۔

۱۰۔ کوشک لال :

سلطان غیاث الدین بلبن نے بادشاہ ہونے سے پہلے بنایا تھا۔ بادشاہ ہونے کے بعد اسی کوشک کے پاس قلعہ غیاث پور بنایا جو قلعہ مرزغن سے مشہور ہوا۔ سی نواح میں تھا جہاں حضرت نظام الدین اولیا کا ... ہے جلال الدین فیروز خلجی کو کیلو کھڑی سے لاکر پرانی دہلی کے تخت پر بٹھا ...یا گیا تو وہ وہاں سے کوشک لال آئے اور سلطان غیاث الدین بلبن کو یاد کرکے اس کے دروازے پہ سے پیادہ پا ہوئے۔ جلال الدین خلجی اکثر اسی کوشک میں رہتے تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی کوشک سیری بنانے سے قبل اسی کوشک میں رہتے تھے۔

۱۱۔ کوشک لال (نیا شہر)

دوسرا کوشک لال سلطان فیروز خلجی کا بنایا ہوا ہے جو کیلو کھڑی میں تھا۔ امیر خسرو نے اس کوشک کی تعریف میں لکھا:

شہا در شہر تو کردی حصارے
کہ رفت از کنگر تا قمر سنگ

۱۲۔ کوشک سبز :

جلال الدین فیروز خلجی نے کوشک لعل سے قریب ایک اور محل کوشک سبز بنایا تھا۔ جب ان کو قتل کیا گیا تو ان کے فرزند رکن الدین ابراہیم شاہ کو اسی کوشک میں تخت پر بٹھایا گیا۔

۱۳۔ قلعہ علائی (کوشک سیری) :

یہ قلعہ سلطان علاء الدین خلجی نے ۱۳۰۳ء میں بنوایا۔

۱۴۔ قصر ہزار ستون :

علاء الدین خلجی نے ۱۳۰۳ء میں بنوایا۔ جب سلطان غیاث الدین تغلق نے خسرو خاں پر فتح پائی تو اس قصر میں آکر سلطان قطب الدین اور اس کے بھائیوں کی تعزیت ادا کی۔

بازار :

دہلی کے بازار بڑے با رونق تھے۔ امیر خسرو تحفۃ الصغر میں کہتے ہیں :

"اس بازار میں آدمیوں کا اتنا ہجوم رہتا ہے کہ مردم چشم کو بھی دیکھنے والے کی آنکھ میں جگہ نہیں ملتی"

بازاروں میں بیرونی ممالک کا سامان بھی ملتا تھا اور دور دور سے تاجر سامان لے کر یہاں آتے تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی نے ملتانی سوداگروں کی ایک کمپنی یا کارپوریشن بنائی تھی اور قیمتی کپڑے لانے کا کام ملتانی سوداگروں کے سپرد کیا تھا۔ ان کو سلطنت سے تجارت کے لیے ایک معقول رقم بھی ملتی تھی۔ ان کو سونے کے تنکے بھی دیے جاتے تھے کیونکہ ان کو سلطنت دہلی کے باہر سے سامان لانا پڑتا تھا۔ خراسان سے کشمش اور بادام بھی اس زمانے میں درآمد ہوتے تھے۔

ہندوستان میں روپیہ کا استعمال شیر شاہ کے وقت سے ہوا۔ اس سے پہلے کا قدیم سکہ تنکہ تھا۔ امیر خسرو کے عہد میں تنکہ سرخ، تنکہ سفید اور جیتل رائج تھے۔ تنکہ سرخ خالص سونے کا سکہ تھا۔ وزن اور بعض اوقات ایک سو بارہ رتی کا ہوتا۔ تنکہ سرخ کا استعمال بیرونی تاجر کرتے تھے۔ تنکہ سفید خالص چاندی کا سکہ تھا جو ۱۷۵ رتی اور تولہ رتی کا ہوتا۔ بازار میں خرید و فروخت میں جیتل استعمال ہوتا۔ ایک تنکہ سفید کے چونسٹھ جیتل ہوتے۔ ششگانی اور ہشتگانی سکے رائج تھے جو علی الترتیب چھ جیتل اور آٹھ جیتل کے ہوتے۔

اس زمانہ کا من ساڑھے چودہ (۱۴½) سیر کا ہوتا تھا۔ لیکن فرشتہ کے مطابق علاء الدین خلجی کے عہد میں

معلوم ہوتا ہے کہ یہ سیر بودہ بر سیر ست دو چہار قلم" اگر اس قدر کا سیر قرار دیا جائے تو ایک سیر کا من ہوا۔
امیر خسرو کے مطابق سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں دو جیتل کا ایک من خربوزہ اور ایک جیتل کا
بیس سیر میدے کی روٹی بکتی تھی۔

علاء الدین خلجی نے اجناس کی حسب ذیل قیمتیں مقرر کی تھیں۔

گیہوں ۷½ جیتل فی من
جو ۴ جیتل فی من
ماش ۵ جیتل فی من
نخود ۵ جیتل فی من
موٹھ ۳ جیتل فی من
شکرتری ۱½ جیتل فی من
شکر سرخ ½ جیتل فی من
گھی ½ جیتل فی من
روغن کنجد ⅓ جیتل فی من
نمک ½ جیتل فی من

اہل دہلی کی زبان کھڑی بولی تھی جو صرف بول چال کی زبان تھی اور لکھی نہیں جاتی تھی۔ نو وارد مسلمانوں نے اس کو اپنی زبان بنا لیا تھا۔ اس کو اور دوسری علاقہ واری زبانوں کو امیر خسرو کے عہد میں ہندوی کہتے تھے۔ امیر خسرو لکھتے ہیں :-

سندی و لاہوری و کشمیر کبر
دھور سمندری تلنگی و گجر
معبر و گوری کو بنگال و اودھ
دہلی و پیرامنش اندر ہمہ حد
ایں ہمہ ہندوی ست از ایام کہن
عامہ بکار ست بہر گونہ سخن

امیر خسرو کے نانا، ان کی اولاد اور سارا ننھیال دہلی کی شائستہ ہندوی بولتا تھا۔ امیر خسرو کے عہد میں اس بولی پر فارسی کا اثر پڑ چکا تھا

امیر خسرو کے عہد میں شریف عورتیں ڈولیوں (پالکیوں) میں آتی جاتی تھیں اور حسب ضرورت پالکیاں کام میں لاتے تھے۔ آٹھ آدمی باری باری اس کو اٹھاتے تھے۔ چار آدمی اٹھاتے اور چار آدمی ساتھ ساتھ چلتے۔ جن کے پاس ہوتے تو وہ ڈولی اٹھاتے ورنہ ایسے آدمی جن کی روزی کا انحصار اس پر تھا اجرت پر یہ کام کرتے۔ بازاروں میں شاہی محل کے پاس یا امراء کے دروازوں پر یہ لوگ کھڑے رہتے۔

میوے اور غلے:

امیر خسرو نے ہندوستان کے جن میووں کا ذکر کیا ہے ان میں آم کو قبولیت حاصل ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ آج قلمی اور پیوندی دو قسم کے آم پائے جاتے ہیں۔ پیوندی آم مغلوں کی دین ہیں اور پرتگیزیوں نے اس فن کو مزید ترقی دی۔ امیر خسرو کے عہد میں صرف تخمی آم ہوتے تھے۔ انہوں نے آم کے بارے میں کہا ہے:

نغزک ما نغز کن بوستاں
نغز ترین میوہ ہندوستاں

اس زمانہ میں کچے آم کا آچار بنانے کا بھی رواج تھا۔

دوسرے میووں میں کٹھل۔ جامن۔ رنگترہ۔ انار۔ انگور اور خربوزے بھی دہلی میں ہوتے تھے۔ خربوزے کی تعریف خسرو نے کی ہے۔

امیر خسرو نے پان کو بھی ہندوستان کے میووں میں شمار کیا ہے اور اس کا ذکر یوں کیا ہے:

جہاں تک اناج کا تعلق ہے خریف کی فصل میں کودرو۔ ماش۔ لوبیا۔ موٹھ اور ربیع کی فصل میں گیہوں، چنا ہوتے تھے۔ چاول۔ تل اور نیشکر کی کاشت بھی کی جاتی تھی۔

کھانے:

سات سو سال کے طویل عرصے میں پکوان کے طریقے اور نام بدل گئے ہیں اور ان میں کافی تبدیلیاں ہو گئی ہیں مگر پھر بھی چند پکوان اس وقت بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً: کھچڑی، سموسہ، کھیر اور آچار مروج تھے۔ آچار سے متعلق امیر خسرو کا مصرعہ ہے ع

ہند معد نیرنگ تا چیار نسیا بی

رسوم :

سیوم کی رسم : دن صبح کا صبح میت کی قبر پر جاتے اور قبر کے گردا گرد ریشمی کپڑے لاتے اور قبر پر پھول رکھے۔ سب دوراپے اپنے کلام اللہ لاتے اور وہاں تلاوت کرتے ۔ جب ختم کر چکتے تو لوگوں کو گلاب پایا جاتا اور ان پر گلاب چھڑکا جاتا اور پان بھی دیئے جاتے۔

عید :

عید کے دن خطیب ہاتھی پر سوار ہوتا۔ ہاتھی کی پشت پر ایک چیز تخت کے مشابہ بچھائی جاتی اور چار علم اس کے چاروں کونوں پر لگائے جاتے۔ خطیب سیاہ لباس پہنے ہوتا۔ موذن ہاتھیوں پر سوار خطیب کے آگے آگے تکبیر کہتے جاتے۔ شہر کے مولوی اور قاضی بھی ساتھ ہوتے۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ صدقہ آتا جو وہ عیدگاہ کے راستہ تقسیم کرتا جاتا۔ جب سب نمازی جمع ہو جاتے تو خطیب نماز پڑھاتے اور خطبہ پڑھتے۔ نماز کے بعد اہل دربار اور معززین بادشاہ کے محل جاتے جہاں سب کو کھانا کھلایا جاتا۔ عیدگاہ پر کپڑے کا سائبان لگایا جاتا اور فرش بھی بچھایا جاتا۔

ستی :

جب کسی ہندو کا انتقال ہوتا اور اس کی بیوہ اس کے ساتھ جل جانے تیار ہوتی تو اس کو بناؤ سنگار کر کے گھوڑے پر سوار کیا جاتا۔ ہندو مسلمان اس کے پیچھے پیچھے چلتے۔ آگے نوبت بجائی جاتی۔ برہمن بھی ساتھ جاتے۔ بادشاہ کی اجازت کے بغیر زندہ عورت کو جلایا نہ جا سکتا تھا۔ اس لیے اجازت لی جاتی۔ ملک کی رسم ہونے کی بنا پر اجازت دے دی جاتی۔

شادی بیاہ کے رسوم :

امیر خسرو کے عہد تک نو وارد مسلمانوں نے ہندوستان میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور مقامی آبادی سے ان کا میل جول کافی بڑھ گیا تھا۔ جس کے نتیجہ کے طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کی تہذیب کے عناصر کو اپنانا شروع کر دیا تھا۔ مسلمانوں نے شادی بیاہ کے رسوم بالخصوص اپنائے تھے۔ مثنوی دول رانی خضر خاں میں امیر خسرو نے جو تفصیلات پیش کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کے علاوہ سارے رسوم ہندوستانی تھے۔

انتظام سلطنت :

امیر خسرو کے عہد میں سلطان اقتدار اعلیٰ کا مالک تھا۔ وہی قانون کا منبع تھا۔ مقدمات کے آخری فیصلے

مذہبی معاملات کرتا اور یہی وجہ تھی کہ یہ کافی مقدر ہوتا تھا۔ جہاں سلطان مذہبی امور میں علماء سے مشورہ کرتا کیونکہ اس وقت علماء شریعت کے احکام کی پابندی ضروری تھی۔ امور سلطنت میں سلطان مجلس وزراء (مجلس حکومت) سے مشورہ کرتا۔ ایسا مشورہ سلطان کے لیے لازمی نہ تھا لیکن اکثر سلطان مشورہ ضرور کرتے۔ سلطان عموماً تین چار خاص امراء سے مشورہ کرتا۔ جو بھی شرکت کرتے یعنی سلطان طلب کرتا۔ کوئی حق کی بنا پر شرکت کا دعا نہیں کر سکتا تھا۔ اس زمانے میں سلطنت کی تشکیل میں عرب و ایران کے انداز کا امتزاج تھا اور فوج کی ترتیب ترک و منگول طرز پر تھی۔ طریقہ مالگزاری ہندوستانی تھا۔ اس زمانہ میں دربار دو قسم کے تھے۔ بار عام اور بار خاص، بار خاص میں خان۔ ملک اور امیر شریک ہوتے بار عام میں ہر کوئی شریک ہوسکتا تھا۔ بار عام کا انتظام امیر حاجب کے ذمہ ہوتا وہ عوام سے درخواستیں وصول کرتا اور سلطان کو پیش کرتا نائب امیر حاجب اس کو فرائض کی تکمیل میں مدد دیتے۔ جب کوئی شخص دربار میں جاتا تو حاجب اسے آداب دربار سے واقف کرواتے اور اس کو ہاتھ پکڑ کر ایک خاص مقام پر لے جاتے کہ وہاں سے تعظیم بجا لائے۔ بار بک chamberlain کے مماثل عہدہ تھا۔ دربار میں مختلف درجے کے لوگوں کے مقام کا تعین کرنا اس کے فرائض میں داخل تھا۔

چند عہدوں کے نام یہ تھے :

وزیر سلطان کی عدم موجودگی میں کاروبار سلطنت انجام دیتا۔ اس زمانہ میں محکموں کو دیوان کہتے تھے۔ مثلاً دیوان اشراف (محکمہ اڈٹ) دیوان کوہی (محکمہ زراعت) دیوان عرض (محکمہ فوج) دیوان انشاء۔ دیوان عمارت دیوان وزارت (محکمہ مال گزاری) وغیرہ اور محکمہ کے صدر کو مالک کہتے تھے مثلاً مستوفی ممالک (آڈیٹر جنرل) برید ممالک (وزیر محکمہ خفیہ) عریض ممالک (وزیر فوج، یہ سپہ سالار نہ ہوتا بلکہ سپاہیوں کا تقرر اور تنخواہ کی تقسیم اس سے متعلق تھی) قاضی ممالک (چیف جسٹس) محکموں کے علاوہ کارخانہ جات بھی ہوتے۔ قاضی کا اصل کام مقدموں کا فیصل کرنا تھا۔

صدر جہاں (قاضی القضاۃ) ایک مرکزی افسر تھا جو اپنے نائبوں کے ذریعہ مذہبی معاملات (علماء کی مدد معاش مساجد کی تعمیر۔ اوقاف کا انتظام وغیرہ) کا ذمہ دار ہوتا۔

شیخ الاسلام صرف ایک لقب تھا جو بادشاہ کی طرف سے ملک کے سب سے بزرگ شیخ کو دیا جاتا تھا۔ لیکن شیخ الاسلام کی بزرگی کا اعتراف کرنا یا اس کو رد کرنا مسلم ملت کے ہاتھ میں نہ تھا۔

کوتوال شہر میں پولیس کا اعلیٰ عہدہ دار ہوتا تھا۔

خریطہ دار جس کے پاس بادشاہ کا قلمدان ہوتا۔

مہر دار بادشاہ کی مہر رکھتا تھا۔

شرابدار بادشاہ کے استعمال کے پانی اور دیگر مشروبات کا منتظم ہوتا تھا۔ سلطان علیم غیاث

[illegible] اس عہدہ کا نام نہیں ملا۔

چاشنگیر — دسترخوان پر لانے سے پہلے ہر ایک کھانے کو چکھنے اور اپنی محافظت میں بادشاہ کے پاس لانے کا کام اس سے متعلق ہوتا۔

میرداد — یہ عہدہ دار قاضی کے ساتھ بیٹھتا اگر کوئی شخص امیر یا بڑے آدمی پر نالش کرتا تب وہ اس کو قاضی کے روبرو حاضر کرتا۔ اس عہدہ کو وکیل سرکار کے مماثل قیاس کیا جاسکتا ہے۔

دوادار — جس کے پاس بادشاہ کی دوات رہتی تھی۔

امیر خسرو کے عہد میں سرکاری خزانہ سے رقومات کی ادائیگی خط خورد: کے ذریعہ ہوتی تھی۔ اس چٹھی میں یہ درج ہوتا تھا کہ بادشاہ کا حکم ہے کہ خزانہ سے فلاں شخص کو فلاں حاجب کی شناخت پر اس قدر روپیہ دے دو۔ اس چٹھی پر چٹھی لانے والا اور جس کی شناخت پر روپیہ دینا لکھا ہو۔ ہر دو دستخط کرتے اسکے علاوہ تین امیروں کے دستخط ہوتے پھر دیوان [illegible] کے پاس پہنچاتے۔ متصدی اس کی نقل لے لیتے پھر پروانہ لکھا جاتا جس پر وزیر خزانچی کو حکم دیتا۔ خزانچی اپنے حساب میں درج کرتا ہر روز کے پہلا دن کا پرچہ بادشاہ کے سامنے پیش کرتا جسکے لیے بادشاہ کا حکم ہوتا کہ فوراً دیدو اسی وقت دیدیا جاتا۔ بعض دفعہ دو دو تین تین مہینے بعد کرتا۔ اس زمانے میں دستور تھا کہ جبقدر انعام کا حکم دیا جائے اس کا دسواں حصہ یعنی عشر وضع ہو کر بقیہ رقم ایصال ہوتی۔ ۵۵

مومن خاں مومن

رشک دشمن بہانہ تھا سچ ہے ٭ میں نے ہی تم سے بے وفائی کی
کیوں برا کہتے ہو بھلا ناصح ٭ میں نے حضرت سے کیا برائی کی
گر نہ بگڑو تو کیا بگڑتا ہے ٭ مجھ میں طاقت نہیں لڑائی کی
مومن آؤ تمہیں بھی دکھلادوں ٭ سیر بت خانہ میں خدائی کی

خواجہ الطاف حسین حالی

نہ وہاں پرسش نہ یاں تاب سخن ہے   محبت ہے کہ دل میں موجزن ہے
بہت لگتا ہے دل صحبت میں اس کی   وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے
بناوٹ سے نہیں خالی کوئی بات   مگر ہر بات میں اک سادہ پن ہے
بھلا حالی اور الفت سے ہو خالی   یہ سب تم صاحبوں کا حسن ظن ہے

غلام کبریا خان شبلی

مسلمانوں کے سائنسی کارنامے

رسولِ مقبول ؐ کا ارشادِ گرامی ہے۔

"اُطْلُبُ الْعِلْمَ وَلَوْ کَانَ بِالصِّیْنِ"

نطقِ مبارک سے نکلے ہوئے ان حکیمانہ الفاظ ہی نے مسلمانوں کو اپنا صحیح زاویہ نظر اور درست طرزِ فکر عطا کیا تھا جس نے قرونِ اولیٰ کے صحرا نوردوں اور بادیہ نشینوں کو تاجِ سلطنت اور اورنگِ حکومت ہی عطا نہیں کیے بلکہ اقلیم علم و فن کا عصائے بادشاہی بھی ان کے قدموں میں ڈال دیا۔

وائے افسوس! آج ہماری پستی کا یہ عالم ہے کہ ہمارے کاسۂ گدائی میں تہذیب و تمدن ہی نہیں افکار و نظریات تک یورپی ہیں۔ وہی یورپ جو کل تک ہمارے مائدۂ علم و فن کا ریزہ چیں رہا ہے آج ہمارا منتہائے فکر ہے۔ اہلِ یورپ نے ہمیشہ مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ پر اپنی تنگ نظری، تعصب اور سیاسی اغراض کے پیشِ نظر دبیز پردے ڈالنے کی کوشش کی ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ع

ہے نیند ہی اس چھوٹے سے فتنے کو سزاوار

کہیں جاگ پڑا تو فلکِ قیادت اور آسمانِ امامت کا یہ ٹوٹا ہوا تارا، مہرِ کامل بن کر فضلت کی چمک دمک کو ماند کر دے۔ مگر جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ کبھی کبھی سہواً یا مجبوراً صحیح بات اہلِ یورپ کی زبانِ قلم پر آ ہی جاتی ہے مثلاً موسیو لی بین کا یہ اعتراف کہ،

"اگر عربوں کا نام تاریخ عالم سے نکال دیا جائے تو یورپ کی نشاۃ ثانیہ کئی صدیاں پیچھے ہٹ جائے جن کے محرک حقیقتاً مسلمان عرب تھے۔"

جب عالم اسلام نے "طلب علم فریضۃ علیٰ کلِ مسلمٍ و مسلمۃ" کے نعرے پر لبیک کہا اور خصوصاً اندلس اور سسلی نورِ علم سے جگمگانے لگے اس وقت یورپ

جہالت، بربریت اور درندگی کے شب تار اندھیروں میں ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ عقل و خرد اور علم و حکمت، مجلس احتساب عقائد کی صلیب پر لٹکے ہوئے تھے۔ ظلمات کے پالے ہوئے یہ شب رنگ سائے اُسی وقت دور ہوئے جب اندلس سے علم و فن کی ضیا پاش بجلیاں یورپ پر کوندیں۔

نویں صدی عیسوی میں طلیطلہ میں یونانی زبان سے علوم و فنون کے جو عربی تراجم ہوئے انہیں یورپ نے پہلی بار علم کے نئے وسیع افق دیکھے۔ اس طرح یورپ کے فکری پیمانے بدل گئے۔ یوں کہا جائے کہ حکمائے یونان کی حیات شہرت ہی عربوں کی مرہون منت ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ نہ آج ارسطو، افلاطون، سقراط، بقراط، اقلیدس، آرشمیدس، فیثا غورث، ارکی زمیں، قراطیس، جالینوس، بطلیموس وغیرہ گوشۂ گمنامی میں دفن رہتے۔ پوری چھ صدیوں تک عرب یورپ کے اُستاد رہے۔ جبر و مقابلہ، علم مثلث، کیمیا، جغرافیہ جیسے وقیع علوم تمام عربوں ہی کی ایجادیں ہیں۔ انھوں نے طب، طبیعیات، حیاتیات، فلسفہ، تاریخ، تعمیرات، میکانیات وغیرہ فنون کی خامیاں دُور کیں۔ ان میں مفید اضافے کیے اور انہیں مستقل علوم کی شکل دی۔

آٹھویں صدی کے نصف کے قریب عباسیوں کا علم اقتدار بلند ہوا۔ اسلامی سلطنت کی قوت و ہیبت شوکت و حشمت کے طلوع خورشید کے ساتھ ہی ایک عبقری مسلم شخصیت کا سایہ قرونِ وسطیٰ کے مشرق و مغرب کے افق علمی پر پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ شخصیت ہے جابر بن حیّان (الصوفی) کی۔ یورپ اسے Geber کے نام سے یاد کرتا ہے۔ جابر علم کیمیا کا باوا آدم ہے۔ "الکیمیا" نام ہی خود عربی ہے جو یورپ میں کیمسٹری ہوگیا۔ اس فن پہ جابر کی کم و بیش سو کتابیں دستیاب ہیں۔ یہ عملی پہلو پر زور دیتا تھا۔ اس نے تصعید، تبخیر اور تقطیر کے بہتر طریقے وضع کیے۔ بہت سے کیمیائی مرکبات مثلاً مرکری سلفائیڈ، آرسینک آکسائیڈ، تیزاب وغیرہ کو خالص حالت میں حاصل کرنے کے طریقے ایجاد کیے۔ "آب سلطانی" یا "آب شاہی" یا ماء الملوک (aqua regia) اسی کی ایجاد ہے۔ جس میں سونے جیسی شریف دھاتیں بھی حل ہو جاتی ہیں۔ قرنبیق اسی کی ایجاد کردہ ہے۔ اور نوشادر اسی کی دریافت ہے۔ دنیا کی بیشتر زبانوں میں اس کی کتابوں کے ترجمے شائع ہوئے ہیں۔

جبر و مقابلہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے عربی الاصل ہے۔ آج کل اسے الجبرا کہتے ہیں۔ مامون الرشید کے ذوقِ علمی کا اندازہ کیجیے کہ اس کے لباس کی آستینوں پر اقلیدس کی شکل کا طغریٰ

بنا ہوا تھا۔ اس شکل کا نام ہی "شکل ہندی" ہوگیا تھا۔ اسی تعداد والے علم و فن فلیفہ کے عہد میں ایک عالم ابو جعفر بن موسیٰ الخوارزمی (متوفی ۸۴۰ء) تھا۔ یہ "صفر" کا خالق تھا۔ اسی نے دنیا کو صفر کا استعمال سکھایا۔ اسی نے الجبرا کو ایک علم الذات کی شکل دی۔ اور اس پر بے شمار کتابیں لکھیں۔ اسی نے ہندسۂ تحلیلی اور علم مثلث کی بنیاد رکھی۔ سب سے پہلے اسی نے زمین کا محیط تقریباً صحیح معلوم کیا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ "خوارزم جدول" ہے جس کو آج "لوگارتھم ٹیبل" کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ "الخوارزم" یورپ میں "لوگارتھم" ہوگیا۔

عمر بن ابراہیم الخیامی (متوفی ۱۱۲۳ء) کو ساری دنیا عمر خیام کے نام سے جانتی ہے۔ لیکن کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ جتنا بڑا شاعر تھا اس سے کہیں زیادہ بڑا ریاضی داں اور ہیئت داں تھا۔ اس نے الجبرا پر کتاب لکھی اور الخوارزمی کی تحقیقات پر اضافے کیے۔ موجودہ کیلنڈر اسی کے مرتب کردہ کیلنڈر کی ترمیم شدہ شکل ہے۔ ریاضی کے میدان میں نصیر الدین طوسی (متوفی ۱۲۷۴ء) اور ابوالوفا بھی امام سمجھے جاتے ہیں۔

ابو علی بن الہیثم یا الہیثم (متوفی ۹۶۵ء) دسویں صدی عیسوی کا بہترین دماغ تھا۔ اس کو یورپ میں (Alhezen) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ عدسوں اور پن ہول کیمرہ کا موجد ہے۔ اس نے سورج گہن کے موقعہ پر کھڑکی میں سوراخ کرکے مقابل کی دیوار پر سورج کا عکس حاصل کیا تھا۔ اس کی کتابوں سے راجر بیکن، لیونارڈو ڈا ونچی اور جان کیپلر جیسے سائنس دانوں نے استفادہ کیا۔ یہ نوریات اور بصریات کا ابوالآباء ہے۔ طبیعیات کے علاوہ ریاضی اور طب میں اس نے قابل قدر اضافے کیے طبیعیات کا علم ابو ریحان محمد البیرونی (۹۷۳ء تا ۱۰۴۸ء) الفارابی (متوفی ۹۵۱ء)، الخازانی (متوفی ۱۱۲۰ء) اور کمال الدین ایرانی (متوفی ۱۳۲۰ء) کے احسانات سے سبکدوش نہیں ہوسکتا۔

علم حیاتیات کے اماموں میں ابن مسکویہ کا نام سرفہرست ہے۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے حیوانات اور نباتات کی تسلی بخش درجہ بندی کی۔ ڈارون سے بہت پہلے نظریہ ارتقاء کے متعلق واضح تفصیلات اسی کے یہاں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ الاصمعی بصری (۷۴۰ء تا ۸۲۸ء) نے حیاتیات پر بے شمار کتابیں تصنیف کیں۔ ابن وحشیہ نے (۹۰۴ء) میں زراعتی نباتات پر کتاب لکھی۔ علم الحیوانات پر زکریا قزوینی (متوفی ۱۲۳۸ء) کی تصنیفات میں تصاویر بھی شامل ہیں۔ اسی طرح محمد الدمیری (متوفی ۱۴۰۵ء) کی تصنیف "حیاۃ الحیوان" بہت مشہور ہے۔

جغرافیہ کا علم عربوں ہی کا ساختہ پرداختہ ہے قطب نما جیسی کار آمد چیز عربوں ہی کا تحفہ ہے۔ اس مخصوص میدان میں المسعودی (متوفی ۹۵۶ء) میر میدان ہے۔ ۱۹۵۸ء میں مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے مسعودی کی ہزار سالہ برسی منائی۔ اسی تقریب میں سیمنار بھی شامل تھا۔ اس سیمنار میں دنیا کے بیشتر یونیورسٹیوں کے ماہرین جغرافیہ نے مسعودی پر اپنے مقالے پڑھ کر اسے خراج عقیدت پیش کیا۔ زلزلہ کے اسباب کا پتہ اسی کی تحقیقات کا ثمرہ ہیں۔

احمد سجستانی نے ۱۰۰۰ء میں زمین کی گردش کا نظریہ پیش کیا جبکہ کوپرنکس (۱۴۷۳ء۔ ۱۵۴۳ء) جس کے سر آج یورپ اس دریافت کا سہرا باندھتا ہے عالم وجود میں بھی نہ آیا تھا۔

طب کے میدان میں یونانیوں نے بڑی وسیع دریافتیں کی ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ دنیا زکریا الرازی (۸۶۵ء۔ ۹۲۵ء) کو بھول نہیں سکتی۔ یورپ والے اسے Razes کہتے ہیں۔ اس کی تصنیفات کی تعداد دو سو ہے جن میں سے سو صرف طب پر ہیں۔ چیچک اور خسرہ پر اس کے قلم سے پہلی مستند کتابیں نکلیں۔ طب پر اس کی صرف ایک کتاب "الحاوی" بیس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ کیمیا پر بھی اس کی نظر جابر سے زیادہ گہری تھی۔

۹۳۶ء میں ابوالقاسم الزہراوی نے اپنی تصنیف میں سو سے زیادہ آلاتِ جراحی کے خاکے دیئے ہیں۔ آج کے آلات جراحی ان کی ہی ترقی یافتہ ترمیمی شکل ہیں۔

فخر الاطباء، ابو علی الحسین ابن سینا (۹۸۰ء۔ ۱۰۳۷ء) کا شمار دنیا کے عظیم ترین اطباء میں ہوتا ہے۔ اہل یورپ اسے Avicenna کہتے ہیں۔ اس کی تصنیف "القانون فی الطب" آج بھی طلبائے طب کے لیے صحیفہ آسمانی ہے۔ یہ بہت بڑا فلسفی اور ماہر طبیعیات بھی تھا۔ اس کی طبی تصنیفات پندرہ ہیں۔

بارھویں صدی کے نصف آخر میں وہ بطلِ جلیل موجود تھا جو مسلمانوں میں ابن رشد اور عیسائیوں میں Averroes کہلاتا ہے۔ یہ بہ حیثیت فلسفی یورپ میں بہت مشہور ہے۔ لیکن یہ ایک ماہر طبیب بھی تھا۔ طب پر اس کی سولہ کتابیں موجود ہیں۔

۱۲۰۰ء میں عبداللطیف نے مردوں کی ہڈیوں پر تحقیق کی۔ جراحی میں بطلاندلسی مشہور ہے۔

دنیا سمجھتی ہے کہ دورانِ خون ولیم ہاروے کی دریافت ہے مگر یہ کوئی نہیں جانتا کہ اس سے

مسلمان قبل ابن نفیس اس راز سے پردہ اٹھا چکا تھا۔ زخم پر ریشم تانکے لگانے کا فن عربوں ہی کی ایجاد ہے۔ طاعون پر ابن خطیب (متوفی ۱۳۱۴ء) اور ابن خاتمہ (متوفی ۱۳۶۹ء) کی تصانیف قابلِ قدر ہیں۔

میکانیات میں محمد بن علی کا نام مشہور ہے۔ جس نے دمشق کے دروازے کے سامنے ایک آبی گھڑی بنائی تھی جو سولہویں صدی عیسوی تک عجوبہ شمار ہوتی تھی۔ اسی قسم کی ایک آبی گھڑی خلیفہ ہارون الرشید نے شارلیمان شاہ فرانس کو تحفتاً بھیجی تھی۔

حربیات کے ضمن میں کہا جاتا ہے کہ منجنیق اور توپیں سب سے پہلے صلیبی جنگوں میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے استعمال کیں۔ خود لوئی شاہ فرانس کا مصاحبِ خاص جان دل جان ویل اس حقیقت کا راوی ہے۔

تعمیرات میں بھی مسلمانوں نے بے مثال کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اندلس مرحوم کا قصرِ الحمراء، آگرہ کا تاج محل، دلی کا قطب مینار اور لال قلعہ آج بھی دنیا سے خراجِ تحسین وصول کر رہے ہیں۔

یونانیوں کا کل علمی سرمایہ محض نظریات و قیاسات ہی تھے۔ مسلمانوں اور بالخصوص عربوں نے علوم و فنون کو مشاہدات اور تجربات کی ٹھوس بنیادوں پر استوار کیا۔ آج کا فلک بوس ایوانِ علم و آگہی دراصل عربوں اور مسلمانوں ہی کے ذوقِ علمی اور جگر کاوی کا ثمر ہے۔

عربوں کی علمی عظمت اس قدر مسلّم تھی کہ تیرھویں صدی عیسوی کے یورپ میں کسی ایسے مصنف کا حوالہ تک نہیں دیا جاتا تھا جس نے عربوں سے کسبِ فیض نہ کیا ہو۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی مزید تفصیلات سے اپنی تشنگی کی تسکین کا سامان "میراثِ اسلام" مترجمہ عبدالمجید سالک، "حکمائے اسلام" مؤلفہ مولانا عبدالسلام ندوی اور "رسائلِ شبلی" کے صفحات میں مل سکتا ہے۔

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

ڈاکٹر آغا محمد غیاث الرحمٰن

برار میں اُردو زبان کا ارتقاء

علاقۂ برار ۱۳۴۸ء سے ۱۹۰۲ء تک کم و بیش ساڑھے پانچ سو برس دکن کا ایک حصّہ رہا ہے۔ علاءالدین خلجی اسی راستے دکن میں آیا۔ محمد تغلق نے دیوگری (دولت آباد) جاتے ہوئے برار ہی کا راستہ منتخب کیا۔ برار، کبھی دکن اور شمالی ہند کے درمیان کی کڑی، عماد شاہیوں کا قلمرو، حکمرانِ آصفیہ کا ایک صوبہ اور کبھی مرہٹوں کا میدانِ کارزار بنا رہا۔

سیاسی خلفشار اور افراتفری کی وجہ سے یہاں کا ادبی ماحول ہمیشہ بنتا بگڑتا رہا۔ یہ علاقہ مستقل بدحالی، بدامنی، معاشی پستی اور بے اطمینانی کا شکار رہا اور حکمرانوں کی سرپرستی سے اکثر محروم رہا۔ اسی لیے یہاں کے شعراء و ادباء کو نہ درباری ماحول نصیب ہوا نہ ہی یہاں علمی و ادبی اجتماعی فضا قائم ہو سکی۔ اور نہ ہی یہاں کا ادبی سرمایہ محفوظ رہ سکا۔ باوجود اس کے برار میں علمی و ادبی انفرادی سرگرمیاں جاری رہیں۔ اور یہاں سے شعر و سخن، علم و ادب، تاریخ و تذکرہ، سیاست و صحافت کی عظیم الشان اور نامور شخصیتیں ابھریں۔ چونکہ برار ایک عرصہ تک دکن کا جز بنا رہا اس لیے دکنی علم و صحافت کی اثر پذیری یہاں ہر شعبۂ حیات میں نظر آتی ہے۔ دکن میں لسانی اعتبار سے جو تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان سب کا اثر نتیجتاً برار پر بھی پڑا۔ لہٰذا اس علاقہ کی اردو زبان کے ارتقاء کی تاریخ بیان کرتے ہوئے۔ دکن کی لسانی تاریخ کا مطالعہ لازمی اور ناگزیر ہے۔

محمود غزنوی اور علاؤالدین خلجی کے حملے (۱۲۹۵ء تا ۱۳۱۵ء) اور اس کے بعد لسانی اثرات برار میں اردو زبان کی ابتداء میں نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زبان کے ارتقائی سفر میں دوسرا اہم موڑ محمد تغلق کا دولت آباد کو (۱۳۲۷ء) پایۂ تخت بنانا ہے۔

علاؤالدین خلجی نے اپنے مفتوحہ علاقوں کے انتظام و انصرام کے لیے تمام علاقہ کو انتظامی حلقوں میں تقسیم کیا۔ اور ہر حلقہ میں ایک ترک افسر بحیثیت ناظم مقرر کیا۔ انھوں

تھی۔ امرائے شمالی ہند سے یہاں منتقل ہو کر بس گئے۔ اس کے بعد محمد تغلق نے بھی اسی نظام حکومت کو برقرار رکھا۔ اس طرح شمالی ہند، دکن اور گجرات کے تعلقات استوار ہوئے، تجارتی لین دین اور دیگر معاشرتی امور کے ساتھ رشتے بھی قائم ہوتے چلے گئے۔

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب علاء الدین خلجی نے شمالی ہند کے لا تعداد خاندانوں کو دکن میں آباد کیا اور محمد تغلق پوری دلی کو دولت آباد لے آیا تو یہاں تہذیبی، معاشرتی، لسانی سطح پر کس قدر زبردست انقلاب برپا ہوگا اور کیا کچھ تبدیلیاں نہ آئی ہوں گی۔

"تاریخ ادب اردو" میں جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ "اس عمل نے شمالی کی تہذیب اور زبان کے اثر کو دکن میں (بشمول برار) تیز تر کر دیا۔

ان واقعات سے نصیر الدین ہاشمی نے یہ نتائج اخذ کیے ہیں کہ یہ فاتح جو زبان دکن میں لے کر آئے وہ یہاں آزادانہ نشو و نما پانے لگی۔ اس جدید زبان کا یہاں خیر مقدم ہوا۔ اور عام طور پر ہر شخص اسے بولنے لگا۔

یہ وہی زبان تھی جو اپنے علاقائی اثرات کی وجہ سے دہلی میں ریختہ، اردو، اور اُردوئے معلیٰ، دکن میں اور گجرات میں گجری کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس وقت علاقہ برار دہلی اور دکن کے درمیان کی کڑی اور گزرگاہ بنا ہوا تھا ان دونوں علاقوں کی زبان کے اثرات یہاں بیک وقت مرتب ہوتے گئے۔

نصیر الدین ہاشمی نے اس عمل کو اس طرح واضح کیا ہے کہ "دوآبہ اور دکن کے علاقوں میں بہت فاصلہ حائل ہے۔ اس لیے دکن میں جب یہ جدید زبان بولی جانے لگی تو مسافت کی دوری کی وجہ سے اس پر برج کا اثر کم ہو گیا جبکہ برار کے شعراء کے کلام میں برج کے لیے بیشمار الفاظ کا بے تکلف استعمال ہوا ہے۔"

سلطنت بہمنی کے عہد میں سلاطین اور ناظمین برار نے اس علاقہ میں ان تمام عناصر کو ابھارا جو خصوصیت سے سرزمین دکن سے تعلق رکھتے تھے۔ معاشی روایات کی حوصلہ افزائی کی، دیسی رسوم اور رواج، میلوں ٹھیلوں اور تہواروں کو ترقی دی اور اس زبان کو بھی ترقی دی جو یہاں رائج تھی۔

"دکن میں اردو" میں لکھا ہے کہ محمد شاہ کے زمانے میں بہمنی سلطنت کے بڑے بڑے شہروں گلبرگہ، بیدر، قندھار، دولت آباد اور ایلچپور میں مدرسے قائم ہوئے جن کے لکھا

[illegible] بہمنی [illegible] کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی حکومت کے [illegible]
تلنگی، کنڑی اور مرہٹی (بہاما) زبان بولنے والوں کو ایک اسٹیج پر جمع کیا۔ ان میں سے کسی ایک زبان کو عام طور پر سرکاری زبان کا درجہ نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس لیے حکمرانوں کو لازمی طور پر ایسی زبان اختیار کرنی پڑی جو مساوی طور پر تمام رعایا میں عام تھی اور یہ وہی زبان تھی جو محمد تغلق کے ساتھ آئی اور دکن میں نشو و نما پا کر دکنی کے نام سے موسوم ہو گئی۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ برار میں وہی زبان اور کلچر پروان چڑھ رہا تھا جو پورے دکن کا کلچر تھا۔ اس سلسلہ میں کئی صوفیائے کرام کے نام بھی آتے ہیں جنھوں نے شمالی ہند سے لائی ہوئی زبان کو تبلیغ دین اور اخلاق سازی کے لیے استعمال کیا اور خاموشی سے اس زبان کے بیج بوتے رہے۔ برار میں اردو کی ابتدائی ترقی میں ان بزرگوں کی نامعلوم کوششیں ناقابلِ فراموش ہیں۔

احمد شاہ (۱۴۲۲ء) کے عہد حکومت میں یہ زبان بول چال سے بڑھ کر ادبی سطح پر بھی استعمال ہونے لگی تھی۔ چنانچہ اس زمانے میں برار کی علمی قدر دانیوں کا شہرہ سن کر ایک عالم ملا قطب الدین کرمانی اور شاعر آذری کے (ایلچپور) برار میں آنے کا پتہ چلتا ہے۔ یہاں آذری نے قلعہ گاول گڑھ کی تعریف میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا۔

قطب شاہی دور (۱۵۱۸ء تا ۱۶۸۶ء) تک آتے آتے ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں اردو ایک مشترکہ زبان کی حیثیت سے تمام بہمنی سلطنت میں پھیل چکی تھی اور اب اس میں ادبی روایات کے سلسلے بھی شروع ہو چکے تھے۔ فارسی اسلوب، اوزان اور بحور استعمال ہو رہے تھے۔

برار سے تعلق رکھنے والے اس رجحان کے پہلے شاعر محمد بیدار فانی (المتوفی ۱۱۶۰ھ) ہیں انھوں نے اردو غزل کو فارسی کا اسلوب دیا۔ جمیل جالبی نے فانی کو نہ صرف برار بلکہ پورے دکن کا نمائندہ شاعر تسلیم کیا ہے اور لکھا ہے کہ فانی اس دور سے تعلق رکھتا ہے جو شروع ہی سے گولکنڈہ میں پھل پھول رہا تھا۔ آج جب ہم فانی کا مطالعہ جانم، جگت گرو، اور عبدل کے زمانے سے کرتے ہیں تو ان کے یہاں جدید اسلوب اپنے نقش و نگار ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ اور ان کے کلام کی حیثیت ایک جزیرہ کی سی معلوم ہوتی ہے۔ نمونتاً ایک شعر دیکھئے۔

ارے اس جے پنتھ کے باج میں آ
دوئی کا تخم ہرگز بو نکوں تو ں
سدا یہ فرمن فانی تجھ اُپر ہے
خدا ایک جان، دیکھوں سُول کل توں

اسی زمانے میں برار کے دو سندھی عالموں شیخ قاسم اور شیخ طاہر کی آمد کا بھی پتہ چلتا ہے جو برار کی ادبی سرگرمیوں کا حال سن کر یہاں کے زمانہ (۱۵۴۳ء) میں سندھ سے ہجرت کر کے احمد آباد ہوتے ہوئے یہاں آکر آباد ہو گئے تھے۔ ان بزرگوں کی اولاد میں طیب سندھی اور ملی جند اللہ بھی گزرے ہیں۔ فانی کے بعد دوسرے اہم شاعر سید بلاقی اللہ جنہوں نے ۱۱۰۰ھ میں معراج نامہ مکمل کیا۔

۱۶۹۸ء تک پورے دکن میں دکنی روایات دم توڑ رہی تھیں اور زبان نئے تشکیل کے دور سے گزرتے ہوئے ریختہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ برار میں اس کے نمائندہ شاعر عبدالرحمٰن قادری ہیں جنہوں نے ایک مثنوی "باغ حسینی" کے نام سے لکھی جو سولہ ہزار اشعار پر مبنی ہے اور دکن کی آخری طویل مثنوی خیال کی جاتی ہے۔

ولی تک (۱۶۸۵ء تا ۱۷۰۵ء) آتے آتے اُردو کی قدیم ہندوی روایات تین سو سال بھانی ہو چکی تھیں اور اب فارسی روایات راہ پانے لگی تھیں۔ ولی کے ہم عصر برار کے شعراء میں آقا محمد وفا ایلچپوری، محمد شاہ محرم، ابوالحسن، رسا بالاپوری اور شیخ غلام مصطفٰے انسان کی زبان بھی دکنی سے ریختہ کی طرف آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ انسان نے شمالی ہند کی شاعری کی نمایاں صنف شاعری دو ہے بھی کہے ہیں۔ وفا کے کلام میں روانی شگفتگی اور تاثیر کے ساتھ زبان بھی قابل توجہ ہے جس میں دکنی اور شمالی ہند کی زبانوں کے الفاظ کا استعمال ملتا ہے ۵

دو جہاں کو ترک کر اے دل خدا کے واسطے
اب خودی سیں باز آ اے دل خدا کے واسطے

اس دور کے اختتام تک دبستان دہلی اور دبستان لکھنو قائم ہو چکے تھے۔ یہ دور اُردو شاعری کا عہد زریں کہلایا۔ ایک طرف زبان پر تکلف بن چکی تھی تو دوسری طرف کلام تخئیل، درد، اثر، تصوف اور منظر نگاری سے مزین ہو رہا تھا۔ غزل اور قصیدہ کا رواج بڑھ چکا تھا۔ برار کے اس دور کے شعراء میں بھی یہ روایات پائی جاتی ہیں۔ ان میں شاہ باقر حسین باقر شمس الدین

علی خاں رنگیں، خواجم قلی خاں موزوں، شیخ نورالعین واقف، شیخ نور محمد عاشق، محبوب خان محمد رسا، مرزا عطا ضیاء، سید محمد درویش درستی ملکاپوری، نصیرالدین خان دانا، مبارک خاں مبارک، میر عبدالحی خاں صارم، میر لطف علی لطفی، شاہ غلام حسین ایلچپوری، اور جرنیل خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

اس دور کے اہم اور نمائندہ شاعر شاہ غلام حسین ایلچپوری ہیں۔ ان کی شاعری لسانی اور معنوی اعتبار سے بہت اہم ہے ان کی زبان میں دکنی اور برج دونوں زبانوں کا رنگ نظر آتا ہے خصوصیت سے ان کی شاعری میں برج کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں جو بہت کم دکنی شعراء کے یہاں نظر آتے ہیں۔ ان کی ایک طویل نظم "اُدھو نامہ" کا موضوع ہی نہیں بلکہ زبان کا قابلِ توجہ ہے۔ اس میں بینیا، ہمری، بھرنی وغیرہ برج کے الفاظ بلا تکلف استعمال ہوئے ہیں۔ ان کی ایک غزل سانجھ پڑی چوندلیس میں بھی برج کے الفاظ کی کثرت ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شمالی ہند کی زبان کے اثرات دکن کی بہ نسبت برار پر زیادہ مضبوطی سے مرتب ہوئے غلام حسین کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

سُوَت سُوَت نِسدِن کھویا سورج ڈوبا جائے
چاندنہ نکسا بھیا اندھیرا سانجھ پڑی چوندلیس

غلام حسین کی یہ غزل جو ہندی افکار اور طریقہ اظہار کی آئینہ دار ہے اس زمانہ میں ایک نئی آواز معلوم ہوتی ہے۔ بعد کے شعراء مرزا دین محمد اعزاز، قاضی محمد صاحب ناقص ملکاپوری، میر شمس الدین محمد فیض، بھوانی پرشاد نفیس، امجد حسین امجد، سہیل، عنایت اللہ عنایت بدنیروی، عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری وغیرہ کے یہاں شمالی رنگ دکنی لب و لہجہ کے ساتھ مشترک نظر آتی ہیں۔

اس علاقہ میں اردو کی ہمسایہ ترقی یافتہ زبان مرہٹی ہے۔ یہاں کے حکمرانوں نے سیاسی اغراض، رعایا پروری، وسیع النظری اور رواداری کے پیشِ نظر مرہٹی ادب کی ترقی اور پرداخت میں بھی دل چسپی لی یہاں تک کہ عادل شاہی اور قطب شاہی سلاطین نے اسے درباری حیثیت بھی دی۔ دفتری کارگزاریاں مرہٹی میں ہونے لگیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں اردو زبان میں مرہٹی الفاظ کے استعمال کی رفتار تیز تر ہو گئی۔ غلام حسین ایلچپوری، نامدار خاں پتی جبرنیل، امجد حسین امجد اور شرف الدین شرف کے یہاں نہ صرف

مراٹھی الفاظ کا استعمال بلکہ مراٹھی اشعار و موضوعات بھی ملتے ہیں۔

۱۹۰۸ء کے بعد اردو شاعری کے جدید دور کا آغاز ہوا۔ ابتداء میں برار میں ادبی جمود طاری رہا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد یہ سست رفتاری دور ہوتی گئی۔ اس کے محرکات میں مڈل ہائی اسکول امراؤتی اور نارمل اسکول امراؤتی، اور مقامی خانگی مشاعرے شامل ہیں۔ اسی فضا میں مظہر مرتضیٰ پوری، عبدالکریم شائق کھامگانوی، قیصر بڈنیروی، بشیر احمد شہید ملکاپوری، شور علیگ، بغدادی بیگم، خورشید آرا بیگم اور بسمل ناندوروی وغیرہ کے ذوق شعری کی تربیت ہوئی۔ اسی زمانے میں مراٹھی ادب سے متاثر ہو کر 'پواڑے' اور 'لوک گیتوں' کے انداز پر محرم کے مہینے میں جوگیوں کے میلے، اور شعر خوانی کا چرچا ہوا۔ اس صنف شاعری کو کھامگاؤں میں شائق نے بالاپور میں معصوم ارمان نے اور دیول گھاٹ میں گلشیر خاں ببر نے رواج دیا۔ اس دور کے زیادہ تر شعراء کو ان محرم کی مجلسوں اور میلوں ہی سے شاعری کا چسکہ پڑا۔

پھر ترقی پسند تحریک، مارکسی نظریہ ادب اور ادب برائے زندگی کے نظریات سے متاثر ہو کر شور علیگ، قیصر بڈنیروی اور رشید کیفی نے شاعری کو نیا موڑ دیا ان کے بعد شاعری میں اس نسل کے نمائندہ شعراء خلیل شارق، حفیظ اللہ خاں بدر، منشاء الرحمٰن خاں منشاء، عبدالقدوس ناطق، منصور کارنجوی، انوار الحق خاں انور، یوسف اثر، ابراہیم بسمل نور الدہر سوختی، مجید کارنجوی، غنی اعجاز اور راشد اللہ خاں جوہر ٹھہرتے ہیں۔ نظام منظر جہانگیر جوہر، انوار قریشی، شفق آکوٹوی، شفیع جانیاز اور ان کے ہم عصر کئی شعراء نے اس سفر کو آگے بڑھایا۔

ہر علاقہ کی طرح برار میں بھی ادبی سرگرمیاں شعر و سخن سے شروع ہوئیں اور نثر نے آہستہ آہستہ دروازے کھولے۔ برار کے قدیم نثری ادب کا سفر ۱۸۵۸ء تا ۱۹۰۸ء کے مابین صرف پچاس سالہ مختصر سفر ہے اس میں سید احمد حسین خطیب، مولوی عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری اور مولوی سید عبدالرزاق ذاکر کے نام ملتے ہیں۔ صوفی کی زبان میں دکنی کا اثر نمایاں ہے۔ جبکہ احمد کی تحریریں اور فارسی سے متاثر نظر آتی ہے۔ ذاکر صاحب کی زبان معیاری اور شمالی ہند میں بولی جانے والی زبان کا نمونہ ہے۔ اسی زمانہ میں برار میں اردو صحافت کا آغاز بھی ہوا۔ اس میں ابراہیم شرر کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے ان کے بعد عبدالصمد جاوید نے بھی صحافت کے فروغ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان کے علاوہ کئی ایک

تمام ان میں اور بھی جوڑے جا سکتے ہیں۔ بہر حال اس وقت تک شمالی ہند اور دکن کی ادبی چہل پہل کے شانہ بہ شانہ برار کے ادبا نے بھی زبان کو اعلیٰ معیار تک پہنچا دیا تھا۔

سنہ ۱۹۱۰ء کے بعد نثر میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ مذہبی، ادبی، تنقیدی اور اصلاحی مضامین کے ساتھ ساتھ ناول ڈرامے، کہانیاں افسانے، منی افسانے بھی تخلیق ہوئے۔ تحقیقی کاموں میں دلچسپی پیدا ہوئی اور ایسے انشا پرداز اور اہل قلم سامنے آئے جنہوں نے نہایت اعلیٰ اور معیاری زبان کو رواج دیا اور تحقیق و تنقید کے فن کو بھی اس علاقے میں زندہ کیا۔ ان میں ڈاکٹر نعیم الدین، ڈاکٹر عبدالرحیم، ڈاکٹر نورالسعید اختر، ڈاکٹر منشا ر۔ خلیل شارق ڈاکٹر سعداللہ، عبدالرحیم نشتر، صفدر، محبوب راہی، یحییٰ نشیط، آغا غیاث الرحمٰن خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ اس ادبی رجحان کو زینت جاوید، ایم آئی ساجد، سبحان انجم، اسد اللہ، صبغۃ اللہ، رحمت اللہ خان، فصیح رحمان، سمیع بن سعد، طفیل سیاب اور شکیل اعجاز آگے بڑھا رہے ہیں۔ بعدازاں جدیدیت تحریک چلی ابتدا میں برار میں اس کے قدم اکھڑتے نظر آئے لیکن چونکہ زبان و ادب ہمیشہ ملک گیر تحریکات سے متاثر ہوتے ہی آئے ہیں۔ اس لیے برار میں بھی عالمی تحریکات کے اثرات دھیرے دھیرے نمایاں ہوتے گئے۔ سنہ ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک کے آغاز میں (سنہ ۱۹۳۶ء تا سنہ ۱۹۵۰ء) برار میں وہ زبان جو ابھی تک سرسید اور حالی کا تتبع اختیار کیے ہوئے تھی۔ ترقی پسندوں کی خطابت سے ہمکنار ہو گئی۔

سنہ ۱۹۶۰ء کے بعد پوری اردو دنیا میں ایک بھونچال سا آگیا جس نے زبان و ادب کی قدیم اور ترقی پسند عمارات کو ہلا کر رکھ دیا۔ جدید مکتب فکر ہر قسم کے نظریات سے انحراف کرتے ہوئے زبان میں توڑ پھوڑ کے تجربات کرتا رہا۔ چنانچہ نہ صرف اسلوب اور ہیئت ہی میں انقلاب آیا بلکہ لسانی سطح پر بھی بہت سی تبدیلیاں سامنے آئیں۔ اس اثر کو برار میں فن کاروں نے نمایاں کیا ان میں صفدر اور محبوب راہی ہیں۔ انھوں نے اپنی تخلیقات کی ندرت اور معنی خیز امکان کی وسعت سے اپنے پیچھے آنے والے قلم کاروں کو متاثر کیا۔ چنانچہ نئی زبان، نئی تشبیہات، نئے اشارے، اور نئی علامات کا استعمال ہو رہا ہے اور اس سے زبان میں کھٹی اور چٹ پٹی ہو چکی ہے۔

آج برار میں وہی زبان بولی اور لکھی جاتی ہے۔ جو شمالی ہند اور دکن کی معیاری زبان۔ ہے یہاں کی اپنی زبان میں شمالی ہند کی جدید تقاضوں سے متاثر زبان کی آمیزش ہے تو بازار، ہاٹ اور دیہات کی زبان میں مرہٹی کے ساتھ دکنی کا اثر نمایاں ہے۔ اس طرح برار کی اردو زبان مرہٹی پس منظر کے ساتھ دکنی اور شمالی ہند کی زبانوں کا خوب صورت سنگم ہے۔

سید شاہ سکندر

حالی کا مسدس

پیامی شاعری کا سرمایۂ مقدس

حالی کی تمام شاعری میں جو چیز خصوصیت سے ان کے مزاج اور افکار کی سب سے بہتر نمائندگی کرتی ہے وہ ان کی شاہکار نظم مسدس مدوجزر اسلام ہے اس نظم کو اگر جدید اردو شاعری کا پہلا کامیاب نمونہ کہا جائے تو بجا ہے۔ یہ نظم عوامی پسندیدگی کے لحاظ سے ساری اردو شاعری پر بھاری ہے۔ اردو کے کسی شاعر کا کلام کبھی اتنی بار اور اتنی بڑی تعداد میں نہیں چھپا جتنی بار اور جس قدر تعداد میں حالی کا مسدس چھپا ہے۔ اردو شاعری کی مختلف اصناف سخن مختلف حلقوں میں مقبول ہوئی ہیں۔ غزلیں لطف و تفریح کی محفلوں میں گائی جاتی ہیں اور پسند کی جاتی ہیں۔ مذہبی نظمیں مذہبی جلسوں میں سنی اور سنائی جاتی ہیں۔ لیکن تمام شاعری میں یہ امتیاز اور خصوصیت صرف مسدس حالی کو حاصل ہے۔ وہ ہر موقع پر ہر تقریب پر ہر طرح کے حلقوں اور اجتماعات میں پڑھی اور سنائی جا سکتی ہے۔ اور ہر موقع پر کامیاب بھی رہتی ہے۔ سر سید نے اس نظم پر جن لفظوں میں اپنی بے حد پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ زمانے نے اس کی صداقت کی عملاً تصدیق کر دی ہے۔

ایک زمانہ تھا مسدس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا شمالی ہند میں شادی کے موقع پر لڑکیوں کو جہیز قرآن شریف کے ساتھ حالی کا مسدس بھی دی جاتی تھی۔ غرض اردو کی اور کوئی نظم اردو شاعری کی تاریخ میں حالی کی مسدس سے زیادہ مقبول اور مشہور نہیں ہوئی۔

ریسرچ اسکالر، ایس۔ وی۔ یونیورسٹی، تروپتی۔ اے پی

حالؔی نے اپنی شاعری اور پیام پر بھرپور اعتماد کا اپنی مسدس کے دیباچے میں اس طرح اظہار کیا ہے۔

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی　　　بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی

جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا　　　ہم نے بھی تیری رام کہانی چھوڑی

ان اشعار سے انداز ہوتا ہے کہ حالی کے دل سے شاعری کا جذبۂ بے پایاں قوم کی محبت سے سرشار ایک پیغام بن کر نکلا جس کی وجہ سے حالی کا مسدس شاہکار بن گیا اور اس نے حالی کو قوم کی خدمت کا بہترین پیامبر بنا دیا۔

ڈاکٹر عبدالحق نے حالی کی سیرت اور شخصیت کے بارے میں دو باتوں کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔" مولانا کی سیرت میں یہ دو ممتاز خصوصیتیں تھیں۔ ایک سادگی اور دوسری دردِ دل اور یہی شان انکے کلام میں ہے، ان کی سیرت اور کلام ایک ہے یا یوں سمجھیے کہ ایک دوسرے کا عکس ہیں"۔

یہ قول اگرچہ حالی کی پوری شاعری پر صادق آتا ہے لیکن تنہا مسدس سے بھی اس قول کی عملی تصدیق ہوجاتی ہے۔ مشہور ماہر تعلیم اور نفسیات کے مبصر ڈاکٹر ذاکر حسین نے حالؔی کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی اس خوبی کو خصوصیت سے ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

"وہ ان میں تھے جن کی طبیعت میں مصائب و آلام کی جگہ سوزِ دل کی دھیمی دھیمی گرمی اور درد کی میٹھی میٹھی کسک پیدا ہوتی ہے جو بے بسی سے چلّاتے اور بپھرنے کی جگہ سعی پیہم کا عزم کرتے ہیں۔"

یہ قول مکمل طور پر مسدس پر صادق آتا ہے اور اس نے ادب اور شاعری کی تاریخ میں حالؔی کو ہمیشہ کے لیے امر بنا دیا ہے۔

حالی کی شخصیت میں شرافت اور شائستگی نرمی اور ہمدردی خلوص اور خیر کا جو عظیم سرمایہ تھا وہی ان کی شاعری کا بھی سب سے قیمتی حصہ ہے۔ لیکن ان کی بھرپور نمائندگی ان کی مسدس ہی سے ہوتی ہے۔ مسدس کو اگرچہ قوم کا مرثیہ اور اس کی عظمت رفتہ کی داستان بھی کہا گیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ حالؔی کے سارے فکر و فن کا خلاصہ ہے اور ان کے پیام کا ایسا عطیہ اور عرفان ہے جس نے ساری اردو شاعری کے باغ کو مہکا دیا ہے۔

ڈاکٹر عابد حسین نے حالی کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ سچا

بے تکلف ہے، مومن ہے، عابد ہے، زاہد ہے۔ احکام ظاہر [illegible]

ہے مگر اسے نہ دین کا گھمنڈ ہے نہ ایمان کا نہ عبادت کا نہ زہد کا نہ شریعت کا وہ اپنی نجات کا وسیلہ دو چیزوں کو سمجھتا ہے جو اصل میں ایک ہیں۔ محبت اور خدمت۔

حالی کی نجات کا یہ تصور حالی کی مسدس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے واقعہ یہ ہے کہ یہ حالی کا اتنا بیش قیمت کارنامہ ہے کہ سرسید کا یہ قول اس پر پوری طرح صادق آتا ہے کہ اگر خدا نے مجھ سے قیامت میں سوال کیا کہ نجات کا کیا سامان کیا ہے تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں۔

مسدس کو پروفیسر رضی الدین احمد نے اقبال کی ساری پیامی شاعری کا پیش رو قرار دیا ہے نہ صرف فکر کے تمام عناصر کے لحاظ سے مسدس اقبال کی شاعری کا واحد نمائندہ ہے بلکہ اپنے آہنگ کے لحاظ سے بھی اقبال کی شاعری کے آہنگ کا ہراول دستہ ہے۔

اقبال اور عشق رسول کے مصنف پروفیسر عبدالرشید نے اس خیال کو بڑی وضاحت کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ اقبال اپنے فکر و فن دونوں کے اعتبار سے حالی کے پیش رو ثابت ہوئے ہیں۔ حالی نے جس مقصدیت اور عملیت کو اپنے فکر و فن کا محور بنایا۔ اقبال کا بھی یہی مرکزی موضوع ہے۔ حالی نے جس طرح شعر و ادب کو صلاح و فلاح ملت کا وسیلہ بنایا وہی مسلک اقبال نے بھی اختیار کیا۔ چنانچہ موصوف نے اس خیال کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔

"غالب کے بعد جس شخصیت کا اثر انھوں (اقبال) نے قبول کیا وہ خواجہ الطاف حسین حالی ہیں۔ وہی دردِ قوم وہی یادِ ماضی اور عظمتِ رفتہ کے احیاء کی تڑپ وہی قوم کا پستیِ اخلاق و زبوں حالی کا رونا اور قوم کے مستقبل کی فکر جو حالی کے ہاں ہے اقبال کے ہاں بھی موجود ہے۔ لہٰذا جہاں ان کو حالی کی دردمندی نے متاثر کیا وہاں ان کے عشقِ رسول کی زمزمہ سنجی نے بھی متاثر کیا ہے۔"

حالی نے جس آہنگ سے ملت سے خطاب کیا ہے ٹھیک اسی آہنگ سے اقبال نے بھی ملت کو اپنا دکھ درد سنایا ہے اور جس طرح حالی نے مسلمانوں سے خصوصی خطاب کر کے انسانیت سے مجموعی خطاب کیا ہے۔ یہی دونوں منزلیں اقبال کی کی شاعری میں بھی بہت واضح ہیں۔ دونوں کا درد بھی ایک ہے اور دونوں کا دل بھی ایک

ہے۔ دونوں نے ایک ہی دل اور ایک ہی درد سے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں شاعری کے میدان کو بہت زیادہ وسیع کر دیا ہے۔ دونوں کا جذبۂ خلوص اور جذبہ خدمت ان کی شاعری کی شاندار اساس ہے۔ البتہ دل اور درد کے اشتراک کے ساتھ ساتھ دونوں میں کچھ اختلاف ضرور ہے۔

حالی نے پہلی بار نئے مسائل کے چیلنج کو پوری طرح قبول کیا ہے اور مکمل اعتماد کے ساتھ بغیر کسی تذبذب کے مغربی تہذیب کی ان صالح قدروں کو قبول کیا ہے جو تمام انسانیت کے لیے ان کے خیال میں مفید اور بہتر ہیں۔ لیکن حالی نے نئی قدروں کے قبول کرنے میں اپنا راستہ ماضی سے یکسر منقطع نہیں کیا ہے بلکہ ماضی اور حال کے تصادم سے ایک بہتر مستقبل کی نئی بنیاد رکھی ہے۔

دنیا کی شاعری میں یہ نرالا اتفاق ہے کہ مسدس ایک ایسی مشترکہ کوشش ہے جس میں دو بڑے دماغوں نے شرکت کی ہے یعنی سرسید کا ذہن اور خیال اور حالی کا ضمیر اور ان کی زبان۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ سائنس کے بڑے بڑے کارنامے جماعت کے ہوسکتے ہیں۔ لیکن شعر و ادب کا کارنامہ محض ایک فرد کا کمال یا کارنامہ ہے لیکن مسدس اس قاعدے میں ایک استثنا ہے کیونکہ یہ نظم دراصل سرسید کے دماغ کی پیداوار ہے۔ انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اردو شاعری میں کوئی نظم ایسی نہیں ہے جو تاریخ اسلام پر روشنی ڈالے۔ حالی نے سرسید کی تحریک پر اور سرسید کی شخصیت کے جادو سے مسحور ہونے کے بعد اسے لکھا۔ سرسید اور حالی ایک جان دو قالب تھے۔ ایک ذہن اور ایک زبان تھے۔ سرسید نے نشان دہی کی اور حالی کے دل میں درد قوم کو ٹیس لینے لگا اور انھوں نے اپنی منزل کی شاہ راہ ڈھونڈ نکالی جس کے لیے وہ مدتوں سے مضطرب تھے جھوٹے عشق اور خیالی معشوقوں کے بجائے ان کے دل میں قوم کی محبت جاگزیں ہو گئی۔ مسدس کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

" زمانے کا نیا ٹھاٹھ دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہو گیا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی۔ قوم کے ایک سچے خیر خواہ نے (سرسید) نے آکر غیرت دلائی کہ حیوان ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا

کی دکھا ہوی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑی شرم کی بات ہے۔ عزیز ذلیل ہو گئے۔ شریف خاک میں مل گئے۔ علم کا خاتمہ ہو چکا ہے دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے۔ پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے۔ اخلاق بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جا رہے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا قوم پر چھائی ہے۔ ایسے میں جس سے جو بن آئے بہتر ہے۔ ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں اور ساری ناؤ کی سلامتی میں ہماری سلامتی ہے۔ ہر چند چند لوگ بہت لکھ رہے ہیں اور بہت کچھ لکھ چکے ہیں مگر نظم بالطبع جو سب کو مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصہ ہے قوم کے بیدار کرنے کے لیے اب تک کسی نے نہیں لکھی۔"

ہر چند کہ (سر سید کے) اس حکم کی بجا آوری مشکل تھی اور اس خدمت کا بوجھ اٹھانا دشوار تھا ناصح کی جادو بھری تقریر جی میں گھر کر گئی دل سے نکلی تھی دل میں جا کر ٹھہری۔ برسوں کی بجھی ہوی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا۔ بیمار دل اور افسردہ دماغ جو امراض کے متواتر حملوں سے کسی کام کے نہ رہے تھے انھیں سے کام لینا شروع کیا اور ایک مسدس کی بنیاد ڈالی۔ اردو شاعری کو سیع دوراں مل گیا۔ اور ۱۸۷۹ء میں سدس مدوجزر اسلام عالم وجود میں آئی۔ حالی نے مسدس بڑے خلوص اور ولولہ کے ساتھ مکمل کیا اور اس کی ایک جلد سرسید کی خدمت میں پیش کی سرسید نے جن الفاظ میں اپنا تاثر ظاہر کیا اسے پڑھ کر کوئی اور دوسرا تاثر نہیں ہو سکتا۔

"جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہوئی۔ جس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے۔ بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ جھوٹی تشبیہات اور دور از کار خیالات سے بالکل مبرا ہے کیونکہ اس خوبی اور خوش بیانی اور موثر طور پر ادا ہوی ہے۔ متعدد بند ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق یہ ہے کہ جو بات دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے بے شک میں اس کا محرک ہوں اور اس کو میں اپنے ان اعمال حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ جب قیامت میں خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس

"لکھالایا بھلا" (سرسید)
حالی کا مسدس خدا کی مخلوق انسانوں کی ترغیب کے لیے اپنے محبت بھرے دل کی آواز ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں

کسی نے یہ سقراط سے جا کے پوچھا — مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا
کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا — کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں

نہیں کوئی ذرہ نجابت کا باقی — اگر ہو کسی میں تو ہے اتفاقی
کہ نا اتفاقی نے کھویا ہے ہم کو — اسی جز رو مد نے ڈبویا ہے ہم کو
اگر بھیک مل جائے قسمت سے ان کو — تو سو بار بہتر ہے محنت سے ان کو
نہ سرکار میں کام پانے کے قابل — نہ دربار میں لب ہلانے کے قابل
وہ گھر بیٹھے آخر کمائی بڑوں کی — بھلا دی جنھوں نے برائی بڑوں کی
یہ اے قوم اسلام عبرت کی جا ہے — کہ شاہوں کی اولاد در در گدا ہے
جسے سنیے افلاس میں مبتلا ہے — جسے دیکھیے مفلس و بے نوا ہے
نہیں کوئی ان میں کمانے کے قابل
اگر ہیں تو ہیں مانگ کھانے کے قابل

مشقت کو محنت کو جو عار سمجھیں — ہنر اور پیشہ کو جو خوار سمجھیں
تجارت کو کھیتی کو دشوار سمجھیں — فرنگی کے پیسے کو مردار سمجھیں
تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی
وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی

اردو اخبارات و رسائل خرید کر پڑھنا

اُردو کی زندگی اور ترقی کا ضامن ہے

ا - و۔ شاکرہ

کیسے چلوں پٹریا رے

اردو زبان کے ایک صاحب طرز ادیب خواجہ حسن نظامی نے کبھی اپنے مسلمان قاعدہ میں لکھا تھا "جمعرات میری دائی جمعہ کی خیرائی" جمعہ میری اماں جیسی کھیلوں دھمک دھما ہفتہ میرا نانا مکان پکڑ بوتا۔ مگر اب تو ہفتہ میرا نانا آرام کا دن بن گیا ہے (بات ان دنوں کی ہے جب پانچ دن کا ہفتہ چل رہا تھا) مگر اس آرام کے دن ہفتہ بھر کے ملتویہ کام "آرام حرام ہے" کا نعرہ بلند کرتے ہوئے باہر نکلنے کے لئے مجبور کر دیتے ہیں اس دن بازار اور بنک دونوں ہی کھلے رہتے ہیں۔

ایسے ہی ایک ہفتہ کو شہر میں سیفٹی ہفتہ منایا جا رہا تھا باہر نکلنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس سیفٹی ہفتہ کا احترام کرنے کیلئے پکا ارادہ کر لیا ہے ہرگز ہرگز سڑک پر نہ چلیں گے بلکہ کنارے کنارے فٹ پاتھ پر ہی چلیں گے۔ خود بھی خطرہ سے دور رہیں گے اور دوسروں کے لئے خطرہ نہیں بنیں گے "جیو اور جینے دو" یہ ہم ہندوستانیوں کا سدا سے آدرش رہا ہے۔

گھر سے نکل کر فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ایک ہی پھاٹک پار کیا تھا سڑک پر اتر جانا پڑا — پرانا مکان نیا بن رہا تھا۔ اینٹ اور سمنٹ سب فٹ پاتھ پر بڑی فراوانی سے پھیلے ہوئے تھے بانسوں کا باڑ بندھا ہوا تھا اور اوپر سے پانی گر رہا تھا اس سے بچنے کیلئے جلدی سے سڑک پر اترنا پڑا ویسے اب دوسری سڑک پر مڑنا بھی تو تھا۔

دیکھا تو سامنے سڑک پر ننھے منوں کا راج تھا۔ اسکول کا پھاٹک ابھی کھلا ہی تھا تازہ اور باسی ٹھنڈی اور میٹھی تیکھی اور کھٹی سب ہی مزوں کی چیزیں ٹھیلوں ٹوکروں اور خوانوں میں سبھی موجود تھیں ان کے بیچنے والوں اور خریداروں کے ہجوم میں ننھی سی پٹریا کہیں کھوئی ہوئی تھی پھر بھی ننھے منوں کی معصوم رکاوٹوں سے "راستہ پر سلامتی ہی سلامتی تھی ان کو دیکھ کر سست رفتار تیز رفتار سواریاں بھی

انچارج لائبریرین شعبہ مخطوطات عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری - حیدرآباد

سنبھل سنبھل کر چلائی جا رہی تھیں سڑک کے بیچوں بیچ چلنے میں بھی سلامتی ہفتہ کی کوئی تعبیر نہیں تھی۔ چلئے سلامتی سے یہ چھوٹی سی سڑک بھی پار ہو گئی اب ذرا بڑی اور معروف سڑک سامنے تھی پھر سے ارادہ کر لیا ہم اس معروف راستہ پر توفٹ پاتھ کو ہرگز نہ چھوڑیں گے ایک شعلہ سا آنکھوں کے سامنے لپک گیا مگر سامنے کسی طرف نا ہموار کی بجائے دھوبی کی استری دہک رہی تھی کچھ بازو ہٹنا چاہا تو موچی کے سوئی دھاگہ میں اُلجھے اُلجھتے بوٹ پالش کے ڈبوں کو لڑھکاتے لڑھکاتے اور بڑے بھاری درخت کے تنے سے ٹکراتے ٹکراتے دوسری طرف پہونچ گئے جہاں اسکاپ ڈیلر نے ابھی ابھی مال سے بھری لاری خالی کروائی تھی جس میں سوئی سے لیکر بھالے شیشے سے لیکر اینٹ، پیپر سے لیکر پلاسٹک اور پیالے سے لیکر بوتل تک ہر نوع اور قسم کی چیزیں شامل تھیں مجبوراً سڑک پر اترنا ہی پڑا اچار قدم بھی چلنے پائے تھے، بھولی بھالی گائے کی بے پرواہ تفریح اور بکھلتے کیچڑ کی شرارت سے ڈرکر پھر سے چبوترہ پر چڑھنا چاہا تو اپنے آپ کو آئس فروٹ کی بنڈیوں کی بھول بھلیوں میں گھرا پایا، غریب بچے اپنے نیلگوں ہاتھوں سے ان ٹھنڈی ٹھیلوں میں برف ٹھونس رہے تھے ایک کے بعد ایک یہ بھول بھلیاں پھیلتی ہی گئیں، بے شمار زاویوں اور دائروں میں رکھی ٹیکسی سیکلوں اور مرمت کے لئے رکھی اسکوٹروں کو پار کروں تو کیسے کروں بڑی مشکل سے اس طلسم کو پار کیا تو سڑک پر آزاد یا شاید حسن نظامی یا شاید اسماعیل میرٹھی کے اردو سبق کے گھریلو زندگی کا ایک سبق سامنے تھا راستہ میں کھاٹ بچھے ہوئے تھے کھاٹوں پر چھوٹے بڑے بچے اور بچیاں ناچ کود رہے تھے اور لڑ بھڑ رہے تھے اور گالی دے رہے تھے بڑی بیٹی یا شاید چھوٹی بہو زمین پر اکڑوں بیٹھی دھان پھٹک رہی تھی۔ باپ بے خبر سویا پڑا تھا ماں بچے کو دودھ پلا رہی تھی اور دوسرے بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ رہی تھی رسیوں پر کپڑے سوکھ رہے تھے جو دھل کر بھی سفید نہیں ہوئے تھے سامنے دکان سے مرمروں اور چنوں کا بھاؤ تول کر رہی تھی اور بھاڑ ہی سے بھنے چنوں کی سوندھی سوندھی بو نکل کر سارے اطراف میں پھیل رہی تھی وہی سوندھے سوندھے چنے جن کے ذریعے سے مرزا ظاہر دار بیگ نے اپنے یار غار دل بھر کے بھوکے کلیم (توبۃ النصوح والے) کو بہلانے کی کوشش کی تھی کلیم باپ سے لڑ کر بڑی امیدوں سے اپنے چہیل چھبیلے دوست مرزا ظاہر دار بیگ کے ہاں گیا سوچا تھا دوست کے پاس خوب خاطر مدارات ہو گی مگر کیا ہوا ظاہر دار بیگ گئے اور آدھی رات کو دھیلے کے چنے بھاڑ میں بھنوا لائے مٹھی بھر چنے جس میں سے شاید خود بھی کچھ پھانک گئے تھے پھر انھوں نے کلیم سے کہا تھا دیکھو ان کی سوندھی سوندھی خوشبو بھی عجیب دل فریب ہے کہ بس بیان نہیں ہو سکتا تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا مگر بھنے چنوں کی طرف کسی کا ذہن ہی منتقل نہ ہوا اسد دل خوش قطعے دانے پر خراش کم نہیں ہے بستی، پستی لوگوں کی بے داد

سے ٹھیک دکر جب چچا حضرت میکائیل کے دربار میں فریاد لے گیا اور الٹے کیسے پکڑ کے اس کو ڈیٹے ہیں تو اس کی چرب زبانی دیکھ کر اور سندر چچا کو منہ توڑ کر حضرت میکائیل کے دربار میں حاضر ہر شخص سے کھانے دوڑا ـــــ

اب میں اس پورے گھر بار کو پار کر کے کیسے چلوں پیٹر یا رسے یہاں سے جو پار ہوئے تو ویلڈر کی دکان کے آگے ٹھنڈی نیلی اور خوفناک روشنی میں درست ہونے والے پیاسے لوہے کے فرنیچر نے ہوا کو تھام لیا۔ بیچ سڑک پر چلنا چاہا تو سڑک اور فٹ پاتھ پر اکثر ول بیٹھے منزویات سے فارغ ہونے والے بچوں کو دیکھ شرم نے پیر پکڑ لیے جائیں تو کہاں جائیں۔ چلیں تو کیسے چلیں !!

کسی نہ کسی طرح سڑک پر چلنا چاہا تو بغیر سائیڈ دیکھے بنا گھنٹی بجائے چلنے والی سیکلوں کی زد سے بچنے کی اور فٹ پاتھ پر چلنے کی کوشش کی کسی بند پھاٹک کے سامنے کھڑی جیپ کو دیکھ کر ہارمان لینی پڑی زمانہ بڑا ہنگامہ ہے۔ بڑے بڑے بنگلوں کے سامنے وسیع لانوں میں خوش نما حوض اور اچھلتے اردل کی جگہ چھوٹے بڑے بے ہنگام گھروندے اگ آئے ہیں کہ ان کے کرایوں سے پیٹ پالا رکھ لکھا وبقا رکھا جا سکے۔

حیدرآباد نگینہ اندرمٹی باہر چونا گیٹ کی آب وتاب بہرحال باقی رکھتی ہے اسی لیے پھاٹکیں بند وہ بھی غائب ہو گئے ہیں اب سیکل، ہیکل رکشا، آٹو، اسکوٹر، کار، جیپ اور لاریاں شہر میں تو بھلا مال شہر میں اور میں بے کار بھلا سڑک پر چلوں تو کیسے !!

آگے ڈیری فارم ہے چارہ کی بنڈی ابھی خالی ہو رہی ہے گوبر کی ہنڈی ابھی بھری نہیں بھینس زندگی حاصل کرنے کیلئے نکل رہی تھیں دودھ والا سر پر دودھ کا بھرا گھڑا رکھ سیکل کو پیڈل مارنے والا تو میں پڑ رہا پر چلوں تو کیسے خالص دودھ کے لئے شہریوں کو کچھ تو قربانی دینی ہی ہوگی کیونکہ یہاں ڈیری فارموں کو شہر سے باہر کر دیا جائے۔

قربانی کے بارے میں سوچ رہی تھا۔ کہ سامنے امر شہید گاندھی جی کا بت نظر آیا ـــــ گاندھی جی جنہوں نے راستی صفائی اور پاکیزگی ظاہری اور باطنی ـــ کے لئے اپنی زندگی کی قربانی دی ـــــ یہاں ایک طرف سرکاری بیت الخلاء دوسری طرف کچرے کی بھرپور کنڈی سامنے سڑک پر ملبہ کی کچرا پھینکنے والی لاری بیچ میں جھنڈے کا چبوترہ ـــ مٹی سے اور چھلکوں سے بھرا ہوا ـــ پیچھے شہر خموشاں میں پھولی قبروں پر جانے کن دربدروں کا اوڑھنا بچھونا چیتھڑوں جیسا سوکھ رہا ہے چند قبروں پر لا پچھی اور سوکھ رہی ہیں اور میلے کچیلے بچے جی کی آنکھیں سوجی ہوئی ہیں رال ٹپک رہی ہے بالوں میں

گردانی ہوئی ہے دانتوں میں میل جمی ہوئی ہے مگر جو اپنے وقت کے بادشاہ ہیں اپنے سمے کے مالک ہیں بڑی بے فکری آزادی سے من پسند کھیل قبروں کے اور گرد کنڈی کے آزو بازو اور مٹی کے ڈھیروں میں کھیل رہے ہیں انھیں یہ پرواہ نہیں کہ صفائی کے نل سے برتنوں اور کپڑوں کے دھوئن کا پانی آس پاس بہ رہا ہے ——— انھیں یہ پرواہ نہیں کہ ڈرینج کی ٹوٹی پائپ کا پانی بھی آس پاس بہہ رہا ہے جو ان کے گندے پیروں کو اور گندہ بنا رہا ہے انھیں یہ فکر بھی نہیں کہ سویرے پھیلائی گئی انسانوں اور جانوروں کی غلاظتیں بو دے رہی ہیں کہیں سے کوئی پگلی آنکلتی ہے لوگ مفت وہ سب دیکھ رہے ہیں جس کے لئے نائٹ کلب اور کیبرے آباد کئے جاتے ہیں۔

حیات اللہ انصاری نے بھی کبھی اپنے افسانے بھرے بازار میں یوں ہی سوچا تھا، بچے غل مچاتے ہیں بوڑھے گالیاں دیتے ہیں اور ان سب کے درمیان راشٹر پتا کا ہنستا مسکراتا چہرہ بارش دھوپ اور شبنم میں بھیگتا تپتا اور سہرتا ——— بڑے آدمی جن کی جگہ دلوں میں ہے کیسا اور کیوں مجسمے بن کر سڑکوں پر زمانہ کی دست برد کا نشانہ بنتے ہیں۔

کسی راہی کو آسکر وائیلڈ کے مسرور شہزادے یا ہیپی پرنس کی یاد آگئی جس کا دل درد سے پھٹ گیا تھا اور جسے گھورے پر جگہ ملی تھی مگر یہی درد بھرا دل خدائے قدوس کی بارگاہ میں ایک نایاب ہدیہ کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے یہ سوچا ایک دم جھٹکا ہو گئی کسی نے تیز آواز سے سیٹی بجائی اور راہی کے سنبھلے سنبھلتے تک ایک جیالا سیکل سوار اپنی سائیکل اس کے بازو سے نکال لے گیا راہی نے سڑک کے بیچوں بیچ چلنا چاہا تھا سیکل رکشا، جاوا موٹر بائیک، بجاج اسکوٹر، لیلینڈ لاری، بے نام آٹو رکشا اور بے ڈھب بیل بنڈی اور ننھی سی ترائی سیکل کو ٹکر دینے کی کوشش کرتے کرتے بس میں بھینچا ہو گیا۔ خیر جان بچی لاکھوں پائے — خیر سے بدھو گھر کو آئے۔

اختر شیرانی

کون آیا مرے پہلو میں یہ خواب آلودہ ؛ زلف برہم کیے با چشم حجاب آلودہ
کس نے بستر پہ بٹھایا یہ مجھے شرما کر ؛ کس کے ہاتھوں میں ہے لرزش یہ حجاب آلودہ
کس کا شکوہ کہ مرے عشق کی رسوائی کا ؛ کس کا لہجہ ہے بایں لطف عتاب آلودہ

ڈاکٹر حمید خاں

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

انسان کی جذباتی زندگی سے قلب کا تعلق ابتدائے زمانہ سے مربوط رہا ہے اسی لیے ہر زبان میں کثیر الفاظ اس کے اظہار کے لیے وضع ہوئے ہیں جن کا کوئی تعلق دل کے حقیقی کام سے نہیں ہے، اُردو زبان ایک کم عمر زبان ہے لیکن بہت ہی کم مدت میں بھی اس میں بے حساب الفاظ اس نہج کے اختراع ہوئے ہیں۔ دل بے پرواہ، دل خانہ خراب، دل خستہ حال، دل بے مدعا، دل گرفتہ، سنگ دل، تنگ دل، خوش دل، سخی دل، بد دل، رحم دل، نیک دل، حساس دل، کمزور دل، بہادر دل، چھوٹا دل، بڑا دل، قلب حزیں، سخی القلب، شقی القلب وغیرہ وغیرہ۔ شاید بہت سارے سائنس داں اپنا سر پیٹ لیں کہ فعلیاتی اور تشریحاتی نکتۂ نظر سے ان میں سے کوئی بھی کام دل سے مخصوص نہیں۔ لیکن ایک بات تو صاف ظاہر ہوتی ہے کہ یہ سارے الفاظ دل و دماغ کے قریبی تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔ سائنس دانوں کو اب یہ علم ہو گیا ہے کہ کسی وجہ سے اگر دل کا مفوضہ کام تین منٹ سے زائد رک جائے تو جو نقصان دماغ کو پہنچتا ہے وہ ناقابل تلافی ہوتا ہے اور اس شخص کی سوجھ بوجھ ہمیشہ کے لیے متاثر ہو جاتی ہے۔ اسی لیے Artificial Cardiac Massage اور Respiration کا طریقہ ہر ایک کو سکھانے کی کوشش جاری ہے۔ اب اگر اس روشنی میں ہمارے ادیب اور شاعر قلب کو اس قدر اہمیت دیتے رہے ہیں تو کوئی تعجب اور حیرت کی بات نہیں۔!

کچھ عنوان کے متعلق

میں ایک دن یہ سوچ رہا تھا کہ "ہسکٹ کے حکم کی پابندی میں تقریر کا کیا عنوان دوں کہ ہماری بیگم صاحبہ نے جڑ دیا کہ کیوں نہیں رکھ دیتے " دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے!

بات دل کی تھی دل کو جا لگی۔ میں نے قبول کرلیا، پھر سوچا کیوں نہ تھوڑی سی تحریف کرلی جائے۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ؎ آخر اس مرض کی دوا کیا ہے

لیکن مکرر غور کے بعد محسوس ہوا کہ جو بات اصلی شعر میں ہے وہ تحریف سے ختم ہوجاتی ہے شاید حضرت غالب کا قریبی تعلق ڈاکٹروں سے رہا ہے جب ہی تو اتنا مکمل شعر فرمایا ہے۔ جو پورے کارڈیالوجی پر حاوی ہے، ایک دوسرے موقعہ پر بھی انھوں نے اسی ذوق کا مظاہرہ کیا ہے۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں

حاضرین! یہ انتظامات جو سکو کی طرف سے آپ کیلئے کیے گئے ہیں اس غرض سے ہیں کہ یہاں سے جاتے ہوئے آپ کچھ معلومات لیتے جائیں۔ اسی لیے میں نے یہ مناسب جانا کہ قلب کے امراض ٭ سے متعلق ایک اجمالی خاکہ آپ کے سامنے رکھ دوں تاکہ بعد کی تقریروں سے یہ ہر وقت آپ کی معلومات میں اضافہ بھی ہوتا رہے اور صحیح تصویر بھی آپ کے سامنے رہے کیونکہ میرا خیال ہے کہ کسی ایک مرض پر تقریر سے اس وقت کے حاضرین کے تمام طبقات کو فائدہ نہیں پہنچ سکے گا تو آئیے پہلے آپ کو قلب کی ساخت اور اس کے عمل کے متعلق کچھ ضروری معلومات فراہم کردی جائیں۔

قلب کی ساخت اور فعل

بدن کے نچلے حصے کا استعمال شدہ خراب خون، جگر کے خون سے مل کر ایک بڑی ورید کے ذریعہ اوپری حصہ کا خون ایک دوسری بڑی ورید کے ذریعہ ہے۔ قلب کے پہلے خانہ (دایاں اذن) میں داخل ہوتا ہے اور دائیں بطن کے ذریعہ شش میں پھینک دیا جاتا ہے، یہاں سے آکسیجن حاصل کرلینے کے بعد دونوں ششوں کا خون بائیں اذن سے ہوتا ہوا بائیں بطن میں داخل ہوتا ہے اور پھر ایک زبردست قوت کے ذریعہ سارے جسم میں پہنچایا جاتا ہے۔ اس سارے عمل کے دوران یہ وفادار عضو ایک قطرۂ خون بھی اپنے لیے کام میں نہیں لاتا۔ لیکن جب خون قلب سے باہر نکلتا ہے تو اس کا پہلا حصہ coronary arteries کے ذریعہ قلب ہی کے لیے فراہم ہوتا ہے۔ اور شاید اسی لیے کسی نے کہا ہے کہ۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا ؎ جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

اب آئیے ایک دوسرے نکتہ نظر سے بھی قلب کو دیکھ لیں، یہ تین پرتوں اور اعصاب

پر مشتمل ہوتا ہے۔

۱- اندرونی پرت (Endocardium) جس سے Valve بھی بنتے ہیں۔

۲- عضلاتی پرت (Myocardium) درمیانی دبیز پرت جو سب سے اہم ہوتی ہے اور یہی خون کو واپس لاتی اور باہر پھینکتی ہے۔

۳- بیرونی پرت (Pericardium)

قلبی نظام کو مربوط رکھنے کے لیے اعصابی نظام ہوتا ہے جو بالکل ایک آزاد نوعیت کا ہوتا ہے جو رفتار قلب کو تیز اور آہستہ کرتا رہتا ہے۔

اب اگر بیرونی پرت پر ورم آجائے یا اس میں خون پیپ اور دوسرے مادے جمع ہو جائیں تو دل میں درد ہوگا اور دم چڑھے گا۔

اسی طرح عضلاتی پرت کو خون کم ملے گا ناقص خون ملے تب بھی دل میں درد ہوگا یا دم چڑھے گا۔

اور اسی طرح اندرونی پرت جس میں valves ہوتے ہیں خراب ہوجائے تب بھی دل میں درد ہوگا اور دم چڑھے گا۔

یعنی تینوں صورتوں میں علامات تقریباً ایک ہی قسم کی ہوتی ہیں۔

اب ذرا یہ بھی سن لیجیے۔ سوئی ہوئی حالت میں قلب فی گھنٹہ (۷۵) گیلن خون پھینکتا ہے۔ اور جاگتی حالت میں زیادہ سے زیادہ ۔ اگر دن تمام کی مصروفیات کالحاظ رکھا جائے تو (۲۴) گھنٹوں میں (۲۳۰۰) گیلن خون پھینکتا ہے۔ جو (۷۰) بیرل کے برابر ہے۔

یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ یہ عضو اپنا کاروبار ماں کے پیٹ ہی میں شروع کر دیتا ہے اور بسا اوقات موت کے کئی لمحوں بعد تک اپنا مفوضہ کام جاری رکھتا ہے۔ اسی لیے قدرت نے سے بہت ہی مضبوط بنایا ہے۔ لیکن انسان اپنے ہاتھوں اسے کمزور کرتا ہے۔ یہ بات بھی دلچسپی ے خالی نہ ہوگی اگر آپ کو یہ بتاؤں کہ اگر دل کا ۷۵ فی صد حصہ خراب ہو جائے تب بھی باقی ۲۵ صد حصہ خراب حصہ کا بدل بن کر (کچھ تحفظات کے ساتھ) کام جاری رکھتا ہے۔ پھر بھی ۔ پریشان ہوتے ہیں کہ یہ ایسا شیشہ ہے کہ ذرا ٹھیس لگی اور یہ ٹوٹا۔ شاعر کے پاس تو شاید یہ ل ٹھیک ہے۔ لیکن سائنس داں تو یہ جانتا ہے کہ یہ دل ناتواں خوب ہی مقابلہ کرتا ہے۔

اس قدر تشریحی اور فعلیاتی معلومات عوامی معلومات کے لیے کافی ہیں۔ اب آئیے کچھ

باتیں امراض قلب کے متعلق کی جائیں۔ میرا خیال ہے کہ قلب کا ایک نہ ایک مریض ہر خاندان میں لازمی طور پر ملتا ہے۔ ہر ایک کی نوعیت الگ ہوتی ہے۔ ہر ایک کے تحفظ کے طریقے الگ ہوتے ہیں، ان کے پرہیز جدا ہیں ان کے علاج میں بھی فرق ہوتا ہے اس لیے ان کا جاننا ضروری ہے۔

قلب کے امراض کی تقسیم اس طرح ہوتی ہے۔

۱۔ پیدائشی امراض قلب۔ ۳ فیصد۔ پیدائش سے لے کر ۱۵، ۲۰ برس میں ظاہر ہوتے ہیں۔

۲۔ گٹھیا اور اس سے متعلق امراض قلب۔ ۲۵ فیصد۔ بچپن سے ۲۵، ۳۰ برس تک ظاہر ہوتے ہیں۔ زیادہ تر عورتوں میں ہوتے ہیں۔

۳۔ کشش کی خرابی سے متعلق امراض قلب۔ ۱۰ فی صد۔ کسی عمر میں بھی ظاہر ہو سکتے ہیں۔

۴۔ خون کے دباؤ اور خون کی رسد میں کمی سے متعلقہ امراض۔ ۶۰ فی صد۔ عام طور پر ۳۰ سے لے کر ۶۰ برس تک ظاہر ہوتے ہیں۔

۵۔ متفرق امراض ۲ فی صد

۶۔ Iatrogenic Diseases

سوال یہ ہے کہ اس تناسب کا جاننا آپ کے لیے کیوں ضروری ہے؟۔

یہ اس لیے ضروری ہے کہ ہر گھر میں بچے بھی ہوتے ہیں جوان بھی اور بوڑھے بھی۔ عورتیں بھی ہوتی ہیں اور مرد بھی۔ اور ہر ایک میں قلب کی خرابی الگ نوعیت کی ہوتی ہے اور اس سے تحفظ کے لیے آپ آسانی سے اپنی راہیں متعین کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہر گروپ کی کچھ خصوصیات آپ اپنے ذہن میں محفوظ کر لیں ورنہ Heart Attack ہی کو قلب کا مرض تصور کریں گے حالانکہ اطراف درد کے کئی دوسرے وجوہ موجود ہیں۔

پیدائشی امراضِ قلب

یہ امراض بچے کے پیدا ہونے سے قبل ہی شروع ہو جاتے ہیں اور پیدائش کے فوری بعد یا پھر کچھ برسوں بعد اپنے اثرات دکھانا شروع کرتے ہیں۔ بچہ اگر دودھ پیتے وقت یا روتے وقت نیلا ہو جائے یا پسینہ پسینہ ہو جائے یا اس کا دم چڑھنے لگے یا اس کے چہرے سے درد کا اظہار ہو، اس کی نشوونما آپ کے لحاظ سے یا گھر کی نانی ماں یا دادی ماں کے لحاظ سے ٹھیک نہ ہو تو اس مرض کا شک کرنے میں آپ حق بہ جانب ہیں۔ اور آپ کو اپنے فیملی

ڈاکٹر سے مشورہ کر لینا چاہیے۔

گٹھیا اور اس سے متعلق امراض قلب

نوجوانوں اور خصوصاً عورتوں میں زیادہ عام ہے گٹھیا کا حملہ ابتدائی عمر سے ۲۰ سال تک ہو سکتا ہے۔ یہ قلب کے ..... کو متاثر کرتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ معمولی دواؤں اور چٹکلوں سے ہی گٹھیا قابو میں آ جائے۔ جوڑوں کا درد دور ہو جائے، بخار کم ہو جائے اور بچہ بھلا چنگا نظر آنے لگے مگر ٹھیک تشخیص اور علاج نہ ہو تو اس کے اثرات کئی برس بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ خصوصاً حمل کے دوران۔ ساری عمر یہ متاثر رہیں گے۔ اور مختلف قسم کے علاجوں اور آپریشنوں سے ان کو سنبھالا دینا ہوگا جو ان کے اور ان کے گھر والوں کے لیے مالی مشکلات اور بہت ساری مصیبتوں کا باعث ہوگا۔

یہاں بھی یہی سوال ہوگا کہ آپ کیسے اور کیوں اس کا شک کریں؟ اس کے لیے آپ کی توجہ صرف چند علامتوں پر مبذول کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ جب بھی بخار ہو یا بغیر بخار کے بچوں میں جوڑوں کا درد ہو اور خاص طور پر ..... قسم کا درد، آپ اس پر خاص توجہ دیں۔

۲۔ جب بچوں کو بار بار نزلہ زکام ہو اور حلق کے درد کی شکایت ہو۔

۳۔ بچوں کو پیٹ کا درد بار بار ہو اور اس کی وجہ معلوم نہ ہو سکے۔

۴۔ بار بار نکسیر پھوٹے۔

۵۔ جب بچہ ایسی حرکات کرنے لگے جس سے گھر میں مالی نقصانات کا سلسلہ شروع ہوئے اور اس کو بغیر کسی توجیہہ "شرارت" سمجھنے لگیں، مثلاً ابھی گلاس ٹوٹی اور اب پیالی توڑ دی۔ ابھی امی جان کو آنکھ ماری تھی اب دادی ماں کو کہنی مار دی۔ کسی کو دانت دکھا دیئے تو کسی کو منہ چڑا دیا۔ چلتے چلتے خود گر گئے اور کبھی کرسی گرا دی۔ ابھی اس بات پر پریشانی ہوئی تھی اور کچھ دیر بعد اسی قسم کی کوئی دوسری حرکت کر بیٹھے۔ بچہ بھی پریشان کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے اور اطراف و اکناف کے لوگ بھی حیران کہ یہ کیا تبدیلی اس میں آئی ہے۔ حاضرین کرام! یہ "....." ہے اور یہ بھی گٹھیا کے مرض کا ایک غیر معمولی اظہار ہے اور اسی طرح قلب کے ..... کو متاثر کر سکتا ہے جس طرح جوڑوں کے درد کے بعد۔ ہو سکتا ہے کہ چند روز میں

بچہ ٹھیک ہو جائے اور آپ سمجھیں کہ "پناٹی "کام آگئی۔ لیکن ۲۰-۳۰ سال بعد اس کے اثرات ظاہر ہوں گے۔

کشش سے متعلق امراض قلب

اکثر آپ دیکھتے ہیں کہ سگریٹ پینے والے، گردآلود پیشوں اور مقامات پر کام کرنے والے، بار بار کسی نہ کسی کشش کے مرض میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں جیسے کھانسی، ہمونیا، تپ دق، دمہ وغیرہ وغیرہ۔ علاج سے یہ ٹھیک بھی ہو جاتے ہیں اور اسی وجہ سے اکثر سگریٹ باز یا سگریٹ چی "بہ وزنِ پتنگ باز" یا افیون چی" ڈاکٹروں کے مشورہ کے باوجود اپنی "چرغ" پھر ہاتھ میں تھام لیتے ہیں مگر۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

کے مصداق دواؤں کا اثر کم ہونے لگتا ہے۔ اور کھانسی، دم اور بار بار حرارت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اور آخر میں قلب بھی متاثر ہو جاتا ہے۔

یا الٰہی مٹ نہ جائے دردِ دل

بہرصورت سگریٹ جاری رکھتے ہیں اور جب زیادہ دم چڑھنے لگتا ہے اور مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن

اب کیا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت!!

خون کے دباؤ اور خون کی رسد میں کمی سے متعلقہ امراض

کچھ مریض جمع تھے اور اپنے اپنے تجربات بیان کر رہے تھے۔ "مریضِ درد دل" کی باری آئی تو انھوں نے شروع کیا کہ

اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

امراض قلب میں یہ سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ کچھ اس وجہ سے کہ جب یہ عارضہ لاحق ہوتا ہے تو مریض کی شخصیت بلحاظ عمر بہت ذمہ داری کی ہو جاتی ہے۔ وہ صدر خاندان ہے اور بچوں کی تعلیم و تربیت، گھر کے اخراجات کی ساری ذمہ داری اسی پر ہوتی ہے یا وہ کسی اہم ادارہ، کسی اہم صنعت، کسی اہم کاروبار یا کسی اہم پیشہ کا روحِ رواں ہو، اس کی موجودگی وہاں ضروری ہو اور اس کی دماغی صلاحیت و تجربہ سے استفادہ ضروری ہو گیا ہو۔ اندازہ لگائیے جب ایسے لوگ اس مرض سے متاثر ہوں تو نہ جانے کتنے اور لوگ اور ادارے اس سے متاثر ہو سکتے ہیں۔

اس لیے یہ مناسب ہو گا کہ آپ کی معلومات میں کچھ اضافہ کر دوں۔ پھر مروجہ غلط معلومات کو آپ کے ذہنوں سے نکالوں۔

پہلے آپ یہ جان لیجیے کہ اس کو کیسے پہچانا جاتا ہے۔

۱ - چلنے سے سینہ کے وسط میں درد ہو اور یہ دونوں ہاتھوں یا کسی ایک ہاتھ میں پھیلے، نچلے جبڑے میں درد ہو جو تھوڑے سے آرام سے کم ہو جائے۔

۲ - چلنے یا کام کرنے پر دم پھول جائے جو پہلے نہیں ہوتا تھا یا غیر معمولی تھکان محسوس ہونے لگے۔

۳ - اختلاج ہونے لگے، خصوصاً اگر یہ اچانک شروع ہو اور اچانک ختم ہو۔

۴ - بیچ رات میں سوتے سے جاگ پڑے اور کھانسی اور دم آنے لگے اور اٹھ بیٹھنے سے آرام ہو جائے۔

۵ - اچانک سینہ کا درد ہو اور آدمی پسینہ پسینہ ہو جائے اور موت نظر آنے لگے۔

۶ - شام کے وقت پاؤں پر ورم آنے لگے اور رات کے آرام سے صبح تک غائب ہو جائے۔

۷ - سینہ میں دباؤ اور بے کیفی محسوس ہو۔

متفرق امراض قلب

Thyroid Gland سے متعلق مرض، Bacterial ، Virus Infections، Infections ، Vitamin B کی کمی سے متعلق، Alcoholic myopathy میں وغیرہ وغیرہ

IATROGENIC DISEASES

اس کے متعلق یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ یہ بغیر مرض کے مرض ہے جو دوسروں کا عطیہ مریض کے لیے ہوتا ہے۔ مثلاً غیر ضروری ادویہ کے استعمال سے ان کے اثرات جسم پر۔

- غیر ضروری گفتگو سے مریض کا نفسیاتی طور پر متاثر ہو جانا۔
- ڈاکٹروں کے غلط الفاظ کا استعمال جس سے مریض غلط مفہوم لے لے۔
- اشتہارات اور اخباری مضامین اور مجلّوں کے پڑھنے سے ایسے معلومات ملیں جس کی کوئی سائنسی بنیاد نہ ہو۔

تشخیصی ذرائع

اب تھوڑا سا ان امتحانات کے بارے میں بھی سن لیجیے جو ہم اکثر کرتے

ہیں، کچھ سمجھ کر اور کچھ بنا سمجھے، کچھ جان بوجھ کر کچھ دوسروں کی خاطر کچھ مریض کے خاندان اور دوست احباب کی خاطر اور کچھ قانونی مدافعت کی خاطر!!

E.C.G.: اس سے صرف دو صورتوں میں ہی مدد ملتی ہے! تشخیص کی خاطر یا دوران مرض کوئی پیچیدگی کا شک ہو۔ لیکن جو لوگ اس پر بہت زیادہ بھروسہ کرتے ہیں وہ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں، ایک معمولی سی تکنیکی خرابی اچھے بھلے آدمی کو "مریض قلب" بنا سکتی ہے یا پھر مریض قلب کو اچھا بنا سکتی ہے۔ اکثر آپ سنتے ہوں گے کہ E.C.G لیا گیا ٹھیک تھا، مریض کو اطمینان دلایا گیا لیکن شاید مریض بضد تھا کہ آدھے گھنٹے کے اندر آپ کو غلط ثابت کرنے کی خاطر دوسری دنیا منتقل ہو گیا! سب ہی ڈاکٹر جانتے ہیں کہ یہ صرف ۵۰، ۶۰ فی صد تک معلومات فراہم کر سکتا ہے۔ یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ خواہ مخواہ بار بار E.C.G لینے سے مریض "ماہر قلب" کے پاس سے "ماہر امراض دماغ" کے پاس چلا جاتا ہے۔!

X RAY: یہ تشخیصی طریقہ بھی محدود مگر اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔ لیکن یہ اچھی طرح یاد رہے کہ X RAY ٹھیک نکلے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مرض نہیں ہے اور یہ بھی کہ بار بار کے X RAYS مریض کو بہت ساری مشکلات سے دو چار کر دیں گے۔ کچھ معاشی کچھ radiation کے۔ اسی لیے ڈاکٹر کے مشورہ پر ہی لینا چاہیے۔ آج کل اکثر لوگ خود ہی تصفیہ کر لیتے ہیں اور اپنی ہی مرضی سے X RAY کروا لیتے ہیں۔

Echo Cardiography:- یہ بھی ایک بالکل نیا اور اہم ذریعہ ہے جس سے تشخیص میں مدد ملتی ہے۔ یہ حالیہ دور کی سب سے اہم دریافت ہے۔

LABORATORY INVESTIGATION: خون، پیشاب اور پاخانہ کے کئی امتحانات تشخیص میں کام آتے ہیں۔

لیکن ان امتحانات کی کوتاہیوں کو اچھی طرح ذہن میں رکھنا چاہیے۔ ان میں بہت کم یقینی ہیں۔ سب ہی جانتے ہیں کہ Sample کے مختلف رپورٹس مختلف لیبارٹریوں سے ملتے ہیں بلکہ بعض وقت تو ایک ہی Sample کے مختلف رپورٹس ایک ہی لیبارٹری سے بھی مل سکتے ہیں۔ یہ نہ سمجھیے کہ یہ ہندوستان ہی میں ہوتا ہے بلکہ انگلینڈ، امریکہ، کنیڈا اور

دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن جب آپ آپ کو ایسا تجربہ ہوتا ہے تو آپ کا معاملہ یہاں کی لیبارٹریوں کو سنا دیتے ہیں تاید اسی لیے مثل مشہور ہے کہ گھر کی مرغی دال برابر۔

مندرجہ بالا معلومات سے آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان ذرائع پر مکمل بھروسہ دھوکہ کھانے کے مترادف ہے، لیکن ڈاکٹر اگر ٹھیک ہسٹری لے، مکمل امتحان کرے امتحان کرے اور اس کے بعد حسب ضرورت ان امتحانات سے مدد لے تو بہت ساری الجھنوں سے بچ سکتے ہیں۔

تحفظ اور علاج کے طریقے

اس خصوص میں تین بنیادی باتوں کا لحاظ ضروری ہے۔ ان پر غور کیجیے اور عمل کیجیے یقین ہے آپ کی مشکلات کم ہوں گی۔

۱۔ قدرت پر بھروسہ اور ایقان: کسی مذہب پر بھی آپ غور کریں یہ بات ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ آپ کی ہر خوشی اور ہر غم ایک عظیم قدرتی نظام کے تابع ہے۔ ۲۵ سال کی پریکٹس کے دوران میں نے بہت سے لوگوں کو مرتے دیکھا ہے، کچھ بیماری اور موت سے پہلے خائف، پریشان اور مضطرب نظر آئے، اور کچھ باوقار، پرسکون اور ہنسی خوشی ان کا مقابلہ کرتے نظر آئے۔ یہ دوسرا گروہ ان کا تھا جو سچائی، ایمان اور ایقان کے حامل تھے اور صبر و شکر سے تکلیف اور موت کا مقابلہ کرتے دکھائی دیے، علاج بھی کرتے رہے اور کہتے بھی رہے کہ

موت سے کس کو رستگاری ہے ؎ آج وہ کل ہماری باری ہے

۲۔ خاندان سے وابستہ ڈاکٹر (Family Doctor) عرصۂ دراز سے یہ مروجہ طریقہ بہت ہی مفید رہا ہے کہ ہر خاندان کا ایک مقررہ ڈاکٹر رہے، یہ آپ سے بہت قریب ہوتا ہے اور ہر آڑے وقت کام آتا ہے، موجودہ رجحان جس میں اکثر لوگ راست Consultants سے رجوع ہوتے ہیں نہ صرف غلط بلکہ آپ کی بہت ساری مشکلات کا باعث ہے اس میں وقت ضائع ہوتا ہے اور ابتدائی علاج بروقت ہو نہیں پاتا، حالانکہ ہر Emergency کا بہتر علاج general practitioner کرتے ہیں۔ آپ ان پر بھروسہ کیجیے اور ان ہی کے توسط سے consultants سے بھی رجوع ہوئیے۔

۲ - ماہران فن کسی ایک شعبہ کے ماہر ہوتے ہیں اور زیادہ مشکل بیماریوں کی تشخیص اور علاج میں general practitioners کی مدد کرتے ہیں۔

اب میں آپ کی توجہ ان امور کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں جن سے ان امراض سے تحفظ میں تجرباتی اور تحقیقاتی نتائج کی روشنی میں مدد لی جارہی ہے، میں نے آپ کے سمجھنے کے لیے وہی سلسلہ قائم رکھا ہے جو امراض قلب کی تقسیم میں بتلایا گیا۔

۱ - پیدائشی امراض سے تحفظ : حاملہ عورتوں کے آرام اور ان کی غذا سے لاپرواہی عوام کے بڑے طبقہ میں پائی جاتی ہے، غیر متوازن غذا، وٹامن کی کمی اور اہم دھاتوں کی کمی سے اس بات کا امکان ہے کہ بچہ کی نشوونما میں خامی رہ جائے اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جو طبقہ تھوڑی بہت توجہ دیتا ہے وہ غلو کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور حمل کو نو ماہ کی بیماری تصور کرتا ہے اور اس لحاظ سے بے حساب دواؤں کا استعمال، سخت پرہیز غیر ضروری پابندیاں اور غیر متوازن غذا کے بے حساب اضافہ سے اس عورت کے لیے وہ سارا ماحول پیدا کردیا جاتا ہے جس سے نشوونما میں فرق پیدا ہو جائے۔ یہ حاملہ کے نادان دوست ہیں۔

غیر ضروری طور پر ہوائی سفر، پہاڑی مقامات پر آرام یا سیر و تفریح کے لیے قیام، غیر ضروری دواؤں کا استعمال بچہ کے لیے مضر ہو سکتا ہے، خصوصاً حمل کے ابتدائی تین ماہ میں۔ مثال کے طور پر آپ کو واقف کراؤں کہ چند سال پہلے ایک دوا Thalidomide مسکن دوا کے طور پر استعمال کروائی گئی تھی ان حاملہ عورتوں نے جن بچوں کو جنم دیا وہ بہت بڑی تعداد میں مختلف deformities میں مبتلا پائے گئے۔ اور اب بھی ان ترقی یافتہ ممالک میں اس زمانہ میں پیدا ہونے والے بچے ایک بڑا مسئلہ بنے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ جو ہر نئی دوا کے استعمال کے خواہش مند ہوتے ہیں اور پہل کو وقار کا مسئلہ بنائے ہوئے ہیں۔ ان کے لیے یہ ایک عبرت ناک سبق ہے۔

حاملہ کو اگر ابتدائی تین ماہ کے دوران German Measles ہو تو اس کے بچہ کا مرض قلب میں مبتلا پیدا ہونا یقینی ہے۔ اور اسی لیے یورپ اور امریکہ میں ایسی عورت کے اسقاط حمل کی رائے دی جاتی ہے۔ اسی بنیاد پر حاملہ عورت کو viral infections سے دور رکھنے کی کوشش کرنا چاہیے ——— پرانی بڑی بوڑھی عورتیں حاملہ

معاون پر سخت نگرانی رکھتی ہیں تو یہ غلط نہیں ہے، مگر یہ نگرانی، پرہیز اور ناموافق ماحول سے دوری، حاملہ سے ہمدردی، خوشی تعاون کے ساتھ ہو نہ کہ ساس بہو کے ناخوشگوار تعلقات کے تابع ہو۔

۲- گٹھیا اور اس سے متعلقہ مرض:- یہ بات قطعی ثبوت کے ساتھ معلوم ہو چکی ہے کہ ابتدائی آرام بہت ضروری ہے اور اس میں آپ کا فیملی ڈاکٹر آپ کی مدد کرے گا کہ کب آرام ختم ہو اور کام کاج، پڑھائی اور کھیل شروع کیا جائے۔ یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اس مرض کے دوبارہ حملے اور پیچیدگیوں کو اگر قابو میں رکھنا ہو تو ہر پندرہ دن میں ایک penicillin کا انجکشن دیا جائے۔ اور یہ سلسلہ بچے کی عمر ۲۰ سال ہونے تک جاری رکھا جائے۔ اس میں تغافل یا تساہل مہلک اور پریشان کن ثابت ہوگا۔

۳- شش سے متعلقہ امراض قلب: سگریٹ سے پرہیز، گرد آلود مقامات سے دوری، شش کے امراض کا موثر علاج، تنفسی ورزش آپ کو اس تکلیف اور مستقل مرض سے دور رکھیں گے۔

۴- خون کے دباؤ اور خون کی رسد میں کمی سے متعلقہ امراض قلب: کوئی بات ابتدا ہی میں آپ کو بتلادوں کہ B.P. کئی قسم کا ہوتا ہے جس کا یہاں تفصیلی ذکر غیر ضروری ہوگا۔ صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ چاہے وہ کسی وجہ سے ہو آخر میں قلب کی شریانوں کو دبیز کر دیتا ہے۔ اور H.B.P. کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ جس کی علامات پہلے بتلائے جا چکے ہیں۔ B.P. کے علاوہ Diabetis Gout Myxedema میں بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ شریانوں کی یہ تبدیلی بغیر B.P. کے بھی ہو سکتی ہے۔ بلکہ اکثر ہوتی ہے اور یہی قلب پر حملہ کا پیش خیمہ ہے، میں نہیں چاہتا کہ آپ ان وجوہات اور تحقیقاتی معلومات کو حاصل کرنے کی فی الحال کوشش کریں جو ابھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی ہیں۔ کیونکہ اگر آپ ایسا کریں تو وہی حشر ہوگا کہ

اور اک پیچ پڑی زلف کے سلجھانے میں

یہ تو ان ڈاکٹروں پر چھوڑ دیجئے جو عمر کا بڑا حصہ اس کو سمجھنے میں صرف کرتے ہیں، کچھ سمجھتے ہیں کچھ الجھتے ہیں، البتہ جو باتیں مصدقہ ہو گئی ہیں میں ان کو آپ تک پہنچاتا ہوں اور جن کی مدد سے آپ اس مرض سے دور رہنے کے اقدام کر سکتے ہیں۔

۱ - بلڈ پریشر، ذیابطیس، گاوٹ Hyperthyroidism، Hypothyroidism
ان پر قابو رکھیے، اپنے خاندانی ڈاکٹر سے مدد لیجیے۔ اس سے شریانوں کی دبازت پر قابو پایا جا سکے گا۔ اور آپ عرصۂ دراز تک اس مرض سے محفوظ رہیں گے۔
۲ - چربیلی غذاؤں کا کم استعمال کیجیے۔ Saturated fats اور Un-saturated fats سمجھنے کی کوشش کیجیے اور اس کا تناسب غذا میں قائم رکھیے۔ ایسی غذا جس میں Cholestrol ہو جیسے بھیجہ، کلیجی، انڈا، طالی، گردے وغیرہ کا محتاط استعمال کیجیے۔
۳ - سگریٹ کے مضر اثرات مسلمہ ہیں۔ اس سے آنکھ خراب ہوتی ہے، پیٹ میں ulcer ہوتا ہے۔ شش کینسر ہوتا ہے۔ اور خون متاثرہ شریانوں میں جم سکتا ہے۔ دل کی شریانوں میں spasm ہو سکتا ہے اور قلب کی حرکت غیر متوازن ہو سکتی ہے۔
۴ - جسمانی ورزش کی عادت ڈالیے، چہل قدمی، ٹیبل ٹینس، ٹینس، پیراکی، گالف ورزشیں وغیرہ وغیرہ۔ صحت مند آدمی کو تو کرنا ہی چاہیے۔ لیکن قلب کے مریضوں کے لیے بہت ضروری ہے، لیکن کسی واقف کار کے مشورہ پر۔ اس سے B.P. کم ہوتا ہے قلب کی رفتار کم ہوتی ہے۔ Cholestrol کا لیول کم ہوتا ہے۔ قلب کے بڑھتے ہیں اور بادو مرض کے effeciency میں اضافہ ہوتا ہے۔
۵ - موٹاپے کو کم کرنے کی کوشش کیجیے۔
۵۔ متفرق امراض قلب میں بہت ہی کم ہوتے ہیں اسی لیے صرف انکے نام ہی پہلے بتلائے گئے ہیں۔
Iatrogenic Disease :۔ آج کل یہ مرض بہت توجہ کا مستحق ہو گیا ہے، ضخیم کتابیں، رسالوں میں مضامین اور قابل ڈاکٹروں کے لیکچروں نے اس گتھی کو سلجھانے کی ایک بڑی ہی کوشش کی ہے۔ اس کو یوں سمجھیے کہ کسی معمولی سی بات پر آپ علاج کے لیے رجوع ہوں بغیر مرض کے! اور ڈاکٹروں نے یا دوست احباب نے یہ مرض تحفتاً آپ کو پیش کر دیا۔ اور پھر
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی!
آخر میں کچھ مریضوں سے آپ کی ملاقات کروانے سے پہلے یہ بھی کہہ دوں کہ جو مریض یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی ہر بیماری کا لازمی علاج موجود ہوگا یا جو ڈاکٹر یہ سمجھتے ہیں یا سمجھاتے ہیں کہ وہ ہر مرض کا علاج یقینی طور پر کر سکتے ہیں وہ اپنے اور دوسروں کے لیے بے شمار مصائب

…اضافہ کرتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ مرض کی نوعیت ایک آسان اور شائستہ طریقے سے مریض یا قریبی عزیز کو سمجھا دی جائے۔

اب لیجیے آپ میرے چند مریضوں سے ملاقات فرمائیے۔

۱ - آپ سے ملیے۔ آپ ادھیڑ عمر کے بیوپاری ہیں، مارواڑی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ نے سنا کہ امریکہ میں ہر تھوڑے دن بعد بڑے لوگ check up کرواتے ہیں، ازراہِ تفریح طبع X ray کی ایک clinic پر جا پہنچے اور E.C.G کی فرمائش کر دی، رپورٹ تھی mild anoxia، گھبرا گئے، وہاں سے میرے پاس تشریف لائے شاید میرا امتحان مطلوب تھا، اصرار ہوا کہ E.C.G لیا جائے، حالانکہ کوئی ضرورت نہ تھی، میری رپورٹ تھی Normal، اب یہ گھبرائے اور مجھے قسم دینے لگے کہ سچ کہوں، مجھے عدالتی قسموں کی عادت نہیں کہ کہوں جو کچھ کہوں گا۔ سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا۔ مجھے تو صرف سیدھی سادھی سچ کہنا آتا ہے جو ایک دن دیکھے خدا کو مان کر اور ایک آنے والے دن کے حساب کی خاطر بولنا پڑتا ہے۔ آدھ گھنٹے کی بحث کے بعد یہ با دلِ ناخواستہ مان گئے کہ کوئی مرض نہیں ہے۔ تب انھوں نے ایک گھنٹہ قبل لیا ہوا E.C.G بتلایا اور مطمئن لوٹے۔!

لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب آدھے گھنٹے بعد ان کی شریمتی آئیں روتے ہوئے کہ خدارا آپ سچ بتائیے کہ میرے شوہر کو قلب کی بیماری ہے یا نہیں۔ یا آپ یقین مانیے سلسلہ ہر ہفتہ قائم رہا اور وہی سبق دہرایا جاتا رہا۔ کچھ روز بعد تھکے تو دوسرے ڈاکٹروں کے پھیرے شروع ہوئے۔ ڈاکٹر ابوالحسن کہتے تھے کہ بھائی تمہارا مریض آج کل ہر روز ایک Consultant کے پاس جاتا ہے، ہفتہ کے چھ دن۔ اور ساتویں روز گھر پہ رہتا ہے کیونکہ اس روز ڈاکٹروں کا ملنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ جب اب پھر آنے لگے ہیں مگر میرے "غصہ" کی خاطر تین ماہ میں ایک مرتبہ۔ ۲۰ سال کی جد و جہد اور خواہش کے باوجود اب تک ان کا E.C.G ٹھیک ہے اور ان کے "قلب پر حملہ" کی ان کی خواہش اب تک پوری نہیں ہوئی

…ترجمہ جمال صاحب "ڈاکٹروں کے غصہ" پر آپ کے لیے ایک سیمینار تیار کر رہے ہیں ان کے لیے یہ ایک نمونہ حاضر ہے۔

۲۔ آپ سے بھی مل لیجیے۔ آپ بہت ہی قابل اور مشہور ڈاکٹر ہیں، بہت با ذوق مذاق، غیر معمولی دماغی صلاحیت کے حامل، مریضوں میں اپنی خداداد شخصی صلاحیت کی بنا پر بہت مقبول اور ساتھیوں میں اپنی یادداشت کی بنا پر "میڈیکل انسائیکلوپیڈیا" کے نام سے مشہور رہیں۔ ایک ہارٹ اٹیک کے ساتھ ہی ساری شخصیت بدل گئی، غذائیں پاپڑ، کدو، ٹماٹے، بھاجیاں اور چند چپاتیاں ——— باوجود سید سے اصرار کے بدل نہ سکے۔ یہ لحیم شحیم شخصیت سوکھ کے رہ گئی۔ جسم کی مدافعتی قوت اتنی گری کہ ایک معمولی نزلہ (common infection) کا تاب نہ لاسکی اور ہم اس غیر معمولی شخصیت سے محروم ہوگئے۔ غذا اور آپ کے روزمرہ کے کام اور مرض میں توازن ہونا چاہیے۔

۳۔ ذرا آپ سے بھی مل لیجیے۔ ہنس مکھ، قابل، صحت مند۔ لیکن ۹۹ بخار آجائے تو سارے محلہ کو جمع کرلیا۔ وصیت بھی لکھ دی، پورے خاندان کو اطراف جمع کرلیے اندازہ لگائیے کہ ہارٹ اٹیک کے بعد کیا ہوا ہوگا۔ اتنا آرام لیا کہ چلنے پھرنے کی اجازت اور اصرار کے باوجود لیٹے رہنے کو ترجیح دی، نتیجہ یہ ہوا کہ pulmonary embolism کا شکار ہوئے۔

۴۔ ایک نمونہ اور حاضر ہے۔ آپ کو قلب کا حملہ شدید ہوچکا ہے اور ۲، ۳ مرتبہ ہوچکا ہے۔ پیچیدگیاں بھی ساتھ ہیں۔ اور اصرار ہے کہ کام اسی رفتار سے کریں جیسا کہ صحت کی حالت میں کرتے تھے، شاید یہ بتلانا مقصود تھا کہ بہت بہادر ہیں غذا کی پروا نہ آرام کی پروا۔ اعتدال ان کے لیے مضحکہ خیز ——— ایک جذباتی تقریر فرمارہے تھے، بے ہوش ہوگئے۔ سنبھلے۔ دوسری منزل سے نیچے صرف اس لیے اترے تھے کہ سب کو معلوم ہو کہ کوئی بیماری نہیں۔ اور اسی اظہار کے دوران چل بسے۔

حاصل کلام یہ کہ ہر وقت اعتدال کا خیال رکھیے، سمجھیے اور سمجھ کر علاج میں تعاون کیجیے۔ یہ یاد رکھیے کہ یہ ایک بہت ہی طاقت ور عضو ہے۔ لیکن شاہی صفات رکھتا ہے ——— اچھا سلوک کیجیے اچھا نتیجہ ملے گا۔

قاضی جلیل احمد

اَلبَدْر

(گزشتہ قسط میں جون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ سے پیدا ہونے والے مسائل کا جائزہ لیا گیا اور عرب اور اسرائیل کے نقاط نظر کو پیش کر کے اسرائیل کی ہٹ دھرمی کے جواب میں صدر عبدالناصر اور ان کے انتقال کے بعد انور سادات کے ردعمل کو پیش کیا گیا۔ اب آگے ملاحظہ ہو (ادارہ)

نک آمد بجنگ آمد

۱۹۷۱ء کا سال مصر کے لیے فیصلہ کن سال ہوگا۔ سادات نے اپنی صلح جویانہ حکمت عملی کے نتائج نا مایوس ہو کر اعلان کیا۔ م پرامن ذرائع اور گفت و شنید سے مسائل کو حل کرنے کے حامی ہیں۔ لیکن ہماری امن پسندی لم ہمتی اور بزدلی سے تعبیر کیا گیا تو پھر دنیا کو خبردار ہو جانا چاہیے کہ مصر ایک فیصلہ کن جنگ کیلئے ا تیار ہے۔ لیکن عرب قائدین کے الفاظ تو عرصہ ہوا معنی اور مطلب سے عاری قرار پا کر اپنی عنت کھو چکے تھے۔ ایسی بھبکیاں تو ۱۹۶۷ء کی جنگ بندی کے بعد سے مسلسل سنائی دیتی آ رہی تھیں۔

— مصری فوجیں آتشیں طوفانوں کا سینہ چیرتی ہوئی سینائی کے ریگستانوں کو عبور کر کے اپنا کھویا ہوا وقار اور گیا ہوا علاقہ واپس لیں گی۔

— اسرائیل سے جنگ ناگزیر ہے ...... ہم قربانی کے لیے تیار ہیں ...... دشمن کو خبردار ہونا چاہیے۔

— بہادر جوانوں سے آئندہ ملاقات انشاءاللہ سینائی کے صحراؤں میں ہوگی۔

خون کو منجمد کرنے والے یہ فقرے دنیا نے بہت سنے لیکن مہینے برسوں میں بدلتے گئے اور مانی بھار یگستان ستم کش انتظار ہی رہا۔ اس لیے اپنے پرائے دونوں ہی نے ان بیانوں کو زیب سنتاں سے زیادہ وقعت دینا چھوڑ دیا۔

لیکن سادات کے یہ اعلان محض زیبِ داستاں کے لیے نہ تھے۔ وہ واقعی ایک جنگ کے لیے بھی بے تاب تھا اور مسلسل اسی تگ و دو میں لگا ہوا تھا۔ سب سے اہم مسئلہ اسلحہ کی فراہمی کا تھا۔ امریکہ اسرائیل کا پشت پناہ تھا۔ مغربی ممالک امریکی دباؤ میں تھے اور ان کی مجال نہ تھی کہ امریکہ کی مرضی کے خلاف مصر کو ہتھیار فراہم کرتے۔ لے دے کے بس روس اور مشرقی یورپ کے کمیونسٹ ملکوں کا سہارا تھا۔ روس نے ہتھیار دیئے ان کے استعمال کی تربیت بھی دی لیکن جو کچھ دیا ان سے بہ مشکل اپنی سرحدوں کا دفاع ہو سکتا تھا۔ حملہ کر کے کسی علاقے پر قبضہ کرنا ممکن نہ تھا۔ مثلاً توپیں تھیں تو ایک جگہ گڑی ہوئیں۔ میزائل تھے تو ایک جگہ نصب، ہوائی جہاز تھے تو وہ بھی لمبی اڑان کے قابل نہ تھے۔ ٹینکوں کی توپوں کا رینج اتنا کم تھا کہ اُن کا گولہ غنیم تک پہنچ نہ پاتا۔ جبکہ دشمن کا ٹینک اپنے لمبے رینج کی وجہ سے دور ہی سے انہیں ختم کر سکتا تھا۔ جب طاقت کے عدم توازن کا یہ حال ہو تو جنگ کیسے لڑی جا سکتی ہے۔ پھر بھی سادات نے کوشش جاری رکھی۔

۱۱ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو حصولِ اسلحہ کے لیے وہ ماسکو پہنچا۔ بہت خاطریں ہوئیں۔ بڑی مدارات ہوئی۔ بالشوی بیلے اور اتفاق اور ہم آہنگی کے ٹوسٹ۔ لیکن جہاں تک ہتھیاروں کا معاملہ تھا معاملہ صفر رہا۔ اور رہنا بھی تھا کیونکہ قریب ہی میں بازی گرِ عالم جناب ہنری کیسنجر سوویت قائدین کو ڈیٹانٹ کا سبز باغ دکھا کر تشریف لے گئے تھے اور اب روسی زعما پریذیڈنٹ نکسن کے انتظار میں دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ہوئے تھے۔ یوں سادات کا فیصلہ کن سال بغیر کسی فیصلہ کن اقدام کے بیت گیا۔

۲ فروری ۱۹۷۲ء کو دوبارہ وہ پھر ماسکو پہنچا۔ لیکن اس ملاقات کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ بریژنیف کو عربوں کی جنگی صلاحیت پر بالکل بھروسہ نہ تھا۔

"۱۹۶۷ء کی جنگ میں تمہارے پاس کس چیز کی کمی تھی؟" اس نے بڑے خشک انداز میں کہا۔ تمہارے پاس جتنے ٹینک تھے ان سے اگر تم کم از کم ایک ایک فائر ہی کر لیتے تو جنگ کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ لیکن تم نے اپنے ہتھیار جوں کے توں دشمن کے حوالے کر دیئے۔

سادات لاکھ غرض مند سہی لیکن اتنا بے غیرت بھی نہ تھا کہ اس شماتت بے جا کو یوں ہی پی جاتا۔ — مسٹر بریژنیف، اس نے سخت لہجے میں کہنا شروع کیا۔ آپ جان بوجھ کر حقائق کو مسخ کرتے ہیں حالانکہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہماری شکست ہماری فوجوں کی کم ہمتی اور بزدلی کا نتیجہ

سے تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم جنگ اس وجہ سے ہارے کہ ہماری فوجوں کو اچھی ٹریننگ میسر نہ تھی۔ ان میں وہ ڈسپلین نہ تھا جس کے بغیر موجودہ جنگ میں کسی بھی فوج کے لیے قدم جمائے رکھنا ممکن نہیں۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ گزشتہ پانچ برسوں سے آپ کے افسر اور آپ کے اپنے ماہرین یہاں اسی کام پر لگے ہوئے ہیں اور مسلسل ہماری فوجوں کی بہترین تربیت اور کارکردگی کی رپورٹیں دیتے چلے آرہے ہیں۔ پھر یہ گذشتہ کا طعنہ آئندہ کی راہ میں رکاوٹ کیسے ہے۔

ان تمام تلخ و تند باتوں کا کوئی نتیجہ برآمد ہونا ممکن تھا نہ ہوا۔ سوویت لیڈر نکسن کی آمد سے پہلے کوئی قدم اٹھانے کے لیے تیار نہ تھے۔ سادات کو ایک مرتبہ پھر صرف اس وعدے پر اکتفا کرنا پڑا کہ نکسن کے دورے کے بعد مصر کی درخواست پر غور کر لیا جائے گا۔

پریزیڈنٹ نکسن کے دورہ ماسکو سے واپسی کے بعد سادات نے پھر حصول اسلحہ کے لیے سلسلۂ جنبانی شروع کی تو اسے لیت و لعل کا وہی پرانا دستور جاری و ساری نظر آیا اور بریژنیف نے پھر اس سوال سے پہلوتہی کا راستہ اختیار کیا۔ روسی سفیر مصر وینوگرادوف نے اپنی حکومت کی جانب سے سادات سے کہا۔

میری حکومت کا خیال ہے کہ مڈل ایسٹ کے مسئلے کے حل کے لیے ضروری ہے کہ موجودہ فوجی تناؤ کو کم کرکے حالات کو پرسکون بنایا جائے۔'

اس بے محل گفتگو پر سادات بھنا گئے۔ مصر کو کمزور رکھ کر اپنے مقبوضات سے چپکے رہنے کی شہ دی جا رہی تھی اور اسے تناؤ کم کرنے کا نام دیا جا رہا تھا۔ واقعی درست ہو تو ایسا ہو۔

فوجی تناؤ کم کرنا ہے تو پھر یوں ہی سہی۔ اس نے گرج کر وینوگرادوف سے کہا۔ یہ تناؤ تمہارے جانے سے اور بھی کم ہو جائے گا۔ میں حکم دیتا ہوں کہ دس دن کے اندر اندر سارا روسی عملہ مصری حدود سے باہر نکل جائے۔

۱۷ جولائی ۱۹۷۲ء سے مکمل نظم و ضبط اور انتہائی خاموشی کے ساتھ روسی فوجیں مصر سے رخصت ہونے لگیں۔ یہی نہیں بلکہ سادات کی اپنی خواہش کے مطابق سارا سامان اور سارے تنصیبات باستثنیٰ مگ ۲۳ وہ مصر ہی میں چھوڑ گئیں۔

اسرائیل اور مغربی ممالک نے مصر اور روس کے اس تناؤ پر نہ صرف بے انگریزی بلکہ خوب خوب بغلیں بجائیں۔ سادات کی پھر جنگ ہنسائی ہونے لگی۔

رہتا ہے لیکن اول تو کوئی عملی قدم اٹھاتا نہیں اور اگر اٹھاتا ہے۔

امکان قریب تر آنے کے بجائے اور دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ کیا ایسا شخص جو لاتعنی جنگ چاہتا ہو کوئی ایسی حرکت کرے گا جس سے اس کا حصول اسلحہ کا واحد ذریعہ بھی بند ہو جائے۔ اور اس طرح آہستہ آہستہ دنیا نے سادات کی باتوں پر دھیان دینا ہی چھوڑ دیا۔

لیکن روسی افواج اور ماہرین کے تخلیے کا حکم کوئی ایسا غیر ذمہ دارانہ فعل نہ تھا جیسا کہ بادی النظر میں دکھائی دیتا تھا۔ سادات کے اس عمل کی کئی وجوہات تھیں۔

۔ روسی فوجوں کا یہ کثیر عملہ عرصہ دراز سے مصر میں مقیم تھا اور ان میں اور مصری افسروں میں ہمیشہ ہی سے ایک طرح کی پیشہ ورانہ چشمک اور رقابت چلی آ رہی تھی۔ اب انہیں روسیوں کی برتری کو برداشت کرنا بے حد گراں گزرنے لگا تھا۔ دوسری طرف یہ روسی استاد کبھی بھی اپنے مصری شاگردوں کی اہلیت اور استعداد کے قائل نہیں ہوئے اور ہمیشہ ہی انہیں سست، آرام طلب، نکمے اور نااہل ہونے کا طعنہ دیتے رہے نتیجہ یہ ہوا کہ مصری افسروں کا دباؤ سادات پر اور روسی افسروں کا دباؤ اپنے جنرل اسٹاف پر بڑھنے لگا کہ اس استادی اور شاگردی کے سلسلے کو اب جلدی ختم کریں۔

۔ اسی طرح سادات اور دیگر سیول اور ملٹری لیڈرز یہ بات شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ فوج پر روسی گرفت انھیں کوئی قدم آزادی سے اور محض اپنے ملک کے مفاد کا لحاظ کرتے ہوئے اٹھانے میں مانع ہے۔ اس لیے جب تک روسی گرفت سے چھٹکارہ حاصل نہیں کیا جاتا اسرائیل سے جنگ کا خواب پورا ہونا ممکن نہیں۔ فوجی نقل و حرکت کے لیے جس آزادی فکر و عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ روسی بالادستی اس راہ میں بری طرح حائل ہے۔

۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ روسی دوستی کی وجہ سے مصر مغربی دنیا سے بالکل کٹ کر رہ گیا تھا اور اسی وجہ سے یورپ اور امریکہ کا سارا جھکاؤ اسرائیل ہی کی طرف تھا۔ سادات نے اندازہ کر لیا تھا کہ مستقبل قریب میں عرب فوجوں کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ میدان جنگ میں اسرائیلی فوجوں کو شکست فاش دے کر ۵ رجون ۱۹۶۷ء کی سرحدوں تک پیچھے دھکیلا جا سکے۔ ایسی صورت میں اسرائیل سے اپنے علاقوں کی بازیابی اسی صورت میں ممکن تھی کہ روس کے ساتھ امریکہ بھی ان کا حامی اور مددگار بنتا۔

۔ ان سب پر مستزاد ہتھیاروں کا مسئلہ تھا جب کہ امریکہ نے اسرائیل کو ایسے ہتھیار

کر سکے تھے جن کی مدد سے وہ غنیم کے ملک کے اندر گھس کر کسی بھی شکست کو فتح میں بدل سکتا تھا روس نے کبھی ایسا کوئی ہتھیار مصر کو فراہم نہیں کیا۔

سادات کو امید تھی کہ روسیوں کے اخراج کا مغربی ممالک اور امریکہ پر اچھا اثر مترتب ہوگا اور امریکہ اسرائیل پر دباؤ ڈال کر اس مسئلے کے حل کی کوشش کرے گا۔ اس خیال کو تقویت اس بات سے بھی ملتی تھی کہ نکسن نے سکریٹری راجرس کے ذریعے اس مسئلے کے حل کی کوشش اس وقت کی تھی جبکہ روسی یہاں پوری طرح قدم جمائے ہوئے تھے اور اس قطعے کے تصفیے سے امریکہ کو کوئی خاص فائدہ ہونے والا نہ تھا۔ آج تو روس اس علاقے سے رخصت ہو چکا ہے اور امریکہ کو اپنا کھویا ہوا رسوخ حاصل کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی ہے۔ لیکن روس جانتا تھا کہ امریکہ قیامت تک اسرائیل کو اس کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کے لیے دباؤ ڈالنے والا نہیں۔ اور ہوا بھی ایسا ہی۔ چنانچہ مصر میں روس کی چھوڑی ہوئی گدی یوں ہی خالی رہی اور ۱۹۷۱ء کا سال بھی بغیر کسی فیصلہ کن اقدام کے ختم ہو گیا۔

۵۵

فانی بدایونی

چن لیا تیری محبت نے مجھے ۔۔ ساری دنیا ہاتھ مل کر رہ گئی

جل رہے ہیں اب تلک دل کے چراغ ۔۔ طور پر اک شمع جل کر رہ گئی

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا ۔۔ بات پہنچی تری جوانی تک

کوئی چشمک سی دل میں لیے جاتا ہے ۔۔ ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

یہ کس نے آخر شب داستانِ شوق دہرائی ۔۔ زمیں نے کروٹیں بدلیں، فلک نے لی ہے انگڑائی

ڈاکٹر ناصرہ

چھوٹی سی نیلی باسکٹ

رات بے حد گرم تھی، قیامت کا حبس تھا، پھر بھی تھی بڑی دلفریب، آسمان پر کھلی فضا میں ستارے کچھ زیادہ ہی تاب ناک نظر آ رہے تھے۔ فریگرینس سے خوشبوؤں کا مہکتا طوفان ابل رہا تھا۔ ٹیپ ریکارڈ پر تیاگ راجا کے کسی گیت کی دھیمی دھیمی دھن چیچ بابو کی دین آیا سے دعارم وینکٹ سوامی کے وائلن کے ریکارڈوں سے، مدھم مدھم سی لے بنی بہہ رہی تھی۔ دیوار پر کسی خلّاق مصوّر کی بنائی ہوئی دعارم وینکٹ سوامی کی تصویر تھی، رنگین تصویر، ایک گال میں گلوری دبا ہوا یہ احساس دلاتی ہوئی کہ دعارم جیسے ہمارے سامنے بیٹھے وائلن بجا رہے ہوں۔ انسان نے جس تمدّن کی تخلیق کی ہے وہ بھی خدا کی بنائی ہوئی حسن در حسن کائنات کے بالمقابل خوبی در خوبی ہی کی تفسیر لگ رہا تھا!

توقع کے مطابق میرا تبادلہ نہ ہو سکا تھا اور مجھے گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد دوبارہ مرتعلی نگر آنا تھا کیونکہ میرے تبادلے کے لیے کچھ اور مدّت درکار تھی اور اس حسین رات جب لکشمی اس پر مُصر ہوئیں کہ مادھوی کی رائے ان کے متعلق سچ سچ بتا دی جائے تو مجھے بے اختیار اقبال کا شعر یاد آ گیا کہ ؎

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

آسمانوں پر جگمگاتے دیپ تھے، زمین پر خوشبوئیں خیمہ زن تھیں، راگ تھے، نغمگی تھی، انسان کے دل میں، دماغ اور روح کی گہرائیوں میں اتھاہ اندھیرا تھا!

(۷)

مادھوی جب اپنی گیارہ سالہ لڑکی اور ۹ سالہ لڑکے کو "فریگرینس" میں چھوڑ کر جا رہی تھیں تو انھوں نے مکان کی ۱۳، ۱۴ سالہ ہمہ وقتی خادمہ 'وینکما' کو الگ لے جا کر دس روپئے دیتے ہوئے

تاکہ بچوں کا خاص خیال رکھے تو شاید ان کے حاشیہ خیال میں بھی یہ نہ تھا کہ آگے چل کر معمولی سی بات کتنے فتنوں کو جگائے گی۔

آندھرا کے طبقۂ امراء میں ہمہ وقتی خدمت گار مقامی باشندے نہیں ہوتے ؤں اور دیہاتوں میں کھیت مزدور یا روزانہ اجرت پر کام کرنے والے لوگ اپنے وں کو بہبودی کے خیال سے انہیں جان پہچان کے لوگوں کے ذریعہ شہر میں امیر گھروں یا ہمہ وقتی ملازمت کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ کسی زمانے میں لکھنؤ کے نواب زادے ادب ستگی اور تہذیب سیکھنے کے لیے طوائفوں کے کوٹھوں کی درس گاہ میں بھیجے جاتے تھے پھر آندھرا میں روزانہ اجرت پر کام کرنے والوں کی اولاد شرفا کی کوٹھیوں میں بھیجی جاتی تاکہ بچوں کے کھانے پینے اور کپڑوں کا خرچہ شرفاء کے ذمے ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ نہ تنخواہ کے طور پر جو رقم مقرر ہوتی ہے وہ والدین کو پہنچے یا خدمت گار یا خادمہ ہی کے نام بنک یا پوسٹ آفس میں جمع ہو جائے۔ ایسے ملازموں کو سال میں ایک آدھ بار مع کرایہ بھیجی جاتی ہے کہ اپنے گاؤں ہو آئیں۔ وینکم ما بھی لکشمی کے پاس مقیم ایسی ہی خادمہ تھی گھر کی ئی اور دیکھ بھال اس کے ذمہ تھی۔ چونکہ لکشمی کے یہاں کوئی اور نہیں تھا اس لیے لکشمی اس بے حد مانوس ہو چکی تھی۔ ان کا ارادہ تھا کہ کوئی اچھا رشتہ نظر آئے تو وینکم ما کی شادی ادیں اور فریگرینس کے آؤٹ ہاؤس میں ان کے زیر سایہ وینکم ما کا خاندان پھلے پھولے وہ فریگرینس کی تا حیات ہاؤس کیپر بنی رہے۔ لیکن مادھوی کے بچوں کے قیام کی وجہ سے سپنا ٹوٹ کر بکھر چکا تھا۔ دیوالی سے ایک رات قبل جب مادھوی کے بچے مرتضیٰ نگر سے تے دھوتے اپنی ماں کے پاس پہنچے تھے اسی رات وینکم ما کا باپ بھی مرتضیٰ نگر پہنچا تھا اور ما کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

پاپا اور جیجی یعنی مادھوی کی لڑکی اور لڑکے کو جب معلوم ہوا کہ انہیں مرتضیٰ نگر ہی شمی آنٹی کے پاس فریگرینس ہی میں رہنا تھا۔ ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ایسا یسی اچھی آنٹی۔ ماں کے ساتھ رہنے پر تو گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانا ضروری ہوتا لیکن یہاں ان کے لیے ملیالی باورچی [illegible] اوپر کا کام کرنے اور پھر ساتھ کھیلنے وینکم ما۔ ماں کی واپسی تک چند ہفتے تو یوں ہی گزر گئے جیسے سورگ میں ہوں۔ صبح نو بجے تک آنٹی کو کالج جانے اور ور جیجی اسکول جانے کے لیے گھر سے نکل جانا پڑتا تھا۔ لیکن ملیالی باورچی صبح سویرے آجاتا

ٹفن کے لیے ہر روز کوئی علیحدہ پکوان ہوتا کبھی اپوما، کبھی اڈلی، کبھی دوسے، کبھی اوتپم، کبھی پوری ترکاری تو کبھی کچھ اور کبھی کچھ۔ ساتھ ہی ساتھ تینوں کے لیے لنچ، ٹفن بکس میں تیار ہو جلدی جلدی فریگرینس کے سب کمروں، باورچی خانے اور فریج پر تالے ڈال دیئے جاتے صرف ڈرائنگ روم میں ہی دنیکم ما کا راج رہ سکتا تھا۔ باورچی کچھ دیر کے لیے باغیچے میں مالی کے طور پہ بھی کام کرتا تھا۔ دنیکم ما کے پاس سرف اور میلے کپڑے دیئے جاتے دھوبن گھر پہ آجاتی۔ سہ پہر تک دنیکم ما اپنے وقت کی مالک ہوتی۔ پھر آنٹی کالج سے اور پاپا و چٹی اسکول سے لوٹ آتے۔ صبح میں باورچی کو سودے سلف کے پیسے دیدیئے جاتے۔ آنٹی کی واپسی تک وہ بھی شام کے پکوان کے لیے واپس آجاتا۔ سہ پہر کے لیے بھی کافی کے ساتھ کوئی نہ کوئی نمکین میٹھی تیار ہو جاتی۔ بند کمرے کھل جاتے دنیکم ما ان سب کی صفائی کرتی۔ شام میں باغیچے میں پانی ڈالتی۔ رات کے کھانے سے قبل آنٹی پاپا اور چٹی کے ہوم ورک میں مدد دیتیں اور رات کے کھانے کے بعد چٹی کہانی سننے کے لیے ضد کرتا۔ کیونکہ اسے کہانی سنے بغیر نیند ہی نہیں آتی۔ آنٹی کیسی اچھی اچھی کہانیاں کہتیں، تلگو سے زیادہ انہیں شیکسپیر کی کہانیوں کا تلگو ترجمہ سنانا اچھا لگتا تھا۔ شیکسپیر کے تقریباً سارے مشہور ڈراموں کے کرداروں سے پاپا اور چٹی متعارف ہو چکے تھے۔

لیکن آہستہ آہستہ سورگ، نرک میں تبدیل ہونے لگا۔ اور یہ آگ کچن ہی سے بھڑکی۔ لکشمی نے پاپا اور چٹی کو باورچی کی چوری چکاری پر سی آئی ڈی مقرر کر دیا۔ جس سے باورچی کو دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے احتجاجاً تنخواہ میں اضافہ کا مطالبہ کیا۔ عذر یہ تھا کہ کام بڑھ چکا ہے۔

پاپا اور چٹی جب سے آئے تھے باغیچہ کا کام وہ دوڑ دوڑ کر کرنے لگے تھے۔ اپنے میں بھی وہ کیاریوں میں پھول اور ترکاری اگانے کے عادی تھے۔ لیکن یہاں تو اتنا بڑا باغ تھا، پھلواری بھی، پھلوں کے درخت بھی اور کچن گارڈن بھی۔ سویرے سویرے اٹھ کر لکشمی آنٹی کی ایما پر پھول توڑنا، کیاریوں سے ترکاریاں توڑنا، باغ کے پودوں اور درختوں کو پانی ڈالنا شروع کیا۔ اسکول سے واپسی کے بعد بھی بہت سا وقت وہ دونوں باغ میں کام کرکے گزارتے۔ اس لیے میڈم نے باورچی سے کہا کہ باغیچہ کا سارا کام تو اب کم ہو چکا ہے، اب تنخواہ بڑھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

نتیجتاً باورچی نے ناغہ کرنا شروع کر دیئے۔

ڈنیکم ما کے علاوہ ایسی حالت میں پاپا اور چھٹی کو بھی کچن میں آنٹی کی مدد کرنی پڑتی جس کی وجہ سے اسکول کی پڑھائی پہ اثر پڑنے لگا۔

ڈنیکم ما بچوں کے آنے سے قبل باورچی کے حرکات و سکنات پر بطور سی آئی ڈی تعینات تھی تو باورچی کو بھی تاکید تھی کہ ڈنیکم ما کے عادات و اطوار کی رپورٹ رکھے۔ لیکن دونوں کا مفاد ایک ہونے کی وجہ میڈم کو محسوس ہوتا تھا کہ وہ دونوں ایک پارٹی کے ہیں۔ پاپا اور چھٹی کو باورچی کے علاوہ ڈنیکم ما پر بھی متعین کیا گیا تھا۔ لیکن ڈنیکم ما کو مادھوی نے بطور خاص رقم دی تھی کہ بچوں کی تھوڑی بہت خدمت کرے۔ پھر پاپا اور ڈنیکم ما میں رفاقت کا ایک ایسا لاشعوری سمجھوتہ طے پا گیا جس کی بنیاد ہم سنی پر ہوتی ہے اور بہت کم سنی کی رفاقت رازداری کے پیمان کو بڑی وفاداری سے نباہتی ہے۔ اس طرح ڈنیکم ما کی کمزوریوں کی بچوں نے پردہ پوشی کی لیکن ڈنیکم ما کے دل میں بچوں کے لیے جا پیدا ہونا لازمی تھا۔ سب سے پہلے تو میڈم کے التفات کے پاپا اور چھٹی نہ صرف حصہ دار بن گئے، بلکہ ہم چشمی کے ناطے ان کا مان زیادہ ہی تھا اور پھر کام بھی بڑھنے لگا، اور جب باورچی غیر حاضر رہتا تو کام کا زیادہ بار ڈنیکم ما پر ہی پڑتا اور وہ جان بوجھ کر بچوں سے بے اتفاقی برتتی یا ان کے خلاف آنٹی کے کان بھر لگتی۔ جس دن ایسا ہوتا بچوں کے دل بجھ جاتے اور انتقاماً وہ بھی ڈنیکم ما کے خلاف آنٹی کے سامنے زہر اگلنے لگتے۔ اس طرح تناؤ بڑھتا گیا۔

باورچی کی غیر حاضری سے نہ صرف کام کی زیادتی ہوتی بلکہ کھانے پینے کی بھی تنگی ہو جاتی۔ پہلے تو ریفریجریٹر میں ذخیرہ کی ہوئی چیزیں استعمال ہوتیں پھر اور بھی طویل غیر حاضری ہوتی تو کچن گارڈن کی ترکاریاں استعمال ہوتیں۔ ایسے زمانے میں تو اس میں صرف توٹہ کو ما (ساگ بھاجی) ہی وافر تھا۔ صبح رواروی میں جو کچھ تیار [illegible] کھایا جاتا وہ تو اسکول پہنچتے پہنچتے ہی ہضم ہو جاتا۔ شام میں بھوکے اور پیاسے لوٹتے تو مامی کی ساگ تھوڑی پڑتی اور رات کو مختصر کھانے سے ان کا پیٹ نہ بھرتا۔ پڑھائی بھی باقاعدہ نہ ہو سکتی۔ آنٹی تھکی ہوئی ہونے کی وجہ سے چڑچڑی سی ہو جاتیں۔ بس پھر سب کے موڈ بگڑ جاتے۔ ایسے موڈ کو لے کر جو سوتے تو صبح خاک تازہ دم ہو کر اٹھے۔ جی چاہتا کہ پیسے لے کر کوئی چیز (تنڈی چیز) ہی خرید کر کھائیں۔ صبح میں اسکول جاتے سمے پیسے مانگتے تو آنٹی خفا ہو جاتیں کہ اب کالج جانے دیر ہو رہی ہے۔ پیسے شام میں لے لینا۔ شام میں مانگتے تو چڑ چڑا کر کہتیں صبح لے لینا۔ اب وہ گئے

تو کہیں کھو جاتے تھے۔ یہاں تک کہ اسی وجہ کبھی کتابیں بھی، نوٹ بک بھی خریدتے ہی کھو جاتی ہوتی اور اسکول میں بازپرس سے الگ سابقہ پڑتا۔

اسی طرح بغیر علم و اطلاع ہی کے بھس میں چنگاریاں پڑتی رہتیں ان میں سب سے زیادہ بھڑک اٹھنے والی چنگاریاں، ونیکم ما، ہی کی تھیں۔ ایک طرف تو بچوں کے دل میں یہ احساس پیدا کرتی کہ آنٹی ممی کی طرح نہیں ہو سکتیں تو دوسری طرف ان کے خلاف آنٹی سے لگائی بجھائی کرتی کہ آنٹی کے خلاف چغلیاں کھا رہے ہیں۔ ایک دن پاپا کا پیر باتھ روم میں پھسل گیا چوٹ تو کچھ نہیں لگی، باورچی غیر حاضر تھا۔ آنٹی باورچی خانے کی مصروفیتوں میں الجھی اس بات پر زیادہ دھیان نہ کر سکیں۔ ونیکم ما نے آہستہ سے پاپا سے کہا کہ تمہاری ممی ہوتیں ہوتیں تو کیا ایسا ہی انجان ہو جاتیں۔

بغیر گھی کے چنٹو کے حلق سے کھانا اترتا ہی نہیں تھا ممی نے دالیں اور چاول اور املی اور پیاز بھجوائی تھی لیکن گھی بھجوانے بھول گئیں۔ حالانکہ گاؤں سے خالص گھی بھی لا کر رکھی تھیں آنٹی بھی دودھ سے بالائی اتار کر خاص طور پر خالص گھی تیار کرتیں اور وہ اتنا مختصر ہوتا کہ انہیں پسند نہیں آتا کہ کوئی اور اسے چکھے۔ ایک رات جب کھانے پر صرف ماٹ کی ساگ اور ساتھ ہی تھا تو چنٹو نے آنٹی سے کہا۔ کھانے میں تھوڑا سا گھی ڈال دیں۔ آنٹی نے گھی کے چھوٹے سے چمچے سے گھی ڈالا۔ چنٹو کا جی چاہا کہ کچھ اور ملے۔ چھوٹی سی کٹوری کے چھوٹے سے چمچے سے صرف ایک ہی بار خشکہ پر گھی ڈال سکا تھا کہ آنٹی نے گھی کی کٹوری ہٹا کر ونیکم ما سے کہا کہ باورچی خانے میں رکھ دے۔ چنٹو کے چہرے پر مایوسی نے آنٹی کو اور چڑچڑا بنا دیا۔ اور جھلاہٹ سے کہا جانتے ہو یہ کیا ہے۔ خالص گھی ہے۔ خالص۔ پاپا نے کسی قدر رعونت سے کہا جانتے کیوں نہیں خالص گھی ہے۔ ہم بھی کھایا کرتے ہیں۔ ونیکم [illegible] باورچی خانے سے ہانک لگائی اپنی ممی کو لکھنا اب کے آئیں تو گاؤں سے گھی بھی لائیں۔

ایک دن چنٹو کے اسکول کو جلد چھٹی ہو گئی۔ اس کے پیٹ میں بھی درد تھا۔ رفع حاجت کی ضرورت پیش آئی۔ وہ جس کمرے میں رہا کرتا تھا اس میں بھی اٹیچڈ باتھ روم تھا۔ لیکن دوسرے تمام کمروں کی طرح یہ کمرہ بھی مقفل تھا اور آنٹی کی واپسی کے بعد ہی کھل سکتا تھا۔ اتفاقاً آنٹی کا باتھ روم ہی کھلا رہ گیا تھا۔ چنٹو نے ان کا کموڈ استعمال کیا لیکن اس کو فلش آؤٹ کرنا نہ آتا تھا جب آنٹی واپس آئیں تو بو سے جو لگی تو تالو میں بجھی۔ پاپا اور چنٹو نے بھی خوب دلائل پیش کیے لیکن

... ہیں ... سے اسے استعمال ... لیا۔
...اسے شہر میں آتے ہیں۔ کیا جنگلوں کے درختوں میں فارغ ہونا بھول گئے۔ یہاں بھی تو
...جھنکاڑ ہیں۔

ایسے ہی متعدد واقعات بچوں کے لیے گلانباری کا سبب بنتے گئے۔ یہاں تک کہ
...ما کا کہنا دل میں بیٹھ گیا کہ آنٹی نے باورچی کو رخصت کر دیا اسی طرح مجھے بھی چلا دیں گی۔
...ے پاپا اور چھی ہی کو سب کام کرنے پڑیں گے۔

پاپا اور چھی بے صبری سے ستمبر کا انتظار کرنے لگے۔ آنٹی نے ممی کو آنے کی دعوت
...۔ ویسے ممی نے بھی ان سے وعدہ کیا تھا کہ اس تہوار پہ فریگر ہینس میں ایک دن قیام
...ند چند دن کے لیے وہ انہیں ڈیڈی کے پاس لے جائیں گی۔ اس کے علاوہ بچوں نے مصمم
...کر لیا کہ ستمبر میں ممی کے ساتھ جانے کا موقع مل جائے تو پھر فریگر ہینس کی طرف پلٹ کر
...ہیں دیکھیں گے۔

آنٹی روزانہ کالج جانے سے قبل پوجا کے کمرے میں خاص اہتمام سے پوجا کر کے
کھانا کھایا کرتی تھیں۔ تہواروں پر بھی وہ جس دیوی یا دیوتا کا تہوار ہوتا ان کی پوجا
...خاص خیال رکھا کرتیں۔

انسانی دھڑ پر ہاتھی کے سر والے دیوتا، جن کی سواری چوہا ہے، گنیش جی لارڈ
...کے اور پاروتی دیوی کے سپتر ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان کا سر بچپن میں بالکل نارمل تھا۔
...ن جب پاروتی دیوی اشنان کرنے جا رہی تھیں تو انہیں نگرانی کے لیے بٹھا دیا۔ جب
...نے لارڈ شیوا کو روکنا چاہا تو غصے میں لارڈ شیوا نے ان کا سر تن سے جدا کر دیا۔ جب
...دیوی نہا دھو کر آئیں اور بچے کا سر کٹا ہوا دیکھا تو دکھی ہو گئیں۔ تب لارڈ شیوا نے ان کو
...لے کے لیے پاس سے گزرتے ہوئے ایک ہاتھی کے بچے کا سر کاٹ کر اپنے بیٹے کے دھڑ
...ا۔ اور یہی گنیش جی بن گئے۔ جنگلوں میں قیام کرنا پھل پھلاری کھانا اور جنگل میں
...گھوما ان کے مشغلے ہیں۔ لیکن ان کا مرتبہ بھی بڑا ہے یعنی مشکلات کو دور کرنے میں
...ہوتے ہیں۔ اسی لیے انہیں وِنکٹیشور بھی کہا جاتا۔ تہوار سے قبل ان کی مورتی
...آسن سجایا جاتا ہے۔ پھل پھلاری جو گنیش جی کے پسندیدہ جیسے جام، بیر، گنا
...جا میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ جب بازار میں گنیش جی کی مورتیاں فروخت ہونے

ھیں تو انٹی بھی ایک مورتی لے آئیں۔ سب نے مل کر مل جانے دیر ین ہی اس نے سجاوٹ یا صرف کیے۔ باغیچے سے گھاس پات، خودرو پھول حتیٰ کہ پتے، آم کے پتے اور کیلے کے ایک پیڑ کو اکھاڑ کر پوجا کے کمرے میں بڑا خوب صورت آسن بنایا گیا۔ ایسا منظر تیار کیا گیا جیسے گنیش جی اُدھم مچاتے پھر رہے ہیں۔ کبھی کسی درخت کو ہلا کر بیروں کا بچھونا کر رہے ہیں تو کہیں پیڑوں سے کویٹ گرا رہے ہیں تو کہیں امرود توڑ توڑ کر پھینک رہے ہیں اور کہیں ایکھ کو جڑوں سے اکھاڑ کر گنوں کے ڈھیر لگا کر کیلے کی پھنی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ گھاس پھوس کے درمیان پلاسٹک کے چھوٹے چھوٹے جانوروں کو سجانے سے جنگل کا منظر حقیقی سا نظر آ رہا تھا۔ ان سب دلچسپیوں کے باوجود چنی اور پاپا کو ممی کا انتظار تکلیف دہ معلوم ہو رہا تھا۔ تہوار میں صرف ایک دن باقی رہ گیا۔ نہ تو ممی آئیں اور نہ ہی ممی کا کوئی خط آیا۔ تہوار کے عین سامنے باورچی نے بھی آنا بند کر دیا تھا۔ تہوار کے لیے آنٹی نے نئی چیزوں کے پکانے کا وعدہ کیا تھا لیکن بہت سی چیزیں باورچی کی آمد فردا پر ٹلتی رہیں۔ جب تہوار میں ایک دن باقی رہا تو آنٹی نے کہا کہ ممی آجائیں گی تو تازہ ترکاریاں، پھل وغیرہ خرید لائیں گے۔ رات دیر گئے تک بس سے ممی کی آمد کا انتظار ناامیدی میں بدلنے لگا۔ آنٹی نے دلاسا دیا کہ شاید سویرے والی بس سے پہنچیں گی تب ہی جا کر سب سامان لے آئیں گے۔

دنیکم ما نے رینٹھے کا کف نہانے کے لیے تیار کر دیا۔ سب نہا دھو کر تیار ہو گئے۔ لیکن لیکن ممی اس وقت بھی نہیں آئیں۔ گنیش کے تہوار پر پوجا پاٹ ہوتا ہے۔ اچھے اچھے پکوان بھی تیار ہوتے ہیں۔ لیکن اس تہوار پر نئے کپڑے بنانے کا رواج نہیں ہوتا۔ دیر تک پوجا پاٹھ کرنا ہوتا ہے۔ آنٹی تو بغیر کچھ کھائے پیے پاٹھ کریں گی۔ لیکن چنی اور پاپا کے لیے جلدی انھوں نے ایک ایک دوسہ تیار کر دیا۔ جب بچوں نے دریافت کیا لنچ پر کیا کھائیں گے تو آنٹی نے کہا شاید تب تک ممی آجائیں گی وہ نیکم ما کی مدد سے سب کچھ تیار کر لیں گی۔

دن تو تہوار کا تھا لیکن میز پر گارے تھے نہ بورے، ترکاری کی بریانی بھی تھی نہ پُلی ہانہ اپیال تھے نہ وڑیاں۔ اگر تھا نہ پسیرا تو۔ گرم گرم خشکہ کے ساتھ رات کا پکا کر فرج میں رکھا ہوا سانبھر تھا اور تو اور پایسم (کھیر) بھی صرف ایک چھوٹی سی کٹوری بھر ملی۔

جب پوجا ختم ہو کر پوجا کے کمرے سے باہر نکلے تو ممی کا خط ملا کہ وہ نہیں آ رہی ہیں۔ اس وقت تو سب کو بھوک لگ رہی تھی۔ سانبھر تو تیار ہی تھا چاول تب کا تب پکانے کے سو ککر چڑھا

[illegible] بھی تقاریب پہ کھانے کے ساتھ ملاؤں میں پائیسم کا ہونا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ آنٹی کئی دن سے ایک نئی ترکیب کی پائیسم بنانے کا پلان بنا کر رکھی تھیں۔ جس میں مکئی کے دانے تھے ساگودانہ چاول اور کدوکش کیا ہوا کدو، جس میں گاجر اور کشمش بھی تھی۔ آنٹی نے کھیر بنائی تو زیادہ ہی تھی لیکن یہ کہہ کر فریج میں رکھ دی کہ آج مہمان آئیں تو ان کی تواضع کے لیے بھی کوئی چیز ہونی چاہیے۔

چار بجے آنٹی کسی سے ملنے کے لیے چلی گئیں پاپا، چچی اور نیلم ملنے پلان بنایا کہ ایک ایک گلاس پائیسم کیوں نہ پی لی جائے۔

آنٹی کی واپسی کے مہمان کے پاس مہمان آئے تو نئی قسم کی بنی ہوئی پائیسم دینے آنٹی نے ریفریجریٹر کھولا تو پریشان ہوگئیں۔ پاپا، چچی اور نیلم کا قصور ایک دوسرے پر ڈالنے لگے اور پھر آنٹی روزانہ اٹھتے بیٹھتے اس قصے کے سلسلے میں خوب چوکے لگاتیں۔ تینوں بچے ایک پارٹی بن گئے پاپانے نیلم ملکے کہنے پر اس کے باپ کے نام خط لکھ ڈالا کہ یہاں سے اسے لے جائیے۔ اور وہ وہ خود بھی نومبر کا انتظار کر رہے تھے۔ ممی تو دیپاولی میں آنے والی تھیں۔

لیکن اکتوبر میں دسہرہ کی چھٹیاں تھیں ممی ایک دو دن کے لیے آئیں۔ لیکن بچے آنٹی کے سامنے آنٹی کے خلاف کیسے کہہ سکتے تھے۔ البتہ اخراجات کے سلسلے میں ممی اور آنٹی میں کچھ تلخی پیدا ہوگئی۔ پھر بھی بچوں کو مرتضیٰ نگر سے ساتھ لے جانا ممکن نہ تھا۔ اسکولوں میں داخلہ کا مسئلہ درد سر بن جاتا۔ ہاں کچھ دن کے لیے بچوں کو ساتھ لے کر اپنی بہن کے گاؤں چلی گئیں۔ اور واپس جانے سے قبل بچوں کو کچھ رقم اخراجات کے لیے بھی آنٹی سے تذکرہ کیے بغیر دیتی گئیں۔ بچوں نے اس رقم سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا۔ مرتضیٰ نگر سے ماں کے پاس جانے کے لیے کچھ رقم کم پڑتی تھی۔ دیوالی سے کچھ دن قبل ممی کے واقف کار لوگوں سے مانگ لی اور یہ کسی سے بھی نہ بتایا کہ اب وہ مرتضیٰ نگر کو خیرباد کہہ رہے ہیں۔

(۸)

"مرتضیٰ نگر دوبارہ آنے سے قبل تم نے اور مادھوی نے ایک ہی جگہ کام کیا تھا۔ مادھوی۔ مادھوی کے بچے مرتضیٰ نگر چھوڑ کر ماں کے پاس پہنچے تو تم بھی وہاں ہی تھیں۔ سچ سچ [illegible] میرے متعلق مادھوی کی کیا رائے ہے؟"

[illegible] نے دوبارہ سوال کیا۔

[illegible] نے پھر بھی خاموشی کو توڑنا پسند نہیں کیا۔

(باقی آئندہ)

(تبصرہ کے لیے کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

تبصرہ

نام کتاب: طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ
مصنف: خواجہ عبدالغفور، آئی اے ایس
ناشر: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ گولا مارکٹ، دریا گنج نئی دہلی ۲
قیمت: پچاس روپے

خواجہ عبدالغفور اپنی کتاب "طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ" میں لکھتے ہیں:

"کچھ دیر کی ہنسی نہ صرف غم و اندوہ کو بھلا دیتی ہے بلکہ اس سے ایسی تازگی اور فرحت پیدا ہو جاتی ہے کہ غم ہائے دنیا برداشت کرنے کی از سر نو طاقت آ جاتی ہے۔

ہر مصیبت کا دیا ایک تبسم سے جواب
اس طرح گردشِ دوراں کو رلایا ہم نے"

آج کی روتی چیختی چلاتی، بے چین، بے تاب دنیا خاص کر ہندوستان کے لیے خواجہ صاحب کی مساعی کا کرشن چندر نے اس طرح ذکر کیا ہے۔

"کئی سو سال سے ہندوستان نے ہنسنا چھوڑ رکھا تھا، آج بھی ہماری مہذب مہذب سوسائٹی میں کھل کر ہنسنا ایک فعل قبیح مانا جاتا ہے۔ مگر اب برف پگھل رہی ہے۔ دھیرے دھیرے لوگ ہنسنے کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔ "قہقہہ زار" لطیفہ گوئی کے فن پر ایک کامیاب کاوش کا درجہ رکھتی ہے جسے عبدالغفور صاحب کی جدت طرازی نے اپنے فکر و فن کی معنی آفرینی، اسلوب کی رنگینی اور موضوع کی بوقلمونی سے سبدِ گل کی صورت عطا کی ہے۔ خواجہ عبدالغفور نے قہقہہ زار میں سینکڑوں بہتر سے بہتر اور نادر سے نادر ترین لطیفے جمع کرنے کے علاوہ اس مشکل ترین فن کا علمی اور نفسیاتی جائزہ بھی لیا ہے۔ اردو میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے۔"

اب خواجہ صاحب کی ایک اور اہم کتاب طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ ہمارے سامنے

بیلیج کر بعض چند گذشتہ رہتے اسے نقش ثانی قرار دیتے۔

ڈاکٹر قریشی لکھتے ہیں کہ

"خواجہ عبدالغفور کا یہ کارنامہ بھی یاد رہے گا کہ انھوں نے لطیفہ گوئی
کو فن کا درجہ دے دیا۔"

پریم گوپال متل جن کے زیر اہتمام یہ کتاب چھپی ہے اس کتاب کو طنز و مزاح
ا کے تحقیقی سفر میں ایک اہم سنگ میل اور اردو کے ذخیرہ میں ایک قابل قدر اضافہ
یتے ہوئے ایک دل لگتی بات بھی کہہ دیتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے لطیفے ان کی
ں کی اشاعت کے وقت بڑی حد تک اچھوتے اور نئے تھے لیکن ان کی اشاعت کے
اتنے مقبول اور معروف ہوئے کہ ہزاروں بار دوسروں کی تخلیقات میں شامل ہو گئے۔
رح موسیقی میں سرگم تال، سُر، لَے کے ساتھ ٹھمری خیال صدیوں سے گائے جاتے ہیں
سیقار ان ہی حدود سے بندھا ہوتا ہے۔ لطیفوں کی نوعیت بھی یہی ہے۔ اور ان
پرانا یا پرانا نہیں کہا جا سکتا۔

"خواجہ صاحب کی شخصیت میں مزاح کی چنگاری بدرجہ اتم موجود ہے۔ حالانکہ ان کے
ت ہر وقت نئے نہیں لیکن انداز بیان بالکل نیا ہے۔ مزاح کے پردے میں ان کے
یں کہیں ناصحانہ انداز بھی آ جاتا ہے لیکن اس کے باوجود شگفتگی اور لطیف مزاح
زیریں لہر ان کی تحریروں میں جاری رہتی ہے۔

متل یہ بھی کہتے ہیں:

"یہ مصنف کی عرق ریزی، سنجیدہ کاوش اور موضوع سے تخلیقی دلچسپی
کا بین ثبوت ہے۔ کتاب کا ایک بڑا حصہ ریسرچ اسکالرز کے لیے گائیڈ
کی حیثیت رکھتا ہے اور اردو ادب میں بالکل نئی چیز ہے اور بالکل نئے
انداز سے پیش کی گئی ہے۔ کتاب میں نہ صرف اردو ادب میں طنز و مزاح
بلکہ یورپ و امریکہ کی تہذیبی و ثقافتی مزاح اور ظرافت کا جائزہ بھی لیا گیا"
اس کے علاوہ اور بھی مشاہیر کی رائیں اس سیریز میں سجائی گئی ہیں اور یہ
لکھنے والے ایسے حضرات ہیں جو بقول غالب کہتے ہیں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں
تبصروں کے بعد اس کتاب کے لیے کسی اور تبصرہ و تنقید کی ضرورت باقی نہیں

رہتا۔ پھر بھی بازار مصر میں سوت کی، دو انٹیاں لے کر آنے والی بڑھیا یوسف کے خریداروں کے جگمگٹ میں صرف شرکت کی آرزو مند تھی۔ اور قریب شہر سخنہاے گفتنی دارد کے مصداق یہ تبصرہ نگار کے پاس جو اس بساط میں نووارد ہے۔ کچھ کہنے کے لیے ہے جو کہنا یہ ہے کہ :-

کتاب کے لکھنے والے خواجہ عبد الغفور حیدر آبادی ثم بمبائیٹ اس دکھی دنیا کی ان چند نادر ہستیوں میں سے ہیں جنہیں اللہ میاں سے کوئی گلہ نہیں ہے کیونکہ "مجھے زندگی میں وہ سب ملا جس کی میں تمنا کر سکتا تھا اور ایسی کوئی حسرت نہیں ہے جس کے لیے اللہ تعالی سے گلہ کر سکوں"

(حوالے کے لیے دیکھو 'شاداب' بابتہ فروری ۱۹۸۴ء ڈاکٹر خواجہ عبد الغفور سے ایک ...) اور جنہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو میڈیم کے ساتھ بی ایس سی آنرز کیا۔ پھر جب سیول سروس کی کلاس سے ہوتے ہوئے اور درمیان میں کئی قسم کی تربیتیں حاصل ہوئے بالآخر یو۔این۔ او کی فیلوشپ پر ان کا علم منتہا ہوا اور پھر بھی وہ اپنے آپ کے حدود میں رکھتے ہیں۔ اس طرح صاحب موصوف آج کے وہ طالب علم اسکالر نہیں ہیں جو ... مباش کچھ کیا کر کے مصداق یکے بعد دیگرے کئی مقالے تحریر کر دیتے ہیں اور کسی نہ کسی ... انہیں شائع بھی کروا لیتے ہیں۔ وہ اڈمنسٹریٹر ہوتے ہوئے بھی لطافت سے کہتے ہیں اپنے آپ کو سیول سرونٹ سمجھتا ہوں (ایضاً) جبکہ اب بھی آپ ایک نمونہ کی ... سربراہ ہیں۔ اور سنجیدگی اور پختگی کے شعور کے ساتھ انھوں نے اپنے مقالہ ... کا تنقیدی جائزہ پیش کر کے بمبئی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی او... اب ...ata Federation of Unesco Association

Bombay کی نگرانی میں ماڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولہ مارکٹ دریا گنج نئی د... سے شائع ہوا ہے۔ ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ سنہ اشاعت جون ۱۹۸۳ء اور قیمت ... روپے ہے۔ کتابت، طباعت، کاغذ سب کسی بھی اردو کتاب کے لیے باعث ر... کتاب پر کہیں بھی اس کا اندراج نہیں ہے کہ یہ پی ایچ ڈی کے لیے پیش کیا ہوا م... اگر ایسا ہوتا تو مقالہ کے لیے معیاری مطالبات کی تکمیل ضروری ہوتی جیسے کتابیات فٹ نوٹ اور حوالے، تاریخیں اور ماخذوں کے ساتھ۔ وغیرہ وغیرہ تاہم کسی بھ...

میں ایک تحقیقی جائزے میں جو بحل پیشہ کے ٹائیڈیک کے زمرے میں شامل ہو سکتی ہے۔ ان سب اجزا کی غیر موجودگی ایک طالب علم قاری کو ضرور محسوس ہوگی

صاحب کتاب ایک سائنٹسٹ اور ڈمنسٹریٹر ہونے کے ناطے درجہ بندی اور ترتیب کے قائل ہیں۔ انہوں نے اس بات کا بغور مطالعہ کیا کہ سب ہی دانش ور، ادیب اور اہل قلم اپنے پسند کے فنکار کو مزاح کے مختلف روپ میں پیش کرتے ہوئے آئے ہیں۔ اور اس کو مزاح نگار کا جائز مقام اور مرتبہ دینے کے لیے ان کی خوبیاں گن گن کر قلمبند کی جاتی رہی ہیں ـــــ لیکن یہ تشنگی ہمیشہ محسوس ہوتی رہی کہ ادیبوں کو ان کے علیحدہ علیحدہ فن کے زمروں میں کس طرح چھانٹا جائے کہ وہ اپنی جگہ زیادہ ہی ممیز و منفرد ہوں۔ چونکہ اردو کے مزاحیہ اور ظریفانہ ادب میں اس طرح کی تفریق و تقسیم اور حد بندی کبھی کی بھی نہیں ہوئی۔ مصنف نے اس خلا کو پر کرنے کے لیے پرانے کلاسیکی ادب سے لے کر حالیہ دور تک ہر قسم کی تحریر اور اسلوب نگاری کا بغائر مطالعہ کر کے انگریزی ادب سے وہ تمام باتیں جو ہمارے ادب میں سما سکتی ہیں یکجا کر کے منظم اور باقاعدہ ترتیب و تدوین کی ہے جو نہ صرف طالب علم بلکہ نقاد اور اسکالر کے بھی کام آئے گی اور اس ریسرچ کو لسانیات میں ایک خاص مقام اور درجہ ملے گا۔ اس لیے بھی اس پُر مزاح کتاب میں مزاحیہ نمونوں سے اخذ کرتے ہوئے مصنف نے اردو کی جنم بھومی کے بارے میں بھی سنجیدگی سے غور کیا ہے اور اپنی رائے دی ہے۔

مصنف مزاح کو آٹھ بنیادی اصناف میں تقسیم کرتے ہیں :۔

(۱) انشائے لطیف (۲) بذلہ سنجی (۳) طنز (۴) اردو کی منظوم خصوصی اصناف۔
(۵) تضحیک و تعریض (۶) انداز بیان اور دوسری زبانوں سے مزاح (۷) متفرقات
(۸) مزاحیہ شاعر، مزاحیہ نثر نگار

ابتدا میں متن کے "حرفے چند" اور مصنف کا "پیش لفظ" اور آخر میں مصنف کا "حرف آخر" شامل ہیں۔

ان آٹھ اصناف کی تقسیم در تقسیم کرتے جملہ ۱۳۹ اصناف پیش کی گئی ہیں۔

اگر یہ ایک روایتی مقالہ یا عام کتاب ہوتی تو مزاح اور صنف مزاح کی وجہ تسمیہ مختصر تاریخ اور تحلیل خشک الفاظ میں بیان کر دی جاتی۔ اور حوالوں سے بوجھل ہو جاتی

[illegible] کے صنف مزاح میں بھی شعر [illegible]

کہ جہاں پہنچ کر "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" کی مد شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اسی طرح سید ضمیر سادہ مگر معیاری زبان جانے پہچانے الفاظ اور رواں تحریر میں اس صنف کی تشریح کرتے ہیں۔ خوب صورت اشعار سے اپنے بیان کی سجاوٹ کرتے ہیں یا دعویٰ پیش کرتے ہیں۔ پھر نئے پرانے جانے ، ان جانے دل چسپ شگوفوں سے اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ قاری اس صنف مزاح کا مطلب سمجھ کر ہنستا ، شرمندہ ہوتا ، قہقہہ لگاتا یا صرف درد کی چوٹ محسوس کر کے رہ جاتا ہے اور یہی مصنف کا مدعا بھی ہے۔

اس طرح مصنف جو زندگی سے پوری طرح مطمئن ہیں مزاح نگار بن کر لوگوں کو زندگی سے پیار کرنا سکھاتے ہیں۔

مزاح کی اصناف اور انواع میں جو پیش کیے گئے ہیں خصوصی اہمیت بیگماتی خاکہ نگاری ، اردو کی منظوم خصوصی اصناف ، مکاتیب ، دکنی اردو ، صحافت میں طنز و مزاح ، مزاحیہ شاعر اور مزاحیہ نثر نگار ہیں۔

ان کی مثالیں زندہ ادب سے جمع کرنے میں مصنف نے بڑی محنت کی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے نادر لطیفے خاصے کی چیز ہیں دوسری مثالوں میں اردو ادب اور ادب اور دکن کا خاص حصہ ہے۔ کتاب کا آخری باب خاص کر بل عطش کی صدا بلند کرتا ہے۔ مزاحیہ شاعر اور نثر نگاروں کے نمونوں پر مشتمل ایک بڑا مجموعہ ترتیب دیا جا سکتا ہے جو اپنی نظیر آپ ہوگا۔

"اردو کی منظوم خصوصی اصناف کے لیے معیاری نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ جو حد سے باہر نہیں گئے ہیں۔ تاہم ریختی کی مثال میں میرا بائی کے کلام کی مثال جچتی نہیں ہے۔ یہ ہند پیرایہ بیان ہے اور ہندی زبان کی فطری شاعری ہے کہ اظہار محبت عورت کی زبانی ہوتا ہے اور وہ اپنی روداد محبت درد بھری لے میں روٹھے ساجن کو سناتی رہتی ہے۔ جب ریختی جو لکھنو کی پیداوار اور اخلاقی اقدار کے تنزل کی آئینہ دار ہے تصنع اور چوما چاٹی کی تما

مزاحیہ شاعری اور نثر نگاری کے نمونے بھی بڑے پر لطف ہیں اور بہت سے نا جنہیں ہمارے ادبی تاریخ نویس بھول بھال گئے ہیں۔ مصنف نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیش کیے ہیں۔ پھر بھی چند نام سہو نظر سے شاید چھوٹ گئے ہیں ، ابن انشا ، مجتبیٰ حسین

رجعت ساجدہ کے نام اور محمود شاید سہو نظر سے شامل نہیں ہو سکے ہیں۔ اسی طرح [illegible] کے "رہبر و رہرو" کا ذکر بھی شامل نہیں ہو سکا ہے۔

اس کے علاوہ اردو اخباروں اور رسالوں میں چھپے نامعلوم مصنفوں کی تخلیقات بھی اس صاحب افکار ادیب سے مانگ کرتی ہیں کہ کبھی ان کی بھی رونمائی کی جائے یا جرعہ حیات پلایا جائے۔ خوشی کی بات ہے کہ حرف آخر میں موصوف نے اس ضرورت کو محسوس کیا ہے۔

مصنف کی وسیع النظری کی ایک مثال مراٹھی ادب کا ذکر ہے اور اردو اور مراٹھی کے باہمی روابط کا ذکر واقعی اہم چیز ہے۔ اس کے علاوہ فہرست میں جملہ الفاظ مراجع کے مرادف انگریزی اور ہندی الفاظ کا شمول بھی واقعی ایک انوکھی چیز ہے۔ جو مصنف کی دقت نظر اور کاوشوں کو ظاہر کرتی ہے۔

ا۔ و۔ ش

خلیل الرحمٰن اعظمی

تو کون تھا، کیا نام تھا، تجھ سے ہمیں کیا کام تھا
ہے پردۂ دل پر ابھی دھندلا سا اک چہرہ ترا؟

~~~

ہم اپنی کہانی کس سے کہیں خود ہم کو جھوٹی لگتی ہے
وہ کون تھا کس کو چاہا تھا گردش دوراں بھول گئے

~~~

نشور واحدی

انجام وفا یہ ہے جس نے بھی محبت میں
مرنے کی دعا مانگی جینے کی سزا پائی

~~~
~~~

غزل

ان کی اب چشمِ التفات نہیں
ویسے رنجش کی کوئی بات نہیں

دنیا کی ہے صفِ تقدیر
یاں کسی چیز کو ثبات نہیں

دمِ قدم سے ہے ان کے نور ہی نور
رات ہوتے ہوئے بھی رات نہیں

میں ہوں تنہائیوں کا صحرا ہے
دور تک پرتوِ حیات نہیں

اب وہ ملتے ہیں اجنبی کی طرح
کیا یہ ترکِ تعلقات نہیں!

صرف نیکی ہی کام آئے گی
اور کچھ باعثِ نجات نہیں

وہ جو اپنی شناخت میں گُم ہیں
خود انہی کو شعورِ ذات نہیں

زخم کھا کر بھی مسکرا دینا
ایسے ویسوں کے بس کی بات نہیں

محمد منظور احمد

غزل

وہ آئے سامنے میرے، مگر حیا کر کے
نہیں ہے ہوش، مرے دل کو سامنا کر کے

ہمارے بیچ میں دیوار بن گئی دُنیا
خدا سے مانگ رہی تجھ کو میں التجا کر کے

زمانہ اپنی جفاؤں سے، کیسے باز آئے
سکون ملتا ہے اس کو، فقط جفا کر کے

یہ رنگ و نور کی دنیا بھی ہو گئی بے نور
جو میں نے دیکھا ہے، دل سے تجھے جدا کر کے

تجھے نہ پا کے مری زندگی ادھوری ہے
فسانہ روک لیا میں نے ابتدا کر کے

قرارِ دل کو نہیں ہے مرے، وہ کیا جانے!
ملے گا کچھ نہیں، بے درد سے گلہ کر کے

وہ سرد مہری سے پیش آئے سن کے قصۂ دل
مجھے ملال ہوا، عرضِ مدعا کر کے

صلہ وفا کا نہیں مانگتے ہیں، اہلِ وفا
وہ شاد رہتے ہیں تا زندگی وفا کر کے

نظارۂ رخِ زیبا، نہ تھا انہیں منظور
وہ منہ پہ ہاتھ پھراتے رہے دعا کر کے

نہ چھوڑ دے دلِ پروین کو تو خدا کے لیے
ملا ہے چین اُسے اب خدا خدا کر کے

فاطمہ ضابطہ پروین

○

مرا خلوص ہے کیا حرف نارسا کی طرح
بھلا دیا مجھے تم نے مری وفا کی طرح

یہ شخص ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا
کبھی صنم کی طرح ہے کبھی خدا کی طرح

را وجود ہے میرے عدم کا آئینہ
خود اپنی روح میں پنہاں ہوں میں خلا کی طرح

میرے دور کا انساں ہے کہ تشنگو
بھٹک رہا ہے خلا میں مری صدا کی طرح

رجز پڑھو کہ ہے نیزے پہ نور زاد کا سر
جوار شہر ہے آغوش کربلا کی طرح

پروفیسر عنوان چشتی

○

محمد یوسف عثمانی

ہیں دیتے ہیں دل کے مکیں فریب
ہنس ہنس کے کھا رہے ہیں مگر سب حسیں فریب

وہ جھوٹ ہے جو سوچتے ہیں سچ
دیتے ہیں اپنے دل کو بڑے دلنشیں فریب

دوست کی مہربات ہے حدیث
گرچہ وہ مجھکو دیتے ہیں اپنے تئیں فریب

سانہ کبھی موت ہے سراب
دل کے سکوں کے واسطے سب ہیں حسیں فریب

خون دل ہے بہا مثل آب پھر
دل نے دیا ہے عقل کو جب بھی کہیں فریب

یوسف یقیں کی سامنے منزل جب آ گئی
حسن خیال نے دیا فوراً وہیں فریب

شاعر کی تمنّا

قیصر بدنیروی

اُمنگیں دل سے اُٹھ اُٹھ کر تخیل میں سنورتی ہیں
مرے ظلمت کدہ میں عرش سے حوریں اُترتی ہیں
وہ میری حسرتیں وہ آرزوئیں وہ تمنائیں
جو برآئیں تو دنیا کے جہنم سرد ہو جائیں
یقیں ہوتا ہے دل کو جادۂ حق سے گذرنا ہے
مجھے مستقبلِ انسانیت تعمیر کرنا ہے
اُٹھوں اُٹھ کر نظامِ محفلِ ہستی بدل ڈالوں
بڑھوں بڑھ کر بدی کی قوتوں کا سر کچل ڈالوں
سراپا سوز ہو کر گرم کر دوں قلبِ ہستی کو
تپش اندوزیوں کا درس دوں مٹی کی پستی کو
ضمیر و فکرِ انسانی کی آزادی کا خواہاں ہوں
میں نسل و رنگ و خوں کے امتیازوں سے گریزاں ہوں
سمیٹوں مرکزِ انسانیت پر نظمِ برہم کو
سکھاؤں احترامِ زندگی اولادِ آدم کو
وقارِ آدمیت سے خرد کو آشنا کر دوں
گدازِ عشق سے آئینۂ دل کی جلا کر دوں
مٹا کر امتیازِ نیک و بد سب ایک ہو جائیں
خدا بھی ایک ہے بندے بھی اس کے ایک ہو جائیں
نہ گلچیں ہو نہ صیادِ ستم راں کی ستم رانی
نہ گل کی چاک دامانی نہ غنچوں کی پریشانی
نہ طوفاں ہو، نہ طوفاں میں غریبوں کا جہاز آئے
خدارا ہم فریبِ کشتی و ساحل سے باز آئے
مری خاموش راتوں کو بھی اک ہلچل سی رہتی ہے
دعا کرتا ہوں میں انسانیت آمین کہتی ہے

بیادِ حضرت بدر

(علاقۂ معدبھر کی نامی گرامی ہستی حضرت حفیظ اللہ خاں صاحب بدر سابق پرنسپل انجمن ہائی اسکول و جونیر کالج کھام گاؤں کی وفاتِ حسرت آیات (بتاریخ ۲۲ جنوری ۸۲ء) پر کہی گئی نظم)

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمن خاں منشاؔ

ہر دل ہے سوگوار سے ہر اک آنکھ شبنمی
یہ کس کی یاد میں یہاں دلگیر ہیں سبھی

وہ حضرتِ حفیظ وہ اک غمگسارِ قوم
اب دے گئے جدائی کا اک داغ دائمی

روپوش آج ہو گیا وہ بدرِ علم و فن
تھی جس کے دم سے سارے علاقے میں روشنی

افسوس ایسا مردِ مسلماں چلا گیا
وقفِ فلاحِ قوم رہی جس کی زندگی

حسنِ خلوص ان کا تھا دراصل بے مثال
تا عمر کی ہے مسلم و ہندو سے دوستی

وہ بزلہ سنج حاملِ ذوقِ یقین تھے
ان کو ملی تھی روشنیِ علم و آگہی

آئے گا اب کہاں سے بھلا ایسا رہنما
ہر ایک راہ میں جو کرے سب کی رہبری

زندہ دلی کا اس سے بڑا کیا ثبوت ہو
فرطِ الم میں ان کے لبوں پر رہی ہنسی

تقریب جب بھی ہوگی کوئی کھام گاؤں میں
محسوس ہوتی جائے گی اک آپ کی کمی

ان کو خدائے کون و مکاں مغفرت کرے
فردوس میں خصوصی جگہ مرحمت کرے

حرفِ تابندہ

ن تابندہ جسے کہتے ہیں وہ ہے ان کی بات
پیسے دنیا سے خود زندہ ہے اب تک ان کی با

ت میں ہو وزن، گہرائی بھی، گیرائی بھی ہو،
ردانا نے کہا ہے مت سنو کم سن کی بات

ت کی باتوں سے اکثر نیند ہوتی ہے اچاٹ
م کی جو بات ہوتی ہے تو وہ ہے دن کی بات

ن کی باتوں کو کہا کرتا ہوں میں "باد رہوا"
پ مجھ سے کہہ رہے ہیں یہ تو کہئے کن کی بات؟

ن کا فرمایا ہوا ہوتا ہے پتھر کی لکیر
م لوگوں میں نہیں آتی کسی مومن کی بات

خود انہیں سے پوچھیے کیا ان کے سینے میں ہے دفن؟
ہپ نے مجھ سے چھپانے کو کہی ہے جن کی بات

زد میں جب خود آئے، تب چودہ طبق روشن ہوئے
جو کہا کرتے تھے بیہودہ ہے شیطانی جن کی بات

مانتا ہوں میں کہ یہ احسان کا بدلہ نہیں
ہے شرافت کا تقاضہ، مان لے محسن کی با

رہن جب اپنی خودی کر دی تو ہو جا مطمئن
دیکھ پوشیدہ ہے اس میں مرتہن، راہن کی بات

اپنے حق میں بے محابا کانٹے بوتے ہیں رشید
کان دھر کر جو سنا کرتے ہیں بدباطن کی بات

رشید انصاری

غزل

آج تک پردہ پڑا ہے کون پسِ منظر میں تھا
شہر جب جلنے لگا تھا میں بھی اپنے گھر میں تھا

جب نہیں معلوم کس کے سر سے چادر چھن گئی
کیوں ترا مغموم چہرہ میری چشمِ تر میں تھا

قافلے والوں نے تجھ کو راہ میں چھوڑا تو کیا
تیری منزل کا نشاں تو راہ کے پتھر میں تھا

دوستو! مہکی ہوئی کچھ تازہ یادیں ہی نہیں
زندگی کا اک ادھورا خواب بھی بستر میں تھا

سامنے لے جاتا کس کے، بے گناہی کا ثبوت
نام میرا بھی تو اک معصوم کے محضر میں تھا

سنگ باری حق بجانب تھی مرے احباب کی
جب سے دیکھا ہے تمہیں پانے کا سودا سر میں تھا

گھر تلک آئی تھی خوشبو پھر بھی پہچانا نہیں
ہنسنے رونے کا سلیقہ آپ کے تیور میں تھا

○

صلاح الدین نیر

انور کھلگانوی

نوجوانانِ ملّت سے

جوانو کچھ خبر ہے کیوں دگرگوں رنگ عالم ہے
جس انسان پر نظر کیجیے وہ اک سوز مجسم ہے

فساد و ظلم کی اب بحر و بر پر حکمرانی ہے
مکدر فتنہ و شر سے فضائے آسمانی ہے

نظامِ امنِ عالم ہو رہا ہے درہم و برہم
ہے آلام و حوادث کی جہاں پر یورش پیہم

فضائے دہر پر منڈلا رہے ہیں جنگ کے بادل
بجھانا چاہتی ہے بادِ نفرت پیار کی مشعل

سکون مفقود ہے، جمعیتِ خاطر پریشاں ہے
اب انساں اپنے ہاتھوں کی کمائی سے ہراساں ہے

جفا و جبر، حرص و آز کا مارا ہوا انساں
ہلاکت کے گڑھے پہ ہے کھڑا سرگشتہ و حیراں

بھلا کر اس نے احکام خدا فرمانِ پیغمبر
مسلط کر لیا شیطانیت کو اپنی ہستی پر

جہاں میں اب ہے ہر سو معصیت کی گرم بازاری
مقدر ہو گئی انسانیت کا ذلت و خواری

بداخلاقی، حیا سوزی کی ہے ہر جا عملداری
گناہ و جرم و فتنہ کی ترو تازہ ہے پھلواری

بھبکتے جا رہے ہیں پیڑ پودے ظلم و طغیاں کے
تھپیڑے کھا رہی ہے آدمیت موجِ عصیاں کے

برائی پر بہار آئی رذالت پر شباب آیا
فرنگی فتنہ گر کے ساتھ کیسا انقلاب آیا

سفاہت جنسیت زدگی تشدد دیں فراموشی
خدا بیزاری، رشوت، سود اندوزی ستم کوشی

جہالت عصبیت، فرقہ پرستی، تفرقہ بازی
کدورت، کذب، کینہ، کبر و کید افترا سازی

سرایت کر چکے ہیں زہر کتنے نبضِ ہستی میں
بلندی سے لڑھک کر گر گیا انسان پستی میں

جنونِ چیرہ دستی روز و شب بڑھتا ہی جاتا ہے
انانیت کا سیلابِ بلا چڑھتا ہی جاتا ہے

وقارِ آدمیت دن بدن کم ہوتا جاتا ہے
خود انسان اپنے ہاتھوں اپنی قسمت کھوتا جاتا ہے

ہے باطل اپنی پر طاغوت پھر سو کار فرما ہے — بدی کا زور ہے عریانیت کا بول بالا ہے
جہادِ زیست میں ہے اہرمن خواہاں پیار کا — جوانو! حربۂ حسنِ عمل سے دو لگے چہرا
لگاؤ تیغِ تیزِ عشق سے وہ ضربت کاری — حواس و ہوش گم ہو جائیں جس سے ساری عیاری کا
شکستِ فاش دو شیطان کو حاصل فتح کامل ہو — علم طاغوت کا نیچا، نگوں سر زورِ باطل ہو
جوانو! فطرتِ سیماب بھی ہے تم سے شرمندہ — کرو اخلاق کی گرتی ہوئی قدروں کو پائندہ
ہمیں تخریب کی قوت سے پنجہ آزمانا ہے — تمہیں کرنا ہے محکم خیر، شر کو مٹانا ہے
ہمی وجہ ہو انسانیت بھی خیر امت بھی — تمہیں کو سونپ دی اللہ نے ارضی خلافت بھی
ہمارا فرض ہے دنیا میں پھر انصاف قائم ہو — چڑھیں پروان امن و آشتی یہ فکر دائم ہو
اباحیت، تجدد، بے یقینی، حرص زر، فتنے — مزے سے پھر رہے ہیں مار کر دم بے خطر کتنے
ہمیں ایمان کی لاٹھی سے ان کا سر کچلنا ہے — فلاحِ آدمیت کے لیے کانٹوں پہ چلنا ہے
جوانی کو ہے تم پر فخر، نازاں جوشِ یزدانی — ہو زندہ جانِ طبِ عالم کرو ایسی مسیحائی
دلوں میں نیم جاں انسانیت کی خون دوڑا دو — ثریٰ سے تا ثریا پرچمِ انصاف لہرا دو
دلِ افسردۂ ہستی مسرت آشنا کر دو — یقین و عشق کے پھولوں سے دامانِ جہاں بھر دو

شمیمِ خلق سے مہکا دو انورِ ہر گلستاں کو
خدا کا بندۂ مخلص بنا دو پھر سے انساں کو

بھری بہار تھی، پھولوں میں آشیانہ تھا
میں سوچتا ہوں، حقیقت تھی یا فسانہ تھا
ملال کس کو ہے، دشمن نہیں وہ دوست سہی
مجھے کسی نہ کسی سے فریب کھانا تھا

نجم آفندی

حرفِ آخر

شاداب کے قارئین کا اپنا صفحہ

○ شاداب کا پہلا شمارہ وصول ہوا، اپنی پوری آب و تاب اور اعلیٰ علمی ادبی معیار کے ساتھ روشن ستارہ کی طرح ہے۔ موضوعات میں تنوع ہے اور توازن بھی۔ جانے پہچانے اور ممتاز ادیبوں کی تخلیقات ہیں، یہ سب اس بات کی ضمانت ہے کہ یہ رسالہ قائم و دائم رہے گا۔

(ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور، بمبئی)

○ "شاداب" کے دوسرے مضمون "قرآن کریم" کو یہاں کافی پسند کیا گیا۔ امجد حیدرآبادی پر مضمون اور حافظ و خیام کے ترجمے بے حد پسند آئے، "عربی کے سبق" اچھا سلسلہ ہے۔ متن کے ساتھ ترجمہ بھی ہو تو اور مفید ہوگا۔

(رحمٰن نادر۔ کلب، ایوت محل)

○ شاداب کا دوسرا شمارہ پہلے کے مقابلہ حسن و ترتیب میں بڑھا ہوا ہے۔ فسانات کا تجزیہ ڈاکٹر باری نے اچھا کیا ہے۔ ڈاکٹر ترکمان کا "اردو اور ترکی" معلومات افزا ہے۔ بہت دنوں سے سوچتا تھا فارسی کا تلفظ اور لب و لہجہ اردو والوں کی فارسی میں کیوں نہیں اس کا جواب اس مضمون میں مل گیا۔ کہ ہندوستان میں فارسی براہ راست نہیں آئی۔ بلکہ ترک قبائل کے ذریعہ آئی ہے اور ترکی لب و لہجہ اس میں گھل مل گیا ہے۔ نفسیات پر ڈاکٹر عبدالمجید خاں کا مضمون خاصا مفید ہے، عربی سبق اچھا ہے۔

(خلیل شارق۔ امراوتی)

○ "شاداب کے اجراء پر مبارکباد قبول کیجیے۔ تین شمارے وصول ہوئے ہر ایک خوب سے خوب تر ہے۔ مگر شاداب میں ایک افسانہ بھی ہو تو مناسب ہے۔ ڈاکٹر ناصرہ کی چھوٹی سی نظم باسکٹ" یقیناً دل چسپ ہے مگر اقساط میں ہونے سے تشنگی کو بڑھاتی ہے اگر مختصر افسانہ شریک کیا جائے تو مناسب ہے۔ نیز ابن میکائی دور میں شگفتگی اور مزاح کا حصہ

بھی کچھ بڑھایا جائے تو "شاداب" اور زیادہ پسندیدہ اور ہر دلعزیز ہوتا جائے گا۔
(محمد بشیر الدین - اورنگ آباد)

○ "شاداب" موصول ہوا، یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس رسالے میں موضوعات و مضامین کا خاصا تنوع ہے، جس میں مذہبی، ادبی، علمی مضامین کے علاوہ بعض ایسی تحریریں بھی شامل ہیں جو عام لوگوں کو بھا پسند آسکتی ہیں، امید ہے کہ آپ کی محنت رنگ لائے گی اور یہ رسالہ اپنے معیار کی بلندیوں کو چھونے کے لیے ارتقاء کی طرف گامزن رہے گا۔
(پروفیسر عنوان چشتی)

○ "شاداب" کا تیسرا شمارہ بھی بدست ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ آپ پوری توجہ شاداب کو نہیں دے سکے یا پھر خیال آفریں مضامین کی قلت ہو گئی ہے، ڈاکٹر مغنی تبسم کا لالۂ صحرا اقبال ریویو کے لیے مناسب ہے، شاداب کے لیے نہیں۔ ذیابطیس اگر سلیس اور عام فہم ہوتا تو بہت اچھا تھا۔ مصطفےٰ شروانی کا "مولانا محمد علی" ایک نثری قصیدہ ہے محض ایک رخی تصویر۔ ڈاکٹر ناصرہ کی چھوٹی سی نیلی باسکٹ معلوم نہیں افسانہ ہے یا ناولٹ، اسے کو انشا قدرے نظر ثانی کا محتاج ہے۔ مثلاً:

"وہ خود میرے سامنے اپنے خوش نما مکان کے حسین ٹیرس پر سفید بے داغ لباس میں ملبوس میرے جوڑے میں ...... سفید گلاب سجا رہی تھیں"

سامنے سے جوڑے میں پھول سجانے کی ترکیب بھی ڈاکٹر صاحبہ بتا دیتیں تو اچھا تھا!
(قاضی جلیل احمد - لندن)

رباعی دعائیہ

سید مظفر الدین خاں صبا

بتقریب آغاز اشاعت ماہنامہ شاداب

ہر آن نئی آب نئی تاب رہے
ایک ایک ورق اک درِ نایاب رہے
دنیٰ پرچے کا آغاز ہے صاحب کیا خوب
سر سبز زمانے میں یہ شاداب رہے

MONTHLY SHADAAB
11-5-147, RED HILLS, HYD-500 004
Regd NO. H/HD 593
Vol. I No. 4 MARCH 1984

ہوئے افکار سے گلشن میں بچھا سکے کوئی
خود تنگ منظر شہزادہ اسپ دکھائی دے گا

ادا

علمی، ادبی، دینی و سماجی اقدار کا نمائندہ

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد (۱)　　اپریل سنہ ۱۹۸۴ء　　شمارہ (۵)

زرِ تعاون　فی پرچہ　پانچ روپے

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
زر سالانہ	50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
زر دوسالہ	90 "	275 "	65 "	36 "	225 "
زر تاحیات	1000 "	2500 "	450 "	300 "	2000 "

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ = 11-5-147 ریڈہلز حیدرآباد 500004

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل پرنٹنگ پریس چارمحل حیدرآباد میں طبع کروا کر ریڈہلز حیدرآباد سے شائع کیا

فہرست

حرف اول

شاداب" کا پانچواں شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ خوب سے خوب تر کی طرف سفر
ر ابھی جاری ہے۔ گزشتہ شمارہ میں ایک ناگزیر وجہ کی بنا پر عربی کے سبق شامل نہ ہوسکے
ز قارئین نے توجہ دلائی کہ ان اسباق کو ناغہ نہ کیا جائے بلکہ انہیں اور آسان اور عام فہم بنایا جائے
اکہ کم اردو جاننے والے بھی ان سے استفادہ کرسکیں۔ طبی مضامین کا سلسلہ برابر جاری ہے
یز سائنسی مضامین کے سلسلہ میں کمپیوٹر کے بارے میں ایک مضمون اس شمارہ میں شریک ہے
جسے اسپین SPAH کے ایک شمارہ سے استفادہ کرتے ہوئے تیار کیا گیا ہے۔ اس کے بارے
یں آپ کے ردعمل کا انتظار رہے۔

اردو دنیا کو ایک اور صدمہ پہنچا اور اردو کے ممتاز شاعر پدم بھوشن جناب محمد صمد یار خاں
ساغر نظامی ۲۷ فروری ۱۹۸۳ء کی صبح نو بجے ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ موصوف کئی مہینوں
ے بیمار تھے اور عمر انتقال کے وقت ۸۰ سال سے زائد تھی۔ ساغر نظامی کو شاعری میں سیماب
آبادی کا تلمذ حاصل رہا۔ اور صحافت و ادب و سیاست میں مولانا آزاد، پنڈت نہرو اور
روجنی نائیڈو جیسی شخصیات سے متاثر رہے اور ہر شعبہ میں جس میں داخل ہوئے اپنا لوہا
وایا۔ کئی رسالوں اور جریدوں کے روح رواں رہے۔ "ایشیا" کو اردو ادبی دنیا کا ایک
ندہ جریدہ بنا دیا۔ بمبئی کے فلمی اداروں میں گیت کار، مکالمہ نگار اور کہانی کار حیثیت سے
یا مگر بہت جلد آل انڈیا ریڈیو سے اردو کے پروگرام پروڈیوسر اور ڈپٹی چیف پروڈیوسر
لک ہوگئے۔ آزادی ہند کی منظوم تاریخ جدوجہد لکھنے کے لئے آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی
پوئیٹ ایٹ ریذیڈنس کی حیثیت سے مشعل آزادی کی دو جلدوں کی تکمیل کی۔ شعری اعتبار
، اردو شاعری کی ہر صنف پر قادر تھے۔ "نہرو نامہ" محب وطن نہرو کے لئے بہترین خراج
دت ہے تو "مشعل آزادی" ایک ناقابل فراموش تخلیق۔ اردو کی ادبی و تہذیبی زندگی

سے ساحر کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ اپنی مترنم آواز، رومانی نظموں اور گیتوں کے ذریعہ بہت جلد ان کا شمار ملک کے مقبول ترین شعرا میں کیا جانے لگا۔ ان کی خدمات کا اعتراف سرکاری، غیر سرکاری سیاسی، غیر سیاسی ہر سطح پر کیا جاتا رہا ہے۔ جوش، فراق، حفیظ و وجد کے بعد ان کے اٹھنے سے گویا ایک دور کا خاتمہ ہو گیا۔

اردو یونیورسٹی کے لئے شاداب نے جو آواز اٹھائی اس کی بازگشت سنائی دے رہی ہے۔ ہماری اسمبلی میں اس مسئلہ کو اٹھایا گیا اور حکومت نے اعلان کیا ہے کہ اس بارے میں ضروری کارروائی کی جائے گی۔ ضرورت ہے کہ سب اردو والے ارباب حکومت کو اس جانب متوجہ کرتے رہیں تا آنکہ حکومت عملی قدم اٹھائے اور اردو یونیورسٹی کے قیام کی صورت جلد نکل آئے۔ آندھرا پردیش میں جامعہ عثمانیہ کے کامیاب عملی تجربے کے بعد یہ بڑی خوشی کی بات ہے اسی اسٹیٹ میں اردو یونیورسٹی کے قیام کی تجویز آگے بڑھ رہی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ آندھرا پردیش اس خصوص میں اولیت کا درجہ حاصل کرلے گا۔

اردو یونیورسٹی کے قیام کی کوششوں کے ساتھ ساتھ اردو والوں کی اس سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم کے ابتدائی اور ثانوی مدارس کے تعلیمی معیار کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اس کے وجوہ جو کچھ بھی رہے ہوں اردو والے چاہیں تو بڑی حد تک اس خرابی کو دور کرکے تعلیمی معیار کو اونچا کرنے میں معاون ہو سکتے ہیں۔ حیدرآباد کی ایک تعلیمی سوسائٹی "محفل علم و فن" نے اس کام کی ابتداء کر دی ہے۔ محفل علم و فن نے تقریباً (۱۲) مرکز ایسے قائم کئے جہاں مارچ ۸۲ء میں منعقد ہونے والے ایس ایس سی امتحان کے اردو میڈیم کے طلبا و طالبات کے لئے فری کوچنگ کا انتظام کیا گیا۔ یہ مرکز تقریباً تمام پرانے شہر میں قائم کئے گئے اور اوقات مدرسہ کے پہلے یا بعد کوچنگ کا انتظام کیا گیا کہ طالب علم اسکول کی تعلیم کے بعد اس کوچنگ سے استفادہ کر سکیں۔ اور پرانے شہر میں جہاں اردو میڈیم اسکول زیادہ قائم ہیں وہیں کے طلبا اس تعلیم سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ ضرورت ہے کہ ایسی ہی کوچنگ کلاسس جماعت دہم کے علاوہ جماعت ہفتم اور جماعت چہارم کے طلبا کے لئے بھی قائم کی جائیں تاکہ اردو میڈیم اسکولوں کے طلبا میں جو بنیادی کمزوری ہے وہ دور ہو اور وہ پھر اس موقف میں آجائیں جہاں وہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے زمانہ میں تھے کہ جامعہ عثمانیہ نے اپنے قلیل دور قیام میں یہ ثابت کر دیا کہ اردو میں ادب و تاریخ کے علاوہ سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم بھی دی جا سکتی ہے اور نہایت کامیابی کے ساتھ دی جا سکتی ہے۔ اردو کے ہر بہی خواہ کو چاہئے کہ اردو کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کی کوشش میں ہاتھ بٹائیے۔

حدیث - ایک انقلاب انگیز عہد کی مستند تاریخ

مولانا سلیمان ندوی کا بیان ہے کہ "علم القرآن اگر اسلامی علوم میں دل کی حیثیت رکھتا ہے تو علم حدیث شہ رگ کی۔ یہ شہ رگ اسلامی علوم کے تمام اعضاء و جوارح تک خون پہونچا کر ہر آن ان کے لئے تازہ زندگی کا سامان پہونچاتا رہتا ہے۔ آیات کی شان نزول اور ان کی تفسیر احکام القرآن کی تشریح و تعیینات، (مجمل) کی تفصیل، عموم کی تخصیص، مبہم کی تعیین، سب علم حدیث کے ذریعہ معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح حامل قرآن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور حیات طیبہ اور اخلاق و آداب مبارکہ اور آپ کے اقوال و اعمال اور آپ کے سنن و مستحبات اور احکام و ارشادات اسی علم حدیث کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں۔ اسی طرح خود اسلام کی تاریخ، صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم کے احوال اور ان کے اعمال و اقوال اور اجتہادات و استنباطات کا خزانہ بھی اسی کے ذریعہ ہم تک پہونچا ہے۔ اس بناء پر اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اسلام کے عملی پیکر کا صحیح مرقع اسی علم کی بدولت مسلمانوں میں ہمیشہ کے لئے موجود و قائم ہے۔ اور ان شاء اللہ تعالیٰ تاقیامت رہے گا"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور تقریر کا نام حدیث ہے۔ آنحضرتؐ کے (ان) حالات و واقعات کو جس طرح اپنی حقیقی اور اصلی شکل میں محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اور اس (تا)ریخی مرقع کے ہر خط و خال کی اصلی شکل و صورت کی حفاظت میں بے حساب انسانوں کی جتنی کوششیں اور (ت)دبیریں صرف ہوئی ہیں۔ اس سے "حدیث" نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ پوری انسانیت کے اہم ترین انقلابی (ع)ہد کی تاریخ کا معتبر ترین ذخیرہ بن گئی ہے۔ اسلامی تحریک نے اپنے زمانۂ آغاز سے اس وقت تک (م)شرق و مغرب کے باشندوں کی مذہبی، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی پہلوؤں کے انقلاب میں جو کام کیا ہے اس کے پیش نظر "حدیث" کی اس تاریخی حیثیت سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

فن حدیث کے سب سے بڑے امام حضرت امام بخاریؒ کی کتاب کو آج ہم "بخاری شریف"

کے نام سے جانتے ہیں۔ لیکن اس کا پورا نام "الجامع الصحیح والمسند المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وایامہ" ہے۔ اس میں "امور" اور "ایام" کے لفظ قابل غور ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی صحیح تعریف امام بخاری کے نزدیک ان تمام "امور" پر حاوی ہے جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے آنحضرت سے تعلق ہو۔ "ایام" کے لفظ نے اس تعریف کو اور وسیع کر دیا کہ فن حدیث درا صل اس عہد اور زمانہ کی تاریخ ہے جس میں آنحضرت جیسی ہمہ گیر عالم پر اثر انداز ہونے والی ہستی انسانیت کو قدرت کی جانب سے عطا ہوئی۔

آج ہر ملک و قوم یہ چاہتے ہیں کہ حال کی تعمیر میں ماضی کے تجربات اور واقعات سے فائدہ اٹھایا جائے اس مقصد کے لئے گذرے ہوئے واقعات کو کسی نہ کسی طرح محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ کبھی زمانے کے حالات لکھنے کے لئے ہر قسم کی باتیں حتیٰ کہ بازاری افواہیں لکھ لی جاتی ہیں۔ جن کے راویوں کا نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتا۔ ان افواہوں سے وہ واقعات چن لئے جاتے ہیں جو قرائن و قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہی واقعات کتابی صورت اختیار کرنے کے بعد "تاریخ" بن جاتے ہیں۔ آج آثار قدیمہ میں کھدائیاں کی جا رہی ہیں۔ قدیم سکے برآمد کئے جا رہے ہیں۔ پرانے کھنڈروں سے ایک ایک ٹھیکری چنی جا رہی ہے۔ ان پر لکھے ہوئے نشان اور تحریروں کو پڑھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اور انہی پر قیاسات قائم کرکے تاریخ لکھی جا رہی ہے۔ اگر کسی عینی شاہد یا سیاح کی یادداشت مل جائے تو اسے بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ لیکن اس بات کا پتہ چلانا قطعاً دشوار ہے کہ اس عینی شاہد یا سیاح کا اپنے ذاتی رجحانات، سوجھ بوجھ، سچائی، راستبازی، سیرت و کردار کے لحاظ سے کیا حال تھا۔ غرض تاریخ کسی ملک، قوم یا قبیلہ کے کیفیات اور حکومت یا جنگوں وغیرہ کے حالات کا نام ہے۔ برخلاف اس کے "حدیث" اس تاریخ کا نام ہے جس کا تعلق براہ راست ایک خاص شخصی وجود یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے ہے۔ ایک ملک ایک قوم یا ایک قبیلہ کے حالات بیان کرنے میں تمام متعلقہ چیزوں کو جمع کرنا اور ان سب کا احاطہ کرنا صحیح واقعات کو لکھنے میں جن کوتاہیوں، غلط فہمیوں اور غلطیوں کا امکان ہے۔ اس کے مقابلہ میں صرف ایک واحد شخصیت کے حالات بیان کرنے اور قلمبند کرنے میں جس صحت اور واقعیت کی توقع کی جا سکتی ہے۔ وہ ظاہر و واضح ہے۔ عام تاریخوں سے تاریخ کے اس حصہ "حدیث" کو جو سب سے بڑا امتیاز حاصل ہے وہ یہی ہے۔

دوسرا امتیاز جو پہلے امتیاز سے بھی زیادہ اہم ہے وہ آنحضرت صلعم اور ان کے مورخین یعنی صحابہ کا باہمی تعلق ہے۔ آج جو تاریخیں اقوام و ملل اور سلاطین و اکابر کی ہم تک پہنچی ہیں ان کی تدوین میں

روایات میں مبہم افواہوں کی صورت میں واقعات ادھر اُدھر بکھرے ہیں۔ پھر انہیں مختلف لوگ
ہوں نے یا اس کے بعد آنے والوں نے قرائن و قیاسات سے جہاں تک ہو سکا جس حصہ کو
مناسب سمجھا مرتب کر دیا۔ یہ اوراق زیادہ بوسیدہ ہوئے تو تاریخی اثاثہ بن گئے۔ چنانچہ آج کل مطبوعہ
یا قلمی نسخوں میں ان سے زیادہ آثار قدیمہ سے برآمد شدہ مواد پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ بہرحال
نتیجہ ان کے مورخوں کو ان واقعات سے یا صاحب واقعات سے قطعاً وہ تعلق نہ تھا اور نہ ہو سکتا
تھا جو کریم ص کو ذات رسالت سے تھا۔ یہی نہیں کہ ان بزرگوں نے حضور کے ہاتھ پر ایمان و اسلام
قبول کی، آپ کی نبوت پر ایمان لائے تھے آپ سے ان کو وہ تعلق تھا جو ایک امتی کو اپنے
نبی سے ہونا چاہیئے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ وہ اپنے ماں باپ، بیوی بچوں بلکہ اپنی جانوں
سے حضور اور آپ کی زندگی کو عزیز رکھتے تھے۔ وہ سب کچھ حضور پر قربان کرنے کو تیار تھے۔ یقیناً
یہ ایسا تعلق ہے جو کسی تاریخی واقعہ کو اپنے مورخین کے ساتھ حاصل نہیں۔

تیسری خصوصیت اس تاریخ اور اس کے راویوں کی یہ ہے کہ علاوہ مذکورہ بالا تعلقات کے
ان مورخوں یا چشم دید راویوں اور گواہوں نے آنحضرت کے دست مبارک پر بیعت ہی اس بات
پر کی تھی کہ تاریخ کے اسی عجیب و غریب واقعہ کے ہر ہر جز کے زندہ نقوش اپنے اندر پیدا کریں گے۔ انہوں نے
خدا کی شریعت اور سنت کا قانون یقین کر کے مانا تھا۔ اس میں بار بار مطالبہ کیا گیا تھا
ہر ایک کی زندگی کا نصب العین صرف یہی ہونا چاہیئے کہ جو کچھ آنحضرت فرماتے ہیں اسے سنو
اور اس پر ایمان لاؤ، یقین کرو، حضور جو کچھ کرتے ہیں، ان کی ہر ہر ادا پر نظر رکھو اور ٹھیک
اسی طرح ان کو جو کچھ کرتے ہوئے دیکھتے ہو تم بھی اس کام کو اسی طرح انجام دینے کی کوشش کرو۔

الرسول فخذوه وما نهاكم عنه — رسول نے جو کچھ تمہیں دیا ہے اسے پکڑے رہو اور جس سے انہوں نے روکا ہے اس سے رک جاؤ۔

رسلنا من رسول الا ليطاع باذن الله — ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا لیکن صرف اس لئے کہ اس کی پیروی اور اطاعت خدا کے حکم سے کی جائے۔

كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله — کہدو اگر تم اللہ کو چاہتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمہیں چاہنے لگے گا۔

كان لكم في رسول الله اسوة حسنة — تمہارے لئے اللہ کے رسول میں اچھا نمونہ ہے۔

صرف آنحضرت ؐ کے اقوال و اعمال کی اطاعت و اتباع ہی ان بزرگوں کے لئے ضروری نہ تھی بلکہ جس قرآن اور جس فرمان نے ان پر یہ فریضہ عائد کیا تھا اسی نے ان کو اس کا بھی ذمہ دار بنایا تھا کہ آنحضرت ؐ کو جو کچھ کہتے ہوئے انہوں نے سنا ہے اور جو کچھ کرتے ہوئے انہوں نے دیکھا ہے وہ دوسروں تک مسلسل پہونچاتے چلے جائیں۔ ہر حاضر غائب کو اور ہر پہلا پچھلوں کو ان کی طرف بلاتا چلے۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ — تم ایک بہترین امت ہو انسانوں کی رہنمائی کیلئے تم ظاہر کئے گئے ہو تا کہ اچھی باتوں کا لوگوں کو حکم دو اور بری باتوں سے ان کو روکو۔

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ — چاہیئے کہ تم میں سے ایک گروہ ہو جو نیکی اور بھلائی کی طرف لوگوں کو بلائے اچھی باتوں کا حکم دے اور بری باتوں سے روکے۔

حضور ؐ ہمیشہ مختلف پیرایوں میں صحابہ کرام کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا کرتے تھے حجۃ الوداع کے تاریخی خطبہ میں اعلان فرمایا کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑتا ہوں جن کے بعد تم پھر گمراہ نہیں ہو سکتے (ایک تو اللہ کی کتاب اور دوسری میری سنت۔ یہ دونوں باہم ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے جب تک کہ حوض کوثر پر میرے سامنے نہ آجائیں) آخر میں مجمع سے یہ دریافت فرمانے کے بعد کہ کیا میں نے پہونچا دیا۔ آسمان کی طرف انگلیاں اٹھا کر تین بار فرمایا کہ اے اللہ کیا میں نے پہونچا دیا" اور خطبہ کو اس مشہور فقرہ پر ختم فرمایا۔ اَلَا فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ (چاہیئے کہ جو حاضر ہے وہ غائب کو پہونچا دے)

غرض صحابہ کرام جس تاریخ کی نشر و اشاعت کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے تھے اس کو چھپانا بھی گناہ خیال کرتے تھے۔ ابوداؤد اور ترمذی میں یہ حدیث روایت کی گئی ہے کہ

مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ ثُمَّ كَتَمَهُ أُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنْ نَارٍ — جس کسی سے علم کی بات پوچھی جائے اور اسے وہ چھپائے تو قیامت کے دن آگ کی لگام اسے پہنائی جائیگی

اسی بنا پر تھا کہ پوچھے جانے پر سکوت کے عالم میں بھی حدیثیں بیان کرتے تھے۔ مبادا علم کے چھپانے کا الزام ان پر لگ جائے۔

جس ایمان و یقین کی دولت سے صحابہ کرام سرفراز تھے جس عملی کردار کے وہ مالک تھے ایسی صورت میں قصداً جھوٹ بلکہ غلط بیانی کرنے کی ان سے توقع ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ پھر بھی وہ جانتے تھے کہ آنحضرت ؐ کی طرف کسی امر کا انتساب کرنا دراصل اس چیز کو خدا کی طرف منسوب کرنا ہے یا ایسے حکم کو نہیں

نبوتوں میں قرآن میں مفتری علی اللہ (خدا پر جھوٹ باندھنے والے) کو سب سے بڑا ظالم قرار دیا ہے۔ گویا قرآن پر تازہ ایمان رکھنے والوں کیلئے اس کے بعد کوئی گنجائش نہ ہو سکتی تھی کہ وہ قصداً العیاذ باللہ اپنے محبوب رسول پر جھوٹ باندھیں پھر بھی بطور احتیاط بعض صحابہ جس وقت حدیث بیان کرنے کے لئے بیٹھتے تو بیان کرنے سے پہلے من کذب علیّ متعمداً والی حدیث فرما دیتے تھے تاکہ ان میں اپنی نازک تاریخی ذمہ داری کا احساس بیدار اور تازہ ہو جائے۔ امام احمد ابن حنبل اپنی مسند میں راوی ہیں کہ خصوصیت کے ساتھ ذخیرہ حدیث کے سب سے بڑے راوی یعنی حضرت ابوہریرہ کا یہ قاعدہ تھا کہ :

یَبْتَدِأُ بِحَدِیْثِہٖ بِأَنْ یَّقُوْلَ قَالَ رَسُوْلُ	اپنی حدیث جس وقت بیان کرنی شروع کرتے
اللّٰہِ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ اَبُوالْقَاسِمِ	تو کہتے فرمایا رسول اللہ صادق و مصدوق ابوالقاسم
صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ کَذَبَ عَلَیَّ	صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ
مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ	باندھا چاہیئے کہ اپنا ٹھکانہ آگ میں تیار کرے۔

اس کے بعد جو کچھ بیان کرنا چاہتے بیان فرماتے۔

صحابہ کرام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ آنحضرت جو کچھ صحابہ کو سناتے یا کر کے دکھاتے اس کے متعلق صرف یاد رکھنے یا عمل کرنے کا حکم دے کر نہ رہ جاتے بلکہ اس کی باقاعدہ نگرانی فرماتے تھے کہ اس حکم کی تعمیل پوری طرح ہو رہی ہے۔ بخاری میں آنحضرت کی عام گفتگو کے متعلق یہ دوامی عادت بیان کی جاتی ہے کہ

اِنَّہٗ کَانَ اِذَا تَکَلَّمَ بِکَلِمَۃٍ اَعَادَھَا ثَلٰثًا	جب حضور کوئی بات کرتے تو اسے تین مرتبہ دہراتے

ظاہر ہے اس میں بھی زیادہ تر دخل اسی مقصد کو تھا کہ حضور کے ارشادات کو لوگ اچھی طرح سن لیں سمجھ لیں۔

عمل کے متعلق مشہور حدیث ہے کہ ایک صاحب حضور کے سامنے نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز کے تمام ارکان یعنی قیام، رکوع و سجود میں کوئی کمی نہیں تھی، صرف ذرا عجلت اور جلدبازی سے کام لے رہے تھے جب نماز سے فارغ ہوئے تو حضور نے ارشاد فرمایا صَلِّ فَاِنَّکَ لَمْ تُصَلِّ (پھر نماز پڑھو تم نے نماز نہیں پڑھی) انہوں نے نماز دہرائی لیکن اب بھی اس میں وقار اور طمانیت نہیں پیدا ہوئی تھی جس سے حضور کو اُنہیں [illegible] اسی طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو کے حکم کی تعمیل [illegible] سمجھانے کے لئے انہوں نے اپنی نماز جیسی کہ چاہیئے ادا کی۔ نماز [illegible] اگرچہ [illegible] کے نزدیک فرض و واجب کا [illegible] ہے لیکن حضور نے ان سب باتوں کے متعلق بھی پوری نگرانی [illegible] کی خود نگرانی کی ہے

اور وہ بھی ایسی کڑی نگرانی ؟
تاریخ کے کسی حصہ پر نظر ڈالئے کہ ابتداء میں ان واقعات کے بیان کرنے والوں یا ان کو ریکارڈ کرنے والوں کی تعداد کیا تھی ؟ - بالفرض اگر خوش قسمتی سے تاریخ کا کوئی حصہ ایسا بھی مل جائے جسے ہم چشم دید گواہوں کا بیان قرار دے سکیں اور اسی کے ساتھ یہ بھی مان لیا جائے کہ ہمیں ان کی دماغی اور اخلاقی منزلت کا بھی کسی نہ کسی ذریعہ سے علم حاصل ہو گیا ہو پھر بھی ایسے راویوں کی تعداد بمشکل ایک دو سے زائد ہو سکتی ہے - اخلاقی اطمینان کے باوجود ایک شخص دماغ پر نسیان اور بھول چوک جس حد تک اثر انداز ہو سکتی ہے ظاہر ہے -
ان حالات میں تاریخ کے اس نادرہ روزگار حصہ "حدیث" پر نظر ڈالئے - جن چشم دید گواہوں اور عینی شاہدوں کے بیانات سے یہ واقعات حاصل کئے گئے ان کی تعداد کیا تھی ؟

علی بن ابی زرعہ جو فن رجال کے بڑے مشہور ائمہ میں ہیں انہوں نے فرمایا:

"حضرت ؐ کی وفات ہوئی اس وقت ان لوگوں کی تعداد جنہوں نے حضور ؐ کو دیکھا اور آپ ؐ سے سنا تھا ایک لاکھ سے زیادہ تھی - ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، سب حضور ؐ سے سن کر اور دیکھ کر روایت کرتے تھے -"

حدیث کے تاریخی راویوں کی تعداد لوگ سنتے ہیں اور گذر جاتے ہیں لیکن مقابلہ سے بات سمجھ میں آتی ہے - کہاں تاریخ کے ابتدائی راویوں کی تعداد دو تین سے آگے نہیں جاتی بلکہ بڑے بڑے مذہبی استنادات جن پر کروڑوں انسان ایمان لائے ہوئے ہیں ان کا بھی یہی حال ہے - مختلف انجیلوں کے ابتدائی راوی ایک لوقا یا ایک مرقس تھا یا ہندوؤں کی مشہور کتاب گیتا کا تنہا راوی سری کرشن کا گاڑی بان سنجے ہے اور حدیث کے بیان کرنے والے ایک لاکھ سے زائد چشم دید گواہ ہیں -

ایک اہم بات تو یہ ہے کہ چند آدمیوں سے اتنے واقعات کا احاطہ ہونا ناممکن ہے جو مشاہدہ کرنے والوں کی کثرت میں ممکن ہے - ان مشاہدین میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی شامل ہیں جس سے حضور ؐ کی زندگی کا ہر پہلو جلوت کا ہو یا خلوت کا، کسی کو راز میں نہیں رکھا گیا اور آج دوست ہی نہیں دشمن بھی اس امر کے اعتراف پر مجبور ہیں۔ صحابہ کرام ؓ جو دیکھتے اور سنتے دوسروں سے بیان کر دیتے - جلیل القدر اصحاب باہم ایک دوسرے سے حضور ؐ کی حدیث پوچھتے - اس طرح ہر ایک اپنی کمی دوسرے کے علم سے پوری کر لیتا

عرب کا عام طریقہ تھا کہ زبانی یاد رکھنے کی کیونکہ ان کی فطری عادت سی تھی اس بات میں ان کو خاص خصوصیت حاصل تھی۔ قاعدہ ہے کہ انسان اپنی جس قوت کو زیادہ استعمال کرتا ہے اس میں جلا پیدا ہو جاتی ہے۔ عرب حافظہ کی قوت میں خصوصیت رکھتے تھے۔ ان میں بعض صرف ایک دفعہ سن کر لوگوں کے اشعار یاد کر لیا کرتے تھے۔

ابن عباس رضؓ کے متعلق مشہور ہے کہ ان کے سامنے عمر ابن ابی ربیعہ شاعر آیا اور ۸۰ شعر کا ایک طویل قصیدہ پڑھ گیا۔ شاعر کے جانے کے بعد ایک شعر کے متعلق گفتگو چلی۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ مصرع اس نے یوں پڑھا تھا۔ مخاطب نے پوچھا کیا پہلی دفعہ میں پورا مصرعہ یاد رہ گیا فرمایا ہو تو پورے ستر شعر سنا دوں اور سنا بھی دیا۔ علاوہ اس کے کہ عرب کا حافظہ قدرتی طور پر غیر معمولی تھا، یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ قرآن مجید کے متعلق جس نے "انا له لحافظون" کا اعلان کیا تھا اسی نے قرآن کی عملی شکل یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی حفاظت جن کے سپرد کی تھی ان کے حافظوں کو غیبی تائید کے ذریعہ غیر معمولی طور پر قوی تر کر دیا تھا۔

اس طرح جن واقعات اور حالات اور جن اقوال و ملفوظات کا ظہور آنحضرتؐ سے ہوا تھا صحابہ کرام اپنے اپنے علم کی حد تک آنحضرتؐ کے زندہ مثنیٰ بنے ہوئے تھے اور اس طرح تاریخ کی وہ کتاب یعنی حضورؐ کی زندگی عہد صحابہ میں بجائے ایک نسخہ کے ہزاروں نسخوں کی صورت میں موجود ہو چکی تھی۔ پس تدوین حدیث کی پہلی صورت تو خود صحابہ کرام کی زندگی تھی اور یہ تھی حفاظت حدیث یا اس تاریخ کے محفوظ کرنے اور ہونے کی پہلی صورت۔ گویا صحابیؓ دراصل حدیث کا ایک نسخہ یا موجودہ اصطلاح میں "ایڈیشن" کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں بعض "ایڈیشن" بہت زیادہ کامل اور حاوی تھے اور بعض میں وہ کاملیت نہیں پائی جاتی تھی۔

حدیث کا بہت بڑا حصہ متواتر ہے۔ قرآن کے بعد ہم جس چیز کو بغیر کسی تذبذب کے آنحضرتؐ کی ذات مبارک کے ساتھ منسوب کر سکتے ہیں۔ وہ حضورؐ کے افعال اور اقوال و تقریرات کا یہی حصہ ہے جو ہم تک تعامل و توارث کے ذریعہ پہنچا ہے۔ صحابہ سے روایت کرنے والے حتی الوسع اس کی کوشش کرتے تھے کہ ایک ہی روایت جن جن صحابیوں سے سننا ممکن ہو انہیں سے کی سنی جائے۔ ایک مشہور حدیث "إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ"

(۳۰) طریقوں سے مروی ہے یعنی حدیث ایک ہے لیکن اس کی سندیں (۳۰۰) ہیں۔
غیر متواتر حدیثوں کا بھی جو ذخیرہ موجود ہے زیادہ تر ان میں ایک ایک حدیث کے اوسطاً آٹھ آٹھ
دس دس صحابی ہیں۔ آج متعدد کتابیں موجود ہیں جن میں ہر حدیث کے تمام اسناد ایک
جگہ جمع کر دیئے گئے ہیں۔

حدیث کی کتابی تدوین کا آغاز کب ہوا؟ اوپر لکھے ہوئے حالات کے پیش نظر
اس کی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ فقہ اور حدیث کے مشہور امام اوزاعی نے فرمایا ہے:

"حدیث کا علم بہت ہی قیمتی اور شریف اس وقت تک تھا جب لوگ
منہ سے حاصل کیا جاتا تھا۔ لوگ باہم ملتے جلتے رہتے تھے اور آپس میں
اسی کا مذاکرہ کرتے رہتے تھے لیکن جب سے حدیثیں کتابوں میں درج ہو گئیں
اس کا نور اور اس کی رونق جاتی رہی اور ایسے لوگوں میں پہنچ گیا
جو اس کے اہل نہیں۔"

ویسے یہ ثابت ہے کہ جس زمانہ میں زبانی مذاکرہ ہوتا تھا اس وقت بھی حدیثیں
ضبط تحریر میں آ چکی تھیں۔ محدثین لکھتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رض کی حدیثوں اور مرویات کی تعداد
پانچ ہزار تین سو چوہتر ہے اور ایک ذریعہ سے نہیں بلکہ مختلف ذرائع سے یہ ثابت ہے کہ حضرت
ابوہریرہ رض خود اپنی یادداشت کے لئے بھی اپنی روایت کردہ حدیثوں کو کتابی شکل میں لے آئے تھے
حضرت ابوہریرہ رض کے مشہور شاگرد بشیر بن نہیک سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے استاد سے
جو حدیثیں سنیں ان سب کو لکھ لیا بعد میں ان کے سامنے پڑھا اور آخر میں کہا کہ یہ سب حدیثیں
ان سے سن کر لکھی ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رض کے دوسرے شاگرد ہمام بن منبہ نے بھی حدیثوں کو
جمع کیا جو صحیفہ ہمام رح کے نام سے مشہور ہے۔ امام احمد حنبل رح نے اس کتاب کا بڑا حصہ اپنی
مسند میں داخل کر دیا ہے۔ امام بخاری رح نے حضرت ابوہریرہ رض کے شاگردوں کی تعداد آٹھ سو بتائی ہے،
کون کہہ سکتا ہے کہ کتنے شاگردوں نے حدیثوں کو قلمبند کیا ہوگا۔

عبداللہ بن عمرو بن العاص رض کی حدیثوں کی تعداد خود حضرت ابوہریرہ رض کے بیان کے مطابق
ان کی حدیثوں سے زیادہ اور کثیر ہے۔ یہ خود براہ راست آنحضرت ص کے حکم سے آپ کی حدیثیں
لکھا کرتے تھے۔ خود حضرت عبداللہ بن عمرو رض فرماتے ہیں:

"میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا وہ سب کچھ جو آپ سے سنتا ہوں لکھ لیا کروں؟

حضورؐ نے فرمایا "ہاں"۔ میں نے عرض کیا کہ "خوشی اور غصہ دونوں حالتوں کی باتوں کو لکھ سکتا ہوں؟" آپؐ نے فرمایا "ہاں! کیونکہ میں ان سب حالتوں میں حق کے سوا کچھ نہیں بولتا۔"

محدثین میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی یہ کتاب "صحیفہ صادقہ" کے نام سے مشہور ہے، ور اکثر کتابوں میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔

ان کے علاوہ حضرت انسؓ، حضرت جابرؓ اور کئی دوسرے راویوں نے بھی اپنی حدیثیں قلمبند کیں۔ اس طرح خود حیات مبارکہ ہی میں حدیثیں کتابی صورت میں جمع کی جا چکی تھیں۔ عہد نبوت کے بعد عہد صحابہ میں تدوین کتب جاری رہی پھر خلافت راشدہ ہی کے آخری دور میں آنحضرتؐ کی طرف جھوٹی حدیثوں کے منسوب کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے جس نے حضرتؐ کی طرف جھوٹی بات منسوب کی وہ عبداللہ بن سبا تھا۔ غرض سبائیوں کی پھیلائی ہوئی روایتوں کی وجہ سے "درایت" کے اصول وضع کئے گئے اور حدیثوں کی درجہ بندی کی جا کر ہیں صحاح ستہ میں جمع کر دیا گیا۔ حنفی فقہ اور مسلک کو واضح کرنے والی حدیثیں منتخب اور ایک جگہ جمع کرنے کا کام حضرت عبداللہ شاہ صاحب قبلہ نے کیا۔ "زجاجۃ المصابیح"۔ اس کا اردو ترجمہ اور تشریح "نور المصابیح" کے نام سے دستیاب ہے جو قرآن کو سمجھنے اور عوام کی رہبری یت میں ممد و معاون ہے۔

▫▫

انبیاء و اولیاء

(علامہ اقبالؒ)

جاوید نامے

مصطفیٰؐ اندر حرا خلوت گزید — مدتے جز خویشتن کس را ندید

(حضرت محمد مصطفیٰؐ نے غار حرا میں تنہائی اختیار کئے اور آپ نے ایک عرصہ تک کسی شخص کو نہ دیکھا)

نقش ما را در دل او ریختند — ملتے از خلوتش انگیختند

(تب، ملت کی بھلائی کا نقشہ ان کے دل میں بھر دیا گیا اور ان کی تنہائیوں سے ایک ملت بر آمد کی گئی)

می توانی منکر یزداں شدن — منکر از شان نبیؐ نتواں شدن

(خدا کے وجود سے انکار کر سکتا ہے کہ وہ ظاہر نہیں ہے، لیکن نبیؐ کی شان سے انکار نہیں کر سکتا کہ اظہر من الشمس ہے)

از کم آمیزی تخیل زندہ تر — زندہ تر، جوئندہ تر، پائندہ تر

(خلوت (تنہائی) سے تخیل کی پرواز بڑھ جاتی ہے، بلند پروازی زیادہ متلاشی ہوتی ہے اور یوں پایہ پائیدار بھی)

دل اگر بندد بہ حق پیغمبری ست — ور ز حق بیگانہ گردد کافری ست

(ہر دل خدا کی طرف مائل ہو تو الہام و پیغام الٰہی کی آماجگاہ بن جائے اور یہی پیغمبری ہے۔ لیکن اگر حق سے بیگانہ وش زندگی گذارے تو نتیجہ خدا کے وجود سے انکار کے سوا کچھ نہیں اور یہی کافری ہے۔)

صد جہاں پیدا دریں نیلی فضاست — ہر جہاں را اولیاء و انبیاء ست

(اس حد نظر تک پھیلی ہوئی نیلی فضا میں سینکڑوں عالم موجود ہیں اور ہر عالم میں اولیاء و انبیاء ہیں)

نیک بنگر اندریں بود و نبود — پے بہ پے آید جہاں ہا در وجود

(اس فنا و بقا کے زندہ ڈرامہ پر غور کیجئے تو معلوم ہو کہ یہاں ہر لمحہ سینکڑوں عالم وجود میں آتے رہتے ہیں)

ہر کجا ہنگامہ عالم بود — رحمۃ للعالمینے ہم بود

(دنیا کی بوقلمونی کے لئے ہر آن نئی شان کا ہنگامہ ضروری ہے، لیکن مصائب سے گھبرانے والوں کے دل دہی کے لئے اقبال کہتے ہیں کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سہارے کیلئے موجود ہے۔)

خلق و تدبیر و ہدایت ابتداست — رحمۃ للعالمینے انتہاست

(مولانا روم کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ تخلیق کائنات تدبیر عالم و ہدایت انسانی سب کی انتہا ذات رحمت عالمؐ ہی ہے)

ڈاکٹر حسن الدین احمد

سلطان العلوم اور ان کی علمی خدمات

تاریخ عہد قدیم میں دکن کی تہذیب ہندوستان کی تہذیبوں کا سنگم رہی اور عہد وسطیٰ میں ہندی اور ایرانی، ترکی اور عربی تہذیبوں کا امتزاج رہی۔ اس میں ایسے رنگ برنگی اور خوشبودار پھول کھلے کہ باغ عالم نے کم کم دیکھے ہوں گے۔ دکن کی تہذیب ہر زمانہ میں نظر افروز رہی لیکن دور عثمانی میں علم سے منور ہو کر اس کی شعاعیں ایسی پھیلیں کہ اس نے بیرونی دنیا کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ عہد عثمانی کی تہذیب سے استفادہ کی ضرورت جتنی آج ہے، کبھی نہ تھی۔ اس تہذیب کے ہر شعبہ میں ایک سلیقہ تھا۔

دور حاضر کا المیہ ہے کہ نوجوان نسل احساس زیاں سے محرومی کے مرض میں مبتلا ہے۔ تو ہمیں اس طرز عمل سے حیدرآباد کی تہذیب خاص طور پر متاثر ہوئی۔ دنیا کے نقشہ سے ریاست حیدرآباد کا غائب ہو جانا میرے نزدیک کوئی المیہ نہیں ہے کیونکہ انقلاب فطرت کا قانون ہے۔ منشائے ایزدی یہی ہے کہ زمانہ کو انسانوں کے درمیان گھمایا جاتا ہے لیکن چونتیس سال کے عرصہ میں عہد عثمانی کی تہذیب کی خوبیوں کا ذہنوں سے فراموش ہو جانا یقیناً ایک المیہ ہے۔

ایک اجنبی ماحول میں جب کہ دور عثمانی کی تہذیب کے تعلق سے نہ صرف عدم واقفیت بلکہ طرح طرح کی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ سمجھنا کہ آج اس کی اچھائیوں کو جذب کر لیا جائے گا، ایک ناممکن العمل بات معلوم ہوتی ہے۔ صاف گوئی کہتی ہے کہ جو نہ ہو سکے اس کی ہوس کیوں کی جائے لیکن اپنے ملک اور اپنی قوم کی تہذیب کو سنوارنے کا شوق جواب دیتا ہے کہ مجھ سے تو نہیں ہو سکتا کہ میری آنکھوں نے میر عثمان علی خاں کے دکن کی قبائے تہذیب میں ٹنکے ہوئے جو ہیرے دیکھے ہیں انہیں موجودہ تہذیب کے دامن میں ٹانک نہ دوں۔ کیا عجب کہ کبھی کسی اہل نظر کو کہیں ان کی اصل چمک دمک کا کچھ نہ کچھ احساس ہو جائے۔

وطن دوستی اور مسلک انسانیت کا تقاضہ ہے کہ ماضی کی ان روایات سے جو یقیناً

عزیز باغ - نور خاں بازار - حیدرآباد

تی دیکھنے کے لائق ہیں موجودہ اور آنے والی نسلوں کی کردار سازی کا کام لیا جائے اور نئے ہندوستان
ے تہذیبی اور ثقافتی ارتقاء میں ان مسالوں کا استعمال کیا جائے۔

قدیم حیدرآبادی تہذیب میں وہ خزانہ موجود ہیں جن کی نئے دور کو حاجت ہے۔ اس بات
کو نئے ہندوستان کے عظیم معمار پنڈت جواہر لال نہرو نے نہ صرف پوری طرح محسوس کیا بلکہ اس خواہش کا
اظہار بھی کیا کہ اس تہذیب سے استفادہ کرنا چاہیئے۔ یہ نئے ہندوستان کی خوش قسمتی ہوگی کہ اس کی
تعمیر میں قدیم روایات، تہذیب، اعلیٰ اقدار اور اصولوں سے استفادہ کیا جائے۔

یہ ایک قومی فرض ہے کہ دور عثمانی کے اچھے اقدار اور قابل تقلید کارناموں کو اپنے ہم وطنوں تک
اور دیگر اضلاع ہند تک پہنچایا جائے تاکہ ہماری عظیم میراث کو ضائع ہونے سے بچایا جا سکے اور آنے والی
نسلوں کے لئے ایسا مواد مہیا کیا جا سکے جو ان کے لئے نشان راہ کا کام دے۔

"نہ سر پر تاج سلطانی، نہ لباس پر زر و جواہر کی تابانی، نہ رخ پر دبدبہ تاجداری
نہ چتون پر شکوہ شہریاری۔ خاکساری کا پیکر، انکساری کا مرقع" [1]

یہ تھے گوشت پوست کے میر عثمان علی خاں۔

وہ اپنے دور میں دنیا کے متمول ترین انسان تھے لیکن سادگی ایسی تھی جسے دیکھ کر ملوکیت
کے ماتھے پر پسینہ آجائے۔ ان کے مزاج کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایسے دور میں جب کہ
ان کا کہا قانون تھا اور ان کا حکم مثل قضا و قدر تھا انہوں نے اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے خود کو
مطلق العنان بادشاہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عام انسان کی حیثیت سے پیش کیا۔ اپنی انسانیت
اور اعلیٰ ظرفی کا اپنے خاص انداز سے وقتاً فوقتاً اظہار کیا۔

۱۹۳۴ء کے ایک فرمان میں تحریر کیا :-

"بحیثیت رئیس میں ایک دوسرا مذہب بھی رکھتا ہوں جس کو صلح کل کے نام سے
موسوم کیا جاتا ہے کیونکہ میری حکومت میں مختلف مذاہب کے لوگ بستے ہیں،
اور ان کے معابد کی نگرانی میرے آئین سلطنت کا وطیرہ رہا ہے۔"

۱۹۳۵ء میں محبوب الہیؒ کی بارگاہ پر حاضری دی۔ اس کے بعد بغرض ادائی نماز مسجد گئے
تو ایک شاعر نے قصیدہ سنانا چاہا تو حضور نظام نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ :

---

[1] وحیدہ نسیم - جامعہ عثمانیہ اور خواتین - ارمغان جشن طلائی جامعہ عثمانیہ مرتبہ انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ

"مسجد میں بندہ کی عظمت کبھی بیان نہ ہونی چاہیئے۔" [1]

حضرت خواجہ بندہ نواز کے عرس کے موقع پر گلبرگہ گئے تو درگاہ شریف کی سیڑھیوں کے پاس گارڈ آف آنر کا انتظام تھا۔ حضورِ نظام نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ :

"یہاں ہم خود سلام کو آئے ہیں"

ایک دفعہ مجلسِ وعظ میں تشریف لے گئے تو واعظ نے سلام بجا لایا۔ حضورِ نظام نے ٹوکا

"آپ منبرِ رسولؐ پر تشریف رکھتے ہیں ...... سلام مجھ پر واجب تھا۔"

میلاد النبیؐ کے ایک جلسہ میں پہنچے تو مقرر نے للکارا :

"اے محمدِ عربیؐ نے تاج پوش غلام سن اور مجھ سے سن کر آئینِ جہانبانی کیا ہے"

اپنے محل میں پہنچتے ہی مقرر کو بہادر یار جنگ کے خطاب سے نوازا۔

ان کے ایک عہدہ دار نے ان کے نام ایک طویل تحریر لکھی جس کے چند اجزاء درج ذیل ہیں

"اس نعمتِ عظمیٰ کو اپنے اسلاف اور قبلہ گاہی کے قدم بقدم خدا کے شکر کے ساتھ نباہتے چلیئے ورنہ خطرناک دن دیکھنا پڑے گا...... جو کچھ آپ کر رہے ہیں ادباً عرض ہے کہ غلط کر رہے ہیں ..... کوئی آپ کا دشمن نہیں ہے۔ یہ دولتِ بے مصرف آپ کی خطرناک دشمن ہے اس کو صرف فرما دیجئے ...... میرے اس عریضہ پر التفات نہ فرمایا جائے تو ظلِ اللہ کے سکوت کو اجازت تصور کروں گا، جو نالاں اور پریشان ہیں ان کا حصہ بد تنخواہ میں انتظام کروں گا۔"

حضورِ نظام نے اس معروضہ کو حرف بہ حرف پڑھا - بار بار پڑھا اور سکوت اختیار کیا

رائے مرلیدھر صدر المہام صرفخاص نے اپنے الٹی میٹم کے بموجب ملازمین صرفخاص کی تنخواہوں کا بقایا تقسیم کر دیا۔ چند روز بعد حضورِ نظام نے رائے مرلیدھر کو بلا کر حسبِ معمول کام لینا شروع کر دیا، گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

عفو و درگذر ان کے کردار کی نمایاں خصوصیت تھی۔ اپنے دورِ حکومت میں کسی کو پھانسی کی سزا نہیں دی۔ جو مقدمات اس سزا کی سفارش کے ساتھ ان کے پاس پیش ہوئے ان کو حبسِ دوام میں تبدیل کر دیا۔

---

[1] مملکتِ آصفیہ - ناشر ادارہ محبانِ دکن - ۱۹۸۰ء صفحہ ۱۹۸

ایک دفعہ جب بکری کا بچہ ان کی موٹر کی زد میں آگیا تھا تو اس کو گھر لاکر اپنی ذاتی نگرانی میں اس کی تیمارداری کی ۔

ایک دفعہ جب اپنی بیوی کے علاج کے سلسلے میں دواخانہ گئے تو ایک مہاراشٹرین لڑکے نظر پڑی جس کا بایاں پاؤں کٹا ہوا تھا ۔ اس سے استفسار کرکے اس کے لئے مصنوعی پیر کا انتظام کروایا ۔ جب معلوم ہوا کہ حیدرآباد میں اس سلسلے میں سہولتیں نہیں ہیں تو کثیر رقم اپنے قائم کردہ ٹرسٹ سے صرف کرکے آرتھوپیڈک اسپتال قائم کیا ۔

۱۹۱۱ء سے جب کہ وہ تخت نشین ہوئے حتی الامکان ملک کی بنی ہوئی اشیاء استعمال کیں اور ملکی مصنوعات کی سرپرستی کی ۔ ایسے دور میں جب کہ دوسری ریاستوں کے حکمران ملک کا روپیہ غیر ممالک میں بے دریغ خرچ کر دیتے تھے ۔ انہوں نے کفایت شعاری کی زندگی بسر کی اور اپنی پس انداز کی ہوئی دولت آزادی ہند کے بعد ترقیاتی منصوبوں میں لگائی ۔

اپنے ملازمین ، خدمت گاروں اور وابستگان کے لڑکوں کو اپنی نگرانی میں لے کر پرورش کرتے تھے اور ذاتی توجہ سے ان کی تربیت کرتے تھے ۔ جب ایک بااقتدار شخصیت نے اس پر اعتراض کیا تو نہایت اعتماد کے ساتھ جواب دیا کہ دوسرے حکمراں گھوڑے اور کتے پالتے ہیں تو آپ اعتراض نہیں کرتے ، میں انسانوں کے بچوں کی پرورش کرتا ہوں اور اپنی مرضی سے ان کی تربیت کرتا ہوں تو آپ نکتہ چینی کرتے ہیں ۔

اقتدار کے ہاتھ سے جانے کے بعد انسان کا کیا ردعمل ہوتا ہے اس سے اس کی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ جب ۱۹۷۷ء میں جنتا پارٹی برسراقتدار آئی تو محترمہ اندرا گاندھی نے سنجیدگی رفتار اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا جس سے ان کی عظمت کا اظہار ہوا ۔ اورنگ زیب نے گولکنڈہ فتح کیا اور مغل افسر مختار خاں اور روح اللہ خاں ابوالحسن تانا شاہ کو گرفتار کرنے قلعہ میں داخل ہوئے تو اس وقت ابوالحسن نے نہایت خاطر جمعی اور استقلال کا اظہار کیا اور شاہانہ وقار میں کوئی فرق نہ آنے دیا ۔ ابوالحسن کے خدوخال اور بیان سے ذرہ برابر انتشار ظاہر نہیں ہوا ۔ اسی طرح اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں نے پولیس ایکشن کے بعد بحیثیت راج پرمکھ اپنے آپ کو نہایت خوبی سے ایڈجسٹ Adjust کیا اور اس کے بعد ایک معمولی شہری کی حیثیت سے خاموش لیکن مفید اور مصروف زندگی بسر کی ۔ کبھی ان کے استقلال اور روایتی اطوار میں کوئی فرق نہ آیا ۔

دور عثمانی کی برکات میں ایک بات یہ بھی تھی کہ اس دور میں خواہ امیر خواہ غریب

سب کو اطمینان کی دولت نصیب تھی ۔ آج ملک آزاد ہے ۔ زندگی کے ہر میدان میں ترقی کا خاطر خواہ وسائل کی فراوانی ہے لیکن روشنی جیسے دل کا چین کہیں کم ہے ۔ شعر

شمعیں تو جل رہی ہیں سو بزم میں روشنی نہیں

اگر یہ صحیح ہے کہ حکمران کی نیت اور رجحان کے بموجب اہل ملک کو سکون و راحت میسر آتی ہے تو اپنے دور کی خوشحالی کا سہرا نواب میر عثمان علی خاں کے سر رہے گا اور اسی خوشحالی اور سکون و چین کے ماحول میں علم و ادب کو دکن میں فروغ ہوا ۔

نواب میر عثمان علی خاں کے خاندان کا سلسلہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ کے توسط سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے ۔

ان کے جد اعلیٰ حضرت مغفرت مآب نظام الملک چین قلیچ خاں نواب میر قمر الدین خاں آصف جاہ اول دکن کے صوبیدار تھے ۔ جب اورنگ زیب کے انتقال کے بعد ان کے نااہل جانشینوں کی وجہ سے سلطنت مغلیہ کمزور ہوئی تو اٹھارویں صدی عیسوی کے اس لائق مدبر نے دکن میں اپنے اقتدار کو سنبھالے رکھا اور ۱۷۲۴ء میں خود مختار ہونے پر بھی خود کو مغلیہ سلطنت کا صوبیدار ہی تصور کیا اور سلطنت دہلی سے تعلق برقرار رکھا ۔

جب شہر دہلی میں نادر شاہ پر تیر اڑ کیا گیا تو وہ برہم ہو کر سنہری مسجد کے صحن میں تلوار کھینچ کر بیٹھ گیا ۔ فوجی سپاہیوں نے جی بھر کر دہلی کو لوٹا ، بازاروں کو آگ لگا دی اور قتل عام شروع ہوا ۔ محمد شاہ رنگیلے کی ایما پر نظام الملک برہنہ سر گلے میں شمشیر حمائل کئے ہوئے نادر شاہ کے سامنے جا کر خاموش کھڑے ہو گئے ۔ نادر شاہ نے دریافت کیا " کیا چاہتے ہو " تو انہوں نے حافظ شیرازی کا شعر پڑھا ؎

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی

مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

آصفجاہ کی شخصیت نے نادر شاہ کے دل پر جادو کا اثر کیا اور اس نے " بہ ریش سفید ت بخشیدم " کہہ کر تلوار کو نیام کروایا اور قتل عام رک گیا ۔ جب نادر شاہ دہلی سے واپس جا رہا تھا تو اس نے نظام الملک کو سلطنت دہلی یہ کہہ کر پیش کی کہ " تم ہی اس کے مستحق ہو " ۔ عالی ظرف نظام الملک نے جواب دیا ۔ " ما مردم نوکر پیشہ ایم ما را از سلطنت چہ کار ، داغ نمک حرامی بر جبین اطاعت روا نمی داریم ۔ "

میر عثمان علی خاں ، غفران مکاں میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کے بڑے فرزند تھے ۵ ۔ اپریل ۱۸۸۶ء کو شہر حیدرآباد میں تولد ہوئے ۔ ان کی والدہ امتہ الزہرا بیگم اہل تشیع سے تھیں اسی تعلق سے ان کا رجحان اور میلان بھی شیعیت کی طرف تھا اپنے آپکو تفضیلی کہتے تھے

نواب میر محبوب علی خاں کو اپنے فرزند کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال تھا ۔ بچپن ہی سے مختلف فنون کی تعلیم کے لئے ملک کے بہترین افراد اتالیق اور معلم کی حیثیت سے مامور کئے گئے عربی اور دینی تعلیم مولانا انوار اللہ فضیلت جنگ بانی جامعہ نظامیہ کے تفویض ہوئی ۔ فارسی تعلیم کے لئے نواب عماد الملک اور آغا سید علی شوستری جیسے متبحر عالموں کو مقرر کیا گیا ۔ انگریزی تعلیم ایجرٹن نے دی ۔ اس بنیادی تعلیم کا اثر تھا کہ انہوں نے اردو ، فارسی ، عربی اور انگریزی میں کافی مہارت حاصل کی ۔

جانشینی کا اعلان پہلے ہی کر دیا گیا تھا اور نواب میر عثمان علی خاں کو ولی عہد مقرر کیا گیا تھا ۔ جب شعور اور ذہن پختہ ہوا تو امور سلطنت اور انتظامات مملکت سے واقفیت پیدا کرنے کے لئے یہ انتظام کیا گیا کہ محکمہ جات کے معتمدین اور ان کے مددگار سرکاری امثلہ ولی عہد کے ملاحظہ میں پیش کرتے اور دفتری کارروائیوں کے طریقوں سے واقف کراتے ۔

اساتذہ کا احترام ہمیشہ ملحوظ رکھا ۔ مولانا انوار اللہ فضیلت جنگ کے انتقال کے بعد بھی ان کا تذکرہ احترام سے کرتے ۔ جامعہ نظامیہ کے انتظام میں استاد کا قائم کردہ ادارہ سمجھ کر دلچسپی لیتے رہے ۔ نواب فصاحت جنگ جلیل کی ہمیشہ عزت و توقیر کی جن سے فن شاعری میں تلمذ حاصل تھا ۔

۱۸۹۹ء میں لارڈ کرزن وائسرائے ہند کی دعوت پر غفران مکاں نواب میر محبوب علی خاں کلکتہ گئے تو میر عثمان علی خاں جن کی عمر اس وقت چودہ سال تھی ساتھ تھے ۔

یکم جنوری ۱۹۰۳ء کو جلسہ تاجپوشی قیصر ہند ایڈورڈ ہفتم بمقام دہلی قرار پایا اس موقع پر لارڈ کرزن وائسرائے ہند نے جملہ والیان ریاست کو مدعو کیا تھا ۔ دوسرے والیان ریاست کے برعکس میر محبوب علی خاں کے سادہ لباس کو دیکھ کر لارڈ کرزن نے پوچھا :

" آپ کے جواہرات کہاں ہیں ؟ " ۔ میر محبوب علی خاں نے مسکرا کر اپنے امراء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا " میرے جواہرات یہی تو ہیں " ۔ اس سفر میں نواب میر عثمان علی خاں جن کی عمر اس وقت سترہ سال تھی اپنے والد ماجد کے ہمراہ تھے ۔

۱۹۰۰ء میں نواب جہانگیر جنگ کی دختر سے شادی ہوئی جو دلہن پاشا کے لقب سے مشہور ہوئیں۔ ان کے بطن سے دو شہزادے نواب میر حمایت علی خاں اعظم جاہ اور نواب میر شجاعت علی خاں معظم جاہ اور ایک دختر احمد النساء بیگم (شہزادی پاشا) تولد ہوئے۔ دلہن پاشا بھی شاعرہ تھیں اور اعجاز تخلص کرتی تھیں۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

کیا نبھے ان سے عشق اے اعجاز
سنگ و شیشہ میں امتزاج نہیں

۲۹ اگست ۱۹۱۱ء کو نواب میر محبوب علی خاں کا انتقال ہوا اور میر عثمان علی خاں پچیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے۔ ۸ ستمبر ۱۹۱۱ء کو بروز جمعہ صبح دس بجے شاہی جلوس پرانی حویلی سے روانہ ہوا۔ ہاتھی سرخ رنگ کی زرین جھول اور سونے چاندی کے مرصع زیورات سے آراستہ کیا گیا تھا۔ عماری کو جس میں حضور تنہا متمکن تھے نہایت عمدگی سے زرین کام سے سجایا گیا تھا۔ حضور شاہی لباس زیب تن کئے اور ہیرے جواہرات سے مزین دستار زیب سر کئے ہوئے تھے جس پر چمکدار طرہ جگمگا رہا تھا۔ حضور کشتی میں سے مٹھی بھر بھر کر رقم نکال کر حاجت مندوں کی طرف پھینکتے جاتے تھے جس میں سونے کی دو اتیاں اور چاندی کے سکے شامل تھے۔ نعرہ ہائے مسرت اور تالیوں کی گونج میں شاہی جلوس آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اسی ہاتھی پر پیچھے مہاراجہ کشن پرشاد مورچھل لئے ہوئے درباری لباس میں سوار تھے اس ہاتھی کے عقب میں کرنل افسر الملک کا ہاتھی تھا، اس کے بعد پچیس ہاتھی سجے سجائے شریک جلوس تھے جن پر امرائے عظام اور مجاز عمائد سوار تھے۔ امراء بہ سواری اسپ شریک جلوس تھے۔ یہ جلوس ایک بجے خلوت پارک میں داخل ہوا۔ ساڑھے تین بجے سے پونے چھ بجے تک دربار منعقد ہوا۔ اسی روز شام کو چومحلہ میں مغلئی دربار منعقد ہوا۔

زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی تمام شعبوں میں ذاتی دلچسپی لی اور اہم تبدیلیاں کیں کچھ عرصہ تو راست انتظام سلطنت کو سنبھالا پھر باب حکومت تشکیل دیا۔ نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ، سر علی امام، مہاراجہ کشن پرشاد، سر اکبر حیدری، حافظ نواب احمد سعید خاں آف چھتاری، سر مرزا اسمٰعیل، میر لائق علی یکے بعد دیگرے صدر اعظم رہے۔ ۱۹۴۷ء میں دستوری اصلاحات نافذ کیں اور مجلس مقننہ قائم کی۔ حکومت کے ہر شعبہ پر بذات خود نگرانی رکھتے تھے۔ نواب مہدی یار جنگ جو ایک عرصہ تک وزارت کے عہدہ پر فائز رہے کہتے تھے کہ :

"سرکار اپنی ہی حکومت کے قائد حزب الاختلاف Leader of Opposition بنے رہتے ہیں"

میر عثمان علی خاں علم و ادب کے شیدائی اور قابلیت و علمیت کا سرچشمہ تھے انہوں نے اپنی زندگی میں سرکاری سطح پر ذاتی حیثیت سے علم و ادب کی جو بیش بہا خدمات انجام دیں وہ کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ انہوں نے علم و ادب کی سرپرستی کے معاملے میں غرناطہ اور بغداد کی یاد تازہ کر دی اور اردو کو دفتری، عدالتی، ڈاکٹری اور انجنیری کی زبان بنا کر یہ ثابت کر دکھایا کہ اس کا دامن کسی غیر ملکی زبان سے تنگ نہیں ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کی تحریک ۱۸۷۵ء میں شروع ہوئی تھی۔

اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں نے سر اکبر حیدری کی عرضداشت مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۱۷ء کو منظور کرتے ہوئے ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء کو فرمان جاری کیا اور پھر ۲۲ ستمبر ۱۹۱۸ء کو وہ تاریخی فرمان جاری کیا جسے جامعہ عثمانیہ کے منشور کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اس طرح اردو زبان کو پہلی مرتبہ یہ رتبہ ملا کہ وہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قرار پائی۔ ایک کہنہ احساس کمتری کا خاتمہ ہو گیا کہ درس و تدریس ایک دیسی زبان کے ذریعے ممکن نہیں۔ تمام علوم و فنون کو جو غیر زبانوں میں مقید تھے آزاد کر دیا گیا احیائے علوم کے لئے جو کام روما میں آگسٹس نے، بغداد میں خلیفہ ہارون الرشید نے یونانی زبان سے فلسفہ اور طب کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کر کے، اندلس میں عبدالرحمٰن ثالث نے، ہندوستان میں بکرماجیت اور اکبر نے، انگلستان میں الفریڈ نے، روس میں پیٹر اعظم اور کیتھرائن نے اور جاپان میں متسو ہیتو نے کیا وہی حیدرآباد میں آصف سابع نے کیا۔ اس کی وجہ سے عام طور پر جذبات تشکر پیدا ہوئے۔ طلبائے جامعہ عثمانیہ میں حضور نظام سے والہانہ عقیدت و ارادت موجود تھی۔ طلباء برادری کو اس امر کا احساس تھا کہ حیدرآباد میں اس کو مادری زبان میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کی جو سہولتیں حاصل ہیں اور اکتساب علم اور حصول تعلیم کے دوران غیر معمولی رعایتوں سے استفادہ کا موقع عطا کیا گیا ہے اس کی تنہا ذمہ دار صرف ایک ہستی ہے اور وہ ہے ذات شاہانہ۔ اور تمام ہندوستان کی علمی دنیا میں یہ احساس تھا کہ نواب میر عثمان علی خاں کی ان عنایات کا اعتراف ہونا چاہیئے۔

جامعہ عثمانیہ کی جانب سے حضور نظام کو اعزازی ڈگری دینے کی اولین تحریک

شمس العلماء نواب عزیز جنگ ولا (۱۸۶۰ء - ۱۹۲۴ء) نے سر علی امام صدر اعظم کے آخری

زمانہ میں کی ۔ حضرت والا نے حکیم الادب کی ڈگری تجویز کی تھی ۔ اس پر کوئی پیش رفت نہ ہوئی
اور ان کو تحریری جواب ملا کہ قواعد جامعہ عثمانیہ میں ابھی تفصیل امور طے شدنی ہیں ۔ حضرت و
نے ۲۰ جنوری ۱۹۲۳ء کو اعلیٰ حضرت کی خدمت میں ایک معروضہ پیش کیا اور اپنی سابقہ تحریک
کا اعادہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس خاص کام میں سرکار کی اجازت کے بعد کوئی امر طے شدنی نہیں ہے
اور آخر میں لکھا کہ سرکار اس عرضی کو اپنی اجازت کے ساتھ سرفریدوں الملک صدر اعظم کے پاس روانہ
فرمادیں تو جامعہ عثمانیہ سالگرہ مبارک کے موقع پر جو آئندہ ماہ میں ہے "حکیم الادب" کی ڈگری پیش
کرے گا اور اس علمی ڈگری کا امتیاز اہل علم کو حاصل ہوگا ۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام نے منظوری
دی ۔ محمد احمد مفتی عدالت العالیہ ، غلام اکبر خاں اور صمد یار جنگ نے اس تحریک کو آگے بڑھایا
البتہ موخر الذکر نے تجویز کی کہ حکیم الادب سے زیادہ باوقار الفاظ ڈگری کے لئے منتخب کئے جائیں ۔
ظاہر نہیں ہوتا کہ حکیم الادب کے بجائے سلطان العلوم کے الفاظ کس نے تجویز کئے ۔ بہرحال حضرت و
کی تحریک منظور ہوئی اور مجلس رفقاء نے اعلیٰ حضرت کی علمی سرپرستی کے اعتراف میں ۲۱ رکتوبر
کو سلطان العلوم کی اعزازی ڈگری پیش کی ۔

جب تک جامعہ عثمانیہ اور اس کی خوبصورت عمارتیں باقی ہیں وہ اپنے زبان حال
اپنے موسس مربی اور سرپرست کی فیاضیوں اور نوازشات کو عالم آشکارا کرتی رہیں گی ۔

ڈاکٹر سی راجگوپال چاری نے اپنے خطبہ اسناد میں کہا تھا :-

"ہندوستان میں ایسی کوئی جامعہ نہیں ہے جس میں سائنس اور فنون میں
ڈگریوں کے حاصل کرنے کیلئے ہندی کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا ہو ..... اردو کا
نام آنے کی وجہ سے اس کارنامہ کی اہمیت کو کم کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی ۔"

جامعہ عثمانیہ کا انوکھا تجربہ امید و بیم کی فضا میں ہوا ۔ ارباب اقتدار کے دل وسوسوں
سے معمور تھے ۔ نظام کالج میں انگریزی ذریعہ تعلیم کو بھی متوازی طور پر جاری رکھا گیا جس کا الحاق
مدراس یونیورسٹی سے تھا ۔ اس کالج میں امراء ، اعلیٰ عہدہ داروں اور اونچے طبقے کے افراد
کی اولاد تعلیم حاصل کرتی تھی ۔ اس طرح جامعہ عثمانیہ کی رونق نچلا متوسط طبقہ ہی سے قائم تھی
جامعہ عثمانیہ کی تعلیمی فیس دنیا کی ساری جامعات سے کم تھی ۔ اس کے دو تہائی
کو سالانہ فیس کی رعایت حاصل تھی اور ان گنت ماہواری وظائف ملتے تھے ۔ ورنہ جامعہ
کے قیام سے قبل اعلیٰ تعلیم صرف متمول خاندانوں کی اولاد کا اجارہ تھی ۔ جامعہ عثمانیہ نے اگر ایک

علوم و فنون کو اجنبی زبانوں کی قید سے آزاد کیا، آسان افہام کیا تو دوسری طرف متوسط طبقہ اور نچلے متوسط طبقات کے لئے علم کے دروازے کھول دیئے۔

جامعہ عثمانیہ نے اپنے تیس سالہ (اردو ذریعہ تعلیم کی) زندگی میں نہ صرف اپنے مقاصد کا تعین کیا بلکہ تجربہ کے مرحلہ سے گزر کر نتائج بھی دنیا کے سامنے پیش کر دیئے ؎

پروانہ کا حال اس محفل میں ہے قابل رشک اے اہل نظر
اک شب ہی میں وہ پیدا بھی ہوا عاشق بھی ہوا اور مر بھی گیا

اپنی زندگی کے تیس سال میں جامعہ عثمانیہ نے وائس چانسلر، سائنسداں، ڈاکٹر، انجینیر، وکیل، انشا پرداز، مصنف، شاعر، ماہر مالیات و نظم و نسق پیدا کئے جن میں اکثر کل ہند اور بعض عالمی شہرت کے مالک ہوئے۔ ان ہوش ربا نتائج کی نظیر ہمیں جامعہ کے قبل حیدر آباد کی تاریخ میں نہیں ملتی

اگر اس زبان کو (جو اس وقت تک برصغیر کی واحد زبان ہے جسے ایسے تجربہ کا موقع ملا) مزید دس سال کا موقع ملتا تو ایسی زبردست ذہنی بیداری پیدا ہوتی اور ایسے شاندار نتائج برآمد ہوتے جو دنیا کو حیرت میں ڈال دیتے۔

جامعہ عثمانیہ کے ساتھ دارالترجمہ قائم کیا گیا اور وضع اصطلاحات کا تاریخ ساز کام شروع ہوا۔ ایسے افراد بھی جن کو اعلیٰ تعلیم کا موقع نہیں ملا علمی اصطلاحات سے مانوس ہو گئے۔ بقول پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم:

"جامعہ عثمانیہ کی اصطلاحات حیدر آباد میں زبان زد خاص و عام تھیں کم علم افراد اور کمسن بچے تک معاشیات، سیاسیات اور دوسرے علوم و فنون کی اصطلاحیں سمجھتے اور بلا تکلف استعمال کرتے تھے اس بات کو اک شاعر نے یوں بیان کیا ہے ؏

تجھ سے گھر گھر چراغ روشن ہے

سلطان العلوم کو صحافت سے دلچسپی تھی اور طبیعت کا میلان اس طرف تھا ایک عرصہ دراز تک اپنا نام ظاہر کئے بغیر روزنامہ "نظام گزٹ" میں مسائل حاضرہ پر تبصرہ کرتے رہے جو پہلے صفحہ پر جلی حرفوں میں شائع ہوتا تھا دوسرے رسالوں میں بھی کچھ نہ کچھ لکھتے۔ علم جغرافیہ سے نہ صرف دلچسپی تھی بلکہ اس سے واقفیت بھی عمیق تھی اسی

سرپرستی کی اور اس کو ترقی دی ۔ علوم کے دوسرے شعبوں کی حد تک یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے بحیثیت حکمراں ان امور میں دلچسپی لی لیکن طب یونانی کی حد تک ان کی دلچسپی بالکل ذاتی اور شخصی تھی ۔ انہوں نے ریاست کے ہر تعلقہ میں یونانی دواخانے قائم کئے اور شہر حیدرآباد میں صدر شفا خانہ یونانی قائم کیا ۔ طب یونانی کی تعلیم کا معقول انتظام کیا ۔ ایورویدک ، ہومیوپیتھی ، فطری علاج اور دوسرے دیسی طریقہ ہائے علاج کو آزادی ہند کے بعد تسلیم کیا گیا لیکن حیدرآباد میں سلطان العلوم نے طب یونانی کو بہت پہلے تسلیم کیا اور اس کی سرپرستی کی ۔

اردو اور فارسی میں شاعری کی ۔ ۱۹۲۳ء سے مستقل طور پر فارسی شعر کہتے تھے ۔ اردو شاعری کا سلسلہ اس سے بہت پہلے سے تھا ۔ اردو کا کلام حضرت جلیل مانکپوری (۱۸۶۶ء - ۱۹۴۶ء) کو برغرض اصلاح دکھاتے رہے ۔ جلیل صرف اس حد تک اصلاح کرتے کہ کوئی لفظ بدل دیا ۔ نفس مضمون یا خیال میں کوئی ترمیم نہ کرتے اور نہ "محلیہ استاد" کے طور پر اپنی جانب سے کسی شعر کا اضافہ کرتے ۔ یہی وجہ ہے کہ جلیل اور عثمان کے کلام کے معیار میں اور رنگ میں خاصا فرق ہے جس کی وجہ سے ویسے شبہات کی نوبت نہیں جیسا بہادر شاہ ظفر کے کلام کے تعلق سے پیدا ہوتے ہیں ۔ اور یہ کہا جاتا ہے کہ ذوق کی دین ہے

بقول برق موسوی :

"حضور نظام کے کلام میں سادگی کا حسن اور حسن کی سادگی ہے ۔ ان کا کلام ایک ہیرا ہے معدن سے نکلا ہوا ، اپنی طبعی اور فطری حالت میں"

انہوں نے کم از کم تین ہزار فارسی غزلیں کہی ہیں ۔ اردو غزلوں کی تعداد بھی لگ بھگ اتنی ہی ہوگی ۔

بقول استاد جلیل :

"قاعدہ ہے کہ جو فرمانروا شاعری کا ذوق رکھتا ہے وہ اپنے ذوق کے اعتبار سے ایک رنگ سخن قائم کر دیتا ہے اور وہی رنگ اس کے دربار کا مذاق شاعری قرار پاتا ہے ۔" [1]

---

[1] کارنامہ امیر مینائی ص ۳

بیسویں صدی کے نصف اول میں حیدرآباد علم و فن اور معیار شاعری اپنی آپ
نظیر تھا ہم اس کو بلا شبہ سلطان العلوم کی دین قرار دے سکتے ہیں۔

حضرت جلیل نے سلطان العلوم کو سلطان الشعراء کا خطاب دیا تھا۔

سلطان العلوم نے حیدرآباد کو صحیح معنوں میں ایک فلاحی مملکت بنا دیا تھا۔ آرائش بلدہ کی جانب سے مکانات تعمیر کئے جا کر نچلے متوسط طبقہ کے افراد کو بہت ہی کم کرایہ پر دئے جاتے تھے اور معمولی اقساط پر ان مکانات کو خرید ابھی جا سکتا تھا شائد اس سے قبل ہندوستان میں کہیں اور ایسی اسکیم روبہ عمل نہیں لایا گیا۔

۱۹۲۹ء میں انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ قائم کیا جس کے نتیجہ کے طور پر آلوین میٹل ورکس تاج گلاس ورکس، نظام شوگر فیکٹری، سرپور پیپر ملز جیسے صنعتی ادارے وجود میں آئے۔ سنگارینی کالریز اور نظام شوگر فیکٹری کو ملک کے اولین پبلک سکٹر کے کاروبار میں شمار کیا جا سکتا ہے

سلطان العلوم کو فن تعمیر سے خاص دلچسپی تھی۔ ان کے دور میں آرٹس کالج جامعہ عثمانیہ عدالت العالیہ، سٹی کالج، عثمانیہ اسپتال، جوبلی ہال کی عمارتیں تعمیر ہوئیں جن میں سے ہر ایک کو فن تعمیر کا شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے خصوصاً آرٹس کالج جامعہ عثمانیہ کی عمارت کو ازمنہ گزشتہ اور اسلامی ثقافت کا حسین اور کامیاب امتزاج کہہ سکتے ہیں جس میں ایلورہ اور الحمراء کی فن تعمیر کے نمونہ کو یکجا کیا گیا ہے۔

آثار قدیمہ کے تحفظ میں بھی دلچسپی لی۔ ان کے دور میں اجنتا کی نقاشی کے تحفظ کیلئے اطالوی ماہرین کی خدمات حاصل کی گئیں اور کثیر رقم خرچ کر کے عہد قدیم کے بے مثال آثار کی خاطر خواہ حفاظت کی گئی۔

۱۹۱۴ء میں حیدرآباد سیول سروس کا قیام عمل میں آیا جس کے نتیجہ کے طور پر ریاست کی اعلیٰ سرکاری خدمات کا دروازہ جو اس سے پہلے اعلیٰ خاندانوں کا اجارہ تھیں، لائق نوجوانوں کیلئے کھول دیا گیا۔

۱۹۲۱ء میں سلطان العلوم نے عدلیہ کو عاملہ سے علحدہ کر کے ایک اہم اقدام کیا۔ برطانوی ہند میں بہت بعد عدلیہ اور عاملہ کی علحدگی عمل میں آئی۔

۱۹۳۲ء میں ریلوے اور روڈ ٹرانسپورٹ کو قومیا یا گیا۔ ریاست حیدرآباد کو اس ضمن میں بھی اولیت حاصل ہے

نواب میر عثمان علی خاں نے اپنے دور حکومت میں پسماندہ طبقات کی فلاح و بہبود اور ان کی ترقی کا خاص خیال ملحوظ رکھا اور اس مقصد کیلئے کثیر رقوم کی منظوری دی

ن ن

برق رفتار کمپیوٹر

کمپیوٹر سائنس اور ٹکنالوجی کی ایک عجیب و غریب تخلیق ہے جس کا ساری انسانیت پر احسان عظیم ہے کیونکہ اس کا اطلاق آج کل ہماری روزمرہ زندگی کے ہر شعبہ میں ہو رہا ہے۔ چنانچہ طب، دفاع، تعلیم، کیمیاوی صنعت اور خلائی تحقیق وغیرہ میں کمپیوٹر کی مدد سے مشکل سے مشکل فنی مسائل بہت قلیل وقت میں حل کئے جارہے ہیں۔ لیکن انسان نے اپنی غیر قانع طبیعت کی وجہ سے اس ایجاد کی موجودہ حالت پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ آئے دن اپنے دماغی اختراع سے اس میں مزید اضافہ و ترقی کی کوشش کی ہے۔

چپاوا فال وسط مغربی امریکہ کے شہر وسکانسن کا ایک مضافاتی علاقہ ہے جہاں مکئی کی کاشت کی کثرت کے سبب یہ مقام مکئی کے کھیتوں سے گھرا ہوا ہے۔ ان ہی کھیتوں سے گھرے ہوئے ایک مکان میں ۷۰ سالہ شخص Seymour Cray سکونت پذیر ہے جو اس ماحول میں یکا و تنہا ایک غیر معمولی صلاحیت رکھنے والی مشین کی تیاری میں منہمک ہے۔ Cray نے کبھی اپنا تعارف کسی سے نہ کرایا بلکہ اپنے علحدگی پسند رجحان کے باعث بڑی بڑی نامور کمپنیوں کی ملازمت کو خیرباد کہا۔ برفانی پہاڑیوں کے ڈھلانوں پر پھسلنا اس کا پسندیدہ کھیل ہے جو ہر سال آسٹریلیا کی پہاڑیوں پر ہونے والے مقابلوں میں اپنی ناقابل تسخیر مہارت سے بڑے بڑے کھلاڑیوں کو متحیر کر دیتا ہے۔ Cray کو اکثر ان مکئی کے کھیتوں میں چند ایسے کاغذات کے ساتھ نمودار ہوتے دیکھا گیا جن پر ہندسی عبارتیں یا ریاضی کی مساواتیں درج کی ہوئی تھیں۔ وہ دراصل اپنی لیباریٹری میں سب سے زیادہ تیز رفتار کمپیوٹر تیار کرنے کی فکر میں ہے جس کی قیمت کا اندازہ ۱۵ ملین ڈالر لگایا گیا۔ Cray کی اس کوشش کے ساتھ ہی کئی لوگ اس کمپیوٹر کی خریدی کیلئے قطار میں

سائنٹسٹ۔ ریجنل ریسرچ لیباریٹری۔ حیدرآباد

باری کے منظر نظر آنے لگے ہیں۔ ایک ایسی ہی مشین واشنگٹن (امریکہ) میں دفاعی امور
رفع رسانی کے محکمہ جات میں ایک عرصے سے استعمال کی جا رہی تھی۔ لیکن Crey کی
نئی مشین ہے۔ Crey کو دوسری تمام مشینوں پر برتری حاصل رہے گی کیونکہ یہ مشین
سکنڈ میں کوئی دو ہزار ملین حسابات کر سکے گی چنانچہ جاپان سے Crey کو یا پھر امریکہ کو
خطرہ لاحق ہو گیا کیونکہ جاپان نے ۲۰۰ ملین ڈالر Crey سے مشابہ مشین کی تیاری پر
دیا ہے۔

Crey سنکی طبیعت کا مالک ہے جس کا پتہ اس واقعہ سے چلتا ہے کہ اس نے کشتیاں
بیں جب کشتی رانی کا موسم ختم ہوا تو اس نے ان کشتیوں کو نذر آتش کر دیا تاکہ اس کو
کشتیوں کے نئے ڈیزائن تیار کرنے کا موقع فراہم ہو سکے۔

۱۹۵۰ء کے اوائل میں Crey نے ریاضی اور الیکٹریکل انجینیئرنگ کی ابتدائی تعلیم کے حصول
خاطر منی سوٹا (Minnesota) یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تاکہ یہ بنیادی تعلیم ایسی مشین کی
ری میں مدد و معاون ثابت ہو سکے جو ایک سکنڈ میں ۲۰۰ ملین حسابات کر سکے جس کا خاکہ
س کے دماغ میں ایک عرصے سے ہے لیکن دوران تعلیم کسی سخت نکتہ چینی کے باعث اس نے
تعلیم ترک کر دی۔ اس کے بعد اس نے فرانک نارسس (Frank Norsis) اور دیگر نوجوان صنعت
روں کی مدد سے کنٹرول ڈاٹا کارپوریشن Control Data Corporation کا قیام عمل میں لایا
اور ۱۹۶۹ء میں اس نے سوپر کمپیوٹر ۳۶ تیار کیا جس کی ضرورت ایک عرصے سے سائنسدان محسوس
کر رہے تھے لیکن ۱۹۷۲ء میں Cray نے کنٹرول ڈاٹا کارپوریشن سے کنارہ کشی اختیار کی کیونکہ
وہ دوسروں سے رقم مستعار لے کر سرمایہ بڑھانے کے اصول کو ناپسند کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے
اپنی ذہانت اور زندگی کا بیمہ کروا کر Crey Research قائم کیا۔ اور تحقیقی کاموں کو ترقی دی
یہ بیک وقت ایک مشین کو تیار کر کے اس کو فروخت کرنے پر زور دیتا ہے کیونکہ اگر موجودہ مشین
میں کوئی ترمیم یا اضافہ ہو تو پرانی مشینیں بیکار نہ ہوں۔

۱۹۷۵ء میں Crey کی ملاقات اتفاقاً جان Rollwagon کے ساتھ ایک طیارہ
پر ہوئی۔ یہ شخص نہ صرف ایک بہترین انجینیئر تھا بلکہ اس نے ہارورڈ یونیورسٹی سے بزنس کی ڈگری
بھی حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ وہ انٹرنیشنل ٹائم سروس کا نائب صدر بھی تھا Rollwagon
کی فنی اور تجارتی صلاحیتوں کے اس امتزاج نے Crey کو بہت متاثر کیا چنانچہ اس نے

Rollwagon کو اپنے ساتھ کام کرنے کے لئے رضامند کر لیا۔ آج Rollwagon "کرے ریسرچ" کا نہ صرف صدر ہے بلکہ چیف ایگزیکٹیو بھی۔ اب کرے کی حیثیت ایک مشیر کی ہے جو کافی تنخواہ پر کام کرتا ہے۔ اس نے ذہین انجنیروں کی ایک جماعت کو تمام ذمہ داریوں کے ساتھ ایک مخصوص پراجیکٹ پر کام پر لگا دیا Grey کا پہلا کمپیوٹر Grey-1 ۱۹۷۶ء میں Los Almos (نیو میکسیکو) کی قومی لیبارٹری نے خرید لیا کیونکہ اس کمپیوٹر میں یہ خوبی ہے کہ اس کی مدد سے زیر زمین جوہری دھماکہ کے بغیر تابکاری اثرات کی پیش قیاسی کی جاسکتی ہے۔ یہ کمپیوٹر اتنا مقبول ہوا کہ سائنسدانوں نے اس کو مختلف محکمہ جات میں نصب کرنے کی سفارش کی چنانچہ کیلیفورنیا کی لیبارٹری Lawrence Livermore میں ۴ ایسے کمپیوٹر نصب کئے گئے۔ اس کے علاوہ نیشنل ریسرچ سنٹر برائے جوہری تحقیق (کولوریڈو) میں دو۔ نیشنل ایروناٹکس اور خلائی تحقیق کے محکمہ جات میں ایک ایک کمپیوٹر کی تنصیب عمل میں آئی Grey Research کا شمار ملازمت کے مواقع فراہم کرنے کے اعتبار سے امریکہ کے دوسرے بڑے سنٹر میں ہوتا ہے جس کی عمارت چپاوا فالس کے مشرقی حصہ کی تین بڑی عمارتوں میں سے ایک ہے جہاں عورتیں آسمانی کوٹ میں ملبوس خوردبین کا استعمال کرتی ہوئی کمپیوٹر کی تیاری میں مصروف نظر آتی ہیں۔ ایک اندازہ کے مطابق کمپیوٹر کی تیاری میں کوئی ساٹھ لاکھ ٹانکے Solder لگانے پڑتے ہیں۔ عموماً ایک کمپیوٹر کے لئے ۱۱۲ کیلومیٹر طویل برقی تار درکار ہوتا ہے جس کی تنصیب کوئی بارہ ہفتوں میں مکمل ہوتی ہے۔ کمپیوٹر تیار ہونے کے بعد اس کی جانچ کے لئے ۸ ہفتہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اوسطاً ہر ماہ ایک کمپیوٹر کی نکاسی عمل میں آتی ہے۔

Grey Research میں برق رفتار اور کئی خوبیوں کے کمپیوٹر تیار ہو رہے ہیں جن سے مقابلہ کا تصور بھی ناممکن ہے کیونکہ یہاں تجربہ کار، ذہین اور ماہر انجنیر کام کرتے ہیں چنانچہ تائیوان کے ایک انجنیر Steve Shyh-Shing Cheu نے Grey کے تعاون اور رہبری کے بغیر Grey X-MP کمپیوٹر تیار کر دیا جو Grey-1 کمپیوٹر کے مقابلہ میں ۳ گنا تیز رفتار اس کمپیوٹر کو ہالی وڈ نے ایک کروڑ ۲۶ لاکھ ڈالر میں خرید لیا جس کی مدد سے عظیم اداکاروں کو فلم میں لڑنے کی تربیت دی جاتی ہے۔

اس چھوٹے سے ادارہ کی ترقی کا راز صرف کمپیوٹر کی غیر معمولی صلاحیت اور خوبی میں مضمر ہے جس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ کسی مسئلہ کے حل کی رپورٹ ایک عام کمپیوٹر سے ایک کتاب پر مشتمل ہوتی ہے جبکہ Grey کے کمپیوٹر سے اسی مسئلہ کے حل کے لئے صرف ایک صفحہ درکار ہے

یہ تمام واقعات Greey کے ایک ساتھی کے زبانی معلوم ہوئے جو کسی زمانہ میں Data Control کے ساتھ کام کرتا تھا۔ Greey کے نئے برق رفتار کمپیوٹر کی تیاری اندرون ایک سال مکمل ہو گی۔ Greey کا یہ نعرہ ہے کہ بزنس میں آدمی خود اعتمادی سے ہی آگے بڑھ سکتا ہے۔

یوں تو مختلف اقسام کے کمپیوٹر تیار ہو رہے ہیں لیکن ان تمام میں Greey کا کمپیوٹر ہی سب سے زیادہ خوبیوں کا حامل ہے۔ Apple ۱۹۷۶ء میں وجود میں آیا۔ یہ وہ شخصی کمپیوٹر ہے جو ساری دنیا میں سب سے زیادہ فروخت ہوتا ہے۔ یہ ہمارے کوئی ۱۰۰ کام انجام دیتا ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ روشنی کی رفتار سے خطوط کی ترسیل کر سکتا ہے۔ ۲۔ بحری جانوروں سے بات چیت کر سکتا ہے
۳۔ چوروں کو پکڑنے میں مدد دیتا ہے۔ ۴۔ جانوروں کی بیماریوں کی تشخیص کر سکتا ہے
۵۔ سرمایہ کاری میں مدد دیتا ہے۔ ۶۔ گھوڑوں کے سدھانے میں مدد لی جاتی ہے اور اصطبل کے تمام گھوڑوں کی خوبیوں کے اعداد و شمار محفوظ کر سکتا ہے۔
۷۔ تجرباتی ہوائی جہاز کی جانچ میں مدد دیتا ہے ۸۔ ہوابازی کو سستا اور آسان بناتا ہے
۹۔ چھپائی کو سستا اور غلطیوں کے امکان کو دور کرتا ہے ۱۰۔ قلبی مریضوں کی زندگی بچا سکتا ہے
۱۱۔ دماغی سکون حاصل کرنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے ۱۲۔ دماغی کیفیت کو ظاہر کر سکتا ہے
۱۳۔ شخصی امور کے فیصلہ جات میں مدد دیتا ہے ۱۴۔ دلی خواہشات کی پیشگی مخبری کر سکتا ہے
۱۵۔ اشتراکی امور میں رہنمائی کر سکتا ہے ۱۶۔ شیرخوار بچوں کے جھولے کو ہلانے میں مدد دیتا ہے
۱۷۔ موٹر گاڑیوں کی فروخت میں مدد لی جاتی ہے ۱۸۔ موٹر گاڑیوں کی پارکنگ میں مدد دیتا ہے
۱۹۔ کالج میں اسباق کے نصاب مکمل کرنے میں مدد دیتا ہے۔
۲۰۔ انتظامیہ کو شہریوں کے حقیقی مسائل سے واقف کراتا ہے۔
۲۱۔ مختلف کھیلوں کے اعداد و شمار کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔
۲۲۔ مال و اسباب کے حمل و نقل کے دوران وزن کے مطابق قیمتیں مقرر کر سکتا ہے۔
۲۳۔ بھاگ دوڑ میں حصہ لینے والے کھلاڑیوں کے لئے بہترین جوتے کے ڈیزائن کر سکتا ہے۔
۲۴۔ صنعتی کاموں کی قیمتوں کے تعین میں کنٹراکٹر کا بہترین ساتھی ہے۔
۲۵۔ عمارتوں کے نئے نئے ڈیزائن تیار کر سکتا ہے۔
۲۶۔ ہوابازی کے مخصوص مقاصد کی پیش قیاسی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

۲۷ - کھیلوں کے تبصرہ اور آنکھوں دیکھا حال بیک وقت ۳۰۰ سے زیادہ ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ۲۸ - کسی شادی یا بیاہ کی رسم انجام دے سکتا ہے۔

۲۹ - علاج اور اس پر صرف ہونے والی رقم کی پیشین قیاسی کر سکتا ہے۔

۳۰ - Photocopier کی درستگی اور ٹریننگ میں مدد لی جاتی ہے۔

۳۱ - بھاگ دوڑ میں حصہ لینے والے کھلاڑیوں کے لئے دوا (Marathon) کی مقدار مقرر کر سکتا ہے۔

۳۲ - خلا میں پودوں کی نشوونما پر ہونے والے تجربات سے آگاہ کر سکتا ہے۔

۳۳ - خلائی جہاز کی زمین پر واپسی کے منظر کو راڈر پر دکھا سکتا ہے۔

۳۴ - خلائی جہاز کے مرکز جاذبہ کے قیام میں اس کے وزن کے توازن کی برقراری میں مدد دیتا ہے

۳۵ - نفسیاتی مریضوں کے سکون اور آرام کے حصول کیلئے ماہر نفسیات کا بہترین ساتھی ہے۔

۳۶ - بینک میں قرضہ جات کو بہ عجلت منظور کرانے میں ممد و معاون ہے۔

۳۷ - ٹیکس کی بچت کے حسابات کی رہبری کرتا ہے ۳۸ - جانوروں کی غذا کی تیاری میں مدد دیتا ہے

۳۹ - بہترین شراب بنانے کے لئے انگور کی فصل کے انتخاب میں مدد دیتا ہے۔

۴۰ - نئی شراب (Beer) کی جانچ میں مدد دیتا ہے ۴۱ - جانوروں اور پرندوں کی نشوونما میں مدد دیتا ہے

۴۲ - یہ موسیقی کو لکھنے پڑھنے اور سیکھنے میں استعمال ہوتا ہے۔

۴۳ - یہ آلہ موسیقی کی ایک پٹی (Key Board) سے حیران کن آوازیں نکالنے میں مدد دیتا ہے۔

۴۴ - دلکش و رنگین ترسیمی مصوری کی تخلیق میں مدد دیتا ہے۔

۴۵ - چٹانوں کو دھماکوں سے توڑنے والی آتش بازی میں مدد دیتا ہے۔

۴۶ - کسی برقی نظام کو کنٹرول کرنے میں مدد دیتا ہے۔

۴۷ - امریکہ میں تقریباً ہر جلسہ گاہ کے لئے اسٹیج کی جسامت، دروازوں کی اونچائی اور بجلی کی ضروریات کے تعین میں مدد دیتا ہے۔

۴۸ - سانفرانسسکو میں آرکسٹرا کی دھن کو کتابوں سے مربوط کرنے میں مدد دیتا ہے۔

۴۹ - کسانوں کو زمین کی زرخیزی اور اس میں مناسب کاشت کی رہنمائی کرتا ہے۔

۵۰ - صنعتی میلوں میں مختلف اشیاء کو Video کے ذریعہ پردہ پر دکھانے کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

۵۱ - پٹرولیم کی صنعت میں کمپیوٹر سے زیر زمین معلومات کا تجزیہ کرکے کھدائی کا کام انجام دیا جاتا ہے۔

۵۲ - شہپرے کو شاکرگٹ کی نکاسی کے مناسب وقت اور آلات کا تعین کرتا ہے۔

۵۳۔ سوئیٹر کے نت نئے ڈیزائن بنا سکتا ہے ۵۴۔ ہیماٹولیٹی کو کنٹرول کرکے ہمارا تحفظ کرتا ہے
۵۵۔ ہوائی جکیوں (Air Turbines) کی کارکردگی بتا سکتا ہے ۵۶۔ Bio-Chemistry حیاتیاتی کیمیا
کے تجربات میں مدد کرنے والے بیکٹیریا کی چھان بین کر سکتا ہے۔ ۵۷۔ اسکوٹ (Scouts) کے بچوں
کو ان کی کارگزاری کے لحاظ سے Merit Badge دلانے میں مدد دیتا ہے۔
۵۸۔ ٹریکٹر کے انجن کی جانچ کی جا سکتی ہے ۵۹۔ ڈاکٹر اپنی پریکٹس کو کامیاب بنانے میں مدد لیتے ہیں
۶۰۔ دوا خانوں میں (Intensive Care Unit) ہر بستر پر نرسوں کے بجائے استعمال ہونے لگا ہے۔
۶۱۔ آپریشن سے پہلے مریض کو مناسب طریقہ پر بے ہوش کرنے میں کام لیا جاتا ہے۔
۶۲۔ یہ سگریٹ نوشی کے خلاف لکچر دے سکتا ہے ۶۳۔ نابینا لوگوں کے تجرباتی پروگرام میں پڑھنے میں
مدد دیتا ہے۔ ۶۴۔ شدید معذور لوگوں کی زندگی کو آسان بنا سکتا ہے۔
۶۵۔ یہ جگر کے کینسر کو (Laser) کی مدد سے تیزی سے تشخیص کر سکتا ہے۔
۶۶۔ Glau Come کے مریضوں کو معلوم کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے جن کیلئے آپریشن فائدہ مند ہے
۶۷۔ نفسیاتی مریضوں کے علاج میں خاص امتحانات کر سکتا ہے۔ ۶۸۔ گھوڑے کو دوڑانے یا کارٹون
کی فلم کیلئے تصاویر کی ترتیب عمل میں لاتا ہے ۶۹۔ برف گرنے کے بعد سڑکوں کی حالت کا پتہ چلاتا ہے
۷۰۔ موٹاپے کو دور کرنے کے لئے مناسب غذا کا تجزیہ کرتا ہے جو ۱۰ افراد خاندان کیلئے کام دے سکتا ہے
۷۱۔ کوئی ۵۰۰ قسم کی گھریلو آئس کریم کے فارمولے محفوظ کر سکتا ہے۔
۷۲۔ اعلیٰ قسم کے فرنیچر کی تیاری کے لئے ابتدائی حساب کتاب کر سکتا ہے۔
۷۳۔ شخصی فینانس منیجر کے فرائض انجام دیتا ہے ۷۴۔ LIFE اور TIME جیسے میگزین کی
اشاعت میں مدد دیتا ہے۔ ۷۵۔ بیمہ کے حساب کتاب کو منٹوں میں حل کر سکتا ہے۔
۷۶۔ مصنفین اپنے مضامین کی ایڈیٹنگ اور ٹائپنگ میں اس سے مدد لیتے ہیں۔
۷۷۔ الفاظ کے غلط Spelling (ہجوں) کو کسی بھی تحریر میں دکھاتا ہے۔
۷۸۔ الکٹرانک انجنیر اپنے (Circuit) کے ڈیزائن میں مدد لیتے ہیں۔
۷۹۔ Apple پر ہزاروں قسم کے کھیل ڈیزائن کئے جاتے ہیں۔
۸۰۔ بہترین کھلاڑیوں کے کرتب کو جو دنیا کے بڑے بڑے مقابلہ جات میں دکھائے ہیں سلسلہ وار پیش کر سکتا ہے
۸۱۔ شمالی بحر اوقیانوس یا جنوبی امریکہ کے ساحلی علاقوں کی سخت سردی کے اتار چڑھاؤ کو ظاہر کرتا ہے۔
۸۲۔ شطرنج کے مقابلوں میں کھلاڑیوں کی ذہانت کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

۸۳۔ بھوت پریت، جادو منتر وغیرہ کے اثر کو پہچانتا ہے۔ ۸۴۔ ہر قسم کے کھیلوں کو اپنے حافظے میں محفوظ رکھتا ہے۔ ۸۵۔ بزنس میں گاہکوں کو فہرست بہ فہرست ترتیب دے سکتا ہے۔

۸۶۔ کوئی دو سو دفتری شکلوں (Files) کو ہر ایک انچ تختی میں ریکارڈ کرکے مطلوبہ فائلوں کو سکنڈ میں پیش کر سکتا ہے

۸۷۔ بڑی کمپنیوں میں کوئی ۲۰ ہزار ملازموں کے نام اور پتہ کا اپنے حافظے میں ذخیرہ کر سکتا ہے۔

۸۸(؟)۔ کسی بھی نوسکھے کو کمپیوٹر کی تعلیم دے سکتا ہے

۹۰۔ کوئی بھی شخص Apple کی Logo زبان سے آسان پیرایہ میں پروگرامنگ سیکھ سکتا ہے۔

۹۱۔ کسی بھی اسکول کے ریکارڈ محفوظ رکھنے اور رقمی معاملات کو ٹھیک ڈھنگ سے چلانے میں مدد دیتا ہے

۹۲۔ Schoolbus نامی نظام سے خرچ کو کم کیا جا سکتا ہے۔

۹۳۔ اسپورٹ کلب (امریکہ) میں موٹر گاڑیوں کی دوڑ کے نتائج کو بہت ہی کم وقت میں ظاہر کرتا ہے

۹۴۔ پوپ جان پال کے حالیہ دورہ امریکہ کے دوران Apple سے مدد لے کر انتظامات کئے گئے۔

۹۵۔ امریکہ کی بعض گرجاؤں میں عبادت کے سوا ہر کام میں Apple استعمال کیا جا رہا ہے۔

۹۶۔ انجیل Bible کو پڑھنے اور مختلف مشابہ متن کے حوالے حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے۔

۹۷۔ آتش فرو محکمہ جات میں سرعت سے آگ بجھانے کے لئے مددگار آلات کی نشاندہی اور اہم فیصلے کر سکتا ہے۔ ۹۸۔ جھوٹ بولنے والے کو بے نقاب کر سکتا ہے

[illegible]۔ Apple ایک معمولی تاجر کو بھی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

۱۰۰۔ لوگ اپنے ۱۴ سال کی عمر کے بچوں کو سمجھنے کے لئے بھی استعمال کر رہے ہیں

(ماہنامہ SPAN (نئی دہلی)
بابتہ جولائی ۱۹۸۳ء سے بشکریہ کے ساتھ)

فارم نمبر ۴
تفصیلات ملکیت
بابتہ
ماہنامہ شاداب
حیدرآباد

زبان بلحاظ وقفہ: اردو ماہنامہ "شاداب"
مقام اشاعت: ۱۱-۵-۱۴۷ ریڈ ہلز۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴
ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر اور مالک کا نام: محمد قمر الدین صابری
قومیت / پتہ: ہندوستانی۔ ۱۱-۵-۱۴۷ ریڈ ہلز حیدرآباد
میں محمد قمر الدین صابری اعلان کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا تفصیلات میرے [illegible]
علم و اطلاع کی حد تک صحیح ہیں۔ فقط
دستخط محمد قمر الدین صابری
پبلشر
مورخہ ۲۵ مارچ [illegible]

ڈاکٹر ثاقب انور

اسرار الحق مجاز حیات اور شاعری

ترقی پسند ادب کے مقبول ترین شاعر اسرار الحق مجاز نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو ردولی کے چودھریوں کے سب سے معزز زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ اس پر جاگیردارانہ نظام کی گہری چھاپ تھ[ی] ان کی ابتدائی تعلیم ردولی ہی میں ہوئی۔ بعد ازاں انہوں نے میٹرک کا امتحان لکھنؤ کے امین آباد ہائی [اسکول] سے پاس کیا۔ انٹرمیڈیٹ کی تعلیم انہوں نے آگرہ کے سینٹ جانس کالج میں حاصل کی یہ دور مجاز کے آغاز شباب کا ہنگامی دور تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ خاندان کے دیگر افراد سے دور ہوئے تھے اس[لئے] آگرہ میں ان کے گھرانے کی بعض صحت مند روایات کا دامن آہستہ آہستہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ چلا اور ایک طرح سے ان کی زندگی کا نظام درہم برہم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ رات رات بھر شعر و شاعری [کی] محفلیں گرم ہونے لگیں، درسی کتابوں کے مطالعہ کے لئے وقت کہاں سے نکالتے؟ نتیجہ ظاہر تھا، امتحا[ن میں] فیل ہوئے۔ لیکن آگرہ کے ادبی ماحول نے ان کی ادبی صلاحیتوں کو ابھرنے کے مواقع فراہم کئے۔ انٹر سائنس میں ناکام ہونے کے بعد مجاز جس وقت مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں داخلہ لینے کے لئے [آگرہ] سے روانہ ہوئے تب ان کی شاعری کی مستحکم بنیادیں پڑ چکی تھیں۔ انہوں نے ۱۹۳۱ء میں علی[گڑھ] مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا جہاں انہوں نے طالب علمی کے پانچ سال سکون، مسرت محبت اور بے[فکری] کے ساتھ بسر کئے۔ اسی دور میں ان کی زندگی اور شاعری کی راہیں متعین ہوئیں اور یہیں کے اشت[راکی] نوجوانوں کی صحبتوں نے ان کی شاعری اور شخصیت دونوں کو شان کجکلاہی اور مرد انقلابی کا بانکپن [عطا] کیا۔ یہیں آکر وہ "شراب و شبستاں" میں کچھ ایسے الجھے کہ آخری سانس تک بس الجھے ہی رہے۔ علیگڑھ میں وہ جن اشتراکی نوجوانوں سے متعارف ہوئے ان میں اختر رائے پوری، حیات اللہ [انصاری،] آل احمد سرور اور سبط حسن قابل ذکر ہیں۔ بعد میں جذبی، سردار جعفری، عصمت چغتائی اور سعادت منٹو بھی علیگڑھ پہنچ گئے تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جن کے ساتھ مل کر مجاز ترقی پسند ادب کی بنیادیں [ڈالنے] میں مشغول ہو گئے۔ ان دنوں مجاز کو جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی کی شاعر[ی]

وائس پرنسپل مولانا آزاد کالج۔ اورنگ آباد

والہانہ لگاؤ تھا۔ بقول سردار جعفری "جوش کی رندی و بیباکی، اختر شیرانی کی معصومیت اور رنگینی اور جذبہ کی نغمگی نے اسے متاثر کیا تھا اور جب اس رندی اور بیباکی، معصومیت اور رنگینی اور نغمگی نے مجاز کی شاعری میں تحلیل ہو کر ایک نیا روپ اختیار کیا تو ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور کی سب سے حسین شاعری پیدا ہوئی۔"

ان دنوں جان نثار اختر اور جذبی کی موجودگی کے باوجود مجاز یونیورسٹی کے سب سے مقبول شاعر تھے۔ وہ طالب علموں کے کمرے ہوں یا پروفیسروں کے بنگلے، مشاعرے ہوں یا جلسے' ہر جگہ مجاز ہی کا طوطی بولتا ہوا نظر آتا۔ غرض مجاز کو جلد ہی اتنی مقبولیت حاصل ہو گئی کہ جگر مرادآبادی کے علاوہ شاید ہی کسی اور شاعر کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی ہو۔

حسن عسکری نے مجاز کی انتہائی عجیب و غریب لیکن اتنی ہی زیادہ پرکشش شخصیت کی وجہ سے ان کے بارے میں کہا ہے کہ وہ " اردو کی تاریخ میں ہمیشہ ایک افسانہ بنے رہیں گے "۔ غالباً اس مقبولیت اور اسی افسانوی شخصیت کی وجہ سے علیگڈھ میں انہیں ایک ایسا رنگین ماحول ملا تھا جس میں کئی زہرہ جبیں لڑکیاں ان سے ملے بغیر ان پر جان چھڑکنے لگی تھیں۔ ان سے شادی کرنے کے لئے حسینوں میں لاٹریاں ڈالی جانے لگی تھیں اور کنواریاں اپنے آئندہ بیٹوں کے نام ان کے نام پر رکھنے کی قسمیں کھانے لگی تھیں۔ نازنینان حرم بڑے ہی ذوق و شوق کے ساتھ خلوتوں میں مجاز کے شعر گنگنانے لگی تھیں۔ انہی دنوں کا تذکرہ کرتے ہوئے مجاز کہتے ہیں ؎

مرے بازو پہ جب وہ زلف شب گوں کھول دیتی تھی
زمانہ نکہت خلد بریں میں ڈوب جاتا تھا

وہ میرا شعر جب میرے لئے ہی گنگناتی تھی
مناظر جھومتے تھے بام و در کو وجد آتا تھا

مری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جب مسکراتی تھی
مرے ظلمت کدے کا ذرہ ذرہ جگمگاتا تھا

اسی علیگڈھ میں مجاز کا شغل مے نوشی شروع ہوا۔ اپنی بادہ نوشی کے بارے میں مجاز نے کیا خوب کہا ہے ؎

عیب جو حافظ و خیام میں تھا

ہاں کچھ اس کا بھی گنہگار ہوں میں

بادہ نوشی کا یہ ذوق مجاز کے لکھنؤ میں قیام کے دوران کافی حد تک تجاوز کر گیا ۔ لکھنؤ میں ان دنوں "نیا ادب" کے حلقے کے ادیبوں اور شاعروں کی بادہ نوشی کا ذکر کرتے ہوئے فرحت اللہ انصاری لکھتے ہیں

"جب ان دنوں کا خیال آتا ہے تو ایک بات جو رہ رہ کر یاد آتی ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے پیتے تھے تو پیتے ہی ان کی رقابتیں اور کثافتیں امڈنے لگتی تھیں اور کبھی کبھی تو اس زور شور سے کہ ساری محفل درہم برہم ہو جاتی تھی مگر مجاز جتنی ہی پیتا جاتا اتنی ہی اس کی محبت اور شرافت عود کر تی جاتی تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے محبت کا ایک سرچشمہ ہے جو پھوٹا پڑتا ہے"

مجاز بنیادی طور پر ایک رومانی شاعر ہیں جنہوں نے شاہد و شراب کے علاوہ انقلاب کے موضوع پر اچھوتی نظمیں اردو ادب کو عطا کیں ۔ عشق ان کا مذہب تھا اور انقلاب ان کا مسلک اگرچہ کہ عملی زندگی میں عشق کے معاملے میں وہ کبھی کامیاب نہ ہو سکے تاہم ان کی شاعری یاسیت کا شکار ہونے کی بجائے بھرپور رجائیت کا مخزن بنی رہی ۔ انہوں نے حادثات زمانہ کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے انوکھے بانکپن سے کہا تھا ؎

بہ ایں سیل غم و سیل حوادث مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

مجاز کا محبوب اردو شاعری کے روایتی محبوب کی طرح نہ تو ظلم و جور یا بے رخی و بیوفائی کا پیکر ہے اور نہ اختر شیرانی کے محبوب کی طرح " تو اس سنسار میں اک آسمانی خواب ہے سلمیٰ " بلکہ ان کا محبوب تو " میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے " —— مجاز نے اپنے محبوب کی جیسی تصویر اپنی نظم "کس سے محبت ہے" میں کھینچی ہے ایسی تصویر اردو شاعری میں شاید ہی کبھی پیش ہوئی ہو ۔

اپنی تمام تر طبعی رنگینیوں کے باوجود مجاز نے انقلاب کے تصور کو کبھی نگاہوں سے اوجھل ہونے نہیں دیا ۔ ان کے تصور شباب میں رومانوی اور انقلابی دو پہلو کچھ اس طرح گھل مل گئے تھے کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا آسان نہ تھا ۔ وہ اپنی زمزمہ سنجی اور نغمہ خوانی کے سلسلے میں "محفل وفا" اور "بزم دلبراں" دونوں کو اہمیت دیتے ہیں ؎

میں ہوں مجاز آج بھی زمزمہ سنج و نغمہ خواں شاعر محفل وفا مطرب بزم دلبراں

مجاز کا تصور انقلاب اپنے عہد کے سیاسی رجحانات کا رہین منت ہے ۔ انہوں نے اسے جوش سے مستعار نہیں لیا کیونکہ مجاز کا انداز فکر عوامی اور جوش کا جاگیردارانہ ہے ۔ مجاز کے نزدیک انقلاب کسان، مزدور اور متوسط طبقے کے باغی نوجوان ہیں جبکہ جوش کے نزدیک انقلاب کے ہیرو وہ تھے یا۔ مجاز نے جوش کی طرح یہ کبھی نہیں کہا ؎

قسم اس جوش کی جو ڈوبتی نبضیں ابھارے گا
کہ اے ہندوستاں جس وقت تو مجھ کو پکارے گا
مری تیغ رواں باطل کے سر پر چلمنا ئے گی
ترے ہونٹوں کی جنبش ختم بھی ہونے نہ پائے گی

اسی طرح مجاز نے کبھی جوش کی طرح ہندوستانی عوام کو " اے ہند کے ذلیل و خوار سیاہ " کہہ کر مخاطب نہیں کیا بلکہ وہ تو ہندی " نوجوان خاتون " سے مخاطب ہو کر یہ مشورہ دیتے ہیں ؎

سنانیں کھینچ لی ہیں سر پھرے باغی جوانوں نے
تو سامان جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مجاز اردو ادب کے وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے شاعری کو انقلاب آفرین، بانداز اور صحت مند تصور عطا کیا ۔

۱۹۳۵ء میں مجاز دہلی چلے آئے اور آل انڈیا ریڈیو کے اردو رسالے " آواز " کی مدیری کی۔ اس رسالہ کا نام انہیں کا تجویز کردہ تھا اور آل انڈیا ریڈیو دہلی کے پروگراموں کا آغاز بھی ان کی اس غزل سے ہوا تھا جس کا مطلع ہے ؎

سارا عالم گوش بر آواز ہے
آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے

مجاز نے ویسے تو کئی خوبصورت غزلیں بھی کہی ہیں لیکن ان کی شاعری کا سب سے بڑا سرمایہ ان کی نظموں پر مشتمل ہے غزلوں پر نہیں ۔

دہلی کے قیام کے دوران مجاز دہلی کے بعض شبستانوں میں آنے جانے لگے تھے اور

وہاں کی ایک لڑکی سے ان کا سلسلہ بھی چل پڑا تھا۔ مجاز کی نظم "آوارہ" میں اس "بازاری لڑکی" کا نام بھی آگیا ہے، وہ مصرعے یہ ہیں ؎

رات ہنس ہنس کے یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہناز لالہ رخ کے کاشانے میں چل

یہ نظم مجاز ہی کی نہیں اردو ادب کی بہترین نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس نظم میں مجاز کی شاعری کا وہ مرد انقلابی اپنی اصلی شکل میں سامنے آتا ہے جیسے مفلسی، ناداری اور مجبوری کی وجہ سے محبت میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو صنعتی عہد کے بڑے شہروں کی شاندار اور جگمگاتی جاگتی سڑکوں پر آوارہ پھرنے کے لئے مجبور ہے۔ اپنی ناکامیوں اور محرومیوں کے زیر اثر اس میں ایک قسم کی جھنجھلاہٹ اور چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے جو اسے اس نظام کا تختہ الٹ دینے پر مجبور کرتا ہے جس نے اسے ایسی ذلیل زندگی بسر کرنے پر مجبور کر رکھا ہے وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں

تخت سلطاں کیا میں سارا قصر سلطاں پھونک دوں

اس نظم کی طرح مجاز کی دوسری اہم ترین نظم "اعتراف" کی اشاریت اور رمزیت کو ذہن میں رکھا جائے تو یہ نظم بقول منظر سلیم "مجاز کی انفرادی زندگی کے المیے سے بڑھ کر ان کے عہد اور ان کی نسل کے المیے کی ترجمانی کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔"

دہلی کے معاشقے میں ناکامی کے باعث ۱۹۴۰ء میں مجاز پر جنون کا پہلا دورہ پڑا علاج معالجے کے بعد کچھ طبیعت سنبھلی لیکن مے نوشی اور دیگر بے اعتدالیوں کی وجہ سے ۱۹۴۵ء میں ان پر جنون کا دوسرا دورہ پڑا جس کی وجہ سے وہ اتنے بے جان ہو گئے کہ شوکت تھانوی کو کہنا پڑا "مجاز نے فیصلہ کر لیا ہے کہ انہیں زندگی بسر کرنے کی ضرورت نہیں زندگی کو خود ضرورت ہو تو انہیں بسر کر لے"۔ ۱۹۵۲ء میں جوش نے ایک طویل نظم "پندنامہ برائے اصلاح میاں مجاز" لکھی اور "آجکل" میں چھاپ بھی دی۔ مجاز پر اس کا شدید ردعمل ہوا۔ وہ جوش سے ایسے ناراض ہوئے کہ عمر بھر شکر رنجی باقی رہی۔ مجاز نے اس نظم کی اشاعت کے بعد دو قطعات کے ذریعے جوش پر بھرپور طنز کیا ہے۔ ایک قطعہ میں جوش کے وزیر اعظم کشمیر شیخ عبداللہ کی شان میں قصیدہ لکھنے پر طنز کیا ہے ؎

نطق رسوا دہن دریدہ ہے   یہ شنیدہ نہیں ہے دیدہ ہے
رند برباد کو نصیحت ہے   شیخ کی شان میں قصیدہ ہے

دوسرے قطعہ میں جوشؔ کی سرکاری ملازمت پر طنز کیا گیا ہے ؎

پیر جوشؔ شباب کیا جانے   شورشِ اضطراب کیا جانے
سینۂ انقلاب چھلنی ہے   شاعر انقلاب کیا جانے

بقول سردار جعفری "یہ ٹھیس کچھ ایسی لگی تھی کہ مجازؔ آخری وقت تک نہ بھول سکا اور رانچی کے اسپتال میں جنونی کیفیت میں جو مصرعے لکھے ان میں ایک مصرعہ یہ بھی تھا ؎

فراقؔ ہوں اور نہ جوشؔ ہوں میں، مجازؔ ہوں سرفروش ہوں میں

بعد ازاں وہ جوشؔ سے اس قدر ناراض ہو گئے کہ برملا کہنے لگے "شاعر صرف دو ہیں، ایک فیضؔ اور دوسرا مجازؔ"۔ یہ شعر بھی بار بار پڑھتے تھے ؎

دعویٰ زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے
تعریف بوئے مشک غزالوں کے سامنے

انہی دنوں رانچی کے دماغی اسپتال میں بنگال کے باغی شاعر قاضی نذر الاسلام بھی زیر علاج تھے

بعض لوگوں نے مجازؔ پر یہ اعتراض کیا تھا کہ وہ اپنے مطالعہ کو وسعت دینے میں ناکام رہے جس کی وجہ سے وہ فکری جمود کا شکار ہو گئے۔ لیکن یہ اعتراض اس لئے درست نہیں ہے کہ مجازؔ کتابوں کے نہیں زندگی کے شاعر تھے۔ عصری زندگی سے جتنی اور جیسی آگہی مجازؔ کو حاصل تھی شاید ہی کسی دوسرے فنکار کو حاصل رہی ہو گی۔

علیگڈھ کے طالب علمی کے دور میں ہی اشتراکیت کو وہ اپنا نصب العین بنا چکے تھے۔ انہوں نے "خواب سحر" میں کھل کر اشتراکیت کو نجات انسانی کی منزل قرار دیا ہے۔ اس نظم کے آخری حصے میں وہ کہتے ہیں ؎

ذہن انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں   زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خواب سحر دیکھا تو ہے   جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے

ہیئتی اور فنی اعتبار سے مجازؔ نے نظم آزاد، نظم معریٰ یا جدید نظم کی بعض دوسری صنفوں کو آخر تک نہیں اپنایا اور نہ صرف یہ کہ اس معاملے میں ن۔م۔ راشد، میرا جی اختر [illegible]

[illegible]

سے بھی دامن بچاتے رہے۔

مجاز نے اپنی فارسی دانی کے بل بوتے پر بعض ایسی خوبصورت علامتیں وضع کی ہیں جو زباں زدِ عام ہو کر رہ گئی ہیں۔ مثلاً " شاہناز لالہ رخ " کے ساتھ معاً کاشانے کا تصور آجاتا ہے یا پھر اس شعر میں ؎

آج بھی ہے لکھی ہوئی سرخ حروف میں مجاز
دفترِ شہریار میں میرے جنوں کی داستاں

دفترِ شہریار میں جو داستاں سرخ حروف میں لکھی ہوئی ہے وہی مجاز کے اس شہریار کو روایتی معنوں سے ہٹا کر ایک نئی علامت بنادیتی ہے۔ مجاز کی تشبیہوں اور استعاروں کے بارے میں اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں " نادر تشبیہوں کی تلاش میں جو ذہن کی تازگی اور نظر میں وسعت پیدا کرنے میں ممد و معاون ہوتی ہیں مجاز کے شاعرانہ عمل کا ایک خاص وصف ہے۔ مثلاً ؎

چمک تاروں کی چشمِ نرگسیں میں — جھلک چاندی کی جسمِ مرمریں میں

نشۂ نازِ جوانی میں شرابور ادا — جسم ذوقِ گہر و اطلس و کمخواب لیے
زلفِ شب رنگ لیے صندل و عود و عنبر — خمِ ابروئے حسیں دیر کی محراب لیے

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال — جیسے صوفی کا تصور جیسے عاشق کا خیال

غرض مجاز نے شاعری کو سیاست بننے نہیں دیا بلکہ سیاست کو شاعری۔ ترقی پسند تحریک کے اس خالق کو بالآخر شراب ناب نے لکھنؤ میں ۵ دسمبر ۱۹۵۵ء کو ہمیشہ کی نیند سلادیا۔ مجاز کی بے وقت موت پر فراق نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

" دورِ حاضر کی شاعری میں مجاز ایک عجیب و غریب منظر کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ایک بان کی طرح چھوٹا اور فضا کی بلندیوں پر پھول سی جگمگاتی ہوئی چنگاریاں بکھیر کر چشم زدن میں بجھ گیا۔ لیکن یہ چنگاریاں اس کے مختصر مجموعہ کلام میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی ہیں۔ ان کی جگمگاہٹیں زندگی کی راتوں کو روشن کرتی رہیں گی۔"

ایس اے رحمٰن ثاقب

عصمت اور جنگلی کبوتر کے نسوانی کردار

اردو فکشن میں عصمت چغتائی کے نسوانی کردار ایک منفرد اور ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ عصمت نے اپنے دور کی فکر سے آگے بڑھ کر عورت کی آزادی کو منوانے کی کوشش کی ہے۔ اور عورت کی اصلاح و فلاح کے دکھاوے کے لئے قاعدے اور قانون کے خلاف سخت احتجاجی انداز اختیار کیا ہے۔ اور ان سماجی بندشوں کو توڑنے کا مشورہ دیا ہے جو عورت کے حقوق کو حقیقتاً مسخ کرنے کا باعث بنتی ہیں "عورت اور مرد برابر ہیں" کا نعرہ بیسویں صدی کی ابتدا میں شدت اختیار کر چکا تھا اس کو فنی جامہ پہنانے والی ادیباؤں میں عصمت آگے رہی ہیں اور اپنی تحریروں میں ہر مقام اور منزل سے عورت کی مساوات کی پرجوش حمایت کرتی رہی ہیں ۔ ناولٹ "جنگلی کبوتر" میں بھی عصمت نے سماج میں عورت کو جنسی طور پر بھی مرد کے مساوی قرار دینے کی کوشش کی۔ ہے جو ایک اہم مسئلہ ہے۔

اس ناولٹ میں عابدہ اور مونا کے دو اہم نسوانی کردار ہیں ۔ عابدہ پڑھی لکھی ماڈرن بیوی کی نمائندگی کرتی ہے جب کہ مونا کال گرل کی ۔ اس ناولٹ میں دراصل ماجد اور عابدہ کی ازدواجی زندگی کو علامت بنا کر عصری حسیت و آگہی کے ساتھ موجودہ معاشرتی ازدواجی زندگی کی حقیقت پر مخصوص نقطہ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ مونا کا کردار اس ازدواجی زندگی کو ایک خاص موڑ پر لاتا ہے اس موڑ پر معاشرے میں ازدواجی رشتوں کی اہمیت ، طوائف سے تعلق ، منکوحہ بیوی کے حقوق ، عورت کی جنسی حیثیت اور اس کی مساوات ، عورت اور مرد کی یکساں اخلاقی حیثیت پر بحث و تکرار کو ناولٹ کا مرکزی خیال قرار دیا جا سکتا ہے۔

عصمت نے دقت نظر سے کام لے کر یہ واقعہ پیش کیا ہے کہ ماجد ، عابدہ کے دور کے رشتہ کا خالہ زاد بھائی ہے ۔ شادی سے پہلے عابدہ ، ماجد کے بارے میں سن چکی تھی کہ وہ بڑا دل پھینک عاشق ہے شادی سے پہلے وہ ماجد کے بارے میں بہت غور و فکر کرتی ہے ۔ اس کے خطوط کا بغور مطالعہ کرتی ہے ماجد نے ایک خط میں صاف لکھا تھا کہ وہ دل پھینک ضرور ہے مگر اس کا دل اب تک کسی نے لیا نہیں ہے

اور وہ وعدہ بھی نہیں کر سکتا کہ شادی کے بعد زاہد خشک بن جائے گا ۔ اس کے علاوہ وہ لکھتا ہے :
" یہ تم کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ تم اپنی چیز واپس لے کر کسی اور کو دینے دو گی کہ نہیں " [۱] ماجد کے خط کا جواب دیتے ہوئے عابدہ لکھتی ہے کہ :

" میں دل لینے اور دینے کی چیز نہیں سمجھتی ۔ دل کچھ بھی ہو آپ کی ملکیت ہی رہے گا ۔ اب جی چاہے تو بانٹتے پھریے گا مگر یہ یاد رکھئے کہ میں حصہ دار نہیں ہو سکوں گی " [۲]

جب ماجد عابدہ کو مونا کا حصہ دار بنانا چاہتا ہے تو وہ اپنے اقرار کے مطابق اڑ جاتی ہے ۔ عابدہ کی غیر موجودگی میں ماجد کی زندگی میں مونا وارد ہو جاتی ہے اور پھر یہ واردات اس کو بچے کی ماں بننے کی منزل پر پہنچا دیتی ہے ۔ عابدہ کو اس واردات کا پتہ چلتا ہے تو وہ آخر وقت تک ماجد سے قریب رہتے ہوئے بھی جنسی طور پر اس سے دور رہتی ہے ۔ ماجد کی یہ غلطی عابدہ کی نظر میں معاف کرنے کے قابل نہیں ہے اس لئے وہ ماجد سے جی بھر کر بدلہ لیتی ہے ۔ ماجد کی اس غلطی کی وجہ سے ان کی ازدواجی زندگی برباد ہو جاتی ہے لیکن آج کل کے عبوری دور کے اخلاق کے نقطہ نظر سے ازدواجی رشتہ اتنا نازک نہیں ہے کہ اس طرح کی ایک غلطی میاں بیوی کی زندگیوں کو تباہ کر دے ۔ عصمت کی نظر میں بھی یہ ماجد کی ایک عام غلطی ہے جو قابل معافی ہے ۔ وہ کہتی ہیں کہ :

" جنگلی کبوتر " کا جو ہیرو ہے وہ بہت ہی نیک کردار ہے ۔ میرے خیال میں اس کی نیک بیوی زیادہ بدکردار ہے جو اسے ایسے عجیب طریقے سے سزا دیتی ہے ۔ اس سے ایک بھول ہو جاتی ہے ۔ میں سمجھتی ہوں عورت سے بھی بھول ہو جاتی ہے ..... جسم کوئی معنی نہیں رکھتا اور ایک عورت کسی مرد سے کسی جذبے کے ماتحت اگر کوئی اختلاط کر لیتی ہے تو یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے شوہر سے نفرت کرتی ہے ۔ بھول میں غلطی میں ایسا ہو جائے گا " [۳]

یہ صحیح ہے کہ ماجد سے یہ بھول ہو جاتی ہے مگر یہ بھی صحیح ہے کہ بھول عابدہ سے نفرت کی وجہ سے نہیں ہوتی ۔ یہ بھول ماجد سے وقتی تقاضے کو پورا کرنے کی غرض سے ہو جاتی ہے مگر عابدہ اس کی بھول کو معاف نہیں کرتی ۔ آخر تک اس کو سزا دیتی ہے ۔ ماجد کئی دفعہ اس کے جنسی جذبات کو بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر بے سود ! آخر تنگ آ کر عابدہ سے ایک بار پوچھتا ہے کہ :

---

[۱] جنگلی کبوتر ص ۱۲ [۲] جنگلی کبوتر ص ۱۱ [۳] عصمت چغتائی سے راقم الحروف کا انٹرویو ، بمبئی مورخہ ۱۸ دسمبر ۱۹۷۰ء

"کیا تمہارا جسم مجھے کبھی نہیں پکارتا ؟" ؎ ۱

اس کے جواب میں عابدہ کہتی ہے کہ :

"نہیں پکارتا ! - میرا جسم تمہارے لمس کے لئے سسک رہا ہے" ؎ ۲

یعنی وہ ماجد کو سزا دینے کے لئے اپنے آپ کو سزا دیتی ہے اور اپنے جنسی جذبات کو دبا کر اپنی خودداری کا بھرم قائم رکھتی ہے - وہ محض جنسی انتقام ہی نہیں لیتی بلکہ ایک عورت کے نقطۂ نظر سے ایک بڑا انقلابی قدم اٹھاتی ہے جو اسے بنت مریم ثابت کرتا ہے یعنی عابدہ ماجد سے اصرار کرتی ہے کہ وہ مونا سے شادی کرلے - عابدہ ماجد کی قانونی بیوی ہے مگر وہ مونا اور اس کے غیر قانونی بچے کو سماج میں ان کا واجبی حق دلانے کے لئے اب محض ایک منکوحہ بیوی نہیں بلکہ ایک انقلابی عورت ہے - اس کی یہ بات کسی اصولی کردار کی بات نہیں ہے کہ :

"اس گھر کے دروازے اس (مونا) پر بند ہیں - جملہ حقوق میرے نام محفوظ ہیں
میں مسز ماجد کہلاتی ہوں اور وہ تمہاری بچی کی ماں ہوکر بھی قانوناً کوئی نہیں
یہ قانون نہیں ڈھکوسلہ ہے" ؎ ۳

یہ محض الفاظ نہیں ہیں بلکہ ان الفاظ میں ایک معیاری نسوانیت کی گھن گرج ہے اور عصمت نے اس گھن گرج کے ذریعہ اس طرح کے سماجی اور قانونی رشتوں کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا ہے - یہاں عابدہ کا کردار بہت ہی بلند و بالا ہے - وہ ایک با اصول بیوی سے بڑھ کر ایک با اصول عورت بن گئی ہے جو اپنے اصولوں کی خاطر اپنے بیوی کے جذبات کو ایک عورت کے جذبات پر قربان کر دیتی ہے ——
مگر جب ماجد مونا سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے تو وہ ماجد سے کہتی ہے کہ :

"بچے کے خیال سے ..... (مونا) نکاح کرکے بعد میں طلاق دے دینا" ؎ ۴

یہ ایک نفسیاتی ردعمل ہے اس کے پیچھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بانجھ عابدہ کے یہاں مونا اور اس کے بچے کا حق دلانے سے زیادہ اس بچے کو اپنانے کا جذبہ کارفرما ہے - یہی وجہ ہے کہ وہ مونا کی زچگی کے دوران اس کی خدمت کرتی ہے اور اس کی دردِ زہ کی آدھی سے زیادہ تکلیف خود جھیلتی ہے - اس کے تلخ لہجہ کو برداشت کرتی ہے لیکن مونا اپنے بچے کو دئے بغیر ہسپتال سے فرار ہو جاتی ہے اور عابدہ اپنے زیورات بیچ کر مونا کی مالی مدد کرتی ہے اور آخر - ماجد کو مونا سے شادی کرنے

؎ ۱ و ۲ جنگلی کبوتر ص ۶۳ ؎ ۳ جنگلی کبوتر ص ۵۳ ؎ ۴ جنگلی کبوتر ص ۶۳

پر راغب کرتی رہتی ہے آخر عاجز آکر ماجد مونا سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ مونا ماجد سے شادی کرنے کے لئے عابدہ سے اجازت لینا چاہتی ہے۔ ماجد مونا کے رویہ سے دلبرداشتہ ہو جاتا ہے اور گھر آکر عابدہ کے سامنے دم توڑ دیتا ہے۔ کہانی کے اختتام میں مونا اپنی بچی کو عابدہ کے حوالے کر کے اپنے ایک عاشق سے شادی کر لیتی ہے اور عابدہ ماجد کی بچی کے یہاں زندگی گزارنے لگتی ہے۔ اس طرح عابدہ کا کردار تکمیل پالیتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو عابدہ کا کردار کافی الجھا ہوا کردار نظر آتا ہے چنانچہ خود عصمت عابدہ کے متعلق کہتی ہیں کہ :

"بڑا الجھا ہوا کردار ہے ..... ایک طرف وہ بڑی پتی ورتا ہے دوسری طرف وہ بڑی پڑھی لکھی ..... وہ اپنے میاں سے محبت کرتی ہے اور نفرت کرتی ہے محبت کیوں کرتی ہے کہ وہ اس کا دس برس سے بہت پیارا دوست ہے، نفرت اس لئے کرتی ہے کہ وہ دوسری عورت سے ملتا ہے ــــ وہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ ایک دور سے گزر رہی ہے اور وہ آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے ــــ وہ اپنی پرانی Values اور نئی Values جو کہتی ہے کہ عورت برابر کی ہونی چاہئیے، اس کے بیچ میں کھینچتی ہے اور ٹوٹتی ہے۔ اور ٹوٹتے وقت بھی دوسروں کو توڑتی ہے۔ کیونکہ عورت ایک دم اس آدمی سے محبت بھی کرتی ہے اور Broad Minded بننے کی کوشش کرتی ہے لیکن اس کے اندر کی عورت جو پرانی ہے اور عورت کی جو کمزوری ہے کہ مرد اس کی محبت کرے کوئی عورت (اپنے میاں کو) معاف نہیں کرتی۔ ہمیشہ میاں اس سے دبتا رہتا ہے جس سے بھول ہو جاتی ہے .... وہ (ماجد) کہتا ہے مجھے اس سے محبت نہیں، میں نے اس کو جسم کے طور پر استعمال کیا تھا لیکن اس (عابدہ) کو چوٹ لگتی ہے اگر ان کے بچے ہوتے تو شاید معاف کر دیتی ۔" [1]

دراصل عصمت کو عابدہ کے کردار کے ذریعہ یہ بتانا مقصود تھا کہ مرد اور عورت جنسی اعتبار سے دونوں یکساں جذبات کے مالک ہیں۔ وہ ایک ہی اخلاقی معیار پر جانچے جانے چاہئیں ــ وہ عورت کو جنس لطیف کہنا اس کی نسوانیت کی توہین محسوس کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک دونوں ایک دوسرے

---

[1] عصمت چغتائی سے راقم الحروف کا انٹرویو ــ بمبئی ۱۸ دسمبر ۱۹۷۵ء

مساوی حق رکھتے ہیں ۔ اور وہ دونوں کو ایک ہی اخلاقی سطح پر رکھتی ہیں ۔ وہ مروجہ اخلاقی اقدار پر طنز کرتے ہوئے اپنے ناول "عجیب آدمی" میں ایک جگہ مرد کی برتری کو یہ کہہ کر ٹھکراتی ہیں کہ :

"عورت سو کنویں کا پانی پی کر پھر سے ستونتی بننا چاہے تو نہیں بن سکتی
مگر مرد کا کچھ نہیں بگڑتا ——" [1]

اس کا مطلب یہی ہے کہ ہر طرح کی بے راہ روی اور اخلاقی جرائم کے ارتکاب سے مرد کا کچھ نہیں بگڑتا مگر عورت کی ایک بھول اس کی زندگی تباہ کر دیتی ہے اس جنسی فرق کو وہ یہاں اس طرح واضح کرتی ہیں

"اس لئے کہ وہ تمہارے علاوہ اوروں کے استعمال میں رہ چکی ہے ——
تو پھر یہ کہو کہ میرا اور تمہارا بھی کوئی جوڑ نہیں کیونکہ تم بھی اوروں کے کام آچکے ہو
جب کہ میں صرف تمہاری ہی ممنون رہی ہوں —— ہاں کہو وکٹ ہمیشہ کر رہی ہوں
مگر اس دھاندلی سے کام نہیں چلے گا ....." [2]

یہاں عابدہ کے کردار کے ذریعہ آخری جملہ میں عصمت نے سخت لہجے میں مردوں کی دھاندلی پر احتجاج لیا ہے ۔ انہوں نے ایک اور جگہ اس بات پر احتجاج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"عورت کی عزت لٹ سکتی ہے ، مرد کی نہیں لٹتی — شاید مرد کی
عزت ہی نہیں ہوتی جو لوٹی کھسوٹی جا سکے ——" [3]

غرض عصمت کے ہاں عورت کا جنسی طور سے مرد سے برابری کا احساس شدت سے ان کے فن کا ایک محور اور اہم معیار ہے ۔

عصمت کے فن کا یہ محور یا معیار محض ان کے ذہن کی اپج یا ایک مثال اور ایک نری ذہنی الجھن نہیں ہے بلکہ ان کے عبوری دور کے اخلاق کا ایک اہم مسئلہ ہے جسے وہ خود ایک حقیقی مسئلہ قرار دیتی ہیں چنانچہ عصمت کی شہادت ہے کہ یہ کردار ان کے مشاہدہ کی تخلیق ہے محض تصور کی نہیں —— وہ کہتی ہیں کہ :

"نہیں بھئی یہ مثالی کردار نہیں ہے میں نے دیکھے ہیں یہ مشاہدہ ہے یہ بالکل
زندہ کردار ہے ۔ واقعات بھی سوائے ناموں کے بہت بہت ملتے ہیں ۔" [4]

---

[1] عجیب آدمی ص ۱۸۴ [2] جنگلی کبوتر ص ۸۳ [3] ہم لوگ ص ۱۲۸
[4] عصمت چغتائی سے راقم الحروف کا انٹرویو ۔ بمبئی ۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۷۵ء

عصمت نے پاکستان میں رضا فاروقی کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے یہ اہم انکشاف کیا ہے
یا دنیا کا ایک سنسنی خیز انکشاف ہے کہ :

" خواجہ (خواجہ احمد عباس) کی ایک بیٹی بھی ہے ، وہ لاہور میں رہتی ہے۔ ان کا
بھی نوجوانی میں کسی کال گرل سے زوردار عشق ہوا تھا جو بیٹی کی پیدائش کے بعد
کلائمکس پر پہنچا ۔ خواجہ اسے خرچہ بھیجتا ہے ۔ ارے تم میرا " جنگلی کبوتر " پڑھ لو
پوری تفصیل پتہ چل جائے گی ۔ نہ عشق جرم ہے اور نہ محبت جرم ہے " [1]

چغتائی کی شہادت ہے اور یہ شہادت تحقیقی معیار سے بہت اہم ہے کہ " جنگلی کبوتر " خواجہ احمد عباس
یں مجتبائی (جن کا نمونیہ میں انتقال ہو گیا تھا) اور ان کی کال گرل کے واقعات پر مشتمل ہے
ار عصمت چغتائی نے اپنے زندہ ماحول سے لیا ہے اور پھر اسے فن سے رنگین کیا ہے اپنی شخصیت
سے اسے جلا بخشی ہے اور ایک بڑے فنکار کی طرح اپنے مواد کو اپنے ماحول سے لے کر اپنے ماحول
مواد بخشا ہے ۔ فکر و فن کا یہ لین دین عصمت کے اکثر کرداروں میں اساسی حیثیت رکھتا ہے
مد اور ناظر دونوں کو پرکھنا چاہیئے ۔ عصمت نے اپنے بعض کرداروں کی تخلیق کا قابل ذکر
ہے اس سے ان کے دوسرے کرداروں کی تخلیق کی بھی بنیادوں کا تعین کیا جا سکتا ہے یعنی
نا میں مونا کا کردار خواجہ احمد عباس کی کال گرل سے ملتا جلتا کردار ہے ۔

مونا نچلے متوسط طبقے کی ایک قبول صورت اور بھرے بھرے جسم کی کرسچن لڑکی ہے ۔ وہ ایک
نے کے باوجود ماجد سے بے حد محبت کرتی ہے اس کا جسم ماجد سے ملنے کیلئے بے تاب رہتا ہے
ے مل کر اپنے آپ کو گناہ گار تصور نہیں کرتی ' ماجد سے اس کو عجیب طرح کی لگاوٹ ہے کیونکہ
ے ذریعے ماں بننے کا فخر حاصل ہوا ہے ۔ اپنے اقتصادی تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے وہ دوسرے
بھی زن و شو کے تعلقات رکھتی ہے مگر واقعتاً وہ ماجد ہی کو چاہتی ہے ۔ عصمت کا یہ تجزیہ فن اور
تجزیہ ہے کہ :

" لیکن جو جسم بیچتی ہیں محبت نہیں کرتیں اور جب محبت کرتی ہیں تو محبت جو مقدس چیز ہے
بلند چیز ہے اس کی وہ قدر کرتی ہیں کسی ایک ہی لگا کے محبت کرتی ہیں سب سے محبت نہیں کرتیں " [2]

حقیقت ہے جسے عصمت نے مونا کے کردار کے ذریعے پیش کیا ہے ۔ عصمت کی یہ پیشکش
ہی اہمیت کی حامل ہے ۔

---

[1] شبینہ " کراچی عصمت چغتائی نمبر
ستمبر ۱۹۷۶ء - ص ۱۱۸

[2] عصمت چغتائی سے راقم الحروف کا انٹرویو
بمبئی - ۱۸ دسمبر ۱۹۷۸ء

[illegible] ہارمن

درد شکم

درد دل، درد جگر، درد تمنا اور درد سر کا ذکر تو اردو شاعری میں اکثر ہم سنتے آئے ہیں مگر درد شکم کا لفظ شاید غیر شاعرانہ ہے اسی لئے شعرائے کرام کبھی اس پر اظہار خیال نہیں فرماتے۔ یوں بھی دردِ دل، درد جگر، درد تمنا وغیرہ کے ازالہ کے لئے چارہ گر، طبیب یا ابن مریم کا ذکر تو اردو شاعری میں جگہ جگہ ہے مگر بے چارے سرجن کا ذکر بمشکل کسی دیوان میں ہے۔ بہر حال یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ سوائے درد تمنا کے جس کا علاج غالباً کبھی کبھی میرے دوست ڈاکٹر مجید خاں صاحب کرتے ہوں متذکرہ بالا تمام دردوں میں کبھی کبھی سرجری ناگزیر ہوجاتی ہے۔ آپ لوگوں میں سے بیشتر کا خیال ہوگا کہ درد شکم سے مراد صرف وہ درد ہے جو معدہ سے شروع ہوتا ہے، مگر دراصل شکم سے مراد جسم کا وہ حصہ ہے جس کو انگریزی میں Abdomen کہتے ہیں اور اس کے مشمولات میں ہضمی نظام یعنی معدہ اور آنتیں جگر، پتہ اور گردے وغیرہ ہیں اور درد شکم کی ابتدا ان میں سے کسی عضو کے متاثر ہونے سے ہوسکتی ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم درد شکم پر غور کریں بہتر ہوگا کہ ہم درد کی تعریف کریں اور اس پر غور کریں کہ درد کیا ہے؟ اور وہ کیوں ہوتا ہے؟ ۔ درد کا دوسرا نام احساس ناراضی ہوسکتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ بعض لوگ درد سے محظوظ بھی ہونے لگتے ہیں چنانچہ لذت درد کا ذکر اکثر ہمارے شعرا حضرات نے کیا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دوسروں کو درد پہنچا کر لذت محسوس کرتے ہیں۔ دراصل یہ ایک اعصابی خلل ہے۔ دنیا کے جابر و ظالم جن کے خونی کارناموں سے تاریخ کے صفحے پٹے پڑے ہیں غالباً اسی مرض کا شکار رہے ہوں گے۔ درد دراصل از خود کوئی مرض نہیں بلکہ یہ کسی بیماری کی علامت ہے۔ دراصل درد ہی وہ شے ہے جو اصل مرض

پروفیسر و صدر شعبہ سرجری۔ گاندھی میڈیکل کالج۔ حیدرآباد

کی طرف مریض کی توجہ مبذول کرتا ہے۔ اگر انسان میں یا جانداروں میں درد کی علامت نہ ہوتی تو شاید مرض کا علم ہی نہ ہوتا اور چلتے پھرتے ہی مرجاتا اور قابل علاج امراض بھی انسان کی لاعلمی کی وجہ سے مہلک ثابت ہوتے۔ درد کی ابتدا، جسم کے متاثرہ حصوں سے ہو سکتی ہے مگر اس کا احساس صرف دماغ کرتا ہے اور اس کے لئے اس کا ایک حصہ مختص ہے جس کو Sensory Area کہتے ہیں اور دماغ ہی درد کی جگہ کا تعین یا Localisation کرتا ہے۔ اگر انسان کا دماغ ماؤف کر دیا جائے جیسا کہ انسان کو بیہوش کر کے کیا جاتا ہے تو اس کو درد کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ گو درد اپنی جگہ برقرار رہتا ہے۔ اور یہی چیز بیہوشی سے آپریشن کے دوران حاصل ہوتی ہے۔

آئیے اب اس پر غور کریں کہ شکم اور اس کے مشمولات میں درد کس طرح پیدا ہو سکتا ہے، آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ شکم کے تمام اعضاء از خود بے حس ہوتے ہیں اور حالت ہوش میں بھی اگر جگر یا معدہ یا آنتوں کو کاٹا جائے تو ان میں درد محسوس نہیں ہوتا۔ مگر چونکہ یہ تمام اعضاء شکم کے اندر پائے جاتے ہیں اس لئے بغیر شکم کی دیوار کو کاٹے ان تک رسائی ممکن نہیں۔ اور انسانی جلد، عضلات اور وہ پرت جو ایک جھلی کی طرح ہوتی ہے اور جو شکم کے مشمولات پر لپٹی ہوئی ہوتی ہے اور جسے کہ طبی اصطلاح میں Peritoneum کہتے ہیں بیحد حساس ہوتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ مریض کو بیہوش کئے بغیر پیٹ چاک کرنا ممکن نہیں۔ شکم کے مشمولات میں درد عموماً تین طرح کی وجوہ سے پیدا ہو سکتا ہے۔ پہلی اہم وجہ ہے Infection یا عفونت۔ مختلف جراثیم کے اثرات کے تحت ہو سکتی ہے نتیجتاً اعضاء میں ورم و سوزش پیدا ہو سکتی ہے۔ مثلاً Appendicites Obst دوسری وجہ درد پیدا کرنے کی یہ ہے کہ گنجائش سے زیادہ مشمولات کا غذائی نالی میں جمع ہو جانا، اس میں گیس کی زیادتی یا فضلہ کی رکاوٹ یا آنتوں میں رکاوٹ جس کو Intestinal obstruction کہا جاتا ہے۔ شکم کے مشمولات کے بعض اعضاء ایک نالی کے ذریعہ اپنی رطوبت خارج کرتے ہیں مثلاً گردہ، پتہ یا البلبہ۔ اگر کسی وجہ سے اس نالی میں رکاوٹ پیدا ہو جائے جو ان مادوں کو قدرتی راستوں میں لے جاتی ہے تو بھی درد شکم پیدا ہو سکتا ہے آئیے اب درد شکم کی تفصیلات پر غور کریں

پہلے ہم ہضمی نظام سے متعلق اعضاء پر غور کریں گے۔ معدہ کا کام غذا کو جگہ دینا اس کو چھوٹے چھوٹے ریزوں میں تبدیل کرنا اور اپنی خارج شدہ رطوبت سے غذا کی آمیزش کر کے آگے آنتوں میں اس کو جذب کرنے کے لئے بڑھانا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان اکثر اوقات زبان کے

[illegible] پیٹ پر پڑتا رہتا ہے۔ غذائی اثرات بھی معدے کے اتنے ہی مضرت رساں ہے جتنی قلت۔ بسیار خوری اور بھوک دونوں انسان کی زندگی گھٹانے کی موجب ہو سکتی ہیں۔ معدے میں السر یا زخم جسے عام اصطلاح میں Peptic ulcer کہا جاتا ہے آج کل بہت عام ہوتا جا رہا ہے۔ معدے میں ترشے کی زیادتی، تند و تیز مصالحے ذہنی و اعصابی تناؤ، سگریٹ و شراب نوشی اس کی عام وجوہات خیال کی جاتی ہیں۔ بعض اوقات عام طور پر استعمال ہونے والی درد کو کم کرنے والی ادویہ، جن کی آج کل بے پناہ تشہیر بھی کی جاتی ہے اور جس کا خاص جز Aspirin ہوتی ہے معدے میں زخم پیدا کر سکتی ہیں۔ پہلے زمانے میں ان تمام تکالیف کا علاج مختلف قسم کے چورنوں، سوڈا الیمن وغیرہ سے ہوتا تھا یا پھر اکثر اس خیال کے تحت کہ ناف ٹل گئی ہے عاملوں سے یا پیٹ کی مالش کرنے والوں سے رجوع کیا جاتا تھا بلکہ اس بیسویں صدی کے اواخر میں بھی کبھی کبھی ان توہمات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ درد شکم السر کی ایک اہم علامت ہے۔ یہ معدے کے السر میں کھانا کھانے کے فوری بعد شروع ہو سکتا ہے اور اثنا عشری Duodenum کے السر میں جو زیادہ عام ہے کھانے کے 2½، 3 گھنٹے بعد شروع ہوتا ہے اور خلوِ معدہ میں درد کے اس مرض کے دورے پڑتے ہیں اور کبھی کبھی سال چھ ماہ تک بھی یہ علامات غائب ہو سکتی ہیں مگر دوبارہ یہ زیادہ شدت سے کچھ عرصے بعد عود کر آتی ہیں۔ السر کے علاج میں ابتدائی دور میں ادویہ کا استعمال کیا جا سکتا ہے مگر کافی دواؤں سے علاج کے بعد افاقہ نہ ہو تو پھر السر میں پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں ایسی صورت میں السر کا علاج صرف آپریشن سے ممکن ہے

السر کی پیچیدگیاں

السر اگر مندمل نہ ہو تو وہ گہرا ہوتا چلا جاتا ہے اور معدہ یا اثنا عشری میں موجود خون کی شریانوں کو پھاڑ دیتا ہے درد شکم کی شدت کے ساتھ اگر خون کی قے ہو جائے تو مریض کو فوری رجوع دواخانہ کرنا ضروری ہے۔ اگر زیادہ مقدار میں خون قے میں خارج ہو جائے تو مریض Shock میں جا سکتا ہے۔ اور اگر فوری طور پر خون اس کے جسم میں داخل نہ کیا جائے تو اس کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اگر باوجود خون داخل کرنے کے اور خون روکنے کی ادویہ کے استعمال کے خون کی قے آتی رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خون کا اخراج جاری ہے اور سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ فوری آپریشن کیا جائے اور خون

کی ان شریانوں کو باندھ دیا جائے جو خون کے اخراج کا باعث ہیں یا السر سے متاثرہ معدہ
ایک حصہ ہی کاٹ کر نکال دیا جائے جسے Partial Gastrectomy کہتے ہیں۔ اس سے
السر اور خون کے اخراج دونوں کا تدارک ہو جائے اور کبھی کبھی یہ آپریشن مریض
بچانے کے لئے رات یا دن کے کسی بھی حصہ میں کرنا پڑتا ہے۔

السر کی دوسری پیچیدگی جو زیادہ عام ہے اس میں السر کے مندمل ہونے
معدہ کا منہ بالکل بند ہو جاتا ہے اسے ڈاکٹری اصطلاح میں Pyloric Stenosis کہتے
نتیجتاً جو غذا مریض کھاتا ہے وہ آگے آنتوں میں بڑھ نہیں سکتی اور ۲،۳ دن قبل
ہوئی غذا بھی معدے میں ٹھہری رہتی ہے اور سڑتی گلتی رہتی ہے۔ بھوک انسان
ہی نہیں اور معدہ ہر وقت بھرا رہتا ہے۔ السر میں جو درد کھانے کے دو ڈھائی گھنٹے کے
ہوتا تھا اب وہ مسلسل ہونے لگتا ہے۔ مریض کو یا تو قے ہونے لگتی ہے یا جب تک مریض
حلق میں انگلی ڈال کر قے نہ کرلے اسے درد شکم سے نجات نہیں ملتی۔ معدہ بہت زیادہ
پھیل جاتا ہے اور مریض چند دن تک اگر ان علامات سے دوچار رہے تو اس کے جسم
کم غذائی کی علامات پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہیں مسلسل قے کی وجہ سے پانی کی زیادہ
مقدار بھی جسم سے خارج ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں بھی سرجری ناگزیر ہو جاتی ہے
سرجری کے ذریعے اس کا مکمل علاج ممکن ہے۔

السر کی تیسری پیچیدگی جو انتہائی خطرناک ہے اور جس میں فوری جان
کی خاطر دن یا رات جب بھی مریض رجوع ہو سرجری لازم ہے اس کو Perforation
یعنی السر گہرا ہوتے ہوتے معدہ میں دفعتاً سوراخ کر دیتا ہے۔ معدہ کی مشمولات وغیرہ
معدہ کے باہر آ کر پیٹ میں جمع ہونے لگتے ہیں۔ مریض کو بے حد شدید درد شکم ہوتا ہے
پیٹ اکڑ جاتا ہے، ٹھنڈے پسینے چھوٹ جاتے ہیں اور نبض ڈوبنے لگتی ہے۔ فوراً
آپریشن کر کے اس سوراخ کو بند کیا جاتا ہے اور پیٹ کے دوسرے حصوں میں جمع
کو صاف کیا جاتا ہے۔ علامات شروع ہونے کے بعد جتنی دیر سے مریض کا آپریشن کیا
اتنا ہی اس کو جان کا خطرہ بڑھتا جاتا ہے۔

السر کی چوتھی پیچیدگی جس سے ہم سب پناہ مانگتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ
معدہ کا السر از خود معدے کے کینسر میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ بہت سا برس اگر ال

غفلت برتی جائے اور اگر درد شکم مسلسل ہونے لگے، خون کی صحت کم ہو اور غذا بالکل نہ کھائی جاسکے اور خصوصاً اگر مریض ۵۰ سال سے معمر ہو تو غیر معمولی ذرائع تشخیص اختیار کر کے اس کا اطمینان کرنا ضروری ہے کہ خدانخواستہ معدہ کا السر کینسر میں تبدیل تو نہیں ہو گیا ہے۔ اور اگر ایسا ہو تو بھی مرض کے ابتدائی مدارج میں سرجری کے ذریعے اور صرف سرجری کے ذریعہ ہی اس کا علاج ممکن ہے۔ اس سے آپ کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ السر ایک انتہائی خطرناک مرض ہے۔ السر بالکل قابل علاج مرض ہے اور اس کی تمام پیچیدگیاں محض آپریشن سے فرار کا نتیجہ ہیں۔ السر کے علاج کے سلسلہ میں جو آپریشن کئے جاتے ہیں ان میں اموات کا فیصد ایک یا ڈیڑھ سے زیادہ نہیں۔ اگر پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں تو یہ فیصد بڑھ جاتا ہے۔

ہضمی نظام کے دوسرے اعضاء چھوٹی اور بڑی آنت بھی درد شکم کا مبدا ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان میں مختلف قسم کے Infection ہو سکتے ہیں یا بعض اوقات ان میں رسولیاں یا Tumours پیدا ہو سکتے ہیں۔ بڑی آنت میں اکثر رسولیاں کینسر ہوتی ہیں۔ چھوٹی آنت کی مجموعی لمبائی ۲۲ فٹ تک ہوتی ہے۔ اور غذا کو آگے بڑھانے کے لئے اس میں مسلسل حرکت ہوتی رہتی ہے۔ یہیں سے غذا کے طاقت بخش اجزا کا انجذاب عمل میں آتا ہے۔ کبھی کبھی چھوٹی آنت ایک انتہائی عام مرض .T.B سے متاثر ہو سکتی ہے۔ خصوصاً چھوٹی آنت کا آخری حصہ جو بڑی آنت سے جاکر جڑتا ہے۔ .T.B کے اثر سے چھوٹی آنت میں جگہ جگہ زخم پیدا ہو جاتے ہیں اور جب یہ زخم مندمل ہوتے ہیں تو آنت کے سوراخ کو تنگ کر سکتے ہیں۔ نتیجتاً آنتوں میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے، شدید درد شکم پیدا ہوتا ہے، پیٹ پھول جاتا ہے۔ قے مسلسل ہوتی ہے۔ محض .T.B کی ادویہ سے اس مرض کا علاج ممکن نہیں۔ البتہ سرجری کے ذریعہ آنت کے ان حصوں کو جو تنگ ہو گئے ہیں کاٹ کر نکال دیا جا سکتا ہے اور تنگ حصوں کے اوپر اور نیچے کے نارمل حصوں کو جوڑ کر رکاوٹ کا انسداد کیا جا سکتا ہے۔

بعض اوقات چھوٹی اور بڑی آنت اپنی نارمل حرکت کے دوران بل یا پیچ بھی کھا سکتی ہیں۔ نتیجتاً ان میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے یعنی Int Obstruction کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور اگر وہ ایک سے زیادہ مرتبہ بل کھا جائیں تو ان کو خون پہنچانے والی شریانیں بھی بند ہو جاتی ہیں اور متاثرہ حصہ نیلا اور پھر کالا ہو کر مردہ ہو جاتا ہے نتیجتاً آنت پھٹ سکتی ہے۔ اس میں بھی شدید درد شکم، پیٹ کھلنے تاشہ پھول جانا،

مسلسل قے وغیرہ اس کی علامات ہوتی ہیں اس کا علاج بھی صرف سرجری سے ہی ممکن ہے ۔ فتق یا Ing. Hernia ایک بہت عام مرض ہے ۔ اس میں ران کے اوپری حصہ میں ایک قدرتی سوراخ ہے جو بعض صورتوں میں کمزور ہو جاتا ہے عموماً چھوٹی آنت کا ایک حصہ جلد کے نیچے پھول کر آجاتا ہے ۔ یہ بیماری مریض کے لئے اس کمزوری کی وجہ سے وزن اٹھانا یا محنت اور مشقت کے کام کرنا ناممکن ہو جاتا ہے ۔ عموماً مرض کے ابتدائی مدارج میں آنت خود باہر آتی اور اندر جاتی رہتی ہے ۔ اگر کسی وجہ سے آنت کا بڑا حصہ اس کمزور جگہ سے دفعتاً باہر آجائے تو وہاں وہ اٹک سکتا ہے ۔ اس میں ورم آجاتا ہے اور درد شروع ہو سکتا ہے ۔ چونکہ اس میں بھی آنتوں کا سوراخ بند ہو جاتا ہے اس لئے Int. Obst کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے ۔ اگر اس کا فوری آپریشن نہ کیا جائے تو آنتوں کے متاثرہ حصے کا دوران خون بند ہو کر اسے مردہ کر سکتا ہے اور اس مرض میں صرف آپریشن ہی انسان کی جان بچا سکتا ہے

بچے اکثر غیر ضروری طور پر مختلف اشیاء منہ میں ڈال لیتے ہیں ۔ بچے اور کبھی کبھی بڑے بھی سیٹیاں گولیاں، سکے بٹن یا سوئیاں وغیرہ نگل لیتے ہیں ۔ ان میں سے اکثر وہ اشیاء جو نوکدار نہیں ہیں از خود قدرتی راستہ سے باہر نکل آتی ہیں مگر بچوں میں اگر نگلی ہوئی چیز کا حجم زیادہ ہو تو بعض اوقات یہ آنتوں میں پھنس سکتی ہیں ۔ نوکدار اشیاء آنتوں یا معدہ کی دیوار میں پیوست ہو سکتی ہیں اور وہاں سوراخ بھی کر سکتی ہیں ۔ ان تمام حالات میں شدید درد شکم اور پیٹ کے اکڑ جانے کی شکایت کی جاتی ہے ۔ ایکسرے کے ذریعے اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ایسی کوئی چیز اٹکی ہوئی ہے تو سرجری کے ذریعے اسے بآسانی باہر نکالا جا سکتا ہے اور مریض کو مرض سے مستقل نجات دلائی جا سکتی ہے ۔

ٹائیفائڈ ایک عام مرض ہے جس میں مریض کو مسلسل ۳ ہفتے اگر دوا علاج نہ کیا جائے تو بخار آسکتا ہے ۔ یہ مرض چھوٹی آنت کے ٹائیفائڈ کے جراثیم سے متاثر ہونے سے ہوتا ہے ۔ اس مرض کے نتیجے میں مرض کے دوسرے ہفتے میں بعض اوقات آنتوں کے زخم گہرے ہو کر سوراخ پیدا کر سکتے ہیں نتیجتاً شدید درد شکم اور پیٹ کا اکڑ جانا خطرناک علامات ہیں اور بعض صورتوں میں سرجری ناگزیر ہو جاتی ہے ورنہ مریض جو کہ مسلسل بخار کی وجہ سے خود انتہائی نحیف ہو چکا ہوتا ہے بالکل موت کے دہانے پر پہنچ جاتا ہے ۔

کینسر Cancer ایک انتہائی خطرناک مرض ہے ۔ باوجود دن رات کی

تحقیق کے جو کہ دنیا کے تمام ممالک میں کینسر کے خلاف جاری ہے ابھی تک اس پر قابو پانا ممکن نہیں ہو سکا ہے۔ کینسر سے چھوٹی آنت کم اور بڑی آنت بیشتر متاثر ہوتی ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ مرض رسولیاں پیدا کر سکتا ہے۔ بڑی آنت میں کینسر کی علامات میں اسہال اور قبض یا اجابت میں خون کا اخراج علامات ہو سکتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ آنتوں کے سوراخ کو بند کر کے Ints Obst کی کیفیت پیدا کر سکتی ہیں۔ درد شکم کے ساتھ اگر بیرونی معائنہ میں کوئی رسولی یا شیومر محسوس کیا جائے تو اس مرض کا شبہ کیا جانا چاہئیے۔ مریض کی آئندہ زندگی کا انحصار متاثرہ آنت کو سرجری سے کاٹ کر نکال دینے پر ہی ہوتا ہے۔ اور فوری تشخیص کی صورت میں کافی امید افزا نتائج نکلنے کا امکان رہتا ہے۔

بڑی آنت کے ابتدائی حصے یعنی Caecum سے منسلک ایک Appendix ، ۲ سے $2\frac{1}{2}$ لمبا نالی نما عضو ہے جو انگشت کی طرح Caecum سے منسلک ہوتا ہے۔ اس کا سوراخ ایک سرے پر بند ہوتا ہے تو دوسرے سرے پر Caecum میں کھلتا ہے۔ اس عضو میں اس کا احتمال زیادہ رہتا ہے کہ وہ عفونت یا آنتوں کی کثافت سے بھر جائے۔ چونکہ کثیف مادہ اس میں محصور ہو کر رہ جاتا ہے اس میں سوزش جلد پیدا ہو جاتی ہے جسے Acute Appendicitis کہا جاتا ہے۔ درد شکم اس میں شدید شروع ہوتا ہے، مریض کو قے بھی ہوتی ہے اور ہلکا بخار ہو سکتا ہے۔ پہلے درد شکم ناف کے اوپر شروع ہوتا ہے جو بعد میں پیٹ کے نچلے حصہ میں دائیں جانب آ کر ٹھیر جاتا ہے۔ اگر فوری طور پر مریض کا آپریشن نہ کیا جائے تو اس بات کا خدشہ رہتا ہے یہ عضو پیپ یا فاسد مادہ کی شدت سے پھٹ جائے۔ اور اگر یہ صورت پیش آ گئی ہو کہ عموماً آپریشن سے گریز کا رد عمل ہوتی ہے تو خطرناک نتائج پیش آ سکتے ہیں۔

Gall Bladder پتہ، جگر کے نیچے ایک تھیلی نما عضو ہوتا ہے۔ یہ جگر سے ایک نالی کے ذریعے منسلک ہوتا ہے۔ یہ نالی Bile یا صفرہ جو کہ جگر میں پیدا ہوتا ہے اس کو پتے میں منتقل کرتی ہے۔ صفرہ پتے میں ذخیرہ کیا جاتا ہے اور ایک دوسری نالی کے ذریعے جو کہ اثنا عشری یا Duodenum سے منسلک ہوتی ہے۔ صفرہ پتے سے غذائی نالی میں منتقل ہوتا رہتا ہے اس کو Common Bile Duct کہتے ہیں۔ صفرہ غذا کے ہضم کرنے میں اہم جز ہے اور غذا کے ہضم کرنے کے لئے درکار صفرہ کی ضرورت کے لحاظ سے وقتاً فوقتاً منسکر تا ہے اور صفرہ آنتوں میں خارج کر دیتا ہے۔ صفرہ میں Cholestrol اور

دوسرے نمکیات Bile Salts پائے جاتے ہیں ۔ اگر عفونت یا Infection پتّہ کو متاثر کرے تو اس میں بھی Appendicites جیسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ درد شکم شدید ہوتا ہے ، قے ہوتی ہے ، غذا ہضم نہیں ہوتی اور گیس کا بننا بہت زیادہ ہوتا ہے ۔ یہ مرض خصوصاً خواتین میں زیادہ ہوتا ہے اور ۵ F سے اس کو تشبیہ دی جاتی ہے Fat, Forty, Female, Flabby, Fertile. عموماً ۴۰ سالہ خواتین جو فربہ اندام ہوتی ہیں ، کثیر الاولاد ہوتی ہیں ان میں پتّے کے امراض زیادہ ہو سکتے ہیں ۔ Cholecytites کی وجہ سے پتّہ یا اس کی نالیوں میں جو صفرہ کو منتقل کرتی ہے پتھر بھی بن سکتے ہیں ۔ یہ پتھر اگر جمع ہو کر صفرہ کی نالی کو بند کر دیں تو یرقان ہو سکتا ہے ۔ یہ یرقان جب تک رکاوٹ دور نہ کی جائے کم نہیں ہو سکتا ۔ یہ یرقان جو عام قسم کا وبائی یرقان ہوتا ہے اور جو غذا میں ایک Virus Infection سے ہوتا ہے ۔ جو Infectious Hepatitis سے مختلف ہوتا ہے ۔ اگر پتّہ یا اس کی نالیوں میں پتھر بن جائیں تو اس کا علاج بھی صرف سرجری سے ہوتا ہے ۔ یہ ضروری ہے کہ نہ صرف صفرہ کی نالیوں میں موجود پتھر نکالے جائیں بلکہ چونکہ یہ پتھر عموماً پتّے میں Infection کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ پتّے ہی کو نکال دیا جائے ۔ اگر یرقان نہ ہو یا پتھروں کا وجود عمل میں نہ بھی آئے تو بھی محض پتّے کے متورم ہونے سے بھی ایک طویل بیماری عمل میں آتی ہے جس میں سوء ہضمی ، گیاس سیز کا ضرورت سے زیادہ بننا ، درد شکم ہوتا رہتا ہے اس میں بھی پتّے کو نکالنا ضروری ہے ۔

لبلبہ یا Pancreas بھی ایک غدود ہے جو معدہ کے پیچھے ریڑھ کی ہڈی کے سامنے پایا جاتا ہے ۔ اس کا ایک کام تو Insulin بنانا ہے اور جس کی بے ضابطگی کی وجہ سے مرض Diabetes ذیابیطس لاحق ہوتا ہے ۔ دوسرا یہ ایک قسم کی رطوبت خارج کرتا ہے جو ایک نالی کے ذریعے چھوٹی آنت کے ابتدائی حصے یعنی Duodenum میں کھلتی ہے ۔ یہ رطوبت بھی غذا کو ہضم کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے ۔ بعض اوقات اس عضو میں بھی پتھر بن سکتے ہیں یا اس میں سوزش ہو سکتی ہے ۔ اس میں شدید درد شکم کے ساتھ انتہائی خطرناک Shock بھی ہو سکتا ہے ۔ اس مرض کا علاج بھی صرف سرجری سے ممکن ہے ۔

بڑی آنتوں میں Amoebic Dysentry ایک عام مرض ہے ۔ یہ جراثیم بعض اوقات آنت سے خون کے ذریعہ منتقل ہو کر جگر کو متاثر کرتے ہیں اور متورم کرتے ہیں ۔ بعض

صورتوں میں اس مرض کی وجہ سے جگر میں پیدا ہو سکتا ہے جس میں سیکڑوں سوامی پیپ کا ہوتا ہے۔ علامات میں درد شکم، پیٹ کا اکڑ جانا اور تنفس میں دشواری شامل ہیں۔ اس کا علاج پیپ کے سوئی کے ذریعہ یا پیٹ چاک کر کے خارج کرنے سے ہی ہو سکتا ہے۔

گردے انسان کے جسم کے لئے فضلہ کے اخراج کا اہم ذریعہ ہیں۔ پیشاب کا شریانی میں مختلف قسم کی قلمیں شامل ہیں جو کہ ہمیشہ خارج ہوتی رہتی ہیں۔ بعض غذائی چیزوں کے استعمال سے ان کی مقدار میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اگر ساتھ ہی ساتھ گردوں یا ان سے متعلق نالیوں میں اگر عفونت یا Infection پیدا ہو جائے تو پتھروں کے بننے کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔ یہ پتھر یا تو گردوں میں بن سکتے ہیں یا پیشاب کی اس نالی میں جو گردوں کو مثانہ سے ملاتی ہے یعنی Ureter یا خود مثانہ میں۔ پتھر ابتدا میں بہت چھوٹے ہوتے ہیں اور اس کا امکان ہے کہ ابتدائی دور میں جب ان کی سائز کم ہو تو وہ خود گردے سے مثانہ میں اور پھر قدرتی راستہ سے باہر نکل جائیں۔ ان میں اگر حرکت نہ ہو اور ایک جگہ پھنس جائیں تو اس کا امکان رہتا ہے کہ مزید نمکیات اور قلمیں ان پر جم کر ان کے حجم میں اضافہ کر جائیں چنانچہ گردے اور مثانہ میں متعدد اور بڑے بڑے پتھر بن سکتے ہیں۔ اگر پتھر کا حجم بڑھ جائے تو پھر ان کا از خود نکلنا مشکل ہوتا ہے۔ پتھروں کی موجودگی میں شدید درد گردہ ہوتا ہے جو کہ کمر کے حصے میں محسوس ہوتا ہے۔ انسان درد کی شدت سے مچھلی کی طرح تڑپنے لگتا ہے عموماً پیشاب میں جلن ہوتی ہے اور کبھی کبھی وہ رک جاتا ہے اور بڑا پتھر ایک سبب پیشاب کی نالی کو بالکل بند کر دے تو گردہ پھیلنا شروع ہو جاتا ہے۔ ان تمام امراض کے ازالے کے لئے سرجری کام آتی ہے۔ بعض اوقات T. B. اور کینسر کا مرض بھی گردے کو متاثر کر سکتا ہے ایسی صورتوں میں اگر دوسرا گردہ سالم ہو تو ناکارہ گردہ نکال دیا جا سکتا ہے۔

خواتین میں درد شکم کا احتمال مردوں کے مقابلے میں زیادہ رہتا ہے ان کے پیدائشی اعضاء مثلاً رحم، ٹیوبس اور Ovaries وغیرہ پائے جاتے ہیں جو مردوں میں نہیں ہوتے۔ ان تمام اعضاء میں Infection اور کینسر پیدا ہونے کا خدشہ لگا رہتا ہے ان عوارض میں درد شکم نچلے پیٹ تک یا کمر کے درد تک محدود رہتا ہے۔

اس طرح آپ نے دیکھا کہ درد شکم کی وجوہات بے شمار ہیں حکیم صاحب کے عرب آپ

(بقیہ صـ پر)

لے کر سرجن کے چاقو تک نوبت پہنچ سکتی ہے۔ تشخیص، صحیح تشخیص اور جلد از جلد
تشخیص ہی مرض کے ازالہ کا راز ہے۔ آپریشن کے تخیل سے جہاں کچھ لوگ اب بھی کانپ
جاتے ہیں وہاں ترقی یافتہ ممالک میں اگر سرجن مریض کے معائنہ کے بعد ضرورت ہونے پر بھی
آپریشن نہ کرے تو اس کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ اکثر امراض سرجری
کے ذریعہ فوری قابل علاج ہوتے ہیں۔ تساہل، خوف یا توہمات کی وجہ سے اگر دیر کی جائے تو
ممکن ہے امراض زیادہ پیچیدہ ہو جائیں اور ایسی صورت میں نتائج بھی امید افزا نہیں ہوتے
فن بیہوشی کی ترقی کے بعد بڑے سے بڑا آپریشن بھی ہر عمر میں ممکن ہے۔ اگر انسان
ہر طرح سے سالم ہو — اور اموات کا فیصد عام طور پر بڑے سے بڑے آپریشن میں
بھی ۲، ۲½ فیصد سے زیادہ نہیں۔ آپریشن کے بعد ہونے والے درد یا تکلیف کا ازالہ بھی
درد دور کرنے والی انجکشن اور ادویہ سے ممکن ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ ہمت اور اولوالعزمی
سے کام لیا جائے۔ لہٰذا آپ سے گزارش ہے کہ آپریشن تھیٹر کو مقتل اور سرجن کو قاتل
کا درجہ دینے والے جاہلوں کی باتوں میں ہرگز نہ آئیں اور اگر ضرورت ہو تو بے جھجک
ہماری خدمات سے استفادہ کریں۔

آزادی و محکومی

محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دل زندہ و پرسوز و طربناک

آزاد کی دولت دل روشن نفس گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک

ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش
وہ بندۂ افلاک ہے یہ خواجۂ افلاک

علامہ اقبال ؒ

محمد برہان یسین

گردے ۔ قدرتی لیبارٹری

یہ بات کہنے میں عجیب لگتا ہے کہ گردے خراب دل کے ساتھ کام چلا سکتے ہیں لیکن دل خراب ے کے ساتھ قطعی کام نہیں کرسکتا۔ لیکن یہ حقیقت ہے۔

گردے بلاشبہ دل پھیپھڑے کی طرح زندگی کے لئے ضروری اعضاء ہیں۔ شاید ان کی اہمیت پیش نظر ہی قدرت نے دو گردے عطا کئے ہیں۔ اور ان میں یہ صلاحیت بھی دی کہ ایک گردہ بھی اگر صحت مند پورے کام کا بوجھ اٹھا لیتا ہے۔ لیکن اگر دونوں گردے ناکارہ ہو جائیں تو اعلیٰ ترین دماغ اور صحت مند ں کام سے معذور ہو جاتے ہیں۔

گردہ کے غیر معمولی پیچیدہ اور پھیلے ہوئے کام کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ اگر یہ کام لیبارٹری انجام دے تو اس میں ۱۴ میل طویل نلیوں کے نظام اور کروڑوں فلٹرس کی ضرورت ہوگی۔ جب کہ ت کی یہ لیبارٹری یعنی گردہ کا وزن صرف ۱۵۰ گرام ہوتا ہے۔ اور یہ ننھی سی قدرتی لیبارٹری دن بھر میں ے جسم کے خون کو (جو ۵ تا ۶ لیٹر ہوتا ہے) پچیس دفعہ مکمل صاف کرتی ہے۔

گردے دن بھر میں جملہ ۱۷۰ لیٹر مائعات کو چھانتے ہیں جن میں سے دو لیٹر مائعات جسم سے باہر کر دیئے جاتے ہیں۔ گردہ خون میں نمک پانی اور ترشہ کی مقداروں کی مناسب سطح قائم رکھتا ہے۔ مقصد کے لئے گردے اپنے کام سے ہٹ کر دو اہم ہارمون ـــ رے نن RENIN اور پوائٹنس (ERYTHROPOIETIN) ــ تیار کرتے ہیں۔ رے نن۔ خون کے دباؤ پر قابو ہے اور ارتھرو پوائٹنس سرخ جسیموں (RBC) کی پیداوار میں مدد کرتا ہے۔

چونکہ گردہ اپنی کارکردگی کے بالکل معدوم ہونے تک بھی کام کرتا ہے اس لئے عام طور پر اسکا احساس نہیں ہونے پاتا۔

گردہ کے فلٹرس میں سے خون سے قابل اخراج تمام کیمیائی مرکبات کا اخراج مطلوبہ ہوتا ہے

کیمسٹ ۔ ریجنل ریسرچ لیبارٹری حیدرآباد

اس لئے ان کو جسم ہمیشہ ایسی شکل میں (یعنی حل شدہ) گردوں کو بہم کرتا ہے کہ ان کا اخراج ممکن ہو سکے لیکن بعض اوقات جسم کا یہ نظام غیر کارکرد ہوتا ہے جس کی وجہ سے بعض مرکبات خارج نہیں کئے جاسکتے اور گردہ میں ڈپازٹ ہونے لگتے ہیں۔ یہی پتھری بننے کا آغاز ہوتا ہے۔

یہ ڈپازٹ ہونے والے مرکبات دو قسم کے ہوتے ہیں ایک کیلشیم کے آکزالیٹ CALCIUM OXALATE اور دوسرے کیلشیم کے سلفیٹ (CALCIUM SULPHATE) اس کے علاوہ اگر گٹھیا کی بیماری ہو تو یورک ایسڈ (URIC ACID) کی پتھری۔

گردہ کی ایک اور خرابی یہ ہے کہ اگر اس کی چھلنیاں (فلٹرس) خراب ہو جائیں تو اُلبومن (ALBUMIN) پیشاب سے خارج ہونے لگتی ہے۔ اور اس کے اخراج سے جسم کا جراثیم کے خلاف مدافعتی نظام متاثر ہو جاتا ہے۔

کبھی گردہ پر بیکٹریا قابض ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے پیشاب میں پیپ (PUS) کے خلیے خارج ہونے لگتے ہیں۔ اس کو "نفرائٹس" کہتے ہیں۔

گردوں کی خرابیوں کی علامات

۱۔ پیشاب کا زیادہ آنا یا بار بار آنا، خصوصیت سے رات میں آنا۔

۲۔ خون یا چائے کے رنگ کا پیشاب آنا۔

۳۔ آنکھوں کے گرد سوجن، پاؤں یا ہاتھ کا سوجنا

۴۔ پیٹھ کے نیچے درد ہونا (خصوصیت سے بچوں میں) جو مسلسل ہوتا ہے۔

اگر ان میں کوئی بھی علامت ظاہر ہو جائے تو فوراً پیشاب کا معائنہ کروانا چاہیئے اور ڈاکٹر کی نگرانی میں اگر ضرورت ہو تو ایکس رے، اور پھر علاج ضروری ہے۔

میڈیکل سائنس کیا کر سکتی ہے؟

۱۔ میڈیکل سائنس نے گردہ کے بیکٹریا سے متاثر ہونے پر اس کی صحت کے لئے دوائیں دریافت کی ہیں۔

۲۔ پتھری بننے کی صورت میں ابتدائی قسم کی جراحی اور انتہائی صورت میں گردہ کو نکال دینے کی جراحی کا فن ایجاد کر لیا ہے۔

۳۔ دونوں گردے بیکار ہو جائیں تو مصنوعی طور پر ڈیالیسس (DYALYSIS) کر کے خون

Regd. No. H/HD 593.

nthly SHADAAB Hyd.

11-5-147, RED HILLS, HYD-500 004.

Vol I No 12 NOVEMBER 1984.

دوسرا مسئلہ خون اور عضلات وغیرہ کی مناسبت کا ہے۔ مگر ایسے ذرائع دستیاب ہیں جو مکمل کر دیتے ہیں اور پیوند کاری کو صد فیصد محفوظ کر لیتے ہیں۔

پیوند کاری TRANS PLANT میں جن مریضوں کو قریبی رشتہ داروں سے گردے ملے ہیں ان کے زندہ رہنے کا فیصد ۹۰ ہے۔ جب کہ اور ذرائع سے گردے حاصل کرنے والوں کا فیصد ۶۰ ہے۔

کوئی بھی شخص جس کی عمر ۱۸ سال سے زائد ہو اور صحت مند ہو محض ایک کاغذ پر راضی نامہ لکھ کر اپنے گردہ کا عطیہ دے سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں قانون سازی ہو چکی ہے۔ عام طور پر ایسے کم عمر (نوجوان) ہی بہتر عطیہ دہندہ ہوسکتے ہیں جو حادثہ میں مر گئے ہوں۔ یا زہر کھا کر یا دماغی سرطان سے فوت ہوئے ہوں۔

بہر حال یہ واضح ہے کہ اگرچہ میڈیکل سائنس نے گردے کے مسائل کو حل کرنے میں بڑی نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں لیکن یہ بھی درست ہے کہ ان میں سے کوئی بھی علاج مریض کو اس کی بالکل نارمل زندگی نہیں دے سکتا۔ جس میں کوئی مسئلہ اور خطرہ نہ ہو۔

○○

قاضی جلیل احمد

البدر

(گذشتہ شمارے میں یہ بیان کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ انور سادات جو بڑے صلح پسندانہ عزائم کے ساتھ مصری سیاست کے منصہ شہود پر جلوہ گر ہوا تھا بالآخر کیسے اس نتیجہ پر پہنچا کہ مصر کے لئے اپنا کھویا ہوا علاقہ اور وقار دوبارہ حاصل کرنے کے لئے جنگ کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔
اب آگے ملاحظہ ہو)

یقت اسرائیل :-

پہلی جنگ عظیم کے بعد جب فلسطین برطانوی انتداب میں دیا گیا تو وہاں اس وقت ی کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بلکہ اس سے بھی کم تھی۔ جنگ عظیم کے دوران جہاں انگریزوں کے خلاف عربوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے شریف حسین مکہ پر ڈورے ڈالے کہ جنگ میں کی کامیابی کی صورت میں جزیرۃ العرب پر شریف حسین کی حکومت تسلیم کی جائے گی وہاں صیہونی تحریک کے سب سے بڑے لیڈر شام وائزمن سے بھی یہ خفیہ معاہدہ کر رکھا تھا کہ کی کامیابی کی صورت میں فلسطین میں یہودی ہوم لینڈ قائم کیا جائے گا۔ یہاں یہ امر واضح سب معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جزیرۃ العرب میں نہ صرف جزیرہ نمائے عرب بلکہ لسطین، شام اور عراق بھی شامل سمجھے جاتے تھے۔ اس طرح سے انہوں نے ایک علاقہ ت دو مختلف فریقوں کو دینے کا معاہدہ کر لیا۔ جنگ عظیم کے بعد یہودیوں نے برطانوی حکومت نا شروع کر دیا کہ وہ اپنے کئے ہوئے وعدوں کا (جن کو اعلان بالفور کے نام سے یاد کیا ے) ایفاء کرے۔

ظاہر ہے کہ لاکھوں کی عرب آبادی کے بیچ صرف چند ہزار یہودیوں کے لئے ایک الگ تو نہیں بنائی جا سکتی تھی اس لئے وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ فلسطین میں کو غیر محدود آبادکاری کا موقع دیا جائے۔ چنانچہ عالمی یہودی دباؤ کے آگے برطانیہ کو

جھکنا پڑا اور فلسطین میں تیزی سے یہودیوں کی آبادکاری کا کام شروع ہو گیا۔ جگہ جگہ یہودی نو آبادیاں اور زرعی فارم قائم ہونے لگے۔ خود تل ابیب بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ ان مزرعوں سے عرب فلاحین کو بے دخل کر کے یورپ اور خصوصاً مشرقی یورپ سے ہجرت کر کے آنے والے یہودیوں کو ان مزرعوں پر آباد کیا جانے لگا۔ یہ مزرعے اور فارم ان عرب اور ترک افندیوں، آغاؤں اور پاشاؤں سے خریدے جاتے تھے جو بیروت، بغداد اور قسطنطنیہ میں چین کی زندگی گذار رہے تھے اور جن کو ان اراضیات سے پیسے کے علاوہ اور کوئی دلچسپی نہ تھی اراضیات کی ایسی خرید و فروخت ہمیشہ ہی سے ہوتی آئی تھی اور مقامی فلاحین کو کبھی اس سے غرض نہیں ہوتی تھی کہ اراضی کی ملکیت کس پاشا کے ہاتھ سے نکل کر کس افندی کے قبضہ میں چلی گئی ہے مالک چاہے آغا ہو یا آفندی کسان ہمیشہ وہی فلسطینی فلاح ہی ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب پہلی مرتبہ یہ تبدیلی دیکھنے میں آئی تھی کہ ملکیت کی منتقلی کے ساتھ فلاح کی بے دخلی بھی عمل میں آنے لگی اور اس زمین پر مشرقی یورپ کا کوئی یہودی کسان کاشت کرتا دکھائی دینے لگا۔ اس طرح دھڑا دھڑ فلسطینی کاشتکار اراضیات سے بیدخل ہو کر بے روزگار اور دانے دانے کو محتاج ہونے لگے۔ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی فاقہ کشی سے تنگ ہو کر جب انہوں نے ان کھیتوں پر حملے کر کے لوٹ کھسوٹ مچائی تو ان کی مدافعت کے لئے یہودیوں نے مسلح گارڈ کی شکل میں پرائیویٹ فوجی تنظیمیں قائم کرنی شروع کر دیں جو ہگانا وغیرہ مختلف ناموں سے موسوم تھیں۔ ان مسلح گارڈز کا طریقہ عمل شروع ہی سے یہ تھا کہ ان حملہ آور فاقہ کش فلاحین کا دور دور تک پیچھا کرتے ہوئے ان عرب بستیوں کو نذر آتش کر دیتے جو راہ میں ملتی تھیں اور بے خبری میں مقامی باشندوں پر حملہ کر کے ان کو موت کے گھاٹ اتار دیتے یہ مسلح گارڈز اعلیٰ قسم کے ہتھیاروں سے لیس ہوا کرتے تھے اور یہودی تنظیمیں ان کے اہل و عیال کی کفیل ہوا کرتی تھیں۔ اس طرح دوسری عالمگیر جنگ شروع ہونے تک فلسطین میں یہودیوں کی آبادی چند ہزار سے بڑھ کر لاکھوں تک پہنچ گئی۔

دوسری جنگ کے آغاز کے بعد جب ہٹلری فوجوں کا ہیبت ناک سایہ مڈل ایسٹ پر منڈلانے لگا اور عراق میں رشید عالی کی ناکام بغاوت کے بعد انگریز اس علاقے کی سلامتی کے تعلق سے اور زیادہ متفکر ہو گئے تو یہودیوں نے ایک بار پھر فلسطین میں اپنی خدمات انگریزوں کو پیش کیں انہوں نے اپنی ساری پرائیویٹ فوجیں اتحادیوں کی کمان میں دے دیں۔ اس کے بدلے میں انگریزوں نے نہ صرف انہیں فلسطین میں چھوٹے اسلحہ کی تیاری کے کارخانے قائم کرنے کی اجازت دے دی بلکہ

...مار فنکار فوجوں کو اس فرانسیسی حکومت کے خلاف (جو شام میں قائم تھی اور ڈیگال کے بجائے ...شی حکومت کی طرفدار تھی) گوریلا کارروائیاں کرنے کی تربیت بھی دینی شروع کر دی ۔

۱۹۴۷ء میں بعد کشمکش بسیار فلسطین میں امریکہ اور اقوام متحدہ کی مساعی سے صیہونی ...ت کا دیرینہ خواب شرمندہ تعبیر ہوا اور اسرائیل کے نام سے وہ سلطنت وجود میں آئی جو کینسر ...ح مشرق وسطیٰ میں پھیلتی اور بڑھتی چلی جا رہی ہے ۔ عربوں نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ...ملکت کی طاقت کا غلط اندازہ لگایا ۔ وہ بھول گئے کہ ان کا مقابلہ ایک ایسی طاقت سے تھا ...ن کو ایک تحریک نے جنم دیا تھا جس کی پشت پناہی پر عالمی یہودی برادری کے خزانوں کی تھیلیاں ...جس کی عسکری تربیت انگریزوں کی ماہرانہ سرپرستی میں ہوئی تھی اور جس کو امریکی کارخانوں ...نکلنے والے بہترین اسلحہ کی امداد حاصل تھی ۔ پانچ عرب ملکوں نے مل کر اس پر حملہ کیا لیکن سب ...ر بمشکل چالیس ہزار سپاہی میدان میں لا سکے جب کہ اس نوزائیدہ اسرائیلی مملکت کی حملہ فوج ...داد ساٹھ ہزار سے اوپر تھی ۔ مصر اردن عراق شام لبنان پانچ عرب ملکوں کو شکست فاش ہوئی ...علاقہ میں جہاں اقوام متحدہ نے ازراہ نوازش اسرائیلی مملکت کے قیام کی اجازت دی تھی ...سرائیلیوں نے لوٹ مار قتل آتش زنی اور زنا بالجبر کا بازار گرم کر دیا جس کی وجہ سے لاکھوں ...نی عرب اپنے گھر بار چھوڑ کر ہمسایہ عرب ریاستوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے ۔ چشم ...میں اس علاقے کی عرب اکثریت ایک حقیر اقلیت میں تبدیل ہو گئی ۔

قیام اسرائیل کے بعد سے مسٹر بنگوریان نے پہلے تو ڈیفنس منسٹر اور اس کے بعد ...عظم کی حیثیت سے ہمیشہ عرب اور اسرائیل کے درمیان مفاہمت کی کوششوں میں رخنے ڈالے ...روڑے اٹکائے تاکہ اسرائیلی توسیع پسندی کا سلسلہ جاری رہے ۔ ۱۹۵۶ء میں ان کی ...یع پسندی کا خواب بلگانن اور آئزن ہاور کے غیض و غضب کا شکار ہو کر پراگندہ ہو گیا ۱۹۶۷ء میں ایسی کوئی طاقت باقی نہیں رہی تھی جو انہیں اپنے مفتوحہ علاقوں سے نکلنے کا حکم ...سکتی ۔ اس کا انہوں نے پوری طرح سے فائدہ اٹھایا ۔ یروشلم کو باقاعدہ اپنی عملداری میں ...لے کے اپنا پائے تخت بنالیا ۔ ویسٹ بنک غازہ اور گولان کے علاقوں میں اپنی نوآبادیاں ...ئیں ...ستانی میں نہر سوئز کے کنارے دفاعی قلعے تعمیر کئے اور بہ بانگ دہل یہ اعلان کر دیا کہ کوئی طاقت ہمیں ۶ جون ۱۹۶۷ء کی سرحدوں کو لوٹنے پر مجبور نہیں کر سکتی ۔

اسرائیلی حکومت کی یہ روش صیہونی فلسفے کے عین مطابق تھی ۔ صیہونی فلسفہ

تصرانیہ ہے کہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کا خدائی حق حاصل ہے اور دنیا کی کسی بھی قوم
دخواہ کتنے ہی عرصے سے وہاں آباد کیوں نہ ہو یہ حق نہیں ہے کہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے
سے باز رکھ سکے ۔ ان سے پہلے بھی اور قومیں فلسطین میں آباد تھیں لیکن خدا نے ان سب کو
نیست و نابود کرکے یہودیوں کو وہاں لا بسایا تھا ۔ اسی طرح آج بھی انہیں یہ حق حاصل ہے کہ
ان سارے غیر یہودیوں کو جو خدا کی ان سے ناراضگی کے دور میں ارض فلسطین میں آباد ہوئے وہاں
سے نکال باہر کرکے خود وہاں آباد ہو جائیں ، یہ خداداد حق کوئی ان سے نہیں چھین سکتا ۔

یہی وجہ ہے کہ کوئی اسرائیلی حکومت جو صیہونیت کے فلسفہ پر عمل پیرا ہونے کی
مدعی ہو یہ جرأت نہیں کر سکتی کہ اسرائیل کے مفتوحہ کسی بھی علاقے سے جو آبادکاری کے قابل ہو
برضا و رغبت دستبردار ہو جائے ۔ دراصل اسرائیلی حکومت خود اپنی تخلیق کے خمیر میں وہ جراثیم
پوشیدہ رکھتی ہے جو اسے توسیع پسندی پر مجبور کرتے رہتے ہیں ۔ اسرائیلی مملکت ان
قسمت آزما افراد کا مجموعہ ہے جو دنیا کے گوشے گوشے سے محض اس لئے اکٹھے ہوئے ہیں کہ اس
خطیر دولت سے جو دنیا کی مہذب حکومتوں کی پرامن اور عادلانہ پالیسیوں کے صدقے میں انہوں نے
جمع کی تھی اور علم و فن کے ہر میدان میں ان ملکوں کی بہ صرف زر کثیر مہیا کردہ سہولتوں سے فائدہ
اٹھا کر جو ترقی انہوں نے کی تھی اس کے بل بوتے پر ایک ایسی کارپوریٹ اسٹیٹ کی بنیاد ڈالیں
جس کا سرمایہ مسلسل بڑھتا رہے جس کا حلقۂ عمل مسلسل وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے
اور جس کے ثمر سے وہ بلا شرکت غیرے تنہا مستفید ہوں ۔ یہ خطرہ ابھی اپنے عہد طفلی میں ہے
لیکن پوت کے پانوں پالنے ہی میں دکھائی دینے لگے ہیں ۔

(باقی آئندہ)

ڈاکٹر ناصرہ

چھوٹی سی نیلی باسکٹ

کچھ دیر میرے جواب کے انتظار کے بعد انہوں نے کہا " ایک بات بتاؤ گی ۔ تمہارا مضمون
یات بھی تو ہے ، ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جن کا میں نے کڑے وقتوں میں ساتھ دیا اور جو مجھ سے
مد قریب ہوگئے ، کچھ عرصہ گذرنے کے بعد کیوں میرے ساتھ دغا بازی پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور
ے اتنے مخالف ہو جاتے ہیں کہ میری صورت بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے ؟ "

ان کا یہ سوال بھی میری خاموشی کے طلسم کو نہ توڑ سکا ۔

کچھ دیر وہ بھی خاموش رہیں پھر انہوں نے کہا کہ " اب مادھوری ہی کو دیکھ لو ، میں تو اس وقت
ان کی سرپرستی کرتی رہی جب کہ ایک دیہاتی اسکول سے پڑھ کر وہ یہاں نئی نئی کالج میں داخل
تھیں لیکن اس کا صلہ مجھے کیا ملا ؟ ۔ مادھوری ہی نے کہا تھا کہ اخراجات میں برابر کی شریک
گی اور جب میں نے بجلی کے اخراجات اور نوکروں کی تنخواہ کے متعلق دسہرے کی چھٹیوں میں جب
یہاں آئی تھیں ذکر کیا تو برا مان گئیں اور دال چاول کا حساب لگانے بیٹھ گئیں کہ انہوں نے جتنا
پوں کے لئے روانہ کیا تھا کیا وہ پورے کا پورا بچوں کے کام آیا ۔ پھر بچوں کو ٹھیرانے کی ذمہ داری
ہنے خود قبول کی تھی لیکن مادھوری کو مجھ سے زیادہ ونیکم ما با اعتماد نظر آئی ۔ اسی لئے تو مادھوری
ے ساتھ فریب کر کے ونیکم ما کو مجھ سے مخفی بخشش دی تاکہ میرے گھر میں میری ہی مہمان نوازی کا
، اٹھا کر میرے احسان مند ہونے کے بجائے میرے نوکروں کو ورغلائیں کہ مجھے حقیر سمجھیں اور انہیں
دل سمجھ کر مجھ سے نمک حرامی کریں ۔ ونیکم ما کو میں نے اپنی بیٹی سمجھ کر رکھا لیکن ان لوگوں نے
کو مجھ سے منحرف کر کے جدا کر دیا ۔ تینوں بچے مل کر میری برائیاں کرتے اور میرے خلاف سازش
حقیقت تو یہ ہے کہ ونیکم ما اتنی بری کبھی نہ تھی جیسی اب دیا پا نے اس کو غلط راستہ پر ڈال دیا تھا "

ملک پیٹ - ٹی سی ای آر ٹی 558/2A آغا پورہ - حیدرآباد ۱

وہ کچھ دیر خاموش ہو گئیں اور پھر کہنے لگیں "ان سب باتوں کے بارے میں سوچتی ہوں تو دکھ میں ڈوب جاتی ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ پھر کسی کو اپنے قریب کرنے کی حماقت نہ کروں لیکن یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ حالات نے تم کو بھی مجھ سے بے حد قریب کر دیا۔ میں اپنی نیک طینتی سے مجبور لیکن مجھے یقین ہے کہ ایک دن شاید تم بھی مادھوی کی طرح بن جاؤ گی۔"

جدلیاتی منطق کو آسان طریقے پر یوں سمجھایا جاتا ہے کہ ایک ڈھال اس طرح بنی ہے کہ اس کا ایک رخ چاندی کا ہے اور ایک رخ سونے کا۔ ایک شخص نے صرف سنہرا رخ دیکھا اور دوسرے نے صرف روپہلا اور دونوں اس بات پر جھگڑنے لگے کہ ڈھال چاندی ہی کی تھی یا ڈھال سونے ہی کی تھی حالانکہ ڈھال کی بناوٹ میں دونوں ہی دھاتیں شامل تھیں۔

مادھوی کو سارا قصور لکشمی کا ہی معلوم ہوتا تھا اور لکشمی کو مادھوی سر تا پا قصوروار نظر آ رہی تھیں۔

ہر انسان کی ذہنی سطح اس بلندی پر نہیں پہنچ سکتی کہ وہ اپنے آپ کو اپنے حریف کے نقطۂ نظر سے بھی دیکھنے کے قابل بن سکے۔ اس طرح یہ میری بساط سے باہر تھا کہ لکشمی پر ثابت کر سکوں کہ ڈھال روپہلی بھی تھی اور سنہری بھی۔

لکشمی نے جب دیکھا کہ میرا سکوت ہی ان کی ہر بات کا جواب بنا ہوا ہے تو وہ بھی کچھ دیر گہری سوچ میں ڈوب گئیں اور کچھ دیر بعد کہا "میرے یہاں اب ۱۴، ۱۵ سالہ یتیم لڑکی ہے ننگو لوگ کلکتہ میں جا کر بس گئے تھے اب اس لڑکی کا کوئی نہیں ہے۔ اب اس گھر میں وہ گھر ہی کے ایک فرد کی طرح رہ سکتی ہے۔ میرے عزیز نے لکھا ہے کہ لڑکی پلی بڑھی تو انتہائی غربت میں ہے لیکن اس کا نصیبہ تو دیکھو کیسے مکان میں مکین بنے گی۔ ایسا مکان جو ہر قسم کے ماڈرن گیجٹ سے آراستہ ہے۔ وینکم ما کو مادھوی نے جس طرح نکما کر دیا تھا ہو سکتا ہے کہ اس نئی ملازمہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ تم کوئی ایسا کام کر بیٹھو جس سے ملازمین کے بگڑنے کا خدشہ رہتا ہے۔ ایسی چند باتیں جس سے ملازمین اپنے مالک کے بجائے اس کے مہمانوں کو خوش کرنا چاہتے ہیں ایک تو یہ کہ مالک سے چھپا کر انہیں بخشش دینا، دوسرا یہ کہ ملازمہ کے علم میں یہ بات آ جاتا کہ اس کے تنخواہ کے اخراجات مہمان بھی برداشت کر رہا ہے۔ اسی لئے نئی ملازمہ پر یہی ظاہر ہونا چاہیئے کہ میں ہی اس کو تنخواہ دیتی ہوں، دوسرے یہ کہ کسی حالت میں بھی اسے کوئی بخشش یا انعام و اکرام نہ دیا جائے اور جب کبھی بھی بطور بخشش کچھ دینا ہو تو میرے حوالے ہونا چاہیئے

اور اگر میں مناسب سمجھوں گی تب ہی یہ بخشش اس کو پہنچاؤں گی۔" ان کی دونوں شرطیں میں سمجھ چکی
ہی گئیں کیوں کہ پہلی صورت میں ملازم یہی سمجھتا ہے کہ بہاں مفت میں اس کی خدمات سے مستفید
رہا ہے اور دوسرے کے تعلق سے بچپن سے ہم کو یہ سکھایا جاتا تھا کہ کسی کو دیں تو یوں کہ ایک ہاتھ
سے دیں تو دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو، اور جہاں بھی جائیں وہاں کے ملازم کو ضرور کچھ نہ کچھ انعام دیں
دھوبی نے جب ویلکم ماکو بخشش دی تھی تو وہ اس وقت دی تھی جب کہ ان کے دل میں میڈم کی بڑی
عزت تھی اور کوئی بری نیت اس بخشش کے پیچھے کار فرما نہیں تھی۔ اس کے باوجود لکشمی کا یہ
کہنا کہ وہ ان کے ساتھ صریح دغا بازی تھی۔ ملازمین سے برتاؤ کے متعلق میرے جو نظریات تھے ا
گر کبھی فریگرنیس میں ان کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتی تو لکشمی کی دانست میں یہ بڑی دغا
کسی ایسے مقام پر جہاں ہم نے اپنا ٹھکانہ نہ بنایا ہو، تنہا رہنا بڑا دشوار امر ہے۔
لکشمی سے زیادہ بہتر مکان دار اس شہر میں ملنا ناممکن تھا۔ بادل ناخواستہ ہی سہی ان کے شرائط
منظور کرنے تھے۔ جب میں نے حامی بھری تو انہوں نے کہا کہ آنے والی ملازمہ بالکل نئی ہے اور خاص حا
لات کے تحت یہاں آ رہی ہے اس لئے وہ چاہتی ہیں کہ ملازمہ کی آمد سے ایک یا دو ہفتہ تک ا
ور البتہ صرف انہیں سے رہے۔
ہوا کے ایک تیز جھونکے کے ساتھ خوشبوئیں یوں ہمراہ ہوئیں جیسے انہیں پھولوں کا رہنا گراں گزرا

9

دو ہفتے گزار کر جب میں فریگرنیس پہنچی تو وہ اوپر کی منزل کو جھاڑ کر زینہ کو جھاڑ رہی
تھی۔ سانولے رنگ کی موہنی صورت، لمبے کھلے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ لکشمی نے بتایا
کہ اس کا نام انہوں نے رادھا رکھا ہے اور اس سے کہنے لگیں کہ "اماں کا ادو کو نمسکار کرو"
جھاڑو زینہ پر رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ اونچے قد کی حسینہ، آنکھوں میں گھلی ہوئی اداسی کو
۔ کر میں نے لکشمی سے کہا "یہ تو رادھا نہیں ہے میرا ہے میرا" پھر اس دن سے اسے میرا
کہا جانے لگا۔
میرا اگرچہ تلگو نژاد تھی لیکن بنگال میں رہنے کی وجہ اس کی تلگو پر گہرا بنگالی رنگ
چڑھا ہوا تھا۔ میری دانست میں یہ ایک اچھا شگون تھا کہ میرا اگر مجھ سے بات چیت کرنے کی
کوشش بھی کرے تو اس کی بات سمجھ میں نہ آنے کا مسئلہ کھڑا نہ ہو گا اور لکشمی کو مادھوی اور
سپنا کے قصے کے دہرائے جانے کا خدشہ نہ رہے گا۔ اس کے باوجود لکشمی کو گمان ہو رہا تھا

کہ میں میرا کو ناکارہ کر دوں گی اور اس کی ابتدا مچھر دان کے استعمال سے شروع ہوئی۔

میرا بغیر کسی ساز و سامان کے فریگرینس پہنچی تھی۔ اگرچہ وینکا نے کپڑے جو لکشمی نے دئے تھے اور جواب فریگرینس ہی میں رکھ لئے گئے تھے وہ میرا کے لمبے قد کی وجہ اس کو ٹھیک نہ ہوتے تھے اس لئے لکشمی نے میرا کو ۲ پرانی ساڑیاں، ۲ پرانے لہنگے دیدئے تھے اور ۲ نئے بلوز بھی درزی سے سلوا کر دئے تھے۔ سونے کے لئے ایک پرانا تکیہ اور پرانی دری میرا کو دئے گئے۔ وینکا کا بستر اس کا اپنا تھا اور وہ اسے ساتھ لے گئی تھی۔ مرتفع نگر میں اوڑھنے کے لئے چادر کو غیر ضروری تصور کرتے ہوئے لکشمی نے میرا کو کوئی چادر نہیں دی لیکن مرتفع نگر کے مچھر دن میں بھی بلائے جان ثابت ہوتے ہیں۔ وہاں سال کے بارہ مہینے چین کی نیند سونے کے لئے مچھر دان اور بجلی کے پنکھے دونوں کی ضرورت ہے۔ اور یہ دونوں بھی جس کسی کو نصیب نہ ہوں تو وہ ایک بڑی سی چادر کو اچھی طرح لپیٹ کر سوئے بغیر کام نہیں چلا سکتا۔ اس صورت میں بھی سوتے میں چادر ادھر ادھر ہونے پر مچھر کاٹ کاٹ کر حیران کر دیتے ہیں۔

مچھروں کی ستائی ہوئی میرا دن چڑھے اٹھتی تھی۔ چند دن تک تو لکشمی نے درگزر کیا انہیں صبح چھ بجے کافی پینے کی عادت تھی۔ صبح ساڑھے پانچ بجے گوالا بھینس مکان پر لاتا تھا۔ دودھ دوہنے کی نگرانی سے لے کر کافی کی تیاری تک کا تمام کام وینکا بلا ناغہ انجام دیا کرتی تھی۔ چار پانچ دن گزر گئے اور سات بجنے پر بھی میرا سوتی رہی تو لکشمی نے اسے ڈانٹ کر اٹھایا۔ اٹھتے ہی اس نے اپنے ہاتھ، پیر اور چہرہ پر مچھر کاٹنے کے جو نشان تھے وہ لکشمی کو بتائے جب وہ جان بوجھ کر بھی انجان بننے لگیں تو میرا نے اپنے ہاتھ میرے سامنے پھیلا دئے۔ مچھروں کی بنائی ہوئی اس درگت پر میں افسوس کرنے لگی۔ لکشمی نے میرا کو ڈانٹ کر کہا "وہاں کھڑی کیا باتیں بنا رہی ہے، کتنے کام پڑے ہیں کرنے کے۔" مگر میرا ڈھیٹ بنی کھڑی رہی اور کہنے لگی کہ اسے ایک مچھر دان خرید کر دیا جائے۔ لکشمی کے ہاں ایک بار الماری میں میں نے کئی مچھر دان دیکھے تھے اور میرا کی طرفداری کرتے ہوئے میں نے کہا کہ "کیوں نہ ایک پرانا مچھر دان اس کو دے دیا جائے۔ لکشمی نے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے میرا سے کہا "اگر اس نے پہلے ہی بتا دیا ہوتا کہ اسے مچھر کاٹتے ہیں تو اسے اوڑھنے کے لئے ایک چادر دے دیتیں" اور پھر مجھ سے انگریزی میں کہنے لگیں کہ میرا نہ سمجھ سکے، ان کے لہجہ میں ناگواری تھی انہوں نے کہا "میرے پاس فالتو مچھر دان نہیں ہیں وہ جو مچھر دان تم نے دیکھے ہیں وہ معزز مہمانوں یا رشتہ داروں کی آمد پر استعمال کے لئے ہیں

عمر بیشتر یا اس طرح سوتے ہیں۔ بالکلتہ میں جیرا نے کونسے مچھردان استعمال کئے ہوں گے۔ ؟
ج اس کوشش ہوگی تو پھر وہ ناکارہ ہو جائے گی۔ اردو کے کسی شاعر کا کہنا ہے کہ ؎

سردی میں کتنے جسم ہیں بیگانہ لباس
جتنی بھی چادریں ہیں مزاروں سے چھین لو

ہ تو کبھی کبھار آنے والے مہمانوں اور رشتہ داروں کے لئے تھے۔ سب کے سب تو کیا نہیں آتے
و ماڈرن گیا جگیٹ سے لیس مکان میں آنے پر وہ اسے خوش قسمت کہتی تھیں لیکن مچھروں کی
بت سے چھٹکارہ کے لئے اسے خیال تو ایک طرف مچھردان کے استعمال کا بھی حقدار نہ سمجھا
یرے لئے افسوس ناک تھا۔

میرا کے آنے کے بعد لکشمی نے مرغی بیچنے والوں کو گھر سے گزرتے دیکھ کر ایک مرغی خریدی
ن دیکھ بھال اور اس کو دانہ دنکا ڈالنے کا کام میرا کا تھا۔ مرغی نے آتے ہی انڈے دینے
ع کر دیئے تھے کوئی آٹھ دن روزانہ میرا مرغی کا انڈا لا کر لکشمی کے حوالے کر دیتی۔ آٹھ دن
یرا نے بتایا کہ آج مرغی نے انڈا نہیں دیا۔ ایک ہفتہ گزر گیا، اتوار کا دن تھا لکشمی گھر کی
نا ستھرائی کر رہی تھیں۔ سودی خانہ میں ان کی نظر ایک ڈبہ پر پڑی اسے کھول کر عجیب
ا کے انداز میں انہوں نے ڈبہ میرے سامنے رکھ دیا۔ اس میں مرغی کے سات انڈے نظر آئے
انے کہا میں نے میرا پر اعتماد کیا یہ اس کا انجام ہے۔ پھر ڈبہ بند کر کے انہوں نے چولہے کے نیچے
یا اور کہا کہ میں اس کی تحقیق کروں گی۔ اتنے میں میرا دوڑتی ہوئی آئی اور اس نے خوشی خوشی
ہ مرغی نے آج انڈا دیا ہے۔ اور وہ انڈا اس نے لکشمی کے سامنے رکھ دیا۔ لکشمی
بڑی میں کہنے لگیں "یہ بھولی بھالی معصوم میرا واقعی اتنی معصوم ہے یا معصومیت کی اتنی بڑی
ثل کر رہی ہے؟ دوسرے دن انہوں نے میرا سے پوچھ تاچھ کے بعد بتایا کہ میرا واقعی بھولی
ا ہے جو سات انڈے اس نے چھپا کر رکھے تھے وہ مجھے خوش کرنے کیلئے بطور سرپرائز کے دینا
ہتی۔ انہوں نے ان سات انڈوں میں سے میرا کو دیدیا کہ وہ اس کا آملیٹ بنا لے اور یہ بھی
ہ اگر میرا کی نیت چوری کی ہوتی تو وہ ان انڈوں کو ابال کر یا تل کر بھی ضرور کھا سکتی تھی جب کہ
اوقات اس کو کچن میں بھی تنہا کام کرنے کا موقع ملتا تھا۔
لیکن لکشمی کی تحقیق کے ساتھ بے شمار ہوا کرتے تھے، محلے کے دوسرے ملازمین گھر میں

آنے جانے والے مختلف لوگ جن سے میرا کا سابقہ پڑ سکتا تھا، ہر ایک سے تحقیق کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچیں وہ یہ کہ میرا چیت چور ہے وہ گھر پر سے گزرنے والی بنڈیوں سے پھل پھلاری یا کھانے پینے کی چیزیں خریدا کرتی ہے ۔ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں تو خریدنے کے لئے کبھی مٹھی دو مٹھی چاول یا آٹے کے بدلے چیزیں مول لیا کرتی ہے ۔ وہ انڈے بھی یقیناً اس طرح بدل میں دینا چاہتی تھی ۔ مجھے لکشمی بڑی قابل رحم نظر آئیں جب چرائے ہوئے سات انڈے دستیاب ہوئے تو میرا کا بیان لینے کے بعد انہوں نے میرا کو بڑی صاف دلی سے معصوم تسلیم کر لیا تھا لیکن آج ان کا اعتماد پاش پاش ہو چکا تھا ۔

انہوں نے مجھ سے پوچھا "میرا نے ایسا کیوں کیا؟" میں نے کہا "بھوک لگتی ہو گی" انہوں نے کہا "میں تو اسے پیٹ بھر کھانا دیتی ہوں" دراصل لکشمی کے کھانے کی مقدار بہت کم تھی وہ اچھا کھاتی تھیں لیکن بہت کم کھاتی تھیں ۔ میرا کو بھی اس حساب سے وہ دیتی تھیں البتہ اس پر "اچھے" کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ جب میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ

مفلسی حس لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی

ان کو اس پر یقین نہ آیا ۔ وہ کہتی تھیں کہ چھوٹی ذات کے لوگوں کی فطرت میں ہی چوری شامل ہوتی ہے۔

میرا نے مجھے اسٹریچ لان کے کالے بلوز میں دیکھا تو مچل گئی کہ بلوز پرانا ہو جانے پر اسے دیدیا جائے ۔ بلوز تو بہت پرانا تھا اور میں اسے کسی کو دینے کا خیال کر ہی رہی تھی ۔ مجھے بہت اچھی طرح یاد تھا کہ لکشمی نے کہا تھا کہ ملازمہ کو جو بھی دینا ہو وہ ان کی اجازت کے بغیر نہ دیا جائے لیکن مجھے یقین تھا کہ اگر میں لکشمی سے اجازت لوں تو مجھے ہرگز بھی اجازت نہ ملے گی ۔ دراصل میرا کے خوبصورت قد و قامت کو دیکھ کر میرا دل چاہتا تھا کہ کبھی اس غریب لڑکی کو عمدہ اور قیمتی لباس میں سجا دیکھوں ۔ اسٹریچ لان کا بلوز اس کے سڈول جسم پر خوب سجے گا ۔ یہ سوچ کر میں نے چند دن بعد وہ بلاوز میرا کو دے دیا ۔ میرا نے اسے شام نہا دھو کر میڈیم کی دی ہوئی کاسنی ساڑی کے ساتھ اس بلاوز کو پہنا ۔ بالوں میں پھول لگا کر وہ بڑی دلکش لگ رہی تھی ۔ جب لکشمی نے میرا کو اس بلاوز میں دیکھا تو دوستانہ طور پر کہا کہ یہ بلاوز اماں گارو نے تم کو دیا ہے بہت اچھا ہے اسے روزانہ پہن کر خراب نہ کرنا

پہن لیا۔ اب کل دھونے کے بعد وہ سلکے پرانے کپڑے ہیں ان کے ساتھ رکھ دینا۔ وہ کیا
پتہ اگر ضرورت ہو تو پہننا، یہ جاکٹ کبھی دعوتوں میں پہنتا تھا۔ میرا کے جانے کے بعد
ستا ناگواری سے کہا کہ ان کی بغیر اجازت پہنا فی کی نمائش کس لئے؟

قبل اس کے کہ وہ مجھے علی الاعلان دغا باز کہہ سکتیں اور مجھے بھی ان کی صورت دیکھنے
وارا نہ ہوتی میرا تبادلہ میرے اپنے شہر پر ہو گیا۔ خوشی خوشی میں اپنا اسباب باندھ رہی تھی
ی اپنی اداس آنکھوں کی اداسی لئے میرا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ آخر چند آرائشی اشیاء جب میں
یک رہی تھی تو میرا نے میرے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی نیلی باسکٹ دیکھی۔ ایک مرتبہ بیا سنگ
امان کے دوکان پر میری نظر ان ننھی منی رنگ برنگی باسکٹوں پر پڑی تھی بڑی خوبصورت
ہی تھیں۔ میں نے پانچ چھ رنگوں کی باسکٹیں خرید لی تھیں۔ سفید رنگ کی باسکٹ
و بھی تحفتاً دی تھی۔ صبح صبح جب وہ اپنے بغیچہ سے پھول چنتیں تو چنبیلی کے مٹھی بھر
اس باسکٹ میں ڈالا کرتیں۔ ان کی عادت تھی کہ صبح کے ناشتے سے قبل پوجا کیا کرتی
، بھگوان کے چرنوں میں چڑھانے کے لئے پھول وہ اس سفید باسکٹ میں اکٹھا کرنے لگی تھیں
یرا آئی تو یہ کام میرا کے تفویض ہوا۔ صرف چنبیلی کے پھولوں کی یکسانیت کو میرا نے توڑ دیا
وہ بغیچے میں مختلف قسم کے پھولوں سے سب سے منتخب مٹھی بھر پھولوں کو باسکٹ میں
دیا کرتی تھی۔ یہ بات لکشمی کو بھی پسند آئی تھی وہ کہتی تھیں کہ میرا بغیچہ کے بہترین پھول
ن کے چرنوں کے لئے چنتی ہے۔ میرا کو وہ سفید باسکٹ بے حد پسند تھی۔

جیسے اسباب میں ویسی ہی نیلی رنگ کی باسکٹ میرا کو نظر آئی تو اس کی
اسی پر مرکوز ہو گئیں اس نے نیلی باسکٹ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ کچھ دیر غور سے دیکھنے
اس نے باسکٹ نیچے رکھ دی۔ اس کی للچائی ہوئی نظریں باسکٹ سے ہٹنے ہی نہیں
تھیں اس نے پھر باسکٹ ہاتھ میں اٹھالی۔ کئی بار وہ باسکٹ نیچے رکھتی اور اٹھاتی رہی
ن بھی یہ تماشا دیکھتی رہی۔ آخر اس نے باسکٹ ہاتھ میں لئے مجھے ایسی نظروں سے
و اگر میرا دل برف سے بنا ہوتا تو پھر پانی بن کر میری آنکھوں سے بہہ جاتا۔ لیکن میرا
رف کا تودہ نہیں تھا۔ اس نے اشارہ سے کہا جو اس کے اور میرے درمیان رابطہ کی
کہ یہ باسکٹ اسے دے دی جائے۔ میں نے بھی اشاروں ہی سے پوچھا کہ وہ اسے

باسکٹ کو کس لئے لینا چاہتی ہے؟ تب اس نے میرے اطراف پیک ہونے کے لئے پڑی ہوئی آرائشی چیزوں کی طرف اشارہ کرکے بتایا کہ یہ سب سجاوٹ کی چیزیں تم کس لئے اکٹھا کرتی ہو؟ میرا کے اس جواب پر مجھے بڑی ہنسی آئی اور میں نے سوچا کہ اچھی اور خوبصورت چیزیں جمع کرنے کس کا دل نہیں چاہتا لیکن غریب میرا کے پاس قیمت خریدکہاں تھی؟ میں نے وہ باسکٹ میرا کو دے دی۔

مرتھنی نگر سے واپسی کے بعد لکشمی کے اور میرے درمیان پرخلوص خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ مجھے سرکاری کام سے سارے آندھرا پردیش کا دورہ کرنا پڑتا تھا اور لکشمی نے کہا تھا کہ جب کبھی بھی مرتھنی نگر یا اس کے اطراف واکناف سے گزرو تو فرنگیپنیس کی خوشبوؤں کو سونگھے بغیر سرحد نہ لانگنا۔

تبادلے کے چھ سات ماہ بعد مجھے مرتھنی نگر کو پار کرکے کیمپ کے لئے جانا تھا۔ میں نے لکشمی کو اس کی اطلاع دی اور لکھا کہ زیادہ سے زیادہ میں ان کے یہاں صرف ایک رات قیام کرسکوں گی انہوں نے اصرار سے لکھا کہ چند منٹ ہی سہی، لیکن مجھے ان کے یہاں ضرور رکنا ہوگا۔

جب میں فرنگیپنیس پہنچی تو رات کا کھانا ٹیبل پر لگا دیا گیا تھا لیکن میرا وہاں نہیں تھی، کوئی دوسری خادمہ تھی، میں نے میرا کے متعلق دریافت کیا تو لکشمی نے بے اعتنائی سے کہا کہ وہ اب ہمہ وقتی خادماؤں کے ناز نخرے برداشت کرتے کرتے تھک چکی ہیں اب تو یومیہ مزدوری دے کر وہ کسی بھی جان پہچان کی عورت سے کام کروالیتی ہیں۔

دن بھر کے سفر کے بعد میں بے حد تھک چکی تھی اور پھر علی الصباح مجھے طویل سفر پر روانہ ہونا تھا۔ میری نیند سے بوجھل آنکھوں کو دیکھ کر لکشمی نے مجھے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

مشرقی گھاٹ کے پہاڑوں کے پیچھے سے سورج طلوع ہوا ہی چاہتا تھا۔ لکشمی کا نواس فرنگیپنیس ان گنت سفید پھولوں کی خوشبوؤں سے لبریز تھا۔ اور وہ خود اپنے کشادہ ٹیرس پر میرے سامنے سفید بے داغ لباس میں ملبوس اپنے جوڑے میں ایک تازہ کھلے ہوئے سفید گلاب کو سجا رہی تھیں۔

میں نے بھرپور نظر ادھر ادھر ڈالی۔ میرے دل نے کہا خالق کائنات! تو نے کتنی مکمل کائنات کی تخلیق کی ہے۔ خوبی در خوبی، حسن ہی حسن۔ میری نظر جہاں پڑتی اس کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا کہ

وہیں لگی ہے جو نازک مقام تھے دل کے
یہ فرق دستِ عدو کے گزند کیا کرتے

ٹیرس پر ایک طرف کاٹ کباڑ رکھا جاتا تھا وہیں اس کاٹ کباڑ کے آس پاس روندی مسلی ہوئی دو چیزیں پڑی تھیں جو میں نے میرا کو دی تھیں ۔ ایک تو تھا کالے سرخ چیک لان کا بلاوز اور دوسری تھی چھوٹی سی نیلی باسکٹ ۔ میری نظریں وہیں رک گئیں یا اوپر کی ہی رہیں ۔ فلش ہی ! میرے جوڑے میں گلاب ٹانک کر ہٹیں تو انہوں نے بھی میرے مرکزِ نظر کو دیکھ لیا ۔ میری اور ان کی نظریں ملیں ان کی نظروں میں نفرت کی آندھیوں کے جھکڑ تھے ۔ آنکھوں کے اس احساس پر انہوں نے جلد قابو پالیا اور بڑے غیر شخصی سپاٹ لہجہ میں کہا "میرا ناقابلِ برداشت بن رہی تھی ۔ آس پاس کے مرد ملازموں سے میل ملاپ بڑھا رہی تھی ، اب اس کو یہاں رکھنا بدنامی تھا ، میں نے اسے چلتا کر دیا ۔ جو چیزیں میرا کی ذاتی نہیں تھیں ان چیزوں کو ساتھ لے جانے کا میرا کو کوئی حق نہیں پہنچتا تھا ۔ یہ چیزیں اس ملازمہ کو ملیں گی جو اس کی جگہ یہاں کام کرنے آئے گی ہر وقت ہر ملازمہ کے لئے کوئی کہاں تک نیا لباس تیار کروا سکتا ہے "۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد انہوں نے کہا "بعض لوگ نوکروں میں مقبولیت حاصل کرنے انہیں بے جا تحفہ تحائف سے نوازا کرتے ہیں ، ایسی چیزوں کا ایسا ہی حشر ہوتا ہے "۔ ان کی نگاہیں روندی مسلی باسکٹ اور بلاوز پر پڑیں ۔

میری جیب پورٹیکو میں آچکی تھی ' ہارن کی آواز پر میں نے ٹیرس سے جھک کر ڈرائیور سے کہا میرا سوٹ کیس جیپ میں رکھ دے اور پھر انہیں کی طرح اپنے چہرے کے احساسات اور تاثرات پر بے نیازی کی نقاب ڈالتے ہوئے میں نے انہیں خدا حافظ کہا ۔

نہ جانے اس آخری ملاقات کے بعد انہوں نے میرے متعلق کیا سوچا لیکن مجھے جب بھی ان کا خیال آیا یہی محسوس ہوا کہ چھوٹی سی نیلی باسکٹ پھیلتی گئی ، پھیلتی گئی یہاں تک کہ میرے اور ان کے درمیان ایک دیوار سی بن گئی اور جہاں جہاں کچھ درز تھے تو سیاہ کپڑوں کی دھجیوں سے بند کر دئے گئے تھے ۔

□□

قاضی انجم عارفی

غزل

جام چلتے رہے مے برستی رہی آسماں پہ جو کالی گھٹا چھا گئی
ساز چھڑتے رہے گیت ڈھلتے رہے کیف و مستی کی اک کیفیت چھا گئی

بات کچھ بھی نہیں بات اتنی سی ہے اپنے اپنے مقدر کی یہ بات ہے
آپ نزدیک میرے جو آ ہی گئے میرے قدموں میں دنیا تمام آ گئی

چاند تاروں کی تابندگی آپ میں ادھ کھلے پھول کی تازگی آپ میں
اور پھر آسماں سے اتر کر دھنک آپ کے رنگ میں روپ میں آ گئی

یہ بھی اچھا ہوا بات تازہ ہوئی شہر در شہر یوسف کے قصے ہوئے
آپ تو اپنا دامن بچا ہی گئے آگ تو میرے دامن پہ آ ہی گئی

اپنی نظروں کے ہی روبرو قافلے آرزوؤں امنگوں کے لٹتے رہے
پھر بھی انجم نہ آئی جبیں پہ شکن دولت غم لیا یک ہی ہاتھ آ گئی

پٹس برگ سے نیاگرا آبشار تک

عائشہ یوسف الدین رباب

نومبر کی تھی شام
خزاں کا موسم
سینکڑوں جھاڑ قطاروں میں کھڑے تھے عریاں
سوکھی ہوئی شاخیں لے کر
بے مایہ تھے وہ
پتا بھی نہ تھا نام کو جن کے اوپر
شاہوں کو گدائی آئی
مغروروں کی سرکوبی کو
حد میں خدائی آئی
عبرت کا تھا درس
دل میں میرے دور بہت دور کہیں
بے نفسی کی صدا آنے لگی

راستہ بھی ڈھلا جاتا تھا
منزل کی طرف
زرد، مضمحل، افسردہ سا
لٹے ہوئے انساں کی طرح
شرمندہ احساں کی طرح

آگے بڑھے
یہی شام تھی اور بلب کہ جو دکھتے تھے
جلتے تھے ستاروں کو بھی شرماتے تھے

ان چراغوں کے قریب
صاف و شفاف دھوئیں کی تھی ملی کوئی چیز
جیسے چلمن ہو کوئی
یا کوئی چادر ہو وسیع
جو بھی ہو میں نے تو محسوس کیا
نامرادوں کے ہجوموں سے اٹھی تھیں آہیں
نارسا ہو گئیں سب

سامنے جاتے ہی اک منظر تھا
اُف وہ منظر
کہ مسلط ہے مرے دل پہ ہمیشہ کے لئے
جیسے پگھلی ہوئی چاندی کے پہاڑ
ایک پر ایک گرے جاتے ہیں
سینکڑوں فیٹ بلندی سے لڑھک کر گرتے
اور دھماکے سے وہ بل کھاتے ہیں
ان گنت اژدہے ہیں کف بدہن جیسے وہ
ایک کو ایک نگل جاتے ہیں
ایک طوفان تھا، ہنگامہ تھا اور دہشت تھی
اور انسان تھے جیسے تنکے
آنکھیں پھیلائے ہوئے ساکت و صامت مبہوت
یہ تھی اللہ کی اک شان جلال
دل کو تھامے ہوئے اور خوف و ستائش کے ساتھ
بندگی بن گئی میں

۱۵۲-۶/اے، ریڈ ہلز۔ حیدرآباد

غزل

فاطمہ ضابطہ پروین

تصدق شمع سوزاں پر فقط پروانہ ہوتا ہے
وہ شعلے کی ادا و ناز کا دیوانہ ہوتا ہے

تلاش عشق میں جاں خوں سے دل کا جام بھرتی ہے
سمجھتی ہے یہ دنیا، پیار اک افسانہ ہوتا ہے

کسی کا دل اگر بے ساختہ ہم رنگ ہو جائے
محبت میں قریب دل، وہی بیگانہ ہوتا ہے

محبت جو بنا دیتی ہے جسم و روح کو یکساں
تو انساں کیلئے سچا وہی یارانہ ہوتا ہے

ہمیں ہے فخر کتنا بستیوں کی پائیداری پر
الٰہی کتنا عبرت خیز یہ ویرانہ ہوتا ہے

بتاتے ہیں جہاں رنج و الم اپنا مکاں پروین
خدا کے پاس پیارا ایسا ہی کاشانہ ہوتا ہے

مدینہ بلڈنگ - پتھر گٹی - حیدرآباد

غزل

عرفان پربھنوی

پھونکوں سے بجھا ہوں نہ ہواؤں سے بجھا ہوں
میں تند ہواؤں میں بھی بے خوف جلا ہوں

مجھ کو کہاں فرصت کہ میں خوابوں کو سجالوں
میں اپنے ہی زخموں کی تواضع میں لگا ہوں

میں درد مجسم ہوں، رگ و پے میں بسا ہوں
زیور کی طرح جسم کے شوکیس میں سجا ہوں

وہ لوگ بجھانے پہ تلے ہیں مجھے اب تو
میں جن کے لئے روز سر شام جلا ہوں

اک وہ ہیں کہ اپنوں کو بھی ٹھکرانے لگے ہیں
اک میں ہوں کہ غیروں کو بھی اپنانے لگا ہوں

جب جب بھی بڑی دیش کو عرفان فرقہ
تب تب میں اسے اپنا لہو دیتا رہا ہوں

بھولی گلی - پربھنی 431401 (مہاراشٹر)

غزل حافظ

ترجمہ از رشید الدین انصاری

بہ چشم مہر اگر با من مہم یک نظر بودے
از آن سیمیں بدن کامم روا ہیچ ار نہ زر بودے

محبت کی جو مجھ بیکس پہ اسکی پاک نظر ہوتی
تمنا میری پوری اس سیم تن سے مثل زر ہوتی

ز شوق افشاندمے ہر دم سرے در پائے جانانم
دریغا! گر متاع من نہ از این مختصر بودے

نچھاور ہر گھڑی کرتا سر اپنا اس کے قدموں پر
اگر پونجی نہ میری آہ! اتنی مختصر ہوتی

اگر برقع برافگندے از آن روئے چو مہ روزے
مدام از نرگس مستش جہاں پر شور و شر بودے

مثال ماہ چہرے سے اگر پردہ ہٹا دیتا
یہ دنیا اس کی چشم مست سے پر شور و شر ہوتی

ہمش مہر آمدے بر من ز مہر آن شاہ خوباں را
گر از درد دل زارم یکے روزش خبر بودے

محبت کے سبب سے اس حسیں کو رحم آ جاتا
اگر میرے دل رنجور کی اس کو خبر ہوتی

بہ وصلش گر مرا روزے ز ہجران فرصتے بودے
مبارک ساعتے بودے چہ خوش بودے اگر بودے

جدائی سے اگر اک روز بھی فرصت مجھے ملتی
وہ کتنی نیک اور اچھی گھڑی ہوتی اگر ہوتی

نہ گفتے کس بہ شیرینی چو حافظ شعر در عالم
اگر طوطی طبعش را ز لعل او شکر بودے

وہی مانند حافظ شعر کہتا اس قدر شیریں
جو اس کے لب سے اسکی طوطی طبع پر شکر ہوتی

غوث محی الدین کاوش

غزل

مدت سے ترے نام کا خالی ہے یہ گھر آ
سونی ہے مرے دل کی ہر اک راہ گذر آ

جب حد سے گذر جائے گی دیدار کی حسرت
خود جلوے پکاریں گے نگاہوں کو ادھر آ

اس آس میں میں اپنی طرف دیکھ رہا ہوں
تو مجھ میں اگر ہے تو پھر اک بار نظر آ

ہے تو بھی بڑا، تیری سماعت بھی بڑی ہے
سننے کو زمیں پر کبھی روداد بشر آ

کیوں حشر کے میدان سے گھبراتا ہے کاوش
سرکار پکاریں گے گنہگار ادھر آ

ڈینٹسٹ۔ عقب کواچی بیکری معظم جاہی مارکٹ

قاضی انصار

غزل

گاہے شعلہ ہے گاہے شبنم ہے
اپنے ہاتھوں میں ایک پرچم ہے

خوف خورشید ان پہ طاری ہے
رات کا ہر چراغ مدھم ہے

موسم گل میں برگ آوارہ
کیا بہار چمن کا ماتم ہے

اک ضعیفی ہزار بیماری
کتنی بیماریوں کا سنگم ہے

کیسی کیسی ہیں اس میں تصویریں
دل مرا اک حسین البم ہے

اپنے ہی خون کی جو پیاسی ہے
یا الٰہی! یہ نسل آدم ہے

کیا جوانی تلاش کرتا ہے
بوڑھے برگد تری کمر خم ہے

دشمنوں کی نوازشیں انعام
دوستوں کا کرم بھی کم ہے

قاضی پورہ۔ کھنڈوہ 450001۔ مدھیہ پردیش

عربی کے سبق

ضمیر

ضمیر وہ اسم معرفہ ہے جو متکلم، مخاطب یا غائب کو بتائے جیسے أَنَا (میں) أَنْتَ (تو) هُوَ (وہ) یہ اگر مستقل کلمہ کی طرح استعمال ہو کسی دوسرے کلمہ کے ساتھ مل کر استعمال نہ ہو تو منفصل کہلاتی ہے۔

ضمائر منفصل مرفوع

ضمیر منفصل اگر فاعل یا مبتدا کی حیثیت سے استعمال ہو تو اسے ضمیر منفصل مرفوع کہتے ہیں۔ کیونکہ مبتدا یا فاعل حالت رفعی میں ہوتا ہے

	واحد	تثنیہ	جمع
غائب مذکر	هُوَ (وہ ایک مرد)	هُمَا (وہ دو مرد)	هُمْ (وہ سب مرد)
مؤنث	هِيَ (وہ ایک عورت)	" (وہ دو عورتیں)	هُنَّ (وہ سب عورتیں)
حاضر مذکر	أَنْتَ (تو ایک مرد)	أَنْتُمَا (تم دو مرد)	أَنْتُمْ (تم سب مرد)
مؤنث	أَنْتِ (تو ایک عورت)	" (تم دو عورتیں)	أَنْتُنَّ (تم سب عورتیں)
متکلم مذکر	أَنَا (میں ایک مرد)	نَحْنُ (ہم دو مرد)	نَحْنُ (ہم سب مرد)
مؤنث	" (میں ایک عورت)	" (ہم دو عورتیں)	" (ہم سب عورتیں)

هُوَ طَاهِرُ الْقَلْبِ وہ (مرد) پاک دل ہے — هُمْ صَالِحُوْنَ وہ سب (مرد) نیک ہیں

…مُهَذَّبَةٌ وہ (عورت) مہذب ہے — هُنَّ مُشْتَرِكَاتٌ وہ سب (عورتیں) اشترک ہیں

…مُجْتَهِدٌ تو (مرد) محنتی ہے — أَنْتُمْ صَادِقُوْنَ تم سب (مرد) منصف ہو

…مُؤْمِنَةٌ تو (عورت) مومنہ ہے — أَنْتُنَّ حِسَانٌ تم سب (عورتیں) خوبصورت ہو

…سَامِعٌ میں (مرد) سننے والا ہوں — نَحْنُ مُطِيْعُوْنَ ہم سب (مرد) فرمانبردار ہیں

…أَمِيْنَةٌ میں (عورت) امانت دار ہوں — نَحْنُ جَمِيْلَاتٌ ہم سب (عورتیں) خوبصورت ہیں

ضمائر منفصل منصوب

ضمیر منفصل اگر جملہ میں مفعول کی حیثیت سے استعمال ہو تو اسے ضمیر منفصل منصوب کہتے ہیں۔ کیونکہ مفعول حالت نصبی میں ہوتا ہے۔

ضمائر منفصل منصوب اکثر فعل سے پہلے آتی ہیں اور فعل میں تخصیص کے معنی پیدا کر دیتی ہیں۔

جمع	تثنیہ	واحد		
اِيَّاهُمْ	اِيَّاهُمَا	اِيَّاهُ	مذکر	غائب
اِيَّاهُنَّ		اِيَّاهَا	مؤنث	
اِيَّاكُمْ	اِيَّاكُمَا	اِيَّاكَ	مذکر	حاضر
اِيَّاكُنَّ		اِيَّاكِ	مؤنث	
اِيَّانَا	اِيَّانَا	اِيَّايَ	مذکر	متکلم

اِيَّاهُ اتَّخَذْتُ خَلِيْلاً

اس (مرد) ہی کو میں نے دوست بنایا

اِيَّاهَا اَعْطَيْتُ الْجَائِزَةَ

اس (عورت) ہی کو میں نے انعام دیا

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں

اِيَّاكِ عَالَجَ الطَّبِيْبُ

تیرا (عورت) ہی حکیم نے علاج کیا

اِيَّايَ مَدَحَ الْاُسْتَاذُ

استاد نے میری ہی تعریف کی

اِيَّاهُمْ وَجَدْتُ فِي الْبَيْتِ

ان (مردوں) ہی کو میں نے گھر میں

اِيَّاهُنَّ هَدَيْتُ الطَّرِيْقَ

ان (عورتوں) ہی کو میں نے راستہ دکھایا

اِيَّاكُمْ لَقِيْتُ فِي الْمَسْجِدِ

تم لوگوں ہی سے میں مسجد میں ملاقات

اِيَّاكُنَّ عَلَّمَ الْمُدَرِّسُ

تم (عورتوں) ہی کو استاد نے پڑھایا

اِيَّانَا كَلَّمَ السُّلْطَانُ

ہم ہی سے بادشاہ نے بات کی

Regd. No. H/HD 593.

,ONTHLY SHADAAB HYD

11-5-147, RED HILLS, HYD-500 004.

Vol. I No. 5 APRIL 198

میرے افکار کے حسن میں جو چھپے لوئی
دور تک منظرِ شاداب دکھائی دے گا



علمی، ادبی، دینی و سماجی اقدار کا نمائندہ

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد (۱)　　مئی ۱۹۸۴ء　　شمارہ (۶)

(مجلس مشاورت)

○ ڈاکٹر خواجہ عبد الغفور　　○ یوسف ناظم
○ ڈاکٹر منشاء الرحمن خان منشاء　　○ محمد منظور احمد منظور
○ اے۔ جی فاروقی　　○ ڈاکٹر محمد یوسف الدین
○ منیر احمد صدیقی　　○ پروفیسر رضی الدین احمد
○ پروفیسر عبد الحلیم ندوی

— (ایڈیٹر) —

محمد قمر الدین صابری

زر تعاون فی پرچہ پانچ روپے

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
زر سالانہ	50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
دو سالہ	90 "	270 "	65 "	36 "	225 "
تاحیات	1000 "	2500 "	450 "	300 "	2000 "

ترسیل زر کا پتہ: 11-6-117 ریڈ ہلز، حیدرآباد 500004 (اے۔پی)

پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان سے چھپوا کر ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا

فہرست

حرف اول

اعلان کیا گیا تھا کہ ماہ مئی کا شمارہ "وجد نمبر" ہوگا۔ ہمیں افسوس ہے کہ چند ناگزیر وجوہ کی بناء پر اس ماہ وجد نمبر پیش نہیں جا سکا۔ ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وجد مرحوم کے بارے میں جو مضامین ہم پیش کرنا چاہتے تھے وہ وقت پر حاصل نہ کئے جا سکے اور ہمارے اندازے سے کم تر معیار کا خصوصی نمبر شائع کرنا ہمیں گوارا نہ تھا۔ انشاء اللہ آئندہ یہ نمبر پیش کیا جائے گا۔

اردو ہندوستانی زبان ہے، دستور ہند میں مندرجہ (۱۴) زبانوں میں سے ایک ہے، عملاً پورے ہندوستان کی رابطہ کی زبان ہے اور اب تو پوری دنیا میں پھیل کر بین الاقوامی رابطہ کی زبان بنتی جا رہی ہے لیکن اس کے اپنے وطن میں اس کی ترقی و استحکام کے لئے جو کام ضروری ہیں وہ نہیں ہو رہے ہیں۔ اکثر اسٹیٹوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ ہے۔ جہاں اس کی تکمیل میں انتظامی احکام جاری ہوئے ہیں وہاں عملی طور پر اس کی تعمیل نہیں کی جا رہی ہے۔ اردو پہلی ہندوستانی زبان ہے جس میں بشمول سائنس و ٹکنالوجی اعلیٰ تعلیم کا کامیاب تجربہ کیا گیا۔ جامعہ عثمانیہ نے ثابت کر دکھایا کہ مادری زبان میں اعلیٰ تعلیم نہایت فائدہ مند اور عملی طور پر ممکن ہے۔ مختلف گوشوں سے یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ ایک اردو یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں ہر علم کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہو۔ اس سلسلہ میں ایک اقل ترین مطالبہ یہ ہے کہ حیدرآباد میں جو اردو میڈیم اندرا پریہ درشنی کالج چلایا جا رہا ہے اس میں چند پوسٹ گریجویٹ کورسس کو اردو میں جاری کرنے کی اجازت دی جائے۔ یقین ہے کہ جامعہ عثمانیہ جو کسی زمانہ میں اردو میڈیم یونیورسٹی تھی، اپنے ایک کالج میں چند پی جی کورسس جاری کرنے کی اجازت دیدے گی اور اردو یونیورسٹی کے قیام کے راستے کو ہموار کرے گی۔

ہماری اسٹیٹ گورنمنٹ نے کئی ریزیڈنشل اسکول قائم کئے جو تعلیمی میدان میں بڑی نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ محفل علم و فن نے مطالبہ کیا کہ کم از کم تین ریزیڈنشل اسکول اسٹیٹ کے تینوں علاقوں میں اردو میڈیم کے قائم کئے جائیں۔ خوشی کی بات ہے کہ حکومت نے اس

مطالبہ کو تسلیم کر لیا ہے اور ان اسکولوں کے قیام کے انتظامات کئے جا رہے ہیں۔

ہماری حکومت نے یہ انتظام بھی کیا کہ اسکولوں کی نصابی کتب کا اردو ترجمہ کرایا جاکر اردو اکیڈیمی کے زیر انتظام ان کی طباعت عمل میں لائی جائے۔ چند کتابیں طبع ہوئیں، کچھ زیر طبع ہیں۔ ان کی تقسیم و فروخت کا انتظام بھی سرکاری طور پر کیا گیا۔ اس انتظام میں مزید بہتری کی گنجائش ہے تاکہ تمام ضرورت مندوں کو اردو کتب وقت پر مہیا ہو سکیں۔

اردو نصابی کتب کی طباعت اور بہتر تقسیم کی طرف مرکزی ادارہ "ترقی اردو بیورو" نے بھی کافی توجہ کی ہے — اور آندھرا پردیش کی نصابی کتابیں اور اعلیٰ تعلیم کی دیگر کتب طبع کروا کر نہایت واجبی قیمتوں پر سربراہی کا انتظام کیا ہے۔ اردو کی ترقی و استحکام کے لئے بیورو نے جو کام کیا اور کر رہا ہے وہ بڑے دور رس نتائج کا حامل ہے۔

مرکزی وزارت تعلیم و ثقافت کے تحت قائم شدہ ترقی اردو بورڈ، اردو کی ترقی و ترویج کے لئے بڑے اہم اقدامات کر رہا ہے۔ اس بورڈ نے ۱۹۷۳ء میں خطاطی کا پہلا تربیتی مرکز قائم کیا اور اسی ماہ حیدرآباد میں ۲۴ واں مرکز قائم کیا جو خواتین کا تیسرا مرکز ہوگا۔ ان مرکزوں کے نتیجہ میں اچھے کاتبوں کی ایک بڑی جماعت تیار ہو گئی جنہیں روزگار ملا اور اردو طباعت کا معیار بلند ہوا۔ ترقی اردو بورڈ اردو کتابوں کی طباعت و اشاعت کا بھی بہت بڑا مرکز ہے جہاں سے بڑی مفید کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ لسانیات و لغات کی کئی مفید کتابوں میں فرہنگ آصفیہ اردو کی مشہور و مستند لغت بھی شامل ہے جو برسوں سے نایاب تھی۔ ادب، تاریخ، سیاست، فلسفہ، تعلیم، نفسیات، سماجیات کے ساتھ تعلیم بالغان اور بچوں کے ادب کی طرف بھی توجہ کی گئی ہے۔ مختلف علوم میں اصطلاح سازی کا کام بھی وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے۔ کچھ علوم کی اصطلاحوں کی فرہنگیں شائع ہو چکی ہیں باقی تیار ہیں۔ نیز انسائیکلوپیڈیا پر بھی کام ہوا ہے۔ غرض کہ بورڈ کے کام کا اچھا اثر اردو پر مترتب ہوا ہے اور مزید ہو رہا ہے۔ اردو والوں کو چاہئے کہ ان اقدامات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔

(مدیر)

لیڈی ایولن کوبولڈ زینب

مترجمہ۔ محسن بن شبیر

سفر نامہ حرمین - مدینہ

۲۰ مارچ ۱۹۳۳ء۔ آج صبح مسجد قبلتین اور سہ پہر میں مسجد قبا دیکھنے گئے۔ مسجد قبا مدینہ کی سب سے پہلی تعمیر شدہ مسجد ہے۔ اس کے دالانوں کی سفید دیواروں پر سبز اور نیلے نقش و نگار ہیں۔ صحن کے بیچ میں ایک چھوٹا سا کوشک ہے، یہ سب طرف کھلا ہوا ہے اسی جگہ آنحضرت ؐ کا اونٹ بیٹھا تھا۔ یہاں کی نماز ایک عمرہ کا ثواب رکھتی ہے بقبولیت دعا کے لئے بھی یہ جگہ مشہور ہے۔ مسجد کے دروازے کے بالکل قریب "بیر خاتم" ہے جس میں حضرت عثمان ؓ کے ہاتھ سے مہر خلافت والی انگوٹھی گری اور کوشش کے باوجود اس کا پتہ نہ چلا۔

یہاں سے ہم ایک باغ میں گئے جہاں لہلہاتا ہوا سبزہ اور انجیر اور نارنگیوں کی شاخوں میں گلاب، چنبیلی اور دوسرے پھولوں کا لشابہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ انار کے پھول بہار پر تھے کھجور کے درختوں کے نیچے اناج کے کھیت اور لوسن کثرت سے اگا ہوا تھا۔ حوض پر انگور کا منڈوا چھایا ہوا تھا۔ مدینے کے تمام خوش باش آدمیوں کے پاس باغ ہیں۔ اکثر ایسے بڑے ہیں کہ سو سو ایکڑ زمین گھیرے ہوئے ہیں۔ جب شہر میں گرمی زیادہ پڑنے لگتی ہے تو وہ لوگ باغوں میں چلے جاتے ہیں جہاں مکان تو نہیں مگر اینٹوں کے سائبان سے بنے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے بہتے ہوئے پانی کا حوض ہوتا ہے اس میں وہ نہاتے ہیں۔ یہ حوض اس قدر شفاف ہوتے ہیں کہ نو دس فٹ کی گہرائی میں بھی تہہ نظر آجاتی ہے۔ سائبان بالکل سادہ ہوتے ہیں ان کے سر کھجور کی لکڑی کے ہوتے ہیں۔ کھانے پینے اور سونے کے لئے ان کے اندر شطرنجیاں اور گدے بچھے رہتے ہیں۔ سائبان کے پیچھے مالیوں وغیرہ کے رہنے کا گھر ہوتا ہے۔

۲۲ مارچ ۱۹۳۳ء۔ مدینے سے روانہ ہونے کے پیشتر آج صبح میں اپنے مزور کے ساتھ مسجد نبوی میں آخری نماز اور روضہ اقدس پر الوداعی سلام و فاتحہ پڑھنے کے لئے گئی۔ دھوپ کی [illegible] کے عالیشان سبز گنبد پر جو نیلے آسمان کے مقابلہ میں خوشنمائی سے رنگا گیا ہے

میں نے پھر نظر ڈالی۔ اس رنگ کو دیکھ کر میرے دل میں خوشی کی لہریں اٹھتی ہیں۔ یہ فن تعمیر کا انتہائی موزونیت کے لحاظ سے بنایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ حضرت بلال رضہ کی مینا رنے اس تصویر کی دلکشی میں اور جان ڈال دی ہے۔

آج جمعہ ہے دوپہر کی نماز بھی مجھے مسجد میں پڑھنی ہے۔ اذان سن کر میں مسجد کو چلی، مصطفیٰ میری جا نماز لئے ساتھ تھا۔ باب مجیدی کے باہر میں نے امیر مدینہ کے خوبصورت بلاڈی گارڈ کے دستہ کو دیکھا جو امیر کی سواری کے لئے رستے کا انتظام کر رہا تھا۔ میں عورتوں کے جنگلے میں پہنچ گئی۔ مصطفیٰ جانماز بچھا کر باہر چلا گیا۔ یہ حصہ ہر طبقہ کی عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں دو اغوات نگرانی و انتظام کر رہے تھے۔ اگرچہ عورتیں روضہ میں بھی نماز پڑھتی ہیں اور آنحضرت صلعم کی قبر پر بھی سلام عرض کرتی ہیں لیکن ان کے لئے مسجد کے صحن میں ایک علاحدہ جگہ بھی ہے جو خصوصاً جمعہ کے دن انہیں کے لئے مخصوص کر دی جاتی ہے۔ یہاں وہ ظہر کی نماز پڑھتی ہیں۔ ادھر ادھر بیٹھی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ ان کے بچے جو نماز کے وقت مٹی کے پتلوں کی طرح خاموش بیٹھے رہتے ہیں نماز کے بعد کھیلنے کودنے لگتے ہیں۔

آج جمعہ کا خطبہ بھی ہے اس لئے نماز دیر تک ہوگی۔ خطبہ ختم ہوگیا۔ اب میں اپنے اردگرد دیکھ رہی ہوں، یہاں میں نے برقعہ اتار دیا ہے اور اس وقت میرے سامنے انتہا درجے کا موثر منظر ہے۔ یہ وسیع مسجد ہر اسلامی ملک کے نمازیوں سے بھری ہوئی ہے۔ بخارا اور نائیجیریا کے امراء ہندوستان کے رئیس، بڑی بڑی داڑھیوں والے روسی، مصر و ترکی کے پاشا سب ان مفلس و قلاش حاجیوں کے کندھے سے کندھا ملائے کھڑے ہیں جو بیچارے اپنی عمر بھر کی ساری جمع جتھا خرچ کرنے کے بعد اس منزل مقصود تک پہنچے ہیں۔

آس پاس کی عورتیں مجھے غور سے دیکھ رہی ہیں اور طرح طرح کے سوال کر رہی ہیں۔ مجمع بہت زائد تھا گڑبڑ میں مصطفیٰ مجھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے اپنی جانماز مسجد کے دروازے پر کفش کن کے پاس رکھوا دی اور جلدی سے گھر پہنچی۔ ابھی سامان کی باندھا بوندھی باقی ہے۔

مجھے حیرت ہے کہ مسجد کے دروازے پر کفش کن ہزاروں جوتوں کی پہچان کس طرح رکھتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ یہ جوتے اٹھا اٹھا کر ایک بڑی الماری کے چھوٹے چھوٹے خانوں میں رکھتا جاتا ہے اور واپسی کے وقت جس کا جوتا اس کے حوالے کرتا ہے۔ بغیر ایڑی کے مشرقی جوتے مجھے تو ایسے ناقابل شناخت معلوم ہوتے ہیں جیسے گلے کی بھیڑیں مگر کوئی شکایت نہیں کرتا کہ

اس کا ہوتا بدل دیا ہے۔ مجھے اس خیال سے وحشت ہوتی ہے کہ لندن کی کسی دعوت میں اگر بیچارے کرتوں پر احتیاط کے ساتھ ٹکٹ نہ لگائے جائیں تو خدا جانے ان کا کیا حشر ہو۔ معظم گھر پہنچا پریشان تھا مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا۔ جو جگہ ملنے کی مقرر کی گئی تھی وہاں تھوڑی دیر راہ دیکھنے کے بعد میری تلاش میں وہ عورتوں کے جنگلے میں گھس گیا یہاں عورتیں جو برقعے اتارے بیٹھی تھیں چاروں طرف سے لے دے کرنے لگیں۔ ایک آغا (خواجہ سرا) نے بھی اسے دھتکارا تو یہ الٹے پاؤں واپس آیا۔ کفش کن نے میری جانماز لے دیدی اور میرے گھر چلے جانے کے بارے میں بھی اسے بتا دیا۔

عربی حساب سے کوئی آٹھ بجے دن کے ہم مدینے سے نکلے اور گرمی اور دھوپ میں چلتے رہے۔ مغرب سے ذرا قبل "مساجد" پہنچے، یہاں چائے پی کر تازہ دم ہو گئے۔ موٹر میں پانی ڈالا اور آگے بڑھے۔ رستے میں ہم نے یہاں کے مصیبت زدہ رہنے والوں کو جھریوں دار ہاتھ بھیک مانگنے کے لئے پھیلائے ہوئے دیکھا۔ معلوم ہوا کہ یہ لٹیرے ہیں، پیشتر حاجیوں کا شکار کیا کرتے تھے اب پانسہ پلٹ گیا۔ جن لوگوں کو پہلے بے شرمی کے ساتھ لوٹا کرتے تھے اب شکریہ کے ساتھ ان سے خیرات لیتے ہیں۔ جب پہاڑوں پر تاریکی چھانے لگی ہم ایک کھلی جگہ ٹھیرے، پانی نہ تھا ریت سے تیمم کیا نماز پڑھی۔ مرغ کے ٹھنڈے سالن سے تاروں کی روشنی میں کھانا کھایا پھر چل پڑے۔ جب نیند سے آنکھیں بند ہونے لگیں موٹر ٹھیرائی۔ زمین پر کمبل بچھائے اور سو گئے۔

۲۴ مارچ ۳۳ء۔ رات زور کی شبنم برسی، میرا کمبل بھیگ گیا۔ چہرہ بال تکیے سب بھیگ گئے۔ نور کے تڑکے ریگستان کا منظر بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ دن نکلے ہم "رابغ" پہنچے چائے پی، پاسپورٹ دکھائے اور موٹر میں پٹرول ڈالا اور چل پڑے اور دوپہر کے کچھ بعد جدہ پہنچ گئے۔

۲۵ مارچ ۳۳ء۔ کل عصر کے بعد ہم مکے روانہ ہوں گے۔ فاصلہ کوئی ۴۵ میل ہے۔ مغرب سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔ میرا احرام سامنے نکلا رکھا ہے، غسل کر کے میں سفید کرتا پہنوں گی۔ اس پر نیچے نیچے سفید عبا، سر پر سفید قصابہ اس طرح لپیٹوں گی کہ بال نظر نہ آئیں۔ چہرے کے سامنے ایک سوراخ دار حصیر کا ٹکڑا رکھ لوں گی۔ اس حصیر میں سفید کپڑے کا لمبا نقاب ٹکا ہوا ہے جو گھٹنوں تک پہنچتا ہے۔ اس میں سے دکھائی بھی دیتا ہے اور سانس بھی اچھی طرح لے سکتے ہیں۔ ان سب کے اوپر سفید برقعہ اوڑھ لوں گی بالکل ویسا ہی جیسے مدینے میں استعمال کیا تھا۔ صرف رنگ کا فرق ہے وہ کالا تھا یہ سفید ہے۔ سیاہ لباس سے مجھے یہ سفید ٹھنڈا معلوم ہو رہا ہے

بال اپنے رہتے ہوئے ناخن چھپانے کے لئے دستانے بھی پہن لوں گی ۔ حالت احرام میں ناخن تراشنے کی ممانعت ہے ۔

۲۶ / مارچ ۱۹۳۳ء ۔ میں نے غسل کرکے احرام باندھا ۔ عربی حساب سے کوئی نو بجے (تین بجے شام) مکے روانہ ہوئی ۔ پینتالیس میل طے کرنے میں ہم کو دو گھنٹے لگے اور غروب سے پہلے ہم مکے پہنچ گئے ۔ رستہ میں ہم کو حاجیوں کے غول کے غول ملے جو پیادہ پا ، گدھوں پر ، اونٹوں پر اور ان بڑی توڑ موٹروں میں چلے جا رہے تھے جن میں سفر کرنا بڑے ہی مضبوط آدمیوں کا کام ہے ہم مختلف کارواں سراؤں اور کنوؤں پر سے گذرتے ہوئے ان دو ستونوں کے پاس جا پہنچے جو حدود حرم کی علامت ہیں ۔ اس کے آگے سوائے سچے مسلمانوں کے کوئی نہیں جا سکتا ۔ یہاں حاجی باآواز بلند لبیک اللھم لبیک کے نعرے لگاتے ہیں ۔ ہم پہاڑی سلسلوں اور تپتی وادیوں میں چلتے رہے ، گدھوں اور اونٹوں کی قطاروں اور حاجیوں کے قافلوں پر سے گذرے ۔

اب ہمارے دل میں اشتیاق کی لہریں اٹھ رہی ہیں اب ہم مقدس شہر سے قریب ہوتے جا رہے ہیں ۔ سامنے تھوڑی دور ایک پہاڑ آس پاس کے پہاڑوں سے اونچا نظر آ رہا ہے یہ جبل نور ہے اس کی مہیب آغوش میں "غار حرا" واقع ہے جہاں پہلی وحی نازل ہوئی تھی اور وہ پیغام الٰہی پہنچا تھا جس نے دنیا کی تاریخ کو بدل دیا ۔ ہم کو اپنے دلوں کے جلد جلد دھڑکنے سے یہ یقین ہو گیا کہ ہاں اب ہم بہت جلد ساحل امید پر پہنچنے والے ہیں ۔ تمام تفکرات دنیوی کو دل سے نکال کر اور احکام الٰہی کی تعمیل پر کمر بستہ ہو کر ہم اس مقدس شہر میں پہنچے جس میں بجز معجزات کے زمانے کی یادگاروں کے اور سوائے اس خاک پاک کے جس پر سے اس عظیم الشان پیغمبرؐ کے قدم اطہر گذرے ہیں نہ کوئی ایسی خوبصورتی ہے اور نہ کوئی اور ایسی چیز جو یاد الٰہی سے انسان کا دھیان ہٹائے ۔ جبل نور کی آگے والی پہاڑی کے اوپر سے شہر کے مکانات اور بیچ میں بیت اللہ کی میناریں دکھائی دے رہی ہیں ۔ مکے کی کوئی فصیل نہیں ہے اس کے آس پاس کے پہاڑ اور ریگستان اس کی حفاظت کر رہے ہیں ۔ ہم سبز رنگ کے چند بھدے دروازوں پر پہنچے جو بند تھے ، آہستہ آہستہ دروازے کھلتے ہیں ، پولیس ہمارے پاسپورٹ دیکھتی ہے ہم محلہ جرول سے گذر کر مکہ پہنچ جاتے ہیں ۔

ہماری موٹر کے لمبے بازاروں اور تنگ گلیوں سے ہوتے ہوئے بالآخر اس مکان پر پہنچی جو زمانہ حج میں میری قیام گاہ رہے گا ۔ میرا میزبان اور اس کے دو لڑکے مجھے موٹر سے

اترنے آئے اور ایک سنگین زینہ پر چڑھاتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں لے گئے۔ دوسری منزل پر میرے ٹھیرنے کا انتظام ہے۔ یہاں کے دستور کے مطابق اس میں دیوار سے لگاکر دیوان (گدے) بچھے ہیں۔ ایک بڑی مسہری بھی رکھی ہے جو غالباً میری خاطر سے یہاں لائی گئی ہے۔ توشک پر نہایت خوبصورت گلکاری کا پلنگ پوش پڑا ہے۔ مچھر دان بھی چھوٹا ہوا ہے۔ افسوس ہے کہ اس مسہری نے کمرے کی مشرقی وضع میں بٹہ لگادیا ہے۔ اسی کمرہ میں چمکدار لکڑی کے دروازوں اور جھلملیوں پر بہت عمدہ اور خوبصورت نقش و نگار ہیں۔ کمرہ کی اونچی لداؤ کی چھت پر بھی اسی قسم کے کام کا حاشیہ ہے۔ چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں بھی سب منقش ہیں۔ سامنے کوٹھری کی دوسری جانب سنگین گیلری ہے جس میں سے حمام کو جاتے ہیں۔ اس میں پتھر کا فرش ہے جس کے بیچ میں ایک سوراخ ہے۔ پانی کے بڑے بڑے گھڑے رکھے ہیں اور سنگ مرمر کی چوکی پر چاندی کے ڈھکنوں کی صراحیاں سلیقہ سے دھری ہوئی ہیں ان میں پانی ہمیشہ بہت ٹھنڈا رہتا ہے ایک صراحی ہر روز خصوصاً آب زم زم سے بھی بھری جاتی ہے۔ میں اپنے رہائشی مکان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی ایسا آرام دہ سامان مہیا کرنے پر اپنے میزبان کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے برقعہ اتار دیا اور کپڑوں کا صندوق کھولا۔ اس میں فرنگی سامان سا بکھیڑا نہیں ہے نہ طرح طرح کی ٹوپیاں ہیں اور نہ وقت بوقت کے لباس اور نہ جوتوں کی قطار — احرام کھول کر میں باریک کرتا اور سیاہ عبا پہن لوں گی اور برقعہ بدل لوں گی۔

رات گئے میں اپنی میزبان کے ساتھ بیت اللہ گئی۔ مصطفیٰ ساتھ ہے مطوف بھی ساتھ ہے۔ چند منٹ پیدل چلنے کے بعد ہم باب ابراہیم پر پہنچے۔ چند سیڑھیاں چڑھ کر ایک چار دیواری میں داخل ہوئے یہ حرم میں کتوں کو داخل ہونے سے روکنے کے لئے بنائی گئی ہے بیت اللہ کے چالیس دروازے ہیں اور سب کے سب اسی قسم کی دیواروں سے محصور ہیں۔ میں نے جوتا اتار دیا اور نقاب اٹھا دیا اب میں بیت اللہ میں ہوں۔ اسے دیکھ کر چند لمحوں تک میں ایسی متحیر ہوئی کہ اپنی پرائی کچھ خبر نہ تھی۔

اب ہم ایک بڑے دالان میں سنگ مرمر کے فرش پر چل رہے ہیں اس کی چھت کامل چالیس فٹ بلند ہے جو ستونوں کے محرابوں پر کھڑی ہے۔ اس قسم کے دالان چاروں طرف ایک لمبے چوڑے مستطیل صحن کو گھیرے ہوئے ہیں اس مسجد کی وسعت و عظمت

مجھے اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ مجھے خبر نہ تھی کہ یہ ایسی حیرت انگیز ہوگی۔ صحن کعبہ بھی اب مجھے اچھی طرح نظر آرہا ہے۔ صحن کے سب طرف سے چوڑی چوڑی سڑکیں کعبہ تک گئی ہیں۔ ان کے ادھر ادھر کنکریوں کے فرش پر حاجی پڑے سو رہے ہیں۔

ہم سنگ مرمر کے چکنے فرش پر ہو کر مقدس ترین عمارت یعنی بیت اللہ کی جانب بڑھے۔ یہ ایک بڑی سیاہ مکعب عمارت ہے جو سادگی کے ساتھ عظمت و شان سے سر اٹھائے ہوئے ہے۔ مسلمانوں کی یہی وہ منزل مقصود ہے جس کے دیکھنے کی آرزو آرزو میں لاکھوں مر گئے اور لاکھوں نے اس کے دیدار سے جنت کا لطف حاصل کر لیا۔ یہ ملحوظ رہے کہ کعبہ کی نسبت مسلمانوں کا یہ عقیدہ کبھی نہیں رہا ہے کہ وہ صفات الوہیت کی حامل ہے مسلمان نماز میں اس کو مخاطب بھی نہیں کرتے۔ آنحضرت ؐ کی بعثت سے قبل بت پرست بھی اس کی پرستش نہیں کیا کرتے تھے۔ وہ لوگ صرف ان بتوں کو پوجتے تھے جو کعبہ کے اندر رکھے ہوئے تھے۔ اب رہا کعبہ کا طواف! اس کی توضیح شاعرانہ پیرایہ میں اس طرح کی جا سکتی ہے کہ ایک عاشق اپنے محبوب کی خاطر تن من دھن سب کچھ قربان کر کے اور دل و جان سے اس کا مطیع و فرمانبردار ہو کر اس کے گھر پر سے صدقے ہو رہا ہے۔ بس یہی وہ جذبہ تسلیم و رضا ہے جس میں مستغرق ہو کر حاجی کعبہ کا طواف کرتے ہیں۔

کعبہ پر سیاہ غلاف پڑا ہوا ہے جس پر سنہری حروف میں آیات قرآنی کڑھی ہوئی ہیں۔ اسی کے گرد حاجی اپنے مطوفوں کے ساتھ ساتھ دعائیں پڑھتے ہوئے چکر لگا رہے ہیں بنی نوع انسان کے اس عظیم الشان مجمع کے جذبات کی تصویر کھینچنا جس کی ایک فرد میں بھی ہوں بڑے بڑے انشاء پرداز کا کام ہے۔ کیسا مجمع جو ایک محویت کے عالم یا جوش مذہبی سے مدہوش ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا ہے۔ بہت سے حاجی زار و قطار رو رہے ہیں، بہت سے اس تاروں بھرے آسمان کی طرف جو یہ نظارے سینکڑوں برس سے دیکھتا چلا آرہا ہے ہاتھ اٹھائے ہوئے ہیں۔ ان کی پرنم آنکھوں، پر درد مناجاتوں اور دعا کے واسطے پھیلے ہوئے واجب الرحم ہاتھوں نے مجھے بھی بیخود کر دیا۔ ایسا اثر مجھ پر عمر بھر کبھی نہیں ہوا۔ مجھ پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور دوسرے حاجیوں کی طرح میں نے بھی بکمال اطاعت سر جھکا دیا۔ اور جذبات شکر و سپاس سے سرشار ہو کر سب کے ساتھ ساتھ طواف کرنے لگا۔ طواف کے بعد مقام ابراہیم کے پاس دو رکعت نماز پڑھی پھر دیوار کعبہ سے لپٹ کر دعا کرنے لگے۔

(بقیہ صفحہ ۲۱ پر)

ڈاکٹر حسن الدین احمد

جامعہ عثمانیہ کا تخیل

نہ معلوم وہ کیسے لوگ ہوں گے جنہوں نے جامعہ عثمانیہ کے قیام کا منصوبہ بنایا۔ جب اس کی تشکیل ہوئی تو صدیوں پرانے احساس کمتری کا خاتمہ ہو گیا کہ درس و تدریس قومی زبان کے ذریعہ ممکن نہیں۔ محض اس بناء پر کہ انہوں نے شاہ دکن کی حیثیت سے وہ تاریخی فرمان جاری کیا جس کو منشور کی حیثیت حاصل ہے نواب میر عثمان علی خاں کو جامعہ عثمانیہ کا بانی کہنا یا اس بناء پر کہ ۲۲ اپریل ۱۹۱۷ء کو سر اکبر حیدری نے تاریخی عرضداشت پیش کی تھی ان کو جامعہ عثمانیہ کا معمار قرار دینا درست نہ ہوگا [۱]۔ جامعہ عثمانیہ کے تخیل میں کئی شخصیتوں کا ہاتھ ہے اور یہ تخیل آصف سابع کی تخت نشینی سے قبل ہی واضح طریقہ پر پیش ہو چکا تھا۔ میں تو آگے بڑھ کر کہوں گا کہ دورِ عثمانی کے سر بھی جامعہ کے قیام کا تمام تر سہرا باندھنا واجبی نہ ہوگا۔ اگر حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو جامعہ عثمانیہ کا تخیل دورِ عثمانی سے بہت پہلے کی دین ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس وقت کی دوسری جامعات کے برخلاف جامعہ عثمانیہ کو نسبت شہری نہیں بلکہ شہریاری حاصل ہوئی لیکن آصف جاہ سابع کا تعلق جامعہ عثمانیہ کے قیام سے برائے نام تھا۔ اس نسبت کا پورا پورا فائدہ بھی انہیں حاصل ہوا۔

دورِ عثمانی کا آغاز ۱۹۱۱ء میں ہوا اور جامعہ عثمانیہ کی تاسیس ۱۹۱۸ء میں عمل میں آئی۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ صرف ۷ سال کی قلیل مدت میں اس انقلاب آفریں تخیل کا نشو و نما بھی ہوا اور صورت گری بھی ہوئی ہرگز درست نہ ہوگا۔ بقول پروفیسر عبدالقادر سروری "جامعہ عثمانیہ کوئی پیدا کی ہوئی چیز نہیں بلکہ ملک کے گزشتہ تعلیمی حالات کی بتدریج ارتقاء یافتہ

---

[۱] اس نقطہ نظر کی وضاحت اس لئے ضروری معلوم ہوئی کہ بدر شکیب جیسے اہل نظر نے بھی اپنی کتاب سرگذشت جامعہ عثمانیہ ۱۹۷۱ء میں سر اکبر حیدری کو جامعہ عثمانیہ کا معمار قرار دیا ہے درآنحالیکہ تاریخی حقائق کی روشنی میں سر اکبر حیدری کا شمار زیادہ سے زیادہ بطور یکے از معماران جامعہ عثمانیہ کیا جا سکتا ہے۔

تشکیل ہے[1] ۔ خدیو ملک کے ذہن میں حیدرآباد کے لئے ایک جامعہ کا خیال اور اس جامعہ کے اجزاء ترکیبی کا دھندلا تصور اس میں شک نہیں کہ عرصہ پہلے پیدا ہو چکا تھا[2]

جامعہ عثمانیہ کو سمجھنے کے لئے انیسویں صدی کے آخری حصہ اور بیسویں صدی کے پہلے عشروں کے حیدرآبادیوں کے دلوں، جذبات، احساسات اور امنگوں کو سمجھنا ہوگا اور ان عظیم شخصیتوں کی زندگیوں اور ان کے خیالات کا مطالعہ کرنا ہوگا جنہوں نے حیدرآباد کے لئے ایک علحدہ جامعہ کا خواب دیکھا، قیام جامعہ کا مطالبہ کیا اور اس کے لئے فضا کو ہموار کیا ۔ آج ہم جامعہ عثمانیہ کی [illegible] کا راستہ صاف کرنے والی ان عظیم ہستیوں کی یاد تازہ کرنی چاہیے اور ان کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرنا چاہیے جنہوں نے قیام جامعہ کے مطالبہ کو اپنی زندگیوں کا نصب العین بنایا تھا ۔ وہ قوم نہایت بدنصیب ہے جو اپنے بزرگوں کے کاموں کو جو یاد رکھنے کے قابل ہیں یاد نہ رکھے یا ان کو نہ جانے ۔[3]

ہندوستان میں انگریزی حکومت کا قیام مستحکم ہوا تو مسلمانوں نے بدیسی حکومت سے بیزاری اور نفرت کا اظہار زبان انگریزی کی مخالفت کی صورت میں کیا ۔ سر سید نے اس رویہ کے نقصان کو شدت کے ساتھ محسوس کر کے انگریزی تعلیم کی زبردست حمایت کی تاکہ مسلمان انگریز حکمرانوں کے بیٹھنے کے قابل بنیں ۔

حیدرآباد میں صورتحال مختلف تھی ۔ یہاں اقتدار مسلمان حکمراں اور امراء کے ایک طبقہ کو حاصل تھا جس میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی شامل تھے ۔ ریزیڈنسی کی مداخلت کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ انگریز بھی حکمرانی میں شریک تھے ۔ یہاں کے حالات کے پیش نظر یہاں انگریز کی ہم نشینی نہ تھی اور نہ ہی ہم نشینی کی اہلیت پیدا کرنے کے لئے انگریزی زبان ناگزیر ۔ ان حالات میں یہاں سر سید کی تحریک کا راست اثر نہیں پڑا بلکہ اہل فکر طبقہ نے مادری زبان میں اعلیٰ تعلیم کے مواقع پیدا کرنے کے خواب دیکھے ۔ اس خواب کے لئے حیدرآباد میں ماحول سازگار رہا ۔ حیدرآباد کی سرگرمیوں میں اردو زبان کا تقریباً (۱۵۰) سال کا ساتھ ہے ۔ گو جامع مسجد کے مدرسہ کی ابتداء سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں ہوئی تھی لیکن کچھ عرصہ بعد یہاں تعلیم کا سلسلہ موقوف ہو گیا تھا ۔ مولانا حافظ شجاع الدین صاحب

---

۱ و ۲ حیدرآباد کی تعلیمی ترقی گزشتہ ربع صدی میں از پروفیسر عبدالقادر سروری - ۹۳۴

۳ علامہ شبلی نعمانی کی تالیف "المامون" کا مقدمہ از سر سید احمد خان

دلچسپی کی وجہ سے امیر کبیر نواب فخر الدین خاں شمس الامرا ثانی[۱] نے ۱۸۳۰ء میں [illegible] کی
طرح مدرسہ شجاعیہ کی ابتدا ہوئی ۔ ۱۸۴۳ء میں امیر کبیر نے اپنی دیوڑھی واقع شاہ گنج میں ایک اور
مدرسہ فخریہ قائم کیا جہاں دینی علوم کے ساتھ علم کیمیا طبعیات اور ریاضی کی تعلیم اردو زبان میں
دی جاتی تھی ۔ امیر کبیر کو ترقی تعلیم سے بڑی دلچسپی تھی ۔ اردو زبان میں ان علوم جدید کی کتابیں
موجود نہ ہونے کی وجہ سے خود نواب صاحب کے مطبع میں طبع کی جاتیں ۔ اردو
زبان میں یہ سب سے پہلی منظم کوشش تھی ۔ دہلی کالج اور رڑکی انجینیرنگ کالج کا کام اس کے بعد کا ہے[۲]
اس کے بعد ۸ مارچ ۱۸۵۶ء کو سر سالار جنگ نے اپنی دیوڑھی واقع پتھر گٹی (?) میں مدرسہ
دار العلوم کی ابتداء کی ۔ مندرجہ بالا تینوں مدرسوں میں اردو زبان، درس و تدریس کے لئے استعمال
کی جاتی تھی ۔ اس کے علاوہ ۱۸۴۵ء میں یعنی نواب ناصر الدولہ کے آخری دور میں مدرسہ طبابت کا
کا قیام عمل میں آیا جہاں ڈاکٹری کی تعلیم اردو زبان میں دی جاتی تھی ۔ شمالی ہند میں حکمران طبقہ کی
زبان انگریزی کی موجودگی کی وجہ سے اردو کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے زیر غور لانے کا امکان نہ تھا
ایک طرف مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے فوائد تھے تو دوسری طرف حکمران طبقہ کی زبان میں مہارت
پیدا کرنے کے فوائد، ثانی الذکر فوائد موقتی طور پر زیادہ اہمیت کے حامل تھے ۔ ریاست حیدرآباد
میں اردو کا مقابلہ انگریزی سے نہیں فارسی سے تھا ۔ نواب مختار الملک سر سالار جنگ (دور وزارت
۱۸۵۳ء تا ۱۸۸۳ء) شدت سے اس اصول پر عمل پیرا تھے کہ فارسی زبان کو ریاست کی سرکاری
زبان برقرار رکھا جائے ۔ وہ اردو کو سرکاری زبان قرار دینے کے سخت مخالف تھے[۳] شمالی ہند میں
انگریزوں نے ۱۸۳۵ء میں فارسی زبان کی بجائے اردو کو دفتری اور عدالتوں کی زبان قرار دیا لیکن
حیدرآباد میں سر سالار جنگ اول نے ایسا نہ ہونے دیا ۔ مشتاق حسین[۴] نے اور دیگر حضرات نے

---

[۱] امیر کبیر نواب محمد فخر الدین خاں شمس الامرا ثانی (۱۸۰۰ء تا ۱۸۹۲ء) امیر پائیگاہ تھے جن کے جد امجد
نواب ابو الخیر خاں حضرت آصفجاہ اول کے سپہ سالار تھے ان کا سلسلہ نسب بابا فرید الدین گنج شکر سے ہوتا ہوا
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے [۲] اردو میں سائنسی ادب از خواجہ حمید الدین شاہد
[۳] ایک دفعہ سالار جنگ اول نے سرور الملک سے کہا تھا "تم ہندوستانی لوگ فارسی تحریر و تقریر میں مشاق
نہیں ہو ۔ اپنے ملک میں تم ذرا سے نشان مٹا چکے ۔ اب یہاں بھی یہ اندھیر کیا چاہتے ہو ۔ جب تک میں
زندہ ہوں فارسی بھی زندہ رہے گی " [۴] وقار الملک (ولادت ۱۸۴۱ء وفات ۱۹۱۷ء) معتمد (?)

غالباً اس کی کوشش بھی کی تھی لیکن سر سالار جنگ اول مضبوط ارادے کے انسان تھے اور بحیثیت ناظم نظم و نسق اپنی پالیسی پر سختی سے عمل پیرا رہتے تھے اس لئے ان کے دور میں ان کی معلنہ پالیسی کے خلاف اردو کی صورت ممکن نہ تھی اور اردو زبان کو سرکاری زبان بنانا یا اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانا مشکل تھا اور اس حد تک فضا ناسازگار رہی تھی[1]۔ اس صورت حال کے باوجود شیخ احمد حسین رفعت یار جنگ اول مددگار معتمد مالگذاری نے ۱۸۷۵ء[2] میں ہمدردانِ ملک کے نام اپیل شائع کی جس میں مروجہ تعلیم کی خامیاں دکھا کر ایک جامع العلوم کے قیام کی تحریک کی گئی تھی اور انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کے متعلق حسب ذیل رائے دی :

"براے انگریزی کہ بنظر رواج تعلیمش ضروری دانستہ می شود ۔ بدیں نمط اہتمام رود کہ صرف تعلیم زبان یعنی تحصیل انشاء در انگریزی عادت کردہ اند حق اینست کہ تحصیل آں علوم و فنون بمردم ہند در زبان انگریزی بوجوہ کثیر قطعاً دشوار و موجب تضییع اوقات است ، ازاں باز داشتہ آید ۔"

کہا جاتا ہے کہ سالار جنگ نے اس تحریک کو پسند کیا اور لکھا :

"ہمہ حرفاً حرفاً دیدم و مسرور شدم و تحسین کردم و ایں تدبیر را مفید می پندارم"

اگر سالار جنگ اول کی مندرجہ بالا پالیسی کا نکتہ پیش نظر ہوتا تو ڈاکٹر زور یہ نہ فرماتے

"تاریخ بالکل خاموش ہے اور قطعاً رہبری نہیں کرتی کہ سالار جنگ کے اظہار خوشنودی بلکہ منظوری کے بعد بھی حیدرآباد میں ایک ایسی درسگاہ جس کا مرتبہ جامعہ کے برابر ہوتا کیوں قائم نہ ہو سکی ۔"[3]

بقیہ حاشیہ ص

عدالت و کوتوالی اور رکن مجلس مال کی حیثیت سے خدمات انجام دیں ۱۸۸۴ء میں سر سالار جنگ ثانی کے دورِ وزارت میں تقریباً دو ماہ تک اضلاع تلنگانہ کا دورہ کرنے کے بعد انہوں نے جو مبسوط رپورٹ پیش کی اس میں اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج کرنے کی رائے دی

[1] سر سالار جنگ کے بعد میر لائق علی خاں سالار جنگ ثانی کے عہد میں یعنی ۱۸۸۴ء میں نواب محسن الملک وغیرہ کی کوششوں سے اردو کو سرکاری زبان قرار دیا گیا یعنی برطانوی عہد میں اس کو سرکاری زبان قرار دینے کے تقریباً ۵۰ سال بعد۔ [2] سرگزشت جامعہ عثمانیہ از بدر شکیب ۱۹۷۱ء صفحہ ۱۳۴ پر ۱۸۸۳ء درج ہے۔ [3] ارمغان جشن طلائی جامعہ عثمانیہ مرتبہ انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ کراچی ۱۹۶۹ء

مسٹر بلنٹ دوسری مرتبہ حیدرآباد آئے باغ عامہ میں ایک بڑا جلسہ ۲۲ اپریل ۱۸۸۱
منعقد کیا گیا جس میں حضور نظام جن کی عمر اس وقت ۱۸ سال تھی بحیثیت صدر جلسہ تشریف فرما تھے
یہ اپنی نوعیت کا پہلا جلسہ تھا جس کی حکمران وقت نے صدارت کی تھی ۔ نواب میر لائق علی خان
سر سالار جنگ دوم بھی شریک تھے مسلم یونیورسٹی بنام نظام یونیورسٹی قائم کرنے کی تحریک منظور
کی ۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ حیدرآباد میں اسلامی یونیورسٹی کے قیام کے تخیل میں جمال الدین
افغانی کا بھی دخل رہا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ (بلنٹ اور ان کی بیوی مسلمانوں
سے کمال درجہ محبت کا دعویٰ رکھتے تھے اور ہندوستان کے ہر صوبے کے مشہور مسلمانوں سے مل کر
ترغیب دلاتے تھے کہ ہندوستان یا عرب میں ایک عربی یونیورسٹی باصول جدید قائم کی جائے ،
خود انگریز تھے مگر انگریزی اہل حل وعقد کے اصول حکمرانی کے بڑے مخالف تھے ۔ مسلمانوں کی
طرفداری میں انگریز حکام وقت سے ادنیٰ سے اعلیٰ کی مذمت میں رطب اللسان تھے (نامہ ہدایت ۲۳۵)
مولانا سید جمال الدین افغانی ستمبر ۱۸۷۹ء میں حیدرآباد آئے تھے ۔ وہ حیدرآباد
کی تعلیمی پستی سے واقف تھے ۔ ۱۳ ستمبر ۱۸۸۳ء کو بلنٹ کی ملاقات سید جمال الدین افغانی
سے پیرس میں ہوئی ۔ بلنٹ اواخر نومبر ۱۸۸۳ء میں حیدرآباد پہنچے اور ۱۰ دسمبر تک حیدرآباد
میں رہ کر بمبئی اور پھر کلکتہ گئے ۔ ۲ جنوری ۱۸۸۴ء کو انجمن اسلامیہ کلکتہ کی میٹنگ میں
بلنٹ نے اسلامی یونیورسٹی کی تجویز پیش کی ۔ ۔ ۔ ۴ جنوری کو بلنٹ نے اس تجویز کو نظام کے
سامنے رکھا جو اس وقت کلکتہ میں تھے ۔ یہ طے پایا کہ سالار جنگ کے ذریعہ ایک نوٹ روانہ
کیا جائے گا ۔ نظام کی حیدرآباد واپسی کے بعد ۲۴ جنوری کو بلنٹ نے جامعہ کی اسکیم پر
تفصیلی نوٹ روانہ کیا جو کتاب انڈیا انڈر ایپن میں ضمیمہ کے طور پر شریک ہے ۔ سالار جنگ دوم
نے ۱۳ فروری ۱۸۸۴ء کو جواب دیا اس کے کچھ عرصہ بعد (۸ مئی ۱۸۸۵ء کو) حضور نظام
علیگڑھ تشریف لے گئے اور وہاں سر سید احمد خاں بھی پہونچے تو رسالہ جریدہ روزگار نے لکھا

"ہم سمجھتے ہیں کہ صاحب ممدوح (سر سید احمد خاں) نظام یونیورسٹی کی بنا
کی مشاورت کے لئے طلب کئے گئے ہیں ۔ ۔ ۔"

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد مرتضیٰ نے لکھا :

" یہ خبر صحیح ہو نہ ہو لیکن اس سے یہ نظر آسکتا ہے کہ یہ خیال عام دماغوں میں کس قدر
پر جوش بن رہا تھا ۔ ہندوستان سے گذرتے ہوئے اس خیالی یونیورسٹی کا شہرہ

لندن تک پہونچا اور قریب قریب محمڈن یونیورسٹی کی اسکیم کے یہ سکیم ترتیب پائی
۔ مگر وہ (ذہنٹ کی اسکیم) ایک بجلی تھی جو چمکی اور غائب ہوگئی ۔ "[1]

نظام کالج کی ابتداء ۱۸۷۰ء میں ہوئی ۔ نظام کالج مدراس یونیورسٹی سے ملحق تھا ۔ کثیر مصارف کے مقابل بیان کے نتائج غیر تشفی بخش تھے ۔ اہل ملک عام طور پر تعلیم سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے ۔ سر وقار الامراء[2] کے عہد وزارت میں ۱۸۹۴ء میں جو جلسہ تقسیم انعامات نظام کالج میں حضور نظام کی صدارت میں منعقد ہوا تھا اس میں سر وقار الامراء نے قیام جامعہ کی تجدید کی تھی ۔

دار العلوم کا درخشاں زمانہ ۱۸۹۰ء سے شروع ہوتا ہے جب کہ اس کا الحاق جامعہ پنجاب سے ہوا ۔ اس درس گاہ میں مولوی فاضل تک تعلیم کا انتظام تھا اور امتحانات پنجاب یونیورسٹی کے ہوتے تھے ۔ دار العلوم سے فراغت تعلیم کے بعد نوجوان باہر آئے تو ہر میدان میں اچھے ثابت ہوئے ۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جہاں اس درسگاہ کے سپوت کار فرما نہ ہوں ... دار العلوم آئندہ وجود میں آنے والی جامعہ کا نقش اول تھا ۔ اس درس گاہ کے فارغ التحصیل طلباء نے جامعہ کا خواب دیکھا ۔ جب ۱۸۹۹ء میں نظام کالج کے ۷۷ طلباء امتحان میٹرک میں شریک ہوئے اور صرف (۷) نے کامیابی حاصل کی تو اس کا ردعمل نوجوانوں کے ذہنوں پر ہوا ۔

محمد مرتضیٰ جو دار العلوم کے فارغ التحصیل تھے ۱۸۹۹ء میں ایک خیال آفریں مضمون بعنوان "حیدرآباد کی تعلیمی حالت کیوں ترقی نہیں کرتی" لکھا ۔

مولوی عبد القادر (نصیر الدین ہاشمی کے والد ماجد) نے مدراس کے ہفتہ وار اخبار "مخبر دکن" میں ۱۸۹۹ء کے لگ بھگ ایک سلسلہ مضامین کا بعنوان "اصلاح تعلیمات حیدرآباد" شروع کیا ۔ ان مضامین میں حیدرآباد میں تعلیم کی ترقی کے امکانات واضح کئے گئے ۔ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے کہ نظام کالج کے مصارف سالانہ کئی لاکھ روپیہ ہوتے ہیں ۔ مدراس یونیورسٹی کے نصاب تعلیم اور حیدرآباد کی تعلیمی پستی کو ظاہر کیا گیا ۔ نظام کالج کو مدراس یونیورسٹی سے منقطع

---

[1] روح ترقی از محمد مرتضیٰ صفحہ ۵ [2] نواب فضل الدین خاں سر وقار الامراء (اقبال الدولہ) فرزند نواب رشید الدین خاں وقار الامراء نواب فضل الدین خان آسمان جاہ کے بعد مدار المہام مقرر ہوئے (۱۸۹۳ء تا ۱۹۰۱ء)

کہ حیدرآباد میں علیحدہ یونیورسٹی کے قیام کی تجویز پیش کی

نظام کالج کے حوصلہ شکن نتائج کی بناء پر سررشتۂ تعلیمات میں یہ تحریک پیش ہوئی کہ نظام کالج کا الحاق مدراس یونیورسٹی کی بجائے کلکتہ یونیورسٹی سے کیا جائے۔ معتمد تعلیمات نے اس تحریک سے اتفاق نہیں کیا۔ جب یہ کارروائی نواب فخر الملک کے ملاحظہ میں پیش ہوئی جو صیغۂ تعلیمات تھے تو موصوف نے مولوی عبدالقادر کے مضامین کو پیش نظر رکھ کر یہ رائے دی کہ حیدرآباد میں ایک علیحدہ یونیورسٹی قائم کرنی چاہیئے۔ مدارالمہام وقت نواب سر وقار الامراء (اقبال الدولہ) نے اس کی مخالفت کی تاہم معاملہ کیبنٹ کونسل تک گیا اور کارروائی لارڈ کرزن کی مقرر کردہ یونیورسٹی کمیشن رپورٹ شائع ہونے تک ملتوی کر دی گئی۔ یہ ۱۹۰۱ء کا واقعہ ہے

اس کے بعد محمد مرتضیٰ نے ۱۳۲۲ ہجری (۱۹۰۳ء) میں ایک کتاب "روح ترقی" کے نام سے شائع کی جس میں اس سوال کا جواب دیا گیا کہ حیدرآباد کیوں ترقی نہیں کرتا اور پھر جامعہ نظام "قائم کرنے اور اردو زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے کی تجویز پیش کی و نیز مغربی زبانوں سے علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمہ کے لئے دار الترجمہ قائم کرنے کی تحریک کی۔ [1]

محمد مرتضیٰ "روح ترقی" میں "نظام یونیورسٹی" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"آج اگر ہم نظام یونیورسٹی کا نعرہ مارنے لگیں تو ظاہر ہے کہ اس سے کوئی اثر مترتب نہیں ہو سکتا اس لئے تا بمقدور ایسی تجویزیں پیش کی گئی ہیں جو سہل الحصول کہی جا سکتی ہیں۔ بڑا حصہ ایسا ہے جس کے جاری ہونے میں کسی قسم کی عملی و مالی دقتیں حائل نہیں ہیں۔" (روح ترقی ص ۲۵)

لارڈ کرزن کے نافذ کردہ قانون جامعات برطانوی ہند کی بنا پر جامعہ پنجاب نے ۱۹۰۶ء میں اپنے امتحانات عربی و فارسی کا انقطاع کیا۔ برطانوی حکومت چاہتی تھی کہ خود مدراس یونیورسٹی ایسے امتحانات کا سلسلہ قائم کرے لیکن مدراس یونیورسٹی سے اس بجز انتظام میں تاخیر ہوئی۔ اس موقع پر اگھور ناتھ چٹوپادھیائے [2] نے فوراً ایک پرائیوٹ اکیڈیمی انجمن معیار العلوم کے ذریعہ امتحانات لئے جانے کا اعلان کرایا اور اکیڈیمی کو سرکار سے تسلیم کروانے کی استدعا کی۔ ڈاکٹر اگھورناتھ چٹوپادھیائے کا خیال تھا کہ بتدریج ملک میں ایک قومی یونیورسٹی

---

[1] از کتاب "مولوی عبدالقادر" از محمد نصیر الدین ہاشمی مارچ ۱۹۶۳ء

[2] سروجنی نائیڈو کے والد

غیر سرکاری اہتمام سے قائم کر دی جائے۔[1] ملا عبد القیوم، مولانا سید علی حیدر نظم طباطبائی اور دیگر علماء نے جامعہ پنجاب کے امتحانات کے مماثل امتحانات خانگی طور پر لینے اور اسناد دینے کا انتظام کیا۔ نواب فخر الملک نے پر زور تجویز کی کہ خود سرکاری طور پر ایسے امتحانات کا انتظام ہونا چاہیئے بیرونی جامعہ کی طرح غیر سرکاری ادارہ کی ضرورت نہیں۔ مدار المہام وقت مہاراجہ سر کشن پرشاد نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ قواعد و ضوابط نافذ کر کے امتحانات جامعہ پنجاب ہی کے قواعد کے مطابق شروع کئے گئے۔ اسی زمانہ میں حسین لطف اللہ طالب علم مدرسہ دار العلوم نے "نظام یونیورسٹی" کے عنوان سے ایک مضمون "مخبر دکن" میں لکھا۔ تحیر آصفی (مدراس) میں بھی مدار المہام کے نام کھلی چٹھی کے طور پر اردو کو ذریعہ تعلیم بنا کر ایک یونیورسٹی قائم کرنے کی تحریک شائع ہوئی تھی:[2]

اب یہ خیال ہوا کہ دار العلوم میں مولوی فاضل سے بھی اونچے درجہ کی تعلیم کا بندوبست ہو چنانچہ مدرسہ کی تنظیم کا خیال عماد جنگ اول معتمد عدالت و تعلیمات کو پیدا ہوا۔ نواب فخر الملک معین المہام تعلیمات ہوئے تو ملا عبد القیوم سے ایک یادداشت مرتب کرنے کی سرکاری طور پر خواہش کی گئی۔ اسی اثناء میں ملا عبد القیوم اور عماد جنگ اول کا انتقال ہو گیا۔ نواب سر بلند جنگ معتمد عدالت کو دلچسپی نہ تھی اس لئے مزید پیشرفت نہ ہو سکی۔

دار العلوم کا سالانہ جشن جوبلی ۱۹۱۳ء میں منایا گیا۔ سالار جنگ ثالث مدار المہام نے اس کی صدارت کی۔ دار العلوم کی تاریخ پر مضمون پڑھا گیا۔ تحریکات میں سب سے اہم حیدر آباد کے لئے ایک جامعہ کے قیام کا مطالبہ تھا۔ شبلی نعمانی نے الندوہ میں لکھا ہے کہ وہ دار العلوم ندوہ کو حیدر آباد کی مجوزہ مشرقی یونیورسٹی سے ملحق کر دیں گے۔

محمد مرتضیٰ نے حیدر آباد ایجوکیشنل سوسائٹی قائم کرنے کے لئے ۱۹۱۴ء میں اپیل شائع کی تو اس میں لکھا۔

"ایک یونیورسٹی کے لئے مواد مہیا ہے۔ مختلف امتحانات یہاں ہوتے ہیں ضرورت ہے کہ سب ایک سلسلہ میں مربوط ہوں۔ تمام امتحانات میں جہت جامعہ ملحوظ رہے۔ کانفرنس کو یقین ہے کہ وہ دن دور نہیں جب کہ

---

[1] "دار العلوم کے سپوت" از حافظ محمد مظہر، ادارہ ادبیات اردو، ص ۲۹
[2] اقتباس رسالہ "اردو" اپریل ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔

نظام یونیورسٹی ہمارے نوجوان کی زندگی کا محور رہنا :

محمد سرتقوی نے ایجوکیشنل کانفرنس (انجمن ترقی تعلیم) کی بنیاد ۱۹۱۳ء میں رکھی
کانفرنس کے بنیادی مقاصد یہ تھے :

۱- علمی سوسائٹی کا قیام جو تقریروں اور علمی تحریرات کے ذریعہ علمی تازگی پیدا کرے ۔
۲- توسیع دائرہ تعلیم (اشاعت تعلیم)
۳- اصلاح تعلیم ۔

ان مقاصد کے لئے حسب ذیل نظام العمل مقرر کیا گیا :-

الف- علوم و فنون اردو میں منتقل کئے جائیں ب- اردو کو اعلیٰ اور فوقانی تعلیم کا ذریعہ بنایا جائے ۔ ج- یونیورسٹی کا قیام

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس جیسی وقیع اور سنجیدہ انجمنیں ہندوستان میں کم ہی نظر آئیں گی ۔ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ ملک کی اہم ترین غیر سرکاری تعلیمی مرکز بن گئی ۔

یکم مارچ ۱۹۱۵ء کو حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے اجلاس کے خطبہ صدارت میں سر اکبر حیدری نے کہا :-

" خدا نے چاہا تو چند سال میں دارالعلوم ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہو جائے گا جس کی نظیر ہندوستان بھر میں نہ ہوگی ۔ "

اس کے کچھ عرصہ بعد جامعہ میسور قائم ہوگئی ۔ ۱۹۱۵ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ پونہ کے خطبہ صدارت میں جسٹس سر عبدالرحیم نے حیدرآباد کو مشرقی یونیورسٹی قائم کرنے کا مشورہ دیا ۔ ندوہ میں ایک رزولیوشن دارالعلوم کو یونیورسٹی بنائے جانے کے متعلق منظور ہوا ۔

انجمن طلبائے قدیم دارالعلوم کا قیام جشن جوبلی کے سلسلہ میں ۱۹۱۳ء میں عمل میں آیا
انجمن طلبائے قدیم کے تیسرے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۹۱۶ء میں اس طرح توجہ دلائی گئی :

"حقیقت میں یہ امر تازیانہ عبرت ہے کہ حیدرآباد جہاں پہلے سے علوم قدیمہ و جدیدہ کے اجتماع کی کوشش دارالعلوم کے ذریعہ ۳۳ سال پیشتر شروع ہوئی اس طویل عرصہ میں مشہور آفاق دارالعلوم بن جانے کے عوض مایوس حالت میں ہو کہ دور دور سے اس کی ترقی کے لئے توجہ دلائی جائے ۔ سال آئندہ

ؔ۔ دروح ترقی ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء

جسٹس عبدالرحیم نے پونہ کانفرنس میں مشرقی یونیورسٹی کے لئے حیدرآباد کو توجہ دلائی ہے اور ابھی حال میں ندوہ میں ایک رزولیوشن ہمارے دارالعلوم کو یونیورسٹی بنائے جانے کے متعلق منظور ہوا ۔"

مختصر یہ کہ ایسے دور میں جب کہ حیدرآباد کی سیاسی زندگی میں غیر معمولی خلفشار تھا[1] چند اولوالعزم شخصیتوں نے سیاسی جوڑ توڑ میں حصہ لینے کی بجائے تعمیری نقطۂ نظر اختیار کیا اور قیام جامعہ کی تحریک چلائی ۔ یہ لوگ سچائی ، درد اور استقلال سے اپنا کام کئے جارہے تھے ۔ ان کی کوششوں سے چند ہمدرد افراد بالآخر باہم مجتمع ہوگئے ۔ امیر کبیر نواب محمد فخر الدین خاں شمس الامراء ثانی نے جو راستہ ہموار کیا تھا اس پر چل کر خاندان نوائط کے ممتاز افراد مولوی عبدالقادر ، محمد مرتضیٰ ، مولانا صفی الدین مددگار صیغہ تعلیمات ، حسین لطف اللہ وغیرہ نے زور و شور سے قیام جامعہ کا مطالبہ کیا اور اس سلسلہ میں موثر آواز بلند کی ۔ محمد مرتضیٰ نے اس مطالبہ کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دے لیا اور اس سلسلہ میں انہوں نے کسی بھی کوشش سے دریغ نہیں کیا ۔ قیام جامعہ کے سلسلہ میں انہوں نے جو جد و جہد کی اس کے نتیجہ کے طور پر عوامی حلقوں میں اور حکومتی سطح پر حیدرآباد کے لئے ایک علٰحدہ یونیورسٹی کا احساس پیدا ہوا[2] ۔ اس احساس کو پیدا کرنے میں رسالہ صحیفہ نے بھی نمایاں حصہ لیا[3]

---

[1] ۱۸۸۳ء میں حیدرآباد کے وزیر با تدبیر سر سالار جنگ اول کا انتقال ہوا تو اس وقت نظام حیدرآباد نواب میر محبوب علی خاں کی عمر صرف ۱۷ سال تھی ۔ حیدرآباد کے لئے یہ بڑا سخت دور تھا ۔ اکرام اللہ خاں ندوی "وقار حیات" میں لکھتے ہیں : "حیدرآباد کا زمانہ بھی ایک خاص زمانہ تھا جب کہ یورپ اور ہندوستان کے بڑے بڑے نامور پولیٹکل شاطر وہاں جمع تھے اور ہر شخص اپنے مخصوص اغراض کے مطابق جوڑ توڑ اور سازش میں مصروف تھا ۔" سرور الملک "کارنامہ سروری" میں لکھتے ہیں : "اس وقت تک (سفر دہلی تک) اعلیٰ عہدوں پر زیر نگرانی امراء زادگان اکثر حضرات مدراس مقرر و ممتاز تھے ۔ یہ سب حضرات سیدھے سچے ، باوفا اور بہی خواہ اپنی سرکار کے تھے ۔ کبھی ان کے ذہن میں اپنے دائرہ سے قدم آگے بڑھانا یا خیر خواہی کے پردے میں اس سے ذاتی منافع حاصل کرنا نہیں آتا تھا مگر اب انتظام ملک کے ... محکمہ جات میں شمالی ہند کے افراد بھی بیشتر سفارش سید احمد خاں آنے لگے ..... (سر سالار جنگ اول کے بعد) کل شمالی ہندوستان کے افراد ایک گروہ عظیم تجربہ کار ..... ہے کہ موقع خود نہ آئے تو موقع کو گھسیٹ لائیں یک دل و یک جہت ہوکر بیچارہ مہاراجہ کے انتظام کو بدنام کرنے میں ہمہ تن ... بیکار تھے ... وہ چند شریف حضرات جو ..... بنگالہ سے طلب کئے گئے تھے (وکیل الدین احترام جنگ اور مولوی عبدالکریم میر مجلس عدالت العالیہ) ان کی عمر وفا نے رفاقت نہ کی ..." [2] جب جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا تو (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صـ سے آگے)

کامیاب جامعہ نے قدیم سنت کو پورا کرتے ہوئے اسی محمد مرتضیٰ کو جس نے جامعہ کا تخیل دیا تھا مجلس رفقاء اور سرکاری ملازمت سے بھی علٰحدہ کیا (دارالعلوم کے سپوت از حافظ محمد مظہر۔ صفحہ ۳۸)

گے رضی الدین حسن کیفی نے انجمن معارف کی زیرِ نگرانی جو ماہوار رسالہ جاری کیا، ملا عبدالقیوم کے انتقال کی وجہ سے انجمن اور صحیفہ کو ابتداء کے فوری بعد بند دیکھنا پڑا۔ بعد میں مولوی اکبر علی اس کے ایڈیٹر بنے۔ چند سال بعد اس رسالہ نے روزنامہ کی صورت اختیار کی۔ یہ شام کو شائع ہوتا تھا۔

▭▭

بقیہ مضمون "سفرنامہ حرمین" (صـ سے آگے)

اس جگہ حاجیوں پر خشوع و خضوع اور بیخودی کی کیفیت طاری تھی بعض زار و قطار رو رہے تھے پھر ہم اس حجرہ میں گئے جہاں چشمہ زمزم ابل رہا ہے یہ وہی کنواں ہے جس نے ہاجرہؑ اور ان کے بچے کی جان بچائی تھی۔ پھر ہم بیت اللہ کے صحن کو پار کرکے باب الصفاء سے باہر گئے اور اس گلی میں پہنچے جو "المسعیٰ" کہلاتی ہے۔ چند قدم چل کر ہم ان سیڑھیوں کے قریب پہنچ گئے جو ایک چٹانی چبوترہ پر چڑھنے کے لئے بنی ہوئی ہیں اس چبوترہ کو "المروہ" کہتے ہیں یہاں تکبیر پڑھ کر اور سیڑھیوں سے اتر کر مسعیٰ کی گلی میں کسی قدر تیز قدمی سے چلے اور ایک دوسری پہاڑی کے دامن میں پہنچے۔ یہاں بھی پتھروں کو کھود کر ایک چبوترہ اور سیڑھیاں بنائی گئی ہیں اسے "الصفاء" کہتے ہیں۔ یہاں تکبیریں کہہ کر پھر واپس ہو کر دوڑے۔ اسی طرح سات دفعہ دوڑے۔ میں تھک کر ہانپتے ہوئے حاجیوں کو دیکھنے کے لئے ٹھیر گئی۔ بعض بیمار حاجی چارپائیوں پر ہیں، ایک عورت تھک کر گر پڑی ہے اس کا شوہر اس کو اٹھاتا ہے، پیٹھ پر لاد لیتا ہے اور پھر دوڑنا شروع کر دیتا ہے۔

اب آدھی رات ہو گئی ہے۔ میں نے عمرہ ختم کر لیا، اب گھر جاتی ہوں اور احرام اتار دیتی ہوں۔

(باقی آئندہ)

منظور احمد منظور

مشاعرے

مشاعرے' ہماری زبان' تہذیب اور ہمارے کلچر کی بقا' ترویج اور ترقی کا ایک اہم ذریعہ ہیں. اچھے شاعروں کا فکر انگیز کلام سامعین کے ذہن و شعور کو جھنجھوڑتا' بیدار کرتا اور ان کے دل میں زندگی سے پیار اور اس کی قدر کرنے کا عزم اور حوصلہ پیدا کرتا ہے.

قدیم زمانے میں ترسیل و ابلاغ کے ذرائع محدود تھے لیکن چھوٹے پیمانے پر ہی سہی زبان و ادب کا صحیح مذاق پیدا کرنے' روحانی مسرت اور ادبی ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرنے میں اس وقت بھی مشاعرے کے انسٹی ٹیوشن نے اہم حصہ ادا کیا تھا.

مشاعرہ کا ایک دور وہ بھی تھا جب ہر شاعر کی باری کے موقع پر اس کے سامنے شمع لائی جاتی تھی. یہ شعری نشستیں' نظم و ضبط' تہذیب و شائستگی' متانت سنجیدگی کا مکمل نمونہ اور مظہر ہوتی تھیں. ان سے شعراء اور سامعین دونوں کے ذہن و فکر کی تربیت اور رہنمائی ہوتی تھی.

مشاعروں کے اس قدیم دور میں استاد اور شاگرد کے رشتے بھی بہت مضبوط ہوا کرتے تھے. یہ کچے دھاگے کا رابطہ در اصل رشتہ تھا. شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہوتا جس کا فن شعر گوئی میں کوئی استاد نہ ہو. دراصل اس زمانے میں بے استادا ہونا ایک عیب سمجھا جاتا تھا. یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ استاد کی نگاہ کے بغیر شاگردوں کو زبان و بیان کی باریکیوں اور نزاکتوں کی خبر ہی نہیں ہو سکتی. راہ و رسم منزل سے واقفیت اور فکر و تخیل کی بلندی' وسعت گہرائی' اور گیرائی کا احساس پیدا کرنے' لب و لہجہ پیدا کرنے اور رموز و نکات سخن کے سمجھنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے استاد سخن کے ماہرانہ مشورے بے حد ضروری سمجھے جاتے تھے. اس طرح اساتذۂ سخن کے وجود سے مشاعرے' زندگی' توانائی' بصیرت' بصیرت کا منبع اور وسیلہ تھے. رواج کے مطابق اساتذہ اور ان کے شاگردوں کے گروہ کلام پر بے حد تنقید کرتے تھے. اس لئے خود مشاعرے میں اپنے کلام پر ہونے والے اعتراضات کے سبب کسی قسم کے سقم

پڑھنے سے قبل غور کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو کر آتے تھے۔ کلام سنانے کے دوران جو چوٹیں ایک دوسرے پر چلی جاتی تھیں اور آپس میں جو ادبی معرکے ہوا کرتے تھے ان سے بھی زبان و بیان کی درستگی اور صحت کی طرف توجہ مرکوز ہوتی تھی۔

مشاعروں میں اساتذہ کی واہ وا، شعر کے معیاری ہونے کا سرٹیفکیٹ ہوا کرتی تھی۔ اس دور میں مشاعروں سے ہر سطح کے شعرا میں مشق و مزاولت، ریاضت، محنت، گہری نظر سے کائنات کے مطالعہ اور مشاہدہ کی عادت اور انسانی جذبات و احساسات کے سمجھنے اور ان کے اظہار کی صلاحیت اور استعداد پیدا ہوتی تھی۔ ان مشاعروں سے شعر گوئی کیلئے اور اچھے اور بلند معیار کے اشعار کی تخلیق کے لیے مسابقت کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ فنکارانہ تخیل اور انداز بیان کے حسن نے ہماری کلاسیکی شاعری کو شہرت عام اور بقائے دوام عطا کی۔ اس قدیم دور میں مشاعرے اساتذہ کے دولت خانوں پر یا نوابوں، رئیسوں اور بادشاہوں کے درباروں میں بڑے اہتمام سے منعقد ہوا کرتے تھے۔ جن میں باذوق عمائدین شہر شریک ہوتے۔ اساتذہ یا نوابوں اور بادشاہوں کی سرپرستی اور داد سے شعراء کا حوصلہ بلند ہوتا اور ان کی شعر گوئی کی صلاحیتیں نکھرتی تھیں۔

جمہوری دور میں مشاعروں کی کایا پلٹ گئی۔ اس عوامی دور میں مقصدی مشاعروں کی گرم بازاری نے قدیم روایات اور اقدار کو متاثر کیا۔ جمہوریت کی فضا میں اور سائنسی ترقی کے دور میں جو مشاعرے منعقد کئے جا رہے ہیں ان میں کلام سنانے والے بعض شاعر اپنے بے استاد ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ انجمنیں، ادارے یا انسٹی ٹیوٹ بڑے پیمانے پر مشاعروں کے انعقاد کا اہتمام کرتے ہیں۔ میزبان یعنی مقامی شعراء اور مہمان یعنی بیرونی شعراء کے فرق و امتیاز سے بعض شعرا میں احساس کمتری اور بعض شعراء میں احساس برتری پیدا ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ مشاعرے کے منتظمین بعض انتظامی مجبوریوں اور زیادہ سے زیادہ روپیہ جمع کرنے کی دھن میں۔ خوش گلوئی یا مسحور کن ترنم کی بنا پر جان بوجھ کر کم تر درجہ کے شعرا کا انتخاب کرتے ہیں اور اس طرح ایسے مشاعرے سامعین کے اعلیٰ ذوق کی تسکین کا سامان اور معیاری اشعار سننے کا موقع فراہم کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ کبھی کبھی مقامی شعراء کو نظر انداز کرنے یا انہیں مناسب اہمیت نہ دینے سے ان کے دلوں میں منتظمین مشاعرہ کے خلاف غصہ اور نفرت کے جذبات ابھرتے ہیں۔ مختلف درجہ کے ٹکٹ کے ذریعہ مشاعروں میں داخلہ کے طریقے نے

یہاں کسی اعلیٰ مقصد کی تکمیل کے لئے سرمایہ کی فراہمی کی ایک لائقِ تحسین اور قابلِ قدر
صورت پیدا کی ہے وہیں اس سے سامعین کی ذہنی تفریح اور اعلیٰ شعری ذوق کی تربیت و
تسکین کے سامان بھی مہیا ہوتے ہیں ۔

مجھے حیدرآباد میں ایسے کئی بڑے پیمانے پر منعقد شدہ کل ہند مشاعروں میں
سامعین کے ساتھ بیٹھنے کا موقع ملا اور میں نے یہ محسوس کیا اور میرا یہ تاثر رہا کہ ہماری زبان
کی ترویج و اشاعت کے اس اہم اور موثر ذریعہ یعنی مشاعرہ کی قوت، توانائی اور عوام کے دلوں
کو متاثر کرنے والی بے پناہ صلاحیت سے کماحقہٗ استفادہ نہیں کیا گیا ۔

بہت بڑے پاٹ والا دریا اگر زرخیز زمین کے قریب سے بہتا ہوا گذر جائے اور
اس زرخیز زمین کے مالک صرف اس کے بہاؤ اور تموج سے محظوظ اور لطف اندوز ہوتے رہیں
تو یہ کس قدر بدنصیبی کی بات ہے۔ مشاعروں سے محض لطف اندوزی بھی کچھ اسی قسم کی ہے
اس میں پوشیدہ دلوں کو جھنجھوڑنے والی صلاحیت سے کام لینے کی طرف خاطر خواہ توجہ کی جائے
تو زیادہ بہتر نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے ۔

مشاعروں کی مدد سے عوام میں اپنی زبان سے محبت اور وابستگی اور اس زبان کے
سیکھنے، بولنے اور پڑھنے کا شوق مستحکم بنیادوں پر عام کیا جا سکتا ہے

اگر عوام کے زبردست اجتماع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اردو میں نئی نسل کی تعلیم
کے بڑے اور اعلیٰ پیمانے پر انتظام کے مسئلہ کو پیش کیا جائے تو سننے والوں کے ذہن ایک
نیک اور اعلیٰ مقصد کی تکمیل کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ سکتے ہیں۔ کم از کم زبان دوم
کی حیثیت سے اردو کی تعلیم کا بندوبست بڑے پیمانے پر ہو جائے تو اردو بولنے والے طبقہ میں
پیدا شدہ Generation Gap کے مسئلہ سے نمٹا جا سکتا ہے۔ مشاعرے جیسے کامیاب
بڑے اجتماعات میں اردو کو وسیع پیمانے پر عام کرنے کی تدابیر اور تجاویز پیش کی جائیں تو
شعراء کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے ارادے سے شرکت کرنے والے عوام ایک کل ہند
نوعیت کے اہم مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے غور کر سکتے ہیں اور اس طرح اردو کی توسیع اور
اشاعت کے لئے ان کے ذہنوں میں بھی فضا تیار کی جا سکتی ہے۔ اردو کی تعلیم کا مسئلہ
آج ہماری اولین توجہ کا محتاج ہے۔ اردو بولنے والے عوام ہی اس کا بندوبست کر سکتے
ہیں لہٰذا اب انہیں کو اس اہم ذمہ داری کی تکمیل کا مصمم ارادہ کرنا ہوگا ۔

حیدرآباد میں مشاعروں کی شاندار اور یادگار محفلیں ایک عرصہ دراز سے منعقد ہوتی رہی ہیں اور اب بھی ہر سال منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ آل سینٹس ہائی سکول کے وسیع اور کشادہ صحن میں، نظام کالج اور گورنمنٹ سٹی کالج کے گراونڈ اور کل ہند صنعتی نمائش کے میدان پر منعقد ہونے والے یادگار مشاعروں کے علاوہ اردو ہال، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد، گولکنڈہ کی گنبدوں، ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹیٹوٹ ، صفی اورنگ آبادی کے تلامذہ کی قائم کی ہوئی انجمنوں اور دیگر کئی اہم تہذیبی اور ادبی انجمنوں کے زیر اہتمام منعقد ہونیوالی شعری محفلوں کی یادیں بھی ہمیشہ ذہن میں تازہ رہیں گی۔ بعض باذوق اور صاحب استطاعت حضرات کی جانب سے ان کے دولت کدوں پر بھی نکھری ستھری شائستہ شعری نشستیں ترتیب دی جاتی رہی ہیں اور آج بھی ایسی نشستوں کا بڑے سلیقہ سے اہتمام کیا جاتا ہے۔

اعلیٰ پیمانہ پر منعقدہ کل ہند مشاعروں میں پروفیسر فراق گورکھپوری، جگر مرادآبادی حضرت جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، ابوالاثر حفیظ جالندھری، منشی تلوک چند محروم عرش ملسیانی، روش صدیقی، جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، نشور واحدی، شکیل بدایونی نریش کمار شاد، حضرت امجد حیدرآبادی، راگھویندر راؤ جذب عالمپوری، علامہ حیرت بدایونی مخدوم محی الدین، شاہد صدیقی، خورشید احمد جامی، سلیمان اریب، ابن احمد تاب، منوہر لال شارب، طالب رزاقی، سلیمان خطیب، سرور ڈنڈا کا منفرد لب ولہجہ اور تحت اللفظ یا ترنم سے ان کے کلام سنانے کا سحر آگیں انداز مدتوں یاد رہے گا۔

مقصدی مشاعروں کی اہمیت، افادیت اور ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن بدلے ہوئے حالات میں عصری تقاضوں کے مطابق اردو میں بڑے پیمانہ پر تعلیم کے عام کرنے کی اسکیمات کو مزید وقت ضائع کئے بغیر روبعمل لانا چاہئے۔

اس مقصد یعنی اشاعت تعلیم کے مختلف پراجیکٹس کی تکمیل کے لئے عوام میں مشاعروں کی مقبولیت سے بھی استفادہ کیا جائے تو اردو کی بقا، ترویج و اشاعت اور ترقی کی نئی راہیں کھل سکتی ہیں۔

■ ■

اردو کتابیں اور رسائل خرید کر پڑھنے کی عادت ڈالیئے

ڈاکٹر غلام کبریا خاں شبلی

تہذیب و ثقافت

تہذیب اور ثقافت کے لئے انگریزی میں کلچر کا لفظ ہے۔ کسی معاشرہ کے رسوم و عقائد، آئین و ضوابط، اخلاق و کردار، آداب و افعال، علوم و فنون غرض یہ کہ بزم سے رزم تک اور ہد سے لحد تک کی تمام وسعتیں اس ایک لفظ میں سمٹ آئی ہیں۔ آج دنیا میں صدہا قسم کی ثقافتیں اور سیکڑوں قسم کی تہذیبیں موجود ہیں۔ کہیں قومی ثقافتیں ہیں تو کہیں ملکی اور کہیں ایک ہی ملک میں کئی ثقافتیں پائی جاتی ہیں مثلاً ہندوستان میں گجراتی تہذیب، بنگالی تہذیب سے مختلف اور کشمیری ثقافت مدراسی ثقافت سے جدا۔ مختلف ثقافتوں کے خوب و زشت کے معیار بھی مختلف ہوتے ہیں مثلاً جاپان میں خودکشی (HaraKiri) کو موت کا بہت ہی باعزت طریقہ سمجھا جاتا ہے اسلام اسے حرام قرار دیتا ہے۔ یورپ میں والدین اور اولاد "صہبائے گلرنگ" سے چھلکتے چھلکتے بلورین جام ٹکرا کر ایک دوسرے کا جام صحت نوش کرنا اخلاق اور اخلاص کی انتہا سمجھتے ہیں۔ اسلام شراب ہی نہیں تمام نشہ آور اشیاء خمر کو حرام قرار دیتا ہے۔ اسکیمو میں مہمان نوازی کا معراج یہ ہے کہ میزبان کی مستورات پر بھی مہمان کو تصرف حاصل ہو۔ اسلام اسے زنا ٹھیراتا ہے حرام قرار دیتا ہے اور زانی اور زانیہ کو سنگسار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یورپ ہی میں نہیں تمام متمدن قوموں میں رقص کے وقت غیر مرد یا غیر عورت کی کمر میں باہیں ڈالے تھرکنا روشن خیالی کا منتہا ہے۔ اسلام اسے بے حیائی ٹھیراتا ہے۔ مرد و زن کے آزادانہ اختلاط پر قدغن لگاتا ہے۔ ہندوستان میں مزامیر اور رقص و سرود کو مذہبی تقدس حاصل ہے، اسلام انہیں حرام ٹھیراتا ہے۔

اگر تمام ثقافتوں کا تجزیاتی مطالعہ کریں تو اس اختلاف معیار کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ تمام ثقافتیں دو میں سے کسی ایک بنیاد پر قائم ہیں۔ ایک روحانی بنیاد اور دوسری مادی بنیاد۔

روحانی بنیاد پر قائم ہونے والی تہذیب میں غیب، مابعد الطبیعیات اور ماورائے محسوسات مثلاً خدا، آخرت، جزا، سزا وغیرہ پر ایمان مرکزی حیثیت کا حکم رکھتا ہے۔ یہ عقائد

انجمن جونیر کالج - کھام گاؤں (مہاراشٹرا)

روحانیت حمیدہ اور عکوری اخلاق پیدا کرتے ہیں مگر محض روحانیت جس میں ضروری مادیت کی آمیزش نہ ہو پائیدار ثقافت پیدا کرنے میں ناکام رہتی ہے کیونکہ یہ ترک دنیا، ترک ملذات اور رہبانیت کی داعی ہوتی ہے۔ دوسری طرف محض مادی بنیاد پر قائم ہونے والی تہذیب کا دائرہ طبعی مظاہر اور محسوسات تک ہی محدود ہوتا ہے اس میں روح کی بالیدگی کا کوئی انتظام نہیں ہوتا کیونکہ بر بنائے غیر مادیت روح کی اس تہذیب میں نفی کی جاتی ہے اسی لئے اس میں اوصاف رذیلہ اور ابلیسی اخلاق کو پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تہذیب و ثقافت کے خالق انسان ہوتے ہیں اور یہ انسانوں ہی کیلئے ہوتی ہے اور دست قدرت نے انسان کو اشکل میں غیر مادی روح اور مادی جسم کا ایک حسین امتزاج پیش کیا ہے اسی لئے انسان جہاں روح کے ارتقاء کے نتیجہ میں احسن تقویم کے اعلیٰ وارفع مرتبہ پر پہنچ سکتا ہے وہاں مادی جسم کے حیوانی تقاضوں کے ہاتھ اسفل سافلین کے تحت الثریٰ میں بھی گر سکتا ہے لہذا ظاہر ہوا کہ ثقافت وہی پائیدار ہو سکتی ہے جس کا خمیر روحانیت اور مادیت کی متناسب ہم آہنگی اور متوازن آمیزش سے تیار ہوا ہو۔ اسلام دین فطرت ہے اسی لئے اسلامی ثقافت فطری ہے۔ ایک طرف تو یہ روح کا تزکیہ کر کے اسے وہ پر پرواز عطا کرتی ہے کہ جو ارض ہی اس کی منزل ٹھیرے اور عبد کو معبود سے اور انسانی خودی کو خدا سے شرف ہمکلامی عطا کرتی ہے، دوسری طرف جسم کے مادی مطالبات کو جائز حدود کے اندر پورا کرنے کے عمل کو بھی عبادت کا درجہ عطا کرتی ہے اور مادی دنیا کو غیر مادی آخرت کے لئے مزرع (کھیتی) قرار دیتی ہے۔ اسلام میں دین کے بغیر دنیا اور دنیا کے بغیر دین کا کوئی تصور ہی نہیں، یہاں دین و دنیا دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

وا حسرتا! کہ آج کم و بیش ۵۰ کروڑ مسلمانوں سے آباد و معمور اس کرۂ خاکی پر جہاں کم و بیش ۳۰ سے زیادہ اسلامی سلطنتیں موجود ہیں اسلامی ثقافت اپنی صحیح اصلی شکل میں کہیں نظر نہیں آتی۔ آج کی دنیا میں خالص مادیت اور مادی ثقافت ہی کا سکہ چل رہا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مادیت کی تاریخ پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے۔

زمانہ قبل مسیحؑ میں جو تہذیبیں اور ثقافتیں تھیں ان میں تصور الٰہ کسی نہ کسی صورت میں موجود تھا اس طرح یہ تہذیبیں انکار ذات میں تو نہیں البتہ انکار صفات میں مبتلا رہا کرتی تھیں۔ لوگ ملحد نہیں مشرک تھے اسی زمانہ میں روم میں الپائر اپنے شباب کو پہنچی۔ روم اور یونان میں علوم عقلیہ مثلاً ریاضی، سائنس، فلسفہ، منطق اور آرٹ وغیرہ کو

بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا جس کے نتیجہ میں مادیت رہی سہی روحانیت پر حاوی ہونے لگی جب یہ حالت شدید ہو گئی تو معجزاتی طور پر حضرت مسیحؑ کا ورود ہوا۔ آنجنابؑ نے وحی الٰہی کی مدد سے مادیت کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور روحانیت کی تبلیغ شروع کی مگر اسرائیل کی جن منتشر بھیڑوں کو جمع کرنے آپؑ آئے تھے انمیں کچھ کالی بھیڑیں بھی تھیں جنہیں آپؑ کے پند و نصائح میں اپنے مفادات کی موت نظر آئی۔ انہیں میں سے ایک یہودا اسکریوتی نے آپؑ کو تیس سکوں کے عوض گرفتار کروا دیا۔ اس وقت کے رومن گورنر نے آپ کو سولی پر چڑھانے کا حکم دے دیا۔ ہمارے عقیدہ کے مطابق مالک کائنات نے اپنے رسول کو ذلت کی اس موت سے بچا لیا اور زندہ آسمان پر اٹھا لیا مگر عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق آپؑ کو یہودیوں کی سازش کے تحت مصلوب کر دیا گیا۔ یہودیوں کے ہاتھوں یہ کسی پیغمبر کا آخری قتل تھا۔ اس دن سے یہودیوں اور عیسائیوں میں دشمنی کی بنیاد پڑ گئی۔ آپؑ کے بعد عیسائیت کو بڑا فروغ حاصل ہونے لگا تو عیسائیوں کی بیخ کنی کرنے کے لئے یہودیوں نے ایک گھناؤنی سازش مرتب کی۔ پال نامی ایک بدکردار یہودی عیسائی ہو گیا اور اپنے ظاہری تقویٰ اور تقدس کی بناء پر سینٹ SAINT کہلانے لگا۔ اس نے عیسائیت کی تبلیغ کی مگر حضرت مسیحؑ کی تعلیمات اور فرمودات کی بجائے اپنے نظریات اور عقائد کی ترویج کرنے لگا لہٰذا آج جو عیسائی کہلاتے ہیں وہ حقیقتاً پالوسی ہیں عیسائی نہیں۔ سینٹ پال کی تحریک کے نتیجہ میں کلیسا کا ادارہ وجود میں آیا اور تمام طاقت اس ادارہ کے ہاتھوں میں مرکوز ہو گئی۔

اس ادارہ کی جانب سے مجلس احتساب عقائد Council of Inquisition قائم ہوئی جو لوگوں کے عقائد کی جانچ کرتی تھی۔ اس مجلس کے جرائم کی فہرست بڑی طولانی اور اس کے مظالم کی داستاں بڑی لرزہ خیز ہے۔ اسی مجلس نے کوپرنکس جیسے سائنسداں کو زندہ جلا دیا کیونکہ اس نے ثابت کیا تھا کہ زمین گول ہے اور مرکز کائنات زمین نہیں بلکہ سورج ہے جس کے گرد زمین گردش کرتی ہے اور یہ نظریہ کلیسا کے نظریہ کے سراسر خلاف تھا۔ اسی مجلس نے گیلیلیو جیسے سائنسداں کو قید و بند اور ترک وطن کی سختیوں میں مبتلا کیا۔ از منہ مظلمہ کے ان مظالم نے دانشور طبقہ کو خصوصیت کے ساتھ عیسائیت کا دشمن اور باغی بنا دیا عیسائیت سے بڑھ کر یہ منافرت مذہب تک پہنچی اور ہر مذہب کو ترقی و ارتقاء کی راہ کا روڑا سمجھا گیا۔ اور ہر مذہب میں اللہ کو چونکہ مرکزی مقام اور اہمیت حاصل ہوتی ہے

اس کی صفات خداوندی سے بھی انکار کر دیا گیا اس وجہ سے نہیں کہ خدا کی غیر موجودگی یا عدم کے قابل یقین ثبوت مل گئے ہوں بلکہ محض اس وجہ سے کہ کلیسا خصوصاً اور ہر مذہب عموماً خدا کا قائل ہے۔ اس طرح الحاد اور انکار ذات کے شجر خبیثہ کی آبیاری عقل و دانش اور علم و حکمت کے نام سے ہونے لگی مگر مشکل یہ پیش آئی کہ کائنات کے وجود اور مظاہر فطرت کی توجیہہ خدا کو خالق مان کر بہ آسانی ہو جاتی تھی۔ اب جب کہ ذات خداوندی ہی سے انکار کر دیا گیا تو یہ توجیہہ کیونکر ہو۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ خدا کی بجائے بے جان مادہ کو ازلی اور ابدی مان لیا جائے جو ہمہ وقت متحرک اور تغیر پذیر ہے اور مظاہر فطرت مادہ کی ان ہی خوبیوں خصوصیات کی وجہ سے ارتقاء پذیر ہوئے ہیں۔ کیا یہ بوالعجبی نہیں کہ دانشوران مذہب دشمنی میں خدا کا تو انکار کر دیں مگر بے جان مادہ کو خدائی کا تاج پہنا دیں بات جہاں تھی وہیں رہی۔ پہلے بندہ خدا تھے اب مادہ کی بندگی کا طوق پہن لیا۔ عبدیت سے چھٹکارا نہ جب تھا نہ اب ملا۔ اسے دانشمندی کہیں یا حماقت؟!

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے

انیسویں صدی کے اوائل میں اس مادیت کو بے انتہا فروغ حاصل ہوا۔ اور علمیات نے اس کے سامنے سپر ڈال دی۔ مادیت کو سب سے زیادہ تقویت چارلس ڈارون (1809-1882) کے نظریہ ارتقاء سے ملی۔ اس کی کتابوں اصل انواع Origin of Species اور نسب نامہ آدم یا میلاد آدم Descent of Man نے عیسائیت کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا۔ انہی دو کتابوں میں اس نے تنازع للبقاء Struggle for Existence بقائے اصلح Survival of Fittest اور فطری انتخاب Natural Selection کے مفروضات پر نظریہ ارتقاء کی بنیاد رکھی۔ اس نظریہ کی رو سے مذہب کا خدا صانع و خالق کائنات نہیں بلکہ مادہ خود اپنی حرکیت اور تغیر پذیری کی بدولت ارتقاء پذیر ہوا اور اس کی انتہائی شکل انسان ہے جس کا ارتقاء حیوانات سے ہوا ہے۔ گویا انسان محض ایک مادی باعقل باشعور، بااراده حیوان ہے اور بس۔ گویا انسان کو دیگر حیوانات پر جو فضیلت اور برتری حاصل ہے وہ روحانیت کی وجہ سے نہیں بلکہ محض دماغی صلاحیتوں کا نتیجہ ہے اور دماغ بھی مادہ ہی سے مرکب ہے۔ یہ بات دلچسپ بھی ہے، حیرت انگیز بھی اور عبرتناک بھی کہ ڈارون ایک مذہبی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور مذہبی ماحول ہی میں اس کا

نشوونما بھی ہوئی۔ گویا ڈارون کی شکل میں مادیت نے مذہب کی گود میں نشوونما پائی۔

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

کم و بیش اسی زمانہ میں ایک جرمن نژاد یہودی کارل مارکس (1818-1883) نے اینگلز کے ساتھ مل کر اپنا اشتراکی منشور Communist Manifesto شائع کیا۔ عمر کے آخری زمانے میں اس کی کتاب "سرمایہ" Das Kapital شائع ہوئی۔ یہ کتاب اشتراکیوں کی بائبل ہے۔ ان دو کتابوں کے ذریعہ مارکس نے دنیا کو جدلیاتی مادیت Dialectical Materialism کا نظریہ اور اقتصادی یا مادی جبریت کا قانون دیا۔ اس نظریہ میں اصل اہمیت مادی پیداوار کو حاصل ہے۔ اس نظریہ کی رو سے مختلف تہذیبیں اور ثقافتیں مادی پیداوار کی مخصوص حالتوں کا نتیجہ ہیں۔ کاشتکاری نے جاگیردارانہ نظام پیدا کیا تھا اور صنعتی انقلاب کا نتیجہ سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ مارکس کے انہی نظریات کی بنیاد پر لینن کے ہاتھوں روس میں اکتوبر ۱۹۱۷ء کو خونی سرخ انقلاب برپا ہوا۔ افسوس کہ مادیت کے اس سرطان نے اکثر اسلامی ممالک کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اس طرح ڈارون کے حیوان ناطق کو مارکس نے روٹی، کپڑے اور مکان کی مادی حدود میں محدود کر دیا۔

ڈارون اور مارکس نے انسان اور انسانیت کی جو تذلیل کی تھی وہ گویا ادھوری تھی۔ اس "کارِ خیر" کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا سہرا سگمنڈ فرائڈ (1856-1939) کے سر ہے۔ یہ بھی ایک آسٹروی نژاد یہودی تھا۔ یہ علم نفسیات اور تحلیلِ نفسی کا بابا آدم سمجھا جاتا ہے۔ اس نے ڈارون اور مارکس کے مذہب بیزار، خدا ناشناس، مادہ پرست معاشرہ کو لاشعور Unconscious Mind اور جنسی تعبیر Sexual Interpretation کے نظریہ کے تحت جنسی جبریت کا قانون دیا جس کی رو سے انسان جنسی جبلت کا غلام ہے۔ ماں کی گود سے لے کر گور کی گود میں پہنچنے تک انسان کے تمام افعال میں جنسی لذتیت ہی کارفرما ہوتی ہے حتیٰ کہ شیرخوار بچہ انگوٹھا بھی جنسی لذتیت کے حصول ہی کے لئے چوستا ہے۔ اس لئے فرائڈ انسان میں پائی جانے والی حیوانی جبلتوں Instincts پر کسی بھی قسم کی پابندی کو پسند نہیں کرتا۔ دوسرے الفاظ میں یہ نظریہ کلی طور پر ہر قسم کے اخلاقیات کی نفی کرتا ہے۔ مارکس کا انسان روٹی کا غلام تھا فرائڈ کا انسان حقیقتاً ایک شہوت پرست حیوان ہے۔

ڈارون، مارکس اور فرائڈ بیسویں صدی کی مادیت کے تین اہم ترین ستون ہیں۔ خصوصاً مغرب کے مذہب بیزار معاشرہ میں ان تینوں کے نظریات کی بڑی گرمجوشی سے پذیرائی ہوئی

مذہب کی شکست اور بے چارگی کا اس اندازہ لگا لیجئے کہ ڈارون جیسے دشمن دین و ایمان کو کلیسا نے ویسٹ منسٹر ایبے میں دفن کرنے کی اجازت دے کر اس کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

ڈارون نے انسان سے اس کا تاج خلافت اور جامۂ شرافت چھینا۔ مذہبی مقدسات اور اخلاقی پاکیزگیوں پر پہلی کاری ضرب لگائی۔ مارکس نے انسانیت کے اس لاشہ کیلئے تابوت مہیا کیا اور فرائڈ نے اس تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔

اب ذرا معاشرہ پر اور تہذیب و ثقافت پر ان تینوں نظریات کے اثرات کا جائزہ لے لیا جائے۔ ڈارون کے نظریہ کی وجہ سے کفر و الحاد پھیلا۔ مذہب، روحانیت اور اخلاق مجذوب کی بڑ ٹھیرے۔ کوئی فعل فی نفسہٖ نہ مقدس ٹھیرا نہ مذموم۔ مذہب مرد و زن کو من حیث الانسان مساوی قرار دیتا ہے لیکن ان کی جسمانی ساخت کے اعتبار سے ان کے دائرہ کار علیٰحدہ علیٰحدہ مقرر کرتا ہے۔ ڈارون نے انہیں حیوانات کی سطح پر لا کر ہر میدان عمل میں مساوات کا گمراہ کن تصور دیا۔ مارکس کے نظریہ کے تحت دولت اور دولت میں اضافہ کا باعث بننے والی پیداوار ہی سب کچھ ہے محبت کی جائے تو دولت سے اور محنت کی جائے تو پیداوار میں اضافہ کے لئے۔ ان دو کے علاوہ زندگی میں نہ کوئی محبوب ہو سکتا ہے اور نہ کسی اور چیز کے لئے محنت سودمند ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام مرد و زن زیادہ سے زیادہ کمانے میں منہمک ہو گئے۔ عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ مردوں ہی کے کام کرنے لگیں۔ عورتوں کی اس خود کفالت کی وجہ سے ان پر مردوں کی بالادستی ختم ہو گئی امور خانہ داری حتیٰ کہ اولاد تک بوجھ بن گئی۔ ایک تو یوں کہ ایک بڑے عرصہ تک کے لئے اولاد والدین کی کمائی میں حصہ دار بن جاتی ہے، دوسرے یوں کہ والدین خصوصاً ماں کے "قیمتی" وقت کی قربانی چاہتی ہے۔ اگر بدقسمتی سے اولاد ہوئی بھی تو تربیت کے لئے والدین کے پاس وقت نہیں۔ بیویوں کے پاس شوہروں کی خدمت کے لئے وقت نہیں۔ آفس اور کارخانہ کے اوقات کے بعد جو وقت بچ جاتا ہے وہ بیوٹی سیلون، کلبوں، ناچ گھروں، جوئے خانوں، شراب خانوں رقص گاہوں، تھیٹروں اور دیگر آوارگیوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ جب اولاد کے ساتھ یہ معاملہ ہے تو بوڑھے کمزور والدین کی خدمت کے لئے بھلا وقت کہاں۔ ان کے لئے بوڑھوں کے نرسنگ ہوم ہیں جہاں یہ اپنی تھکی ہوئی زندگی کے آخری دن گزار سکتے ہیں۔ والدین نے بھی تو بچوں کو نرسوں کے سپرد کر رکھا تھا گویا جو بویا تھا وہی کاٹ رہے ہیں۔ اولاد سے بیزاری کے اسی جذبہ نے فیملی پلاننگ کے انتہائی خبیث رواج کو ترقی دی تاکہ کمانے والے پیسہ اور وقت کی قربانی کم سے کم

کرنے والے کم سے کم ہوں۔ حقیقت حال یہ ہے کہ ڈاروِن اور مارکس کے آفریدہ بے خدا معاشرہ کا فرد یہ سمجھتا ہے کہ رزق کی کنجیاں اسی کی مٹھی میں ہیں۔ جب جگر کے ٹکڑے تک اجنبی ٹھہرے تو غیروں سے ہمدردی کا تصور ہی غلط ہے۔ دولت کی ہوس نے سود و قمار جیسی لعنتوں کو فروغ دیا۔ یہ لعنتیں اپنے جلو میں خود غرضی اور بد دیانتی لائیں۔ نہ اولاد کو والدین سے اور نہ ہی والدین کو اولاد سے کوئی جذباتی لگاؤ باقی رہا۔ گھر، خاندان اور عائلی زندگی سے سکون، اطمینان اور احساس تحفظ کا خاتمہ ہو گیا۔ اور روئے انسانی معراج کی انتہا ٹھہری۔

فرائڈ مذہب دشمنی میں ڈارون اور مارکس دونوں پر سبقت لے گیا۔ شیطان نے آدم و حوا کو شجر ممنوعہ کا پھل کھلا کر ایک دوسرے کے سامنے عریاں کر دیا تھا فرائڈ نے محض جنسی جبریت کا نعرہ دے کر انسانیت کو عریاں کر دیا۔ اس کے ہاں انتہائی مقدس رشتے بھی لذت جنس کا مظہر بن گئے۔ یہ کہتا ہے کہ لاشعوری طور پر بیٹا اپنی ماں سے بحیثیت ماں کے نہیں بلکہ محض بحیثیت عورت کے محبت کرتا ہے اور بیٹی باپ کو محض مرد سمجھ کر محبت کرتی ہے اس طرح جنس بے راہ روی بلکہ جنسی کجروی کو فروغ ملا۔ اخبار بین حضرات جانتے ہیں کہ چند مغربی ممالک میں ہم جنسی قانوناً جائز ہے۔ برطانیہ کی ملکہ ایلزبتھ دوم کے محل کے محافظ دستے کے کمانڈر کی کہانی ہنوز تازہ ہے فرائڈ جنسی بھوک کو کسی بھی طریقے سے مٹانے کو ایک شدید فطری تقاضہ کا پورا کرنا کہتا ہے، حلال اور حرام تو خیالی مذہب کے ڈھکوسلے ہیں۔ فرائڈ اپنے پیشروؤں ڈارون اور مارکس کی طرح ان کا قائل نہیں۔ مذہب دشمنوں کو کھل کھیلنے کا موقع۔ عریانیت اور بے حیائی تہذیب کی علامت بن گئی۔ ننگوں کے کلب بن گئے جہاں ہر کہ ومہ، خورد و کلاں مرد و زن مصنوعی لباس سے بے نیاز صرف جامہ فطری میں نظر آتے ہیں۔ کچھ لوگ جن کے دلوں میں ہنوز مذہب چور بنا بیٹھا ہے اس عریانیت کو "غسل آفتابی" کی خوبصورت سائنسی اصطلاح میں لپادہ اڑھاتے ہیں۔ آج کے ذرائع ابلاغ پر غور کیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ آج کی تہذیب و معاشرت پر فرائڈ کی گرفت کتنی مضبوط ہے۔ ریڈیو پر گیت اور موسیقی جنسی ہیجان میں مبتلا کرنے والا فلموں کے ڈائیلاگ ہیجان خیز، فلموں اور ٹی وی پر حسن و شباب کی عریانیت ہی مقبولیت کی ضامن۔ رسائل، اخبارات اور جرائد عریاں تحریروں اور تصاویر کے بغیر بے مزہ اور پھیکے۔ خاندانی منصوبہ بندی کے ذرائع نے فرائڈ کی بے لگام شہوت پرستی کو مہمیز کر دیا۔ ایک خفیف سا ڈر جو تھا، 'ناجائز اولاد کا' وہ بھی نہ رہا۔ بغیر کسی خطرہ کے عیش کرتے رہے

[illegible] سے متعلق ہے ... بنا دیا۔ جنسی تسکین اور جنسی لذت حیات انسانی کا نصب العین بن گئی۔ فرائڈ نے انسانی تہذیب کی ہر شے تقدیس پر تیشہ چلایا ہے مثلاً وہ کہتا ہے کہ محبت محض شہوت کا مسئلہ ہے۔ ہر انسان لاشعوری طور پر ایک دوسرے سے منافرت کرتا ہے۔ کسی کے مرنے پر لاشعوری طور پر خوشی ہوتی ہے لیکن وہ غم جو آنسو اظہار غم کے لئے بہائے جاتے ہیں وہ مگرمچھ کے آنسو ہوتے ہیں۔ فرائڈ نے نہایت ذہانت سے اپنے نظریات کا محور لاشعور کو بنا لیا ہے جس کے عدم اور وجود، نفی و اثبات کے متعلق بحث تو کی جا سکتی ہے مگر نہ عدم ثابت کیا جا سکتا ہے نہ وجود۔

یہ ہے آج کی مادی ثقافت خصوصاً مغربی تہذیب کی تصویر۔ اس ملحدیت کی ابتداء عیسائیت کی دشمنی سے شروع ہوئی تھی۔ اور عیسائیت کی روحانی تعلیمات کو مسخ کرنے والا پہلا شخص سینٹ پال یہودی تھا جو عقائد و اخلاق اس کی دستبرد سے بچ گئے تھے انہیں ڈارون، مارکس اور فرائڈ نے اپنی مادی نظریات کی قربان گاہ پر چڑھا دیا۔ ان تینوں میں سے موخر الذکر دو یعنی مارکس اور فرائڈ یہودی تھے۔ سینٹ پال، مارکس اور فرائڈ کی یہودیت کو نظر میں رکھتے ہوئے، کیا ذہن میں عیسائیت کے خلاف یہودیوں کی طویل مدتی منصوبہ بند علمی و فکری سازش کا نقشہ نہیں ابھرتا؟ ۔ چند سال قبل (شاید آخری عرب اسرائیل جنگ کے بعد) ویٹیکن، روم سے پاپائے اعظم کی جانب سے اعلان کیا گیا کہ عیسائیوں نے اپنے پیغمبر کا خون یہودیوں کو معاف کر دیا اور اب یہودی اور عیسائی بھائی بھائی ہو گئے ہیں کیوں نہ ہوں! اب عیسائی اپنے کردار، اعمال و افکار کی رو سے یہودی ہی بن گئے ہیں اب یہ کل کے دشمن آج کے بھائی بھائی یعنی نام نہاد عیسائی اور یہودی مشترکہ طور پر سر توڑ کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح اسلامی عقائد، اخلاق، اعمال و افکار میں شک و ریب کا زہر ہلاہل ملا دیں تاکہ مسلمان اپنے دین فطرت سے بیگانہ ہو جائیں اور ان کی ناپاک جوع الارض کے لئے نرم چارہ بن جائیں۔ یہ ناپاک سازش اور جہالت کی باتیں علم و تحقیق کے پردہ میں مستشرقین پھیلا رہے ہیں کیونکہ صفحہ عالم پر اسلام ہی ایک ایسا مذہب اور نظام حیات باقی ہے جو یہودیوں اور صیہونیوں کے ناپاک عزائم کی راہ میں آہنی چٹان ثابت ہو رہا ہے۔

میری اس تمام گفتگو کا لب لباب یہ ہے کہ مادیت کوئی ثابت شدہ علمی حقیقت نہیں ہے بلکہ چند مفروضات ہیں جنہیں صیہونیت اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا رہی ہے

...مادی دنیا کو فکری طور پر مغلوب کر لینے میں یہی الحاد مصروف ہے ... اس چٹان

ٹکرا رہی ہیں جس پر اسلام کا مینارہ نور قائم ہے۔ صیہونیت کے علماء کا لائحہ عمل :

"The Protocols of Learned Elders of Zion"

کے مندرجہ ذیل اقتباس کو میری گزارشات کے تناظر میں رکھ کر سنئیے :

"ڈارون ، مارکس اور نطشے کی کامیابی کا پروگرام ہم نے مرتب کر لیا ہے ہم ان کے افکار کی خوب خوب اشاعت کریں گے اور ان کے علوم سے غیر یہودی فکر میں جو زوال پیدا ہوگا وہ بالکل واضح ہے ۔

ہمیں اخلاق (دیوالیہ پن) کی کوشش کرنی چاہیئے تاکہ دنیا پر ہماری حکومت مسلط ہو سکے ۔ فرائڈ ہمارا ہے اور وہ جنسی تعلقات کو کھلم کھلا اچھالتا رہے گا تاکہ کوئی مقدس شے باقی نہ رہے اور لوگوں کا کام صرف اپنی جنسی بھوک مٹانا باقی رہ جائے ۔ بس اسی وقت اخلاق کا دیوالہ نکل جائے گا ۔"

بحوالہ "اسلام اور جدید مادی افکار" صفحہ ۱۰۱

(محمد قطب / سجاد احمد کاندھلوی)

صیہونی مادیت کی اس طوفانی یلغار میں گھرا اسلام تن تنہا کھڑا ہوا ہے اور بڑی پر امید نظروں سے اپنے ماننے والوں کی طرف دیکھ رہا ہے ۔ آؤ ! .. دوڑو !! ... اور اپنی تہذیبی و ثقافتی اقدار ، اپنے ملی و دینی تشخص کی خاطر ، اپنے اسلام کے خاطر سینہ سپر ہو جاؤ ۔ دست قدرت تمہارے سر پر تاج جہانگیری رکھنے اور ہاتھ میں عصائے جہانبانی تھمانے کو منتظر ہے ۔ آج ہم اپنی جہالت کی وجہ سے اپنے تہذیبی ورثہ کو فرسودہ اور ثقافتی اقدار کو بوسیدہ سمجھنے لگے ہیں اس کے برخلاف مانگے کی مغربی تہذیب و ثقافت کی ظاہری چمک دمک نے ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے ۔ ہم آب حیات کو چھوڑ کر زہر آب پینے لگے ہیں ۔ ہم جو خیر امت تھے امت وسط تھے آخر اس قعر مذلت میں کیونکر گر پڑے ؎

ہیں کیوں ذلیل آج کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

لیکن ناامیدی کی کوئی وجہ نہیں ہے اس مٹی کے ذرات نم ہونے کی دیر ہے پھر اس کی زرخیزی

(بقیہ صفحہ ۳۰ پر)

پروفیسر ڈاکٹر عتیق الرحمٰن خاں

مولانا عبدالماجد دریابادی بحیثیت انشاپرداز و ادیب منفرد

تاریخ اردو ادب میں جن چند مایہ ناز ہستیوں کا ذکر نہایت احترام کے ساتھ لیا جاتا رہے گا ان میں حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کا بھی شمار ہوگا ۔ مولانا ماجد اردو کے ان اہل قلم، صاحب فکر دانشوروں میں سے تھے جن کی رشحات فکر اور تخلیقات قلم نے ہم اہل اردو کے ذہنوں کو جلا بخشی ہے اور جن کے ادبی شہ پاروں نے ہمارے قلب و دماغ کو روشن و تابناک کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ کی کوششوں کی بدولت اردو زبان کا علمی ادبی اور مذہبی سرمایہ بے حد وسیع ہوا ہے ۔ آپ ہمارے ان بزرگ ادیبوں میں شمار کئے جاتے تھے جو تقریباً نصف صدی سے کشت علم و ادب کو سینچ رہے تھے ۔ اور اپنے ہمہ جہتی ادبی کارناموں سے دامن اردو کو مختلف جواہر علم و ادب سے مالا مال کر رہے تھے ۔ ۱۹۲۵ء میں آپ نے "سچ" کی عنان ادارت سنبھالی تھی اور ۱۹۷۱ء تک اسی ہفتہ وار "سچ" میں باقاعدگی کے ساتھ لکھتے رہے ۔ اس میں ان کے قلم سے جو کچھ مواد شائع ہوا وہ علمی و ادبی افادیت کے اعتبار سے بے حد اہم ہے ۔

اس تمام مواد کو اگر یکجا طور پر منضبط کر کے شائع کیا جائے تو اردو زبان و ادب کے لئے بیش قیمت سرمایہ اکٹھا ہو جائے گا ۔ ان پینتالیس برسوں میں مولانا کے قلم کا زور اور تحریر کی دھار نیز انداز تنقید کی کاٹ میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا ۔ ان کا لہجہ زندگی بھر حیرت ناک طور پر یکساں اور ہموار رہا ۔ اس میں کبھی پستی و بلندی کا فرق پیدا نہیں ہوا ۔ وہ اردو میں ایک خاص طرز کے موجد اور لہجہ کے ایک خاص اسلوب کے مخترع ہیں ۔ ان کے چھوٹے چھوٹے فقرے غضب کی بلاغت اور معنی آفرینی، ضبط و توازن اور ایجاز و اعجاز سے بھرپور ہوتے تھے ۔

ان فقروں میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو کامیاب اشعار کے لئے لازمی قرار دی گئی ہیں لیکن خوبی تو یہی ہے کہ ان تمام خوبیوں کے ہوتے ہوئے بھی یہ فقرے اشعار نہیں بن پائے بلکہ ایک حسین و پرتاثیر اسلوب بنے رہے ۔ مولانا عبدالماجد کی تحریر کا کمال تو یہی ہے کہ ان کے

۱۱ ۔ اسٹار کی ٹاؤن ۔ منگل بازار ۔ ناگپور

اسلوب میں اردو کا کوئی بھی صاحب اسلوب [illegible] ہمسر [illegible]
فلسفۂ اخلاق کی پیچیدہ تہوں سے لے کر قرآن کریم کے جان بخش اسرار و رموز کی گہرائیوں تک
انہوں نے اپنے ذہن اور اشہب قلم کو دوڑایا ہے۔ وہ تمام عمر تحریر و تصنیف میں مصروف رہے
ڈرامہ نگاری، افسانہ نگاری، شعر و شاعری، انشا پردازی اور ادب و صحافت کے ہر ایک
موضوع کو ان کے بیباک قلم نے چھیڑا اور چھوا ہے۔ انہوں نے تحریر کے ہر کوچے کی خاک چھانی ہے
اور خوب تجربہ حاصل کیا ہے۔ وہ دین سے لے کر بے دینی تک سے آشنا رہے۔ ساری
کوچہ گردیوں اور بادیہ پیمائیوں کے بعد وہ اپنے [illegible] دماغ، قلب و خیالات کی پوری صحت و
صلاحیت کے ساتھ اسلامیات کے ساحل پر اتر پڑے اور حضرت مولانا شبلی کی طرح انہوں نے
آخر عمر تک اپنی طبیعت اور زور قلم کی جولان گاہ اسلامی تعلیمات کی تبلیغ اور دینی خدمات کو
قرار دیا اور انہیں میں تادم آخر مصروف و منہمک رہے۔ مولانا شبلی نے "سیرت النبیؐ"
کو تصنیف و تالیف کے مشغلہ کا منتہا قرار دے دیا تھا مگر مولانا ماجد "تفسیر ماجدی"
جیسی عہد آفریں تالیف کے بعد بھی بدستور خدمت علم و ادب میں غرق رہے۔ مولانا موصوف نے
جتنا کچھ بھی لکھا ہے اس میں انشا پردازی کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کے منفرد
دلکش محاسن پائے جاتے ہیں۔ حق گوئی آپ کا وصف خاص رہا ؎

آئین جوانمرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اس اللہ کے شیر نے ہمیشہ حق کو حق اور باطل کو باطل کہہ کر ببانگ دہل اپنے خیالات کا پرچار
کر لیں ذرا برابر بھی جھجک سے کام نہیں لیا۔ اپنے نزدیک اور اپنے خدا کے نزدیک جس بات
کو درست اور جائز سمجھتے تھے بے محابہ بیان کر دیتے۔ صداقت، خلوص، دیانت داری، حق پرستی
اور حق گوئی نیز حق جوئی ان کے خمیر میں داخل تھا اور کیوں نہ ہوتا تحریک خلافت کی بھیڑ کی رنگ
ترک موالات کی روح رواں، علوم مشرقیہ، عربی، فارسی، اردو ادب، علم دین، تفسیر
حدیث، فقہ، انگریزی ادب، فلسفہ، عمرانیات، مذاہب کا تقابلی مطالعہ الغرض ان میں سے
ہر ایک پر بڑی عمیق و گہری نظر رکھتے تھے اور ہر میدان میں ایک مجاہدانہ شان کے حامل نظر آتے تھے
مولانا کی اکثر تحریریں اور مختلف مضامین اور "صدق" میں قائم کردہ عنوانات ہمیشہ قاری
کو اپنی طرف بے ساختہ متوجہ کر لیا کرتے تھے ان کی بڑی خوبی یہی تھی کہ جہاں کہیں بھی [illegible]

اور اپنے جذبات و کیفیات اس پر خود منکشف کر دیتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم زبردست صاحبِ سیف و قلم تھے۔ ان کے الفاظ میں ان کی سیف کا کام کرتے تھے اور ان کے الفاظ کی تلوار عام تلوار سے زیادہ کاٹنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ ایک صاحبِ طرز انشاء پرداز، بہترین صحافی، زبردست عالمِ دین، بہترین مفسرِ قرآن اور بہترین انسان بھی تھے۔ سب کے بہی خواہ اور سب سے بڑھ کر خود اپنے ہمدرد اور دوست۔ وہ اپنے بے لاگ قلم سے انسان دوستی کا حق ادا کرتے رہے۔ وہ صحیح معنوں میں خلوص و ایثار، کرم و مروت اور وفا داری کا مجسمہ تھے اسی لئے ان کی تقریر و تحریر میں بے پناہ تاثیر پائی جاتی ہے۔ تقریر کرنے پر اتر آتے تو ان کا ہر جملہ دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا اور لکھنے پر کمربستہ ہو جاتے تو ہر لفظ نقش فریادی بن کر ان کی شوخیِ تحریر کی طرف اشارہ کرتا تھا۔

مولانا موصوف کی قلم کی جولانی ادب کی کسی خاص صنف تک محدود نہ تھی۔ ان کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ انہوں نے مختلف موضوعات کے ادبی پہلوؤں اور ادبی مسائل پر مضامین لکھے ہیں۔ ان میں شعر و ادب پر تنقید بھی ہے۔ ادبی شخصیتوں اور ان کے کارناموں پر تبصرہ بھی ہے۔ ادبی مجالس کے خطبے بھی ہیں۔ علمی و ادبی بیانات بھی ہیں۔ ریڈیو کی نشریات بھی ہیں۔ مرنے والوں کی موت پر تاثرات بھی ہیں۔ کتابوں کے مقدمے اور ان پر نقد و تبصرے بھی ہیں اور یہ سب اپنے اپنے رنگ میں فرد اور مولانا کی ادبی نکتہ سنجی کا نمونہ ہیں اور ان کے مخصوص طرزِ نگارش اور مخصوص اصلاحی نقطۂ نظر کو نمایاں کرتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی اپنے دور کے منفرد صاحبِ طرز انشاء پرداز تھے اور ایک خاص اسلوبِ تحریر کے علمبردار بھی تھے۔ ان کی تخلیقات کا شمار ہمارے بیش قیمت کلاسیکل سرمایہ میں ہوتا ہے ایسا سرمایہ جو کمیاب بھی ہے اور نایاب بھی۔ کمیاب اس بنا پر کہ ہمارے نثری ادب کی اساس جن صاحبِ طرز انشاء پردازوں پر ہے ان کی تعداد بہت مختصر ہے اور تقریباً انگلیوں پر گنے کے برابر ہے۔ رجب علی بیگ سرور، سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی، مولانا ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی، سید احتشام حسین، آل احمد سرور ... ملک کے ممتاز نثری صاحبِ طرز مولانا شبلی نعمانی سے ... مولانا عبدالماجد دریابادی ہی نظر آتے ہیں ان کی گزشتہ ... برس کی

زائد عرصہ میں لکھی گئی تحریریں اور ادھر ادھر کتب میں، رسائل میں منتشر، سچ اور صدق میں محفوظ نثر عالیہ کو ابھی تک یکجا اور محفوظ نہیں کیا گیا۔ مقالات ماجد، انشائے ماجد، نشریات ماجد اور ان کی متعدد دیگر تصانیف میں محض ان کا عطر پیش کیا گیا ہے ورنہ ان کی بیشتر عالمانہ، ادیبانہ اور فلسفیانہ ادبی اور ہلکی پھلکی شوخ و شنگ تحریریں نہ ابھی تک انتخاب کی گئی ہیں اور نہ یکجا۔

آپ کا نثری اسلوب موضوع کے عین مطابق ہوتا تھا۔ اپنی مذہبی دینی تحریروں اور تفسیر قرآن میں ان کا انداز عالمانہ، وقیع اور پرشکوہ ہوتا تھا لیکن سادگی اور سلاست کے ساتھ ساتھ عالمانہ و فلسفیانہ اور تحقیقی مضامین ایک عالم ایک فلسفی یا ایک محقق کی شان تصنیف کو وہ برابر برقرار رکھتے تھے۔ اپنی ادبی اور صحافتی تحریروں میں وہ سادگی اور سلاست سے کام لیتے تھے۔ ان کے نپے تلے بچے چھوٹے چھوٹے جملے، برجستہ فقرے، محاورے، اشعار اور مصرعے، تراکیب اور بولتے رواں دواں الفاظ، پھر الفاظ بھی کیسے کہ جو الفاظ جہاں رکھ دئے ہٹائے نہیں ہٹ سکتے انگشتری میں نگینہ کی طرح چمکتے ہیں۔ ان کی نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عبارت نہایت چست اور متحرک ہوتی ہے۔ جامد اور بے جان نثر، ڈھیلی ڈھالی اور پھیکی تحریر کا اس دبستان ادب میں گذر نہیں۔ یہاں شوخی و تازگی سے تراوٹ اور جدت ہے، ندرت اور ایجاز ہے، طباعی اور حکیمانہ اپج ہے۔ سرخی ایسی جمائی جاتی ہے کہ طبیعت پھڑک اٹھے، چٹکی ایسی ہوتی ہے کہ بے اختیار پڑھنے والے کے منہ سے واہ واہ سبحان اللہ نکل جائے۔ ان کی نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ نثر نگار کے پیچھے ہاتھ باندھ کر چلتی ہے یہ جدھر اور جیسے چاہتے ایسے موڑ لیتے تھے اس نثر میں شگفتگی اور شادابی ہے، بشاشت اور خوش فکری ہے، سادگی رعنائی اور روانی ہے نثر دل میں جا کر بیٹھ جاتی ہے یا اس کے دھماکے دل و دماغ میں محسوس ہوتے ہیں اس میں کسک اثر اور دھمک ہے۔

مولانا مرحوم کی قلمی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہے، فلسفہ اور حکمت سے لے کر مذہب، تصوف اور ادب تک مختلف اصناف میں ان کے بلند پایہ مضامین اور مختلف تصانیف موجود ہیں لیکن اصلاً وہ ادیب تھے ادیب منفرد۔ ان میں ادب اور انشاء کا ذوق اتنا رچا بسا ہوا تھا ان کا امتیازی وصف بن کر رہ گیا تھا جن سے ان کی مذہبی فلسفیانہ تصانیف بھی خالی نہیں۔ زبان و ادب کے ہر پہلو پر ان کی حکمرانی تھی۔ کلاسیکی ادب کی تمام خصوصیات مولانا میں ایک جا جمع ہو گئی تھیں اس لحاظ سے وہ دور حاضر کے منفرد ادیب کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ ان کی ادبی خصوصیات

اندازہ لگانے کے لئے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں ۔ اپنے ایک ادبی مضمون بعنوان " اردو کے ایک واعظ شاعر " میں حالی کی شاعری خصوصاً ان کے تغزل پر ایسا دلکش تبصرہ کیا ہے کہ وہ بجائے خود ایک ادبی شاہکار بن گیا ہے ۔ مضمون کا آغاز اس حیرت سے ہوتا ہے ۔

" ہائیں ! یہ کیا ارشاد ہوا ، کہاں مولوی حالی اور کہاں یہ شعر ! بیچارے سادے واعظ قسم کے آدمی ۔ روکھے پھیکے اشعار کے ناظم ، انہیں غزل اور پھر غزل کے پھڑکتے ہوئے شعر سے مناسبت کیا ؟ شعر کے سارے تیور استاد غالب کے ، تخیل وہی بندش ہوئی ، زبان وہی ۔ حالی کے کلام میں نہ حسن بیان نہ لطف زبان ، نہ یہ روح نہ یہ جان ، نہ تخیل میں رعنائی نہ طرز بیان کی زیبائی ، غرض دل نے کچھ جھنجھلا کر اور خفیف ہو کر یہ ساری جرحیں کر ڈالیں لیکن حقیقت بہرحال حقیقت رہتی ہے "

اسی طرح مولانا کے فلسفیانہ مضامین کی ایک جھلک " تخلیق کا سدا بہار کارو بار " کے عنوان والے مضمون میں ملاحظہ ہو ۔ فرماتے ہیں :

" کائنات پھیل رہی ہے وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہے ۔ ستارے ہم سے دور ہوتے جا رہے ہیں ۔ کائنات کسی انجانی منزل کی طرف بڑھتی جا رہی ہے ۔ بڑے بڑے سائنسی مضمون اور مقالے آجکل اسی قسم کے فقروں سے بھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ خالق کائنات کی قوت تخلیق جب معطل نہیں ہوئی ہے تو آخر کس طرح چرند پرند ہر قسم کے جانور اور شجر و حجر ہر طرح کے نباتات و جمادات ہر روز نئے نئے وجود میں آتے رہتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ نئے نئے ستارے اور چاند سورج نہ پیدا ہوتے رہیں ۔ آسمانوں اور کہکشاؤں کی آفرینش کیا اب بند ہو گئی ہے ؟ آخر یہ فرض کیسے کر لیا گیا ؟ "

مولانا ماجد کو خاکہ نگاری اور منظر کشی میں کمال حاصل تھا جس چیز کو بیان کرتے تھے اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے رقصاں ہو جاتا ہے وہ تصدق حسین خاں شروانی کی شکل و شباہت یوں بیان کرتے ہیں :

" علی گڑھ کے کھلنڈرے ایک سے بڑھ کر ایک لیکن تماشائیوں کی نظریں بس علیگڑھ کے گول کیپر پر جمی ہوئی ۔ ایک سرخ و سپید ، قوی ، تنومند خوش رو نوجوان پہاڑ کی طرح اٹل اور چٹان کی طرح مضبوط ۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ گول کیپری ہی کے لئے خلق ہوا ہے ۔ لکھنؤ کی ٹیم بے طرح جوش و ولولہ کے ساتھ پھیر پھیر کر گیند ...

حملے کرتی اور ہر حملہ اسی طرح کیپر کا استقلال کا عالم ۔ بس یہیں سمجھ لو ...
سمندر کی غضبناک موجیں اپنی سطح سے اچھل اچھل کر حملہ آور ہوتیں اور
پتھر کی چٹان سے ٹکرا کر واپس چلی جائیں ۔"

ایک دوسری جگہ منظر کشی کا عالم ملاحظہ ہو ۔ جیسے ہی دشمن [illegible] کی لڑائی کے دوران معزز ممبر پارلیمنٹ پر شہد کی مکھیوں کے حملے کے بارے میں لکھتے ہیں :

"جلاو کے لئے آگ جلی تو دھواں پیدا ہوا اور دھواں چھت تک جا پہنچا مکھیاں بھڑکیں اور بگڑیں اور غضبناک ہو کر حملہ آور ہو گئیں ۔ ان کا حملہ معاذ اللہ! گولی اور گولے سے بڑھ کر بے پناہ ۔ ابھی چپراسی کو کاٹا ابھی دربان کو بھنبھوڑا ۔ یہ آئیں وہ آئیں اور لیجئے اب حملہ خود وزارت مآب پر شروع ہو گیا ۔ نہ چوکیداروں کی لاٹھیاں کام آئیں نہ کانسٹبلوں کے ڈنڈے نہ منصب و مرتبہ کا رعب پڑ سکا ۔ وزیر با تدبیر اعزاز و وقار کا خیال کئے بغیر بے تحاشہ بھاگے کسی نے کیبن کے اندر گھس کر جان بچائی، کسی نے غسل خانے کے اندر اپنے کو بند کر لیا جب کہیں مصیبت سے جان بچی ۔"

آخری بات یہ ہے کہ ایسی ہی اعلیٰ قسم کی ادبی تحریروں اور منفرد اسلوب نگارش کے باعث مولانا عبدالماجد دریابادی اردو ادب میں رہتی دنیا تک یاد کئے جاتے رہیں گے ۔

بقیہ "تہذیب و ثقافت" صـ ۳۲ سے آگے

تمام مشکل ہوگی ۔ مغربی تہذیب شاخ نازک پہ بنا آشیانہ ہے، ناپائیدار ہے بلکہ اب تنکے تنکے ہو کر خود ہی بکھر چکا ہے اور یہ تہذیب اپنے ہاتھوں آپ خودکشی کر چکی ہے ۔ اب اس خلا کو پر کرنے کی ضرورت ہے ہمیں چاہیئے کہ پندرہ سو سال پہلے بتائی ہوئی صراط مستقیم پر ہم پہلے گامزن ہو جائیں اور دوسروں کو بھی اس سیدھے راستے کی نشاندہی کریں تاکہ ہم بھی فلاح و بہبود پائیں اور انسانیت کو بھی سیدھے راستے پر ڈال کر اپنے مقصد تخلیق کی تکمیل کا سبب بنیں ۔

پروفیسر فاروق محمد خاں

یادِ رفتگاں ۔ منٹو

پردۂ سیمیں پر فلم چل رہی تھی ۔ عدالت کے سین میں ایک ملٹری آفیسر آتا ہے ۔ سنکی ' نیم پاگل کرنل کرپا رام ۔ اس اداکار کو کبھی دیکھا نہ تھا ' ہال میں آوازیں ابھریں " منٹو !... ارے منٹو ..... " نام بھی نیا اور عجیب ، فلم تھی " آٹھ دن " ۔ فلم کے ہیرو تھے اشوک کمار ــــ ہم اس دور میں آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے ۔ یہیں سے منٹو کے نام سے کان آشنا ہوئے تجسس ہوا منٹو کے بارے میں معلومات کرنے کا ، پتہ چلا کہ بہت بڑا اور بہت بدنام افسانہ نگار ہے اس دور میں افسانے پڑھنے تو شروع کر چکے تھے مگر افسانے وہی سمجھ میں آتے تھے جو رومانی قسم کے تھے ۔ پھر ایک روز ایک پرانا رسالہ ردی میں ہاتھ لگ گیا شاید " ساقی " تھا اس میں منٹو کا ایک افسانہ نظر سے گذرا " پھاہا " ، جس میں ایک کمسن لڑکا اور ایک کمسن لڑکی جو شباب کی دہلیز پر قدم رکھ رہے تھے ان کا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا تھا آج بھی جب کوئی پھوڑے پھنسی پر Gum PLAST لگا ہوا نظر آتا ہے تو منٹو کا افسانہ پھاہا ضرور ذہن میں کلبلانے لگتا ہے ۔ یہیں سے منٹو کو پڑھنے کا شوق ہوا ، انٹر اور بی اے تک آتے آتے منٹو کے سبھی قابل ذکر افسانے پڑھ ڈالے ۔ دھواں ، بو ، ہتک ، نیا قانون ، کالی شلوار ، بابو گوپی ناتھ ، نعرہ ، سرکنڈوں کے پیچھے ، خالی بوتلیں خالی ڈبے ، سڑک کے کنارے ، ٹھنڈا گوشت ، ٹوبہ ٹیک سنگھ ، کھول دو وغیرہ وغیرہ ۔ پھر فسادات کے موضوع پر سیاہ حاشیے " گنجے فرشتے " فلمی شخصیتوں کے خاکے ، پردے کے پیچھے ۔

شروع میں منٹو کی تکنیک کی وجہ سے کچھ الجھن ہوتی ۔ کچھ افسانے سمجھ میں آ جاتے کچھ نہ آتے ، پھر بھی پڑھتے ۔ اپنے سے سینئرز سے ڈسکس کرتے یا افسانہ کو دوبارہ پڑھتے [illegible] " [illegible] " نے بڑا پریشان کیا ۔ رفتہ رفتہ منٹو ہمارے دل و دماغ پر چھا گیا [illegible] افسانے [illegible] پڑھ ڈالے ..... سردیوں کے موسم میں ہم بھی اپنے [illegible]

اس کے افسانے "بو" کی بو تو آج تک نتھنوں میں گھسی ہوئی ہے۔ منٹو کے افسانوں کا یہاں تک اثر ہوا کہ وہ جس طرح سماج کے ہر طبقے اور اس کے ہر فرد سے گھل مل جاتا، ہم بھی ہر کس و ناکس سے اس طرح ملتے جیسے وہ ہمارا یار غار ہے۔ دوست احباب ہم سے چڑ کر کہتے "چلو یار! .. کسی بھی معمولی آدمی سے اتنی دیر بات کر رہے ہو، اس کے پیشے کی نزاکتیں دریافت کر رہے ہو جیسے تمہیں آگے چل کر یہی پیشہ اپنانا ہے"

تو یہ سب کیا تھا؟ ۔ دراصل منٹو اپنی تحریروں کے باعث ہم میں رچ بس گیا تھا۔ ہم پر بس منٹو ہی منٹو چھا گیا تھا۔ جب حالت یہ ہو تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ منٹو کو ہم نے نہیں دیکھا ۔ منٹو نے پشاور یونیورسٹی کے ایک طالب علم کی آٹوگراف بک کر اپنی موت سے ایک سال پہلے ایک کتبہ لکھ کر دیا تھا:

"یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے، اس کے سینہ میں فن افسانہ نگاری کے سارے اسرار و رموز دفن ہیں .... وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا ۔"

شاید یہ اس کے بڑا افسانہ نگار ہونے ہی کی دلیل ہے کہ وہ چپکے چپکے اپنے قاری کے ذہن و دل کو متاثر کر جاتا۔ یہاں تک کہ چپکے چپکے ہم نے بھی منٹو کے رنگ میں دو تین افسانے لکھ ڈالے ۔ لیکن ہم میں منٹو ایسی جرأت کہاں ۔ افسانے لکھے لیکن شائع نہیں کروائے۔

سعادت حسن منٹو ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء کو بمقام سمبرالہ ضلع لدھیانہ پیدا ہوئے۔ منٹو کشمیری زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہوتے ہیں ترازو ۔ وہ کہتا ہے کہ ہمارے آبا و اجداد کے ہاں دولت ترازو میں تلتی تھی اسی مناسبت سے ان کا خاندان منٹو کہا جانے لگا۔ اس لفظ سے بڑی بڑی شخصیتوں کو غلط فہمیاں ہوئیں۔ پہلی مرتبہ جب منٹو کا تعارف مشہور ڈرامہ نویس آغا حشر کاشمیری سے کروایا گیا تو انہوں نے سوال کیا "لارڈ منٹو سے کیا رشتہ ہے تمہارا؟" آج بھی بیشتر حضرات منٹو ہی کہتے ہیں۔ منٹو کا خاندان عرصہ سے امرتسر میں آباد تھا۔ یہ اپنے والد کی دوسری بیوی کے بطن سے تھے اور سب سے چھوٹے۔ والد مجسٹریٹ تھے۔ ان کے تین سوتیلے بھائی تھے جو ولایت میں تعلیم پا رہے تھے لیکن منٹو کو ان سے ملاقات کا موقع نہ ملا۔ بچپن امرتسر میں گذرا۔ بے حد ذہین اور شرارتی تھے۔ اپنی شرارتوں اور دوسروں کو اچانک چونکا دینے والی حرکتوں کی وجہ سے اسکول میں "ٹامی" کے نام سے مشہور تھے۔ مسلم ہائی اسکول شریف پورہ امرتسر سے منٹو نے

ان کے دوستوں کی شرارتیں بڑی ہوشربا ہوا کرتی تھیں ۔ وہ انٹرنس کے امتحان میں دوبار فیل ہوئے یہ بھی بڑی عجیب و غریب بات ہے کہ اردو کا سب سے بڑا افسانہ نویس اردو کے پرچہ میں ناکام رہا امتحان پاس بھی کیا تو تھرڈ ڈویژن میں ۔ پھر ہندو مہاسبھا کالج امرتسر میں ایف اے میں داخلہ لیا یہاں فیل ہوئے تو علیگڑھ یونیورسٹی چلے گئے ۔ علیگڑھ یونیورسٹی سے صرف اس لئے نکالے گئے کہ وہ .T. B جیسے موذی مرض میں مبتلا تھے پھر وہ اپنی صحت درست کرنے کے لئے کشمیر کے ایک بٹوٹ چلے گئے یہاں تین مہینے قیام رہا ۔ شاید یہ تین مہینوں کا عرصہ منٹو کی زندگی میں کسی قدر اطمینان و خوشگواری کا تھا ۔ ان کا افسانہ "لالٹین" بٹوٹ سے ہی متعلق ہے ۔ افسانہ کا بیشتر حصہ منٹو کی رومانی زندگی کا حصہ معلوم ہوتا ہے ویسے منٹو کا ادبی ذوق امرتسر کی ایک ہوٹل "شیراز" سے شروع ہوا ۔ مشہور مزاح نگار حاجی لق لق اور باری صاحب جو ان دنوں "مساوات" کے ایڈیٹر تھے اسی ہوٹل میں چائے پینے آتے ، کبھی کبھی اختر شیرانی بھی ۔۔ اس طرح منٹو کا تعلق "مساوات" سے ہوگیا اور ان کے ذمے فلمی خبروں کا کالم دیا گیا ۔ پھر باری صاحب نے وکٹر ہیوگو کی Last Days of Condemned ترجمہ کرنے کے لئے دی اور منٹو نے ڈکشنری کی مدد سے اس کا ترجمہ کر ڈالا ۔ اب بقول منٹو وہ "صاحب کتاب" تھے ۔ یہ کتاب "سرگذشت اسیر" کے نام سے چھپ چکی ہے لیکن اس سے پہلے ان کا پہلا افسانہ "تماشا" چھپ چکا تھا جو انہوں نے جلیانوالہ باغ خونی حادثہ سے متاثر ہو کر لکھا تھا مگر چھپایا تھا فرضی نام سے ۔ "مساوات" سے کوئی باضابطہ تنخواہ نہ ہوتی تھی اس لئے وہ نذیر صاحب کے بلانے پر بمبئی آئے اور یہاں آکر ان کے فلمی ہفتہ وار "مصور" کی ادارت سنبھال لی ۔ اس دور میں منٹو نے فلمی ہستیوں سے انٹرویوز بھی لئے اور یہیں سے وہ فلموں سے وابستہ ہوئے ۔ سب سے پہلے بحیثیت مکالمہ نگار یہ سیٹھ اردشیر ایرانی کی امپیریل کمپنی میں ملازم ہوئے ۔ وہی اردشیر ایرانی جو پہلی بولتی فلم "عالم آرا" پیش کر چکے تھے ۔ اس زمانہ میں منٹو "منشی منٹو" کہلاتے تھے ۔ اسی زمانہ میں ان کی شادی ایک کشمیری گھرانے میں ہوئی جس کی دلچسپ روداد انہوں نے اپنے ایک مضمون "میری شادی" میں لکھی ہے وہ لکھتے ہیں کہ وہ زندگی میں تین مرتبہ بیہوش ہوئے ، سب سے پہلے اپنے نکاح پر اور دوسری مرتبہ اپنی والدہ کی موت پر اور تیسری مرتبہ اپنے لڑکے کی وفات پر ۔ شادی کے سلسلہ میں بیہوش یوں ہوئے کہ وہ اپنے ایک دوست کو نکاح میں شرکت کی دعوت دے کر لوٹ رہے تھے کہ تیز چلنے سے فرش پر ان کا پاؤں پھسلا اور وہ اس زور سے گرے کہ بیہوش ہوگئے

فلموں کے ساتھ منٹو کہانیاں بھی لکھتے رہے ۔ "ہتک" اسی دور کی کہانی ہے ۔ بمبئی کی عیاشی، مفلسی، قلاشی اور زندگی کے زہر کو پینا پڑا ۔ بقول کرشن چندر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے افسانوں میں سے جذبات، احساس اور ملائمت کو دھکے مار کر نکال رہا ہے لیکن یہ بمبئی ہی تھی جہاں مصیبتوں، تکلیف اور اذیتوں کی بھٹی میں تپ کر منٹو کندن بن کر نکلے۔

بمبئی کے دور کے بعد دہلی کا دور آتا ہے جب آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر پطرس بخاری پہنچے تو انہوں نے اس دور کے بیشتر شعراء اور ادیبوں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر لیا تھا۔ مثلاً احمد ندیم قاسمی، دیویندر ستیارتھی، میراجی، چراغ حسن حسرت، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، کرشن چندر، بیدی، اپندر ناتھ اشک وغیرہ ۔ منٹو بھی بمبئی چھوڑ دہلی چلے گئے ۔ یہاں منٹو اور اشک ڈرامے اور فیچر لکھتے اور کرشن پروڈیوس کرتے ۔ یہاں اشک اور منٹو کی خوب نوک جھونک چلتی ۔ اس چپقلش کی تفصیل اشک نے اپنے ایک مضمون "منٹو۔ میرا دشمن" میں بڑی خوبی سے پیش کی ہے ۔ ان دنوں کرشن اور منٹو نے مل کر ایک فلمی کہانی لکھی "بنجارہ" دہلی کے کسی ڈسٹری بیوٹر کو منٹو نے یہ کہانی بیچ دی ۔ اس ڈسٹری بیوٹر نے اس کہانی میں اتنی تبدیلیاں کروائیں کہ کرشن چندر حیران رہ گیا ۔ وہ سمجھتا تھا کہ منٹو اس ڈسٹری بیوٹر پر اب برسا تب برسا مگر منٹو نے اس کی ہر بات بلا چون و چرا مان لی ۔ کرشن کے دریافت کرنے پر کہنے لگا "ادب سے خدمت کرو اور قلم سے روپیہ کماؤ"

منٹو کے ریڈیائی ڈرامے اور فیچر عوام میں بہت مقبول ہوئے ۔ وہ جب کبھی ریہرسل کے لیے آتا تو اپنی پھلجھڑیوں سے شگفتگی پیدا کر دیتا ۔ ریڈیو آرٹسٹ منٹو کو بہت چاہتے تھے انہوں نے ان ریڈیو آرٹسٹوں کے نام اپنے ریڈیائی ڈراموں کی کتاب بھی معنون کی ہے ۔ منٹو اس دور میں ہر کسی کو چھیڑتا ۔

شاہد احمد صدیقی نے منٹو کا خاکہ لکھا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ منٹو کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتیں، اسے ہمیشہ "میں ہی میں" کا احساس رہتا، کہتا میں سب سے اچھا لکھنے والا ہوں۔ خود کو پورا افسانہ نویس اور عصمت کو آدھا افسانہ نگار مانتا ۔ کرشن اور بیدی کو خاطر میں نہ لاتا ۔ اسے تصنع، بناوٹ، ریاکاری سے چڑ تھی ۔ میراجی جا مزعفر میں سالن ڈال کر کھاتے تو کہتا "یہ سالا بڑا فراڈ ہے"۔ ستیارتھی نے اپنی وضع قطع ٹیگور جیسی بنا لی تو کہتا "یہ بڑا فراڈ ہے، سالا بڑا سپوشن ہے، شیطان ہے ۔" [illegible]

[illegible] پوچھا [illegible] منٹو [illegible] نہیں [illegible] "دیکھو منٹو! میں تمہیں اپنے بیٹے کے برابر سمجھتا ہوں" منٹو نے جھلا کر جواب دیا "مگر میں آپ کو اپنا باپ نہیں سمجھتا"

ایک مرتبہ مولانا چراغ حسن حسرت سے ٹکر ہو گئی۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ حسرت اپنی علمیت کا سب پر رعب جما رہے تھے۔ انہوں نے منٹو سے کہا۔ "مقامات حریری میں یہ کہ [illegible] .... مگر آپ نے کہاں پڑھی ہوگی عربی میں ہے یہ کتاب" پھر کہا "دیوان حماسہ" .... "اگر آپ نے پڑھا ہوتا... مگر عربی آپ کو کہاں آتی ہے" اس طرح مولانا نے کئی عربی فارسی کتابوں کے نام گنا دئے۔ منٹو پیچ و تاب کھاتا ہوا خاموش بیٹھا رہا، دوسرے دن پھر جب چائے کیلئے جمع ہوئے تو منٹو نے مولانا پر جوابی حملہ شروع کر دیا۔ "کیوں مولانا! آپ نے فلاں کتاب پڑھی ہے؟ مگر آپ نے کہاں پڑھی ہوگی، وہ تو انگریزی میں ہے۔ اور ہاں! فلاں کتاب، شاید آپ نے اس جدید ترین مصنف کا نام بھی نہ سنا ہوگا۔" اس طرح منٹو نے کوئی پچاس نام ایک ہی سانس میں گنا دئے آخر مولانا کو کہنا پڑا کہ ان میں سے ایک بھی کتاب ان کی نظر سے نہیں گزری۔ مولانا کو پسینہ آگیا اور بڑی مشکل سے جان چھڑا کر بھاگے۔ مولانا کے جانے کے بعد کسی نے پوچھا کہ "اتنی ساری کتابیں اس نے کب اور کہاں پڑھ ڈالیں؟" تو منٹو نے مسکرا کر جواب دیا "کل شام یہاں سے سیدھا اٹھ کر ایک انگریزی کتب فروش کے پاس گیا اور جدید ترین کتب کی فہرست لے کر رٹ ڈالا"

شیخی کی باتیں منٹو کو سخت ناپسند تھیں اور شیخی کرکری کرنے میں اسے لطف آتا۔ راشد سے ان کی آزاد شاعری کے تعلق سے کسی نے پوچھا کہ "آخر آپ کی یہ عجیب و غریب شاعری میں کیا تک ہے" تو انہوں نے Rhyme اور Rhythym کا فرق سمجھاتے ہوئے اپنی ایک نظم سنانی شروع کی اور کہا کہ اس میں میں نے ڈانس کا Rhythym رکھا ہے۔ منٹو نے فوری ٹوکا "کون سا ڈانس؟ والز، رمبا سمبا، کتھا کلی، کتھک، منی پوری یا بھرت ناٹیم؟" اس پر راشد بغلیں جھانکنے لگے تو پھر کہا "فراڈ کہیں کا"

دہلی ریڈیو اسٹیشن کے بعد منٹو پھر واپس بمبئی آگئے اور فلموں کیلئے لکھنے لگے "اپنی نگریا" "بیگم" "آٹھ دن" "شکاری" "چل چل رے نوجوان" وغیرہ کئی فلموں کی کہانیاں لکھیں۔ ان کی سب سے اہم فلمی کہانی "مرزا غالب" ہے جو انہوں نے پاکستان جانے کے بعد سہراب مودی مرحوم کو بھجوائی تھی۔ [illegible] بعد منٹو [illegible] ادیب [illegible]

ادب سے فلم کی طرف آیا بلکہ منٹو کی افتاد طبع کی طرح یہاں بھی معاملہ برعکس ہے۔ وہ فلم سے ادب کی طرف آیا۔ پریم چند تو اس فلمی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد فوراً ہی واپس چلے گئے لیکن منٹو جما رہا۔ فلم اور ادب دونوں راستوں پر ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ نامور فلمی ہستیوں جیسے اشوک کمار، نرگس، نسیم، ستارہ، کلدیپ کور، شیام، رفیق غزنوی کے حالات — "پردے کے پیچھے" میں انوکھے ڈھنگ سے پیش کئے۔

"گنجے فرشتے" میں بڑی بڑی نامور شخصیتوں کے عجیب و غریب پہلوؤں کی نقاب کشائی کی ہے جن میں میرا جی، آغا حشر، بابو راؤ پٹیل یہاں تک کہ قائد اعظم محمد علی جناح کو بھی نہ بخشا ویسے منٹو کو لیڈری اور سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے :

"سیاست سے مجھ کو کوئی دلچسپی ہے تو بس اتنی جتنی گاندھی جی کو فلم سے،
وہ سینما نہیں دیکھتے میں اخبار نہیں پڑھتا۔ دراصل ہم دونوں غلطی کرتے ہیں
گاندھی جی کو فلم ضرور دیکھنی چاہیئے اور مجھے اخبار ضرور پڑھنا چاہیئے۔"

تقسیم ہند کے بعد چند در چند وجوہات کی بناء پر منٹو پاکستان چلے گئے جہاں "ٹھنڈا گوشت" کی وجہ سے ان پر مقدمہ چلا۔ منٹو پر فحش نگاری کے سلسلے میں پانچ بار مقدمات چلے۔ پاکستان میں ثقہ حضرات نے فتویٰ دیا کہ "منٹو ناپاک ہے"۔ ہجرت کے بعد بھی منٹو کو سکون نصیب نہ ہوا۔ منٹو کو شراب پینے کی لت تھی صحت پہلے ہی خراب شراب نے اور غارت کر دیا۔ اس کم بخت شراب کے لئے منٹو نے اچھا برا سب لکھ ڈالا۔ روز دو افسانے لکھتے اور اس کی شراب پی جاتے۔ بے تکلف دوستوں کی جیب میں ہاتھ ڈال دیتے اور جو کچھ ہوتا نکال لیتے۔ شراب کے اثرات کی وجہ سے دو مرتبہ پاگل خانہ جانا پڑا، جگر چھلنی ہو چکا تھا۔ ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود بھی شراب نہ چھوڑی۔ بالآخر ۱۸ جنوری سنہ ۱۹۵۵ء کی صبح منٹو نے خون کی ایک قے کی اور اس جہان فانی کو خیرباد کہا۔

یہاں منٹو کی افسانہ نگاری کا جائزہ لینے کی گنجائش نہیں۔ بدنام اور متنازعہ فیہ شخصیت ہونے کے باوجود اردو نقادوں کی اکثریت نے منٹو کو بہت بڑا افسانہ نگار تسلیم کیا ہے منٹو نے پہلی مرتبہ کہانی سے پلاٹ کی اہمیت کو ختم کیا اور کردار نگاری پر زور دیا۔ اس کے کردار بابو گوپی ناتھ، ایشر سنگھ اور موذیل پلاٹ کی جکڑبندیوں سے آزاد اور غیر مربوط انداز میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ منٹو کی کہانی "پھندنے" شاید اردو کی پہلی کہانی ہے جس میں اردو

افسانہ نگاروں میں ترتیب اور منطقی ربط سے چھٹکارہ دلایا۔ یہ ۱۹۵۵ء کے آس پاس بکھر گئی تقسیم سے پہلے منٹو "ہتک" دھواں، بو، کالی شلوار، نیا قانون، بابو گوپی ناتھ وغیرہ سے افسانہ اردو ادب کو دے چکا تھا لیکن ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۵ء تک کا دور تو بالکل منٹو ہی کا تھا۔ فسادات کے موضوع پر منٹو کے افسانے جو "سیاہ حاشیے" کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں مجرے مزے کے ہیں۔ فسادات کے پس منظر میں اس کے افسانے "ٹھنڈا گوشت" "ٹوبہ ٹیک سنگھ" اور "کھول دو" کو شاہکار کا درجہ دیا جاتا ہے۔

آج کے دور میں ہر پڑھا لکھا جنس کی اہمیت، اس کی پیچیدگیوں اور اس کے گوناگوں تاثرات سے بخوبی واقف ہے۔ اب تو جنسی تعلیم باضابطہ نصابوں میں داخل کی جا رہی ہے لیکن اس جنسی تعلیم کے لئے ہم بڑی حد تک منٹو کے معترف ہیں۔ بقول کرشن چندر اس نے جذبات کے مسئلہ پر جس بے باکانہ انداز میں قلم اٹھایا ہے ہمارے ادب بشمول ہندی، مراٹھی، گجراتی، بنگالی اس کی مثال ڈھونڈنا مشکل ہے۔ اس نے یہ تعلیم اپنی جوانی اور صحت کو کھو کے ہمیں دی ہے۔ بمبئی کی چالیں، گلیاں، شراب خانے، قمار خانے، قحبہ خانے، بمبئی کی جرائم پیشہ دنیا، وہاں کے دادا ___ سچائی کی تلاش میں وہ اس کیچڑ میں دھنس گیا لیکن اس کی روح کبھی میلی نہ ہوئی۔ منٹو اردو ادب کا واحد شنکر ہے جس نے زندگی کے زہر کو خود گھول کر پیا ہے۔ منٹو کہتا تھا :

"یہ بھڑوے، یہ دلال، یہ کلال، یہ رنڈیاں، یہ قاتل، یہ چور، یہ خونی لچے لفنگے یہ بھی انسان ہیں، انہیں پہچانو ___ یہ بھی انسانوں کی طرح عزت ذلت، دکھ درد سب ہی کچھ محسوس کرتے ہیں ___"

مشہور نقاد وارث علوی کا بھی کچھ یہی خیال ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ منٹو بیک قلم مسترد کرتا ہے نطشے کے فوق الانسان کو، اقبال کے مرد مومن کو، سارتر کے لبرل انقلابی کو، کامو کے فرشتہ صفت مسیحوں کو اور ہندوستان کے نیل تھیلا سرحتی جینوں کو ___ ان کی جو کچھ بھی افادیت سہی لیکن منٹو کو اپنے فن کے لئے ان کی ضرورت نہیں۔ دراصل وہ جو بات کہنا چاہتا تھا وہ ان گرے پڑے لوگوں کے ذریعہ ہی کہہ سکتا تھا۔ وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ کسی اخلاقی ضابطہ یا سماجی ذمہ داری کے احساس کے بغیر بھی انسان سے کچھ اچھا کام ہو سکتا ہے۔ پاپ اور پن کے خیالات کے بجائے جب ایک انسان کو دوسرے کی تکلیف اور اذیت کا خیال آتا ہے جب وہ دوسرے کے ستم کو پہچان لیتا ہے تو اسے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے اور شاید یہی ہے درد کا رشتہ

شیخ ناصر نعیم

تہذیب کا موضوع فرد یا معاشرہ (ایک جائزہ)

تہذیب کا موضوع فرد یا معاشرہ ہے۔ انسان بحیثیت فرد کے نہ تو کوئی انفرادی تہذیب رکھتا ہے اور نہ کوئی انفرادی زبان۔ انسان کو معاشرتی حیوان انہی معنوں میں کہا گیا ہے کہ وہ بغیر معاشرے کے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ انسان کو ایک طرح سے تہذیب کا خالق کہا جا سکتا ہے کیونکہ یہی وہ شاہکار ہے جو اسے فطرت میں منفرد اور ممتاز کرتا ہے۔

اقبالؒ نے انسان کو چراغ کا خالق کہا ہے اور خدا کو رات کا خالق (تو شب آفریدی) یہاں چراغ انسانی تہذیب کا استعارہ ہے۔

مذہبی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ بحث بہت قدیم ہے کہ فرد اور معاشرہ کے تعلق میں مرکز فرد اور محیط معاشرہ ہے یا پھر مرکز معاشرہ ہے اور فرد محیط۔ اس مسئلہ پر جو بڑی فلسفیانہ بحث ہے وہ دو الگ الگ زاویہ نظر ہیں۔ بعض مذاہب نے اہمیت فرد کو دی ہے اور بعض نے معاشرہ کو۔ اسلامی مفکرین نے بھی اس بحث میں دو الگ الگ راہیں اختیار کی ہیں۔ بعض کا رجحان فرد کی اہمیت و عظمت کی طرف ہے اور بعض کا معاشرے کی اہمیت و عظمت کی طرف۔

اسلام نے نیکی کو برائی کا معیار قرار دیا ہے۔ اس لحاظ سے اگر فرد نیک ہے تو خواہ معاشرہ کیسا ہی کیوں نہ ہو پھر بھی فرد کی نیکی کو اعلیٰ معیار قرار دیا جاتا ہے۔ اسلامی تاریخ کے اولین دور میں نیکی کا معیار انفرادی تھا۔ اکیلے افراد اپنے ایمان میں کامل ہوتے تھے۔ چاہے وہ گنتی میں کتنے ہی کم تعداد ہوں۔ وہ پورے معاشرے کے مقابلے میں سچائی کا پیکر تھے۔ چونکہ اس وقت معاشرہ بہت قوی تھا اور پورا معاشرہ ان نیک انسانوں کا سخت ترین دشمن تھا اس نے ان چند انسانوں پر زندگی حرام کر دی تھی۔ یہاں تک کہ ان نیک انسانوں میں سب سے معیاری انسان کو اپنے نیک مقصد کی خاطر اپنا پیدائشی شہر چھوڑ کر دوسرے شہر میں جانا پڑا لیکن کچھ دنوں بعد ان نیک انسانوں نے اپنی تعداد اور تنظیم کے ذریعہ اپنے کو ایک معاشرے

ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو۔ ایس وی یونیورسٹی۔ تروپتی

میں تبدیل کر لیا تو پھر نیکی کا محور بجائے فرد کے معاشرہ قرار پایا۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں
دل سے خدا کو ماننا، اس پر یقین کرنا اور انفرادی طور پر اپنے ایمان کا مظاہرہ کرنا اصل ترین
نیکی تھی اور عبادت بھی انفرادی تھی لیکن فتح مکہ کے بعد جماعت کی اہمیت واضح ہوئی اور خود
پیغمبر اسلام کی زندگی کے بھی دو دور قائم کئے گئے ایک مکی زندگی دوسرے مدنی زندگی۔
مدنی زندگی کے بعد ہی سے اسلام کے معاشرتی اصول و قوانین بننے شروع ہوئے اور
جوں جوں فتوحات کا سلسلہ بڑھتا رہا اسلامی معاشرت کے متعین اصول بھی واضح ہوتے گئے۔
ہر فرد کی نیکی اور پاکیزہ اخلاق کو اخلاق کا معیار قرار دیا جائے تو معاشرے کی تبدیلی کے بغیر
ہی ایک اچھے فرد کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ اگر مقصود ایک نیک معاشرہ کو وجود میں لانا ہے تو
محض فرد کی نیکی چنداں اہمیت نہیں رکھتی۔ اخلاق لحاظ سے فرد اور معاشرہ لازم و ملزوم
الفاظ ہیں جن کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہر ماحول معاشرہ میں اس کے رہن سہن، راہ و رسم
پاکیزہ اخلاق و آداب، عقائد و خیالات، پسند اور ناپسند کے سب معیار تہذیب کے دائرہ میں
آتے ہیں جس کو مشہور دانشور ڈاکٹر سید عابد حسین اس طرح سے پیش کرتے ہیں:

"سب سے زیادہ مشہور معنی ہیں پاکیزہ و پسندیدہ اخلاق و آداب،
جس شخص کی طبیعت، چال ڈھال، گفتگو اور برتاؤ میں ایک خاص
موزونیت اور دلکشی ہو وہ مہذب کہلاتا ہے" ۱؎

اور تہذیب کا وسیع ترین مفہوم دراصل ان الفاظ میں پیش کیا جا سکتا ہے:

"اقدار کا شعور جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے اور جس کے مطابق
وہ اپنی زندگی کی تشکیل کرنا چاہتی ہے۔" ۲؎

دراصل کلچر انگریزی لفظ Cultivation سے نکلا ہے جس کے معنی زراعت یا کھیتی
کے ہیں۔ تہذیب و تمدن دو ایسے الفاظ ہیں جو عام طور پر مترادف خیال کئے جاتے ہیں۔
تہذیب معاشرہ کی روح ہے جو معاشرہ کے پیکر میں چھپی رہتی ہے۔ اور معاشرہ تہذیب کا وہ پیکر
ہے جو تمدن میں ظاہر ہوتا ہے جس طرح لفظ کا وجود مادی ہوتا ہے اور جس کے معنی اس کے
اندر ہی چھپے رہتے ہیں اسی طرح تہذیب اپنا اظہار تمدن میں کرتی ہے جو عربی لغت میں مدن سے نکلا ہے،

۱؎، ۲؎ ڈاکٹر عابد حسین۔ قومی تہذیب کا مسئلہ ۱۹۸۰ء۔ ص ۱۳-۱۵

جو شہر کے معنی رکھتا ہے ۔ ہم تمدن کے ان مظاہر پر غور کرتے ہیں جو خواہ آثار قدیمہ ہوں یا اوزار ، ہتھیار ، وہ مجسمے ہوں یا تصاویر ، رسم و رواج ہوں یا قوانین ، ان سب سے ہم اس عہد کی تہذیب کا پتہ لگا سکتے ہیں ۔

تہذیب مختلف اجزا کا مجموعہ ہے ۔ اس کے اجزائے ترکیبی پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ تہذیب کا وجود فطرت کے مقابلے میں منفرد اور فطرت سے یکسر آزاد ہے ۔ یہ خود اپنا اظہار فرد اور معاشرے میں کرتی ہے جس میں معاشرے کا زیادہ حصہ ہوتا ہے ۔

معاشرہ افراد کا وہ مجموعہ ہے جو محض اتفاقیہ نہیں ہوتا بلکہ اس میں جماعت کے [illegible] کا دخل ہوتا ہے ۔

انسان بقول ڈاکٹر ذاکر حسین کے :

انسان محض انفرادی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اپنی تمام صلاحیتوں کو درجہ کمال تک پہنچانے کے لئے کسی جماعت یا کسی ریاست کی رکنیت کا محتاج ہے ۔ وہ دراصل جسم اجتماعی کا ایک عنصر ہے ۔[۱]

فطرت انسانی کوئی جامد اور مستقل شے نہیں ہے یہ دراصل سماج کی رہین منت ہے اس کا تعلق فرد سے بھی ہے اور معاشرے سے بھی ۔ یعنی فرد کی فطرت نجی بھی ہو سکتی ہے اور جماعتی بھی ۔

معاشرہ میں افراد کے کئی طرح کے رجحانات ملتے ہیں کیونکہ افراد الگ الگ طبیعتوں کے مالک ہیں ۔ اسی لئے مختلف رجحانات و میلانات معاشرہ میں راہ پاتے ہیں ۔ ان رجحانات میں وہی رجحان غالب ہوتا ہے جو سارے معاشرے کی ترجمانی کرے اور معاشرہ کو بحیثیت مجموعی مطمئن کر سکے ۔ اس ضمن میں اردو ادب کے مشہور و معروف دانشور علامہ اقبال کے خیال کو پیش کرنا ضروری ہے ۔ اقبال کا کہنا ہے کہ :

" فرد کا وجود مجازی ہے اور قوم (معاشرہ) کا وجود حقیقی ہے " ۔ انہوں نے فرد کے تشخص کو جماعت ہی کے وسیلہ سے تعین کیا ہے ۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

---

[۱] افلاطون ۔ مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین ۔ ۱۹۶۰ء ساہتیہ اکادمی دہلی ۔ ص ۹ ۔ ۱۳

اس بحث میں بعض دانشور فرد کی اہمیت کو زیادہ سراہتے ہیں اور بعض معاشرے کی اہمیت کو زیادہ بتاتے ہیں اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ معاشرہ کے اندر افراد کے تعلقات داخلی حیثیت کے مالک ہیں اور یہ معاشرہ افراد کے مشترک مقاصد کا سرچشمہ ہے اور وہ آگے چل کر سماج کہلاتا ہے۔ اس بحث میں فطرت انسانی کے دو اساسی رجحانات ہیں۔

ساری کائنات میں سب سے زیادہ عقل کا استعمال انسان کرتا ہے اس بنا پر یہ اشرف المخلوقات کہلاتا ہے لیکن یہی انسان جب عقل کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے تو اپنی سطح سے گر جاتا ہے۔ وہ عقل کے ذریعہ فطرت پر قابو پانے میں اور اس کو اپنی پسند میں ڈھالنے میں کامیاب ہوا ہے یعنی انسان نے عقل کی قوت سے کائنات کی تسخیر کی ہے۔ قدرت پر انسان کی فتح دراصل اس کی عقل اور تجربے کی فتح ہے اگر عقل کے دور سے پہلے ہم کائنات کے وجود پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ کائنات اس وقت تک بے جان تھی جب تک سمندر، پہاڑ، جنگل سب کے سب اپنا اپنا کام فطری طور پر انجام دے رہے تھے اور ان میں جب تک انسان نے دخل نہیں دیا تھا کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی مثلاً بجلی کا چمکنا، بارش کا ہونا قدرت کے ایک نظام کے ماتحت تھا لیکن جب انسان نے بجلی پیدا کی تو کائنات کے نظام میں ایک بہت بڑی تبدیلی آئی اور تہذیب کا آغاز ہوا۔ اسی طرح انسان نے اپنی کوشش سے آگ پیدا کی اور اپنی ضرورتوں کو خاص کر غذا تیار کرنے، ریل گاڑی چلانے اور دوسرے ترقی یافتہ کاموں کو پورا کرنے میں اس کا استعمال کر کے اپنی تہذیب اور ترقی کا مظاہرہ کیا اور اس کا ثبوت دیا۔

انسان کی عقل جس طرح فطری ہے اس کے جذبات بھی فطری ہیں۔ یہ جذبات انسانی کا دوسرا لازمی عنصر ہیں جس سے فطرت محروم ہے۔ فطرت ہر طرح کے جذبات سے محروم ہے، اگر انسان کے پاس غور و فکر کا مادہ فطری ہے تو اس کے جذبات بھی فطری ہیں۔ دوسری کسی بھی مخلوق میں یہ جذبات نہیں ہیں۔ غرض یہ انسان عقلی اعتبار سے بھی اور جذباتی اعتبار سے بھی ساری کائنات میں ممتاز او منفرد ہے لیکن بعض مفکروں نے فطرت کے زیر اثر معاشرہ و فرد کو ایک عقلی معاہدے کے ذریعہ ایک دوسرے کا پابند کر دیا ہے۔ جیسے کہ روسو کا نظریہ معاہدۂ عمرانی۔

سماج کا ہر فرد اپنی بقا اور بہبودی کی خاطر ایک دوسرے سے وابستہ ہے اور یہ انسانی عقل کا عطیہ ہے جس کا تعلق ہماری شعور سے ہے۔ اس میں انسانی تخیل، حافظہ اور استدلال جیسی مخصوص قوتیں کارفرما ہیں۔

اکثر مفکرین نے انسانی گروہوں کے پیش نظر جذباتی ہم آہنگی یا اپنائیت پر سماج کی بنیاد رکھی ہے جس سے سماجی پہلوؤں کو نظر انداز کر کے نفسیاتی پہلو کو اہمیت دی گئی ہے عہد جدید میں قومیت کا تصور اسی جذباتی ہم آہنگی کا رہین منت ہے اور اس قومیت کے ردعمل کے طور پر بین الاقوامیت کا تصور بھی انسانی جماعتوں کی جذباتی ہم آہنگی کی بنیاد پر بنا ہے۔ اقبال اور ٹیگور نے ساری انسانیت کو سامنے رکھ کر اپنے اپنے انداز قومیت کی سخت مخالفت کی اور اسے انسانی جماعت میں انتشار کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔

فرد اور جماعت کے ربط کے سلسلے میں یہ بات آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ فرد کا دائرہ محدود ہے اور معاشرہ کا دائرہ وسیع۔ اکیلا فرد اپنی ضروریات کو ایک حد تک پورا کر تو کر لے لیکن مستقبل میں ترقی کرنے کے لئے اس کو معاشرے کے زیر اثر رہنا ضروری ہے — اسی لئے انسان کو سماجی حیوان کہا گیا ہے۔

فرد کا زندگی بسر کرنے کے لئے ایک جماعت سے وابستہ ہونا اس کی ترقی کا ایک اصلی معیار ہے۔ یہاں پر سماج کی وسعت کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد حسن صاحب کا کہنا ہے کہ

"سماج بذات خود ایک عظیم اور وسیع ادارہ ہے اور اس کے اتنے روپ، اتنے رنگا رنگ ہیں کہ ان میں وحدت پانا مشکل ہے۔"[1]

یہی وہ سماج ہے جو اپنے ملک کو مثالی شخصیتوں سے نوازتا ہے جو ملک کی ترقی و بہبودی کے ذمہ دار ٹھہرائے جاتے ہیں اور یہی افراد معاشرے میں تربیت و پرورش پا کر ملک کی ذمہ داری کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا لیتے ہیں۔ دراصل انہیں یہ طاقت اور ہمت معاشرے کی بدولت ہی ملتی ہے۔

فرد اور سماج کا تعلق معاشرتی، اخلاقی، مذہبی، تمدنی و سیاسی اور تاریخی کئی نوعیتوں کا ہے لیکن وہ ہر دور میں افراد کی بہبودی کے لئے آگے بڑھتا اور ضروریات زندگی کو پورا کرتا رہتا ہے۔ یہی وہ ادارہ ہے جو فرد کی ذہنی نشو و نما کا ذمہ دار ہے۔ مثال کے طور پر آج کی دنیا میں امریکہ کو مادی ترقی کی بنیاد پر دنیا کا سب سے بڑا ترقی یافتہ ملک کہا جا سکتا ہے جو ساری دنیا کی مادی قوت کا بڑا مرکز ہے لیکن اس مادی ترقی کے دور میں بھی کالے اور گورے

---

[1] ادبی تنقید - ڈاکٹر محمد حسن

تفریق انسان کے دورِ جاہلیت کی یادگار ہے، اس لئے وہ اخلاقی اور ذہنی پستی کی سطح پر ہے

دنیا کی مادی ترقی کے ساتھ ساتھ اگر انسان کی فکری ترقی کا بھی جائزہ لیا جائے
س میں سب سے بڑا عنصر تہذیب کی ترقی کا عنصر ہے اور یہی دراصل انسانی تہذیب
ا کی کہانی ہے۔

اب تہذیب کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی پہلو
ے یکسر الگ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے آج کل تہذیب کی ترقی کے بغیر انسانی ترقی کا
ا بھی تصور ممکن نہیں ہے۔

اس لحاظ سے تہذیب و تمدن کی ترقی کو انسانی ترقی کا مرکز قرار دیا گیا
ر تہذیب کا موضوع انسانی معاشرہ مقرر کیا گیا ہے۔

□□

علامہ اقبال

قطعہ

ترے شیشہ میں مے باقی نہیں ہے — بتا: کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم — بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر — حریمِ کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے — اسے بازوئے حیدرؑ بھی عطا کر

قاضی جلیل احمد

ا ہ بدر

(گذشتہ شمارے میں حقیقت اسرائیل کے عنوان سے اس مملکت کے قیام سے لے کر آج تک کے حالات پر انتہائی اختصار کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے فلسفہ صیہونیت کی بھی اجمالاً تشریح کی گئی تھی ـــ اب آگے ملاحظہ ہو)

اسرائیل کے دفاعی اقدامات

اسرائیل کا مشہور و معروف مرد یک چشم جنرل دایان جس کی آنکھ پر پڑا ہوا پردہ اسرائیل کا ٹریڈ مارک بن گیا تھا عجیب، دبدا میں پڑا ہوا تھا ۔ عرصہ سے سوویزا اور گولان کے محاذوں سے بڑے پیمانے پر عرب فوجوں کی نقل و حرکت کی اطلاعیں آرہی تھیں ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عرب کوئی بڑی فوجی کاروائی کرنے والے ہیں لیکن دوسری طرف یہ نقل و حرکت کوئی نئی بات بھی نہ تھی ۔ گذشتہ چھ سالوں سے عرب فوجیں بڑی تعداد میں انہی مقامات پر جنگی مشقیں کرتی چلی آئی تھیں ۔ عام حالات میں دایان کو عرب فوجوں کی اس نقل و حرکت پر کسی قسم کا تردد لاحق نہ ہوتا ۔ لیکن ادھر کچھ عرصہ سے پریسیڈنٹ سادات کے بیانات بھی کچھ زیادہ ہی جنگجویانہ ہوتے چلے جا رہے تھے ۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس نے صدر کے علاوہ وزیر اعظم کا عہدہ بھی اس واضح اعلان کے ساتھ سنبھالا تھا کہ اسرائیل کے ساتھ پیش آنے والی جنگ میں حکومت کا مکمل اقتدار ایک شخص کی ذات میں محدود رہنا بہت ضروری ہے ۔ دوسری طرف سادات کی اس قسم کی حرکات اور اعلانات کوئی نئی چیز بھی نہ تھے بلکہ ان کے تواتر کی وجہ سے وہ دنیا کی ہنسی اور تمسخر کا موضوع بن گیا تھا ۔ مصر کی معاشی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی اور ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ سادات عوام کی توجہ روٹی کپڑے کے مسائل سے ہٹانے کے لئے وقتاً فوقتاً اسرائیل سے جنگ کی باتیں کیا کرتا ہے جنکی اصلیت کچھ نہیں ہوتی

۲۱ ستمبر ۷۳ء سے سوویزا اور گولان کے محاذوں پر عرب فوجوں کی نقل و حرکت میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا تھا ۔ بڑی آہستگی سے اور تھوڑا تھوڑا کر کے اندرون ملک چھاؤنیوں سے

کی یہ کاروائیاں اسرائیل کے مونٹ ہرمن آبزرویشن پوسٹ سے بخوبی دکھائی دیتی تھیں اس لئے ۲۴ ستمبر کو جب اسرائیلی جنرل اسٹاف کی میٹنگ ہوئی تو گولان سیکٹر کے اسرائیلی کمانڈر جنرل ازہاک ہوفی نے شامی فوجوں کے اس کثیر اجتماع پر دایان پر اپنی گہری تشویش کا اظہار کیا اور اسرائیلی چیف آف اسٹاف جنرل ایلازار نے بھی اس کی تائید کی۔ ان اسرائیلی جنرلوں کی تشویش کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گولان کے محاذ پر شامی اور اسرائیلی فوجوں کے درمیان ایسی کوئی قدرتی رکاوٹ نہیں تھی جیسے سینائی میں سویز کی نہر اور اردن کے محاذ پر خود دریائے اردن۔ اس لئے اندیشہ تھا کہ اگر شامی فوجیں ٹوٹ پڑیں تو بہت آسانی سے اسرائیل کی اپنی سرحدوں تک پہنچ سکتی ہیں۔ معاملہ کی سنگینی یوں اور بڑھ گئی تھی کہ سویز کے محاذ پر بھی مصری فوجوں اور آلات حرب کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

لیکن اسرائیل کے انٹیلیجنس چیف زائرا کی رائے مذکورہ جنرلوں کی رائے سے مختلف تھی۔ یہ شخص ان لوگوں میں تھا جن کی رائے یہ تھی کہ عرب قوم کی فطرت میں ایسی طبعی خامیاں اور کمزوریاں ہیں کہ جنگ کے لئے جس نظم وضبط اور ڈسپلن کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی۔ ان کی انفرادیت پسندی انہیں کسی ایک مسلک پر متحد ہونے نہیں دیتی اور وہ سب اپنی ذاتی خود غرضیوں اور قومی نفاق کے شکار ہیں۔ اس کے علاوہ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں انہیں ہر میدان میں اسرائیلی برتری کا جو سبق ملا تھا اس کے بعد اب یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ مصر، شام اور اردن ایک بار پھر متحد ہو کر اسرائیل کے خلاف صف آرا ہوں۔ ان کے لیڈروں کی تقریروں میں چاہے کیسی ہی خوں آشامیاں اور آتش افروزیاں ہوں عملاً ان سے کسی دلیرانہ اقدام کی توقع رکھنا عبث ہے۔ اس لئے جنرل زائرا کی رائے میں عرب فوجوں کے اجتماع سے کسی حملہ کا اندیشہ نہیں تھا۔

جنرل زائرا کی رائے کو اہمیت یوں حاصل تھی کہ اسی پر اسرائیلی ریزرو فوج کے طلب کئے جانے یا نہ کئے جانے کا انحصار تھا۔ اسرائیلی ریزرو فوج کی اہمیت کو جاننے کے لئے اسرائیل کی فوجی تنظیم پر سرسری نظر ڈالنی ضروری ہے۔ یہ کہنا خلاف واقعہ نہ ہوگا کہ اسرائیلی فوج کا قیام پہلے عمل میں آیا اور اسرائیلی ریاست بعد میں بنی۔ فلسطین میں برطانوی انتداب کے دوران بیشمار یہودی نوجوان جو برطانوی فوجوں میں نوکریاں کرتے تھے صیہونیوں کی غیر قانونی فوجی تنظیم ہگانہ کے ممبر بھی ہوا کرتے تھے اور پوشیدہ طور پر دوسرے یہودی نوجوانوں کو مکمل فوجی تربیت دے کر

فوجی خدمات ادا کرنے کے قابل بناتے تھے۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے بعد جب برطانوی اقتدار فلسطین سے روانگی کے لئے پر تول رہا تھا تو فلسطین میں یہودیوں کی ایک منظم اور تربیت یافتہ والنٹیرس فوج وجود میں آچکی تھی جس نے پانچ عرب ملکوں (مصر، اردن، شام، عراق اور لبنان) کی فوجوں کو شکست دے کر اپنی برتری کا لوہا منوالیا تھا۔ اور گو نہ صرف اس جنگ میں بلکہ بلا استثنیٰ ۱۹۵۶ء ہر ایک جنگ میں امریکی اسلحہ نے بھی بڑا کام کیا تھا لیکن اس حقیقت سے بہرحال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر جنگ میں لڑنے والے ہمیشہ یہودی والنٹیرس ہی ہوا کرتے ہیں۔ کسی بیرونی فوج نے آکر اسرائیل کی مدد نہیں کی تھی۔

۱۹۴۸ء کی جنگ کے بعد اسرائیلی فوجوں کی جو تنظیم نو ہوئی تھی اس میں بھی والنٹیر فورس کے قدیم طریقہ کو بحال رکھا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت اسرائیلی ریاست کی کل آبادی ہی دس بارہ لاکھ افراد پر مشتمل تھی جس میں مرد عورتیں بچے سبھی شامل تھے۔ اتنی چھوٹی آبادی کے لئے لاکھوں کی فوج رکھنا نہ مالی لحاظ سے ممکن تھا اور نہ ہی آبادی کے وسائل کے لحاظ سے۔ اس لئے ہر تندرست اور بالغ اسرائیلی کے لئے فوجی تربیت حاصل کرنا لازمی قرار دیدیا گیا۔ دو اور تین سال کی فوجی ٹریننگ کے بعد یہ نوجوان اپنے پیشوں کا انتخاب کرنے میں آزاد ہوتے تھے۔ ان میں کوئی فیکٹری کا مزدور ہوتا کوئی کارخانہ دار، کوئی کلرک، کوئی استاد، کوئی ڈاکٹر اور کوئی انجینیر لیکن ان کا نام اور عہدہ فوج کے رجسٹر میں یوں درج ہوتا جیسے وہ خود فوج میں موجود ہوں۔ چنانچہ انہیں غیر حاضر لوگوں کے ناموں کو جوڑ کر پلاٹون، بریگیڈز، رجمنٹ ڈویژن وغیرہ بنائے جاتے تھے۔ مثلاً بیس ہزار کے ایک ڈویژن میں بمشکل چند سو ریگولر فوجی ہوا کرتے تھے جن کے دم سے اس ڈویژن کا ڈھانچہ قائم رہتا تھا لیکن جوں ہی حالت جنگ قائم ہو جاتی یا کسی ایمرجنسی کا اعلان ہوتا تو یہ سارے تربیت یافتہ سیول افراد اپنے اپنے کاروبار چھوڑ کر ان یونٹوں کا رخ کرتے جس کے ممبر ہونے کا پروانہ فوجی تربیت کے بعد ہی ان کے ہاتھ میں تھما دیا جاتا تھا۔ زمانہ امن میں بھی ان لوگوں کو وقفہ وقفہ سے ریفریشر کورس کے لئے طلب کیا جاتا تھا۔

اگر اسلام کے ابتدائی عہد پر نظر ڈالی جائے کچھ اس قسم کا منظر وہاں بھی دکھائی دیتا ہے۔ ہر شخص فنون سپہ گری میں ماہر ہوتا اور بوقت ضرورت اپنی خدمات جہاد کے لئے پیش کرتا تھا۔ مہم کے اختتام پر وہ پھر سے اپنے غیر فوجی پیشے اور کاروبار میں مشغول ہو جاتا تھا۔ لڑائی کے وقت تو سردار اور سپہ سالار سبھی ہوا کرتے تھے لیکن زمانہ امن میں نہ کوئی سردار تھا اور

سپہ سالار - آج اسرائیل کے بوقت واحد پانچ عرب فوجوں کو شکست دینے پر جشن کر رہا ہے
نکھ کھول کر دیکھیں کہ عربوں کی اسی والنٹیرز فورس نے کبھی بوقت واحد قیصر روم اور کسریٰ
یران سے جنگ کر کے دونوں کو شکست فاش دی تھی - آج انہی کے نام لیوا اپنی فوجیں قیصر و کسریٰ
طرز پر مرتب کرتے ہیں جب کہ محمد عربیؐ اور خلفائے راشد کی سنت چین، ویت نام اور
اسرائیل کے حصہ میں آئی ہے -

ریزرو فوج کی طلبی اسرائیلی حکومت کے لئے یقیناً مالی زیرباری کا باعث تھی اور
س طلبی سے پہلے اچھی طرح یہ اطمینان کر لیا جاتا تھا کہ ملک کو واقعی کوئی خطرہ لاحق ہے - اور
س وقت بھی موشے دایان وزیر دفاع اور ساری کابینہ کو مل کر یہ طے کرنا تھا کہ ریزرو فوج کو طلب
یا جانا چاہیئے یا نہیں - عام حالات میں اس بات کے طے کرنے کا زیادہ تر دارومدار اس مشورہ پر
وتا ہے جو فوج اور انٹیلیجنس کے لوگ حکومت کو دیتے ہیں - لیکن اس وقت اتفاق سے فوج اور
نٹیلیجنس کی رائے میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور تصفیہ کی ذمہ داری موشے دایان اور گولڈ میر
ر کابینہ پر آپڑی تھی - چنانچہ دایان کے مشورہ پر اکثریت کی رائے سے کابینہ نے یہ طے کیا کہ فی الحال
یزرو فوج کی طلبی ضروری نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ہی موشے دایان نے دو اقدام کئے - ایک
تمام محاذوں پر فوج کو تیار باش کا حکم دے دیا گیا، دوسرا اہم قدم جو گولان کی دفاع کے مزید
ستحکام کے لئے اٹھایا گیا وہ یہ تھا کہ اندرون ملک سے ساتویں آرمرڈ بریگیڈ کو گولان کے محاذ پر
وانہ کر دیا گیا - چنانچہ اسی بریگیڈ نے کونیترا کی کامیاب دفاع میں بڑا اہم حصہ لیا - دایان کو سینائی
ی بہ نسبت گولان کی دفاع کی زیادہ فکر تھی - اس میں شک نہیں کہ مصری فوج اپنی تعداد اور
سائل کے لحاظ سے شام سے کئی گنا زیادہ تھی پھر بھی اس کی راہ میں کئی رکاوٹیں حائل تھیں مثلاً خود
سوئز، پھر بارلیو لائن، گیدی اور متلا کے درے اور سینائی کا سارا ریگستان - ان تمام
کاوٹوں کو عبور کر کے اسرائیلی سرحدوں تک پہنچنے کے لئے مصری فوجوں کو کافی وقت درکار تھا
ر اس مہلت میں اسرائیل اپنی ریزرو فوج کو بآسانی میدان میں لا سکتا تھا - لیکن ایسی
وئی رکاوٹ گولان کے محاذ پر شام اور اسرائیل کے درمیان حائل نہ تھی - اسی لئے دایان ایک
حہ کے لئے بھی گولان سے غافل نہیں رہا اور آخر تک اسی محاذ کو ترجیح حاصل رہی -

سکندر توفیق

سیرِ عالمِ بالا

(جاوید نامہ اقبال)

(اقبال کی شہرہ آفاق مثنوی "جاوید نامہ" جس میں عالم نوجوان نسل کو پیام دیا گیا ہے فارسی میں ہے اس لئے آج کی نسل کی پہنچ سے ماوراء ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ جاوید نامہ کا اردو ترجمہ کیا جائے۔ گو اس کے دو تین ترجمے ہو چکے ہیں لیکن ان میں صرف ترجمہ کا حق ادا کیا گیا ہے حالانکہ اپنے ادق اور عمیق مضامین کے باعث ضرورت اس بات کی تھی کہ Translation سے زیادہ شعری تجربہ کی تشکیل نو Reconstruction کی طرف توجہ دی جاتی۔ مترجم نے اسی نصب العین کو پیش نظر رکھ کر اس کی ترجمانی کی کوشش کی ہے۔

ذیل میں "جاوید نامہ" کے اس حصہ کی آزاد منظوم ترجمانی پیش ہے جس میں زروان مسافر کو عالم بالا کی سیر پر لے جاتی ہے۔

نوٹ: "زروان" اوستا کی رو سے روح زمان و مکان کا نام ہے)

اس کی باتوں نے بنایا روح کو میری شکار
یک بہ یک مشرق کے اور مغرب کے بیچوں بیچ میں
اک فرشتہ اس گھرے بادل سے یوں ظاہر ہوا
جو دھواں تھا، رات سے بڑھ کر سیاہ تاریک تھا
آنکھ بائیں خواب میں ڈوبی ہوئی اور بند تھی
اس کے پر سارے کے سارے رنگیں رنگ تھے پیدا سبھی
تھا مزاج اس کا تنک جیسے خیال برق گام
لحظہ لحظہ آرزو بدلی ہوئی، ہر دم نئی

ذرہ ذرہ ذات کا پارہ صفت تھا بیقرار
ابر روشن تھک گیا آ کر ہوا کے بیچ میں
رخ تھے دو چہرے کے اس کے اک دھواں اک آگ تھا
اور رخ روشن پہ تارہ آ گیا نزدیک تھا
آنکھ دائیں تاب افزا جاگ اور چوبند تھی
نیلے نیلے، پیلے پیلے، اودے اودے نقرئی
ایک دم میں تھا زمیں پہ تا فلک اس کا خرام
اک نئے ماحول میں ہر شاخ پہ طیران تھی

"بیت ثمین" 2-2-1108/2 تلک نگر - حیدرآباد 500044

یہ کہا اس نے کہ نور دانم رکھا ہے میرا نام — ہوں نہاں پل میں عیاں پل میں کبھی پیش اوام
ہے تسلط مجھ کو حاصل آب و باد و خاک پر — ہے گزر میرا بآسانی ادھر افلاک پر
سارے تدبیر و عمل جو بھی ہیں زیر آسماں — تار ہے تقدیر سے میری بندھا ان کا نہاں
چاہے انساں ہوں کہ حیواں یا جمادات و نبات — صید بن جاتی ہے میرے تیر کا ہر ایک ذات
پھول ٹہنی پر کھلا تو میں رہا غنچہ کا چاک — نالہ بلبل میں ہے میری نوا کا اشتراک
دانہ کوشش سے مری ہو جائے اک تازہ نہال — میری کاوش سے بدل کر ہجر بنتا ہے وصال
میں کبھی غصہ ہوں ظاہر اور کبھی چمکار بھی — تشنگی کرتا ہوں پیدا تا کہ جام آب دوں
زندگی میں، موت میں، میں ہوں قیامت میں نشور — میں ہوں پرستش میں بھی دوزخ میں بھی لعنت میں بھی
کیا فرشتہ، آدمی کیا، سب ہیں دامن سے بندھے — سارے شش روزہ مظاہر شکل فرزند میں مجھے
پھول تو نے شاخ سے جو بھی چنا میں ہی تو ہوں — اصل ہر اک چیز کی ہوں تجھ سے اب کیا کیا کہوں
میرے سحر زندہ میں ہو کر رہے ہیں سب اسیر — پھونک میری دقت ہے کر دے جوانوں کو جو پیر
لی مع اللہ ہے مگر جس دل کی دھڑکن کی صدا — پھر وہی دل سحر کامل ریزہ ریزہ کر گیا
تیری خواہش ہے اگر حائل نہ ہوں میں درمیاں — لی مع اللہ پڑھ خلوص دل سے بے حد بیاں
کہہ کے یہ، میری طرف اس نے نظر ڈالی عجیب — وہ نظر جس سے جہان آشنا بھی ہو قریب
اور ہی عالم میں تھا میں ورود حسب مسعود — یا اسی دنیا کو حاصل اک نیا رنگ وجود
کائنات رنگ و بو میں میری قسمت انتقال — شور سے آزاد عالم میں ہوں میں مثل خیال
میرا رشتہ اس جہان کہنہ سے توڑا گیا — اک نئی دنیا سے اس کو دفعتاً جوڑا گیا
گم شدہ دنیا کے غم سے جان پر تھی آ بنی — ڈھل گئی اک تازہ عالم میں یہ میری ہستی
جسم میرا بے وزن ہونے لگا، جاں تیز گام — اور بصیرت تیز تر، بیدار تر، عدسہ نظام

سب حجابات نظر اٹھنے لگے، جلوہ کھلا
نغمہ انجم میرے کانوں میں پھر آنے لگا

عائشہ یوسف الدین رباب

تصور کی پرچھائیاں

میں نے محسوس کیا آپ مرے پاس ہی تھے
ورنہ تھی کس کی مدارات کہ سب ساتھ ہی تھے

میری آنکھوں میں تھا اشکوں کا تبسم کیسا؟
اور فضاؤں میں تھا نغموں کا ترنم کیسا؟

کس کی طاعت میں تھے اپنے کو سنبھالے بادل؟
تھم گئے تھے، نہ برستے تھے وہ کالے بادل

نم ہوائیں پرُ تعظیم چلی آتی تھیں
نرم ہریالیاں تسلیم بجا لاتی تھیں

کھلکھلاتے ہوئے تھے دوڑتے جاتے نالے
کس پہ سو جان سے بلہار تھے وہ متوالے

بجلیاں سہمی رہیں کس کی تھی وہ شان جلال
پھول قربان ہوئے کس کی تھی وہ شان جمال

رقت اشجار پر اور کیف مری آنکھوں میں
عرق آلود میں کیوں کر ہوئی برساتوں میں

کون کہتا ہے؟ میں تنہا تھی بہت دور تھے تم
میرے مسجود! مری روح میں مستور تھے تم

۱۱-۵-۱۵۲/۱/۷ - ریڈ ہلز - حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۴

غزلیں

پرنس سعادت سجاد بہادر

تھرائی ہوئی دل میں عجب طرح کی رو تھی — جب غور سے دیکھا تو کوئی شمع کی لو تھی
چہرے سے نقاب اس نے اٹھائی تو یہ دیکھا — آہستہ افق پر کوئی پھیلتی ہوئی پو تھی
اللہ کرے پھر وہ لب تازہ بہم ہوں — کیا رات تھی کیا بات تھی کیا حسرت نو تھی
سج دھج کے بہار آئی ہے گلزار میں اب کے — نوخیز عروسان چمن کھیلیں تو جو تھی
اے عمر سبک سیر یہ کیا تھا نظارہ — کیا جانیے کیا چیز تھی ظلمت تھی کہ ضو تھی
سستائی تو سستائی وہ منزل پہ پہنچ کر — اک عمر کی اللہ ری کیا کیا تگ و دو تھی
در آتے ہی ہنگامۂ ہستی میں سعادت — اک پشت سے آتی ہوئی آواز پہ رو تھی

○

رشید کیفی

شوق دل آج بھی ہے، ذوق نظر آج بھی ہے — دیدہ و دل پہ وہی قید نظر آج بھی ہے
روز روشن پہ مسلط ہے سیاہی اب بھی — شب تاریک سے محجوب سحر آج بھی ہے
ہر ملمع ہے حریف زر خالص اب بھی — ہر خزف ریزے کو دعوائے گہر آج بھی ہے
ذوق خام آج بھی ہے پختگی فن کی دلیل — عیب کے سامنے شرمندہ ہنر آج بھی ہے
حامل تابش صد طور ہے ذروں کا جمال — منفعل جلوۂ خورشید و قمر آج بھی ہے
چل دیئے اہل خرد اپنا بچا کر دامن — ایک دیوانہ مگر خاک بسر آج بھی ہے

اسی ظلمت سے کرے نور جو پیدا کیفی
اپنی نظروں میں وہ تابندہ نظر آج بھی ہے

کاسۂ طلب

رعنا حیدری

خوشا نصیب میں اس سرزمیں پہ آئی ہوں
جہاں سنا ہے دعائیں قبول ہوتی ہیں
کھلے ہوئے ہیں اجابت کے در یہ قسمت ہے
یہ غم نہیں ہے کہ دامن دریدہ ہیں ہم لوگ
مگر یہ سوچتی ہوں کونسی دعا مانگوں
کہاں سے لاؤں وہ الفاظ جن کے سہارے سے
سکونِ قلب ملے ذہن بھی معطر ہو
یہاں پہنچ کے مگر یہ خیال آیا ہے
دعا کے واسطے جذبوں کا واسطہ ہے بہت
پھر ایک بار یہ کہتی ہوں سر جھکائے ہوئے
زہے نصیب کہ پھر وا ہوئے ہیں بابِ عطا
خدا کا واسطہ اے ہستی بلند مقام
مجھے عطا ہو مرے جسم و جاں کی تابانی
مرے لہو کی ضمانت ملے یہاں مجھ کو

مرا لہو جو امانت ہے میرے بچوں کی
کہ جن کے واسطے کیا کیا نہ دکھ سہے میں نے
شفیق و نرم سہارے بھی تج دئیے میں نے
ریاضتوں کی کڑی دھوپ بھی سہی میں نے
مجھے یقین ہے اے حاملِ بلند مقام
مجھے ملے گی ضمانت مرے لہو کی بھی
جان و دل کی بھی
مرا لہو مرے بچوں کے جسم میں ہے رواں
جہاں جہاں بھی بہا ہے وہ خون میرا ہے
جہاں جہاں بھی کٹا ہے وہ جسم میرا ہے
مرے یہ دستِ دعا کاسۂ طلب ہیں ابھی
خدا کا واسطہ اے ہستی بلند مقام
مرے لہو کی ضمانت ملے مجھے اب تو

شعبۂ اردو، مولانا آزاد کالج ۔ اورنگ آباد

قطعہ سعدی

مع ترجمہ رشید انصاری

گِلِ خوشبوئے در حمام روزے
رسید از دستِ محبوبے بدستم

بپرسیدم کہ "مشکی یا عبیری؟"
کہ از بوئے دل آویز تو مستم"

بگفتا "من گلِ ناچیز بودم
ولیکن مدتے با گل نشستم"

جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم"

مرے حمام میں اک روز عطر آمیز مٹی تھی
مرے محبوب کے ہاتھوں سے میرے ہاتھ آئی تھی

کہا میں نے یہ مٹی سے کہ "تو ہے مشک یا عنبر؟"
مشامِ جاں معطر ہے تری خوشبو سے سرتاسر"

جھکا کر سر کہا اس نے کہ "میں ناچیز مٹی ہوں"
مگر یہ سچ ہے گل کے ساتھ عرصہ تک میں بیٹھی ہوں"

تقاضا تھا جمالِ ہم نشیں کا میں اثر لے لوں
وگرنہ میں وہی مٹی جو پہلے تھی سو اب بھی ہوں

رباعی خیام

مع ترجمہ رشید انصاری

بعضے، بہ تماشائے خط و خال خوش اند
بعضے، بہ تمنائے زر و مال خوش اند
ایں ہا ہمہ اسباب پریشانی ہاست
خوش اند کسانے کہ بہر حال خوش اند

کچھ لوگ تماشائے خط و خال میں خوش ہیں
کچھ لوگ تمنائے زر و مال میں خوش ہیں
لیکن یہ سب اسباب پریشانی و غم ہیں
خوش ہیں یہی جو لوگ کہ ہر حال میں خوش ہیں

غزل اکبر الہ آبادی

مترجم فارسی
از فاطمہ ضابطہ پرویں

وہ رشکِ گل نہ ہوا ہم سے ہمکنار افسوس
بہارِ عمر، خزاں ہو گئی ہزار افسوس

بہت پسند ترا رنگ ہے مجھے، لیکن
بقا نہیں ہے تجھے اے موسمِ بہار افسوس

کسی نے بزم میں سمجھا نہ باعثِ گریہ
تمام رات رہی شمع اشکبار افسوس

طریقِ عشق میں، ہادی و رہنما اکبر
جو ایک دل بھی ملا ہے وہ بیقرار افسوس

نہ گشت رشکِ گل، ماہ ہمکنار افسوس
بہارِ عمر خزاں گشت، صد ہزار افسوس

پسند گشت مرا رنگ تو بسے، لیکن
نہ داری ہیچ بقا، موسمِ بہار! افسوس

نہ کرد، درک کسے، وجہ گریہ در محفل
بماند تا سحر، شمع اشکبار افسوس

براہِ عشق تو، ہادی و رہنما اکبر
ولے کہ یافتم آں ہست، بیقرار افسوس

غالب

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے

ترجمہ پرویں

مرا ببنگر، اگر تو دیدۂ عبرت نظر داری
شنو ایں حرفِ من، تو گوشِ حق شنوا اگر داری

لا اعلم

گفتم، "روم، کہ شمّت مائلِ بخوابِ ناز است"
بکشاد زلف و گفتا "بنشیں کہ شب دراز است"

ترجمہ پرویں

"تری آنکھیں ہیں خواب آلود اب جاتا ہوں" میں بولا
کہا زلفوں کو بکھرا کر "بڑی ہے رات ابھی مت جا"

غزلیات

غزل

مجھ پر خدا کے احد یہ انعام دیکھنا
توبہ کے ساتھ آنے لگے جام دیکھنا

وہ جلوہ گر ہیں پھر سے لب بام دیکھنا
کس کو ملے گا موت کا پیغام دیکھنا

پہلے کسی کے درد کو اپنانا شرط ہے
پھر کتنا دل کو ملتا ہے آرام دیکھنا

بے وقت ہائے کس کے یہ گیسو بکھر گئے
کیوں تیز گام چلنے لگی شام دیکھنا

دیکھا جو میں نے حادثے تھرا کے رہ گئے
گھبرا رہی ہے گردش ایام دیکھنا

خوبی ہے غزل کی رونق تحریر ہو گئی
کاوش لکھا ہے اس پہ ترا نام دیکھنا

غوث محی الدین کاوش
ڈینٹسٹ ۔ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

مقبول احمد مقبول
سیتارام پیٹھ حیدرآباد

وہ نگاہوں سے جب پلاتے ہیں
بے خودی کو قریب پاتے ہیں

پی کے آنکھوں سے مئے تری ساقی
غم زمانے کے بھول جاتے ہیں

قابل فخر ہیں وہی انساں
جو مصیبت میں کام آتے ہیں

راز الفت کا ہے یہی شاید
وہ جو میرے قریب آتے ہیں

درد الفت کا جام پینے دو
آنکھ سے آنکھ کیوں چراتے ہیں

رونے دھونے سے کچھ نہیں حاصل
غم کے لمحے گزر ہی جاتے ہیں

رہ کے ہم بے خبر زمانے سے
ہر قدم پر فریب کھاتے ہیں

دوستی کر کے دیکھئے ہم سے
دوستی کیسے ہم نبھاتے ہیں

حوصلہ ہے یہ آپ کا مقبول
چوٹ کھاتے ہیں مسکراتے ہیں

قیامِ آندھرا پردیش

دلوں پہ نقش ہے یکم نومبر عیسوی چھپن — اسی دن سامنے سب دیکھ کے آیا آندھرا کا تن
اسی دن زندگی میں اک نیا سورج چمک اٹھا — اسی دن باغ سارا لہلہایا اور مہک اٹھا
اسی دن جام و صہبا دور میں بے ساختہ آئے — اسی دن میکشوں نے بے خودی کے حوصلے پائے
اسی دن سرفروشوں کی نگاہیں مسکرائی تھیں — اسی دن دل کے ایوانوں میں شمعیں جگمگائی تھیں
اسی دن اصل میں خونِ شہیداں رنگ لایا تھا — اسی دن خواب کا عالم حقیقت بن کے آیا تھا
اسی تاریخ بھائی چارگی کا جوش دیکھا تھا — اسی تاریخ دیوانوں میں کتنا جوش دیکھا تھا
اسی تاریخ ذکرِ اتحادِ حال ہوتا ہے — اسی تاریخ جشنِ آرزو ہر سال ہوتا ہے

یہی دن ہند کی تاریخ سے مٹنا نہ جائے گا
یہی دن اک نئی صبحِ درخشاں لے کے آئیگا

اسحاق ملک

اسحاق ملک

نقیبِ زمانہ - غالب

بلبلِ نغمہ سنج، روحِ چمن — فخرِ ادوار، آفتابِ سخن
فطرتِ آسمان خمیرِ زمیں — خاتمِ دل کا زرنگار نگیں
نکتہ رس، واقفِ زبان و مکاں — خود زباں چومتی ہے تیری زباں
ٹوٹتے ہیں علوم کے کس بل — فکر تیری ہے پھر بھی لاینحل
ہر زمانے کا ہر صدی کا نقیب — دوست تو دوست، معترف ہیں رقیب
تیری قسمت نے یاوری کی ہے — مفلسی میں شہنشہی کی ہے
تنگ دستی میں بے نوا نہ ہوا — قدرِ منت کشِ دوا نہ ہوا
جانتا تھا ثوابِ طاعت و زہد — رندِ بدمست تھا، نہیں عابد
ذکرِ ماضی پہ مسکراتا تھا — حالِ دل پہ ہنسی اڑاتا تھا
خوگرِ رنج و غم رہا ہر آں — مشکلیں اپنی کر گیا آساں
شاعرِ بے مثال، نقشِ قلوب — تو ہی غالب تھا، کل جہاں مغلوب

دلاور فگار

پیاز کا بحران

نہ ڈرامہ کا فلم کا بحران　　نہ کتاب اور قلم کا بحران
نہ کرسی، نہ نوٹ کا بحران　　نہ الیکشن نہ ووٹ کا بحران
نہ مکین و مکان کا بحران　　نہ حسین و جوان کا بحران
نہ متاع و معاش کا بحران　　نہ جگہ کی تلاش کا بحران
نہ چمن میں بہار کا بحران　　نہ شب انتظار کا بحران
نہ سیاست کی حالت نازک　　نہ قیادت کی ساعت نازک
جا چکے یہ کرائسس کب کے　　ایک بحران اور ہے اب کے
آج ہے میری نظم کا عنوان　　دور حاضر میں پیاز کا بحران
پڑ گیا قحط مہ جمالوں کا　　رنگ پیازی ہوا ہے گالوں کا
عشق میں حال یہ ہوا دل کا　　جیسے ہوتا ہے پیاز کا چھلکا
دس روپے سیر مل رہا ہے پیاز　　میرے بحران، تیری عمر دراز
تھی جو رخصت کی اس کو بھی جلدی　　مرچ بھی ہم کو چھوڑ کے چل دی
ہو گیا جب فراق بھی احسن　　چل نہ دے ہم کو چھوڑ کے لہسن
پیاز دس روپے میں ایک کلو　　میاں بحران یوں نہ ہم سے ملو
اذن ملتے ہی سبز جھنڈی سے　　پیاز رخصت ہوا ہے منڈی سے
گھی کو خوشبو سے پیاز بھی نہ رہا　　دال میں وہ بگھار بھی نہ رہا
آملیٹ میں بھی وہ مزا نہ رہا　　کوئی سرکہ کا ہمنوا نہ رہا
ہو گیا چاک انڈے کا سینہ　　خاک میں مل گیا ہے خاگینہ
بوڑھا لگتا ہے پیاز کا طالب　　"مضمحل ہو گئے قویٰ غالب"
کوئی صحت نواز بھی نہ رہا　　کیا بگھاریں کہ پیاز بھی نہ رہا
نفس کو بس بگھارتے ہیں ہم　　صرف شیخی بگھارتے ہیں ہم

(اقرار کلکتہ سے ماخوذ)

علی صاحب میاں

چوٹے

①

لمی تری املی کے بوٹاں لگ گئے انجیر کو
یا گلہری بندہ دئے ہیں بھینس کی زنجیر کو
شاعراں اب بول رئیں نئے[1] تو ترقی کی شاعری
ایک مصرعہ تیر کو تو ایک مصرعہ میر کو

[1] جدید

②

دغل بازی[1]، ظلم کو کاں چلے گئے روکنے والے
کدر[2] چھپ گئے مصیبت کے وخت[3] میں ٹوکنے والے
فقط[4] تقریراں جھاڑ گئے کر گئے جھوٹے سب دوست
یہ مسلہ[5] ہے پرانا کاٹتے نئیں بھونکنے والے

[1] دغابازی [2] کدھر [3] وقت
[4] فقط [5] ضرب المثل

③

سیاست میں گھس کر حماقت[1] کرے نا
ہمیں[2] زندگی اپنی غارت کرے نا
الیکشن میں جس جس کو کھاندا[3] دیے تھے
انوں[4] خود ہماری حجامت کرے نا

[1] حماقت [2] ہم
[3] کاندھا [4] وہ

④

ہم اپنے غم کی کبھی داستاں سنا نہ سکے
غضب ہے تجھ کو کبھی باغباں بتا نہ سکے
ہمارے خون سے سینچا گیا چمن لیکن
ہم اس چمن میں کہ شیں بنا نہ سکے

عربی کے سبق

فعل VERB

فعل وہ لفظ ہے جس سے کام کا کرنا یا ہونا ظاہر ہو ۔
عربی میں فعل " مادہ " سے بناتے ہیں ۔ مادہ کے اصلی حروف کم سے کم تین
وتے ہیں ۔ ایسے تمام افعال جو تین حرفی مادوں سے بنتے ہیں افعال ثلاثی کہلاتے ہیں ۔
مادہ پر اس کی اصلی حالت میں کوئی اعراب (زبر، زیر، پیش) نہیں ہوتے
ور ہر مادہ کے اپنے خاص معنی ہوتے ہیں جیسے سمع (سننا) فتح (کھولنا) کرم (بزرگ ہونا)
جب مادہ پر اعراب لگاتے ہیں تو وہ زمانہ ماضی میں واحد مذکر غائب کا صیغہ
ن جاتا ہے جیسے

سمع	(سننا)	سَمِعَ	(اس نے سنا)
فتح	(کھولنا)	فَتَحَ	(اس نے کھولا)
کرم	(بزرگ ہونا)	كَرُمَ	(وہ بزرگ ہوا)

فعل ماضی PAST TENSE

ایسا فعل جس میں کسی کام کا گذرے ہوئے زمانے میں ہونا پایا جائے ـــ
فعل ماضی کہلاتا ہے جیسے جَلَسَ (وہ بیٹھا) اَكَلَ (وہ کھایا) لَعِبَ (وہ کھیلا)
فعل ماضی کا پہلا صیغہ یعنی واحد مذکر غائب بنانے کے لئے مادہ کے پہلے
ور آخری حرف پر (ـَـ) لگاتے ہیں ۔ درمیانی حرف پر زیر، زبر، پیش تینوں میں سے کوئی
رکت آسکتی ہے جیسے شَرِبَ (پیا) حَفِظَ (یاد کیا) عَبَرَ (پار کیا)
شَكَرَ (شکر ادا کیا) قَرُبَ (قریب ہوا) بَعُدَ (دور ہوا)
فعل ماضی کے صیغہ واحد مذکر غائب کو جڑ سمجھنا چاہیئے کہ اسی کے آخر میں تبدیلی

اضافہ کر کے دوسرے صیغے بنائے جاتے ہیں۔

فعل کی مختلف حیثیتوں کے پیش نظر فعل ماضی اور دوسرے فعلوں کے چودہ (۱۴) صیغے بتفصیل ذیل آسکتے ہیں:

غائب مذکر (واحد تثنیہ جمع) تین صیغے + حاضر مذکر (واحد تثنیہ جمع) تین صیغے + واحد متکلم (مذکر و مؤنث) ایک صیغہ

غائب مؤنث (" ") " " + " مؤنث (") " + تثنیہ جمع متکلم (") "

گردان فعل ماضی معروف

	صیغہ	مذکر	مؤنث
غائب	واحد	فَعَلَ اس نے کیا	فَعَلَتْ (فَعَلَ+تْ) اس ایک عورت نے کیا
	تثنیہ	فَعَلَا (فَعَلَ+ا) ان دونوں نے کیا	فَعَلَتَا (فَعَلَ+تَا) ان دو عورتوں نے کیا
	جمع	فَعَلُوْا (فَعَلُ+وْا) ان سب نے کیا	فَعَلْنَ (فَعَلْ+نَ) ان سب عورتوں نے کیا
حاضر (مخاطب)	واحد	فَعَلْتَ (فَعَلْ+تَ) تم نے کیا	فَعَلْتِ (فَعَلْ+تِ) تم نے کیا
	تثنیہ	فَعَلْتُمَا (فَعَلْ+تُمَا) تم دونوں نے کیا	فَعَلْتُمَا (فَعَلْ+تُمَا) تم دو عورتوں نے کیا
	جمع	فَعَلْتُمْ (فَعَلْ+تُمْ) تم سب نے کیا	فَعَلْتُنَّ (فَعَلْ+تُنَّ) تم سب عورتوں نے کیا
متکلم	واحد	فَعَلْتُ (فَعَلْ+تُ)	میں نے کیا (مذکر و مؤنث)
	تثنیہ جمع	فَعَلْنَا (فَعَلْ+نَا)	ہم دونوں نے کیا / ہم سب نے کیا } (مذکر و مؤنث)

اَلْوَلَدُ لَعِبَ (لڑکا کھیلا) — اَلْبِنْتُ کَتَبَتْ (لڑکی نے لکھا)

اَلْوَلَدَانِ لَعِبَا (دونوں لڑکے کھیلے) — اَلْبِنْتَانِ کَتَبَتَا (دونوں لڑکیوں نے لکھا)

اَلْاَوْلَادُ لَعِبُوْا (سب لڑکے کھیلے) — اَلْبَنَاتُ کَتَبْنَ (سب لڑکیوں نے لکھا)

اَنْتَ جَلَسْتَ (تو بیٹھا) — اَنْتِ شَرِبْتِ (تو نے پیا)

اَنْتُمَا جَلَسْتُمَا (تم دونوں بیٹھے) — اَنْتُمَا شَرِبْتُمَا (تم دونوں نے پیا)

اَنْتُمْ جَلَسْتُمْ (تم سب بیٹھے) — اَنْتُنَّ شَرِبْتُنَّ (تم سب نے پیا)

اَکَلْتُ میں (مذکر و مؤنث) نے کھایا

اَکَلْنَا ہم دونوں (مذکر و مؤنث) نے کھایا ہم سب (مذکر و مؤنث) نے کھایا

اَلْوَلَدُ خَرَجَ مِنَ الْبَیْتِ ذَھَبَ اِلَی الْمَدْرَسَۃِ جَلَسَ فِی الصَّفِّ
وَقَرَأَ وَکَتَبَ ثُمَّ رَجَعَ اِلَی الْبَیْتِ

(لڑکا گھر سے نکلا، مدرسہ (کو) گیا، جماعت میں بیٹھا اور پڑھا لکھا پھر گھر کی طرف واپس ہو گیا)

أَکُلُّ وَلَدٍ قَرَأَ ؟ (کیا ہر لڑکے نے پڑھا) نَعَمْ ، کُلُّ وَلَدٍ قَرَأَ وَکَتَبَ (ہاں ، ہر لڑکے نے پڑھا اور لکھا)

مَنْ جَلَسَ ھٰھُنَا ؟ (یہاں کون بیٹھا) وَمَنْ ذَھَبَ ھُنَاکَ ؟ (اور وہاں کون گیا)

اَلْاُسْتَاذُ کَتَبَ بِقَلَمِ الْحِبْرِ (استاد نے فونٹن پن سے لکھا)

ھٰذَا الْوَلَدُ کَتَبَ بِقَلَمِ الرَّصَاصِ (اس لڑکے نے پنسل سے لکھا)

مَنْ کَتَبَ فِی ھٰذِہِ الْکُرَّاسَۃِ الْجَدِیْدَۃِ ؟ (اس نئی کاپی میں کس نے لکھا ؟)

مَتٰی رَجَعَ الْوَلَدُ مِنَ الْمَدْرَسَۃِ ؟ (لڑکا مدرسے سے کب واپس ہوا) لِمَنْ ھٰذِہِ الْعَرَبَۃُ ؟
(یہ گاڑی کس کی ہے ؟) مَنْ جَلَسَ فِیْھَا ؟ (اس میں کون بیٹھا ؟)

مَاذَا فَعَلْتَ فِی الْمَدْرَسَۃِ ؟ (تو نے مدرسے میں کیا کیا) قَرَأْتُ وَکَتَبْتُ (میں نے پڑھا اور لکھا)

أَکَلْتَ الْبُرْتُقَالَ (تو نے سنترہ کھایا) شَرِبْتُ اللَّبَنَ (میں نے دودھ پیا) شَرِبْتَ الشَّاءَ (تو نے چائے پی)

ھَلْ بَدَأْتُمُ الْعَرَبِیَّۃَ ؟ (کیا تم (سب) نے عربی شروع کی ؟) نعم ! بدأنا العربی (ہاں ہم نے عربی شروع کی)

افھمتم درس الامس ؟ (کیا تم (سب) نے کل کا سبق سمجھا ؟) ھَلِ التَّلَامِیْذُ فَرِحُوْا بِالْاُسْتَاذِ ؟ (کیا سب شاگرد استاد سے خوش ہیں ؟)

نَھَضَ التَّلَامِیْذُ لِلْاُسْتَاذِ ، ھُمْ بَدَءُوْا الدَّرْسَ وَفَھِمُوْا جَیِّدًا —
(لڑکے استاد کے لئے اٹھے ، انھوں نے سبق شروع کیا اور اچھی طرح سمجھا)

(باقی آئندہ)

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا! آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اقبال

تبصرہ

نام کتاب — شبنم کے موتی
مصنف — غنی غازی
مطبوعہ — ورما آفسیٹ پریس بمبئی
قیمت — چھ روپے

"شبنم کے موتی" بچوں کے لئے لکھی گئی دس کہانیوں کا ایک مجموعہ ہے جسے صبح امید پبلیکیشنز بمبئی نے مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی کے مالی اشتراک سے شائع کیا ہے۔ اردو اکیڈیمی مہاراشٹرا جو متعدد اچھے کام اردو کے فروغ کے لئے کر رہی ہے ان میں سے ایک مستحسن اور قابل قدر اقدام بچوں کے ادب کی اشاعت کی حوصلہ افزائی ہے جس کے بڑے دوررس نتائج مترتب ہوں گے۔ غنی غازی ایک نوجوان قلمکار جو درس وتدریس سے منسلک ہیں، مدرسہ کے باہر بھی کم عمر طالب علموں کی تربیت کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس مختصر مجموعہ میں ان کی تمام کہانیاں نہایت دل نشیں انداز سے کسی نہ کسی اچھی خصلت کو بچوں کے ذہن پر مرتسم کرتی ہیں۔ بچوں کے لئے لکھنا آسان نہیں ہے۔ غنی غازی اس میدان کے نئے شہسوار ہیں لیکن ان کے قدم لڑکھڑانے کی بجائے ایک غازی کی شان سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ "حسن سلوک" میں بڑے موثر انداز میں بتاتے ہیں کہ مصیبت میں اپنے دشمن کا بھی ساتھ دینا چاہیئے، چاہے اپنی جان ہی خطرہ میں پڑ جائے۔ "ماں کی نصیحت" اگر اپنے بچے کی اصلاح کا سبب بنتی ہے تو وہیں ماں کی خاموشی بچے کو تباہی کے راستہ پر ڈال دیتی ہے۔ "کالا شیر" میں شوبھا کی حاضر دماغی، "ذہین بڑھیا" کی عوام دوستی، "گینڈا اور چڑیا" میں چڑیا کی ہمدردی اور انصاف پسندی، "زہریلا ناگ" میں بندر کی ہوشیاری، "عقلمند وزیر" کی اصلاحی ترکیب اور "صبر کا پھل" کا میٹھا انجام بتاتے ہیں اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ غنی غازی بچوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف ہیں اور نہایت موثر و دلپذیر انداز سے کہانی لکھنے پر قادر ہیں۔

"وہ کون ہے" میں جس انداز سے تجسس اور دلچسپی کو قائم رکھا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس مختصر مجموعہ کو دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ غنی غازی کا اسلوب نگارش اور نکھرے گا۔ وہ اپنی کامیاب تحریری کاوشوں کے پرچم لہراتے ہوئے خوب سے خوب تر کی طرف اپنا سفر جاری رکھیں گے۔

شکیل اعجاز کا بنایا ہوا کتاب کا سرورق نہایت خوبصورت اور سادگی و پرکاری کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ ان کا بنایا ہوا غنی غازی کا اسکیچ بھی غازی کے اندرونی عزم اور اپنے آپ پر اعتماد کو اجاگر کرتا ہے لیکن کتابت اور طباعت میں وہ احتیاط و توجہ نہیں برتی گئی جس کی بچوں کی کتاب مستحق ہوتی ہے۔ کاتب صاحب نے صفحہ ۴۱ پر "زہریلے ناگ" اور "کالے بچھو" کی بجائے "زہریلی ناگ" اور "کالی بچھو" لکھ دیا ہے نیز "ڈس رہے ہیں" کی بجائے "ڈنس رہے ہیں" لکھ دیا ہے۔ بچوں کی کتاب میں ایسی فروگذاشت دور رس نتائج پیدا کر سکتی ہے نیز کئی صفحات برابر سیٹ نہیں کئے گئے ہیں۔ کہیں کہیں متن کے الفاظ سیون میں آگئے یا کٹ گئے ہیں۔ کاغذ بھی اعلیٰ درجہ کا نہیں ہے۔ بچوں کا ادب ہونے کا لحاظ کرتے قیمت بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے اس قیمت میں کتاب اعلیٰ درجہ کے کاغذ پر خوبصورت آفسیٹ پرنٹنگ میں بچوں کو ایک دلکش تحفہ کے طور پر پیش کی جاتی تو اچھا ہوتا۔ موجودہ لباس میں بھی "شبنم کے موتی" اپنی آبداری اور تابناکی سے بچوں کے ماحول کو روشن کرنے میں اپنا حصہ ادا کریں گے۔ امید یقین ہے کہ بچوں کے ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ثابت ہوں گے

▭▭

نام کتاب "لمحوں کی حرکت" ناشر سہیل احمد خاں
مصنف طفیل سیماب اکولہ
صفحات ۸۰ ڈیمی سائز قیمت سات روپے
یہ کتاب مہاراشٹرا اردو اکیڈمی کے جزوی مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے

مختصر افسانہ لکھنا اگر فن ہے تو مختصر مختصر افسانہ یا منی افسانہ فن لطیفہ ہے جس کے لکھنے کے لئے باریک بینی اور پتہ ماری ضروری ہے۔ اردو میں اس کو "منی کہانی" بھی کہہ سکتے ہیں۔ مثنوی کے مقابلہ میں غزل کا ایک شعر یا رباعی کے چار مصرعے زیادہ محنت چاہتے ہیں اسی طرح مختصر مختصر افسانہ بھی زیادہ باریک بینی، زیادہ توجہ اور زیادہ تراش خراش طلب ہوتا ہے کیونکہ کم الفاظ میں اہم تاثرات کی ترسیل کرنی ہوتی ہے۔

طفیل سیماب کی تصنیف "لمحوں کی حرکت" اس صنف کی شاید پہلی کتاب ہے جو شائع ہو سکی ہے ویسے شمع اور دوسرے رسالوں میں اس قسم کے افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں۔

ہماری نئی نسل کو اس کتاب میں شائع ہوئے سہ خیال کے دھندلے ہوئے شعر کی مناسبت سے جلتی راہوں کے مسافر کہنا بالکل مناسب ہے جو غیر یقینی مستقبل کی وجہ انتشار بے چینی، بے کاری، بےحسی، بے خوابی، بے راہ روی کی شکار ہے۔ ایسے ہی جذبات ان ہی افسانوں میں سامنے آتے ہیں۔ اس کو دور کرنا اور نئے مصنفوں کی اچھی رہبری کرنا ہمارے اساتذہ کی ذمہ داری ہے ورنہ پتہ نہیں یہ کاروان جس کا کوئی رہنما نہیں ہے کہاں جا پہنچے گا۔ افسانہ نگار آج کی دنیا کے اس انتشار سے بخوبی واقف ہے۔ اپنے خود بھی اس راہ میں لڑکھڑا کر ابھی سنبھلنے کی کوشش کر رہا ہے ساتھ ہی چاہتا ہے کہ دوسرے اس راہ میں گر سنبھل نہ پائیں اسی لئے وہ بہت کچھ کہنا چاہتا ہے، سنانا چاہتا ہے، سکھانا چاہتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس مصروف زمانے میں یہ مختصر کہانی لوگوں کو زیادہ متوجہ کر سکے گی۔ لیکن آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک کے مطابق ان افسانوں میں آہوں کا اثر ہونا چاہیئے جبھی وہ پڑھنے والوں کی مصروف زندگی میں لمحہ اثر پیدا کر سکتی ہے اس کے لئے الفاظ کو زیادہ متنوع، زیادہ بہتر اور زیادہ پہلودار اور نوک دار ہونا چاہیئے جو تجربہ کے ساتھ علم و مطالعہ کی وسعت سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ مخدوم کا ایک شعر ہے جس میں ایک مسافر سے

سحر کے تعاقب میں گرتا ابھرتا چلا جا رہا ہے

سیماب کے افسانوں سے یہی تاثر پیدا ہو رہا ہے اور ہمارا ان سے یہی کہنا ہے بقول فیضی۔ ع

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

"امکان" (سہ ماہی)   ناشر۔ مہاراشٹرا اردو اکاڈمی

"امکان" مہاراشٹرا اردو اکیڈمی کا سہ ماہی جریدہ ہے جو گورنمنٹ پریس ممبئی سے چھپتا ہے اور دفتر اکیڈمی ایڈمنسٹریٹیو بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۲۲ سے شائع ہوتا ہے۔

سرپرست ڈاکٹر اے آر منشی، نگران اعلیٰ ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور (آئی اے ایس) مدیر ہیں۔ مجلس ادارت میں سلمیٰ صدیقی، ڈاکٹر عبدالستار دلوی اور عبدالسمیع بوہرے شامل ہیں۔ مددگار مدیر شاہد ندیم، کتابت کے ذمہ دار محمد اسلم کرتپوری اور سرورق حمید حسین کا تیار کردہ ہے جو ہر شمارہ میں تبدیل ہوتا ہے۔ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ "امکان" کو دیکھ کر آنکھیں روشن اور دل شاد ہو جاتا ہے۔

دیدہ زیب سرورق، عمدہ کاغذ، آفسیٹ پرنٹنگ یہ سب کسی بھی جریدہ کے لئے بلندیوں کی انتہا سمجھی جا سکتی ہے اور اردو جریدہ کے لئے تو نایاب ہے لیکن کتابت کی غلطیاں جو میرے خیال میں پروف ریڈنگ

میں قسطوں کی وجہ سے ہو رہی ہیں مزے دار نوالوں میں ایک ہیں کی کنکر بن جاتے ہیں "امکان" اس سے بھی پاک ہے

"امکان" کی سب سے بڑی خوبی اس میں تناسب کی برقرار رکھنا ہے۔ ہندوستان کا ملا جلا تمدن جس کے ان گنت مناظر بھی "امکان" کے صفحات پر منقش کیا جا رہا ہے۔ ادب و تنقید کے ساتھ تاریخی سماجی، معاشی اور معیشتی موضوعات امکان کی منزلتیں اضافہ کر رہے ہیں۔ صحافت پر سمینار مالیگاؤں کی بنکر برادری، تذکرہ مالیگاؤں اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ادبی موضوع بھی ایسے چنے گئے ہیں جن کو عام طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ گوشہ چکبست، سر عبدالقادر، خواجہ شوق، حکیم بدرالدین افسر، برار میں اردو شاعری کا آغاز و ارتقاء اس قسم کے مضمون ہیں۔ پھر اردو کے علاوہ دوسری ہندوستانی زبانوں کے ادب کی پیش کشی اردو والوں کے ذہنی کینوس کے پھیلاؤ میں مددگار ہوگی۔

کشمیر سے کنیا کماری تک کے ادیب جن میں تجربہ کار اونچی سطح کے ادیبوں کے ساتھ کم چھپنے والے اور نئے لکھنے والے بھی شامل ہیں۔ امکان کے صفحوں پر موجود ہیں۔ ان ادیبوں کی نگارشات کو اکٹھا کرنا واقعی بڑا کام ہے۔

یوسف ناظم کا چند مشاہیر عالم خاصے کی چیز ہے۔ مقابلے کے امتحانوں میں شریک ہونے والے ان کو پڑھ لیں گے تو ۱۲۰ فیصد نمبر کے حقدار ہو جائیں گے اور ہنستے کھیلتے امتحان پاس کر کے مالدار بیوی کے لئے بھی منتخب ہو سکیں گے۔

مہاراشٹرا کے مختلف مقامات پر منعقد کئے گئے سمیناروں میں پیش کئے جانے والے مضمون رسالہ کی افادیت میں مزید اضافہ کر رہے ہیں ـــ "مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی کی کارکردگی کی ڈائری" دیکھ کر چشم بد دور دل سے دعا نکلتی ہے کہ ہماری اردو اکیڈیمی کو بھی اللہ ایسی ہی توفیق عطا فرمائے ہمارے پیش نظر اس وقت "امکان" کے دو شمارے ہیں اور دونوں پر بھی جلد نمبر (۲)، اور شمارہ نمبر (۲) چھپا ہے۔ کسی اور جگہ تاریخ کے نہ ہونے سے اس کی تصحیح بھی مشکل ہے۔ ایک شمارہ میں تو اکیڈیمی ڈائری میں سنہ موجود ہے اور دوسرے میں نہیں دیا گیا ہے البتہ مسودوں کی مالی امداد برائے ۸۲-۱۹۸۱ء سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شمارہ اس سال سے متعلق ہوگا۔ اگرچہ امکان کو پڑھ کر اس کے ادبی مواد سے لطف اندوز ہونے میں تو کوئی الجھن نہیں پیدا ہوتی لیکن تاریخ داں خاص کر مستقبل کے تاریخ نویس کے لئے اس سے الجھن پیدا ہو سکتی ہے۔ اس سے قطع نظر رسالہ کے سرپرست، نگران اعلیٰ اور مجلس ادارت نے رسالہ کو معیاری بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے

حرفِ آخر

"مارچ کا شمارہ وصول ہوا، نہایت دیدہ زیب، دلچسپ اور معلوماتی ہے جیسے ہر دور پچھلے شماروں سے کہیں زیادہ اعلیٰ معیار کا حامل ہے۔ مزاح گوئی دربارِ نبوی میں بہت ہی اوریجنل اور باسلیقہ انشائیہ ہے، سفر نامہ حرمین بھی تاریخی اعتبار سے دلچسپ ہے لیکن ڈاکٹر حمید خاں نے "دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے" علمی، ادبی اور ڈاکٹری اعتبار سے بڑا ہی عمدہ مضمون لکھا ہے سائنسی مضامین اگر دوسرے اہلِ قلم بھی اسی طرح لکھیں تو اردو دنیا میں ہلچل مچ جائے گی شاداب کی دن دونی رات چوگنی ترقی کے دعائیں۔"

ڈاکٹر خواجہ عبد الغفور۔ بمبئی

"ماہنامہ "شاداب" نظر نواز ہوا۔ اردو زبان کے عظیم فنکاروں کو یکجا کر دیا ہے بلند پایہ تخلیقات نے شاداب کے معیار کو درخشاں بنا دیا ہے۔ یقین ہے یہ رسالہ جلد ہی اہلِ اردو دنیا حضرات تک پہنچ کر سامانِ فرحت بخشے گا۔"

نہال انصاری۔ مالیگاؤں

"اس زمانہ میں اور وہ بھی حیدرآباد سے اردو رسالہ شائع کرنا ہمت کا کام ہے مجھے اس کا خاصہ تجربہ ہے اور ہو رہا ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ آپ کو کامیابی عطا ہو۔ رسالہ بہت اچھا ہے، ادبی معیار بلند ہے۔ اور کتابت و طباعت دیدہ زیب۔"

پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد۔ کراچی

"اردو ادب کے تعلق سے حیدرآباد کی اپنی ایک علمی اور ادبی روایت رہی ہے۔ آپ کے اس شمارہ کی ورق گردانی کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اس صحتمند روایت کو آگے بڑھانے کی ایک کامیاب کوشش کر رہے ہیں۔"

(ریاض احمد خاں مدیر قومی راج)

"شاداب کے جو چند شمارے وصول ہوئے، چونکا دینے والے تھے۔ انداز کے تنوع، مضامین کی ہمہ اقسامی اور اعلیٰ ادبی معیار کے لحاظ سے یہ رسالہ اپنی آپ مثال لگتا ہے

فروری کے شمارے میں فیلیطین کا مضمون بہت معلوماتی تھا ۔ یوسف ناظم کے تین خطوط کافی لذیذ تھے ۔ جنابہ عائشہ یوسف الدین رباب کی چھوٹی سی، سادہ سی اور پیاری سی نظم نے دل کے تار چھیڑ دیئے۔ امید کہ موصوفہ آئندہ بھی لکھتی رہیں گی ۔ اللہ سے دعا ہے کہ آپ کا گلشن افکار ہمیشہ سرسبز و شاداب رہے ــ اور اس میں نت نئے اور نادر گل بوٹوں کا اضافہ ہوتا رہے ۔ آمین "

(ڈاکٹر مسز تسنیم احمد ـ میسور)

" شاداب کی اجرائی میں آپ جس پابندی کا اہتمام کر رہے ہیں اور اس کے مضامین کے معیار کی اونچائی کی برقراری کا خیال کر رہے ہیں وہ اس پرچہ کی بقا کی ضامن ہے ــ "سفرنامہ حرمین" کے سلسلہ کو نہ پاکر مایوسی ہوئی ۔ اسے جاری رکھیئے اس سے پہلی انگریز نومسلمہ کے اثرات کے ساتھ ساتھ اس زمانہ کے عرب کے حالات سے واقفیت ہوتی ہے ۔ "

(ایس ۔ اے ۔ قادر ہاشمی ـ سکندرآباد)

" شاداب اپریل کا تازہ شمارہ ہاتھوں میں ہے بہت کچھ پڑھ لیا ہے، بہت کچھ پڑھنا باقی ہے ۔ اس پابندی اور سرعت کے لئے آپ کو جتنی مبارکباد دی جائے کم ہے ۔ اداریوں کے مطالعہ کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ اردو کی خدمت کے تعلق سے آپ کے ذہن میں ایک سوچا سمجھا منصوبہ موجود ہے آج وقت کی ضرورت یہی ہے ۔ اس مرتبہ خلیل الکن، ڈاکٹر ثاقب انور، رحمٰن ثاقب اور عائشہ یوسف الدین رباب کی تخلیقات کافی پسند آئیں ۔ "سفرنامہ حرمین" کیا ختم ہو گیا ہے؟

(انیس چشتی ـ پونہ)

ماہنامہ شاداب نظر نواز ہوا ۔ آپ نے شاداب نکال کر بڑی خدمت انجام دی ہے ہیں، علم اور ادب کا جو گلدستہ آپ نے تیار کیا ہے وہ بڑا خوشنما اور پرکشش ہے ۔ اردو ادب میں نئی روشنی آپ نے پیدا کی ہے، خدا نظر بد سے بچائے ــ مضامین کے تنوع اور حسن ترتیب نے دو آتشہ بنا دیا ہے ۔ آپ ہر طرح سے قابل داد ہیں اور "شاداب" قابل دید و مطالعہ

(اسحٰق حسینی ـ لکھنو)

زندگی کے ہر موڑ ، ہر ضرورت پر اردو کا استعمال کیجئے
تبھی ، اردو زبان فروغ پائے گی

تلگو تہذیب - ایک نشاۃ ثانیہ



شری این ٹی راما راؤ کی زیر قیادت و نگرانی تلگو عوام کی قدیم روایات اور تہذیب کی عظمت کو پروان چڑھانے اور آبیاری کرنے و نیز ملک کے کونے کونے میں پہنچانے کے لئے حکومت آندھرا پردیش نے اپنے آپ کو وقف کیا ہے اور کئی نئی اسکیموں کا آغاز کر دیا گیا ہے ۔

- تلگو یونیورسٹی کا قیام
- ہر ضلع میں تمام عصری ضروریات کے حامل ایک جدید آڈیٹوریم کم کلچرل سنٹر کا قیام
- رقص و موسیقی اور ڈراموں کے ہر ضلع میں مقابلے منعقد کئے جائیں گے
- مختلف ثقافتی شعبوں سے تعلق رکھنے والے نوجوان فنکاروں کو مالی امداد کی فراہمی
- نوجوان فنکاروں کو ممتاز استادان فن کے ذریعہ ٹریننگ اور اسکالرشپ کی فراہمی
- ریاستی سطح پر موسیقی اور ڈراموں کے یونٹ کا قیام
- دور قدیم کے قلمی نسخہ جات کی نشاندہی اور ان کی اشاعت
- سال ۱۹۷۵ء میں شروع کی گئی تلگو تہذیب سے متعلق میوزیم کی جلد سے جلد تکمیل
- موسیقی کے کالج میں "ندلیتوارم" کی فروغ کے لئے علاحدہ شعبوں کا قیام
- موسیقی کے خانگی کالجوں کو مسلمہ حیثیت دیتے ہوئے رقمی امداد کی فراہمی۔
- مقامی عمر رسیدہ فنکاروں کے لئے مالی امداد
- مختلف اکاڈیمیوں کی سرگرمیوں کو از سر نو منظم کرنا
- رضا کارانہ ثقافتی تنظیموں کے لئے مالی امداد
- ثقافتی شعبوں سے تعلق رکھنے والی ممتاز شخصیتوں کی یاد منانے کے لئے تقاریب کا انعقاد۔
- ثقافتی ٹروپس کے دوسری ریاستوں کو دورے ' تاکہ ثقافتی یکجہتی

اور خوشگوار تعلقات فروغ پاسکیں

○ بدھ پورنیما پراجیکٹ حیدرآباد میں مہاتما بدھ اور دوسرے ممتاز ۲۵ شخصیتوں کے مجسموں کی تنصیب۔

ریاستی حکومت نے اپنے آپکو تلگو عوام کی ثقافتی عظمت کے احیاء کیلئے وقف کردیا ہے

DIPR's Letter
No 8934/Advt II/c4/84
Dated: 29-3-84

اطلاعات و تعلقات عامہ حیدرآباد

Regd. No. H/HD 593.

Monthly **SHADAAB** Hyderabad

11-5 147, RED HILLS, HYD-500 004.

Vol. 4 No. 6 MAY 19



میرے افکار کے سن میں بجھالے لوی
دُور تک منظرِ شاداب دِکھائی دے گا

۱۹۹۰ء

حیدرآباد

قیمت : پانچ روپے

علمی، ادبی، دینی و سماجی اقدار کا ترجمان

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد (۱) جون سنہ ۱۹۸۴ء شمارہ (۷)

زر تعاون فی پرچہ پانچ روپے

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
زر سالانہ	50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
سہ سالہ	90	275	65	36	225
معاونین تاحیات	1000	2,500	450	300	2,000

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :- 11-5-147 ریڈ ہلز - حیدرآباد 500004 (اے پی)

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد میں طبع کروا کر ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا

فہرست

حرف اول

"شاداب" کا ساتواں شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ اعلیٰ معیار کے ساتھ شاداب کا تنوع اور رنگا رنگی برقرار رہے، اور وہ اپنے پڑھنے والوں کی دلچسپی کے ساتھ ساتھ ان کی تسکین کا موجب بھی بنا رہے۔ ہم کس حد تک مقصد میں کامیاب ہیں تو آپ ہی اس کا تصفیہ کریں گے۔ آپ کے تاثرات اور مشوروں کا ہمیں انتظار رہے گا۔

گزشتہ دنوں شاداب کو ایک بڑے صدمہ اور عظیم نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ شاداب مجلس مشاورت کے رکن اول ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور ۲۶ر اپریل ۱۹۸۲ء کی ابتدائی ساعتوں میں "شاداب" اور "اردو دنیا" کو داغ مفارقت دے گئے۔

خواجہ صاحب مرحوم جنہوں نے "طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ" کی تکمیل کر کے حال ہی میں بمبئی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی اور جن پر خود تحقیق کرنے کے لئے اس یونیورسٹی نے ایک ریسرچ اسکالر کو رجسٹریٹ کرنے کی منظوری دی تھی اور جن کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے تہنیتی جلسوں کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ بمبئی سے ایک جانکاہ خبر موصول ہوئی کہ خواجہ صاحب اپنے دو پسندیدہ شہروں کے درمیان سفر کرتے ہوئے اللہ کو پیارے ہوئے۔ اس سفر میں بیگم حبیبہ غفور اور ایک قریبی رشتہ دار ساتھ تھے۔ بمبئی کے اسٹیشن وکٹوریہ ٹرمنس پر مرحوم کے رشتہ داروں نے میت حاصل کی۔ تدفین بعد نماز عشاء ناریل واڑی بمبئی کے قبرستان میں عمل میں آئی۔

حیدرآباد میں وہ پیدا ہوئے تھے، حیدرآباد نے انہیں بنایا۔ ریاستوں کی تنظیم جدید کے بعد بمبئی نے انہیں اپنایا اور اپنا سب کچھ انہوں نے بمبئی کو دیا۔ بمبئی اور حیدرآباد دونوں جگہ کی علمی، ادبی، سماجی، ثقافتی اور تہذیبی غرض ہر طرح کی سرگرمیوں کی وہ روح رواں تھے۔ غالباً خواجہ صاحب مرحوم خود بھی اس کا فیصلہ نہیں کر سکتے تھے کہ دونوں شہروں میں سے وہ کسے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ایک پیر بمبئی میں تو دوسرا پیر حیدرآباد میں ہوتا۔ بمبئی سے سرکاری ملازمت ایڈیشنل چیف سکریٹری کی حیثیت سے سبکدوش ہونے کے بعد انہیں مکرم جاہ بہادر نے ٹرسٹوں کا چیف ایڈوائزر مقرر کیا۔ اس میں یہی شرط تھی کہ ہر ماہ وہ کچھ دن بمبئی میں گذاریں گے۔ بعد میں یہ شرط بھی انہیں گوارا نہ ہوئی اور وہ اس

ملازمت سے سبکدوش ہو کر دونوں شہروں میں اپنی سرگرمیوں میں معروف ہو گئے۔ گذشتہ ایک سال سے ان کی صحت خراب رہ رہی تھی لیکن ان کی سرگرمیوں میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ میناراکسپریس سے وہ حیدرآباد سے بمبئی واپس ہو رہے تھے کہ ۲۶ راپریل ۱۹۸۴ء کی صبح [illegible] کے قریب دل کا شدید دورہ پڑا۔ اور بمبئی پہنچنے سے قبل انہوں نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔

خواجہ صاحب مرحوم ہمہ جہتی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ حیدرآباد کے ان چند سویلین عہدیداروں میں سے ایک تھے جنہوں نے اپنی غیر معمولی شخصیت اور گوناگوں صلاحیت کی بنا پر نہ صرف انتظامیہ میں نام کمایا بلکہ علمی، تہذیبی، ثقافتی سرگرمیوں میں بھی اپنا مقام بنایا۔

خواجہ صاحب مرحوم ۶ راکتوبر ۱۹۲۰ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں جامعہ عثمانیہ سے بی ایس سی اردو میڈیم میں بدرجہ اول کامیاب کیا اور پوری یونیورسٹی میں اول رہے۔ حیدرآباد سیول سروس کے لئے منتخب ہوئے اور اس میں بھی بدرجہ امتیاز کامیاب ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں ضلع میدک میں میدک ٹریننگ پر دوم تعلقدار (اسسٹنٹ کلکٹر) مقرر ہوئے۔ فوراً ہی اپنی افتادِ طبع کے مطابق انہیں کام سونپا گیا۔ اور ۱۹۴۴ء میں انہیں ہریجنوں اور گرجنوں کی فلاح و بہبود کے لئے ڈولپمنٹ آفیسر مقرر کیا گیا۔ مرحوم نے اس خصوص میں ایسی شاندار خدمات انجام دیں کہ ۱۹۴۶ء میں حکومت وقت نے ایک علحدہ محکمہ فلاح و بہبود درج فہرست اقوام و قبائلی اقوام قائم کر کے خواجہ صاحب کو اس کا سربراہ مقرر کر دیا۔ اس محکمہ نے کئی اصلاحی اقدام کئے۔ چلڈرنس ایکٹ مدون کیا جس کے تحت ۱۲ سال سے کم مجرمین کو جیل خانوں میں ٹھونسنے کی بجائے چلڈرنس ہوم میں مختلف فنون اور نیک چال چلن کی تربیت دی جاتی تھی۔ ایک "بیگرس ایکٹ" نافذ کیا جس کے تحت کئی بیگرس ہوم قائم کئے گئے جہاں بھیک منگوں کو رسی بنانے، لفافے بنانے، بید بافی اور بڑھئی کے کام کی تربیت دی جاتی تھی۔ قبائیلیوں کے لئے ایک پنچایتی ایکٹ بنایا گیا جس میں ان کے پنچایتی اصولوں کا تحفظ کر کے ان کی تربیت کا کام انجام دیا گیا۔ اس محکمہ نے ایک کروڑ سکہ عثمانیہ کے سرمایہ سے شیڈولڈ کاسٹ ٹرسٹ فنڈ بھی قائم کیا جس نے ان پچھڑے ہوئے طبقات کے لئے کئی فلاحی کام انجام دیئے مرحوم کے اس کام سے متاثر ہو کر یونیسکو نے بھی ان کی خدمات حاصل کیں اور امریکہ کے ریڈ انڈینز میں ایک سال رہ کر انہوں نے ان کی بہتری کے لئے بہت سے کام کئے۔ ریاستوں کی تنظیم جدید کے بعد خواجہ صاحب کی خدمات کو مہاراشٹرا کے تفویض کیا گیا جہاں وہ مختلف اہم عہدوں بشمول کلکٹر ضلع، کمشنر سیلز ٹیکس، سکریٹری جی اے ڈی، ڈائرکٹر جنرل اطلاعات کی حیثیت سے فائز رہ کر اڈیشنل چیف سکریٹری کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے۔ کچھ مدت نواب مکرم جاہ بہادر کے مشیر خصوصی اور کئی ٹرسٹوں کے ٹرسٹی رہے۔ پھر ابھی سے بیمار رہ کر بھی

ے آپ کو بے شمار سماجی، ادبی اور تہذیبی تنظیموں سے وابستہ کرکے ان کے لئے کام کرتے رہے۔
سوشیل سروس پر انگریزی میں بے شمار مضامین لکھے اور ایک کتاب بھی شائع کی۔ لیکن ان کی توجہ
رخصوصاً طنز و مزاح پر مبذول رہی۔ لطیفہ گوئی اور لطیفہ سازی کے فن کو نکھار کر "قہقہہ زار"
"گل و گلزار" "شگوفہ زار" "ہنسی زار" جیسی کتب اردو کی نذر کیں۔ آخر میں "طنز و مزاح
دی جائزہ لکھ کر اس میدان میں کام کرنے والوں کے لئے راستہ صاف کرکے کئی آسانیاں پیدا کر دیا

اردو کے لئے خواجہ صاحب مرحوم نے جو کام کئے وہ بے مثال ہیں۔ مرحوم نے اخبار اشتراک اردو
یا کے بانی ممبر سکریٹری "امکان" سہ ماہی اور "قومی راج" سہ روزہ کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت
ہ گئے وہ سبھی کے علم میں ہیں البتہ ان کے آخری کارنامہ سے کم لوگ واقف ہیں۔ اردو زبان
نا سکھانے کے لئے ایک "ویڈیو فلم" ہے جسے مرحوم نے تیار کر لیا تھا اور بڑے پیمانہ پر اس کی
شاعت کے منتظر تھے۔ اردو نوشت و خواند سے ناواقف نئی پود اور غیر اردو داں حضرات
کے کم وقت میں اردو لکھنا پڑھنا سکھانے کے لئے مرحوم نے ایک سائنٹفک طریقہ ایجاد کیا اور
یہ تین گھنٹہ طویل ایک ویڈیو فلم بھی تیار کر لی جس کے ذریعہ ٹیلی ویژن پر اردو لکھنا پڑھنا سکھایا
ہے۔ اس ویڈیو فلم سے نہ صرف اردو سیکھنے کے خواہشمند ہندوستانی فائدہ اٹھا سکتے ہیں بلکہ
ن و امریکہ اور غیر ممالک میں رہنے والے اردو والوں کی نئی پود جو اردو سے ناواقف ہے استفادہ
ہے۔ خواجہ صاحب مرحوم کی یاد کو قائم رکھنے کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ ان کی تیار کردہ
م سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرکے اردو کو تقویت پہنچائی جائے۔

مدیر

[illegible]انی اشارات

(تیسرا ایڈیشن) مصنفہ مولوی خواجہ حمید احمد حسنی کامل التفسیر جامعہ نظامیہ

رمضان المبارک کا نایاب تحفہ

ہر پارہ کا خلاصہ صرف ایک ایک صفحہ میں لکھ دیا گیا ہے تاکہ تراویح میں اردو کا نزول سے قبل وہ
[illegible] دیا جائے تو دو منٹ سے کم وقت صرف ہوگا اور سماعت قرآن کے وقت اس کے معنی و مطالب کی طرف
یادہ توجہ قائم رہ سکے گی اور اس سے قرآن فہمی کا شوق تیز تر ہوگا۔ صفحات ۱۵۰ ۔ ہدیہ آٹھ روپیہ
ملنے کا پتہ: جامع دار الرضائی ۔ لال ٹیکری حیدرآباد • کمرشیل بک ڈپو ۔ چار مینار حیدرآباد

محمد کلیم الدین حسن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
یہ ایک آیت ہے جو قرآن پاک میں سورہ نمل کا جزو ہے۔ اہل اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت
علاوہ سورہ توبہ کے ہر سورۃ کے شروع میں لکھی جاتی ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ...
بسم اللہ جز سورہ نمل کے اور کسی سورۃ کا جزو نہیں ہے بلکہ ایک مستقل آیت ہے جو ہر سورت کے
شروع میں دو سورتوں کے درمیان فصل اور امتیاز ظاہر کرنے کے لئے نازل ہوئی ہے۔

سب سے پہلی آیت جو آنحضورؐ پر نازل ہوئی "اقراء باسم ربک..." سے شروع ہوتی
ہے اس میں قرآن کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ قرآن کے
سوا دوسری تمام آسمانی کتابیں بھی بسم اللہ سے شروع کی گئی ہیں اور بعض علماء نے فرمایا ہے ":
بسم اللہ الرحمن الرحیم قرآن اور امت محمدیہ کی خصوصیات میں سے ہے۔" دونوں اقوال کی تطبیق
یہ ہے کہ اللہ کے نام سے شروع کرنا تو تمام آسمانی کتب میں مشترک ہے مگر الفاظ بسم اللہ الرحمن الرحیم
قرآن کی خصوصیت ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ آنحضرتؐ ابتداء میں ہر کام کے شروع میں باسمک اللھم
کہتے اور لکھتے تھے آیت بسم اللہ الرحمن الرحیم کے نزول کے بعد اسے اختیار فرما لیا اور ہمیشہ
کے لئے یہ سنت جاری ہو گئی۔

اسلام نے ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کی ہدایت دے کر انسان کی پوری زندگی کا
رخ اللہ تعالیٰ کی طرف اس طرح پھیر دیا ہے کہ وہ قدم قدم پر اس حلف وفاداری کی تجدید کرتا ہے اور اس
طرح ہر نقل و حرکت اور تمام معاشی و دنیوی کاموں کو بھی ایک عبادت بنا دیا۔ عمل کتنا مختصر ہے
لیکن فائدہ کتنا بڑا۔ ایک مسلمان ایک لقمہ کھانے سے پہلے بسم اللہ کہہ کر یہ اقرار کرتا ہے کہ اس
لقمہ کا حاصل کرنا میرے بس میں نہ تھا اللہ ہی کی ذات ہے جس نے بے شمار مراحل سے گذار کر یہ لقمہ
عطا فرمایا ہے۔ سونے سے پہلے اور بیدار ہوتے وقت اللہ کا نام لیتا ہے گویا اللہ کے ساتھ اپنے

رابطے کی تجدید کرتا ہے۔ سواری پر سوار ہوتے وقت بسم اللہ کہہ کر گویا یہ شہادت دیتا ہے کہ اس سواری کا پیدا کرنا، مہیا کرنا اور پھر اس کے قبضہ میں دے دینا اللہ ہی کے نظام محکم کا کام ہے۔ یہ تمام اسی اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں جو انسان کی قدرت سے باہر ہے غرض بسم اللہ ایک نسخہ اکسیر ہے جو صرف اسلام کی خصوصی دین ہے۔

بسم اللہ تین لفظوں سے مرکب ہے (۱) حرف باء (۲) اسم (۳) اللہ

حرف باء کے عربی میں کئی معنی آتے ہیں یہاں موقع کے لحاظ سے تین معنیٰ مناسب ہیں۔

۱۔ مصاحبت یعنی کسی چیز کا کسی سے متصل ہونا۔

۲۔ استعانت یعنی کسی چیز سے مدد حاصل کرنا۔

۳۔ تبرک یعنی کسی چیز سے برکت حاصل کرنا۔

"اسم" یعنی نام ـــ اور "اللہ" اسم اللہ ہے جو اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس لفظ کا تثنیہ اور جمع نہیں آتے کیونکہ اللہ واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ غرض اللہ نام ہے اس موجود ذات کا جو تمام صفات کمال کا جامع ہے، صفات ربوبیت کے ساتھ متصف، یکتا اور بے مثال ہے۔ یہ اللہ کے ناموں میں سب سے بڑا اور سب سے زیادہ جامع نام ہے اسی کو اسم اعظم کہا گیا ہے۔ کلمہ بسم اللہ کے معنیٰ حرف باء کے مذکورہ تین معنوں کے ساتھ یہ ہوئے:۔

۱۔ اللہ کے نام کے ساتھ ۲۔ اللہ کے نام کی مدد سے ۳۔ اللہ کے نام کی برکت سے

تینوں صورتوں میں کلام نامکمل ہوگا جب تک اس کام کا ذکر نہ ہو جس کا کرنا مقصود ہو گویا یہاں فعل محذوف ہے کہ "شروع کرتا ہوں" یا "پڑھتا ہوں"

اور مناسب یہ ہے کہ یہ فعل بھی بعد میں محذوف مانا جائے تاکہ حقیقتاً شروع اسم اللہ ہی سے ہو وہ فعل محذوف اسی لئے ہے کہ اسم اللہ سے پہلے نہ آئے۔ صرف حرف باء کا اسم اللہ سے پہلے آنا عربی زبان کے قاعدے کی رو سے ضروری ہے۔ اس میں بھی مصحف عثمانی میں باجماع صحابہ یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ حرف باء رسم الخط کے قاعدے سے الف کے ساتھ ملا کر لکھنا چاہئے تھا اور لفظ اسم الگ۔ جس کی صورت ہوتی "باسم اللہ" لیکن مصحف عثمانی کے رسم الخط میں حرف ہمزہ کو حذف کر کے حرف باء کو سین کے ساتھ ملا کر اسم کا جزو بنا دیا تاکہ شروع اسم اللہ سے ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے مواقع میں یہ حرف الف حذف نہیں کیا جاتا جیسے "اقراء باسم ربک" میں ب کو الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ یہ صرف بسم اللہ کی خصوصیت ہے کہ حرف باء کو سین کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔

اور "بسم اللہ" لکھا جاتا ہے ۔

" الرحمٰن الرحیم " دونوں اللہ کی صفات ہیں ۔ رحمٰن کے معنیٰ عام الرحمۃ اور رحیم کے معنیٰ تام الرحمۃ ہیں ۔ عام الرحمۃ سے مطلب یہ ہے کہ وہ ذات جس کی رحمت سارے عالم اور ساری کائنات اور جو کچھ اب تک پیدا ہوا ہے اور جو کچھ ہوگا سب پر حاوی ہو شامل ہو ۔ اور تام الرحمۃ کا مطلب یہ ہے کہ اس کی رحمت کامل اور مکمل ہو ۔

یہی وجہ ہے کہ لفظ رحمٰن اللہ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے اور لفظ اللہ کی طرح اس کا بھی تثنیہ و جمع نہیں ہے ۔ برخلاف اس کے رحیم کی صفات مخلوق میں پایا جانا ممکن ہے ۔ کسی مخلوق کو رحمٰن کہنا جائز نہیں ہے البتہ لفظ رحیم انسان کے لئے بھی بولا جا سکتا ہے ـــــ قرآن کریم میں حضور ؐ کے لئے آیا ہے بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۔

بسم اللہ میں اللہ تعالیٰ کی صفات کمال میں سے صرف دو صفتیں ذکر کی گئی ہیں اور وہ دونوں لفظ رحمت سے مشتق ہیں اور وسعت رحمت اور کمال رحمت پر دلالت کرتی ہیں گویا تخلیق عالم اور آسمان و زمین اور تمام کائنات کے پیدا کرنے اور ان کو پالنے وغیرہ کا منشاء اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت ہے نہ اللہ کو ان چیزوں کی ضرورت تھی اور نہ کوئی دوسرا ان چیزوں کو پیدا کرنے پر مجبور کرنے والا تھا ـــــ صرف اللہ کی رحمت کے تقاضے سے یہ تمام تخلیق عمل میں آئی ہے ۔

آیت شریفہ " بسم اللہ الرحمٰن الرحیم " ایک معجزانہ اور کلیدی حیثیت کی بھی حامل ہے اور اپنے الفاظ اور حروف کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ قرآن مجید کے غیر انسانی ہونے کا مادی اور محسوس ثبوت پیش کرتی ہے بلکہ وہ اس ابدی حقیقت کی شہادت بھی دیتی ہے کہ دوسری آسمانی کتابوں کے برعکس قرآن شریف تحریف سے محفوظ ہے ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے پورے حروف ابجد (۱۹) ہیں (۱۹) ایسا طاق عدد ہے جو کسی اور عدد سے تقسیم نہیں ہوتا ۔ بسم اللہ کے حروف کی یہ تعداد اپنے اندر اعجازی اور امتیازی حیثیت یہ رکھتی ہے کہ پورے قرآن شریف میں "اللہ" ۲۶۹۸ بار آیا ہے جو (۱۹) پر (۱۹ × ۱۴۲ = ۲۶۹۸) قابل تقسیم اور اس کے مکررات سے ہے ۔ "رحمٰن" پورے قرآن شریف میں (۵۷) بار آیا ہے جو (۱۹ × ۳ = ۵۷) (۱۹) اور (۳) کا حاصل ضرب ہے ۔ "رحیم" قرآن شریف میں (۱۱۴) بار آیا ہے یہ بھی (۱۹) کے مکررات (۱۹ × ۶ = ۱۱۴) سے ہے ۔ اصل معجزہ (۱۹) کے عدد میں نہیں بلکہ آیت شریفہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں ہے جو (۱۹) حروف سے مرکب ہے اور جس کے ہر لفظ ، اسم ذات اور اسمائے حسنیٰ اللہ ، رحمٰن اور رحیم

یات کی تعداد اس آیت کے حروف کی تعداد پر برابر تقسیم ہوتی ہے۔

قرآن شریف کی سورتوں کی تعداد (۱۱۴) ہے اور آیت شریفہ بسم اللہ الرحمن الرحیم (۱۱۴) مرتبہ آئی ہے۔ چونکہ سورۂ توبہ اس سے خالی ہے اس کی تلافی سورۂ نمل میں کر دی گئی ہے جہاں تداء میں آنے کے بعد آیۃ ۳۰ میں بھی نازل ہوئی ہے۔ یہ عدد (۱۱۴) بھی ۱۹ کے مکررات (۱۱۴=۶×۱۹) ہے۔

حروف مقطعات میں بھی اس آیۃ شریفہ کے حروف کی تعداد کا معجزہ کارفرما ہے۔ جن سورتوں میں حروف مقطعات آئے ہیں ان میں حروف مکررات کی تعداد (۱۹) سے قابل تقسیم ہے مثلاً:

سورۂ قٓ میں "ق" (۵۷) بار آیا ہے جو (۱۹) کا تین گنا ہے۔ اسی طرح سورۂ "قلم" میں "ن" (۱۳۳) بار آیا ہے جو (۱۹) کا سات گنا ہے۔ سورۂ یٰسین میں "س" (۲۸۵) ہے جو (۱۹) کا پندرہ گنا ہے۔ "حٰم" سے شروع ہونے والی سورتوں میں ان دونوں حروف کے تہ کا شمار کیا جائے تو (۲۱۶۶) کا عدد حاصل ہوتا ہے۔ یہ بھی (۱۹) کے مکررات سے ہے۔

سورہ شوریٰ میں جو "ع س ق" سے شروع ہوتی ہے تینوں حروف کے مکررات کو گنا جائے تو ۲) حاصل ہوتا ہے جو (۱۹) پر گیارہ بار قابل تقسیم ہے۔

سورہ رعد "المر" سے شروع ہوتا ہے۔ اس سورت میں ان چار حروف کے مکررات کی (۱۵۰۱) ہوتی ہے جو (۱۹) پر (۱۹×۷۹=۱۵۰۱) قابل تقسیم ہے۔

اگر قرآن مجید کے موجودہ رسم الخط میں تبدیلی کی جائے یا کسی قسم سے تحریف کی جائے تو قرآن کے اس مستحکم اور وقیع میزان اور نظام میں خلل پڑ جائے گا جس کی حفاظت کے لئے یہ حروف یدار اور نگران کی حیثیت سے سورتوں کے دروازوں پر رکھے گئے ہیں۔ ایسی کسی تحریف سے حروف ررات کی تعداد مختلف ہو جائے گی اور وہ کسوٹی جو بسم اللہ کے حروف کی تعداد اور اس کے مکررات پوشیدہ اور قائم ہے اس کی نشاندہی کر دے گی۔

■ ■

انیس چشتی

واقعۂ ہجرت کا معاشی استدراک

ہجرت دراصل ترک وطن کو کہتے ہیں۔ اسلام کی سیاسی، سماجی، عمرانی اور معاشی تاریخ میں ہجرت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہجرت کے بعد اسلامی نظام حیات نے ایک نئی کروٹ بدلی اسی واقعہ کو مرکز مان کر اسلامی کیلنڈر کی ابتداء ہوئی۔ دیگر مذاہب کے کیلنڈر بھی اکثر چاند کی تاریخوں سے شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے ماہ و سال بھی چاند کی اشکال کے گھٹنے بڑھنے سے تشکیل پاتے ہیں "ہندو پنچانگ" یا جنتری اس کی عمدہ مثال ہے۔ لیکن دیگر مذاہب کے قمری کیلنڈروں کی ابتداء یا تو کسی بادشاہ کے سال جلوس سے ہوتی ہے یا کسی فتح کی وجہ سے یا کسی بادشاہ کے یوم پیدائش سے اسلام چاہتا تو اس کے پاس ایسے لاتعداد واقعات تھے جن کے ظہور کو بنیاد بنا کر وہ اپنے کیلنڈر کی ابتداء کرتا۔ رسول اللہؐ کا یوم پیدائش، فتح مکہ، غزوہ بدر، پیغمبر اسلام کا سال وفات بیعت عقبہ، صلح حدیبیہ، غزوہ خندق اور اسی طرح کے کئی واقعات ہیں جن کو اسلامی کیلنڈر کی ابتداء کا شرف بخشا جا سکتا تھا لیکن رسول اللہؐ نے "واقعہ ہجرت" کو اسلامی کیلنڈر کا سن تاسیس قرار دیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام ایک نظام حیات ہے اور اس میں تحریک کو غلبہ حاصل ہے نہ کہ زمینی فتوحات کا شخصیت پرستی اور قومی و ملی کامیابیوں کو۔

دوران ہجرت پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کے سامنے محض اپنی بقاء اور زندگی کے تحفظ ہی کا مسئلہ نہ تھا بلکہ اس مشن کی بھی حفاظت ضروری تھی جس کی تبلیغ و اشاعت کے لئے آپ اللہ کی جانب سے مامور کئے گئے تھے۔ آپ کی نامزدگی کا اصل مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو نیکی کی طرف بلائیں اور برائی سے روکیں۔ آپؐ کے ہمعصر معاشرہ میں کفر و شرک، عدم مساوات، استحصال زن و زمین، قتل و غارت گری، لڑکیوں کی زندہ تدفین، غلام مرد و زن کا کھلے بازاروں میں بھیڑ بکریوں کی طرح بکنا

۴۲۵ ۔ کیداری روڈ ۔ پونہ ۱

ورمز دعاؤں اور سماج کے کمزور طبقات کا استحصال روزمرہ کا معمول بن چکے تھے۔ ان تمام برائیوں سے
نسانیت کو پاک کرنا ہمارے انسانوں کو ایک خدا کی غلامی میں دے کر صالح اقدار کی نشوونما حضور اکرم
کا سب سے اہم ذمہ داری تھی۔

کن حالات میں ہجرت کی گئی

مکی زندگی میں رسول اللہؐ اور آپ کے ساتھیوں نے جن اذیتوں کا سامنا کیا تاریخ اسلام کے ادنیٰ طالب علم پر بھی ان کے وہ تیرہ سال نکارہ ہیں دشمنان اسلام جب آپؐ کے خون کے پیاسے ہو گئے اور جب زندگی کا چراغ ہی خطرہ میں گھر گیا یعنی کے تمام سرداروں نے ایک رات آپؐ کا کام تمام کرنے کا ہی فیصلہ کر لیا تب آپؐ نے اللہ کے حکم سے مکہ سے مدینہ جانب ہجرت کرنے کا ارادہ کر لیا۔ دشمنوں کے نرغے میں سے صاف بچ کر نکل جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ پنے نبیؐ کو اللہ کی بھرپور نصرت وحمایت حاصل تھی اور یہ اس بات کا بین ثبوت تھا کہ اللہ اس نبی آخر الزماںؐ ، ذریعے اپنے دین کو قیامت تک کے لئے زمین پر برپا کر کے رہے گا۔ ہجرت کا یہ عظیم واقعہ ۶۲۲ء میں پیش آیا

ہجرت کے لئے مدینہ کا انتخاب

ہجرت کے لئے مدینہ کا ہی انتخاب کیا گیا۔ مکہ کے بعد حجاز مقدس کا یہ سب سے بڑا شہر تھا۔ اس شہر سے پیغمبر اسلامؐ کے بڑے گہرے تعلقات ۔۔ اس کی بھی کئی وجوہات ہیں۔ بیعت عقبہ اولیٰ اور بیعت عقبہ ثانی کے ذریعہ مدینہ کی جلیل القدر ہستیاں ت کے عوض رسول اللہؐ کے ہاتھ پر اپنے جان ومال اور تن واولاد کی قربانی کی بیعت کر چکے تھے۔ مدینہ کی ب قبول اسلام کے لئے ہموار ہو چکی تھی۔ مکہ کے مہاجرین اور خاص طور پر حضرت مصعب بن عمیرؓ کی کوششوں جہ سے مدینہ کی گلیوں میں اسلام کا چرچا تھا۔ آپ حضرات رسول اکرمؐ سے پہلے مدینہ ہجرت کر چکے تھے۔ یاں نے مدینہ میں اسلام کے لئے رائے عامہ ہموار کر رکھی تھی۔ مدینہ کے صالح قلوب رات دن نہایت بے تابی حضورؐ کی آمد کا انتظار کرتے تھے۔ شہر سے دور نکل کر وداع کی پہاڑیوں کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتے رہتے ئی قافلہ آرہا ہے یا نہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ رسول خداؐ کو مدینہ کے لوگ کس قدر محبوب رکھتے تھے

تی نفسیات اور مدینہ کی معاشی صورت حال

عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی کھاتے پیتے اور آباد ملک میں بے خانماں، برباد اور لٹے پٹے افراد داد اچانک بڑھ جائے یا کسی پڑوسی ملک سے در آمد ہو جائے تو اس ملک کی معاشیات پر اس کا بڑا گہرا پڑتا ہے۔ آج بھی پاکستان کی مالی حالت افغان مجاہدین کی اچانک آمد سے بڑی حد تک متاثر ہو چکی ہے تو یوں بھی ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ ایک طرف طاقتور دشمن محدود ذرائع آمدنی اور ایک بھاری اکثریت پیٹے قافلہ کی جو نہایت کسمپرسی کے عالم میں اپنا وطن اور سب کچھ چھوڑ کر صرف بدن کے کپڑوں سے مدینہ پہنچا تھا

خلاف نظر آرہا تھا کہ مستقبل قریب میں ایک ایسی بڑی آبادی وجود میں آجائے گی جو آسمان کی کھلی چھت کے نیچے پڑی ہوگی اور بھوک و افلاس جس کا مقدر بن چکی ہوگی ـــ غربت، طبقاتی کشمکش اور مطالبات والی سیاست کو جنم دیتی ہے ۔ غریبوں کی بے چینی سکھی خاندانوں کی بھی نیندوں کو برباد کر دیتی ہے اور پورا معاشرہ ایک آتش فشاں کے دہانے پر پہنچ جاتا ہے ۔ سماج میں مختلف گناہ پرورش پانے لگتے ہیں اور پورا ماحول اخلاق و کردار کی پستی اور تعفن سے لرزہ براندام ہو جاتا ہے ۔ جب غریب طبقہ امراء کے عیش و آرام کو بزور یا بذریعہ مطالبات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تب بھی سماج میں قانون و نظم کی صورت برقرار نہیں رہتی اور غریب طبقہ امیر بننے کی خواہش میں موقع کا منتظر رہتا ہے ' طبقہ امراء میں ہجرت کر جانے کی شدید خواہش اسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتی اور طبقہ امراء میں غریبوں سے متعلق نفرت اور استحصال کا مادہ جنم لیتا ہے ۔ اگر ایسی صورت میں چند غریب امیر بن جائیں یا چند امیر غریب ہو جائیں تو بڑے پیمانہ پر "متوسط طبقہ" وجود میں آتا ہے اور یہ طبقہ اپنی طاقت اور تعداد کی بناء پر باقی ماندہ غریبوں اور امیروں کا جینا حرام کئے رہتا ہے ۔ اس کی بہترین مثال موجودہ بھارت یا تیسری دنیا کے تقریباً تمام ممالک ہیں ۔

مدینہ پہنچتے ہی رسول اللہ ؐ کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ مہاجرین کی باز آبادکاری اور مدینہ کی معاشی استحکام کا تھا ۔ اس زبردست معاشی مسئلہ کو جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حل کیا وہ خود اس ثبوت کے لئے کافی ہے کہ آپؐ بے پناہ معاشی بصیرت بھی رکھتے تھے ۔

انصار کا تعاون

مدینہ کی آبادیاں تو دیدہ و دل فرش راہ کئے ہوئے تھیں اور حضورؐ کے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار تھی ۔ لیکن پھر وہی مسئلہ پیدا ہوتا کہ ایک اچھی خاصی کھاتی پیتی اور معاشی طور پر خوش حال آبادی غریب بن جاتی اور ایک نئے مسئلہ کو جنم دیتی ۔ حضور صلعم نے یہاں نہایت دانشمندی کا ثبوت دیا اور یہ اعلان فرمایا کہ مکہ سے آنے والے مہاجرین ، مدینہ کے باشندے انصار یعنی ان کے مددگار اور مہمان نواز ہیں اور دونوں آپس میں بھائی بھائی ہیں ۔ اس واقعہ کو عربی میں "مواخات" کہتے ہیں ۔ اب کیا تھا ۔ مدینہ والوں کو بھائی مل گئے اور مکہ کے مسلمانوں کو ایک عظیم سہارا سب سے آگے بڑھ جانے کے لئے آپس میں رسہ کشی ہونے لگی اور ہر انصاری ایک مہاجر بھائی کا ہاتھ پکڑے گھر روانہ ہوا جس کے دو کھیت تھے اس نے ایک کھیت اپنے مہاجر بھائی کو دے دیا ، دو باغ تھے تو ایک باغ دے دیا دو مکان تھے تو ایک مکان دے دیا ۔ یہاں تک کہ جس کی دو بیویاں تھیں اس نے ایک بیوی کو طلاق دے کر اپنے مہاجر بھائی سے اس کی شادی کروا دی ۔ دولت کی مساوی تقسیم کی اس سے بہتر مثال دنیا میں کہیں دیکھنے نہیں ملی ۔ کسی سرمایہ دار سے بزور دولت چھین کر اپنے نظریاتی حامی کو دے دینا تمام دولت کی مساوی تقسیم نہیں ہے ۔

(بقیہ ص۱ پر)

لیڈی ایولن زینب

سفرنامہ حرمین - مکہ

مارچ ۱۹۳۳ء میں نے معمولی مسلمان عورتوں کے سے سیاہ کپڑے پہن لئے اور سورج نکلنے کے تین گھنٹے بعد مصطفیٰ کو لے کر حرم میں آئی ہوں اس وقت بھی تپش کی
ت ہے کہ جب دالان سے نکل کر سنگ مرمر کی سڑکوں پر جو بیت اللہ کے صحن میں ہر طرف بنی ہوئی ہیں۔
ملی تو تکلیف ہونے لگی حالانکہ میرے پاؤں میں پاتابے بھی تھے۔ کعبہ کے اطراف اس وقت بڑا ہجوم ہے
مان ابن سعود خود احرام باندھے آئے ہیں اور کعبہ کے اندرونی فرش کو زمزم سے دھو رہے ہیں اس کے
عطر گلاب دیواروں وغیرہ پر چھڑکیں گے۔ میں چاندی کے منبر کی سیڑھیوں پر چڑھ کر غسل کعبہ کی رسم
ے کی کوشش کرتی ہوں جو عرب کا بہادر جنگی بادشاہ اپنے ہاتھوں سے انجام دے رہا ہے۔ میرے
ے چلے جا رہے ہیں اس لئے اس کوشش سے دست بردار ہو کر چاہ زمزم دیکھنے جاتی ہوں۔ چاہ زمزم پر
قبہ کا ایک کوشک بنا ہوا ہے۔ کنویں کے اطراف منڈیر اور لوہے کا جنگلہ ہے۔ زمزم کے حجرے میں
ے گھڑے رکھے ہوئے ہیں جن میں سے حاجی گلاس بھر بھر کر لیتے رہتے ہیں۔ ان گھڑوں کو بھرنے کے لئے
وہی ہر وقت پانی کھینچتے رہتے ہیں۔ خانگی طور پر بھی بہت سے مکانوں میں آب زمزم کی مانگ دوا
تی رہتی ہے۔ بیت اللہ میں آٹھ سو زیادہ ملازم ہیں ان میں ایک سو اغوات ہیں۔ صرف حج کے زمانے
ن کا کام بڑھ جاتا ہے ورنہ سال کے بڑے حصے میں ان کی نوکری بڑی ہلکی رہتی ہے۔ ان کا فرض ہے
ت اللہ کو صاف رکھیں۔ کوڑا کرکٹ دھبہ نظر نہ آئے۔ یہ ان کبوتروں کو بھی دانہ ڈالتے ہیں جو بیت اللہ
بکثرت ہیں اور جو اس قدر مودب ہیں کہ حرم کو خراب نہیں کرتے۔

مکہ کی تجارت میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بغیر حاجیوں کے مکہ کیسا رہ جاتا ہوگا۔ مکے والے کہتے ہیں کہ ہم نہ جوتتے ہیں نہ بوتے ہیں۔ ہماری گذر حاجیوں پر ہے۔ حاجی نہ ہوں
ز بھوکا مر جائے۔ یمن میں باہر بھیجنے کے لئے قہوہ ہوتا ہے مگر حجاز بنجر ہے اور مکہ ایسی وادی میں واقع ہے
طرف سے پتھریلی پہاڑیوں سے گھری ہوئی ہے خلاصہ یہ کہ یہاں ویرانہ ہی ویرانہ ہے۔ ہم مکہ

زمانہ میں تجارت و صنعت و حرفت کا بھی ایسا ہی مرکز تھا جیسا کہ تقدس کا۔ یہاں سے تاجروں کے قافلے یمن کی پیداوار و خوشبوئیات، افریقہ کا لوبان، چین کا ریشم، جزائر ہند کے جواہرات اور گرم مسالے ایران و شام و عراق لے جایا کرتے تھے اور وہاں سے واپس ہوتے وقت دمشق کی کمخواب و مخمل، تلواروں کے پھل اور منقش ڈھالیں اونٹوں پر لاد کر لایا کرتے تھے۔ مکہ مشرق و بحر روم کے راستوں کا چوراہا تھا۔ قافلوں کی آمد و روانگی مکے والوں کے لئے ایک بڑا اہم واقعہ ہوا کرتا تھا جس سے یہاں کی ساری آبادی کا تعلق رہتا تھا اور چونکہ اس تجارت میں منافع بہت باقاعدہ طور پر تقسیم ہوا کرتا تھا اس لئے غریب سے غریب آدمی بھی اس میں شریک ہو جاتا تھا۔

مکہ کے مسطح نشیبی حصے میں جہاں کعبہ شریف واقع ہے بڑے بڑے تاجر، مہاجن، مالدار، بردہ فروش اور وہ قومیں رہتی تھیں جن میں سے آگے چل کر اسلام کے کئی خلیفہ ہوئے۔ نیز رؤسائے قریش محافظین کعبہ، حاجیوں کو پانی تقسیم کرنے کی خدمت رکھنے والے سب یہیں سکونت پذیر تھے اور اسی مہذب مرکز کے چاروں طرف ڈھلوان گلیوں میں عام لوگ آباد تھے۔ اس کے بعد کوہی سلسلہ کے نزدیک نالوں میں پناہ گزینوں اور غلاموں کی آبادی تھی اور امیر امراء کے متوسلین اور پردیسی رہا کرتے تھے یہ سب بڑے منافع کی امید پر تجارت میں روپیہ لگا دیا کرتے تھے۔

بازار عکاظ

اس زمانہ میں مضافات مکہ میں ایک بڑا میلہ ہوا کرتا تھا جس میں دور دراز ریگستانوں کے خانہ بدوشوں کے علاوہ بہت سے سوداگر بحری سفر طے کر کے یہاں پہنچا کرتے تھے اور اس زمانہ کے دنیا کے مشہور تاجر بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ یہاں عرب شاعر بھی اکٹھا ہوتے تھے مجمع کثیر کے سامنے اپنے اشعار سنا کر خراج تحسین وصول کرتے تھے۔ بدنصیبی سے ان قافلوں کے ساتھ ایران و عراق، مصطافے اور یونان سے لونڈیاں باندیاں بھی اہل مکہ کی دلگی اور وقت گذاری کیلئے آیا کرتی تھیں اور ... کی بری عادتوں میں اضافہ کرتی تھیں۔

انہیں عربوں میں ایک آدمی ایسا پیدا ہوا جو عربوں کو جہالت و تباہی کے اندھیرے گڑھے میں سے نکال کر مذہب کی روشنی میں لانے والا اور خدائے واحد کا پرستار بنانے والا تھا۔ حضورؐ نے جس خوبی کے ساتھ نبوت کے مقدس فرض کو انجام دیا وہ تاریخوں سے ثابت ہے۔ آپؐ نے صرف اپنی ہی قوم کی رہنمائی نہیں کی بلکہ سمندر پار کے کروڑوں آدمیوں کو اس مذہب کا راستہ بتایا جو آج کے دن بھی اسی آب و تاب کے ساتھ ضوفشاں ہے جیسا کہ اس وقت تھا جب آپ پر آسمانی نور نازل ہوا تھا۔

مکہ میں خانہ داری

بیت اللہ سے میں واپس آگئی ہوں۔ اب میری میزبان نے مجھے اپنے کمرے میں جو اس مکان کی آخری منزل پر ہے بلایا ہے۔ اس نے اپنے کئی اور

قاتیوں کی بھی دعوت کی ہے۔ یہ کمرہ قالینوں سے آراستہ ہے اور ریشمی گدے بچھے ہوئے ہیں۔ یہاں ایک
ٹے سے پنجرے میں ایک بلبل ہے۔ سب سے بڑے کمرے کے سامنے چھت کی چاندنی ہے۔ یہ اس وقت پھول باغ
ہوئی ہے۔ ان میں سے دو ایک طرح کے پھولوں کو میں پہچانتی ہوں باقی کی خبر نہیں۔ یہاں تہہ کئے ہوئے بچھونوں
معلوم ہو رہا ہے کہ کچھ عورتیں باہر چاندنی پر بھی سوتی ہیں۔ سورج اس باغ کو چند روز میں سکھا دے گا۔
اس کے بعد یہ لوگ بھی گرمی گذارنے کے لئے اپنے طائف کے مکان میں چلے جائیں گے۔ کمرے میں یہاں قالینوں
ٹھی ہیں۔ بڑی بوڑھیاں حقہ پی رہی ہیں، دو جوان عورتوں کی گودوں میں بچے بھی ہیں جو ہماری باتوں اور قہقہوں
مزے سے سو رہے ہیں۔ یہ ملاقاتی عورتیں یہاں آج دن بھر رہیں گی۔ میری میزبان نے مجھے زنان خانے کے
حصوں سے بھی واقف کرا دیا ہے۔ ایک جگہ تنور ہے جس میں اس بڑے گھرانے کے لئے روٹیاں پکتی ہیں
طرف باورچی خانہ ہے جہاں میری میزبان دوسری عورتیں اور چھوکریاں کھانے وغیرہ پکاتی ہیں۔ ایک
بی خانہ بھی ہے اس میں بعض چھوکریاں کپڑے دھو رہی ہیں اور میری میزبان کی تین خوبصورت بھانجیاں
ان پر استری کر کر کے تہہ کرتی جا رہی ہیں۔ سینے پرونے اور بیٹھنے اٹھنے کا کمرہ الگ ہے۔ غرض کہ خانہ داری
سب کام گھر ہی میں ہو جاتے ہیں۔ چھتیں کپڑے سکھانے اور ہوا کھانے کے لئے ہیں۔ موسم بہار میں جب گرمی
لگتی ہے تو سب آدمی ان چھتوں پر ہی سوتے ہیں۔

۲۸ مارچ

آج سہ پہر کو میں اپنی میزبان اور مصطفیٰ کے ساتھ موٹر میں منیٰ و عرفات میں اپنی
جائے قیام دیکھنے کے لئے گئی جہاں تین راتیں گزارنا لازمی ہے۔ مکہ سے چل کر ہم
ن کی طرف گئے۔ سلطان کے محل پر سے گذرے۔ بڑی اچھی سنگین عمارت ہے انہوں نے خود تعمیر کروایا ہے
مشرق کی طرف مڑے اور ایک گہرے نالے میں چلنے لگے اس کو سابق شاہ حجاز حسین نے پتھر اڑا اڑا کر صاف
ا۔ مکہ والے کہتے ہیں کہ اس نے صرف یہی ایک کام نیکی کا کیا ہے لیکن غالباً یہ بات مبالغہ سے خالی نہیں ہے
کی صفائی سے پیشتر خصوصاً اونٹوں کے لئے یہ رستہ بڑا خوفناک تھا۔ بہت سے حاجی اس ڈھلوان سے
کرنے میں مر چکے ہیں۔ جن لوگوں نے اس جگہ اپنی جانیں کھوئی ہیں ان میں ایک عباسی خلیفہ منصور بھی ہے
صدی عیسوی میں اس نے بغداد آباد کیا تھا، اس نے علم و فن کی ترقی میں بھی بہت کوشش کی تھی، بغداد کا
دارالسلام اسی نے رکھا گیا تھا کہ ایک نجومی نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ بغداد کا کوئی فرماں روا اس شہر کے
مرے گا۔ منصور پہلا خلیفہ بغداد تھا جس نے اس پیشینگوئی کو صحیح ثابت کیا۔ وہ عین جوانی میں اس
سے گذرتا ہوا مارا گیا جسے سابق شاہ حجاز نے درست کرایا ہے۔ بڑی حیرت کی بات ہے کہ بغداد کے
تیس بادشاہ کسی نہ کسی وجہ سے بغداد سے دور کسی دوسرے ملک میں سفر کرتے ہوئے مرے اور اس طرح

پیشین گوئی پوری ہوئی -

اس گہرے نالے کو پار کرنے کے بعد تھوڑی دیر میں ہم منیٰ پہنچ گئے - یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے حاجی عرفات سے واپس ہو کر یہاں شیطان کو کنکریاں مارتے ہیں - یہاں میں نے حاجیوں کا ہوٹل دیکھا حاجیوں کی کثرت کی وجہ سے اس کا کوئی کمرہ نہیں مل سکا اور آخر رائے یہ ٹھہری کہ گو موسم بہت گرم ہے لیکن دامن کوہ میں خیمہ لگا لینا چاہیئے - ریتیلے میدان میں ایک گلی چلی گئی ہے یہی منیٰ ہے - یہاں مسجد خیف بھی ہے یہ بہت قدیم ہے اس میں سنگین محرابدار رواقیں ہیں ، ایک قبہ ہے جو اس جگہ بنا دیا گیا ہے جہاں آنحضرت نے حجۃ الوداع میں نماز پڑھی تھی - یہ مسجد صرف عید الضحیٰ کے موقع پر آباد ہو جاتی ہے - تین دن یہاں بڑا ہجوم رہتا ہے اور اس کے دونوں میناروں پر اذان بھی ہوتی ہے - ادھر حج ختم ہوا خیمے اکھڑے مجمع منتشر ہوا اور مسجد سنسان و ویران ہو گئی -

ہماری موٹر شمال مشرق کی جانب بڑھتی رہی - پہاڑ زیادہ ڈھلوان ہوتے گئے اور بلندی بڑھتی گئی - ان پہاڑیوں کے نشیبی حصوں میں سبز بھوری خاردار جھاڑیاں پھیلی ہوئی ہیں ان کے پتوں کو اگر رگڑا جائے تو خوشبو دیتے ہیں - ایسی جھاڑی کے بیچ میں ایک اور قسم کی بوٹی ہوتی ہے جسے بدوی باشم کہتے ہیں اس میں مرہم کی سی خاصیت ہوتی ہے - گرمی کے دنوں میں اس کی چھال میں شگاف کر دیئے جاتے ہیں اور اس کا نرم گوند تھیلیوں میں جمع کر لیا جاتا ہے یہ زخموں کے لئے بہت مفید ہوتا ہے - اس کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ یہ بوٹی حضرت سلیمانؑ کو ان کی بیوی ملکۂ سبا نے نذر کی تھی -

حدود حرم کے ستونوں سے گذرنے کے بعد ہم کو ناہموار کنارہ وادی اور پہاڑیاں نظر آئیں جو اندرون ملک تک چلی گئی ہیں - یہاں سے آگے موٹر نہیں چل سکتی تھی اس لئے ہم بائیں جانب مڑے اور جبل عرفات کے دامن تک پہنچے - یہ ایک ڈھلوان پہاڑ ہے جس پر جا بجا نماز پڑھنے کے لئے چبوترے بنے ہوئے ہیں اور اس کی چوٹی پر ایک سنگین ستون ہے یہی وہ مقام ہے جہاں پیغمبر صاحبؐ نے حجۃ الوداع میں خطبہ پڑھا تھا -

جبل عرفات کو جبل رحمت بھی کہتے ہیں اس پہاڑ کی اس چوٹی پر جہاں حجۃ الوداع میں آنحضرتؐ کھڑے ہوئے تھے حج کا خطبہ پڑھا جاتا ہے - پہاڑوں کا پانی یہاں بڑے بڑے حوضوں میں جمع کر لیا جاتا ہے اور وہ پھر ایک گہری نہر کی صورت میں تقریباً بیس میل کا فاصلہ طے کرتا ہوا مکہ تک پہنچتا ہے - اس مضبوط کام کی تعمیر کو ایک ہزار برس سے زیادہ مدت گذر گئی مگر آج کی تاریخ تک اس کے ذریعہ شہر کو برابر پانی ملتا ہے یہ اس زمانہ کے کاریگروں کی صناعی کی یادگار اور اس ملکہ کا فیض جاریہ ہے جس نے اسے تعمیر کرایا تھا -

پہاڑ کے دامن میں ہم نے موٹر چھوڑ دی اور پیدل چڑھائی تک پہنچے۔ یہاں تھوڑی سی صاف کی ہوئی جگہ ہے۔ اس کی نسبت مشہور ہے کہ یہاں حضرت آدمؑ نے نماز پڑھی تھی اور یہ گویا پہلی نماز تھی جو انسان نے ادا کی۔ یہاں بہت سے حاجی آرام کر رہے ہیں اور بہت سے پیچھے سے آتے دکھائی دے رہے ہیں۔

ہم چڑھتے چڑھتے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے اور اس وقت کہ میں سنگین ستونوں کے پاس کھڑی ہوں مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ میں آنحضرتؐ کا وہ وداعی خطبہ سن رہی ہوں جو آپؐ نے تیرہ سو سال قبل ایک آبدیدہ مجمع کو سنایا تھا

(باقی آئندہ)

(سلسلہ صفحہ ۱۲ سے آگے)

مہاجرین کا رویہ جس معاشرے کی بنیاد صالح اقدار، آخرت کے یقین اور بے غرضی پر ہو تو اس سماج کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ مدینہ کے انصار اپنے مہاجر بھائیوں کی مدد کے لئے ایک دوسرے سے بڑھ جانے پر تلے ہوئے تھے لیکن اس کے برعکس مہاجرین کا یہ رویہ تھا کہ وہ انکار کرتے چلے جاتے تھے اور صرف اتنا ہی لیتے تھے جس سے ان کی روزانہ زندگی کے صرف ضروری مصارف پورے ہوں۔ چنانچہ وہ مدینہ والوں کے کھیتوں اور باغوں میں کام کرتے۔ اپنے انصار بھائیوں کو کسی کام کو ہاتھ لگانے نہ دیتے اور جب سال کے آخر میں فصل پک کر تیار ہو جاتی تو دستور اور اصرار کے مطابق فصل کے دو حصے کرتے۔ مدینہ ایک سرسبز علاقہ ہے یہاں ہر چیز افراط سے پیدا ہوتی ہے تاہم خاص فصل کھجور کی ہے۔ کھجور کے بٹوارے میں مہاجرین خراب سوکھی ہوئی کھجوریں چھانٹ کر الگ ڈھیر کرتے اور ان پر اچھی کھجوروں کی تہ چڑھا دیتے۔ انصاری بھائی کی سادہ دلی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خراب کھجوروں کی ڈھیری خود مہاجرین اپنے لئے پسند کر لیتے۔

کسی مہاجر بھائی کی دستگیری کے لئے کوئی انصاری جب اپنے گھر لے چلا تو مہاجر نے اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور کہہ دیا کہ "آپ مجھے بازار کا راستہ بتلا دیجئے میں خود وہاں اللہ کے فضل کو تلاش کر لوں گا"

قربانی اور خلوص کی ان چند مثالوں سے آپ ہجرت کی آفاقیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ہجرت نبویؐ کے لاتعداد فیوض و برکات میں سے معاشی طور پر مستحکم معاشرہ کا قیام ہمیشہ تک اسلامی ملکوں کے لئے ایک مشعل راہ بنا رہے گا۔

□ □

پروفیسر محمد قاسم راز

کلام اقبال میں زندگی اور موت کی حقیقت

زندگی اور موت کا مسئلہ صدیوں سے بحث کا موضوع بنا رہا ہے بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ خود انسان ۔ انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کے ہر دور میں فلسفیوں نے بساط بھر تفکر و تدبر سے اس ضمن میں اپنے خیالات و تصورات کو پیش کیا اور اس عقدہ لاینحل کے بارے میں ان کے خیالات میں کہیں تنوع ہے تو کہیں تضاد ۔

مذہب و اخلاق کے لئے تو یہ مسئلہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے ۔ مذہب نے اس مسئلہ کی حقیقت سے پردہ ہٹا کر بنی نوع انسان کو ہدایت کی راہ دکھائی اور اسے بالآخر سرخرو اور سرفراز ہونے کی ضمانت دی ۔ مذہب کی رو سے انسانی عمل کا تمام تر معاملہ زندگی اور موت کے بارے میں اس کے عقیدے سے وابستہ ہے ۔ چنانچہ انسان کے اعمال کی اصلاح کی جتنی بھی کوششیں مذہبی پیشواؤں اور ہادیان ادیان نے اپنے اپنے عہد میں کی ہیں ان سب میں دنیاوی زندگی کے عمل کو آخرت کی زندگی میں حاصل و حصاد کا ذریعہ قرار دیا ہے ۔ حدیث پاک میں ارشاد ہے : الدنیا مزرعۃ الاخرۃ (یعنی دنیا آخرت کی کھیتی ہے) گویا اصل زندگی موت کے بعد کی یعنی آخرت کی زندگی ہے اور دنیا کی زندگی محض اخروی زندگی کی تیاری کا زمانہ ہے ۔ اس دنیاوی زندگی کے اعمال کے اعتبار سے آخرت کی زندگی بنے اور سنورے گی یا تباہ و برباد ہوگی ۔ اس اعتبار سے دنیا کی زندگی کی بے ثباتی اور آخرت کی زندگی کا ابدی ہونا ذہن نشین کرایا گیا ۔

اس تمام کا منشا و مقصد انسان کی انفرادی اور اجتماعی فلاح ۔ دنیا میں امن و سکون اور خدا کی بے شمار نعمتوں سے بہرہ یاب ہونے کے لئے ایک عام آسان ، قابل عمل طریق زندگی کی رہنمائی کرنا تھا چنانچہ ہر زمانہ میں انسانوں کی خاص تعداد نے اس راستہ کو اپنایا تھا اور دنیاوی زندگی میں عزت و آبرو اور

صدر شعبہ اردو و فارسی ۔ مولانا آزاد کالج ۔ اورنگ آباد

امن و سکون کی زندگی گذار کر اخروی زندگی کی لامتناہی نعمتوں کی مستحق بنی ۔

لیکن جب بھی انسانیت اس صراط مستقیم سے ہٹی ہے ، امن و سکون غارت ہوا ہے ۔ انسانوں نے درندگی اختیار کی تو خدا کے برگزیدہ بندے اسی پیغام کو لے کر آئے جسے لوگ بھلا چکے تھے ۔ ہر دور میں ایسا ہوا ہے ۔ اور آخری بار آج سے چودہ سو برس پہلے بھی اسی پیغام کا اعادہ کیا گیا اور مکمل طور پر اور قطعیت کے ساتھ کیا گیا ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے خاک نشینان عرب کو عالم میں اتنا چمکایا اور سربلند کیا کہ تاریخ جس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے ۔

لیکن جیسے ہی اس پیغام کی روح نے امت مسلمہ کے سینے کو خیرباد کہا وہ اتنی ذلیل و رسوا ہوئی کہ تاریخ میں پھر کوئی مثال ملنا مشکل ہے ۔ امت کی اس ناگفتہ بہ حالت اور دعل مغرب کے ہاتھوں اس کی آبرو کا نیلام ان لوگوں سے دیکھا نہ گیا جو قوموں کے عروج و زوال سے واقف تھے جن کے دیدہ مند دل جب تک وہ زندہ رہے اسی فکر میں تڑپتے رہے کہ امت مسلمہ کی عظمت رفتہ کو پھر کیونکر لوٹایا جا سکتا ہے، ان کے دل کی گویا یہی آواز تھی ۔ ؎ دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

ایسے دردمندان ملت کی صف میں نمایاں مقام علامہ اقبال کو حاصل ہے ۔

اہل مغرب کے ہاتھوں اہل مشرق کی عموماً اور مسلمانان عالم کی بالخصوص تباہی کے دلدوز مناظر نے اقبال کے درد آشنا اور غیور دل کو ہمیشہ بیقرار رکھا ۔ اسی حکیم فرزانہ اور دانائے اسرار حیات نے بالآخر امت کی سرفرازی اور سربلندی کے لئے وہی نسخہ تجویز کیا جو ہمیشہ آزمایا جا چکا تھا ، جو بہ حیثیت حیات افروز و حیات بخش ثابت ہو چکا تھا جو قیامت تک کے لئے تجویز کر دیا گیا ہے ۔ وہ نسخہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ ؎

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اگر امت مسلمہ خاص طور سے اور پوری انسانیت عام طور سے اسلامی طرز حیات کو اپنا لے تو دنیا سے استبداد ، استعماریت ، رنگ و نسل کی عصبیت ، زبان و اوطان کی مخاصمتیں غرض سارے مفاسد کا قلع قمع ہو سکتا ہے ۔ شرط یہ ہے کہ انسانیت ساری کی ساری اسلام کے زریں اصولوں مثلاً توحید ، انسانی مساوات ، عالمی اخوت کو سینے سے لگا لے اور خاص طور سے مسلمانان عالم میں کا ہر فرد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا امتی ، پیرو اور متبع بن جائے ۔ اقبال کا یقین تھا کہ دنیا کی تعمیر نو وہی کر سکتا ہے جس نے بیت الحرام کی تعمیر کی یعنی حضرت ابراہیمؑ اور بعد میں حضور اکرم صلعم یعنی آپؐ کے سچے پیرو ہی عالم کی تعمیر نو کا کام انجام دے سکتے ہیں گویا اقبال تمام ازموں اور فلسفوں سے مایوس

ہو کر اسلام اور اس کے متبعین کو عالم کی مسیحائی کا اہل سمجھتے تھے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

ناموس ازل را تو امینے تو امینے دارائے جہاں را تو یسارے تو یمینے
اے بندۂ خاکی تو زمانے تو زمینے صہبائے یقیں درکش و از دیر گماں خیز
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز

فریاد ز افرنگ و دلآویزی افرنگ فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ معمار حرم! باز بہ تعمیر جہاں خیز
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز

اقبال کے پیغام کا مخاطب اول معمار حرم ہے۔ وہ امت مسلمہ ہی کو اپنے پیغام میں خطاب کرتے ہیں اسی سے انہیں آس و امید ہے کہ وہ عالم کی تعمیر نو کے عظیم منصب کو قبول کرے گی۔ اسی آرزو کے پیش نظر اقبال نے اپنے عالمگیر پیغام کو پہنچانے کے لئے شاعری کو وسیلہ بنایا۔

کلام اقبال میں ان کے افکار و تصورات میں جس بات پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ ہے تصور خودی، ان کے افکار کا محور و مرکز یہی تصور ہے۔ وہ خودی کی تربیت اور ارتقا کو انسانی کوشش کا مرکز قرار دیتے ہیں۔ خودی کو وہ انسانی کردار کی عظمت کا جوہر اصلی قرار دیتے ہیں اور خودی کا جذبہ ہی وہ جذبہ ہے جس کو کام میں لاکر عالم کی تعمیر نو کے خواب کی تعبیر ڈھونڈی جا سکتی ہے۔

چنانچہ زندگی اور موت کے بارے میں اقبال نے جس انداز سے اظہار خیال کیا ہے اس کا سرچشمہ بھی تصور خودی ہے۔ خودی کے بارے میں ان کے افکار جابجا ان کے کلام میں بکھرے ہوئے ہیں تاہم یہاں چند ایک شعر پیش ہیں کہ اقبال کے تصور خودی کو سمجھنے میں مدد ملے ــــ فرماتے ہیں ؎

یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے راز درون حیات خودی کیا ہے بیداری کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

گویا زندگی کو اگر ایک تیغ سے تشبیہ دیں تو خودی کی حیثیت اس کے لئے ایسی ہی ہے جیسی تلوار کے لئے آب اور اس کی دھار ہوتی ہے کہ جس تلوار میں دھار نہ ہو وہ کسی کام کی نہیں بلکہ تلوار سے مراد اس کی دھار ہی ہے بالکل اسی طرح زندگی کا مقصود ہی خودی کی پرورش و بقا ہے۔ زندگی اگر خودی کے جوہر سے عاری ہو تو وہ زندگی نہیں عدم ہے۔

خودی کو خود شناسی اور پھر خدا شناسی کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

منکر حق نزد ملا کافر است | منکر خود نزد من کافر تر است
آں بانکار وجود آمد عجول | ایں عجول و ہم ظلوم و ہم جہول

اقبال کے خیال کے بموجب جس طرح دنیا کی زندگی خودی کے لئے عرصہ بالیدگی و نمو ہے اسی طرح موت کے بعد کی زندگی اس کے لئے ارتقائے مسلسل کا لازوال دور ہے۔ گویا خودی کی تکمیل کے لئے یہ زندگی بھی اور وہ زندگی بھی ضروری ہے اور ان دونوں کے درمیان موت محض پل یا ایک دروازہ ہے جس سے گذر کر خودی ایک نئی آب و تاب کے ساتھ جادہ پیما ہوتی ہے۔ اقبال کی نگاہ میں زندگی پیمانہ امروز و فردا سے ناپنے کی شے نہیں ہے بلکہ خودی کے ارتقاء میں ایک جہد مسلسل کا عرصہ ہے۔ فرماتے ہیں ؎

دمادم رواں ہے یم زندگی | ہر اک شے سے پیدا رم زندگی
فریب نظر ہے سکون و ثبات | تڑپتا ہے ہر ذرہ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود | کہ ہر لحظہ ہے تازہ شان وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی | فقط ذوق پرواز ہے زندگی

زندگی گویا اک بحر بیکراں ہے، کائنات کی ہر شے اپنی حرکت سے وجود کا ثبوت دیتی ہے اور زندگی کا کام ہے ہر لحظہ نئی آن اور نئی شان سے جلوہ گر ہے۔ زندگی کی کوئی منزل نہیں بس ایک سفر مسلسل سفر ہے جسے زندگی کہا گیا ہے بلکہ ذوق وجود ہی زندگی ہے۔ اقبال نے زندگی کو ایک جہد مسلسل اور حرکت لازوال کا عنوان دیا ہے۔ دنیا کی زندگی نہ کوئی منزل ہے کہ جہاں کارواں رکے اور نہ کوئی مقام ہے کہ جس پر سفر ختم ہو بلکہ یہ زندگی تو شوق سفر کو بڑھانے کا ایک ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی نگاہ میں زندگی روحانی اور جسمانی دونوں لحاظ سے غیر فانی شے ہے وہ اسے زمان و مکاں کی قید سے آزاد سمجھتے ہیں بلکہ زندگی کے لازوال ہونے کی دلیل فطرت کے مظاہر کے حوالے سے یوں دیتے ہیں ؎

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے
ذوق حفظ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے

چنانچہ مثال یوں دیتے ہیں ؎

پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ

زندگی کے تواتر اور تسلسل پر ایک اور دلیل اس طرح لاتے ہیں ؎

یہ اگر آئین ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح | مرقد انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

ایک اور مثال سے

وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل

عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے

غنچہ کی فنا بیدلیا ہے آفرینش گل ہے ۔ اس اعتبار سے زندگی نے محض چولا بدلا ہے ختم کہاں ہوئی؟ گل کی آفرینش اور اس کا وجود دلالت کرتا ہے اس بات پر کہ عدم کوئی شے ہی نہیں ۔ چنانچہ اقبال کا خیال ہے کہ جس طرح حیات نباتی میں تسلسل و تواتر برقرار ہے اسی طرح حیات انسانی کی نوعی بقاء کا اہتمام بھی فطرت اپنے ذمے لیتی ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ انسان میں موت کے بعد زندہ رہنے کی شدید خواہش ہر دور میں رہی ہے اور یہی خواہش لذت وجود یا خودی کے ارتقائے مسلسل کے مترادف ہے ۔

اقبال نے زندگی کی حقیقت پر جس طرح جابجا اپنے اشعار میں اظہار خیال کیا ہے اسی طرح ان کے کلام میں موت کے سربستہ راز پر سے بھی پردہ ہٹایا گیا ہے ۔ پہلے عرض کیا جا چکا کہ موت کے بارے میں مذہب نے جو عقیدہ دیا ہے اس کا مین منشا یہ ہے کہ انسان آخرت کی زندگی کو جو موت کے بعد شروع ہوگی پیش نظر رکھ کر اپنے عمل کا جائزہ لیتا رہے اور موت ایک ایسی شے ہے جو دنیاوی زندگی کے سارے علائق سے جدا کر کے آدمی کو ایک اور ہی عالم میں پہنچا دیتی ہے یقیناً مذہب کی رو سے بھی یہی بات جتائی جاتی ہے کہ جسم تو مرتا ہے روح البتہ نکل جاتی ہے جو مرتی نہیں ۔ عالم برزخ میں روح اور ہی حالات سے دوچار ہوتی ہے ۔

ایک اور نقطہ نظر موت کے متعلق یہ بھی پیش کیا جاتا ہے ۔ آدمی اپنے کرم (عمل) کے لحاظ سے اپنی موت کے بعد جسم بدلتا رہتا ہے اور یہ ایک چکر یا دور ہے جس سے نکلنے ہی میں اس کی نجات ہے ۔ جس کے بعد وہ روح اپنے پیدا کرنے والے کی ذات میں ضم ہو جاتی ہے ۔ یہ مسئلہ تناسخ کہلاتا ہے جس کے نتیجہ میں آدمی کرم سے کورا ہونے ہی میں اپنی عافیت سمجھتا ہے اس کے لئے ترک دنیا کا راستہ اپنا اور نتیجہ میں بے عمل زندگی گذارنے پر قناعت کرتا ہے ۔

موت کے بارے میں کلاسیکی اور نو افلاطونی نظریہ یہ ہے کہ موت کے ساتھ ہی انسانی روح جسم کو چھوڑ کر ہستی مطلق میں ضم ہو جائے گی اور اس طرح اس کی انفرادیت اور امتیاز ختم ہو جائے گا ۔ اس عقیدے کے بموجب انسان کے علٰحدہ وجود یا تفرد یا دوسرے لفظوں میں خودی کی نفی ہوتی ہے ۔

لذت پرستوں کا ایک گروہ موت کے بارے میں کچھ اس طرح کی رائے رکھتا ہے کہ :

" تمام برائیوں میں سب سے بڑی موت ہے لیکن ہمارے لئے کچھ بھی نہیں ۔ جب ہم زندہ ہوتے ہیں تو موت نہیں ہوتی اور جب موت ہوتی ہے تو ہم زندہ نہیں ہوتے اس لئے موت نہ زندوں کے لئے خوف کا موجب

ہونی چاہیئے نہ مردوں کے لئے منذروں سکے لئے اس کا وجود نہیں بلادمر کے ہوئے خود وجود نہیں رکھتے۔" (اپی کیوریس)

اسلام نے موت کے بارے میں جو عقیدہ دیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ :

"دنیا کی زندگی عارضی ہے دنیا دارالعمل ہے موت عالم آخرت میں منتقل ہونے کا ذریعہ ہے۔ عالم آخرت میں انسان کے لئے عمل کا کوئی موقع نہیں بلکہ وہ دارالمکافات ہے۔"

آخرت کے بارے میں اس قسم کا عقیدہ ہی انسان کو دنیا میں اپنے عمل کے محاسبہ کی فکر پیدا کرتا ہے اسلام نے اس خیال کی شدت سے تردید کی ہے کہ بس دنیا کی زندگی ہی تک معاملہ ہے اس کے بعد کچھ نہیں۔ جیسا کہ اس شعر میں کہا گیا ہے ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا

اقبال نے موت اور عالم برزخ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بادی النظر میں کچھ علٰحدہ نوعیت کے معلوم ہوتے ہیں۔ اقبال نے چونکہ ہمیشہ حرکت کی تعلیم دی اور جمود کی شدت سے مخالفت کی ہے۔ وہ زندگی جو حرکت سے عاری ہو اقبال کی نظر میں زندگی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال موت کے بعد بھی روح کے ارتقاء کی بات کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ روح جو لافانی شے ہے اپنی تکمیل کے لئے نہ صرف دنیا کی زندگی کو کام میں لاتی ہے بلکہ موت کے بعد کی زندگی میں عروج و ترقی کے منازل و مراتب طے کرتی ہے۔ اور جمود و بے حسی (جو قوموں کے لئے روگ اور موت کا سبب ہے) کے برخلاف حرکت اور جہد مسلسل پر شدت سے اصرار اقبال کے پیغام کا خاصہ ہے اس کی یہی وجہ ہے کہ ملت اسلامیہ کو جو خواب گراں کی خوگر اور حرکت و عمل سے کوری ہو چکی تھی پھر سے متحرک اور بیدار و آمادۂ پیکار کرنا چاہتے تھے اسی لئے ان کے کلام میں زندگی اور موت کا تصور قدرے بدلا ہوا ملتا ہے۔ یہاں ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اقبال کا دل امت کے غم میں کرب و اضطراب میں مبتلا رہتا تھا۔ وہ ایک ایسے دردمند انسان تھے جنہوں نے اپنے پیغام کو پہنچانے کے لئے شاعرانہ انداز بیان اختیار کیا تھا۔ اقبال کی حیثیت ان امور میں نہ تو فقیہہ کی ہے نہ مفتی کی۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ موت کو جس طرح کوئی نبی یا پیغمبر پیش کرتا ہے اقبال سے ہم اس کی توقع نہیں کر سکتے۔ اقبال پیغام ضرور دیتے ہیں لیکن پیغمبر نہیں تھے۔ انہوں نے جو کچھ کہا بس اس کی حقیقت یہ ہے کہ اپنے دل کی دھڑکنوں کو شعر کے قالب میں ڈھالا ہے۔ وہ دھڑکنیں جو امت مسلمہ کی حالت زار پر خصوصاً اور عام انسانیت کے لئے عموماً ان کے دل نے پیدا کی تھیں ——

اس وضاحت کے بعد اب آئیے اقبال کے ان تصورات کی طرف جو موت کے بارے میں انہوں نے ظاہر کئے ہیں

اقبال کا خیال ہے کہ زندگی جب ایک بار دے دی جاتی ہے تو اس کے لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یعنی موت زندگی کے لے لینے کا نام نہیں۔ موت سے جسم تو چھینا جا سکتا ہے روح نہیں یعنی موت جسم کو آتی ہے روح نہیں مرتی۔ روح اصل انسان ہے اس کو موت نہیں بلکہ بندہ آزاد کے لئے موت ایک نئی زندگی میں قدم رکھنے کا نام ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

بندہ آزاد را شانِ دگر   مرگ او را می دہد جانے دگر

اقبال ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

کشادِ در دل سمجھتے ہیں اس کو   ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں

اقبال موت کو نئی زندگی کا آغاز، دنیاوی زندگی کی شام کے بعد حیاتِ ابدی کی صبح نو قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

مومن کی نگاہ میں موت ایسی ہے جیسے شیر کی نظر میں بے چارہ آہو۔ اس تشبیہ سے ایک نکتہ یہ بھی پیدا ہوتا ہے جس طرح آہو شیر کی غذا بن کر اس کی طاقت و توانائی کا سبب بنتا ہے اسی طرح بندہ مومن موت سے خونِ تازہ اور توانائی مزید حاصل کرتا ہے۔ یہاں موت کس قدر حقیر اور زندگی کتنی توانا نظر آتی ہے ــــ فرمایا ؎

بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ   اک مقام از صد مقام اوست مرگ

بلکہ فرماتے ہیں کہ زندگی خود موت کی گھات میں رہتی ہے یعنی اندازہ کیجئے کہ جو موت کا مشتاق ہو موت اسے کیسے مار سکتی ہے ؎

اتر کر جہانِ مکافات میں   رہی زندگی موت کی گھات میں

اقبال کی نظر میں موت زندگی کے ارتقاء میں ایک مرحلہ ہے اور تجدیدِ مذاقِ زندگی کا ذریعہ ہے۔ فرمایا ؎

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے   خواب کے پردہ میں بیداری کا اک پیغام ہے

موت کی حقیقت کہ وہ کتنی بے حقیقت شے ہے یوں واضح کی ؎

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمانِ غیور
موت کیا شے ہے؟ فقط عالمِ معنیٰ کا سفر

مردِ مومن کا ایک نمایاں وصف مرنے کا شوق اور موت سے پیار ہے۔ امت میں اسی وصف کو پیدا کرنے کے

آرزو مند ہیں ۔ فرماتے ہیں ؎

از مرگ ترسی اے زندہ جاوید　　مرگ است صیدے تو در کمینے
جانے کہ بخشند دیگر نگیرند　　آدم بمیرد از بے یقینے

مرد آزاد موت کو جس طرح دیکھتا ہے اس کو اقبال نے یوں بیان کیا ؎

او خود اندیش و مرگ اندیش نیست　　مرگ آزادان ز آنے بیش نیست

اقبال کی نظر میں یہ مفروضہ غلط ہے کہ موجودہ انسان کی ذہنی اور جسدی ساخت حتمی اور قطعی ہے اور اس کے بعد ارتقاء کی کوئی منزل نہیں رہی ۔ چنانچہ فرمایا ؎

یہ نکتہ سیکھا میں نے بوالحسن سے　　کہ جاں مرتی نہیں مرگ بدن سے

موت کے ساتھ اس جہانِ فانی کے بچھڑنے کا غم کس قدر بے معنیٰ اور لغو ہے علامہ اقبال کے اس شعر میں دیکھئے ؎

چہ غم گر یک جہاں گم شد ز چشمم　　ہنوز اندر ضمیرم صد جہاں است
چہ غم داری حیاتِ دل ز دم نیست　　کہ او در حلقۂ بود و عدم نیست
مخور اے کم نظر اندیشۂ مرگ　　اگر دم رفت دل باقیست غم نیست

اقبال کے بموجب موت کے بعد کی زندگی مشروط ہے یعنی صرف انہیں لوگوں کو زندگی ملے گی جنہوں نے دنیاوی زندگی میں اپنی خودی کے استحکام کی فکر کی ہوگی ۔ جس کی خودی کو دنیا کی زندگی میں ارتقاء کا موقع نہ ملا ہو وہ عالم آخرت میں بھی ارتقاء سے محروم رہے گا ۔ چنانچہ فرمایا ؎

بانگِ اسرافیل ان کو زندہ کر سکتی نہیں　　روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد
مر کے جی اٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام　　گرچہ ہر ذی روح کی منزل ہے آغوشِ لحد

الغرض اقبال زندگی اور موت کی حقیقت کو ایک نئے انداز سے سمجھاتے ہیں ۔ زندگی ان کی نگاہ میں ایک تسلسل کا نام ہے جس کا کوئی خاتمہ نہیں ۔ رہی موت تو وہ ایک درمیانی مرحلہ ہے جس کے بعد زندگی تازہ دم ہو کر نئی شان سے اپنے ارتقائی سفر پر گامزن ہوتی ہے اور موت کے بعد زندگی کیلئے نئے امکانات روشن ہوتے ۔ انسان کی خودی اپنی تکمیل کے مراحل کے لئے ایک نیا عرصہ پاتی ہے ۔ اپنے اس بیان کو اقبال کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں ؎

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

احمد علی خاں ادیب

لغاتِ غالب

مرزا اسد اللہ خاں غالب مرحوم کی سرگذشت بار بار اس کثرت سے قلمبند ہوئی ہے کہ یہاں اس کا اعادہ تحصیل حاصل ہے ۔ مجھے مرزا غالب کے نام سے زیادہ ان کے کام کا ایک رخ پیش کرنا ہے ۔

یوں تو خواجہ الطاف حسین حالی نے "یادگارِ غالب" جیسی یادگار کتاب لکھ کر بہت بڑی حد تک اس کا حق ادا کیا ہے اور سیکڑوں اہلِ قلم حضرات نے غالب کی شاعری کے بے شمار گوشے اجاگر کئے ہیں ۔ جہاں نقادانِ سخن نے کھلے دل سے غالب کے محاسنِ شعری کا اعتراف کیا ہے وہاں ان کے حین حیات اور دنیا سے گذر جانے کے بعد بھی ان پر کڑی تنقیدیں شائع ہوتی رہی ہیں ۔ بادی النظر میں یہ فیصلہ کرنا سخت مشکل ہے کہ آیا غالب کا مقام اسالیب نثر کی تخلیق میں ارفع و اعلیٰ ہے یا شاعرِ بے بدل کی حیثیت سے وہ درجہ اجتہاد پر فائز نظر آتے ہیں ۔ اگر ان کے تمام ادبی کارناموں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مرزا غالب کی افتادِ طبع ہرگز اس کی مقتضی نہ تھی کہ وہ اپنے ہمعصر شاعروں اور نثاروں کی شاہراہِ عام پر چل پڑتے ۔ بقول انہیں کے جس کو دنیائے عام میں مرنا بھی گوارا نہ ہو اس کی ادبی زندگی کیونکر عامیانہ بن کے رہ جاتی ۔ انہوں نے اپنے رشحاتِ قلم کی ہر عمارت جدت طرازی کے سنگِ بنیاد پر قائم کی اور اسی کی بدولت اپنی نثر کے ذریعہ متناسب آب و رنگ کا جو بھی مرقع انہوں نے اردو ادب کو بخشا اس کی مثال نثرِ اردو کی تاریخ میں کہیں دستیاب نہیں ہوتی مگر منظومات میں ان کی یہی روشنی طبع (جدت طرازی) جابجا غلو کی حد تک پہنچ گئی ۔ وہ فارسی کے عاشق تھے ، شعرائے فارس کے دواوین کا پورا پورا جائزہ لے چکے تھے ۔ خود قلم برداشتہ فارسی لکھتے اور کبھی کبھی عالمِ سرخوشی میں فارسی کی مئے دوآتشہ اردو کے جام میں ایک دم جو انڈیل دیتے تو وہ لامحالہ چھلک جاتا ۔ یہی سبب ہے کہ وہ ہمیشہ الفاظ و محاورات وغیرہ کو اپنے چونکا دینے والے تخیلات ، نادر تشبیہات و استعارات اور دلکش محاکات کے تابع

مکان نمبر ۱۰-۳-۱ بی کلاس ۔ بال سٹی کا کمپٹ ۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۲۴ (اے پی)

بنائے رکھتے تھے اس طرح ان کی اپنی ایک خاص زبان عالم وجود میں آئی۔ اگر نگارشات غالب سے غالب کے وضع کیے ہوئے الفاظ و محاورات اور تراکیب چن چن کر یکجا کرلئے جائیں تو شکسپیر ڈکشنری کی طرح ایک چھوٹی اعلیٰ غالب ڈکشنری تیار ہوسکتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ وہ کس حد تک ٹکسالی یا ٹکسال باہر سمجھی جائے گی اس کا تجربہ آئندہ نسلیں خود ہی اٹھالیں گی خذ ما صفا و دع ما کدر کے معیار پر ان مخترعات غالب کو قبول عام نصیب ہوگا وہ یقیناً ہماری زبان کی توسیع و اشاعت میں ممد ثابت ہوں گے۔

مذکورہ بالا غالب ڈکشنری کی تدوین کا مختصر سا خاکہ دیوان غالب سے چند مخصوص الفاظ و محاورات و تراکیب اخذ کرکے زیر نظر مضمون میں بطور نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اہل الرائے حضرات سے ملتمس ہوں کہ وہ اس خصوص میں اپنے مفید مشوروں سے مجھے مستفید فرمائیں۔

نمونہ لغات غالب

آرزو خرامی : اس سے آرزو کرنا مراد ہے۔ ہماری زبان میں آرزو برآنا، آرزو بر لانا، آرزو بڑھانا، آرزو پوری کرنا، آرزو پوری ہونا، آرزو ٹپکنا، آرزو چھپانا، آرزو خاک میں ملا دینا، آرزو خاک میں مل جانا، آرزو نکلنا، آرزو رہ جانا، آرزو ساتھ لے جانا، آرزو جیب نہیں، آرزو کا خون ہونا، آرزو کرنا، آرزوگاہ آرزو گور میں لے جانا، آرزو مٹ جانا، آرزومند، آرزو نکالنا، آرزو نکلنا، آرزو سے عام سب استعمال ہوتے ہیں مگر آرزو کرنے کے مفہوم میں آرزو خرامی کی ترکیب اردو میں رائج نہیں ہے۔ سب ہی جانتے ہیں کہ آرزو کرنا کے معنی ہیں تمنا کرنا خواہش کرنا مگر خواجہ حیدر علی آتش نے منت اور التجا کرنے کے مفہوم میں اسے نظم کیا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

دیدار عام کیجئے پردہ اٹھائیے
تا چند بندہ ہائے خدا آرزو کریں

یعنی اللہ کے بندے کب تک تمہاری خوشامد کرتے رہیں۔ جس طرح یہ صرف الشاذ کالمعدوم کی تعریف میں آتا ہے اسی طرح غالب کا یہ شعر ہے ؎

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی
دل جوش گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

اے : یہ حرف ندا ہے جو عربی میں الف کے زبر سے، فارسی میں الف کے زیر سے اور اردو میں دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اردو والے بیشتر الف کے زیر ہی سے بولتے ہیں۔ ان تینوں زبانوں میں حرف ندا کے بعد منادیٰ کا لانا ناگزیر ہوتا ہے۔ اہل فارس اگر منادیٰ ذکر نہ کریں تو اس کے بجائے "آنکہ" یا "کہ" فرولہ

وقتیں ہیں مگر ہمارے اردو کے شاعر نے اس قاعدہ کلیہ سے انحراف کرکے اپنے اس شعر میں مناعی کو یکسر حذف کر دیا ہے

اے ترا غمزہ یک قلم انگیز — اے ترا ظلم سر بسر انداز (غالب)

یہی نہیں بلکہ شاعر نے ذیل کے شعر میں عجز اور رسوا کے مفہوم میں بھی "اے" نظم کیا ہے جس کی مثال اردو شاعری میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی ہے

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ — اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے (غالب)

چلا دے = یعنی برباد کر دے ۔ اگرچہ فارسی میں چیزے بباد دادن تباہ و برباد کر دینے کے معنی میں مستعمل ہے لیکن "بباد دینا" ہماری زبان نہیں ۔ ذیل کا شعر اسی ادبی بدعت کا حامل ہے

نالہ دل نے دیئے اوراق لخت دل بباد

یادگار نالہ اک دیوان بے شیرازہ تھا

بیوفائی کا رسوا = یعنی اپنی بیوفائی کی وجہ سے بدنام ۔ مندرجہ ذیل شعر میں شاعر نے "بیوفائی کا رسوا" والا غیر شاعرانہ ٹکڑا ہی نظم نہیں کیا بلکہ "حسن تماشا دوست" کی ترکیب بھی موزوں کی ہے

نہ ہو حسن تماشا دوست رسوا بیوفائی کا

بہ مہر صد نظر ثابت ہے دعوے پارسائی کا

پا بدامن ہو رہا ہوں = یعنی پاؤں سمیٹے بیٹھا ہوں ۔ فارسی میں "پا بہ دامن کشیدن" والا محاورہ پاؤں سمیٹ کر بیٹھ جانے اور آمد و رفت ترک کر دینے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے ۔ شاعر نے اپنے اس شعر میں فارسی محاورے کا ترجمہ نظم کیا ہے

پا بدامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد

خار پا ہیں جوہر آئینۂ زانو مجھے

پرسش ہائے پنہانی = یعنی وہ آگاہی جو پوشیدہ طور پر یا چھپ کر حاصل کی جائے ۔ فارسی میں پرسش بمعنی عیادت و تعزیت ہے ۔ کسی کی حالت دریافت کرنی ہو تو پرسش حال کہیں گے ۔ شاعر نے اپنے اس شعر میں پرسش کو کنایۃً پرسش حال کے مفہوم میں بہ صیغہ جمع نظم کیا ہے

کیوں نہ ہو بے التفاتی اس کی خاطر جمع ہے

جانتا ہے محو پرسش ہائے پنہانی مجھے

پریشانی شمع = شمع کی لو کی تھرتھراہٹ مراد ہے ۔ پریشانی کے معنی ہیں بکھر جانا ، ہوا سے شمع کی لو کی تھرتھراہٹ ظاہر کرنے کے لئے شاعر نے اپنے اس شعر میں "پریشانی شمع" اڑ جانے کے مفہوم میں جلوہ دیری کا

کی جو شاعرانہ اور عالمانہ ترکیب نظم کی ہے اس سے اس کے تخیل کی بلندی اور لطافت ظاہر ہوتی ہے ؎

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے

بہ جلوہ ریزیِ باد و بہ پرفشانیِ شمع

پشتِ دست بر زمیں نہادن : عاجزی و فروتنی کرنا۔ مندرجہ ذیل شعر میں شاعر نے مذکورہ بالا محاورے "پشت دست" اور "خس بہ دنداں گرفتن" (عجز ظاہر کرنا اور امان مانگنا) سے "خس بہ دنداں" کے ٹکڑوں کے ذریعے عاشق کے عجز کی انتہا تو ظاہر کر دی مگر صوری اعتبار سے فارسی کے محاورے سے ناقص شکل میں نظم کر کے اپنے بیان کے عجز کا بھی مظاہرہ کر دیا حالانکہ اردو کا محاورہ بھی جز نہیں بلکہ کلی حیثیت میں نظم کیا جاتا ہے ؎

ہم سے رنجِ بے تابی کس طرح اٹھایا جائے

داغِ پشتِ دستِ عجز شعلہ خس بہ دنداں ہے

پیہم : متواتر۔ فارسی میں پئے ہم (بہ اضافت) اور پیہم (بلا اضافت) دونوں درست ہیں مگر اردو میں اضافت کے بغیر صرف پیہم رائج ہے۔ مندرجہ ذیل شعر میں شاعر نے فارسیوں کی طرح پئے ہم موزوں کیا ہے ؎

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو

صد رہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو

تماشا کرنا : اس سے دیکھنا مراد ہے جو تماشا کردن کا ترجمہ ہے حالانکہ اردو میں "تماشا کرنا" کے معنی ہیں سوانگ کرنا، ناٹک کرنا، کرتب دکھانا، کسی کا ٹھٹھا کرنا اور احمق بنانا۔ شاعر نے دیکھنے کے معنی میں تماشا کرنا باندھ کر فارسی کی پوری پوری پیروی کی ہے ؎

خانہ ویراں سازیِ حیرت تماشا کیجیے

صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست

جا گرم کی : یعنی دیر تک بیٹھا۔ جا گرم کردن فارسی کا محاورہ ہے جو بیٹھے رہنے کے مفہوم میں کنایتہً استعمال ہوتا ہے۔ شاعر نے اپنے اس شعر میں اسے اردو کا جامہ پہنا دیا ؎

کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا

آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

چراغِ کشتہ : یعنی ٹمٹماتا چراغ جو بجھ جانے کو ہے۔ چراغِ کشتہ کے معنی ہیں بجھا ہوا چراغ مگر شاعر نے اپنے اس مصرعے میں اسے ٹمٹماتے چراغ کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ ح

رحم کر ظالم کہ کیا بود چراغ کشتہ ہے

خلوتِ ناموس ۔ یعنی خلوت شرم و حیا ۔ ہماری زبان میں خلوت خانہ، خلوت سرا، خلوت گاہ، خلوت گزیں، خلوت نشین جیسی ترکیبیں تو استعمال ہوتی ہیں مگر "خلوت ناموس" لفظاً و معناً بالکل اچھوتی ترکیب ہے ۔ علی ہذا کسوت فانوس ہے ؎

شب کہ وہ مجلس فروز خلوت ناموس تھا
رشتہ ہر شمع خار کسوت فانوس تھا

دریا آشنا ۔ یعنی جو دریا کی طرح وسیع ہو ۔ لفظ آشنا کے حسب ذیل معنی ہیں :
دوست، واقف، ہیراک، عارف، قدر بیگانہ، حال کا شریک، روشناس، ترکیب کے ساتھ بھی آتا ہے مثلاً حرف آشنا، صورت آشنا، مندرجہ ذیل شعر میں دریا آشنا کی ترکیب لفظی اور معنوی دونوں حیثیتوں میں اچھوتی ہے ؎

شوق ہے ساماں طراز نازشِ ارباب عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

اس شعر میں "دریا آشنا" کے علاوہ "ساماں طراز" (سامان مہیا کرنے والا) ارباب عجز (عشاق؟) اور صحرا دستگاہ (جس میں صحرا کی سی وسعت ہو) جیسی ترکیبیں اردو میں رائج نہ ہونے کے باوجود ذوق سلیم پر گراں نہیں گزرتیں ۔ شاعر کا یہ اجتہاد ادب کا بہت بڑا کمال ہے

دم باہر ہونا ۔ اس سے مراد ہے بے اختیار ہو جانا ۔ دم کے معنی ہیں سانس اور "دم شمشیر" تلوار کی دھار کو کہتے ہیں ۔ مندرجہ ذیل شعر میں اگرچہ شاعر نے لفظ "دم" سے شاعرانہ کرتب دکھانے کی کوشش کی ہے لیکن "دم باہر ہونا" اردو کا کوئی محاورہ نہیں ہے ؎

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیئے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

دم کے تعلق سے ہماری زبان میں حسب ذیل محاورے استعمال ہوتے ہیں :
آنکھوں میں دم ہونا، دم اٹکنا، دم اکھڑنا، دم الٹنا، دم الجھنا، دم باقی نہ ہونا، دم بڑھ جانا دم بند کرنا، دم بھرنا، دم بھرانا، دم پر آنا، دم پر بن جانا، دم پر چڑھانا، دم پر چھوڑ دینا، دم پھڑکنا دم پھلنا، دم پھونکنا، دم ٹوٹنا، دم چرانا، دم چڑھنا، دم چھوڑ دینا، دم خشک ہونا، دم دیکھنا، دم دینا، دم رکنا، دم رہنا، دم سادھنا، دم سولی پر ہونا، دم سے لگنا، دم فنا ہونا، دم کھینچنا، دم لبوں پر آنا

دم لگانا، دم لینا، دم مارنا، دم میں آنا، دم میں دم رکنا۔ یہ سب زبان زد خاص و عام ہیں۔

دنداں در دل افشردن : یعنی تکلیف و مصیبت برداشت کرنا۔ فارسی کا اصل محاورہ ہے دنداں بر جگر افشردن جس کے معنی ہیں "دل بر بلا نہادن و جرأت بر کار دشوار نمودن"۔ اس کا ترجمہ ہوگا۔ مرنے پر مستعد ہو جانا اور سخت و دشوار کام کرنے کی جرأت کرنا۔ مندرجہ ذیل شعر میں شاعر نے فارسی کے متعارف محاورے کا پیوند لگا کر اس کے مفہوم میں بھی تصرف سے کام لیا ہے حالانکہ اردو تک کے محاورے میں تصرف جائز نہیں سمجھا جاتا ہے

کلفت افسردگی کو عیشِ بے تابی حرام
ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

رحمت : اس سے مراد ہے رحم کرنا۔ مندرجہ ذیل شعر کا سیاق و سباق چاہتا ہے کہ رحمت کے بعد کوئی فعل محذوف سمجھا جائے۔ رحمت نازل ہونا، رحمت برسنا اور رحمت خدا کی، مستعملات اردو ہیں

کس پردگی ہے آئینہ پرداز اے خدا!
رحمت کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے

زرِ از دست رفتہ : ہاتھ سے نکلی ہوئی دولت۔ مندرجہ ذیل شعر میں شاعر نے "زر از دست رفتہ" کا ٹکڑا اس بے تکلفی سے موزوں کر دیا کہ گویا ہاتھ سے نکلی ہوئی دولت کا ترجمہ ہی مقصود تھا

ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر
ہوں گلفروشِ شوخیٔ داغِ کہن ہنوز

مژگانی کرے : یعنی مژگاں کا کام دے۔ مندرجہ ذیل شعر میں "مژگانی کرے" کا ٹکڑا نہ ہماری زبان ہے اور نہ مستعملات فارسی سے بلکہ شاعر کی اپنی اپج ہے۔ اسی طرح "موئے شیشہ" سے شاعر نے وہ بال مراد لیا ہے جو ٹوٹے ہوئے شیشہ میں پیدا ہو جاتا ہے

میکدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پائے شکست
موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

زبان و بیان کے اعتبار سے کلامِ غالب کے رطب و یابس کی اور بھی مثالیں ہیں مثلاً۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ غالب جیسا نغز گو شاعر دو جملوں کو مربوط کرنے کے لئے "اور" کے عمل بر (؟) غلط کیونکر نظم کر گیا۔ شعر ملاحظہ ہو

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں + دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

(ماخوذ از "سب رس" حیدرآباد۔ غالب نمبر بابت ستمبر ۱۹۶۹ء)

جگن ناتھ آزاد

احسان دانش

یوں تو سال ٹھیک سے یاد نہیں آرہا ہے لیکن یہ چونکہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب میں راولپنڈی کے ڈی اے وی کالج میں زیر تعلیم تھا فرسٹ ایر یا سکنڈ ایر میں، اس لئے یہ بات ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء کی ہو سکتی ہے والد محترم لاہور کے ایک مشاعرے سے واپس آئے اور آتے ہی مجھے یہ بتایا کہ اب کے ایک نئے شاعر کو سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ نام ہے اس کا احسان بن دانش کاندھلوی۔ بہت اچھے شعر کہتا ہے ترنم سے پڑھتا ہے اور اتنا اچھا پڑھتا ہے کہ سننے والوں پر جادو کر دیتا ہے۔ میں نے اس وقت تک حفیظ جالندھری کے علاوہ اور کسی اچھے پڑھنے والے شاعر کو نہیں سنا تھا اس لئے قدرتی طور پر میرا سوال یہ تھا کہ "کیا حفیظ صاحب سے بھی اچھا پڑھتا ہے؟" کہنے لگے "حفیظ کی آواز میں دلکشی زیادہ ہے۔ زیر و بم کی کیفیت اسے اور دلآویز بنا دیتی ہے، احسان میں یہ بات نہیں، لیکن مقابلے کا سوال یوں اس لئے پیدا نہیں ہوتا کہ احسان کا ترنم بالکل ہی مختلف انداز کا ہے۔ اس کی آواز میں بھی بلا کی تاثیر ہے اور یہ سیدھی دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔

والد نے یہ بھی بتایا کہ احسان بن دانش سے ملاقات بھی ہوئی اور اس نے اپنی غزلوں کا مجموعہ "حدیث ادب" مجھے دیا ہے۔ یہ کہہ کے انہوں نے "حدیث ادب" بکس سے نکال کر میرے حوالے کی۔

آج اس واقعہ کو پورے پچاس برس ہو رہے ہیں۔ بقول حفیظ

نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

لیکن "حدیث ادب" کے چند اشعار مجھے آج بھی یاد ہیں اگرچہ اس کتاب کو اس زمانہ کے بعد دوبارہ دیکھنے کا موقع نہیں ملا اور غالباً اس کا دوسرا ایڈیشن چھپا بھی نہیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس کی ابتدائی غزلوں میں ایک غزل یوں شروع ہوتی تھی ؎

یہ وقت دیدنی ہے الوداع اے خالقِ عالم!
ترے بندے سبھی ہم سے پیش آتے ہیں خدا ہو کر

بعد کی غزلوں میں اشعار اس طرح کے تھے ؎

اٹھو عاشقو! آ رہے ہیں وہ شاید — قیامت میں وعدہ وفا کرنے والے
بہت دور ہیں رسم دیر و حرم سے — سجودِ محبت ادا کرنے والے

ہجومِ حشر میں اس واسطے ہوں شرمندہ
بقدرِ رحمتِ یزداں گناہ کر نہ سکا

آج اگر میں یہ اشعار پہلی بار پڑھتا تو مجھے شاید یہ متاثر نہ کرتے لیکن انچاس پچاس برس قبل جب کہ میری عمر پندرہ سولہ برس کی تھی مجھے ان اشعار نے بہت متاثر کیا اور میں نے "حدیثِ ادب" اول سے آخر تک پڑھ ڈالی۔

چند ماہ بعد والد محترم پھر ایک مشاعرہ میں شرکت کے لئے لاہور گئے۔ واپسی پر پھر انہوں نے احسان دانش کا ذکر کیا کہ اب کے احسان نے پھر مشاعرہ لوٹ لیا اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اب وہ احسان بن دانش کاندھلوی نہیں ہیں بلکہ صرف احسان دانش ہیں۔

ہاں یاد آیا والد نے پہلے سفر سے واپسی پر یہ بھی بتایا تھا کہ جب احسان نے اپنی کتاب "حدیثِ ادب" انہیں پیش کی تو والد نے ایک شعر لکھ کے احسان کی نذر کیا اور وہ شعر یہ تھا ؎

ہوا ہنگامہ آرا شعر میں احسان بن دانش
یہ با دانش اگر ہوتا قیامت ہی بپا کرتا

بہر طور اس مدت میں احسان بن دانش، احسان دانش بن چکے تھے۔

اسی زمانہ کی بات ہے مشہور اخبار نویس لالہ دینا ناتھ حافظ آبادی جنہوں نے اپنے دور میں "ہندوستان" کے مدیر کی حیثیت سے بڑا نام پایا تھا مرض الموت میں گرفتار ہو گئے۔ ان کے اشعار ان دنوں مہاشے ناننک چند ناز "پرتاپ" میں جس کے وہ ایڈیٹر تھے چھاپا کرتے تھے۔ یوں تو لالہ دینا ناتھ کے اشعار میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی تھی۔ اکبر الہ آبادی کے رنگ میں وہ مزاحیہ اشعار کہنے کی کوشش کیا کرتے تھے اور یہ اشعار "ظرافت تکلیلی" کے عنوان سے "پرتاپ" میں چھپتے تھے۔ ع مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی اکبر کے رنگ میں اقبال ہند کہہ سکے لالہ دینا ناتھ کیا کہتے لیکن بسترِ مرگ سے انہوں نے چند اشعار اشاعت کے لئے "پرتاپ" کو بھیجے۔ ان اشعار کی بات ہی کچھ اور تھی۔ مزاحیہ رنگ نہیں تھا۔ یہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت ان کے دل کی صدا تھی آواز تھی۔ یہ اشعار تعداد میں چار یا پانچ تھے مجھے اس وقت صرف ایک ہی شعر یاد ہے ؎

دنیا سے سب کو جانا ہے اور وقت چلا آپہنچا

گو دل میں ہے دنیا کی حسرت دنیا سے مگر ہم چلتے ہیں

ان اشعار میں سے کسی ایک کا مصرعِ ثانی مہاشے ناتک چند ناز نے مصرعِ طرح کے طور پر پیش کیا۔ اکثر شعراء نے اس پر طبع آزمائی کی۔ مجھے اس وقت تمام شعراء میں سے صرف والدِ محترم اور احسان دانش کے اشعار یاد ہیں۔ والدِ محترم کے اشعار یہ تھے ؎

اے لالہ دنیا ناحق تیرا، یہ شعر ہے کتنا درد بھرا

دینے کو داغ فغاں سینے کو آنکھوں سے اشک نکلتے ہیں

دل خوش ہے ابھی پرغم ہے ابھی شادی ہے ابھی ماتم ہے ابھی

تصویرِ حیات کے منظر بھی کتنی تیزی سے بدلتے ہیں

اور احسان دانش کے اشعار یہ تھے ؎

جب موت کے بازو بالیں پر بیمار کے پنکھا جھلتے ہیں

ہنسنے والوں کی آنکھوں سے حیرت کے اشک نکلتے ہیں

اعمال ضیا پھیلاتے ہیں قندیل تجلی بن بن کر

اس راہ میں جتنے رہرو ہیں سب تنہا تنہا چلتے ہیں

یہ احسان دانش کے ساتھ میرا پہلا تعارف تھا۔ غائبانہ تعارف۔ یا یوں کہیے کہ یہ شاعر احسان دانش کا یہ تعارف تھا اپنے ایک قاری جگن ناتھ آزاد کے ساتھ۔

میں جب انٹرمیڈیٹ میں پڑھتا تھا تو سرگودھا کے ایک مشاعرے میں شرکت کرنے گیا تھا لیکن لاہور ابھی دور تھا اس لئے احسان کے ساتھ ملاقات کی خواہش اگرچہ تھی بھی تو وہ دل کے نہاں خانے میں ر
—— لیکن ہوا یوں کہ انہی دنوں راولپنڈی میں ایک مشاعرہ ہوا۔ بہت بڑا مشاعرہ۔ غالباً یہ مشاعرہ عبدالعزیز فطرت مرحوم کی کوششوں سے منعقد ہوا تھا۔ وہ انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے میں ان کا انجمن کا اسسٹنٹ سکریٹری۔ فطرت صاحب نے مجھ سے کہا کہ جگن! اس مشاعرے میں تمہیں بھی کلام پڑھنا
اس دعوت سے مجھے خوشی تو بہت ہوئی اور میں شرکت مشاعرہ کے لئے آمادہ بھی ہو گیا لیکن جب مشاعرہ
میں پہنچا — اور پہنچا کیا مجھے تو کے از منتظمین کے طور پر وہاں پہنچنا ہی تھا —— اور جب احسان اور دوسرے
ترنم سے پڑھنے والے شعراء کا کلام سنا تو حوصلہ پست ہو گیا اور میں نے اپنے آپ کو یہ مشورہ دیا کہ آزاد
یہ دنگل ہے۔ یہاں تمہاری دال گلنا دشوار ہے۔ شعر پڑھنے کا خیال دل سے نکال دو چپ چاپ بیٹھ

ممکن ہو۔ آزاد صاحب نے فوراً یہ مشورہ قبول کیا اور مشاعرہ گاہ سے اٹھ کر باہر آگئے اور ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر آخر تک مشاعرہ سنتے رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مشاعرہ میں جس شاعر نے مجھے بے حد متاثر کیا وہ احسان دانش تھے اس مشاعرے میں جوش، جگر اور حفیظ شریک نہیں تھے۔ معلوم نہیں وہ ہوتے تو میرا ردعمل کیا ہوتا لیکن یہ مفروضے پر مبنی بات ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ وہ مشاعرہ احسان دانش کے ہاتھ رہا۔

اس مشاعرے میں احسان نے متعدد نظمیں سنائیں۔ جی ہاں نظمیں، غزلیں نہیں۔ نظموں کے عنوانات کچھ اس طرح کے تھے۔ جشن بہاراں، مزدور کی بیٹی، بیتے ہوئے دن۔ احسان کا ترنم لاجواب ترنم تھا اور کلام بھی معیاری تھا۔ اس وقت سنی ہوئی نظموں کے بعض اشعار اور مصرعے آج بھی حافظے میں باقی ہیں۔ مثلاً۔

ہے داغ دل اک شام الم پوش کا منظر
تھا ظلمت خاموش میں شہزادۂ خاور
عالم میں ڈھلکنے ہی کو تھے رات کے گیسو
انوار کے شانوں پہ تھے ظلمات کے گیسو

پرائے گھر میں بیٹی جا رہی ہو
غریب اس پہ محشر ڈھا رہی ہو
مگر تاباں رہے عصمت کا غازہ
چلی ہے پالکی نکلے جنازہ

شام ہے سرمہ برستا ہے بساط خاک پر

بیتے ہوئے دن، کا ٹیپ کا مصرعہ یہ تھا ؎

بیتے ہوئے دن کچھ ایسے ہیں تنہائی جنہیں دہراتی ہے

اور نظم کچھ یوں شروع ہوتی تھی۔

جب رات کے عبرت نامے کی تصدیق سحر فرماتی ہے
سورج کی دلارا تابانی ظلمات سے ٹکر کھاتی ہے

احسان کی کسی معاشقے کے بارے میں تھی اور اس میں اس طرح کے مصرعے آتے تھے۔

. . . . چہرے کو پریشانی گھیرے
وہ تیتی مستی نگر میں گرم چمکتی کوٹھے پر وہ پھیروں پر پھیرے
مل جائے جو کوئی بھولی افسانے یونہی تیرے میرے
بیتے ہوئے دن کچھ ایسے ہیں تنہائی جنہیں دہراتی ہے

مشاعرہ ختم ہوا تو میں پھر پنڈال کے اندر آ کے منتظمین میں شامل ہو گیا۔ فطرت صاحب نے مجھ سے پوچھا کہاں روپوش ہو گئے تھے۔ میں نے کہا "جو حشر آپ کا ہوا اس سے اپنے آپ کو بچانے گیا۔" کہنے لگے "بیٹی یہ تو بقول تمہارے ایک دنگل تھا۔ ہم لوگوں نے تو بس فرض ہی ادا کیا۔ مشاعرہ تو احسان دانش کا تھا" یہ کہہ کے انہوں نے احسان سے میرا تعارف کرایا۔ احسان بہت محبت سے ملے اور کہنے لگے تم تو میرے بھتیجے ہو میاں یہ سنتے ہی چکرا گیا کیونکہ احسان مجھے والد سے بہت ہی چھوٹے نظر آئے اور مجھ سے ذرا بڑے۔ اب جو میں حساب لگاتا ہوں تو احسان میرے والد سے بیس برس چھوٹے تھے اور مجھ سے گیارہ برس بڑے — یہی اندازہ میرا اس وقت تھا اور میں سوچ میں پڑ گیا کہ انہیں تو میرا دوست ہونا چاہیئے تھا لیکن یہ میرے والد کے دوست ہیں اور میرے چچا بن گئے ہیں۔

انٹرمیڈیٹ کے بعد بی اے کے میرے دو برس بھی راولپنڈی ہی میں گذرے۔ احسان اس دوران میں دو تین بار راولپنڈی آئے مشاعروں میں شرکت کے لئے — میرے دوست فضل الرحمٰن اشک پروپرائٹر ایشیاٹک آرٹیکل ورکس ان کے میزبان ہوا کرتے تھے اور ان کی وجہ سے اکثر میرا وقت احسان کے ساتھ بسر ہوتا تھا لیکن صحیح معنوں میں ان کے ساتھ ملاقاتیں لاہور میں شروع ہوئیں جب میں بی اے کے بعد لاہور آیا ایم اے میں داخلہ لینے کو۔

لاہور آتے ہی جن بزرگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شروع ہو گیا وہ تھے مولانا صلاح الدین احمد، مولانا تاجور نجیب آبادی، ابوالاثر حفیظ جالندھری، چراغ حسن حسرت اور بعض اور حضرات اور قریباً اپنے ہمعصروں جن کے ساتھ نشست و برخاست کی ابتدا ہوئی وہ تھے احسان دانش، شورش کاشمیری، یوسف ظفر، قیوم نظر، عاشق حسین بٹالوی، پرشوتم لال ضیا، میراجی، کرشن چندر، حافظ منیر، راج بلدیو راج، حفیظ ہوشیارپوری اور چند اور احباب۔ وحید قریشی کے ساتھ اس زمانے میں ادبی رشتہ نہیں تھا۔ اورینٹل کالج کا رشتہ تھا۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، ڈاکٹر سید عبداللہ، سید عابد علی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، پروفیسر علم الدین سالک اور پروفیسر جُپتہ رام رتن میرے استاد تھے حلقہ احباب میں نہیں تھے۔

احسان اس زمانے میں مزنگ میں رہتے تھے اور کچہری روڈ پر ان کی کتابوں کی دکان تھی، نام تھا ذیشان بک ڈپو۔ ذیشان ان کے فرزند ارجمند کا نام ہے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ دکان اس جگہ تھی جہاں اب مکتبہ کارواں ہے یا شاید اس سے ایک دکان ادھر یا ادھر۔

احسان کے ساتھ ملاقاتیں اس دکان پر بھی رہتی تھیں اور ان کے مکان واقع مزنگ میں بھی ان پر زیادہ، قریب قریب ہر روز کیونکہ یہ دکان یونیورسٹی سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ گورنمنٹ کالج یا اورینٹل کالج سے نکل کر سیدھا وہیں پہنچ جاتا تھا۔ مکان پر تو اتوار کو چھٹی کے روز ملاقات ہوتی تھی۔

میں وقت تک احسان لارنس باغ اور لاہور ریلوے اسٹیشن پر مزدوری کا دور ختم کر چکے تھے۔ ایک شاعر کے طور پر ان کی شہرت بڑھتے ہوئے دریا کی طرح منزلیں مارتی چلی جا رہی تھی۔ اس لئے ان کے زمانہ مزدوری کے واقعات میرے لئے دیدہ نہیں بلکہ شنیدہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں ان کی شاعرانہ اور صحافیانہ فتوحات کا شاہد ہوں۔ مزدورانہ فتوحات کا نہیں۔

یہ دکان والی بات میں شاید غلط لکھ گیا ہوں۔ غلط کے معنی یہ ہیں کہ ترتیب کچھ غلط ہو گئی ہے۔ غالباً کچہری روڈ سے پہلے احسان کی دکان ہسپتال روڈ پر تھی۔ اس کا نام گیلانی بک ڈپو تھا۔ یہ گیلانی پریس کے مالک بابو نظام الدین گیلانی کی دکان تھی۔ احسان اس دکان پر ملازم تھے۔ احسان سے میری مسلسل ملاقاتوں کی ابتداء اسی دکان پر ہوئی نہ کہ کچہری روڈ والی دکان پر۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے میں اس دکان پر بیٹھا تھا کسی گاہک نے آکر پوچھا۔ آپ کے پاس پریم چند کا ناول "غبن" ہے۔ احسان نے کہا "نہیں ہے"۔ وہ شخص چلا گیا تو میں نے احسان سے کہا کہ "یہ کیا مسخرہ پن ہے وہ سامنے دیکھئے ریک میں "غبن" کی کئی جلدیں رکھی ہیں"۔ احسان نے جواب دیا "اگر کتاب بیچ دیں تو دکان میں کیا رہے گا"۔ غرض اس طرح احسان گیلانی بک ڈپو چلاتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے یونیورسٹی روڈ پر جسے اب کچہری روڈ کہتے ہیں اپنی دکان کھول لی۔ ساتھ ہی آپ نے اپنی کتابیں چھاپنا شروع کر دیں اور آہستہ آہستہ اپنے کاروبار کو فروغ دیتے چلے گئے۔

جوش اور فراق کی طرح احسان بھی گفتگو کے میدان کے مرد تھے۔ جب وہ باتیں شروع کرتے تھے تو سیلاب گفتگو تھمنے میں نہیں آتا تھا۔ اگرچہ ان کی باتوں میں جوش کی سی شگفتگی اور فراق کی سی شتریت نہیں ہوتی تھی لیکن ندرت اور حلیمت کی شان ضرور ہوتی تھی۔ لغت اور قواعد کے اہم رموز وہ لوگوں کو باتوں باتوں ہی میں بتا دیتے تھے۔ طبیعت ایسی حاضر تھی کہ بدیہہ گوئی میں اپنے سے بہتر شاعروں کے مقابلے میں کہیں آگے تھے۔ اس وقت ان کے کتنے ہی فی البدیہہ اشعار مجھے یاد آرہے ہیں لیکن اتفاق کی بات ہے کہ وہ سب کے سب فحش ہیں اس لئے یہاں لکھنے سے معذور ہوں۔ ان اشعار کو وہ "الہیات" کہتے تھے۔ مذہب کے Rituals کے خلاف ان کا اظہار فحش اشعار کی صورت ہی میں ظاہر ہوا کرتا تھا۔ اس وقت احسان نعتیہ اشعار تو کہتے تھے لیکن نماز روزے کے پابند نہیں تھے۔ غالباً اس زمانے میں نعت ان کے لئے محض ایک صنف سخن کی حیثیت رکھتی تھی اور جب نماز روزے کی پابندی ان کے یہاں آئی تو شعر گوئی ختم ہو گئی۔

یوسف ظفر نے کچھ وقت تک احسان سے اصلاح لی۔ یہی بات مجروح سلطان پوری کے بارے میں

بھی حفیظ میں آ ن لاحق ہوا جانے اس میں کہاں تک صداقت تھی لیکن یوسف ظفر کے کلام کی اصلاح تو ہم لوگوں کے سامنے کی بات ہے بہرحال جب یوسف ظفر نے میراجی کے زیر اثر نئی شاعری شروع کی تو ان کا اور احسان کا شاگردی استادی کا رشتہ ختم ہو گیا بلکہ دونوں ایک دوسرے کی بدگوئی پر اتر آئے تھے ۔

احسان کی ابتداء ہی میں مشاعروں سے اچھی خاصی آمدنی شروع ہو گئی تھی ۔ وہ فیاض طبع تھے اپنی ذات پر تو وہ زیادہ خرچ نہیں کرتے تھے لیکن دوستوں کو چائے اور اکثر اوقات اچھی چائے پلانے میں انہیں خوشی محسوس ہوتی تھی ۔ مزاج میں چونکہ سادگی تھی اس لئے تکلفات سے بہت دور تھے ۔ ان کے گھر پر گپ شپ کے دوران میں جب کھانے کا وقت ہو جاتا تھا تو چاہے ہم لوگ تعداد میں دس یا پندرہ ہی کیوں نہ ہوں سب کے لئے ہوٹل سے کھانا آتا تھا ۔ روٹی کے بارے میں وہ ایک ایک سے پوچھتے تھے تم کتنی روٹی کھاؤ گے اور ایک کاغذ پر ہر ایک کے نام کے آگے روٹی کی تعداد یا مقدار لکھ لی جاتی تھی ۔ روٹی اسی حساب سے منگوائی جاتی تھی مثلاً وہ پرچہ اسی طرح کا ہوتا تھا ۔

جگن ناتھ آزاد	½ روٹی	حافظ منیر	½ روٹی
اسحٰق مشہود	۱ روٹی	ایوب شاہد نسیم	¾ روٹی
راج بلدیو راج	¾ روٹی	قمر جلال آبادی	¾ روٹی
پرشوتم لال ضیا	½ روٹی	شورش کاشمیری	½ روٹی
یوسف ظفر	¾ روٹی	احسان دانش	۱ روٹی
		میزان	۶½ روٹی

یہ روٹی بہت بڑے سائز کی ہوتی تھی ۔ قارئین یہ نہ سمجھیں کہ ہم لوگ بھوکے رہتے تھے بلکہ پیٹ بھر کے روٹی کھاتے تھے ۔ اسی حساب سے سالن بھی آتا تھا ۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سالن نہیں منگوایا جاتا تھا اس صورت میں احسان کی بنائی ہوئی لہسن کی چٹنی کے ساتھ ہم لوگ روٹی کھاتے تھے ۔ اب اس وقت اس چٹنی کے ذائقے کی میں کیا بات کروں ۔ سالن کا ہم لوگوں کو خیال ہی نہ آتا تھا ۔

چٹنی سے یاد آیا ۔ مرلی منوہر شاد پروپرائٹر لائل پور کاٹن ملز (شاگرد حضرت بیخود دہلوی) مشاعروں کے شوقین اور شاعروں کے عاشق زار تھے ۔ میرے ساتھ اور احسان دانش کے ساتھ ان کے بہت ہی گہرے دوستانہ مراسم تھے ۔ وہ جب بھی لائل پور سے لاہور آتے تو ٹیلیفون پر مجھے اپنے آنے کی اطلاع دیتے تھے ان کا ہمیشہ جملہ یہ ہوتا تھا کہ میں پہلے تمہارے پاس آؤں گا تم احسان سے کہہ رکھنا کہ اس کے یہاں کھانے پر ہم دونوں

وقت آئیں۔ اس کے ساتھ وہ یہ شرط عائد کرتے تھے کہ کھانے میں سالن نہیں ہوگا صرف چٹنی ہوگی۔ چنانچہ مرزی ظفر شاد نے بھی اسی پروگرام کو عملی جامہ پہنایا جاتا تھا۔

یوسف ظفر چونکہ احسان سے خفا تھے اس لئے وہ اکثر مجھ سے کہتے تھے کہ احسان احساس کمتری میں مبتلا ہے اسی لئے اپنے احباب کو چائے پلاتا رہتا ہے کہ اپنے جذبہ کمتری کو تسکین دے سکے۔ اسے یقین ہے کہ وہ کلام ... اور اب کوئی ترتیب نہیں کر سکتا۔ لیکن یوسف ظفر کا خیال غلط تھا، احسان احساس کمتری میں نہیں بلکہ برتری میں مبتلا تھا۔ اگرچہ یہ بھی ایک طرح کا مرض ہے۔

میں نے نئی شاعری کے بارے میں کبھی کوئی جملہ خیر احسان کے منہ سے نہیں سنا۔ میرا جی ہوں یا راشد ظفر ہوں یا تصدق حسین خالد یہ سب ان کی نظر میں لغو گو تھے۔ اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ جس طرح کی یہ لوگ کہتے ہیں ایسی نظمیں میں ایک دن میں پچاس کہہ سکتا ہوں

جوش ملیح آبادی کے وہ بہت قائل تھے اور مداح اور انہیں زندہ شعراء میں اردو کا سب سے بڑا مانتے تھے۔ اقبال کی شان میں نظمیں کہتے تھے لیکن نجی گفتگو میں ہم لوگوں سے یہ بھی کہتے تھے کہ اقبال شاعر ناظم ہے۔ مگر یہ بات برسرعام انہوں نے کبھی نہیں کہی اور برسرعام ایک زمانے تک جگر، فراق اور جوش نے نہیں کہی۔ جگر صاحب نے تو خیر یہ برسرعام کبھی نہیں کہی۔ فراق اور جوش سے عمر کے آخری حصے میں ضبط نہ ہو سکا فراق نے "آج کل" کے اقبال نمبر میں اور جوش نے ریڈیو پاکستان کے غیر نشر شدہ انٹرویو میں دل کی بھڑاس نکالی لیکن فراق نے جہاں ہوشیاری اور زمانہ سازی سے کام لیتے ہوئے اقبال کو ایک عظیم شاعر کہنے کے بعد ان کے فلسفے کو ہدف تنقید بنایا، جوش وقت کی نبض پر انگلی نہ رکھ سکے اور نتیجتاً ان پر جو بیت گئی وہ ادبی دنیا سے مخفی نہیں ہے[1]۔

---

[1] جوش صاحب کا اور میرا کوئی آٹھ نو برس کا ساتھ رہا۔ اقبال کا ذکر انہوں نے ہمیشہ احترام سے کیا۔ اکثر انہوں نے کہا کہ اقبال بڑے آدمی تھے۔ اقبال کے ذکر کے ساتھ جوش اپنی احسانمندی کا ذکر بھی کیا کرتے تھے کہ انہوں نے مجھے ... حیدری کا نام خط دیا جس کی وجہ سے مجھے دارالترجمہ حیدرآباد میں فوراً ملازمت مل گئی لیکن اقبال کو بڑا شاعر انہوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اس موضوع پر میری جوش صاحب کے ساتھ اکثر بحث رہتی تھی لیکن جوش غالباً زیادہ ذاری محسوس کرتے تھے کہ اقبال بڑے شاعر نہیں ہیں تاہم ریڈیو پر مذکورہ انٹرویو دیتے وقت اس بات سے کیوں اللذہن بہک گئے یہ ایک اطلاعاً "انٹرویو قطعاً غیر ضروری ہے اور اس کے بغیر بھی زندگی بسر ہو سکتی ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تو میں اقبال کے متعلق احسان کی رائے کا ذکر کر رہا تھا۔ احسان نے اقبال کے متعلق بہت نظمیں کہیں لیکن غالباً اقبال کے متعلق سب سے پہلی نظم اقبال پر نہیں تھی بلکہ اقبال کی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی پر تھی۔

احسان نے پہلی بار جب یہ کوٹھی دیکھی ہوگی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے ہوں گے کہ مشرق کا یہ شاعر اعظم اتنے بوسیدہ مکان میں رہتا ہے۔ کہنے کو تو یہ کوٹھی تھی اور پتہ بھی نہایت عمدہ تھا میکلوڈ روڈ لاہور۔ لیکن تھی اتنی بوسیدہ کہ جب سالک صاحب جیل سے رہا ہو کر علامہ سے ملنے اس کوٹھی میں آئے تو پہلا سوال یہی کیا کہ کیا اس سے بہتر کوٹھی نہیں مل سکتی تھی۔ اقبال نے جواب میں کہا "جی ہاں! یہ تو میری دعاؤں کے سہارے کھڑی ہے ورنہ اب اس میں کچھ رہ نہیں گیا ہے" ـــ تو احسان کی نظم کا موضوع اس کوٹھی کی بوسیدگی تھی۔ اس میں اس طرح کے مصرعے آتے تھے۔

. . . . اقبال کا اور ایسے مکاں میں ہو گزارا

. . . .

سنتا ہوں کہ اب ہو گئی کوٹھی کی مرمت احسان کبھی دیکھنے جاؤں گا دوبارا

یہ نظم میں نے پہلے پہل کسی مشاعرے میں سنی تھی۔ احسان اس نظم کے ساتھ سامعین کو بہالے جاتے تھے اور ہر مشاعرے میں اس نظم کا تقاضا ہوتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے لاہور میں سر عبدالقادر کی زیر صدارت مشاعرہ تھا احسان نے یہ نظم پڑھی اور مشاعرہ لوٹ لیا لیکن مشاعرہ کے بعد ہم لوگوں کو معلوم ہوا کہ شیخ سر عبدالقادر نے اس نظم پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ یہ اطلاع احسان تک بھی پہنچی اور اس کے بعد انہوں نے اس نظم کو مشاعروں میں پڑھنا بند کر دیا۔

جوش کی شاعری کے متعلق تو میں نے احسان کی رائے بیان کر دی ہے۔ اب احسان کی شاعری کے بارے میں جوش کی رائے بھی سن لیجئے ـــ

یہ رائے جوش نے ایک غیر رسمی بات چیت کے دوران میں دی تھی اور قارئین اسے جیسا چاہیں سمجھ لیں۔ "آج کل" کے زمانے کی بات ہے۔ جوش صاحب کا "دربار" لگا تھا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں

(گذشتہ صفحہ سے آگے) وہ یہ بات کیوں بھول گئے کہ ؎

گفتار صدق مایۂ آزار می شود

چوں حرف حق بلند شود دار می شود

احسان دانش کا ذکر آیا - میں نے کہا " جوش صاحب احسان جس قدر آپ کی شاعری کا مطیع ہے اس قدر کسی اور کی شاعری کا نہیں ہے اس کی شاعری پر آپ کی شاعری کا اثر بہت زیادہ ہے - کہنے لگے -

" ہاں وہ میرے سیاسی فرموں میں تو جوتے اچھے بنا لیتا ہے ' لیکن
دوسرے فرموں میں جوتے بنانا اس کے بس کا کام نہیں — "

اس پر محفل میں ایک طویل قہقہہ بلند ہوا اور میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ یہ بات جوش نے محض تفنن طبع کے طور پر کہی ہے یا جوش کے اندر بھی کوئی نقاد پوشیدہ ہے -

احسان کی کچہری روڈ والی دکان اچھی چلی - سارے ملک میں وہ دور دور مشاعرے پڑھنے تو جاتے ہی تھے - کبھی پشاور ، کبھی پٹنہ ، کبھی حیدر آباد ، کبھی کلکتہ ، کبھی بمبئی — وہاں اپنی کتابیں ساتھ لے جاتے تھے - مشاعرے کے بعد یہ کتابیں خاصی تعداد میں فروخت ہو جاتی تھیں - جو بچ جاتی تھیں ان کے تبادلے میں احسان وہاں کے ناشروں سے اچھی کتابیں لے آتے تھے اس طرح سے ذیشان بک ڈپو میں گاہکوں کو بعض ایسی کتابیں مل جاتی تھیں جو اور کسی کتب فروش کے پاس نہیں ہوتی تھیں -

تو گویا کچہری روڈ والی دکان نادر اور معیاری کتابوں سے بھری رہتی تھی - اب احسان نے اپنے کاروبار کو فروغ دیا اور ایک صاحب کے ساتھ جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا مل کر گنپت روڈ پر کتابوں کی دکان کھولی - یہ بہت بڑی دکان تھی اس میں اشتراک کی صورت یہ تھی کہ نقد سرمایہ دوسرے پارٹنر نے لگایا کتابوں کی صورت میں سرمایہ احسان نے لگایا - برابر برابر - دکان پر کام کرنے کی تنخواہ مقرر ہوئی اور منافع میں دونوں برابر کے شریک - مجھے اس دکان کا نام بھی یاد نہیں رہا لیکن اتنا یاد ہے کہ اس دکان کی طرف سے جو فہرست کتب شائع ہوئی اس کا نام تھا "کتب نما" -

یہ دکان میرے گھر سے دور تھی اس لئے جب احسان یہاں آ گئے تو ان سے میری ملاقاتیں کم ہو گئیں - ویسے بھی اس وقت تک صورت یہ ہو گئی تھی کہ میرا اٹھنا بیٹھنا زیادہ تر " ادبی دنیا " کے دفتر میں شروع ہو چکا تھا - اور فارسی میں آنرز (منشی فاضل) کا امتحان پاس کرنے کے لئے میں نے دار العلوم السنہ شرقیہ میں داخلہ لے لیا تھا - آغا بیدار بخت اس کالج کے پرنسپل تھے - آغا صاحب اور ان کے رفقا بڑی محنت سے ہم لوگوں کو پڑھاتے تھے - یہ شام کا کالج تھا گویا شام کا وقت اب زیادہ تر گپ شپ کیلئے استعمال نہیں ہوتا تھا[1]

احسان کی سادہ زندگی کا ذکر میں اس سے قبل اس مقالے میں کر چکا ہوں - ایک دن میں نے

---

[1] مرزا ادیب ساگر بھی اسی کالج میں پڑھتے تھے - وہ ادیب عالم کا امتحان دے رہے تھے -

انہوں نے یہ مشورہ دیا کہ چونکہ آپ کا شمار ہندوستان گیر شہرت کے شاعروں میں ہوتا ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ ملک کے مختلف حصوں سے بعض اہل قلم لاہور میں آپ کے ساتھ قیام کرنے کے آرزومند ہوں۔ آپ مکان تبدیل کر لیں اور نئے مکان میں ایک کمرہ مہمانوں کے لئے مخصوص کر دیں۔ کہنے لگے اسی مکان میں مولوی عبدالحق قیام کر چکے ہیں۔ میں نے کہا یاران کا رہنا سہنا تو اور طرح کا ہے انہیں یہاں آرام کم ملا ہوگا۔ میں ان کے یہاں قیام کر چکا ہوں ان کے لئے بیت الخلاء میں فلش سسٹم کا ہونا لازمی ہے۔ کہنے لگے میں ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ میرا جو دوست میرے یہاں رہنا چاہے گا اسے میری ہی طرح رہنا ہوگا۔ نہانے کے لئے میں نے کپڑے دھونے والا صابن مولوی صاحب کے سامنے رکھ دیا تھا۔ میں یہ سب سن کر چپ ہو گیا۔

تقسیم سے کچھ قبل ۱۹۴۶ء میں میری بیوی کا انتقال ہوا۔ ان کی علالت کے دنوں میں احسان اکثر عیادت کے لئے آتے رہے تھے۔ انتقال کے بعد تو وہ مسلسل بلا ناغہ کئی روز تک آتے رہے اور ہر روز خاصا وقت دیتے رہے۔ غم میں شرکت کا رشتہ بھی عجیب رشتہ ہے۔ میرے جو احباب اس وقت تک میرے گھر کبھی نہیں آئے تھے وہ اس موقعے پر بلا ناغہ کئی کئی روز تک آتے رہے مثلاً صلاح الدین احمد، عاشق حسین بٹالوی وغیرہ

جوں جوں علمی اور ادبی دنیا میں میری مصروفیت بڑھتی گئی احسان کے ساتھ گھر اور دکان پر ملاقاتیں کم ہوتی گئیں لیکن مشاعروں کی ملاقاتوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ امرتسر، سرگودھا، گوجرانوالہ، انبالہ، لدھیانہ، راولپنڈی، گجرات اور یہ سب مشاعروں کے مرکز تھے اور ان مشاعروں میں احسان سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

اگر کبھی مولانا تاجور کے حکم پر میں بغیر معاوضہ لئے کسی مشاعرے میں شریک ہوتا تھا اور احسان کو اس کا علم ہو جاتا تھا تو وہ اس کا بہت برا مانتے تھے اور مجھے اکثر فہمائش کیا کرتے تھے کہ میں بغیر معاوضہ لئے مشاعروں میں شرکت کا طریقہ بند کر دوں۔ اس موقعے پر وہ اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ اگر گھوڑا گھاس سے دوستی کرے گا تو کھائے گا کیا شرکت مشاعرہ کا معاوضہ لینے کے معاملے میں احسان سختی کی حد تک وضع کے پابند تھے۔ کسی مشاعرے میں بلا معاوضہ شرکت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ۴۳-۱۹۴۲ء کی بات ہے ان کے مکان کی بیٹھک میں جہاں مہمان اور احباب آ کے بیٹھتے تھے ایک فریم کیا ہوا کاغذ لٹکا رہتا تھا۔ اس پر کچھ اس طرح کی عبارت لکھی رہتی تھی۔

> مشاعرے میں شرکت کے لئے میری فیس تین سو روپے ہے جو مجھے پیشگی مل جانا چاہیئے۔
> منتظمین کو سکنڈ کلاس کا کرایہ اس کے علاوہ دینا ہوگا۔
> میرا شاگرد بننے والے حضرات کو ڈاک کے تمام مصارف خود برداشت کرنا ہوں گے۔
> اس کمرے میں بیٹھنے والے حضرات میری کسی کتاب یا کاغذ کو ہاتھ نہ لگائیں۔

اس طرح کے دس بارہ اصول اس کاغذ پر لکھے ہوئے ہر آنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتے تھے ۔ لیکن جہاں تک پہلی ہی شرط کا تعلق ہے اس کی پابندی کم ہی ہوتی تھی ۔ یہ محض دکھانے کے لیے تھا ۔ ۱۹۴۳ء-۴۴ء میں کلاس کا کرایہ اور تین سو روپے معاوضہ دینے والے منتظمین مشاعرہ قریب قریب مفقود ہی تھے ۔ جوش یا شاید اتنا معاوضہ ملتا ہو لیکن امکان اس کا بھی کم ہے ۔ احسان باقاعدہ مول تول اور سودے بازی کرتے کسی نہ کسی رقم پر معاملہ طے ہو جاتا تھا ۔

تقسیم ہند کے دنوں میں تو ایک افرا تفری کا عالم رہا کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی کہ کس حالت میں ہے، میں لاہور کو خیرباد کہہ کے میں دہلی پہنچا ۔ یہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے ۔ غالباً اسی سال کے آخر میں یا ۱۹۴۸ء کے یں لائل پور کا چار برس پرانا آل انڈیا مشاعرہ پہلا انڈو پاکستان مشاعرہ بن کے نمودار ہوا ۔ اس میں ہندوستان ب میں ہی شریک ہوا ۔ عجب دور تھا ۔ اس مشاعرہ میں احسان سے ملاقات ہوئی ۔ لائل پور میں ۔ کہنے لگے ہر لاہور میں رکو گے نا؟ میں نے کہا گھر کے لوگ لائل پور آنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے مرلی دھر شاد محترم کو یقین دلایا ہے کہ میں آزاد کو تنہا کہیں نہیں جانے دوں گا ۔ آپ ان سے بات کر لیں میں آپ کے ساتھ چلنے تیار ہوں ۔ آپ کے ساتھ صرف ایک دن قیام بھی کروں گا پھر ایئرپورٹ پر آپ خود یا آپ کا کوئی دوست پہنچا آئے گا ۔ کہنے لگے یہ سب ہو جائے گا ۔ انہوں نے مرلی دھر شاد سے بات کی وہ نہ مانے اور کہنے لگے کہ رم صاحب سے تو وعدہ ہے میں انہیں مشاعرے کے فوراً بعد بذریعہ طیارہ روانہ کر دوں گا ۔ یہاں کل کا دن بھی لیں گے، ہاں ایک بات ہو سکتی ہے کہ میں آپ کو گاڑی دیتا ہوں آپ اور آزاد مشاعرے کے دوسرے دن یں روانہ ہو جائیں پہلے آزاد کو ایئرپورٹ پہنچا دیں کہ گاڑی کے لاہور پہنچتے پہنچتے قریب قریب طیارہ کا وقت ہو گا ۔ ان کو روانہ کر کے آپ اپنے گھر آ جائیں اور گاڑی واپس لائل پور روانہ کر دیں ۔ احسان کو یہ تجویز پسند آئی چنانچہ لائل پور سے لاہور تک میں نے احسان کے ساتھ مرلی دھر شاد کی گاڑی میں سفر کیا ۔ احسان یرپورٹ پر پہنچا کر اپنے گھر واپس لوٹے ۔

لائل پور کے ذکر سے ایک اور مشاعرہ یاد آ گیا ہے ۔ یہ مشاعرہ بھی وہیں لائل پور ہی میں تھا ۔ خواجہ الرحیم آئی سی ایس ڈپٹی کمشنر لائل پور اس کے منتظم تھے ۔ مولانا تاجور مرحوم بھی اس میں شریک ہوئے ۔ ما اس زمانے میں سیکنڈ کلاس میں سفر کرتے تھے احسان تو ہمیشہ تھرڈ ہی میں سفر کرتے رہے ۔ میرا طریقہ نہ مشاعروں سے معقول معاوضہ مل جاتا تھا تو انٹر میں سفر کرتا تھا ورنہ تھرڈ میں ۔ لائل پور کے مشاعرے سے معاوضہ ول ملا تھا اس لئے انٹر میں سفر کرنے کا ارادہ تھا لیکن احسان نے چونکہ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا میں نے بھی ہی کا لیا ۔ سیکنڈ کا ٹکٹ اس وقت لائل پور سے لاہور تک چھ روپے تھا اور چھ روپے کی رقم بہت معقول تھی

مولانا کو سیکنڈ کلاس میں بٹھا کر احسان ان کا ٹکٹ خریدنے گئے اور جب ٹکٹ خرید چکے تو ریل کے چلنے کا وقت ہو گیا چنانچہ وہ اپنے ڈبے میں آکر بیٹھ گئے اور ریل چل دی۔

اسی اثناء میں ٹکٹ چیکروں نے چیکنگ شروع کی۔ جب ایک ٹکٹ چیکر مولانا کے ڈبے میں پہنچا تو اس نے مولانا کو پہچان لیا اور انہیں آداب کیا لیکن مولانا چونکہ ٹکٹ کے بغیر تھے اسے دیکھتے ہی گھبرا گئے۔ ٹکٹ چیکر نے بھی ایک مصنوعی افسریت چہرے پر طاری کر لی اور لطف اٹھانے کے موڈ میں آگیا۔ چنانچہ اپنے سرکاری انداز میں اس نے مولانا سے ٹکٹ مانگا۔ مولانا نے بتایا کہ احسان دانش کو دام دیئے تھے وہ تھرڈ کلاس کے کسی کمپارٹمنٹ میں بیٹھا ہو گا۔ اگلے اسٹیشن پر وہ آئے گا اس سے ٹکٹ لے کر میں آپ کو دکھا دوں گا۔

ٹکٹ چیکر نے کہا نہیں حضرت! یہ بات تو غلط ہے، میں کسی احسان دانش کو نہیں جانتا آپ سیکنڈ کلاس میں بغیر ٹکٹ کے بیٹھے ہیں یہ جرم ہے آپ کا چالان ہو گا۔ مولانا یہ سن کر اور زیادہ گھبرا گئے۔ ٹکٹ چیکر نے جب ان کی گھبراہٹ دیکھی تو کہنے لگا اچھا آپ اگلے اسٹیشن پر ٹکٹ دکھا دیجیے گا چنانچہ ریل جب اگلے اسٹیشن پر رکی تو مولانا اپنے ڈبے سے اترے اور "احسان! "احسان!" "ابے او احسان!" کی آوازیں لگاتے ہوئے ریل کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک احسان کی تلاش شروع کی ٹکٹ چیکر بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ یہ تماشا تھوڑی دیر دیکھ لوں پھر مولانا کو احترام سے ان کے ڈبے میں بٹھا دوں گا۔ لیکن مولانا سمجھے کہ یہ انہیں گرفتار کرنے کے در پے ہے آخر میں نے اور احسان نے مولانا کی آوازیں سنیں "احسان" "ابے او احسان" تو احسان نے فوراً جواب دیا "جی مولانا"۔ مولانا وہیں رک گئے اور ڈبے میں جھانک کر انتہائی گرجدار آواز میں بولے "مولانا کے بچے، حرامزادے، کہاں دبکا بیٹھا ہے۔ میرا ٹکٹ لا۔ دیکھتا نہیں ہے میری جان پر بن رہی ہے۔" یہ سنتے ہی میں اور احسان لپک کر باہر آئے۔ ٹکٹ چیکر کو دیکھ کر احسان کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی لیکن مولانا کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا، بولے "ادھر لا میرا ٹکٹ، تم دونوں کو اتنا بھی خیال نہیں کہ میرا ٹکٹ دبائے بیٹھے ہو اور گپ بازی میں لگے ہو۔" یہ سن کر ٹکٹ چیکر نے زور کا ایک قہقہہ لگایا اور احسان نے کہا کہ "مولانا! ٹکٹ حاضر ہے لیکن یہ تو اپنا مدن لال ہے آپ کا نیاز مند اور قدرداں۔ ٹکٹ چیکر نے فوراً جھک کے مولانا کے پیروں کو چھوا اور بولا "حضور! میں نے تو آپ کے ڈبے میں آتے ہی آپ کو آداب کیا لیکن جب دیکھا کہ آپ میری وردی دیکھتے ہی گھبرا گئے ہیں میں نے سوچا ذرا لطف لے لوں۔ مجھے جب پتہ چلا کہ آپ اس ریل میں سفر کر رہے ہیں تو میں اس لئے آپ کے ڈبے میں حاضر ہوا کہ آپ کے لئے چائے وغیرہ کا انتظام کر دوں لیکن آپ کی گھبراہٹ دیکھتے ہی میرے اندر سویا ہوا لونڈا جاگ اٹھا اور اس نے کہا کہ ذرا تھوڑی دیر مزہ لے لو

یہ ڈرامہ دیکھ کر مولانا کا غصہ فوراً فرو ہو گیا اور کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے میرے اور احسان کے بارے میں یہ کہہ کر کہ یہ دونوں نالائق ہیں ٹکٹ چیکر کے ہمراہ اپنے ڈبے کو روانہ ہوئے ۔

لاہور پہنچ کر مولانا نے بتایا کہ جب میں ڈبے میں واپس پہنچا تو چائے اور ناشتہ کا سامان وہاں موجود تھا ۔ یہ سب مدن لال کا کرشمہ تھا ۔ اس بات چیت میں مولانا کو بار بار اپنی شرمندگی کا احساس ہوتا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ان کی ہنسی نکل جاتی تھی اور وہ یہی کہتے تھے کہ تم دونوں اس سازش میں شریک تھے لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہ سارا ڈرامہ فی البدیہہ تھا اور اس کیلئے کوئی سازش نہیں کی گئی تھی ۔

تقسیم کے بعد ملاقاتوں کی صرف دو ہی صورتیں تھیں اور وہ یہ کہ یا احسان ہندوستان آئیں یا میں پاکستان جاؤں ۔ احسان ہندوستان کم آئے میں پاکستان زیادہ دفعہ گیا ۔ کبھی مشاعرے میں ، کبھی سیمینار میں ، کبھی کسی توسیعی لکچر کے سلسلے میں ۔ گویا پاکستان میں احسان کے ساتھ اکثر ملاقاتیں رہیں ۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ لاہور سے لمبے لمبے سفر ہم نے ساتھ ہی کئے ۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کراچی سے مشاعرے کی دعوت تھی میں براستہ لاہور کراچی گیا ۔ میں اس خیال میں تھا کہ احسان بھی شریک ہوں گے لیکن وہ غالباً اس مشاعرے میں مدعو نہیں تھے ۔ لاہور پہنچ کے میں نے احسان ہی کے یہاں قیام کیا ۔ اب احسان مزنگ والے مکان میں نہیں تھے انارکلی کے ایک مکان میں آ گئے تھے اور یہ مکان تھا جس میں تقسیم ہند سے قبل سنٹرل بنک آف انڈیا تھا ۔ نیچے دکانیں تھیں ۔ انارکلی بازار کی دکانیں ، اوپر تین چار منزلیں ۔ بہت بڑا مکان تھا ۔ مکان دیکھ کے میں بہت خوش ہوا اور احسان سے میں نے کہا کہ اس میں ایک بہت عمدہ ذاتی کتب خانہ بآسانی سما سکتا ہے ۔ کہنے لگے "وہ بھی ٹھیک ہے لیکن اس وقت اس میں ایک اسکول چل رہا ہے" ۔ میں نے کہا ۔ "اسکول کیسا ؟" کہنے لگے "وہ "ادیب پاگل" "منشی پاگل" "مولوی پاگل" ۔" مجھے ہنسی آ گئی ۔ یہ وہی کھلنڈرا احسان تھا جس سے ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ ملاقاتیں شروع ہوئی تھیں ، ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ ۔ میں نے ایک رات اس کے ساتھ قیام کیا اور دوسری صبح ریل سے کراچی روانہ ہو گیا ۔

آخری ملاقات ۷۶ء میں ہوئی ۔ لاہور میں اقبال صدی تقاریب کے موقع پر ۔ شورش کاشمیری کے فرزند مسعود شورش نے اپنے گھر میں دعوت کی اور اس میں شورش مرحوم کے دوستوں کو مدعو کیا ۔ مدعوئین میں راقم التحریر کے علاوہ احسان دانش ، آل احمد سرور ، محمد طفیل ، میاں محمد شفیع اور چند اور احباب تھے ۔ احسان کی خود نوشت سوانح حیات "جہان دانش" انہی دنوں چھپی تھی ۔ وہ اس کی ایک ایک جلد ہم سب کے لئے لائے تھے ۔ کتاب دیتے ہوئے مجھ سے کہنے لگے اس میں تمہارا بھی ذکر ہے ،

(بقیہ ص ۵۴ پر)

سری نواس لاہوٹی

وہ بات کوہکن کی گئی کوہکن کے ساتھ

جب میں عمر رفتہ کو آواز دیتا ہوں اور ماضی کی یادوں کے چراغ روشن کرتا ہوں تو ۱۹۴۴ء کی ایک شام یاد آتی ہے جب کہ ایک ادبی محفل میں جو راجہ بہادر بشیشور ناتھ کے بنگلے کوچہ مقرب جنگ (حیدرآباد) میں منعقد ہوئی تھی اور یہیں پر مجھے پہلی بار پنڈت ونشی دھر ودیالنکار سے ملنے کا موقع ملا تھا۔ غالباً ان کی تقریر کا موضوع "ہندی شاعری اور چھایاواد" تھا اور وہ خطیبانہ میں اپنے موضوع پر اظہار خیال کر رہے تھے۔ میرے دوست جیتندر ناتھ واگمرے نے جب پنڈت جی سے تعارف کرایا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں کسی رشی سے مل رہا ہوں۔ یہ ادبی محفل رات کے تقریباً دس بجے برخواست ہوئی اور پنڈت جی سے اس پہلی ملاقات کے بعد وہاں سے رخصت ہو کر جب میں نکلا تو پنڈت جی کے خیالات مجھ پر چھائے ہوئے تھے اور میں ان خیالات کے دھندلکوں میں لپٹا ہوا پریم گنج سے گذر رہا تھا۔ اور رات کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے گو تاریکی نے پوری طرح سے رات کو اپنی آغوش میں نہیں لیا تھا۔ میں اس وقت اپنے میں ایک روشنی محسوس کر رہا تھا جیسے میں نے کوئی بیش بہا چیز کو پا لیا ہو۔

اس واقعہ کے تھوڑے دن بعد مجھے دوبارہ پنڈت جی سے اپنے ایک دوست ہیت اونکار کے مکان پر ملنے کا موقع ملا جو پنڈت جی کے قریبی عزیز ہوتے ہیں۔ وہاں ان سے کھل کر باتیں کرنے کا موقع ملا مگر یہ باتیں ادبی کم اور سیاسی زیادہ تھیں مگر پنڈت جی ہماری باتیں سن رہے تھے اور مسکرا رہے تھے اس وقت مجھے احساس ہوا کہ سیاسیات میں ان کی زیادہ دلچسپی نہ ہوتے ہوئے بھی اطمینان کے ساتھ ہماری بحث سماعت فرما رہے تھے۔ پنڈت جی کے چلے جانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اونکار پرشاد کے خالو ہوتے ہیں اور انہوں نے ذات پات کے بندھن توڑ کر اورنگ آباد میں شیو پرشاد آریہ کی لڑکی سے شادی کی ہے اور گورنٹہ میں جنم لینے والے اور گروکل کانگڑی کے فارغ التحصیل

نے حیدرآباد ہی کو اپنا وطن بنا لیا کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ ــــ جہاں رہ پڑے ہو گیا وہ وطن ۔

پنڈت جی سے قریب آنے کا موقع مجھے اس وقت ملا جب کہ میں ۱۹۵۲ء میں ہندی پرچار سبھا کے معتمد کی حیثیت سے کام کرنے لگا تو مجھے ان کی دیوہیکل شخصیت کا پورے طور پر اندازہ ہوا ۔ اس وقت پنڈت جی جامعہ عثمانیہ میں شعبہ ہندی کے صدر اور مشہور ہندی ماہنامہ "اجنتا" کے ایڈیٹر تھے اور سارے ہندی جگت میں "اجنتا" کی دھوم تھی۔ پولیس ایکشن (۱۹۴۸ء) سے قبل حیدرآباد میں ہندی کا کام کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ جامعہ میں ہندی تو کجا دوسری علاقائی زبانوں کی بھی اتنی پوچھ نہیں تھی جتنی کہ ہونی چاہیے تھی شعبے تو کھولے جا چکے تھے لیکن درس و تدریس برائے نام ہوا کرتا تھا ۔ اساتذہ اپنی تنخواہیں پاتے اور توڑ جوڑ میں مصروف رہا کرتے تھے ایسے ماحول میں ہندی کا کام کرنا کٹھن ہی نہیں بلکہ مشکل تھا۔ پنڈت جی مولوی عبدالحق صاحب کے بھیجے تھے اور انہیں کی ایما پر اورنگ آباد سے حیدرآباد آئے تھے اور جامعہ عثمانیہ ہندی اور سنسکرت کے لکچرر مقرر ہوئے تھے ۔ اس وقت جامعہ عثمانیہ کی فضا میں جوڑ توڑ، سازش، گٹ بندی کا بہت زور تھا مگر پنڈت جی ہمیشہ اس قسم کی باتوں سے الگ تھلگ رہ کر اپنے شعبے کو مستقل بنیادوں پر استوار کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ پولیس ایکشن کے بعد بھی آسانی کے ساتھ ہندی کا شعبہ قائم نہیں ہو سکا بلکہ اس کے لیے پنڈت جی کو بڑی کوشش اور جدوجہد کرنی پڑی اور ان کے بعض ساتھیوں نے ان کے خلاف سازشیں اور ریشہ دوانیاں کیں مگر انہوں نے کوئی جوابی کارروائی نہیں کی ۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ لوگوں نے پنڈت جی کی جھوٹی سچی شکایتیں جامعہ کے ارباب اقتدار کے پاس بار بار کیں تاکہ ان کو شعبے سے ہٹا کر اس پر خود قابض ہو جائیں مگر پنڈت جی نے خاموشی ہی کو اپنا شعار بنایا اور جوابی کارروائی کے طور پر انہوں نے حکام بالا کے پاس کوئی شکایت نہیں کی اور نہایت ہی سکون کے ساتھ اپنے شعبہ کو وسعت دینے میں مصروف رہے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ ان نازک حالات میں ایل۔ بی۔ گپتا ڈاکٹر حسین ظہیر اور دوسرے احباب نے ان کی بڑی مدد کی ورنہ آج جامعہ میں ہندی کا شعبہ جس طرح عروج پر ہے اس تک پہنچنے کے لئے اور دیر لگتی ۔

پنڈت جی ایک کھاتے پیتے برہمن خاندان میں ۔۔ ۱۲ء میں کوئٹہ میں پیدا ہوئے جو آج پاکستان میں ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم آریہ سماجی اصولوں پر ہوئی اور انہوں نے گروکل کانگڑی سے گریجویٹ ہو کر تکمیل کے بعد گجرات کے ایک تعلیمی ادارے میں معلم کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا آریہ سماج کے پرچارک کے ناطے انہوں نے نہ صرف پورے ہندوستان کا دورہ کیا بلکہ برما بھی گئے اور تعلیمی اداروں کے لیے چندہ جمع کیا۔ اورنگ آباد بھی وہ اسی غرض سے آئے تھے لیکن وہ وہیں کے ہو کر رہ گئے اور مولوی عبدالحق صاحب کی ایما پر حیدرآباد منتقل ہو گئے۔ مولوی عبدالحق صاحب سے ان کی پہلی ملاقات

کی کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے جس کو وہ خود اکثر سنایا کرتے تھے۔ وہ بیان کرتے تھے کہ اورنگ آباد میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا اور پنڈت جی بھی ایک سامع کی حیثیت سے اس میں شریک ہوئے لیکن چپکے سے عبدالحق صاحب کے پاس ایک چٹ بھجوا دی کہ یہاں ایک نیا شاعر بھی موجود ہے اس کو بھی سن لیا جائے۔ مولوی صاحب نے پنڈت جی کے نام کا اعلان کر دیا اور جب پنڈت جی اپنی نظم پڑھ کر ڈائس سے نیچے اترے تو سارا ہال تالیوں کی گونج سے نئے شاعر کا خیر مقدم کر رہا تھا۔ اس واقعہ سے مولوی صاحب اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے پنڈت جی کو اورنگ آباد کالج میں استاد کی حیثیت سے مقرر کروا دیا اور جب وہ صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے جامعہ عثمانیہ منتقل ہوئے تو پنڈت جی کو بھی بلا لیا اور وہ جامعہ عثمانیہ میں سنسکرت اور ہندی کے استاد بنا دئے گئے۔ پنڈت جی نے اپنے محسن ڈاکٹر عبدالحق پر "سچا موتی" کے عنوان سے جو مضمون تحریر کیا ہے وہ ہمارے ادب کی ایک یادگار چیز ہے اور خود مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے ایک خط کے ذریعہ اپنے قدیم ساتھی غلام ربانی صاحب (...) کو لکھا تھا کہ "اگر میں والئی ریاست ہوتا تو پنڈت جی کی گود موتیوں سے بھر دیتا"۔ تنگ مذہبی ماحول میں پرورش پانے کے باوجود بھی پنڈت جی کوئی بڑے مذہبی نہیں تھے لیکن ان کے بارے یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ وہ مذہب سے بیگانہ یا مذہب دشمن آدمی تھے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ خیال وسیع تھے اور اپنی رند مشربی کو ہر جگہ اچھالتے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی فیاض دلی کو کبھی بند نہیں کیا۔ ان کی تینوں لڑکیوں نے ذات پات کے بندھن توڑ کر اپنی پسند کی شادیاں کیں حتیٰ کہ ان کی ایک لڑکی شاردا نے عبداللطیف بروا (سابق ڈائرکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو) سے شادی کر لی تھی۔ وہ اس میں حائل نہیں ہوئے بلکہ اس کو خوش آمدید کہا اس سے ان کی وسعت قلبی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۱۹۵۵ء میں وہ جامعہ عثمانیہ کی خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ۱۹۵۶ء میں خانگی ڈگری کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے کام کرنے لگے لیکن تین سال کام کرنے کے بعد انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ اس میدان کے شہسوار نہیں ہیں تو انہوں نے وہاں سے علاحدگی اختیار کر لی اور ہندی اورینٹل کالج کی داغ بیل رکھ کر اس کو کھڑا کیا اور مرتے دم تک اس کے پرنسپل کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ پنڈت جی تقریباً (۳۰) سال تک ہندی پرچار سبھا سے وابستہ رہے اور سبھا کی جو بھی مطبوعات شائع ہوئی ہیں ان میں بیشتر ان کی مرتب کردہ یا لکھی ہوئی ہیں اور جب یہ کتابیں شائع ہوتی تھیں تو اس میں نفاست کا وہ خیال رکھتے تھے اور وہ اس امر کی تاکید کر دیا کرتے تھے کہ کتاب بہت اچھے کاغذ پر نہایت عمدہ طریقہ سے شائع ہو اور اس میں طباعت کی کوئی غلطی نہ رہے۔ ان ہدایات کے باوجود جب کتاب میں غلطیاں رہ

تو وہ غصے میں آپے سے باہر ہو جاتے تھے اس لئے کہ پنڈت جی مزاج کی نفاست اور طبیعت کی شرافت میں اپنی آپ نظیر تھے ۔ میرا تو خیال ہے کہ ان کی تخلیق میں جز و اعظم یہی دو عنصر تھے ۔ لکھتے وقت کاغذ نفیس ہو قلم بڑھیا ہو ، روشنائی کا خاص رنگ ہو اور ان سے بڑھ کر ماحول خوشگوار ہو ، جب ان کا قلم حرکت میں آتا تھا ۔ کتابیں وہ نہایت صاف ستھری رکھتے ، سکینڈ ہینڈ یا استعمال شدہ کتاب کو وہ " دست غیر سے مس ہو جانے والی دوشیزہ " کا درجہ دیتے تھے ۔ کھانا عمدہ کھاتے ، کپڑا اچھا پہنتے ، مکان خوبصورت غرض کہ ہر چیز میں صفائی اور نفاست و لطافت کے قائل تھے اور کہا کرتے تھے کہ سکنڈ کلاس کوئی سی بھی شے ہو تو مجھے برداشت نہیں ہوتی ہر چیز فرسٹ کلاس ہونی چاہیئے ۔ ان میں شرافت نفس اس قدر بھرا ہوا تھا کہ کسی کی دل آزاری کیا دل شکنی بھی نہیں کرتے تھے ۔ اپنی تحریروں میں درشت و ناملائم الفاظ کا استعمال وہ گالی کے مترادف سمجھتے تھے ۔ اگر کسی پر چوٹ کرنی بھی ہو تو لطیف اشاروں اور کنایوں کے قائل تھے اور کہا کرتے تھے کہ تحریر میں بھدے اور ثقیل الفاظ کا استعمال کرنا اچھی تحریر کا خون کرنے کے برابر ہے ان کو شہرت کی کبھی خواہش نہیں رہی اور نہ وہ ان لوگوں سے مرعوب ہوئے جن کا ادبی دنیا میں ڈنکا بجتا رہتا تھا بلکہ وہ اس کے قائل تھے کہ ؎

رموز سجدہ سے نا آشنا ہے میری جبیں

ریاست حیدرآباد میں اور آندھرا اور وشال آندھرا بننے کے بعد مرہٹواڑہ اور کرناٹک میں ہندی پرچار سبھا کے ذریعہ انہوں نے ہندی کی جو سیوا کی ہے اور ہندی کے تعلق سے لوگوں کو جو احساس دلایا ہے اس کا اندازہ تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے ۔ اس لئے کہ نوبی ہند میں ہندی پرچار کی تاریخ ایک کشمکش کی تاریخ ہے ، ہنگاموں کی داستان ہے اور ہندی کو ن کٹھن آزمائشوں سے گذرنا پڑا ہے اس کا اندازہ تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو مشکل مراحل کا سامنا رنا پڑا ہے ۔ اس وقت تو صرف پنڈت جی کے تعلق سے اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ ہندی ہی ان کی دنیا ں ، ہندی ہی ان کی زندگی تھی اور ہندی ہی ان کا نصب العین اور نظریہ حیات تھا ۔ اس لئے ہم نڈت جی کو ہندی تحریک سے علٰحدہ کر کے نہیں دیکھ سکتے ۔ مجھے تو کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اگر پنڈت جی ی انتھک محنت اور جد و جہد نہیں کرتے تو شاید جامعہ عثمانیہ میں ہندی کو وہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا ۔ آج اس کو حاصل ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کو دوسری زبانوں سے محبت نہیں تھی بلکہ ہ تو کئی زبانوں کے عالم تھے اردو اور بنگالی پر تو وہ اچھی خاصی قدرت رکھتے تھے اور ان زبانوں کے ب عالیہ کو تو انہوں نے ہندی میں منتقل بھی کیا ہے ۔ گرو دیو ٹیگور اور مولانا حالی ان کے خاص اور

اور پسندیدہ شاعر تھے جن کے بیشمار اشعار ان کو ازبر تھے ۔

پنڈت جی کی اردو دوستی کا اندازہ ہم ان کی اس تقریر سے لگا سکتے ہیں جو انہوں نے "یوم اردو" کے موقع پر ۲۹ جنوری ۱۹۶۶ء کو اردو ہال میں کی تھی ۔ اردو والوں سے وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اردو کی راہ میں آج کل جو دشواریاں اور مشکلات حائل کی جارہی ہیں ان سے اردو والوں کو بددل نہیں ہونا چاہئیے بلکہ انہیں تو اپنی مساعی میں اور زیادہ انہماک سے کام لینا چاہئیے ۔ ان کا خیال تھا کہ "ہندی" ہندوستان کی زیادہ آبادی کی زبان ہے اور اگر اسے ہندوستان گیر ہونا ہے تو وہ اردو کی مددگار اور شریک کار کی حیثیت ہی سے اس درجہ اور مقام کو پہنچ سکتی ہے اس لئے ہندی اور اردو میں رقابت اور دشمنی نہیں ہونی چاہئیے ۔ ایک جگہ انہوں نے اردو ادب کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

> "اردو کا ادب سرل ہے جس سے دل کا کنول کھل جاتا ہے ، اس کا خزانہ بھرا پڑا ہے جس میں موتی ، ہیرا ، یاقوت اور نہ معلوم کتنے رنگوں کے جواہرات ہیں ۔ ان کو یقیناً تلف ہونے سے بچایا جائے گا تاکہ ہندی کا روپ نکھر سکے ۔"

پنڈت ونشی دھر جی کا نام بچپن سے سنتا آیا تھا اور یہ نام کچھ اس طرح سے دل و دماغ میں بس گیا تھا جیسے کسی رشی منی کا نام ذہن نشین ہو جاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ پنڈت جی پر جب لکھنے بیٹھا تو بات میں بات نکلتی چلی گئی اور میں خطرہ محسوس کرنے لگا تھا کہ شاید میں اپنے فرض کو پورا نہ کر سکوں ۔ آج پنڈت جی ہم میں نہیں ہیں لیکن میرے لئے ۲۲ فروری ۱۹۶۶ء کے بعد بھی یہ سمجھنا مشکل ہو گیا ہے کہ اب وہ ہماری سماج اور زمانے کے نہیں رہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ موت نے انہیں ہمارے درمیان سے جدا کر کے غلطی ہی کی ہے ۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم !
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے ؟

□□

زندگی کے ہر موڑ پر اردو کا استعمال کیجئے تبھی اردو زندہ رہ سکے گی
صرف قصیدہ خوانی سے اردو کا کچھ بھلا نہ ہوگا

ڈاکٹر نعیم الرحمٰن خاں ایم ڈی

ماجرائے دردِ دل!

دل میں اک درد سا اٹھا ہے ابھی
منزلِ غم کی ابتدا ہے ابھی

اس شعر میں شاعر نے دل اور درد کی نسبت سے یقیناً بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ دل کے تعلق سے ہمارے شاعروں کی خیال آرائیاں ہمارے ڈاکٹروں اور طبیبوں سے مختلف ہرگز نہیں۔ میر تقی میر فرماتے ہیں ؎

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

دردِ دل یا دل کا عارضہ یقیناً بڑا خطرناک عارضہ ہوتا ہے۔ ابتدا میں ہلکے طور پر اٹھنے والا دل کا درد، علاج نہ کرنے پر آگے چل کر آہستہ آہستہ نہایت خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس لئے چاہیئے کہ ہم اس دردِ دل کے تعلق سے غفلت نہ برتیں۔ اسے معمولی نہ سمجھیں بلکہ جیسے ہی درد کے آثار پیدا ہوں فوراً کسی معتبر ڈاکٹر سے رجوع کریں۔

دردِ دل یا عارضۂ قلب کی نشانیاں، علامتیں اور کیفیتیں مختلف قسم کی ہوتی ہیں۔ سینہ میں درد کا شروع ہونا دل کی بیماری کی واضح اور اہم علامت ہے اس لئے جونہی سینہ میں درد محسوس ہونے لگے اس کی طرف فوراً توجہ دی جانی چاہیئے اور اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ سینہ کا درد کہاں ہو رہا ہے اور کتنے عرصے سے ہو رہا ہے، اس درد کی نوعیت اور کیفیت اپنے ڈاکٹر سے صاف صاف اور واضح طور پر بتانی چاہیئے۔ جن دل کی بیماریوں میں سینہ میں شدید قسم کا درد ہوتا ہے ان میں ہے:

1. Angina Pectoris

ہنگوارہ صدر ۔ ناگپور (مہاراشٹرا)

2. Acute Coronary Insufficiency.
3. Mayocardial infarction.

ایک خاص قسم کی دل کی بیماری ہوتی ہے جس میں سینے کے درمیانی حصہ میں درد محسوس ہوتا ہے کبھی یہ درد سینے کے ساتھ ساتھ محسوس ہوتا ہے Angina کا درد مختلف درجوں میں اور مختلف قسم کی جسمانی اذیتوں سے پیدا ہوتا ہے۔ درجن وقفہ تک رہتا ہے اس درد کے محسوس ہوتے ہی احتیاطاً جسمانی اذیت سے حتی الامکان گریز کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔

عام طور پر تیزی سے چلتے وقت یا بلندی یا اونچائی پر چڑھتے وقت یا تیز ہوا کی مخالف سمت چلتے وقت، خاص طور پر سرد موسم میں اس درد کے اٹھنے کے قوی امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ جوش یا روانی میں سانس بھر آنے سے کبھی دل میں یہ درد اٹھ سکتا ہے۔ اس درد سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کچھ دیر سکون و آرام کے ساتھ لیٹ جانے سے اور جوش، غصہ یا تیزی جذبات پر قابو پانے سے یہ درد خود بخود کم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس درد کے اٹھنے پر سینہ میں عجیب قسم کا بھاری پن یا دباؤ سا محسوس ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اس درد کو دور کرنے کے لئے مخصوص دواؤں کا استعمال بھی کرنا پڑتا ہے۔

دل کی دوسری بیماری جسے Acute Coronary Insufficiency کہتے ہیں۔ ایک مہلک قسم کا مرض ہے اس میں Angina ہی کی طرح درد اٹھتا ہے لیکن اس کی میعاد زیادہ دیر تک رہتی ہے۔ دل کو کافی مقدار میں خون نہ ملنے کے باعث اس قسم کا درد اٹھتا ہے۔ اس میں خون کی کمی یعنی Anaemia یا خون کی چھوٹی سی نالی میں خون کے جم جانے سے یا حرکت دل کی رفتار بڑھ جانے سے دل کو اس درد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

دل کی تیسری اور سب سے مہلک بیماری کا نام Mayo Cardial Infarction ہے جسے عام طور پر ہارٹ اٹیک کہا جاتا ہے۔ ان بیماری میں خون کی شریان بند ہو جانے کی وجہ سے ایک شدید قسم کا درد محسوس ہوتا ہے۔ یہ درد بیٹھے بیٹھے آرام کی حالت میں یا پھر نیند کے دوران بھی لاحق ہو سکتا ہے۔ یہ شدت اختیار کر لینے پر جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ شدت درد کی وجہ سے مریض شاک کی کیفیت میں چلا جاتا ہے اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ جاتا ہے۔ نبض کی رفتار سست ہو جاتی ہے جسم سے پسینہ بہنے لگتا ہے۔ خون کا دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ متواتر ہچکی آنے لگتی ہیں اور قے کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے تعلق سے اگر ڈاکٹروں سے فوراً رجوع نہ کیا گیا تو موت واقع ہو سکتی ہے

دل کی بیماریاں یقیناً بڑی تشویشناک ہوتی ہیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ سینہ کا ہر درد دل کا درد نہیں ہوتا۔ دیگر وجوہات کی بناء پر بھی سینہ میں تکلیف محسوس ہو سکتی ہے مثلاً:

1. Pleurisy 2. Myalgia 3. Neuralgia 4. Rheumatic Pain وغیرہ

ان تمام بیماریوں میں سینہ میں شدید درد محسوس ہوتا ہے اور ناچیز بدگمانی، غلط فہمی اور شکوک کی بناء پر ہم خود اپنی صحت کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ اس لئے سینہ میں اٹھتے ہوئے ہر درد کو محض دل کا درد مان کر اپنے آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہیئے۔ دل کی بیماریوں کی پہچان یا شناخت کے لئے بہترین قسم کے آلات ہمارے پاس موجود ہیں۔ E. C. G. سے ہم دل کے اس حصہ کو بآسانی شناخت کر سکتے ہیں جہاں خون کی نالی بند ہو جانے سے آکسیجن کی رسائی نہیں ہو پاتی۔ ان آلات سے درد کی جگہ معلوم کر کے تیر بہدف قسم کا علاج اچھی طرح کیا جا سکتا ہے۔

دل چونکہ ہمارے جسم کا ایک اہم عضو ہے، ہمیں اس کی تندرستی اور توانائی کا خاص خیال رکھنا چاہیئے۔ ایسی تمام باتوں سے پرہیز کرنا چاہیئے جو دل کی کمزوری کا باعث ہوتی ہیں ترس اور غم و غصہ کی آلودگیاں عام طور پر دل کو کمزور کر دیتی ہیں۔ اندھا دھند عیش کوشی، شراب نوشی اور سگریٹ یا چرٹ کے دھوئیں سے کھیلنے کا شوق دل کو جلا کر خاک کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں نشہ آور اشیاء اور مرغن غذاؤں کا استعمال بھی امراض دل کا باعث بن جاتا ہے۔ یہ چیزیں ابتداء میں خوشی، راحت اور کیف و سرور کا سامان مہیا کرتی ہیں مگر ان کے مضر اثرات دل کو تباہی کی منزل کے قریب کر دیتے ہیں۔

آج کے تہذیب و تمدن کے فروغ والے دور میں عیش و عشرت کے اسباب کی فراوانی ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی حرص و ہوس، حصول روزگار کی اکتا دینے والی یکسانیت سے جسم انسانی میں خون کا دباؤ اور اعصابی تناؤ بڑھنے لگتا ہے۔ اس تناؤ (Tension) سے دل مختلف قسم کی بیماریوں اور خرابیوں کا نشانہ بن رہے ہیں۔ مشہور مقولہ ہے کہ احتیاط علاج سے بہتر ہے لہٰذا جہاں تک ہو سکے دل کی بیماریوں کے معاملے میں پہلے ہی سے احتیاط برتنی چاہیئے۔ دل کی صحت اور توانائی کا دارومدار محض دواؤں پر نہیں بلکہ احتیاطی تدابیر پر ہوتا ہے۔ خاص طور پر خون کے بڑھتے ہوئے دباؤ کی روک تھام بے حد ضروری ہے۔ دل کو صحیح سلامت رکھنے کے لئے ہمیں چاہیئے کہ ہم روزمرہ کی زندگی میں دباؤ اور اعصابی تناؤ کی مختلف وجوہات سے بچیں، ہلکی زود ہضم اور طاقت بخش غذاؤں کا استعمال کریں۔ زیادہ سے زیادہ پیدل چلنے کی عادت ڈالیں۔ صبح کی سیر کو اپنا معمول بنائیں

غصہ، خفگی اور ہمیشہ سوچتے رہنے کی بری خصلتوں سے کنارہ کش رہیں۔ دسترخوان کی مرغن غذائیں، شراب نوشی اور Smoking عام طور پر دل کی خوفناک بیماریوں کا سبب بنتی ہیں۔ اس لئے ان سے جتنا پرہیز کیا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔

اگر الجھنوں سے بچنے، تناؤ سے گریز کرنے، غم و غصہ سے دور رہنے اور بری عادتوں کو چھوڑنے کی کوشش نہ کی گئی تو "دردِ دل" مقدر ہو کر رہے گا اور یہی کہنا پڑے گا کہ

دل میں اک درد سا اٹھا ہے ابھی
منزلِ غم کی ابتدا ہے ابھی

□□۔

(سلسلہ ص ۴۵ سے آگے)

میں نے کہا "کہیں سے یا کئی جگہوں پر ہے؟" ہنس دیئے اور بولے "کچھ کم ہی ہے"

۱۹۷۷ء کے بعد میں پاکستان کئی بار گیا۔ ۱۹۸۰ء، ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۲ء میں۔ ۱۹۸۰ء میں تو دو دن لاہور میں قیام بھی کیا۔ احسان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ پتہ چلا بیمار ہیں سوچا واپسی پر ملوں گا اور واپسی پر مل نہ سکا۔ ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۲ء میں سفر صرف کراچی اور حیدرآباد سندھ تک محدود رہا۔ لاہور نہ جا سکا ہاں ۱۹۸۴ء میں ابوظہبی، دوبئی اور شارجہ کے مشاعروں میں احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی اور دوسرے دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ اب ان کی صحت اچھی ہے لیکن ایسی نہیں کہ مشاعروں میں شریک ہو سکیں۔ اسی سال کے آخر میں قتیل شفائی، ضمیر جعفری اور جمیل الدین عالی سے امریکہ میں ملاقات ہوئی۔ اس وقت بھی احسان کی صحت کی حالت انہوں نے وہی بتائی کہ بہتر ہیں لیکن مشاعروں میں شرکت کے قابل نہیں ہیں۔ اصل میں ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا جس کے بعد انسان کی صحت بالعموم نارمل نہیں رہتی۔

اب میں سوچ رہا تھا کہ لاہور جانے کی کوئی صورت پیدا ہو تو اپنے اس محبوب دوست سے ملوں اور لاہور جانے کا ایک پروگرام معرضِ تشکیل میں تھا ہی لیکن اس سے پہلے کہ وہ پروگرام عملی جامہ پہنتا احسان وہاں چلے گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آیا۔

□□

خلیل اکمل

صوتی آلودگی

سائنس کی برق رفتار ترقی سے ہمارے معاشرے پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ یوں تو
ثرات ہماری روزمرہ زندگی کو پر سکون بنانے کے ضامن ہیں لیکن ساتھ ہی یہ ہماری صحت کو متاثر کرنے کے
لیے بھی ہیں۔ آلودگی کا وجود سائنس کی ترقی کا نتیجہ ہے خصوصاً ہمارے صنعتی انقلاب سے فضائی
ں اور زمینی آلودگی میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ آلودگی کے اس زمرہ میں اب صوتی آلودگی بھی شامل
ئی ہے۔ بالفاظ دیگر صوتی آلودگی کی حیثیت ہمارے صنعتی انقلاب کے ضمنی حاصل کی ہے، جو
یث شدہ غذا کی طرح ہماری صحت کو متاثر کرنے کے درپے ہے۔

صوتی آلودگی کا مطلب بے ہنگم آواز، چیخ و پکار اور شور و غل ہے۔ ہم کو روزمرہ زندگی
بئی قدرتی آوازیں سنائی دیتی ہیں جیسے ہوا کی سرسراہٹ، بادل کی گرج، پرندوں اور جانوروں کی
از وغیرہ لیکن ہم ان آوازوں سے اس قدر مانوس ہوگئے ہیں کہ ہم ان کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن
ں کے علاوہ خود انسان کی پیدا کردہ آوازیں اس قدر تیز اور اونچی ہوتی ہیں کہ ہماری مصروفیات میں خلل
لتی ہیں اور ہمارے ماحول کو آلودہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتیں۔ ان آوازوں کا منبع ہے
دی بیاہ کا بیانڈ باجا، فیکٹریوں کی مشینیں، موٹر گاڑیاں، ہوائی جہاز، تفریحی آلات جیسے لاؤڈ اسپیکر
یرہ۔ صنعتی مشینوں اور بیانڈ باجے سے پیدا شدہ آواز صرف اسی مقام تک محدود رہتی ہے جس سے صرف
دی کے براتی اور ورکشاپ میں کام کرنے والے مزدور ہی متاثر ہوتے ہیں لیکن موٹر گاڑیوں کے ہارن اور
سائلینسر کی آواز شہر کے وسیع رقبہ کو متاثر کرتی ہے جس سے شہریوں کو سکون و چین میسر نہیں آتا
نیز ہوائی جہاز کی آواز صوتی آلودگی میں بے پناہ اضافہ کرتی ہے جس کا اندازہ صرف انھیں لوگوں کو خوبی
ہو سکتا ہے جو کسی ایرپورٹ کے قرب و جوار میں رہتے ہوں۔ ایک عام مسافر بردار جہاز کم از کم دس ملین واٹ

سائنٹسٹ۔ ریجنل ریسرچ لیباریٹری حیدرآباد

کے مانند شور و غل برپا کرتا ہے جب کہ ایک آدمی کی قوت سماعت صرف ایک واٹ تک محدود ہے۔ مستقبل میں دور دراز کی مسافت کو بہت ہی کم وقت میں طے کرنے کے لئے اگر سپر سانک یعنی آواز سے بھی تیز رفتار سے اڑنے والے جہاز کا استعمال شروع ہو جائے تو صوتی آلودگی میں مزید اضافہ ہوگا۔ کیونکہ اس جہاز کی آواز سے فضا میں جو ارتعاش پیدا ہوتا ہے اس کا دباؤ فی مربع فٹ رقبہ پر دس پونڈ کے برابر ہوتا ہے۔ اس ہیبت ناک آواز کے دھماکے سے کھڑکیاں ہلتی ہیں او دیواریں گرتی ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ اڑان کے بعد بھی یہ اپنی گزرگاہ کے ۵۰ کیلو میٹر فاصلہ پر آواز کا شدید دباؤ کچھ وقفہ تک باقی رکھتا ہے جس سے ایک عام آدمی کی سماعت متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

طبی اعتبار سے شور و غل فضائی دباؤ کے معمول میں خلل انداز ہوتا ہے۔ یہ فضا میں آواز کی رفتار کے ساتھ بیک وقت مختلف سمتوں میں پھیل جاتا ہے جس کی شدت کا احساس ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب کہ آواز کی لہریں ہمارے کانوں کے پردوں سے ٹکراتی ہیں۔ آواز کی شدت کا اندازہ ہم اس کی اکائی (Decibel) سے لگا سکتے ہیں۔ جب ہم کانا پھوسی کرتے ہیں تو یہ اکائی ۱۵ تا ۲۰ تک محدود رہتی ہے لیکن عام گفتگو کے وقت یہ اکائی ۵۰ تا ۶۰ تک پہنچ جاتی ہے خصوصاً ٹیلیفون کی گفتگو کے دوران یہ اکائی ۶۵ تا ۸۰ کے درمیان رہنا ضروری ہے ورنہ بات کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ اگر آواز کی اکائی ۸۰ سے کم ہو تو اس سے ہماری بات چیت اور نیند میں کوئی خلل نہیں ہوتا۔ لیکن یہ اکائی ۸۰ سے تجاوز کر جائے یعنی آواز تیز، اونچی اور اچانک ہونے کے ساتھ ساتھ بے ترتیب وقفہ سے بار بار دہرائی جائے تو یہ ہمارے لئے باعث زحمت بن جاتی ہے۔ اسی لئے شور و غل کی سطح کو ہماری خوابگاہ، اسکول، میٹنگ ہال، ڈانس ہال میں کم سے کم رکھا جاتا ہے تاکہ آواز کی لہریں کانوں کے پردہ پر اس قدر ارتعاش پیدا نہ کریں کہ سونے والا جاگ جائے یا پھر کانفرنس ہال اور اسکول میں لوگوں اور طلباء کی توجہ مبذول ہو اور ڈانس ہال میں سُر یا دُھن بگڑ نہ جائے۔ ان مقامات میں آواز کی اکائی صرف ۳۰ تا ۴۰ تک محدود رکھی جائے۔

صوتی آلودگی انسانی زندگی کو مختلف طریقوں سے متاثر کرتی ہے۔ اس کا پہلا نشانہ ہماری قوت سماعت ہے، دوسرا ہمارے اعصاب، تیسرا اثر ہمارے سماجی طرز عمل پر ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کی قوت سماعت میں عمر کے ساتھ ساتھ انحطاط واقع ہوتا ہے۔ عموماً یہ انحطاط ۴۰ سال کے بعد ہی رونما ہونے لگتا ہے لیکن اگر کوئی شخص مسلسل ۹۰ اکائی والی آواز سننے کا عادی ہو تو ۴۰ سال کے بعد وہ کانا پھوسی کے قابل بھی نہیں رہتا۔ اگر یہ اکائی ۱۵۰ تک بڑھ جائے وہ پھر مستقل بہرہ ہو جائے گا۔ لیکن عورتوں کی قوت سماعت کو مردوں کے مقابلہ میں بہت ہی کم نقصان پہنچتا ہے۔ اسی لئے ٹیلیفون کے محکمہ میں خواتین کی

خدمات سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ شور و غل سے ہماری صحت بھی متاثر ہوتی ہے چنانچہ گذشتہ ۱۵ سال کی لمبی تحقیق سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ مسلسل اونچی اور بے ترتیب آواز کو سننے سے انسانی جسم کی کارکردگی میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ امریکی ماہر نفسیات ڈاکٹر Bruce کے بموجب اگر کوئی شخص مسلسل شور و غل سننے کا عادی ہو تو اس کے اعصاب، دماغ، ہاضمہ اور جسمانی نشو و نما بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ خصوصاً ایسے مزدور جو کسی صنعتی ورکشاپ میں تیز اور اونچی آوازیں کام کرتے ہیں ان کے قلبی رگ پٹھے کمزور ہو جاتے ہیں اور ان کو قلبی امراض لاحق ہو سکتے ہیں۔ ایک برطانوی ماہر نفسیات کا مشاہدہ ہے کہ لندن ایر پورٹ کے قریب رہنے والے عموماً دماغی امراض کا شکار ہوتے ہیں کیونکہ جہازوں کی پرواز سے کوئی ۱۲۰ تا ۱۴۰ اکائی کا شور و غل پیدا ہوتا ہے جو لوگوں کے ذہنی سکون کو بے حد متاثر کرتا ہے۔

شور و غل ہماری گفتگو میں مخل ہوتا ہی ہے لیکن یہ ہماری طبیعت میں غصہ اور چڑچڑا پن بھی پیدا کرتا ہے۔ مزاج میں یہ تبدیلی ہماری قوت برداشت کے اعتبار سے کسی میں کم اور کسی میں زیادہ ہو سکتی ہے لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ شور و غل کو ایک طویل عرصہ تک برداشت کرنے کے بعد بھی ہمارا مزاج معمول کے مطابق رہتا ہے کئی مشاہدات کی بنا پر یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ شور و غل سے ہمارے کام کرنے کی صلاحیت میں انحطاط واقع ہوتا ہے لیکن بعض کام ایسے بھی ہیں جن کی کارکردگی میں اضافہ بھی ہوتا ہے اس میں ٹائپ رائٹنگ اور مصوری قابل ذکر ہیں۔

صوتی آلودگی کا ہماری جدید طرز زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے کیونکہ ایک مشینی زندگی گذارنا ایک عام بات ہے۔ مسالے پیسنے کی مشین، واشنگ مشین، سلوائی کی مشین وغیرہ ہماری زندگی کے لازمی جزو بن چکے ہیں جن کا استعمال صوتی آلودگی کو ہوا دیتا ہے چنانچہ امریکہ میں کرایہ کے مکان کے متلاشی اپنے ساتھ ایک ٹرانسسٹر رکھتے ہیں محض اس جانچ کے لئے کہ متصلہ فلاٹ سے آواز کس قدر ماحول کو آلودہ کر سکتی ہے۔ صوتی آلودگی کی روک تھام کے لئے ہر ملک میں انجمنیں وجود میں آئی ہیں جن کے زیر اہتمام اس موضوع پر کئی سمینار بھی منعقد ہوئے جن میں یہ طے کیا گیا کہ صوتی آلودگی کے انسداد کے لئے قانون کا نفاذ ضروری ہے چنانچہ ہندوستان میں لاوڈ اسپیکر اور پٹاخوں کے استعمال پر پابندی عائد کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ اب برطانیہ میں شور و غل کی ایک اکائی مقرر ہے۔ اس اکائی سے تجاوز کر جانے پر عوام قدائع آمد و رفت کے حکام سے معاوضہ طلب کر کے اپنے مکانوں کو ساؤنڈ پروف بنا سکتے ہیں۔ اور یہی قانون برٹش ہوائی کمپنی کو کن کارڈ اور کارن وال طیاروں کی پرواز پر عوام کو بھاری معاوضہ ادا کرنے کا سبب بنا۔ امریکہ میں ۱۹۶۹ء میں جہازوں کے شور اور ۱۹۷۲ء میں فیاکٹریوں میں پیدا ہونے والی آواز پر

(بقیہ ۴۲ پر)

ثریا صولت حسین

"نیند پری"

بظاہر کس قدر سادہ اور معصوم سا لفظ ہے "نیند"! - دو چار جماہیاں لیں اور ہاتھ پاؤں ڈھیلے کرکے بستر پر لیٹے اور سو گئے! - لیکن ہرگز نہیں - دراصل نیند بے شمار ننھی منی پریوں کے ایک جھمگھٹ کا نام ہے - یہ پریاں بے حد شوخ، فتنہ پرداز اور عشوہ طراز ہوتی ہیں - ان کی شکل و صورت سے تو کوئی آشنا نہیں - کیونکہ یہ عالم غنودگی میں مندتی ہوئی آنکھوں میں پتہ نہیں کب آدھمکتی ہیں کہ ان کے نازک قدموں کی آہٹ بھی کوئی محسوس نہیں کر سکتا - البتہ ان کی فطرت سے تقریباً ہر شخص واقف ہوتا ہے — یہ نیند پریاں بڑی ہی متضاد طبیعتوں کی مالک ہوتی ہیں - مہربان نامہربان، وفا شعار ستم شعار! کوئی خرگوش کی طرح تیز طرار اور چست تو کوئی کچھوے کی طرح دھیمی اور سست - کوئی سنجیدگی کا مکمل مجسمہ تو کوئی شرارت کی جیتی جاگتی پتلی! - ان کی فطرت میں بچپنا بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے، وقت بے وقت جگہ بے جگہ اور اندھیرے اجالے کی تو گویا ان کو تمیز ہی نہیں ہوتی - چند ذمہ دار پریوں کو چھوڑ کر باقی زیادہ نیند پریاں خود مختاری اور آزادی کی دلدادہ ہوتی ہیں لیکن اپنے موڈ کی غلام ہوتی ہیں -

سنسان جنگلوں میں جاتے ہوئے مسافروں کے ساتھ ان شوخ پریوں کو ٹھٹھولیاں کرنے میں بڑا لطف آتا ہے - ایک مسافر اپنی گٹھریا سنبھالے ہوئے سنسان راستے پر چلا جا رہا ہے کہ اچانک کسی نیند پری کی رگ شرارت پھڑکی! بس آگے بڑھ کر اس کے ہوش و حواس پر ڈاکہ ڈال دیا، اب چاہے آ اس غریب کی گٹھریا میں چور بھی لگ جائے تو یہ پری اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوگی - اور اس مسافر کی بے بسی پر اندر ہی اندر تالیاں بجائے گی -

اسپتال کے نام سے تو جیسے ان نیند پریوں کے پر جلتے ہیں شاید ان کی نازک مزاجی خون پیپ اور لکھو معالم کی بدبوؤں کی متحمل نہیں ہو سکتی - کتنے مریض درد اور تکلیف سے کراہتے ہوں لیکن

بمعرفت جناب ایس ایس ایچ قاضی - ۲/۳۲ آنند نگر - سول لائنس - ناگپور

پریوں کو یہ ہرگز گوارا نہ ہوگا کہ وہاں پہنچکر ہنسی خوشی ان مریضوں کی تکالیف کا مداوا کریں۔ کبھی کبھار گئیں
بھی تو الٹے پیروں واپس لوٹ آئیں — اور یہ وہاں بھی اپنی شرارتوں سے باز نہ آئیں گی مثلاً ایک مریض قلب
جس کو نیند کی اشد ضرورت ہے اس کو یہ دور سے انگوٹھا دکھا دیں گی اور کھلکھلاتی ہوئی اس طرف کو
چلی جائیں گی جہاں وہ مریض پڑا ہوا ہے جس کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ اس مریض کا معالج اسے موت
کے منہ سے واپس کھینچنے کی ہر تدبیر کر رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ اس امر کے لئے کوشاں ہے کہ
مریض سونے نہ پائے کیونکہ سوئے ہوئے انسان کو ہر طرح کا زہر بہت جلد مغلوب کر لیتا ہے لیکن اب
یہ نیند پری کا المعروف دیکھئے کہ وہ مسلسل اس مریض کو بڑے پیار سے تھپتھپا رہی ہے کہ سو جا!
میری نیند سو جا"!!

آج دنیا میں ہر طرف سیکولرزم اور کمیونزم کا بہت چرچا ہے چنانچہ یہ نظریات ان نیند پریوں
پر بھی اثر انداز ہوئے ہیں۔ امیری غریبی، چھوٹائی بڑائی اور ذات پات کے بھید بھاؤ کو یہ قطعی نہیں مانتیں
ان کا رویہ خواہ مہربانی کا ہو یا ستم شعاری کا بلا امتیاز خاص و عام ہوتا ہے۔ وہ دیکھئے نقرئی تھالیوں
میں کھانا کھانے والے سیٹھ جی نرم مخملیں گدیلے بستر پر کس طرح عالم اضطراب میں کروٹ پر کروٹ
بدل رہے ہیں لیکن نیند پریاں ان کی امارت یا شان و شوکت سے بالکل مرعوب نہیں ہوتیں، وہ تو ان
کے آنگن میں چاند کی روپہلی کرنوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی ہیں۔ اچانک ایک نیند پری کی نظر اس
بھکاری پر پڑی جو پتھریلی زمین پر اپنی باہوں کا تکیہ بنائے ہوئے چپ چاپ لیٹا ہوا چاند کو تک رہا ہے
تو آناً فاناً اس پری کی ساری شوخی اور شرارت ممتا اور کوملتا کے جذبات میں بدل جاتی ہے — اور وہ
پھولوں سے بھی زیادہ سبک قدموں سے چلتی ہوئی اس بھکاری کی آنکھوں کے کھلے دریچوں میں جا سماتی ہے۔

عموماً نیند پریاں شیر خوار بچوں سے مخصوص قسم کی انسیت اور محبت رکھتی ہیں چوبیس
گھنٹوں میں سے بیس گھنٹے کوئی نہ کوئی نیند پری کسی نہ کسی ننھے کو اپنی باہوں میں لئے ہوئے جھولا جھلاتی
رہتی ہے۔ بچوں پر مہربان یہ نیند پریاں وقت کی پابند اور ذرا ذمہ دار قسم کی ہوتی ہیں۔

عالم شباب میں انسان کو جن نیند پریوں سے سابقہ پڑتا ہے وہ کچھ اول جلول قسم کی
ہوتی ہیں۔ یا شاید وہ یہ فیصلہ ہی نہیں کر پاتیں کہ یہ زمانہ سونے کا ہوتا ہے یا جاگنے کا؟ کبھی کسی کی
آنکھوں آنکھوں میں رات کٹوا دی تو کبھی کسی کو اتنا مدہوش کیا کہ آفتاب سوا نیزے پر آ پہنچا — ان
نیند پریوں کو ضعیفوں سے نہ کوئی خاص رغبت ہوتی ہے اور نہ پرخاش! — اپنا بچا کھچا وقت ان ضعیفوں
کو دینے میں ان پریوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا چند خوش قسمت اشخاص ان نیند پریوں کو وراثتاً

حاصل کرتے ہیں مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں فلاں خاندان میں نیند بہت زیادہ ہے یا فلاں شخص کی نیند بہت اچھی ہے تو اس کا مطلب صرف یہی ہوتا ہے کہ پشت با پشت سے چند نیند پریاں اس خاندان کی خدمت پر مامور ہیں۔ ان خاندانوں کے افراد کے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ بستر پر لیٹ کر سوئیں۔ وہ تو بسوں کی سیٹوں پر بیٹھے بیٹھے سوتے ہیں، چلتی ہوئی ٹرین میں کمپارٹمنٹ کی دیواروں سے چپک کر کھڑے کھڑے بھی سو جاتے ہیں۔ دن ہو یا رات، سکھ ہو یا دکھ وہ ہر حال میں سوتے ہیں۔ سینما ہالوں، پارکوں اور دفتروں میں ان افراد کی شناخت بہ آسانی کی جا سکتی ہے۔ ایسی جگہوں پر اگر آپ کو بلی کی سی خرخرانے کی آواز آئے تو آپ جھک کر اپنے قدموں میں بلی کو مت تلاش کیجئے بلکہ اپنے آس پاس کے ماحول پر ایک طائرانہ نظر ڈالئے، آپ کو یقیناً اسی خاندان کا کوئی فرد بیٹھا ہوا یا پھر کھڑا ہوا نیند کا لطف لیتا ہوا نظر آئے گا، واللہ اعلم! یہ بھی سنا ہے کہ نیند پریاں ان اشخاص پر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی مہربان ہو جاتی ہیں جو اپنے گھوڑے بیچ دیتے ہیں لہٰذا "گھوڑے بیچ کر سونا" محاورے کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔

اردو کے شاعروں پر جو نیند پریاں مہربان ہیں وہ ایسی ہی مختلف قسم کی ہوتی ہیں جیسے اردو کے شاعر۔ کچھ ایسی نازک مزاج ہوتی ہیں کہ ذرا سی سرگوشی بھی ان پر گراں گذرتی ہے چنانچہ میر نے ہمیں بتا دیا ہے کہ ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

برخلاف اس کے کچھ ایسی سخت جان ہوتی ہیں کہ قیامت کا شور بھی انہیں ٹس سے مس نہیں کر سکتا سودا پر کچھ ایسی ہی نیند پری مہربان تھی کہ ؎

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شور قیامت
خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

لیکن جب یہ کسی فرد یا قوم پر ضرورت سے زیادہ مہربان ہو کر اس کو اپنا عاشق زار بنا لیتی ہیں تو بے ساختہ کہنا پڑتا ہے ؎ -

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

قاضی جلیل احمد

البدر

[گزشتہ اشاعت میں حقیقت اسرائیل اور اس کی فوجی طاقت کے بارے میں مختصراً بیان کیا گیا۔ اب صفحات ذیل میں مصر اور شام کے فوجی افسروں کے درمیان ہوئی ایک کونسل آف وار کو افسانوی انداز میں پیش کیا جا رہا ہے اس میں انداز بیان کے علاوہ اور کوئی چیز افسانہ نہیں ہے۔ (ادارہ)]

"لیکن مصر کے لئے ۵ر سے ۱۰ر اکتوبر کی درمیانی تاریخیں بہت اہم ہیں اور اگر جنگ شروع کی جا سکتی ہے ہیں سے کسی ایک تاریخ پر ورنہ شاید پھر کافی عرصہ مزید انتظار کرنا پڑے گا جس کے لئے صدر سادات یار نہیں ہیں"۔ مصر کے وزیر جنگ احمد اسمٰعیل نے اپنے مخصوص دھیمے اور پرسکون لہجے میں کہا۔

ہی ہی ہی ۔ مصطفیٰ طلاس (شام کا وزیر جنگ) کی بے ہنگم ہنسی گونجی ۔ یقیناً برادر اسمٰعیل رمالوں ول سے ساعت سعید نکلوانے کے قائل تو نہ ہوں گے"۔ اس ریمارک سے کانفرنس کی گمبھیر فضا میں خوش دلی ہلکی سی لہر دوڑ گئی اور شامی ہوں یا مصری سب ہی کے چہروں کی بشاشت عود کر آئی۔

یہ ۲۲ر اگست کی شام تھی اور اسکندریہ کے راس التین پیلس کے ایک وسیع کمرے میں شامی اور زراء جنگ کی سرکردگی میں اسرائیل کے خلاف جنگ کے منصوبوں کو آخری شکل دینے کیلئے دوپہر سے ایک ہو رہی تھی ۔ اس کانفرنس میں اول الذکر دو وزراء کے علاوہ ہر دو ممالک کی بری بحری اور ہوائی فوجوں کے ف اسٹاف ، ڈائرکٹرس آف انٹیلیجنس اور ڈائرکٹرس آف اوپریشن بھی شامل تھے۔ کانفرنس کے ایجنڈے وقت دو ایسے مسئلے تھے جن کا تصفیہ ہونا ضروری تھا۔ ان میں سے ایک مسئلہ تھا آغاز جنگ کی تاریخ کا بس کو D-Day کہتے ہیں اور دوسرا مسئلہ تھا حملے کی ساعت کا تعین جو H-Hour کہلاتا ہے۔ اسمٰعیل کا تعلق اول الذکر مسئلے سے تھا۔ یہ وہ بہت سنجیدہ بلکہ قدرے خشک مزاج آدمی تھا لیکن اس وقت اسے ان ہر دو امور پر اپنے خیالات کی اہمیت فریق ثانی پر واضح کرنی تھی اور مصطفیٰ طلاس کا وہ جملہ جیسی

میں ہی سہی لیکن اعتماد واذکار بھی نہ تھا ۔ مشرق میں روحانیت کے نام پر توہم پرستی کا زور اب بھی باقی ہے ۔ ہندوستان کی آزادی کی ساعت بھی پنڈتوں ہی سے نکلوائی گئی تھی ۔ نائیجیریا اور بیافرا کی خانہ جنگی میں حملے کی تاریخیں نجومیوں سے نکلوانے کے بے شمار واقعات ہیں ۔ خود مصر میں صدر ناصر کے مرنے کے بعد متعدد مصری وزراء اور سیاسی قائدین ناصر کی روح کو طلب کر کے اس سے مصری مسائل کی نسبت صلاح مشورے کیا کرتے تھے ۔ اور اسی امر واقعہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسمٰعیل نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ مسکراتے ہوئے جواب دیا :

" بھئی یہ وقت مذاق کا نہیں ہے اور نہ ہی یہ تاریخیں نجومیوں سے نکلوائی گئی ہیں ۔ ان تاریخوں کا تعین نہر سوئز میں سے گذرنے والی بحری لہروں کے گذشتہ صد سالہ ریکارڈ کی تفصیلی چھان بین اور اسٹڈی کے بعد کیا گیا ہے ۔ ان تاریخوں میں نہر کا پانی نسبتاً زیادہ پرسکون ہوتا ہے ۔ یہ تاریخیں اگر ہاتھ سے جاتی رہیں تو پھر عرصے تک دوسری ایسی تاریخ ملنی مشکل ہے جس میں نہر کے پانی میں اس قدر ٹھہراؤ آجائے ۔ "

" مرحبا ۔ مرحبا " طلاس نے خوش ہو کر کہا " برادر اسمٰعیل ! مجھے اپنے اس ریمارک پر شرمندگی ہے تم نے اس جنگ کی منصوبہ بندی جس سائنٹیفک انداز میں کی ہے وہ فن جنگ کی تاریخ میں جگہ پانے کی مستحق ہے لیکن یہ بتاؤ کہ ان میں سے کونسی تاریخ تمہارے لئے موزوں رہے گی ؟ "

" ۶ ر اکتوبر کی تاریخ میرے خیال میں مناسب رہے گی " اسمٰعیل نے جواب دیا " اس لئے کہ نہر کے کرنٹ میں اگر کوئی وقتی تبدیلی ہو بھی جائے تو ۶ ر تاریخ تک نہر بہرحال پرسکون ہو جائے گی ۔ نہر کا پرسکون ہونا کشتیوں کی آمد و رفت کے علاوہ ایک اور مہم کے لئے بھی ضروری ہے ۔ ہمارے کمانڈوز نے جو نہر پار کر کے سینائی میں کافی عرصہ قیام کرتے رہے ہیں یہ اطلاع دی ہے کہ انہوں نے نہر کے کنارے نیپام کے ایسے ذخائر دیکھے ہیں جن کا تعلق نلوں کے ذریعہ نہر کی تہہ سے کر دیا گیا ہے ۔ نیپام کے ان ذخائر کا مقصد یہ ہے کہ اگر ہم کبھی بڑے پیمانے پر نہر عبور کرنے کی کوشش کریں تو ان نلوں کے دہانے کھول کر پمپوں کے ذریعے سارا نیپام نہر میں جھونک دیا جائے اور پھر اس میں آگ لگا کر پانی کی اس نہر کو ایک دریائے آتشیں میں تبدیل کر دیا جائے اور اس طرح کچھ عرصہ تک ہماری پیش قدمی کو روک دیا جا سکے ۔ نہر جس قدر پرسکون ہو گی ہمارے غوطہ خوروں کیلئے ان نلوں کو تلاش کر کے سیل کرنا آسان ہو گا ۔ ہمارا منصوبہ یہ ہے کہ یہ کام حملے سے صرف ۳ گھنٹے قبل مکمل کیا جائے تاکہ دشمن کو خبر نہ ہو سکے کہ اس کا ایک اہم ہتھیار بے کار کر دیا گیا ہے ۔ "

" اچھا تاریخ کا تعین تو ہو گیا " طلاس نے کہا " اب بتاؤ کہ H-HOUR کیا ہو ؟ "

اسمٰعیل نے اپنے چیف آف اسٹاف کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے چاہتا ہو کہ اس سوال کا جواب وہ دے

مصر کے چیف آف اسٹاف جنرل سعد الدین شاذلی نے چند لمحوں تک اپنے سامنے رکھے کاغذوں کی سمت گھورا۔ یوں لگ رہا تھا کہ کاغذات کو پڑھ نہیں رہا بلکہ اپنے خیالات کو مجتمع کر رہا ہے پھر ایک زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ اس نے کہنا شروع کیا۔

"حملے کی ساعت کے تعین میں ہم نے جن امور کو پیش نظر رکھا ہے ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ ہم کم سے کم نقصان کے ساتھ اپنے زیادہ سے زیادہ آرمر Armer کو نہر کے اس پار پہنچا سکیں۔ اس امر میں رات کی تاریکی ہمارے لئے بہت مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ کیلنڈر کے لحاظ سے ۶ اکتوبر کی رات گیارہ بجکر ۴۵ منٹ پر چاند غروب ہو جائے گا اور اس طرح صبح کے اجالے سے پہلے پہلے ہمیں شب کی تاریکی کا اتنا وقت مل جائے گا کہ ہم اپنے آرمر کا بیشتر حصہ نہر کے پار اتار سکیں اور اس طرح ہماری انفنٹری کو جو اس وقت تک نہر کے مشرقی کنارے پر دشمن کے ہوائی جہاز اور آرمر کے رحم و کرم پر ہو گی ضروری سپورٹ مل جائے گی۔ نہر پر پل کی تیاری میں ہمیں چھ تا آٹھ گھنٹے درکار ہوں گے۔ اگر ہم رات کے آٹھ اور دس بجے کے درمیان پلوں کی تیاری کا کام مکمل کرنا چاہیں تو اس کام کا آغاز ہمیں دوپہر سے کرنا ہو گا تاکہ اگر بیچ میں کوئی رکاوٹ بھی پڑ جائے تو ہمارے پاس اتنا وقت ہو گا کہ نصف شب تک ہم آٹھ تا دس پل تیار کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ اس لئے دن میں دو بجے کا وقت ہماری رائے میں بہت مناسب اور موزوں رہے گا۔ دو بجے کی ساعت مقرر کرنے کے اور فائدے بھی ہیں۔ مثلاً اس وقت سورج اسرائیلیوں کی آنکھوں کے سامنے اور ہماری پشت پر ہو گا۔ اگر حملے کا آغاز دو بجے سے پہلے کیا جائے تو ہمیں بہت دیر تک رات کی تاریکی کا انتظار کرنا پڑے گا اور اس وقت تک نہر کے مشرقی کنارے ہماری انفنٹری کو آرمر کی امداد نہ مل سکے گی جو ان کے لئے تباہ کن بھی ثابت ہو سکتی ہے۔"

"دلائل تو آپ کے بہت معقول ہیں" شامی چیف آف اسٹاف جنرل شکور نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن سورج کی پوزیشن ہمارے لئے بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی آپ کے لئے ہے اور دوپہر میں سورج ہماری آنکھوں کے سامنے اور اسرائیلیوں کی پشت پر ہو گا۔ قطع نظر اس کے حملے کے آغاز سے قبل فوجوں کی جو ضروری حمل و نقل ہوتی ہے وہ دن کے اجالے میں دشمن کی نظروں سے پوشیدہ رہنی ممکن نہیں اس طرح حملے کا آغاز دو بجے کرنے کی وجہ سے ہم حملے میں پہل کرنے کے فائدے سے بھی محروم رہیں گے اس لئے اگر علی الصبح طلوع آفتاب سے کچھ قبل مقرر کیا جائے تو اس وقت ہماری نقل و حرکت رات کی تاریکی میں پوشیدہ رہے گی اور دشمن بھی اس وقت غافل اور بے خبر ہو گا۔" شکور نے بات ختم کرتے ہوئے اپنے وزیر جنگ مصطفیٰ طلاس کی جانب دیکھا جس نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

جواب کی ذمہ داری ایک بار پھر شاذلی پر آپڑی جس کے لئے وہ پوری طرح سے تیار تھا۔

جواب میں اس نے کہنا شروع کیا۔ "آپ کا استدلال درست ہے لیکن ایسی صورت میں دشمن کے نہ صرف خبردار اور چوکنا ہونے کا امکان ہے بلکہ اس کے حملے میں پہل کرنے کا احتمال بھی ہے لیکن کیا رات کی تاریکی میں فوجوں کی نقل و حرکت کو بالکلیہ پوشیدہ رکھنا ممکن ہے؟ اسرائیلیوں کے لئے شامی فوجوں کا یہ کثیر اجتماع ہی شک اور شبہ میں مبتلا کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس کے علاوہ دمشق اور قاہرہ میں جو اسرائیلی جاسوس پھیلے ہوئے ہیں ان کی آنکھوں سے فوجوں کی نقل و حرکت کہاں پوشیدہ رہ سکتی ہے۔ اور اگر بفرض محال یہ جاسوس چوک بھی جائیں تو امریکی سٹلائیٹس اور یو ٹو طیاروں کی خورد بینی نظروں سے اس کا پوشیدہ رہنا کہاں ممکن ہے اس لئے یہ سمجھنا کہ آخر لمحہ تک دشمن کو خبر نہ ہوگی حقیقت پسندی کے منافی ہے لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں حملے سے چند گھنٹے قبل اگر دشمن کو پتہ چل بھی جائے تو اس قلیل مدت میں وہ ہوائی تاخت کے علاوہ اور کوئی بڑا حملہ کرنے کے قابل نہیں ہوگا اور ہماری موجودہ ایر ڈیفنس کی پوزیشن کے لحاظ سے یہ حملہ رفتار جنگ پر کچھ زیادہ اثر انداز ہونے والا نہیں ہے اس لئے ایک موہوم سے احتمال کے لئے ایک ٹھوس فائدے سے دست بردار ہونا عقلمندی نہ ہوگی اب رہا سورج کا آنکھوں کے سامنے ہونے کا مسئلہ تو یہ امر واقعی قابل غور ہے اور اگر آپ حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ سورج کی پوزیشن آپ کے لئے واقعی اتنی اہم ہے اور کسی بڑی رکاوٹ کا باعث ہو سکتی ہے تو پھر ہمیں اس میں بھی کوئی اعتراض نہیں کہ آپ اپنے حملہ کا آغاز عصر سے آٹھ گھنٹے قبل صبح کے دھندلکے میں کر دیں۔"

"دھندلکے پر سے خیال آیا کہ صبح کی دھند آپ کے طیاروں کی کارروائی میں رکاوٹ کا باعث بھی ہو سکتی ہے" ایر کموڈور فہمی نے کہا۔ "اب یقیناً اپنے حملے کا آغاز دشمن کی لائنوں پر بمباری کے ذریعے کریں گے اور کوشش یہ ہوگی کہ دشمن کے زیادہ سے زیادہ ٹینک اور آرمر کو اس حملے کے ذریعے تباہ کیا جا سکے لیکن جیسا کہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں اکتوبر کے مہینے میں گولان کی پہاڑیاں صبح کے وقت کہر کے گہرے غلاف میں ملفوف ہوتی ہیں۔ یہ کہر آپ کے ہوائی جہازوں کی کارروائی میں رکاوٹ کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس لئے شاید صبح کا وقت آپ کے لئے بھی موزوں نہیں ہوگا۔"

کمرے میں ایک لحظہ کیلئے گہرا سکوت طاری ہو گیا جیسے ہر کوئی ڈرتا ہو، گھبراتا ہو اس سکوت کو توڑنے اور اس خاموشی کو درہم برہم کرنے سے۔ گفتگو فیصلہ کن مرحلے پر پہنچ چکی تھی اور صرف ہاں یا نہ کی دیر تھی بالآخر اس سکوت کا سینہ چیرتی ہوئی مصطفیٰ طلاس وزیر جنگ کی پاٹ دار آواز پھر ابھری:

"میں سمجھتا ہوں ہم نے اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کر لی ہے ویسے بھی اس نشست میں ہم نے کئی ایک اہم فیصلے کئے ہیں لیکن اس آخری مسئلے کے تعلق سے میں سمجھتا ہوں کہ قطعی تصفیے سے قبل صدر حافظ الاسد کی رائے لینی مناسب ہوگی انشاء اللہ کل شام تک صدر کے فیصلے سے آپ باخبر ہو جائیں گے"

(بقیہ ص۲۷ پر)

عربی سبق

فعل مضارع

فعلِ مضارع وہ فعل ہے جس سے کسی کام کا زمانہ حال یا زمانہ مستقبل میں ہونا سمجھا جائے جیسے يَفْعَلُ (وہ کرتا ہے یا وہ کریگا)، يَأْكُلُ (وہ کھاتا ہے یا کھائیگا)، يَأْخُذُ (وہ لیتا ہے یا وہ لے گا)
عبارت کے مضمون سے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ یہاں زمانہ حال سے متعلق ہے یا مستقبل سے۔

مضارع بنانے کے لئے مادہ سے قبل علامت مضارع کا اضافہ کرکے اسے زبر دے دیتے ہیں۔ مادہ کے پہلے حرف کو ساکن کرتے ہیں اور آخری حرف کو پیش دے دیتے ہیں۔ مادہ کے درمیانی حرف کی حرکت مختلف مادوں میں مختلف ہوتی ہے۔ علامت مضارع چار حرف ہیں ا۔ت۔ی۔ن (اَتَيْنَ)

گردان کا پہلا صیغہ یعنی مذکر واحد غائب کا صیغہ بنانے کے لئے مادہ سے قبل علامت مضارع "ی" اضافہ کرتے ہیں مثلاً = يَفْعَلُ —— دیگر صیغوں میں جو مزید تبدیلیاں ہوتی ہیں ذیل میں دی ہوئی گردان سے ظاہر ہوتی ہیں۔

گردان فعل مضارع معروف

صیغہ		مذکر	مونث
غائب	واحد	يَ + فْعَلُ = يَفْعَلُ وہ کرتا ہے / وہ کریگا	تَ + فْعَلُ = تَفْعَلُ وہ کرتی ہے / کریگی
	تثنیہ	يَ + فْعَلُ + انِ = يَفْعَلَانِ { وہ دونوں کرتے ہیں / کریں گے }	تَ + فْعَلُ + انِ = تَفْعَلَانِ { وہ دونوں کرتی ہیں / کریں گی }
	جمع	يَ + فْعَلُ + وْنَ = يَفْعَلُوْنَ { وہ سب کرتے ہیں / کرینگے }	يَ + فْعَلْ + نَ = يَفْعَلْنَ { وہ سب کرتی ہیں / کرینگی }
حاضر / مخاطب	واحد	تَ + فْعَلُ = تَفْعَلُ تو کرتا ہے / کرے گا	تَ + فْعَلُ + يْنَ = تَفْعَلِيْنَ تو کرتی ہے / کرےگی
	تثنیہ	تَ + فْعَلُ + انِ = تَفْعَلَانِ { تم دونوں کرتے ہیں / کریں گے }	تَ + فْعَلُ + انِ = تَفْعَلَانِ { تم دونوں کرتی ہیں / کرینگی }
	جمع	تَ + فْعَلُ + وْنَ = تَفْعَلُوْنَ { تم سب کرتے ہیں / کرینگے }	تَ + فْعَلْ + نَ = تَفْعَلْنَ { تم سب کرتی ہیں / کرینگی }
متکلم	واحد	(مذکر / مونث) اَ + فْعَلُ = اَفْعَلُ میں کرتا ہوں / کروں گا — میں کرتی ہوں / کروں گی	
	تثنیہ / جمع	(مذکر / مونث) نَ + فْعَلُ = نَفْعَلُ { ہم دونوں کرتے ہیں / کریں گے ؛ ہم سب کرتے ہیں / کرینگے }	

يَنْصُرُ وہ مدد کرتا ہے / کرے گا تَنْصُرُ وہ مدد کرتی ہے / کرے گی
يَنْصُرَانِ ، تَنْصُرَانِ ، يَنْصُرُوْنَ ، يَنْصُرْنَ ، تَنْصُرُ ، تَنْصُرِيْنَ
تَنْصُرَانِ ، تَنْصُرَانِ ، تَنْصُرُوْنَ ، تَنْصُرْنَ ، اَنْصُرُ ، نَنْصُرُ

مَاذَا يَفْعَلُ الْوَلَدُ ؟ (لڑکا کیا کرتا ہے ؟) هُوَ يَعْبُدُ اللّٰهَ (وہ اللہ کی عبادت کرتا ہے) مَاذَا يَفْعَلُ الْآنَ ؟ (اب کیا کر رہا ہے ؟) اَلْآنَ يَرْكَعُ ثُمَّ يَسْجُدُ (اب رکوع کر رہا ہے بعد میں سجدہ کرے گا) مَاذَا يَفْعَلُوْنَ (وہ سب کیا کر رہے ہیں ؟) هُمْ يَلْعَبُوْنَ وَ يَضْحَكُوْنَ وَيَمْزَحُوْنَ (وہ سب کھیل رہے ہیں ، ہنس رہے ہیں اور مذاق کر رہے ہیں) مَاذَا يَفْعَلُوْنَ الْآنَ ؟ (وہ اب کیا کر رہے ہیں ؟) يَضْرِبُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا (ان میں سے چند دوسروں کو مار رہے ہیں) ۔

اَلْاَوْلَادُ يَلْعَبُوْنَ / يَلْعَبُ الْاَوْلَادُ (لڑکے کھیلتے ہیں)

(جمع فاعل کے لئے فعل بعد میں آئے تو جمع ہوگا اور شروع میں آئے تو واحد ہوگا) ——

اَلْاَوْلَادُ يَاْكُلُوْنَ وَيَشْرَبُوْنَ مِنْ رِزْقِ اللّٰهِ لڑکے اللہ کے رزق میں سے کھاتے اور پیتے ہیں) آكُلُ التِّيْنَ وَ الْعِنَبَ وَالتُّفَّاحَ (میں انجیر ، انگور اور سیب کھاتا ہوں)

نَاْكُلُ لَحْمًا طَرِيًّا (ہم تازہ گوشت کھاتے ہیں) نَشْرَبُ لَبَنًا خَالِصًا (ہم خالص دودھ پیتے ہیں) اَلْعَبُ فِي الْفَتْرَةِ (میں انٹرول میں کھیلتا ہوں) اَتَذْهَبُ الْيَوْمَ اِلَى الْمَدْرَسَةِ يَا مَجِيْدُ ؟ (اے مجید ! کیا آج مدرسہ جاؤگے ؟) نَعَمْ ! اَذْهَبُ الْيَوْمَ وَلٰكِنْ لَا اَذْهَبُ غَدًا (ہاں ! آج جاؤں گا لیکن کل نہیں جاؤں گا) لِمَاذَا لَا تَذْهَبُ غَدًا (کل کیوں نہیں جاؤگے !

غَدًا يَوْمُ الْعُطْلَةِ (کل تعطیل کا دن ہے)

مَاذَا تَاْكُلُ وَتَشْرَبُ فِي الْفُطُوْرِ ؟ (ناشتہ میں تم کیا کھاتے پیتے ہو ؟)

آكُلُ الْخُبْزَ بِالْاِدَامِ وَاَشْرَبُ الشَّايَ (میں روٹی سالن سے کھاتا ہوں اور چائے پیتا ہوں)

مَاذَا تَفْعَلُ اَنْتَ وَاَصْدِقَاؤُكَ بَعْدَ الدَّرْسِ ؟ (پڑھائی کے بعد تم اور تمہارے دوست کیا کرتے ہیں ؟) نَلْعَبُ بِكُرَةِ الْقَدَمِ فِي الْمَيْدَانِ (ہم فٹبال سے میدان میں کھیلتے ہیں)

جی - وائی - انصاری

اردو سے خواجہ عبدالغفور کا رومان

ڈاکٹر غفور کا آخری انٹرویو

"ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو" کے دور سے گذرنے والی "اردو" کی بدنصیبی دیکھئے کہ خود اردو والوں کی صفوں سے کچھ ایسے لوگ ابھر آئے ہیں جنہیں "اردو" کے حروف تہجی میں بقول خود "تکرار" پر، حروف تہجی کی کثرت تعداد پر، حتیٰ کہ حروف تہجی یا اردو کی موجودہ شکل و صورت پر اعتراض ہے۔ اب یہ میں نہیں جانتا کہ آیا یہ رجحان حصول آزادی کے بعد اردو والوں کی اکثریت میں پیدا ہونے والے احساس کمتری کا نتیجہ ہے!۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اسے کیا "نام" دیا جانا چاہیئے؟۔

"پڑھے لکھوں کی ایک تعداد" اردو رسم الخط "کو اردو زبان کے لباس سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی اور چاہتی ہے کہ اسے - اردو کو - یا تو دیوناگری رسم الخط کی ڈھیلی ڈھالی انگیا اور گھاگرا پہنا دیا جائے یا پھر رومن رسم الخط کا رانوں کے قریب تک اونچا "منی اسکرٹ" پہنا دیا جائے۔

دیوناگری - رومن رسم الخط - اردو والا فرقہ دراصل اردو کے خوبصورت جسم کی ان نزاکتوں کو، اس کے زاویوں اور اس کی کمر کی لوچ کو دیکھنے سے قاصر ہے جو صرف اردو ہی کا حصہ ہیں۔ یہ لوگ یا تو برسر اقتدار طبقہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ایسی باتیں کرتے ہیں یا پھر اس قدر شدید احساس کمتری میں مبتلا ہیں کہ وہ نہ صرف خود بلکہ تمام اردو والوں کو اردو کے حسن لازوال سے محروم کر دینے میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔

دوسری جانب مشرق وسطیٰ، انگلستان اور شمالی امریکہ میں اردو کا بڑھتا ہوا چلن، خود ملک اور بیرون ملک اردو فلموں، اردو فلمی گیتوں کی مقبولیت ہے جن کے ماتھے پر محض موقعہ شناسی یا کسی کی خوشنودی حاصل کرنے "ہندی" کا لیبل چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ یہ خدشہ پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں "اردو" فلموں اور بازار کی زبان ہو کر نہ رہ جائے۔ اس صورت حال کا سامنا کرنے اور "اردو زبان کی ترویج و ترقی اور اس کا مستحقہ مقام دلانے کے لئے مثبت مساعی کی شدید ضرورت ہے۔ ان مثبت مساعی میں - حقیقی شکل میں "اردو" کے تعارف کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ تعارف صرف غیر اردو داں طبقات تک ہی محدود نہ رہے خود اردو داں طبقات میں بھی اس کا از سر نو تعارف ناگزیر ہے کیونکہ اردو داں طبقات کی نئی پود کی اکثریت اردو

رسم الخط سے ناواقف ہوتی جا رہی ہے ویسے ہی جس زبان کا تعلق راست معاش سے جڑا ہوا ہو اس پر توجہ دی جاتی ہے جب کہ لوگ ان زبانوں کو سیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو روزگار کے دروازے کھول سکتی ہیں۔ ان حالات اردو کے "کافر ادا بدن" پر دیوناگری یا رومن رسم الخط کے غیر موزوں لباس پہنانے کی تجویز پر خوب بحث ہونے لگی۔ اس قسم کی تجویزیں پیش کرنے والوں کو "سرپرستیاں" بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔ ان کی ستائش کی جانے لگی۔ ایسے ماحول میں اردو کو اس کے حقیقی خد و خال میں باقی رکھنے کی آرزو کرنے والوں کو بھی ہم بہت ہی باحوصلہ اولوالعزم کہہ سکتے ہیں۔

اردو میں کثرت حروف تہجی، ظاہراً مماثلت لفظ پر بے جا اعتراضات کا سامنا کرنے والی زبان بلاشبہ ہیں ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور آئی اے ایس (ریٹائرڈ) ممبر و سکریٹری مہاراشٹرا اردو اکادمی بھی ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور نے "قہقہوں" پر تحقیق کرکے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے اور اب بمبئی نے ان پر [illegible] ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور پر تحقیق کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری کا مستحق قرار دیا ہے۔ اس اعلان کے بعد توقع بندھ گئی ہے کہ ملک کی کوئی نہ کوئی یونیورسٹی "سنجیدگی"۔ ڈاکٹر عبدالغفور قہقہوں کے مابین "رشتوں تلاش و تحقیق پر بھی ڈاکٹریٹ کی ڈگری کا اعلان کرے گی۔ کسی نے ہمیں بتایا کہ ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور نے اردو میں کثرت حروف تہجی اور مماثلت حروف تہجی کا بڑا ہی کرارا جواب دیا ہے لیکن ساتھ ہی اس بات کو بھی شہرت ہوگئی تھی کہ انہوں نے حروف تہجی کی تعداد (۳۷) سے گھٹا کر (۱۳) کر دی ہے۔

"شہرتوں" کے اس تضاد نے ہمیں ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور سے ملنے اور بات چیت کرنے پر مجبور کیا۔ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لئے ایک باقاعدہ منصوبہ بنانا پڑتا ہے ان کا ایک پیر بمبئی میں دوسرا کہیں اور رہتا کل سنا تھا کہ دہلی میں ہیں۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ پتہ چلا کہ ناگپور میں اردو کے یک بابی ڈراموں act- Drama کے فروغ کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رہے ہیں۔ اب اسے ہماری خوش نصیبی ہی کہیے کہ وہ ہمارا باقاعدہ منصوبہ بندی کے آغاز کے دوران ہی حیدرآباد تشریف لائے اور ہم نے ان سے بہت سارے عذر دار ایک بھی "عذر لنگ" نہیں تھا۔ پھر بھی ہماری ضد نے ان کی ایک نہ چلنے دی اور بات چیت شروع ہو گئی۔

ہمارا پہلا سوال بڑا ہی کرارا تھا اور بات چیت شروع کرنے کے اخلاق کے منافی بھی کیونکہ حروف کی تعداد گھٹانے کی بات ہمیں پسند نہیں آئی تھی۔

جی۔ وائی۔ اے: سنا ہے کہ آپ نے اردو حروف تہجی کی تعداد گھٹا دی ہے کیا اس طرح آپ نے اردو رسم الخط کو نقصان نہیں کر دیا؟ کیا آپ نے خود کو ان لوگوں کے زمرہ میں شامل نہیں کر لیا جو کثرت حروف کی شکایت کرتے پھرتے ہیں؟ کیا آپ کے خیال میں اس طرح اردو کی مقبولیت کو گھٹانے کے خدشات کو [illegible]

ے کا نام شامل نہیں ہو جائے گا ؟

ڈاکٹر خواجہ عبد الغفور ہمارے سوال کے دوران اس طرح مسکراتے ہوئے ہمیں دیکھ رہے تھے جیسے وہ سوال ختم ہوتے ہی کوئی لطیفہ سنا کر بات چیت ختم کر دیں گے لیکن ۔۔ ڈاکٹر خواجہ عبد الغفور نے نہایت سنجیدگی جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ کس نے کہہ دیا کہ میں نے اردو کے حروف تہجی کی تعداد گھٹا دی ہے، یہ سراسر الزام ہے۔ میں نے حروف تہجی کو صرف سکیڑ دیا ہے انہیں گھٹایا نہیں۔ آپ اس حقیقت سے واقف ہی ہوں گے "اردو" نقطوں اور حروف کے پیچ و خم اور لوچ و لچک کی زبان ہے ۔ صرف وہی لوگ جو نقطوں اور حروف پیچ و خم کی خوبصورتی کو دیکھنے، پرکھنے، سمجھنے اور بولنے کے فن سے ناواقف ہیں ۔ اردو میں حروف تہجی کی بہتات سے ایسے ہی گھبراتے ہیں جیسے کثرت ازدواج سے انہیں گھبرانا چاہیئے ۔ جہاں تک حروف تہجی کا تعلق ہے میں نے انہیں سکیڑا ضرور ہے لیکن ان کی تعداد ہرگز نہیں گھٹائی ہے ۔

جی ۔ وائی ۔ اے ۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ جملہ میرے لئے "کہہ مکرنی" سے کم نہیں تھا اس لئے میں نے اس کی وضاحت چاہی ۔

ڈاکٹر غفور ۔ نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا "جیسا کہ میں قبل ازیں کہہ چکا ہوں، اردو نقطوں اور حروف کے پیچ و خم کی زبان ہے ۔ انہی نقطوں اور پیچ و خم کو بنیاد بناتے ہوئے میں نے حروف تہجی کو اس طرح سکیڑنے کی کوشش کی ہے کہ اردو بولنے والے، اردو والے اور اردو سیکھنے کے خواہشمند، غیر اردو داں طبقے سہل ترین مدت میں اردو سیکھ لیں ۔

اردو حروف تہجی میں "ل" اور "ق" دو ایسے حروف ہیں جو ہر حال میں مکمل رہتے ہیں اگرچہ کہ "ط" بھی اپنی شکل کبھی نہیں بدلتا لیکن نقطہ اس پر اثر انداز ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ میں نے "ط" کو "ل" اور "ق" کے زمرہ میں شامل نہیں کیا ۔ اب رہ جاتے ہیں دوسرے حروف جو مختلف زمروں میں منقسم ہیں ان سے ہر ایک زمرہ کے حروف کے بارے میں علیحدہ علیحدہ وضاحت کروں گا ۔

پہلا زمرہ : ب پ ت ٹ ث کا ہے ۔ آپ ان حروف میں نقطوں کی جادوگری کو واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں ۔ غیر اردو داں طبقہ یا اردو رسم الخط سے ناواقف "اردو والے" نقطوں کی اس جادوگری کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ ان پر اردو کا جادو نہ چل جائے چنانچہ میں نے ان پانچ حروف کو ایک ہی شکل دے دی ہے ۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر خواجہ عبد الغفور نے ہمیں وہ ویڈیو کیسٹ دکھلائے جو اردو انگریزی [illegible] تیار کی گئی ہیں ۔ ان ویڈیو کیسٹس کا مقصد ملک، بیرون ملک اور خاص کر شمالی امریکہ اور برطانیہ میں رہنے والے

شعبہ والوں کی نئی پود کو جو اردو رسم الخط سے واقف نہیں ہے اور جن کے پاس کوئی دوسری زبان سیکھنے کے لئے بہت کم وقت ہوتا ہے اقل ترین مدت میں اردو اور اردو رسم الخط سے واقف کرانا ہے۔ اس وڈیو کیسٹ میں جو گُر بتایا گیا ہے وہ نسخہ کیمیا سے کم نہیں ہے۔ ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور صاحب نے ایک لمبی لکیر ـــــــــــ کھینچی اور پھر اسے اس طرح ـ ـ ـ ـ ـ پانچ حصوں میں منقسم کر دیا۔ نقطوں کی جادوگری کا کمال بتاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے ان منقسم حصوں پر ب پ ت ٹ ث کے نقطے لگا دئے اس طرح یہ ایک لکیر ب پ ت ٹ ث میں بٹ گئی اسی طرح انہوں نے چار "ح" لکھیں اور پھر اپنی نقطہ دانی اور نقطہ نوازی کا کرشمہ دکھاتے ہوئے ایک کے پیٹ میں نقطہ لگا کر اسے "ج" کر دیا دوسری کے پیٹ میں تین نقطے لگاتے ہوئے اسے "چ" کر دیا تیسری پر چونکہ نقطہ کا جادو نہیں چلا اس لئے وہ "ح" باقی رہ جاتی ہے اور نقطہ کا جادو جب چوتھی کے سر چڑھ کر بولتا ہے تو وہ "خ" ہو جاتی ہے۔

اسی طرح انہوں نے چار "ر" لکھیں ایک کو "ر" ہی رہنے دیا دوسری کے سر پر نقطہ کی بندیا لگا کر "ز" اور تیسری کے سر پر چھوٹی "ط" کا طرہ لگا کر "ڑ" اور چوتھی کے سر پر تین نقطوں کا تاج پہنا کر "ژ" بنا دیا۔

ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور نے اپنے دونوں وڈیو کیسٹس ـــ اردو اور انگریزی میں۔ دوسرے حروف تہجی کو بھی نقطوں کے اس جادوئی عمل سے گزارتے ہوئے ان کی تعداد گھٹائی نہیں بلکہ ان کی گنتی سکیڑ کر (۳۷) کی بجائے (۱۳½) تیرہ بٹے سینتیس کر دی ہے اس طرح ڈاکٹر غفور نے صرف (۳۰) منٹ میں اردو کے نئے طالب علم کو اتنا سکھا دیا ہے جتنا کہ وہ روایتی طریقہ سے کم از کم تین ماہ میں سیکھ سکتا تھا۔

جی۔ وائی۔ اے۔ "اردو" کو دیوناگری کی ڈھیلی ڈھالی انگیا اور گھاگرا یا رومن رسم الخط کا تاپ بسن پہنانے کے بارے میں پیش کی جانے والی تجاویز کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر غفور۔ اس خصوص میں قطعیت کے ساتھ یہ کہوں گا کہ اردو رسم الخط کسی طرح بھی مشکل نہیں ہے جبکہ دیوناگری اور رومن فرصت سے زیادہ مشکل ہیں اور ساتھ ہی ببانگ دہل یہ اعلان کرنا چاہوں گا کہ "دیوناگری" اور "رومن" کا ظرف بڑا ہی تنگ ہے۔ یہ ان تمام چیزوں کو اپنے میں سمونے سے قاصر ہے۔ ان دونوں پیشیوں کے دامن میں اتنی وسعت کہاں کہ وہ اردو کی گہرائی اور گیرائی کو برداشت کریں۔ نیز اردو زبان کی نفاست، نزاکت اور لوچ و لچک کی آئینہ داری سے بھی یہ دونوں لپیاں قاصر ہیں۔ جہاں تک دیوناگری رسم الخط میں شائع ہو کر ہندی داں طبقہ پر اپنا سکہ جمانا چاہتے ہیں۔

اب رہ جاتا ہے رومن رسم الخط اس تجویز کے چہرہ پر عالمگیر رابطہ کا انتہائی خوبصورت نقاب بھی چڑھا دیا گیا ہے۔ اگر اسے مان بھی لیا جائے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان کی دیگر زبانوں کو بھی اس

"شاندار تجویز سے مستفید ہونا چاہیئے۔ دوسری تلخ حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی اکثر زبانیں رومن رسم الخط میں لکھی جانے کے باوجود ایک دوسرے سے قریب نہیں ہیں۔

جی۔ وائی۔ اے ؛ انگریزی۔ آج دنیا کی سب سے بڑی زبان ہے اور یہ رومن لیپی میں لکھی جاتی ہے۔ کچھ اہل قلم حضرات کی جانب سے اردو کے لئے رومن رسم الخط اختیار کرنے کی تجویز کے ساتھ ساتھ اس رسم الخط کی وسعتوں اور پہنائیوں کے بارے میں بڑی زبردست بلکہ تاخنور (طاقتور) مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور نے جو ہر مشکل مسئلہ کو لطیفہ بردوش کرتے ہوئے اس کا حل تلاش کرلیا کرتے ہیں، ہمارے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا:

"آپ انگریزی حروف تہجی کو لیجئے "A" کو "اے" پڑھتے ہیں لیکن آندھرا لکھتے ہیں تو یہی "A" اچانک "آ" بن جاتا ہے اس وقت برناڈ شا کا ایک لطیفہ یاد آرہا ہے : انگریزی زبان کے اس عظیم قلمکار نے ایک بار (GHOTI) گوٹی لکھا اور لوگوں سے خواہش کی کہ وہ اسے "FISH" فش پڑھیں۔ جب انگریزی کے اہل زبان اس تجویز پر حیران ہوئے تو جارج برناڈ شا نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ : ENOUGH کے آخری دو حروف GH سے "F" کی آواز نکلتی ہے WOMEN (ومین) کے دوسرے حرف "O" (او) سے "I" (آئی) کی آواز نکلتی ہے اسی طرح ATTENTION (اٹینشن) کے ساتویں اور آٹھویں حروف "TI" (ٹی آئی) "SH" (ایس ایچ) کی آواز دیتے ہیں اس طرح ہمیں GHOTI (گوٹی) لکھ کر FISH پڑھنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے۔

ڈاکٹر عبدالغفور نے اس طرح انگریزی زبان کے سیکڑوں ایسے الفاظ پیش کردئے جن کے ہجے ہی دشوار ہیں بلکہ جو لکھے جاتے ہیں کچھ اور پڑھے جاتے ہیں کچھ۔ اس بات چیت سے یہ حقیقت واضح ہوتی جارہی تھی کہ ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور اردو زبان، اردو رسم الخط اس کے نقطوں اور حروف کے پیچ وخم میں "رومان" تلاش کرنے میں بڑی شاندار کامیابی حاصل کرچکے ہیں۔ انہوں نے اردو کے جوڑ پیچ وخم میں رومان پرور زلفیں پالے ہیں، ان کی غنائیت اور لفظ سے پھوٹتے ہوئے تغزل کی طرف سے اوروں کی طرح اپنے کان بند نہیں رکھے ہیں اگرچہ کہ وہ ماہر لسانیات ہونے کے دعویدار نہیں لیکن اردو زبان کی تراش خراش سے، اردو کی نازک کمر کے اس لوچ سے بخوبی واقف ہیں جس پر ہر زبان کے "لفظ" کی گاگر بالکل ایسی ہی بیٹھتی ہے جیسے کہ وہ صرف اسی "کمر" کے لئے بنائی گئی ہو۔

اردو زبان کی لوچ ولچک ہی ہے جو دوسرے زبانوں کے الفاظ کو "یہ اپنے ہیں" کے انداز میں اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے اور سیکڑوں اجنبی الفاظ "اردوائے" جانے کے بعد ان کی اصل شناخت

بن گئے ہیں اور ایسے لگتے ہیں جیسے کہ وہ "اردو" کے بطن ہی سے پیدا ہوئے ہوں ۔
ہمیں یقین ہے ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور کا اردو سے یہ رومان پروان چڑھے گا اور بار آور ثابت ہوگا ۔ اردو صوتی تہجی کو سیکھنے کی تکنیک انتہائی سودمند ثابت ہوگی ۔ ▬▬

(سنڈے ایڈیشن روزنامہ منصف [illegible] سے شکریہ کے ساتھ)

(سلسلہ صفحہ ۴۳ سے آگے)

نوٹ: حسب وعدہ حافظ الاسد صدر جمہوریہ شام کا مکتوب انور سادات کے نام ارسال کیا گیا جو کچھ اس طرح تھا

"..... مجھے آپ کی تجویز کی ہوئی تاریخ اور ساعت (۶ اکتوبر ۲ بجے دن) سے اتفاق ہے ۔ برادرم سادات یہ جان لیجئے کہ ہم اہل شام معرکہ کی اہمیت اور معرکہ کی قدر و قیمت سے بخوبی واقف ہیں ۔ ہم اپنی بقا کو معرکہ کی بقا میں اور اپنے مفاد کو معرکہ کے مفاد میں مضمر سمجھتے ہیں اور اسی لئے ہر وہ تجویز قبول کرنے آمادہ ہیں جس سے آپ کو مدد ملتی ہو ...."

(باقی آئندہ)

(سلسلہ صفحہ ۴۵ سے آگے)

ہر پابندی عائد کر دی گئی ہے ۔

صوتی آلودگی کے سدباب کے لئے سائنسی نظریات کو کام میں لانا ضروری ہے یعنی یہ دیکھا جائے کہ آواز کا منبع کہاں ہے، اس کی اشاعت کس راستہ سے ہو رہی ہے اور اس کی پہنچ کہاں تک ہے؟ عموماً آواز ذرائع آمد و رفت اور مختلف مشینوں سے پیدا ہوتی ہے اس لئے ایسی مشینیں تیار ہوں جو کم سے کم آواز پیدا کریں ۔ یہ کام صنعت کاروں کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں ۔ آواز کی اشاعت اور اس کی پہنچ کو اسی وقت قابو میں رکھا جا سکتا ہے جب کہ شہر میں مکانوں کی تعمیر کے وقت صوتی آلودگی کو پیش نظر رکھا جائے ۔ یعنی رہائشی مکانات سڑکوں، ریلوے اسٹیشن اور ایرپورٹ کے قریب تعمیر نہ کئے جائیں اور اگر ممکن ہو سکے تو ساؤنڈ پروف اشیاء استعمال کی جائیں ۔

غرض صوتی آلودگی بنی نوع انسان کے لئے نہایت ہی خطرناک ہے ۔ اس کے ممکنہ مسائل کی یکسوئی کے لئے ایک اجتماعی اقدام ہی ہمارے معاشرہ کو صحت مند رکھنے کا ضامن ہو سکتا ہے ۔

▭▭

ڈاکٹر منشاء الرحمن خاں منشا

آہ! خواجہ عبدالغفور

دل مچل اٹھے ہوئے آنسو رواں
ہائے رے یہ ناگاہ مرگِ ناگہاں
یہ اچانک کون رخصت ہو گیا
بزمِ یاراں آج ہے ماتم کناں

کر کے رنج و غم میں سب کو مبتلا
چل بسا وہ خواجۂ حق آشنا
تھا جو حسنِ خلق کا آئینہ دار
دوستوں کا دوست اور یاروں کا یار

تا دمِ آخر جو کرتا ہی رہا
گیسوئے اردو کو پیہم تابدار
خدمتیں اس کی ہیں بے حد و حساب
اس نے بخشی ہے ادب کو آب و تاب

وہ تھا مخلص قدردانِ علم و فن
باعثِ زیبائشِ ہر انجمن
فیض قدرت سے میسر تھا اسے
طرزِ دلداری کا سادہ بانکپن

وہ سراپا پیکرِ اخلاص تھا
تب ہی تو مقبولِ عام و خاص تھا
دلنوازی میں تھی یکتا اس کی ذات
اس کا شیدا ہے جو دل کی تھیں شانِ صفات
تھا زبردار بھی جوش و خروش کا
خوبصورت باب تھی اس کی حیات

بے نظیر اوصاف کا حامل تھا وہ
در حقیقت ایک صاحبِ دل تھا وہ
تھا نگاہِ خوش دلاں میں معتبر
اس کا فن اس کا قلم اس کا ہنر

گلشنِ طنز و ظرافت کو دیئے
اس نے کیا کیا خوشنما گلہائے تر
اس کے اک اک حرف میں اعجاز تھا
اس پہ علم و آگہی کو ناز تھا

وہ تھا پختہ پیکرِ عزم و یقیں
شخصیت اس کی تھی بے حد دلنشیں
وہ رہا گفتار اور کردار میں
حیدرآبادی ثقافت کا امیں

ہر ادا میں اس کی تھا رنگِ فسوں
اس سے زندہ تھیں روایاتِ جنوں
بزم آرائی پہ تھا اس کو عبور
اس کا ڈنکا بج رہا تھا دور دور

خادمِ اردو ہزاروں آئیں گے
اب نہ آئے گا مگر عبدالغفور
دردِ اردو اس کے دل میں تھا سدا
وہ شکار آخر اسی کا ہو گیا

وہ اکادمی کی جان اور آن تھا
اس کو اپنے فرض کا عرفان تھا
اک زمانہ اس کا شاہد ہے کہ وہ
خوش خصال و نیک دل انسان تھا

مغفرت فرما تو اس کی اے خدا!
اس کے حق میں ہے یہ منشا کی دعا

پرنس سعادت جاہ بہادر

"چشمۂ آفتاب"

(زیرِ ترتیب مجموعۂ رباعیات سے ایک ورق)

چہرے کو کتابِ دل و جاں کہتے ہیں
نظروں کو تمنا کی زباں کہتے ہیں
اس نفس کو ہم سمجھتے ہیں حشرِ نفس
ہر سانس کو ایک ہفتخواں کہتے ہیں

ایک ہمہمہ آرائشِ صد بزم سے ہے
اور رزم تو جوشش و جذبۂ رزم سے ہے
انسان عبارت ہے تو بس عزم سے ہے
اور عزم بھی وہ کہ عزم بالجزم سے ہے

اے سوزِ نہاں تیری قسم کھاتا ہوں
اے برقِ تپاں تیری قسم کھاتا ہوں
معصوم بہت ہے ناتوانی میری
اے تاب و تواں تیری قسم کھاتا ہوں

وہ عشق کے مرحلے عیاذاً باللہ
پیچیدہ معاملے عیاذاً باللہ
ہر ساعت و ہر لحظہ و ہر دم شب و روز
طے ناشدہ فیصلے عیاذاً باللہ

ثابت ہے زباں ہے ملکوتی میری
ظاہر ہے کہ ہے شاعری ثبوتی میری
نازک سی رگِ گل ہے رباعی اپنی
بندش ہے انوکھی، طرز اچھوتی میری

—•—

شیدا سیمابی

اردو کا کارواں

تقریر کر رہے تھے اک اردو کے جاں نثار
مستقبل اس کا خوف و خطر سے نہیں دوچار
افسوس ان کی فہم و فراست پہ ہے ہمیں
نزدیک سے وہ دیکھتے اردو کا حالِ زار
وہ ہو رہی ہے اپنے وطن میں ہی اجنبی
ہر سمت سے ہے زور کہ وہ ہو ذلیل و خوار
اپنے ہیں بدگماں تو پرائے ہیں [illegible]
در پے اسے مٹانے پہ دشمن جفا شعار
اردو کے مدرسے میں ذرا چل کے دیکھیے
کتنے ہیں لکھنے پڑھنے میں ہشیار فی ہزار
استاد کتنے ہیں جو پڑھاتے ہیں درد سے
ماں باپ ہیں پڑے ہوئے غفلت میں [illegible]
بچوں کو اپنے نام کے ہجے نہیں آتے
اردو "دہم" میں پڑھ تو رہے ہیں وہ نابکار
گھر، مدرسہ، سماج کا ہے فرض اوّلیں
اپنے، پرائے بچوں کو دیکھیں وہ بار بار
مضبوط کر دیں سب ہی کو اپنے نصاب میں
ایسا کہ امتحاں کا نتیجہ ہو شاندار
پرہیز کر لیں نقل سے وہ امتحان میں
آگے بڑھائیں عزم سے اردو کا کاروبار
منزل سے دور جاتا ہے اردو کا کارواں
لوگو! اٹھو! نہ دیر کرو اور نہ انتظار

—•—

غزلیں

صلاح الدین نیر

پہلے کی طرح شام و سحر کون آئے گا
مجھ جیسے بد نصیب کے گھر کون آئے گا

دیوانگی ہے سرحدِ ادراک سے پرے
اب آگہی کے زیرِ اثر کون آئے گا

ٹوٹے ہوئے بدن کی طرح نذر کیلئے
ہاتھوں میں لے کے دیدۂ تر کون آئے گا

اس سوچ میں جو عمر تھی باقی وہ کٹ گئی
بن کے یہاں نگارِ سحر کون آئے گا

رو رو کے رات کٹ تو گئی پھر بھی صبحدم
بیمارِ غم کی لینے خبر کون آئے گا

سب تازہ گل فضاؤں میں تحلیل ہو گئے
اب ہر روش پہ ہم کو نظر کون آئے گا

ٹوٹیں گی جب بھی اپنے قبیلے کی بندشیں
بن کر مرا رفیقِ سفر کون آئے گا

مدت کے بعد جب مجھے تنہائی مل گئی
نیر بجز تمہارے نظر کون آئے گا

— ✦ —

غفار شاکر

آؤ کہ ذرا سمجھیں کیا اس کا تقاضا ہے
یہ وقت جو بدلا ہے یہ دور جو آیا ہے

دیکھا ہے ان آنکھوں نے منزل پہ وہ پہنچا ہے
اٹھ اٹھ کے جو پھسلا ہے گر گر کے جو سنبھلا ہے

مشرق سے وہ ابھرے گا شک اس میں نہیں کوئی
کچھ دیر ہوئی سورج مغرب میں جو ڈوبا ہے

حالات کی گرد ان کو کر دیتی ہے میلا بھی
چادر وہ جو اجلی ہے دامن وہ جو ستھرا ہے

سمٹے گا وہی دامن بوجھ اس پہ ہی پڑنے دو
جو بڑھتے تقاضوں سے چادر سے بھی پھیلا ہے

اک تم ہی نہیں شاکر جو چھوڑ نہ سکے گھر در
کتنے ہیں یہاں جن کو حالات نے ٹھکرایا ہے

محبوب راہی

غزل

وہ خود سے کس طرح مجھتا اور اسے سمجھاتا کون
جان بوجھ کر اپنا دامن کانٹوں میں الجھاتا کون

سب کے لبوں پر لگے ہوئے تھے جب پہرے خاموشی کے
کون مری ایسے میں سنتا، اپنی مجھے سناتا کون

جس کو دیکھا لپٹا پایا اپنے دکھوں کی چادر میں
میں کس کے دامن سے لپٹتا مجھ کو گلے لگاتا کون

اک پہچان لگا رکھی تھی سب نے اپنے چہروں پر
بے چہرہ بے نام و نشاں میں پھر مجھ کو اپناتا کون

سب کے اپنے اپنے دکھڑے اپنا اپنا رونا تھا
میرے دکھ کو کون سمجھتا اور مجھے سمجھاتا کون

دھوپ کی چاندی پاس تھی میرے اور نہ عظمت کا سونا
کون مرے گھر چل کر آتا مجھ کو پاس بلاتا کون

کاغذ کے رنگین پھولوں کے اہل نظر شیدائی تھے
گلشن میں اخلاص و وفا کے نازک گل کھلاتا کون

کیسی قسمیں کیسے وعدے تو تھا کس خوش فہمی میں
منہ دیکھے کی ان باتوں کو میرے یار نبھاتا کون

اپنا لہو اپنا ہوتا ہے اپنے ہی کام آتا ہے
خون کے ان پیاسوں کو جا کر یہ سب کچھ سمجھاتا کون

بوڑھا سورج سسک رہا تھا کہروں کے انبار تلے
اس کی مدد کو کون پہنچتا اپنے ہاتھ جلاتا کون

خشک ہیں کیوں یہ سارے سمندر کیوں صحرا میں جل تھل
اک چلو پانی کی خاطر یہ گتھی سلجھاتا کون

بھٹکے ہوئے تھے سارے رہبر اپنی اپنی منزل سے
اک انجانے راہی کو سیدھا رستہ دکھلاتا کون

قدم قدم پر کرب و الم کے کانٹے بکھرے تھے راہی
سچائی کی راہگزر پر ساتھ مرے پھر آتا کون

چراغ غزل

نیک انسان ہدایت کے جلاتے ہیں چراغ
اور بدنفس ہدایت کے بجھاتے ہیں چراغ

دل بوجہل ہے ایماں کے نہ ہونے سے سیاہ
وہ ہیں ناکام جو ابلیسوں کو دکھاتے ہیں چراغ

تم کسی سے بھی ملو خندہ جبینی سے ملو
لوگ کہتے ہیں کہ روتوں کو ہنساتے ہیں چراغ

بدامن باد صبا میں ہے وہ جاں بخش ہوا
باغ میں بجھتے نہیں جو نظر آتے ہیں چراغ

باغ سرسبز و شاداب ہے گذری جو نسیم
نام روشن ہے جو احساں کے جلاتے ہیں چراغ

قد میں چھوٹے ہیں تو کیا ان سے نہیں ڈرتے عصاۃ
رات کی تاریکی میں راہ دکھاتے ہیں چراغ

خانہ دل مرا روشن ہے انھی داغوں سے
داغہائے دل سوزاں نظر آتے ہیں چراغ

میں تو بالا بالا کی سمجھتا ہوں کہ دل سوختہ ہوں
داستاں سوز محبت کی سناتے ہیں چراغ

دل ناکام میں امید کو دیتے ہیں جگہ
کتنے نادان ہیں صحرا میں جلاتے ہیں چراغ

قتل کرتے ہیں فسادات میں معصوموں کو
خاندانوں کے یہ سفاک بجھاتے ہیں چراغ

رات آتی ہے تو کہتا ہوں قیامت آئی
اسی پہ سمجھ کر یہ مرے جی کو جلاتے ہیں چراغ

ان کا دولت کدہ بن جائے نہ کیوں بقعۂ نور
آئینہ خانے میں جب ایک جلاتے ہیں چراغ

حیلہ یوں ہی سہی وہ خوش تو ہوئے آخرکار
حال بدمستی کے مرا گھر کے جلاتے ہیں چراغ

ایسا بے چین کیا طبع رواں نے ہم کو
آج ہم لکھ کے غزل دن میں جلاتے ہیں چراغ

کیوں نہ قرباں ہوں فروغ رخ زیبا پہ رشید
جب بھی آتے ہیں مرے گھر میں جلاتے ہیں چراغ

رشید انصاری

غزل

خورشید جنیدی

امید زندگی میں زندگی مشکل سے گذری ہے
خوشی سمجھا جسے ایسی خوشی مشکل سے گذری ہے

ملی جب سے نظر کو روشنی مشکل سے گذری ہے
فراغت کی فضا میں زندگی مشکل سے گذری ہے

رگ جاں سے نظر کا فاصلہ یوں بھی کتنا تھا
مگر اے دوست یہ منزل بڑی مشکل سے گذری ہے

یہاں تک آگیا ہے تلخیٔ حالات کا ماتم
لبوں پر ایک ہلکی سی ہنسی مشکل سے گذری ہے

میں جس غم کی بلندی پر پہنچ کر مسکراتا ہوں
وہاں تک خود نگاہ اجنبی مشکل سے گذری ہے

شکست آرزو تک تھا بھرم خود اعتمادی کا
مگر یہ فرصت بے ساختگی مشکل سے گذری ہے

زمانہ کو برا کیسے کہوں تم خود زمانہ ہو
یہ مانا ہر زمانہ میں بڑی مشکل سے گذری ہے

تسلط ہے جہاں ملبوس ظاہر کی پرستش کا
وہاں خورشید فن کی روشنی مشکل سے گذری ہے

غزل

قطب سرشار

ریت کا گھر ہوں سمندر کی نمی رکھتا ہوں
موج در موج میں امید نئی رکھتا ہوں

جھوم جاؤں تو ہوا دل کو طراوت بخشے
درد کا پیڑ ہوں میں چھاؤں گھنی رکھتا ہوں

چاہتا ہوں میں تجھے بس یہی کافی ہے مجھے
قیس کا دل نہ دم کوہ کنی رکھتا ہوں

دل کے ہمراہ مرے کوئی حسیں رہتا ہے
میں فقیر آدمی صحبت تو غنی رکھتا ہوں

مجھ کو کھوجو نہ کریدو نہ ہی اندر جھانکو
جو ہے باہر مرے اندر بھی وہی رکھتا ہوں

مجھ کو سرشار نے تہذیب کا مخلص جانا
بات یہ ہے کہ عداوت کی کمی رکھتا ہوں

آندھرا پردیش میں مزدوروں کی فلاح و بہبود

ریاستی حکومت چیف منسٹر این ٹی راما راؤ کی رہنمائی میں مزدوروں سے متعلق کئی ایک فلاحی پروگرام زائد از ایک سال کے عرصہ میں کامیابی کے ساتھ روبعمل لاچکی ہے ــــ آندھرا پردیش آج پر امن صنعتی فضا سے ہمکنار ہے جو صحت مند اقتصادی فروغ اور پیداوار کے لئے سازگار ہے

ـــ ✦ ـــ

- ۱۶ مختلف علاقوں میں اقل ترین اجرتوں سے متعلق قانون کے تحت آنے والے غیر منظم مزدوروں کی اجرتوں کی سطح میں ۱۸۰ روپیے سے ۳۰۰ روپیے فی ماہ اضافہ کردیا گیا ہے۔
- جوٹ کی صنعت میں صنعتی مزدوروں کے لئے ۱۵۰ روپیے کا اضافہ کیا گیا ہے اور اڈہاک بنیاد پر جوٹ انڈسٹری ورکرس کی اجرت میں ½ ۱ فیصد الاونس کرایہ مکان بھی دیا جارہا ہے۔
- رعایتی انڈسٹریل اسکیم کے تحت تعمیر کردہ ۵۱۴۷ مکانات آسان اقساط پر مکینوں کے حوالے کئے گئے ہیں۔
- زرعی مزدوروں کی تعلیم و رہنمائی اعدادی معیار زندگی کو بہتر بنانے کے لئے ۴۰ بلاک علاقوں میں رورل آرگنائزرس کا تقرر عمل میں لایا جارہا ہے۔
- کوئی ۸۵ لاکھ زرعی مزدوروں کے لئے ویلفیر فنڈ، میٹرنٹی اور اولڈ ایج بینیفٹس کو یقینی بنانے کے لئے زرعی مزدوروں سے متعلق مسودہ قانون زیر غور ہے۔
- اقل ترین اجرتوں سے متعلق قانون کے تحت برسرکار مزید ۳۰،۰۰۰ غیر منظم مزدوروں پر مشتمل ایک زبردست جمعیت لائی گئی ہے۔
- دکانات و اداروں جات سے متعلق قانون کے تحت حاصل ہونے والے فوائد کو ۹۱ نئے

شعبوں کے ملازمین تک وسعت دی گئی ہے جس سے اس قانون سے کوئی ۱۵ ملازمین مستفید ہو رہے ہیں۔

۵ ۶۸۵ صنعتی تنازعات کی ریاستی مصالحتی مشنری کے توسط سے یکسوئی کی جاچکی ہے اور ۳۶۳ تنازعات تصفیہ کے لئے صنعتی عدالتوں سے رجوع کئے گئے ہیں۔

"حکومت مزدوروں کی فلاح و بہبود کے مقصد کی تکمیل کیلئے خود کو پابند بنا چکی ہے

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش

DIPR's Lr No 12046 / Advt II / C4/84. D/_ 3-5-84

قطعہ
اقبال

دم عارف نسیم صبحدم ہے
اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

Regd. No. H/HD 593.

Monthly **SHADAAB** Hyd

11-5-147, RED HILLS, HYD-500 004.

Vol. I No. 7 JUNE. 1984.

میرے افکار کے گلشن میں جو چھایا ...

دور تک منظرِ شاداب دکھائی ... کا

ماہ نامہ

شگوفہ

حیدرآباد

... پانچ روپے

علمی، ادبی، دینی و سماجی اقدار کا نمائندہ

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد (۱) جولائی ۱۹۸۴ء شمارہ (۸)

مجلس مشاورت

ایڈیٹر

محمد قمر الدین صابری

قیمت فی پرچہ ۵ روپے

	ہندستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
زرِ سالانہ	50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
دو سالہ	90	270	65	36	225
معاونین تاحیات	1000	2500	450	300	2000

خط و کتابت کا پتہ: 11-5-147 ریڈ ہلز حیدرآباد (500004) اے پی

ایڈیٹر و پبلشر [illegible] نے [illegible] پریس میں چھپوا کر [illegible] سے شائع کیا

فہرست

حرف اول

علم کی نشر و اشاعت میں کتاب کی اہمیت ظاہر ہے ۔ اور کتاب اسی وقت طبع اور شائع کی جاتی ہے جب اس کے خریدے جانے کی توقع ہو ، کتاب وہی خریدی جاتی ہے جس کی اہمیت اور افادیت کا خریدنے اور پڑھنے والے کو احساس ہو ، نیز پڑھنے والے کی قوت خرید پر بھی بڑی حد تک اس کا انحصار ہوتا ہے ۔ اردو قاری مختلف وجوہ کی بنا پر کتاب و رسالہ خرید کر پڑھنے سے پیچھے ہٹتا ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی قوت خرید بھی زمانہ کافی متاثر ہے مگر اس کے باوجود ایسے قدم اٹھائے جا سکتے ہیں کہ اردو قاری کتاب اور رسالہ خرید کر پڑھے ۔ مراٹھی ادیبوں اور ناشروں نے اس سمت میں ایک انقلاب انگیز قدم اٹھا کر ثابت کر دیا ہے کہ پڑھنے والے کتابیں خریدنے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ کتابوں کو ان تک پہنچایا جائے ۔ چنانچہ مراٹھی والوں نے "گرنتھالی" جیسا فعال ادارہ قائم کیا ، جس نے ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت کتابوں کو گاؤں گاؤں پہنچا دیا ۔ گرنتھالی نے مہاراشٹرا کے ۳۵ مقامات کو منتخب کر کے "گرنتھ یاترا" کا پروگرام بنایا مراٹھی کے ادیب ، شاعر ، ناشر اور ادب دوستوں نے مل کر چار پانچ مہینوں تک ان مقامات کا دورہ کیا ، کتابوں کی نمائش لگائی ، سمینار منعقد کئے ، جلسے کئے ، جلوس نکالے اور کتابوں کو فروخت کیا ۔ شہروں سے زیادہ چھوٹے دیہاتوں قصبوں میں کتابوں کی فروخت کا تناسب زیادہ رہا ۔ کل ۸۵ ناشروں نے اس "گرنتھ یاترا" میں حصہ لیا ، نمائش میں (32,700) کتابیں رکھی گئیں ۔ ان میں سے 21,150 کتابیں فروخت ہوئیں اور ۲۵ تا ۳۰ فیصد کمیشن دئے جانے کے بعد ان کتابوں کی فروخت سے کل چار لاکھ اکتیس ہزار روپے وصول ہوئے ۔ گرنتھالی کے سکریٹری کا کہنا ہے کہ دیہاتی علاقے کے پڑھے لکھے نوجوان طبقہ میں کتابیں خریدنے کا شوق ہے ۔ ان کے پاس پیسہ بھی ہے شرط یہ ہے کہ کتابیں ان تک پہنچائی جائیں ۔ اگر مناسب تشہیر و وسائل سے منصوبہ بند طریقہ پر کام کیا جائے تو کسی کتاب کی اشاعت پچاس ہزار سے ایک لاکھ تک بآسانی ہو سکتی ہے ۔ اس تجربہ کی تفصیلات انیس چشتی نے دلچسپ پیرایہ میں بیان کی ہیں ۔ اس کی اشاعت سلسلہ اس شمارہ سے شروع کیا گیا ہے ۔ مراٹھی والوں نے راستہ بتایا ہے ۔ اردو والے اس راستہ کو اپنا کر اپنی زبان کو مستحکم بنیادوں پر قائم کر کے آگے بڑھا سکتے ہیں ۔

موجودہ دور سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے ۔ شاداب کی اشاعت کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ جدید سائنس اور ٹکنالوجی کو اردو داں طبقہ تک پہنچایا جائے اسی لئے شاداب اس

اقدام کا نہایت مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہے جو سائنسی موضوعات پر اردو میں لکھنے والوں نے اٹھایا ہے۔ ان اردو داں سائنسدانوں نے ایک انجمن قائم کی ہے جو یہ اہتمام کرے گی کہ سائنس اور ٹکنالوجی پر اردو میں زیادہ سے زیادہ لکھا جائے اور اس کی نشر و اشاعت کا انتظام بھی کیا جائے۔ "شاداب" اس اقدام کا دوبارہ خیر مقدم کرتا ہے اور اپنے تعاون کی پیشکش کرتا ہے۔

مدیر

محمد کلیم الدین احسن

کلمہ طیبہ

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

کلمہ طیبہ کے لفظی معنی تو "پاکیزہ بات" کے ہیں۔ مگر اس سے مراد وہ قول حق اور عقیدہ صالحہ ہے جو سراسر حقیقت اور راستی پر مبنی ہو۔ یہ قول اور عقیدہ قرآن مجید کی رو سے لازماً وہی ہو سکتا ہے جس میں توحید کا اقرار، انبیاء اور کتب آسمانی کا اقرار اور آخرت کا اقرار ہو۔ کیونکہ قرآن انہی امور کو بنیادی صداقتوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔

قرآن شریف میں کلمہ طیبہ یعنی کلمہ توحید ایمان کی تفہیم سورۂ ابراہیم کی آیات ۲۴ تا ۲۷ میں کی گئی ہے جن کا مطلب ذیل میں دیا جاتا ہے :۔

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے! — اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے۔ یہ مثالیں اللہ اس لئے دیتا ہے کہ لوگ ان سے سبق لیں — اور کلمہ خبیثہ کی مثال ایک بد ذات درخت کی سی ہے جو زمین کی سطح سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے۔ اس کے لئے کوئی استحکام نہیں ہے۔ ایمان لانے والوں کو اللہ ایک قول ثابت کی بنیاد پر دنیا اور آخرت دونوں میں ثبات عطا کرتا ہے اور ظالموں کو اللہ بھٹکا دیتا ہے — اللہ کو اختیار ہے جو چاہے کرے۔"

آیات بالا میں کلمہ طیبہ کو ایک اچھی ذات کے درخت سے مثال دی گئی ہے۔ اکثر مفسرین نے اس درخت کو کھجور کا درخت بتایا ہے اس کی تائید تجربہ اور مشاہدہ سے بھی ہوتی ہے۔ کھجور کا تنا بلند اور مضبوط ہوتا ہے۔ اس کی جڑیں زمین میں دور تک پہنچی ہوتی ہیں۔

ہے ـــ اس کا پھل بھی ہر وقت اور ہر حال میں کھایا جاتا ہے۔ سخت پیدا ہونے سے پہلے تک ـــ
مختلف طریقوں سے، چٹنی آچار کے طور پر اور طریقوں سے ـــ پھر پک جانے کے بعد اس کا خشکو
بھی پورے سال باقی رہتا ہے۔ صبح شام، دن رات، گرمی سردی غرض ہر موسم اور ہر وقت کام
دیتا ہے۔ اس درخت کا گودا بھی کھایا جاتا ہے اس سے رس نکالا جاتا ہے۔ اس کے پتوں
سے بہت سی مفید چیزیں بنتی ہیں، گٹھلی جانوروں کا چارہ ہے۔ غرض مومن کی مثال اس
درخت سے دینے کی ایک وجہ یہ ہے کہ کلمہ طیبہ میں ایمان ہے جس کی جڑ بہت مستحکم اور مضبوط
ہے، دنیا کے حوادث اس کو ہلا نہیں سکتے۔ کھجور کے درخت کی شاخیں بلند آسمان کی طرف ہوتی ہیں
مومن کے ایمان کے اثرات یعنی اعمال بھی آسمان کی طرف اٹھائے جاتے ہیں۔ مومن جو اللہ تعالیٰ کا ذکر
تسبیح و تہلیل و قرأت قرآن وغیرہ کرتا ہے، یہ صبح و شام اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچتے رہتے ہیں۔
جس طرح کھجور کا پھل ہر وقت ہر آن کھایا جاسکتا ہے مومن کے اعمال صالحہ بھی ہر وقت ہر موسم
اور ہر حال میں صبح و شام جاری ہیں۔ اور جس طرح کھجور کے درخت کی ہر چیز کار آمد ہے۔ مومن
کا ہر قول و فعل اور حرکت و سکون اور اس سے پیدا ہونے والے آثار پوری دنیا کے لئے مفید
ہوتے ہیں ـــ کلمہ طیبہ کے مقابلے میں کلمات کفر کو بد ذات درخت سے مثال دی گئی ہے بعض حضرات نے
اس کو حنظل" قرار دیا ہے جس کی جڑیں زمین کے اندر زیادہ نہیں ہوتیں اور اس درخت کے پورے
جثہ کو زمین سے اکھاڑ پھینکا جاسکتا ہے۔ کافر کے اعمال کو اس درخت سے تشبیہ دینے کا یہ
مطلب ہے کہ اس کے عقائد کی کوئی جڑ بنیاد نہیں ہے ذرا دیر میں متزلزل ہو جاتے ہیں۔ دنیا کی
گندگی سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور ان کے درخت کے پھل پھول یعنی اعمال و افعال عند اللہ کار آمد نہیں ہیں
مومن کے ایمان اور کلمہ طیبہ کا ایک خاص اثر یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ یہ کلمہ طیبہ مضبوط و مستحکم
درخت کی طرح ایک قول ثابت ہے جس کو اللہ تعالیٰ ہمیشہ قائم و برقرار رکھتے ہیں۔ دنیا میں بھی اور
آخرت میں بھی۔ یعنی دنیا میں ان کو اس کلمہ کی وجہ سے ایک پائیدار نقطۂ نظر، ایک مستحکم نظام فکر اور
ایک جامع نظریہ ملتا ہے جو ہر عقدہ کو حل کرنے اور ہر گتھی کو سلجھانے کے لئے شاہ کلید کا حکم رکھتا ہے
سیرت کی مضبوطی اور اخلاق کی استواری نصیب ہوتی ہے۔ جسے زمانے کی گردشیں متزلزل نہیں
کر سکتیں۔ زندگی کے ایسے ٹھوس اصول ملتے ہیں جو ایک طرف ان کے قلب کو سکون اور دماغ کو اطمینان
بخشتے ہیں۔ اور دوسری طرف انہیں سعی و عمل کی راہوں میں بھٹکنے اور ٹھوکریں کھانے سے بچاتے ہیں۔
پھر جب وہ موت کی سرحد پار کر کے عالم آخرت کی حدود میں قدم رکھتے ہیں تو وہاں کسی قسم کی حیرانی و پریشانی

ان کا [illegible] نہیں ہوتی۔ وہ اس مضبوط درخت کی طرح مضبوط ہو جاتے ہیں یا اس کی [illegible]
تے ہیں۔ ان کی ہر منزل پر ہمیشہ ثابت قدمی کے ساتھ گزرتے ہیں۔ لیکن جو ظالم ہو کر خبیث
کو چھوڑ کر کسی کلمہ خبیثہ کی پیروی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ذہن کو پراگندہ اور ان کی مساعی کو برباد
کر دیتا ہے۔ وہ کسی بھی مقصد میں فکر و عمل کی یکسوئی حاصل نہیں کر سکتے اور ان کا کوئی تیر بھی نشانے پر
نہیں بیٹھتا۔ آخر میں یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ کوئی طاقت نہیں جو اس کے
ارادے اور مشیت کو روک سکے۔

مندرجہ بالا آیات میں توحید اور کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ کی عظمت و فضیلت اور اس کی برکات و ثمرات اور اس سے انکار کی نحوست اور انجام بد کا بیان کیا گیا ہے۔ توحید ایسی لازوال دولت ہے جس کی برکت سے دنیا میں تائید ایزدی ساتھ ہوتی ہے اور آخرت میں بھی اللہ کی نصرت شامل حال ہوتی ہے۔ اور اگر اس سے انکار کیا جائے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے بجائے عذاب الٰہی سے سامنا ہوتا ہے۔

اللہ اس معبود حقیقی کو کہتے ہیں جس کی طرف انسان بہ ایں اعتقاد رجوع کرے کہ غیب کی سلطنت صرف اسی کے ہاتھ میں ہے، وہی آسمان و زمین کا مدبر ہے اور اسی کے ہاتھ میں نفع و نقصان ہے۔ یہی وہ ذات ہے جس کی عبادت کی جائے، جس کے سامنے جھکا جائے، جس سے ہدایت و رہنمائی مانگی جائے اور جس کے آگے سر اطاعت خم کیا جائے۔ انسان کا ذہن مجبور ہے اس ہستی کو ڈھونڈے، اس کو جانے اور پانے میں اپنی عقل و فکر کی تمام قوتیں صرف کر دے۔ اور پھر اس کو پا کر اپنی ساری زندگی اس کے حوالے کر دے۔

مسلمانوں میں لاکھ اختلاف ہوں لیکن لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ میں کوئی چون و چرا نہیں کرتا۔ کلمہ کے علم کی جان توحید و رسالت ہے۔ توحید جس میں عقیدہ نہ ہو وہ شرک ہے اور رسالت نہ ہو تو کفر۔ کلمہ طیبہ کے اقرار و تصدیق سے انسان مسلمان بن جاتا ہے۔ کلمہ کے ورد سے بے حد فیوض و برکات آتے ہیں۔ کلمہ کے معنی معلوم نہ ہوں تو بھی کلمہ اثر رکھتا ہے البتہ مداومت کا فرق ہے اب آپ کو اختیار ہے کہ کلمہ کے ورد کے وقت اس کے معانی و مطالب پر بھی غور کریں اور بارگاہ باری تعالیٰ سے اعلیٰ مدارج حاصل کریں۔

سفرنامہ حرمین — مکہ

۲۹ مارچ ۱۹۳۳ء / ۲ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ ۔ آج سورج نکلنے کے ایک گھنٹہ بعد موٹر میں حاجی عبداﷲ کے مکان پر گئی۔ یہ شہر کے آخری حصہ میں سلطان کے محل کے پاس ہے۔ اگرچہ یہ گھر سوکھی پہاڑیوں کے بیچ میں ہے مگر یہاں پانی بہت ہے اور فی الحقیقت یہ ایک پر فضا باغ ہے۔ اب میں سمجھ گئی کہ وہ اپنے اطراف کتنا ایک سبزا خوبصورت کئے ہوئے اور گوناگوں دلچسپیوں کے باوجود جدہ سے روز دوڑ کر مکہ کیوں جاتے ہیں۔ اس دلفریب چھوٹے سے مکان میں انہوں نے پھلواری خود اپنے ہاتھوں سے لگائی ہے۔ جب وہ جدہ آتے ہیں تو ہمیشہ ان کی موٹر پھولوں سے لدی رہتی ہے۔ جدہ میں باغ نہیں ہیں اس لئے وہاں والے پھولوں کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ مکہ اور جدہ جیسی جگہ رہ کر ہی آدمی سمجھ سکتا ہے کہ خشک و بے آب وگیاہ مقام کسے کہتے ہیں۔ جہاں کوئی ایسا درخت نہیں جس کو درخت کہہ سکتے ہوں اور جس کا سایہ بھی پڑتا ہو۔ مسز خلیل کے اس باغ کی دیکھ بھال دو چھوکریاں کرتی ہیں۔ ان میں کی ایک سلطان نے ان کو دی ہے۔ سلطان کے پاس سیکڑوں لونڈی غلام ہیں۔ شادی، ولادت اور دوسری تقاریب میں سلطان احکام قرآنی کے بموجب جن میں بردے آزاد کرنے کے ثواب کا ذکر ہے بعض کو آزاد کر دیتے ہیں لیکن غلام اپنے آرام دہ مسکن کو چھوڑ کر دوسری نئی جگہ جانے سے عموماً انکار کر دیتے ہیں۔

مکہ کے ایک بازار میں جو سوق العبید کہلاتا ہے غلاموں کی باقاعدہ خرید و فروخت ہوتی ہے۔ اس بازار میں مکانوں کے سامنے لمبے لمبے سنگین چبوترے بنے ہیں ان پر خریداروں کے انتظار میں غلام بیٹھے ہیں۔ لونڈی غلام زیادہ تر افریقہ کے رہنے والے ہوتے ہیں اور ہر عمر کے ہوتے ہیں۔ لونڈیاں برقعہ اوڑھے رہتی ہیں۔ خریدار دیکھنا چاہے تو برقعہ اٹھا بھی دیتی ہیں۔ مکہ میں ایسا کوئی گھر مشکل سے ملے گا جس میں لونڈی غلام نہ ہوں۔ جس مکان میں ٹھہری ہوئی ہوں اس میں بھی لونڈیاں کامل طور پر خوش ہیں۔ ان کے ساتھ گھر والوں کی طرح برتاؤ کیا جاتا ہے۔ ایک کالی بڑھی ان سب کی چودھری اور سب پر حکومت کرتی ہے۔

عرب میں اشاعت دین اور فتوحات سے غلامی کا طریقہ ایجاد کر دیا تھا۔ غلامی کی غرض جانے دو
تو یہ ہوا کہ یہ مسئلہ کہ قرآن میں ممانعت ہے اور رہا یہ اس بات کی تاکید ہے کہ جب تک ممکن ہو غلاموں کو آزاد کیا جائے۔ چونکہ لونڈی غلاموں کو آزاد کرنا ثواب کا کام ہے اس لئے ہر مسلمان مرد و عورت جس کے پاس لونڈی غلام ہوں مرتے وقت یہ وصیت کر دیتا ہے کہ اتنے غلام آزاد کر دئے جائیں۔ اور اس قدر روپیہ جو ان کے خرچ کے لئے کافی ہو ان کو دے دیا جائے۔

نئی حکومت اپنے دائرہ اختیار میں انسداد بردہ فروشی کی کوشش کر رہی ہے۔ سلطان ابن سعود نے غلاموں کی درآمد و فروخت کی ممانعت کر دی ہے۔ اس سے کچھ عرصہ میں غلاموں کی تجارت عرب میں خود بخود بند ہو جائے گی۔

غلامی کی اصلیت کے متعلق میں امیر علی سے بہتر صراحت نہیں کر سکتی اس لئے ان کی کتاب "اسپرٹ آف اسلام" کی عبارت نقل کرتی ہوں:-

"اسلام رنگ و قوم کے فرق کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کی نظر میں سب برابر ہیں نہ محض کہنے کے لئے بلکہ عملاً بھی — مسجد میں، محل میں، بازار میں، مہمان خانے میں یا کسی حالت اور بغیر کسی امتیاز کے وہ سب مل جاتے ہیں۔ اسلام کا پہلا موذن ایک حبشی غلام تھا۔ دہلی کا پہلا بادشاہ اور ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا بانی ایک غلام تھا۔ غلاموں نے ملکوں پر حکومت کی ہے اور شاہی خاندان قائم کئے ہیں۔ اسلام میں جو آج غلام ہے کل وہ وزیر اعظم ہے۔

قرآن نے غلاموں کی آزادی کے بارے میں تائید کی ہے اور پیغمبر صلعم نے رسم غلامی کو ایک عارضی رسم تصور کر کے یہ تسلیم کیا کہ خیالات میں ترقی اور حالات میں تبدیلی ہو کر اس رسم کا نیست و نابود ہو جانا یقینی ہے۔ آنحضرت صلعم نے غلاموں کو یہ بھی اجازت دے دی کہ وہ خدمت یا مزدوری کر کے اپنی قیمت ادا کریں اور آزاد ہو جائیں۔ اور اگر سردست کوئی غلام محنت مزدوری نہ کر سکتا ہو تو اس کی قیمت بیت المال سے پیشگی ادا کر دی جائے۔ اس کے بعد بھی یہ کہنا کہ غلاموں کا جو تصور انگریزوں میں ہے اس کے مطابق کوئی چیز اسلامی قانون میں بھی ہے بالکل لغو اور بے معنی ہوگا۔"

یکم اپریل سنہ ۔ جب سے میں مکہ آئی ہوں یہ پہلا موقع ہے کہ آج مجھے چند گھنٹوں کی فرصت ملی ہے

سبھی مردانہ ضبط کی ایجاد کر رہے ہیں اس لئے کسی ... ہے ۔ ا
حقیقت ہے کہ "حرم" میں شائستگی اور عرب میں عورتوں کی معاشرت کے بارے میں جس کی طرف
یورپ میں سخت غلط فہمیاں ہیں چند سطریں لکھ دوں ۔

لفظ "حرم" مشتق ہے "محرم" سے جس کے معنی محترم یا حرام کے ہیں اور اصطلا
اس حصہ مکان پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جو عورتوں کے رہنے سہنے کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ نا
محترم جگہ تو ضرور ہوتی ہے مگر جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے قید خانہ سے اس کو کیا نسبت ؟ ۔
عام خیال کے مطابق یہاں نہ بیویوں کا گلہ رہتا ہے نہ بدچلن عورتوں کے غول ۔

پردے کو اسلامی ایجاد سمجھنا بھی غلطی ہے ۔ یونانی اپنی انتہائی شائستگی کے زمانہ
عورتوں کو گھروں میں قید رکھا کرتے تھے ۔ ان کے کسی قسم کے حقوق نہ تھے ، یہاں تک کہ حق ورا
بھی عورتوں کو حاصل نہ تھا ۔

یونان کے علاقہ اسپارٹا کے رہنے والے اکثر اپنی ایسی عورتوں کو ہلاک کر دیا کرتے تھے
کہ تندرست بچے پیدا ہونے کی امید نہیں ہوتی تھی ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ مردوں کے مقابلہ میں عو
کی تعداد اس قدر گھٹ گئی تھی کہ ایک ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہونے لگے تھے ۔

روم میں عورتوں کے رہنے کے حصے علٰحدہ ہوتے تھے ۔ مردوں کو ان کی موت وحیا
کا کامل اختیار تھا اور وہ ان کے ساتھ غلاموں کا سا برتاؤ کیا کرتے تھے ۔

ایران میں شادی کا کوئی مسلمہ قانون نہ تھا ۔ اگر کوئی تھا بھی تو اس پر عمل نہیں
آنحضرت صلعم کی بعثت سے پہلے عرب میں عورتوں کی حالت انتہا درجہ کی گری ہوئی تھی ، عور
خاندانی جائیداد منقولہ یعنی مال و اسباب کا جزو لاینفک سمجھی جاتی تھیں اور شوہر کے مرنے
اس کے بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دی جاتی تھیں ۔

اسلام نے عورتوں کے درجے کو بہت بلند کر دیا ۔ اسلام نے انہیں ایسے حقو
جو اس سے قبل ان کو کبھی نصیب نہ ہوئے تھے ۔ اسلام نے ان کی وہ وقعت قائم کی جو انہیں انگا
و دیگر یورپی ممالک میں سینکڑوں برس بعد تک نصیب نہ ہو سکی ۔ میں اس حقیقت کو آشکا
کرتی ہوں کہ اسلام میں عورتوں کو حق حاصل ہے کہ کسی جائیداد پر وہ بلا شرکت غیرے خاص
مالکانہ حقوق حاصل کر لیں اور جس طرح چاہیں اسے رکھیں یا منتقل کر دیں ۔ بیوہ کو شوہر کی جا
جائیداد میں ... حاصل ہے کہ وہ اپنے بچے کو سات برس تک اور بچی کو سن بلوغ تک ...

چونکہ عورت کا حق کسی صورت میں ناقابل تنسیخ ہے لہٰذا مرد اس کو طلاق بھی دیدے۔ حقوق زوجیت منقطع ہونے کا اختیار رکھتی ہے۔ مستحق ہے کہ بیوی کو شوہر کے رشتہ داروں سے علیحدہ کسی مناسب مکان میں رکھا جائے اور اس کے معاف شوہر کی کفالت میں بچوں کی پرورش کے لئے اسے رکھا جائے۔ اگر شوہر اپنی زوجہ کی خبرگیری نہ کرے تو زوجہ کو اس پر دعویٰ کا حق ہے۔ عورت کو یہ بھی حق ہے کہ اگر اس کے شوہر کی اور بھی بیویاں ہوں تو مساوات کے برتاؤ کے متعلق دعویٰ کرے مہر، جو دلہن کا حق ہوتا ہے اس کی ادائی از روئے شرع شوہر پر واجب ہے۔ اگر شادی کے وقت تعداد مہر کا کوئی تعین نہ ہو تو بھی عورت کو اس قدر مہر دلایا جا سکتا ہے جو عموماً اس کے خاندان کی عورتوں کا ہو۔ بیوہ کا دعویٰ مہر قرض کی حیثیت رکھتا ہے اور قبل تقسیم ترکہ اس کے شوہر کی جائیداد سے ادا کیا جاتا ہے۔ جب کوئی اپنی بیوی کو طلاق دیدے تو اس کو کم سے کم تین مہینے کا نفقہ دینا پڑتا ہے۔ اگر اس مدت میں وہ حاملہ ثابت ہو تو شوہر پر واجب ہے کہ وہ اس عورت اور بچہ کا نفقہ لڑکا ہونے کی صورت میں سات برس تک اور لڑکی پیدا ہونے کی صورت میں نو برس تک ادا کرتا رہے۔

ریگستان کے پیغمبر اعظم نے عورتوں کے مدارج کو جس قدر بلند فرمایا ہے اس کا ذکر تمام غیر متعصب مصنفوں نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ یہ کہنا صریح بہتان ہے کہ اسلام نے عورتوں کے درجہ کو گھٹا دیا یا یہ کہ اسلام کو عورتوں کے ذی روح ہونے سے انکار ہے۔

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں بہت سی عورتیں بڑے بڑے مرتبے رکھتی تھیں اپنے زمانہ کی سیاسیات میں انہوں نے زبردست حصہ لیا ہے۔ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں عورتیں فقہ کی شرح بیان کرتی تھیں۔ اپنے غریب بیٹوں کے لئے انہوں نے کالج قائم کئے تھے۔ عورتیں میدان جنگ میں فوجوں کی کمانڈری تک کرتی تھیں۔ سب سے پہلی مسلم عورت جو وعظ کیا کرتی تھی اور جس کا تاریخ سے پتہ چلتا ہے وہ عہد عباسیہ میں خلیفہ مہدی کی ملکہ خیزران تھی وہ معاملات سلطنت میں بہت دخیل تھی۔ ہر اہم معاملہ میں اس سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ اس کی رائے سے اس کے شوہر نے حاجیوں کے واسطے مکہ کی شاہراہ تیار کرائی تھی جس میں جابجا تالاب اور سرائیں اور کنویں تھے۔ اس ملکہ کے آستانہ پر نامی گرامی شعرا اور عالم حاضر ہوا کرتے تھے۔ اپنے لڑکے کی خلافت کے ابتدائی زمانہ میں چند سال تک وہ انتظام سلطنت کی حکمرانی میں شریک تھی۔

بہت سے عزیزوں کی بلکہ زبیدہ خاتون نے تبلیغ میں سیاست میں بڑا حصہ لیا
جنہیں دیکھنے والا ایک نہر زبیدہ کی صورت میں چھوڑ گئی۔ جب وہ حج کو آئی تھی تو اس نے
مکہ معظمہ میں پانی کی بڑی تکلیف دیکھی اس نے یہ نہر تعمیر کروائی جس کے ذریعے شہر میں باافراط پانی
فخر النساء شہدہ پانچویں صدی ہجری میں بغداد کی جامع مسجد میں کثیر تعداد
حاضرین کے سامنے علم کلام و شاعری و ادب پر بڑے بلیغ خطبے دیا کرتی تھی۔ اسی وجہ سے اس کا
خطاب فخر النساء تھا۔

مکہ کے ایک گھرانے میں مہمان ہونے کا مجھے بہت اچھی طرح موقع ملا ہے۔ اس لئے
معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تو ان خاتونوں کے متعلق جو غلط خیال ابھی تک اہل یورپ کے دل میں
بیٹھا ہوا ہے میں اس کی تردید کر دوں۔ صرف اسی ایک مکان میں نہیں بلکہ عرب میں جتنے زنانے
میں نے دیکھے ان میں اپنے میزبانوں کی صرف ایک ایک ہی بیوی دیکھی۔ ان عورتوں کی زندگی
عیاشی کی زندگی سے کوسوں دور ہے۔ وہ عورتیں خانہ داری کے کام دھندوں میں الجھی رہتی
اور اس کے ساتھ ساتھ خوشی و مسرت کی زندگی بھی گزارتی ہیں۔ وہ اپنی ملاقاتی عورتوں کی دعوتیں
کرتی ہیں۔ رسم رسوم، تقاریب، عید، تہواروں کے موقعوں پر لطف اٹھاتی ہیں۔ وہاں یورپ کی
طرح اکیلی بدنصیب بوڑھیاں الگ رہتی مجھے نظر نہیں آئیں۔ زیادہ تر طریقہ یہ ہے کہ سب مل جل
کر رہتے ہیں۔ خوشی کی کلکاریاں اور مسرت و قناعت کی لہریں جو ان کے زنانخانوں سے
ہیں ان پر میں رائے قائم کرتی ہوں کہ دنیا میں بہتر سے بہتر حالت جو ہو سکتی ہے وہ ان کی ہے۔

آج مکہ حاجیوں اور اونٹوں سے پٹا پڑا ہے۔ سب منیٰ جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔
شغدف قطار در قطار سڑکوں اور گلیوں میں رکھے ہوئے ہیں رستہ چلنا دشوار ہو گیا ہے۔
شغدف اونٹوں پر باندھنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ دو چارپائیاں ہوتی ہیں جن پر لکڑیوں کو جوڑ
باندھ دیتے ہیں۔ اوپر دھوپ کے بچاؤ کے لئے ٹاٹ یا شطرنجی وغیرہ تان دیتے ہیں۔ اس کو اونٹ
اونٹ کی پیٹھ پر موٹی رسیوں سے کس دیتے ہیں۔ ایک شغدف ادھر ایک ادھر رہتا ہے
اندر پانی کی صراحیاں اور دوسری ضروری چیزیں رکھنے کے لئے تھیلیاں لٹکی رہتی ہیں۔ ان میں
دونوں کے دو آدمی بیٹھتے ہیں اور اترتے چڑھتے وقت توازن کا خیال رکھتے ہیں ورنہ شغدف
گرنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ میں نے دو بیچارے حاجیوں کو دیکھا کہ وہ شغدف میں سے گرے
ان کا احرام کھل گیا تھا وہ زمین پر مادرزاد ننگے پڑے ہوئے تھے۔ لوگ ان کو دیکھ کر ہنس رہے تھے

سلطان نے آج شہر میں موٹریں چلانے کی ممانعت کر دی ہے۔ سڑکوں پر بڑا ہجوم ہے اور بغیر شغدف کی ٹکر کھائے چلنا ناممکن ہے۔ آج صبح میں اپنے کمرے میں بیٹھی اونٹوں کے لدنے کا تماشا دیکھتی رہی۔ شور مچ رہا تھا۔ اونٹ بڑبڑا رہے تھے۔ اونٹ جب شغدف سمیت اٹھتے، شغدف ڈھیلے پڑ جاتے، سواریوں کو بڑا جھٹکا لگتا اور شغدف دوبارہ درست کرنے پڑتے تھے۔ ایک جگہ میں نے دو بہت خوبصورت شغدفیاں دیکھیں۔ یہ ایک بڑے گھر کے سامنے رکھی ہوئی تھیں، ان پر قرمزی رنگ کے زرین غلاف چڑھے ہوئے تھے میں نے ان کے پردوں کو ہٹا کر جھانکا اندر اطلس کے نرم نرم گدی تکیے لگے ہوئے تھے۔ مجھے ان لوگوں پر رشک آیا جو کل ان میں بیٹھ کر منیٰ و عرفات جائیں گے۔

چند سال ہوئے سلطان نے مکہ میں ایک شفاخانہ قائم کیا ہے۔ سہ پہر کو میں اسے دیکھنے پیدل گئی۔ مصطفیٰ ساتھ تھا، ہم بازاروں، گلیوں اور پیچیدہ راستوں سے ہو کر ایک پرانی محراب کے پاس پہنچے۔ یہاں علاقہ نوبہ کا رہنے والا ایک شخص پیتل کی چھوٹی سی چکی میں قہوہ پیس رہا تھا۔ احرام باندھے عرب قہوہ پی رہے تھے اور سپاہیوں کی نگاہ بچا کر حقے کے کش لگا رہے تھے۔

جب سلطان ابن سعود نے اس ملک کو فتح کیا تھا اس وقت سوائے قدیم طریقہ کے علاج کے یہاں اور کچھ نہ تھا۔ نیا شفاخانہ شہر کے آخر کونے پر بنا ہے، اس کے اطراف چمن اور مختلف قسم کے سایہ دار درخت ہیں۔ شفاخانہ کی عمارت کے چاروں طرف وسیع برآمدہ ہے۔ مسٹر ناظم طبابت میرے منتظر تھے ان کو فرانسیسی زبان آتی ہے۔ انہوں نے اپنے بعض ماتحت ڈاکٹروں اور مریضوں سے میرا تعارف کرایا۔ ان میں سے کئی پیرس اور قسطنطنیہ میں تعلیم پا چکے تھے۔ میں نے باورچی خانہ اور آپریشن کا کمرہ دیکھا۔ وارڈ میں اونٹوں سے گرے ہوئے دست و پا شکستہ دو ایک بدنصیب حاجیوں سے گفتگو بھی کی۔ برسوں تک روپیہ جمع کر کے سفر دراز کرنے کے بعد اس طرح حج سے ان کا محروم ہو جانا قیامت ہے۔ تاہم نیت بھی حساب میں آتی ہے مگر تقدیر جو دکھائے سو لاچار دیکھنا۔

شفاخانہ والوں نے بتایا کہ منیٰ و عرفات سے واپسی کے بعد بیماروں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو جائے گا۔ قلت رقم کی وجہ سے شفاخانہ ابھی ناتمام ہے۔ جو کچھ سہولتیں مجھے سلطان [illegible] ابن لک نے بہم پہنچائی ہیں ان کے شکریہ میں ایک چھوٹا سا عطیہ میں نے ناظم صاحب طبابت کو پیش کیا اس پر انہوں نے بہت شکریہ ادا کیا۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مسلمان طبیبوں نے ہی سب سے پہلے ایسے شفاخانے بنائے تھے جن میں بیماریوں کی نوعیت کے اعتبار سے مریضوں کو جدا جدا وارڈوں میں رکھا جاتا تھا۔ جن شفاخا

سے علاج کا ایک ضروری جزو ہوا کرتی تھی اور بیماروں کے آرام و آسائش کا خصوصیت کے ساتھ
اہتمام کیا جاتا تھا۔ آج جدید چیچک کے ٹیکے کے استعمال میں بھی عربوں کے مرہون منت ہیں۔

مگر میرا امراض جسمانی کے اس شفاخانہ کے علاوہ ایک شفاخانہ امراض دماغی کا بھی۔
عربوں میں جنون ہمیشہ سے خاص توجہ کی چیز رہی ہے جس زمانہ میں یورپ والے جنون کو کسی گند
تصور کرتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ مریض کے جسم میں کوئی خبیث روح حلول کر گئی ہے، عرب اس
بھی اس کو بیماری سمجھتے تھے۔ کچھ زمانہ گذرا کہ ایک انگریز بادشاہ کو عارضہ مراق و ہذیان لاحق
اس کے طبیبوں نے اس بلا سے نجات دلانے کے لئے یہ علاج کیا کہ اسے زمین پر ڈال کر خوب پیٹا۔

میری میزبان آج بڑی مصروف ہیں اور کام کاج سے تھک کر لیٹ ہو گئی ہیں۔ ان کا
اس وقت ملاقاتیوں اور رشتہ داروں سے بھرا ہوا ہے۔ کچھ لوگ کل آئے تھے آج نو وارد آ گئے ہیں
جب میں اپنی میزبان کے کمرے میں اوپر کی منزل پر گئی تو دیکھا کہ گدیوں اور فرش پر عورتیں بچے
بہت سے سو بھی رہے ہیں۔ بعض مردوں کو بھی میں نے ان کمروں میں سے نکلتے دیکھا جن میں میرے
صاحب اور ان کے لڑکے رہتے ہیں۔ غرضکہ چچا چچیاں، بھتیجے بھتیجیاں، بھانجے بھانجیاں،
کے زمانے کے رشتہ دار تک سب کے سب جدے، مدینے، ینبوع اور حجاز کے دوسرے شہروں
دنوں کے لئے ان پر آنازل ہوئے ہیں۔ مصطفیٰ جو نیچے کہیں سوتا ہے کہہ رہا ہے کہ اس کی جگہ یہ
لوگوں سے گھر گئی ہے۔ مکہ اب حاجیوں سے بھر گیا ہے جن میں ایک میں بھی ہوں اور غالباً ان
ایک میں ہی ایسی خوش قسمت ہوں کہ آج کی رات پورے کا پورا کمرہ میرے قبضہ میں رہا۔
وقت تک سب عرفات چلے جائیں گے اور شہر ہو کا میدان ہو جائے گا۔

(باقی آئندہ)

اسحٰق جلیس ندوی

تحریک پیام انسانیت

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے ایک انٹرویو

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ذات محتاج تعارف نہیں ہے۔ ملک کی دن بدن بگڑتی ہوئی صورت حال اور انسانی اور اخلاقی قدروں کی پامالی سے متاثر ہو کر مولانا موصوف نے بلا تفریق مذہب و ملت ہر طبقہ ملک سے رابطہ اور خطاب کی مہم دسمبر ۱۹۷۴ء میں الہ آباد سے شروع فرمائی۔ اسے ایک ہمہ گیر انسانی اور اخلاقی تحریک اور مہم کی شکل دینے کے لئے لکھنؤ میں کل ہند حلقہ پیام انسانیت کا قیام عمل میں آیا۔ یہ کوئی نئی جماعت یا سیاسی پارٹی نہیں ہے بلکہ ایک نئی اور نامانوس صدا لگانے والوں کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم ہے۔ بقول مولانا موصوف کے "ہم نے بہت انتظار کیا۔ افسوس ہے کہ اس لمبے چوڑے ملک میں (جس میں کروڑوں انسان بستے ہیں اور بڑے سے بڑے انسان ہیں) اخلاقی کمزوریوں کو دور کرنے اور روحانی اور انسانی زندگی کو رواج دینے کے لئے کوئی تحریک اور کوئی جماعت نظر نہیں آتی۔ ہم نے بہت انتظار کیا اور آخر یہ فیصلہ کیا کہ جو کچھ بن پڑے اس کو شروع کر دیں۔" جناب اسحٰق جلیس ندوی نے اس تحریک پیام انسانیت کے بارے میں مولانا موصوف سے ایک انٹرویو دسمبر ۱۹۸۰ء میں طبع کیا۔ ملک اس وقت جن حالات سے گذر رہا ہے، اس سے، اس انٹرویو اور اس میں بیان کردہ باتوں کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ "ذوق نظر" کی یکسانی کے اس دور میں اس "نوا" کو تیز تر کرنے کی ضرورت ہے اسی لئے ذیل میں اس انٹرویو کو دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے)

س۔ میں آج آپ سے تھوڑا سا وقت پیام انسانیت کی تحریک کے سلسلہ میں لینا چاہتا ہوں

خدا کے فضل سے ہندوستان کی چار ریاستوں مدھیہ پردیش، ہریانہ، پنجاب، راجستھان میں دورے کامیاب ہوئے۔ ہر جگہ کے شہر جہاں ہم گئے وہاں اس کا عظیم جلسہ ہوا۔ ہندو مسلمانوں کی یکساں بڑی تعداد میں شرکت، غیر مسلم فضلاء اور علماء کا بڑے شوق و ذوق سے شرکت کرنا اور دیکھ کر متاثر ہونا، جلسوں کا سکون اور نظم و ضبط، ان جلسوں کی ایسی خصوصیات ہیں جو سالہا سال سے اس ملک

یہ دیکھنے میں نہیں آئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ... انسانوں کے دل کی آواز اور وقت کی ضرورت ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس وسیع ملک میں کس تلخ تجربات کے بعد بھی خلوص اور بے غرضی کی سچی طلب اور قدر ہے اور یہاں کے ... کا ضمیر خوابیدہ کہا جا سکتا ہے "مردہ" نہیں ہے۔ اور خدا کی رحمت انسانیت پر پہنچنے سے جو اس کی نظر کرم رہی ہے اور انسانوں کی ذہنی صلاحیتوں سے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ اب جب کہ تحریک اس مرحلہ پر پہنچ گئی ہے کہ ملک کے سنجیدہ اور تعلیم یافتہ لوگوں کی نظر اس پر پڑنے لگی ہے اور ہندوستان کی مختلف ریاستوں کی طرف سے دورے کی دعوت اور محبت و قدر کے پیام آرہے ہیں میں آپ سے ایک صحافتی انٹرویو کی ضرورت سمجھتا ہوں تاکہ اس کے اصل محرکات و مقاصد لوگوں کے سامنے آجائیں، اس کام کا آپ کو کیسے خیال پیدا ہوا، جبکہ آپ کا اصل مزاج علمی و فکری ہے، اور مطالعہ و تصنیف (جس کے لئے سکون اور گوشہ نشینی کی ضرورت ہوتی ہے) آپ کی زندگی کا پسندیدہ مشغلہ ہے جو جہاں تک مجھے علم ہے آپ کو وراثت میں بھی ملا ہے اور ماحول نے بھی اس کو تقویت اور غذا پہنچائی ہے۔ یہ کام آپ نے سب سے پہلے کب شروع کیا؟ کیا یہ تسلسل کے ساتھ جاری رہا، یا اس میں کچھ وقفے بھی آئے؟

ج:۔ مجھے اگرچہ صحافتی انٹرویو سے بہت کم مناسبت ہے اور عام طور پر اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن پیام انسانیت کی تحریک کے اس مرحلہ پر نہ صرف یہ کہ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا، بلکہ کسی درجہ میں اس کی ضرورت اور افادیت بھی محسوس کرتا ہوں۔ بعض غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کو رفع کرنے کے لئے بھی یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کے پس منظر، محرکات و مقاصد اور اس کے طریق کار پر روشنی ڈالی جائے۔

س:۔ سب سے پہلے تو میں اپنی بات دہراؤں گا کہ آپ کے لئے اس تحریک کا اصل محرک و باعث کیا ہوا؟

ج:۔ یہ بالکل فطری اور قدرتی امر ہے کہ آدمی اپنے اس گھر کی بربادی نہیں دیکھ سکتا جس میں اس کو رہنا ہے اور جہاں اس کی عزیز متاع اور زندگی کی پونجی ہے اور جس کے بنانے اور سنوارنے پر اس کی اور اس کے اسلاف کی بہترین صلاحیتیں اور توانائیاں صرف ہوئی ہیں۔ یہ ہر سلیم الفطرت بلکہ صحیح الفطرت انسان کا تقاضہ ہے کہ جس کشتی پر وہ سوار ہے اس میں وہ کسی کو سوراخ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس شاخ پر اس کا آشیانہ ہے عقل و ہوش رکھنے والا کبھی اس پر تیشہ نہیں چلا سکتا ہے اور نہ کسی کو تیشہ چلانے کی اجازت دے سکتا ہے۔ روز مرہ کا مشاہدہ تھا کہ ملک تیزی کے ساتھ اخلاقی انارکی بلکہ قومی و اجتماعی خودکشی

ہے۔ اخلاقی قدریں بے وقعت ہو کے سماج پامال کیا جا رہی ہیں۔ خود غرضی [illegible] سالار ملک پرستی کر کے جس پر مذہب و اخلاق کی کسی وجہ سے گرفت مضبوط ہے یا جو زندگی کے اقدار کا مخلص ہیں یا سب پر سوار ہے۔ انسان کی جان و مال، عزت و آبرو کا احترام تیزی سے رخصت ہو رہا ہے۔ حقیر شخصی فوائد کے لئے اجتماعی و ملکی مفاد کو آسانی سے قربان کیا جا سکتا ہے۔ کام چوری، احساس ذمہ داری کا فقدان، رشوت خواری، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی خرابیاں یہ سب اسی درخت کے پھل ہیں اور انہوں نے پوری زندگی کو عذاب بنا دیا ہے اور ان کی وجہ سے ملک کے آزاد اور با اختیار ہو جانے کے بعد بھی اس میں بسنے اور آزادی سے فائدہ اٹھانے کا مزہ نہیں رہا۔

یہ خرابیاں اور کمزوریاں انگریزوں کے زمانہ میں بھی تھیں بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان کے اقتدار اور نظام تعلیم کو ان کے پیدا کرنے یا ان کو ترقی دینے میں بڑا دخل ہے۔ لیکن ایک دینی رفاقت، جوش، انتظامیہ اور مجبوری و بے اختیاری نے ان کو بہت کچھ دبا رکھا تھا۔ باہر کی بے اس سرپرستی کے اٹھ جانے سے یہ خرابیاں ابال اور بھاپ کی طرح نکل پڑیں۔ آزادی کی جنگ سرپرستی ہوئے لگاتار چھلکنے کی مصروفیت نے قومی تعمیر اور کردار سازی کی مہلت نہیں دی۔ ملک آزاد ہو گیا لیکن ضمیر اندر سے غلام تھا، برطانیہ یا کسی غیر ملکی طاقت کا نہیں بلکہ ہوا و ہوس، دولت و عزت و اقتدار اور تنگ نظری و تنگ دلی کا۔ اتنے بڑے ملک کے نظم و نسق اور سیاسی جماعتوں کی باہم کشمکش اور کرسی اقتدار کی حفاظت نے اس کی مہلت نہ دی (اور چند کو مستثنیٰ کر کے) ہمارے سیاسی رہنماؤں کے ذہن میں اس کی کچھ اہمیت بھی نہ تھی کہ وہ عوام سے رابطہ پیدا کر کے ان کے دل و ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کریں۔ ان کے اخلاقی حس کو تیز اور متحرک کریں۔ جو باتیں ملک کے لئے حقیقی خطرہ بنی ہوئی ہیں ان کی طرف متوجہ کریں۔ بہت انتظار کرنے کے بعد اپنی بے سروسامانی، تنہائی و بے اثری کا پورا علم و احساس ہونے کے باوجود ہم میدان میں آئے اور قوم و ملت اس ملک کے بسنے والوں کے دلوں پر دستک دینے کا فیصلہ کیا کہ جب کسی محلہ میں آگ لگتی ہے تو کوئی اپنی کمزوری اور بے نوائی کو نہیں دیکھتا، گونگے بھی چلا اٹھتے ہیں، اپاہج بھی دوڑ پڑتے ہیں۔

سوال: قبل اس کے کہ میں آپ سے یہ سوال کروں کہ آپ نے اول اول اس تحریک کی ضرورت کب محسوس کی تھی؟ میں آپ سے اس سوال کی اجازت چاہتا ہوں کہ کیا آپ کے لئے اس کا [illegible]

چونکہ آپ نے تصنیف و تالیف کے کام اور ندوۃ العلماء جیسے عظیم ادارہ کی خدمت و ترقی کو ہی اپنا مقصد
سمجھے۔ آپ شروع سے تبلیغی جماعت کے ایک اہم داعی، ترجمان اور اس کے خاص کے شریک
رہے ہیں اور آپ کو اس جماعت کے خلوص و مقبولیت اور اس کے وسیع اور ہمہ گیر اثرات پر اب بھی
اطمینان ہے، پھر جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ ہندوستان کے کئی اہم تعلیمی و تصنیفی اداروں کی انتظامیہ
کمیٹیوں کے رکن بھی سالہا سال سے چلے آ رہے ہیں۔ آپ پوری یکسوئی اور اطمینان قلب کے ساتھ
اپنے اسلاف اور بزرگوں اور اساتذہ کی طرح ان اداروں کی خدمت میں مصروف رہ سکتے تھے
میرے نزدیک کوئی شخص بھی جو آپ کے طبعی مذاق، صحت کی کمزوری اور خاندانی گوشہ پسندی سے واقف ہے،
آپ کو ملامت نہ کرتا اور نہ اس سلسلہ میں آپ کا گریباں گیر ہوتا۔

ج :- آپ نے بڑا اچھا سوال کیا اور بڑی خوبی سے میرے لئے اپنے علمی کاموں میں انہماک
اور اپنے میدان عمل کے انتخاب کے لئے عذر تلاش کر لیا لیکن میں اپنے اس اندرونی یقین اور اس
بدیہی حقیقت کو کیسے نظر انداز کر دوں کہ کسی ملک اور دور میں بھی تعلیمی و تعمیری کاموں کے لئے
(خواہ وہ کتنے مقدس، ضروری اور مفید ہوں) شرط یہ ہے کہ اس ملک میں معتدل NORMAL
حالات ہوں، جہاں کوہ آتش فشاں بار بار پھٹتا ہو، سائیکلون جلد جلد آتے ہوں، سیلاب اپنی
قہر سامانیوں کے ساتھ پورے پورے شہروں اور صوبوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہو، وہاں تعلیمی و
تعمیری کام کے لئے دماغی سکون اور ولولہ عمل کہاں سے پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ تو غیر اختیاری امور ہیں
اور ان پر کسی کا کوئی قابو نہیں۔ لیکن جہاں فرقہ وارانہ فسادات، انسان کشی اور انسانیت
سوزی کے جنون کی لہریں اٹھتی ہوں اور اچھے پڑھے لکھے انسانوں پر اعصابی (ہسٹیریا) کے دورے
جلد جلد پڑتے ہوں، جہاں دولت و قوت کے سوا کوئی حقیقت زندہ اور مسلم نہ مانی جاتی ہو اور
جیسا کہ میں نے ابھی سیوان کی تقریر میں کہا تھا کہ "یہ بات تو میری سمجھ میں آتی ہے کہ انسانوں یا
عمارت پر بجلی گر جائے، نیویارک کے پاور ہاؤس پر بجلی گری اور سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔
کسی مجمع پر چھت یا دیوار گر جائے۔ کوئی ہاتھی یا سانڈ مست ہو کر انسانوں کی جان لے لے،
اس لئے کہ یہ سب بے شعور و بے ضمیر چیزیں ہیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک پڑھا لکھا آدمی کسی
پڑھے لکھے آدمی پر گر جائے، جیسا کہ جمشید پور، راوڑکیلا اور رانچی میں ہوا۔ ایک ہی کالج میں
پڑھانے والا استاد دوسرے استاد کے خون میں ہاتھ رنگ لے۔ طالب علم طالب علم کی مخبری کرے
اور کسی سیاسی جماعت کا ایک رفیق دوسرے رفیق کا گلا کاٹے۔"

اور یہ صرف کسی وقت ہی معاشرہ پر ہو سکتے ہیں۔ اور لوگ [illegible] اور [illegible] سکتے ہیں۔ عمل کسی علمی و تعمیری کام یا ادارے کے لئے ان کی اعانت کب تک دی جا سکتی ہے معاشرہ میں یقینی اور سچائی فضا میں کوئی تحسین یا فکری کام کیسے ہو سکتا ہے بقول میر ؎

یوں زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آئے

میں تو سمجھتا ہوں کہ اس فضا میں ادب و شاعری اور فنون لطیفہ اور اقبالؒ کے الفاظ میں "لذت کردار اور جرأت اندیشہ" کی بھی کیا گنجائش ہے؟

اور یہ تو ملک گیر اور وسیع پیمانے کے حوادث ہیں۔ جہاں سوسائٹی اتنی مسخ Corrupt ہو جائے کہ کسی کو بغیر رشوت دیئے نہ اس کا حق ملے، نہ ریل پر وہ آرام سے سفر کر سکے، نہ طالب علم پڑھنے کی طرف متوجہ ہوں نہ استاد پڑھانے کی طرف۔ انتظامیہ کے سب کام بے عمل اور سست ہوں، پورے ملک میں وقت کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو، سفر غیر محفوظ اور قیام مخدوش ہو جائے وہاں اس بگڑے ہوئے معاشرہ میں افراد کے لئے اپنے اصولوں پر قائم رہنا کب تک ممکن ہے؟

اس بنا پر میں اس بات کے سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ یہ اخلاقی سدھار کی مہم اور پیام انسانیت کی تحریک ملک کے تمام دینی، تعلیمی، علمی کوششوں اور تحریکوں کے لئے ایک حصار کی حیثیت رکھتی ہے جس کے اندر رہ کر ہر کوشش کامیاب ہو سکتی ہے اور اس کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے پرسکون اور معتدل فضا میسر ہوگی اس لئے اس تحریک کو میں ہر تحریک کا خادم اور معاون سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک ہر دعوت و تحریک کو اس کا خیر مقدم کرنا چاہئے۔ کم سے کم اس کی حیثیت وہ ہے جو کسی فرش یا سقف یا زمین برابر کرنے والے یا شامیانہ لگانے والے کی ہوتی ہے جس کے بعد کوئی بھی جلسہ یا اجتماع ہو سکتا ہے، خواہ وہ خالص مذہبی نوعیت کا ہو یا تعلیمی [illegible] کا۔

س: اب مجھے پوچھنے کی اجازت دیجئے کہ اس بھرے پرے ملک میں جس میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے آپ ہی نے کیوں اپنی ذمہ داری سمجھی کہ اس دعوت کو لے کر کھڑے ہوں، اور کسی کا انتظار کئے بغیر میدان میں آئیں؟

ج:۔ آپ کا سوال بالکل حق بجانب ہے لیکن آپ خود صاحب علم ہیں اور قرآن و حدیث اور سیرت نبوی پر آپ کی نظر ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مسلمان خالص اپنے نفع کی [illegible] منصب ہے کہ وہ جہاں کہیں ہو اپنے ماحول کی فکر کرے، رشد و ہدایت کی طرح [illegible] منکر و ظلم سے آنکھیں بند کرنے [illegible] غیرت ہے [illegible]

[illegible] نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کا حکم ہے۔ اس کو سمجھنا چاہئے کہ معاشرہ کی
کی بس کشتی پر سوار ہے وہ جب ڈوبے گی تو اس کو لے کر ڈوبے گی۔ اس کے لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم
نے بہت عمدہ مثال دی ہے جو مثال دی ہے اس سے بہتر مثال کم از کم مجھے مذہبی و اخلاقی لٹریچر
میں نہیں ملی۔ آپؐ نے فرمایا کہ: "ایک کشتی پر کچھ لوگ بالائی منزل پر سوار ہیں اور کچھ نیچے کی منزل پر
نیچے پانی کا انتظام اوپر ہے، نیچے والے کچھ دیر کو اوپر جا کر پانی لائیں اور اپنی پیاس بجھائیں۔
پانی گرتا اور چھلکتا ضرور ہے، کشتی کے "بالا نشینوں" کو اس سے کچھ تکلیف ہوئی، انہوں نے
روک ٹوک کی۔ نیچے والوں نے کہا کہ پانی کے بغیر انسان کا گزارا نہیں، اگر اوپر والے پانی نہیں
لینے دیتے تو ہم نیچے کے حصہ میں سوراخ کر لیں گے اور یہیں بیٹھے بیٹھے دریا سے پانی حاصل کر لیں گے"
آپؐ نے فرمایا۔ "اگر اوپر والوں میں ذرا بھی سمجھ ہے تو وہ ان کو ایسا کرنے سے روک دیں گے اور
پانی لے جانے کی اجازت دے دیں گے۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا اور کشتی میں سوراخ ہو گیا تو
نہ اوپر والے بچیں گے نہ نیچے والے"

بس ہم سب اسی کشتی کے سوار ہیں، یہ ہمارے ملک کی کشتی ہے اگر خدانخواستہ
ڈوبی تو نہ جلسے اور ادارے بچیں گے نہ کتب خانے، نہ مقدس اور خدارسیدہ افراد، نہ عالم و
فاضل، نہ بزرگ۔

س :- کیا آپ کو تحریک شروع کرتے وقت یہ خیال نہیں ہوا کہ مسلمانوں کے اس اخلاقی
سدھار کی قیادت کی آواز اٹھانے اور اس کا جھنڈا ہاتھ میں لینے سے برادرانِ وطن میں بدگمانی
کا ایک طوفان کھڑا ہو جائے گا اور مسلمانوں پر اس کے ذریعہ سیاسی مقاصد کے پورا کرنے کا الزام دیا جائے گا؟

ج :- جی ہاں یہ خطرات تو تھے۔ لیکن خطرات اور اندیشوں کی بنا پر کوئی ضروری کام
چھوڑا نہیں جا سکتا۔ جب یہ کام شروع کیا گیا تو اندازہ ہوا کہ دلوں اور دماغوں کے دروازے بند
نہیں ہیں اور جب کوئی کسی آتش زدہ محلے یا گاؤں میں صدا لگاتا ہے آگ لگی ہے، آگ
لگی ہے تو کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ صدا لگانے والے کا مذہب کیا ہے۔ میں اس موقع پر اپنی ایک
پرانی تحریر کا اقتباس پیش کرتا ہوں جو [illegible] کی ہے:-

"عالم انسانی کی ایک ضرورت یہ ہے کہ اغراض و تعصبات، قوم پرستی اور
سیاسی مقاصد سے بالکل آزاد ہو، بے تعلق ہو کر عام انسانوں کے سامنے
وہ حقیقتیں رکھی جائیں جن پر انسانیت کی نجات اور سلامتی موقوف ہے

[illegible] پر کریں بجو ضرورت [illegible] اس ملک میں چلا آرہا ہے کسی ملک میں اگر کوئی اقلیت یا فرقہ اپنی وراثت محفوظ اور بے لاگ و بے غرض قیادت و دعوت کے بغیر عزت والمیان کے ساتھ نہیں رہ سکتا اقبال نے صحیح کہا ہے ۔ ع

زندگی جہد است استحقاق نیست

س :- اب مختصراً یہ بتا دیجئے کہ آپ نے یہ کوشش کب شروع کی تھی؟ اور اس سلسلہ میں یا کوئی واقعہ بھی آیا؟

ج :- یوں تو میں نے تقسیم اور ملک آزاد ہوجانے کے بعد ہی سے اپنے ان خیالات اور ملک کی اخلاقی گراوٹ اور بگڑتی ہوئی صورت حال پر اپنی گہری تشویش کا اظہار اپنے بعض مضامین اور رسائل کے ذریعہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اسی زمانہ میں میرا ایک مضمون "ہندوستانی سماج کی جلد خبر لیجئے" کے عنوان سے نکلا تھا جس کا ہندی، انگریزی ترجمہ بھی نے اس وقت ملک کے تقریباً تمام سربرآوردہ سیاسی رہنماؤں اور وزراء اعلیٰ کو بھیجا تھا لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ کوشش ۱۹۵۴ء کے آغاز میں شروع ہوئی اس سلسلہ کی پہلی تقریر جس سے اس مہم کا آغاز کیا گیا، ۹ر جنوری ۱۹۵۴ء کو گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں ایک ایسے اجتماع میں کی گئی جس میں شہر کے سربرآوردہ حضرات اور غیر مسلم تعلیم یافتہ اصحاب کی خاص تعداد شریک تھی۔ اس زمانہ میں تبلیغی دورے کے ساتھ اس جزء کو شامل کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد ہی مشرقی اضلاع کا ایک دورہ کیا گیا جس میں جونپور، غازی پور، مئو اور گورکھپور میں بڑے بڑے جلسے اجتماعات ہوئے۔ اس دورے کی تقریریں ایک مجموعہ میں جمع کر دی گئی ہیں جس کا نام ہی "پیام انسانیت" ہے اس سلسلہ کا دوسرا نمبر "مقام انسانیت" کے نام سے شائع ہوا لیکن کچھ ہی دن کے بعد اندازہ ہو گیا کہ اس کو تبلیغی دوروں کے ساتھ ملانا بعض غلط فہمیوں کا موجب ہوگا۔ ادھر یہ احساس غالب آنے لگا کہ ایسی تقریروں کے لئے جن احتیاطوں اور رعایتوں کی ضرورت ہے ان پر سب پر قدرت نہیں، اس لئے ان تقریروں کا بوجھ زیادہ تر اس ناچیز پر اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی پر تھا اور جہاں ہم نہ ہوتے وہاں اس طرح کا کوئی اجتماع بھی نہ کیا جاتا۔

ادھر میرے بیرونی ملک کے سفر پیش آنے لگے کہ اس کے کچھ عرصہ کے بعد ہی مجھے دمشق یونیورسٹی کی طرف سے دعوت آئی، اور کئی مہینے ملک سے باہر رہا۔ وہاں سے آنے کے بعد اپنے تصنیفی و علمی مشاغل میں مصروف ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے ساری عمر اس کا قلق رہے گا یہ سلسلہ کیوں اتنی جلدی رک گیا۔ میں اس کو اپنی ایک اخلاقی کوتاہی سمجھتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس کو

اور جن کو نظر انداز کرکے جاہلانہ پرستی اور بے لگام انسانی ہوس آج اس وقت [illegible] اور موت و زیست کی کشمکش میں گرفتار ہے۔ یہ حقیقتیں اپنے اپنے زمانہ میں پیغمبروں نے بیان کی تھیں اور ان کے لئے سخت جد و جہد کی تھی۔ یہ حقیقتیں اب بھی زندہ ہیں لیکن سیاسی تحریکوں، ملکی جھگڑوں اور قومی خود غرضیوں نے گرد و غبار کا ایسا طوفان کھڑا کر دیا ہے کہ یہ روشن حقیقتیں ان کی اوٹ میں اوجھل ہو گئی ہیں لیکن انسانی ضمیر ابھی مردہ اور انسانی ذہن ابھی مفلوج و معطل نہیں ہوا ہے۔ اگر پوری بے غرضی، پورے یقین اور پورے خلوص کے ساتھ ان حقیقتوں کو عام فہم زبان اور دلنشیں انداز میں بیان کیا جائے تو یہ انسانی ضمیر و ذہن اپنا کام کرنے لگتا ہے اور بڑی گرمجوشی سے ان حقیقتوں کا استقبال کرتا ہے اور بعض وقت تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان تقریروں میں اس کے دل کی ترجمانی اور اس کے درد کا مداوی ہے۔

آپ نے کم سے کم بھوپال کے صدر منزل، لکھنؤ کے گنگا پرشاد میموریل ہال، آگرہ کے سینٹ جارج کالج ہال، اندور کے ٹیگور ہال، بہرائچ کے ٹاؤن ہال اور چنڈی گڑھ، جے پور، جونپور اور ناگپور کے عظیم جلسوں میں غیر مسلم بھائیوں کا گہرا تاثر اور ان کے ذوق و شوق کی کیفیت دیکھی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ لوگوں میں موجودہ صورت حال سے بے اطمینانی، بیزاری کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ تاریخ کا مسلسل تجربہ ہے کہ ایسے موقع پر وہ لوگ تو کم تعداد میں ہوتے ہیں جو اس صورت حال سے پنجہ آزمائی کے لئے میدان میں آجائیں لیکن وہ لوگ بڑی تعداد میں ہوتے ہیں جو اس صورت حال کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کا ساتھ دیتے ہیں یا کم سے کم دل سے اس کو پسند کرتے، ان کے حق میں کلمہ خیر کہتے یا دل سے دعا دیتے ہیں۔ ایسے موقع پر کسی فرد یا جماعت کا میدان میں آنا شرط ہے۔ اگر کوئی میدان میں آنے کے لئے تیار نہ ہو تو حالات کا یہ دھارا اسی رخ پر بہتا رہتا ہے۔ اور پرانی [illegible] شاندار تہذیبوں کی طرح وہ تہذیب یا معاشرہ بھی زوال کا شکار اور تاریخ کا قصہ پارینہ بن کر رہ جاتا ہے۔

س :- کیا آپ اس سوال کا جواب دینا پسند کریں گے کہ مسلمانوں کو من حیث الجماعۃ بھی اس دعوت و تحریک سے کچھ فائدہ پہنچے گا؟

ج :- آپ نے ذرا نازک سوال کیا ہے۔ میرے نزدیک مسلمانوں کو من حیث الجماعۃ اس کا کچھ بھی فائدہ نہ پہنچے اور ملک کو فائدہ پہنچ جائے، جب بھی ان کو یہ کام کرنا چاہئے۔ وہ اپنے دینی منصب کے لحاظ سے اس کے لئے مامور ہیں اور ملک کے ہر فائدے میں شریک، لیکن میرے نزدیک مسلمانوں کے لئے اس ملک میں باعزت طریقہ پر رہنے کا یہی راستہ ہے کہ وہ اپنی افادیت ثابت کریں اور اخلاقی قیادت کے

اضطراب ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہتا تو ہزاروں کارکن تیار ہو جاتے اور ملک کی فضا پر اس کا خوشگوار اثر پڑتا ۔ اس طویل وقفہ کے بعد دسمبر ۱۹۸۰ء کو الہ آباد سے پھر اس مہم کا آغاز کیا گیا اور کیفیت سے کسی نہ کسی طرح یہ سلسلہ جاری ہے ۔

س ۔ اب دو سوالات میں اور کرنا چاہتا ہوں ، آپ نے اپنی علالت و تکلیف کے باوجود بڑے تفصیلی جوابات دئے اور یہ انٹرویو میرے اندازہ اور توقع سے زیادہ طویل ہو گیا ۔ میں اس کے لئے معافی چاہتا ہوں ۔

پہلا سوال یہ ہے کہ اس تحریک سے بعض حضرات کو بعض خدشات ہیں ۔ ان میں سب سے بڑا شبہ یہ ہے کہ کہیں اس سے وحدت ادیان کا فتنہ پیدا نہ ہو ، آپ اس سلسلہ میں اگر کوئی وضاحت مناسب سمجھتے ہوں تو فرمائیں ۔

ج ۔ اس کا سارا انحصار داعیوں کی نیت ، ان کے یقین و عزم اور ان کے دعوت کے پیش کرنے کے طریقہ پر ہے ۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں شروع سے وحدت ادیان کا مخالف اور وحدت دین کا قائل ہوں ، ۱۹۴۷ء کے بعد ہی سے میں نے اس پر مضامین لکھنے شروع کئے اور ہر اس چیز کی مخالفت شروع کی جس سے مسلمانوں میں کسی دوسری تہذیب یا دعوت میں تحلیل ہونے کا اندیشہ پیدا ہوتا تھا اس سلسلہ میں میں اپنے دو رسالوں کا حوالہ دوں گا جن کا تعلق علی الترتیب ڈاکٹر سمپورنانند وزیر اعلیٰ ریاست یوپی اور بابو پرشوتم داس ٹنڈن صدر کانگریس و اسپیکر یوپی اسمبلی کی بعض تقریروں سے تھا ۔ ایک کا عنوان " مسلمان اور ہندوستان پر دو ج " اور ایک کا نام " مذہب یا تہذیب " ہے ۔ درحقیقت یہ تحریک وحدت ادیان کی نہیں وحدت انسانیت کی ہے اس لئے ہم اس پر عمل میں اس سے امکانی حد تک احتیاط برتتے ہیں کہ ان میں مذہب کی دعوت دی جائے ۔ ہم صرف اخلاق ، خدا ترسی ، انسان دوستی اور اخلاقی و شہری شعور کی دعوت دیتے ہیں ۔ یوں سمجھئے کہ یہ غیر مسلم اکثریت کے ملک میں اس " حلف الفضول " کی ایک تقلید ہے جو بعثت سے قبل مکہ میں ایک انجمن یا معاہدہ کی شکل میں قائم ہوا تھا جس کے اہم دفعات یہ تھے کہ " ہم ملک سے بدامنی دور کریں گے " " مسافروں کی حفاظت کریں گے " " غریبوں کی امداد کرتے رہیں گے " " زبردست کو زیردست پر ظلم کرنے سے روکا کریں گے " آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس میں شریک تھے نبوت کے زمانہ میں فرمایا کرتے تھے کہ اگر آج بھی کوئی اس انجمن کے نام سے کسی کو مدد کے لئے بلائے تو سب سے پہلے اس کی امداد کو تیار پایا جاؤں گا ۔

[illegible] میں ... پہلا کوئی سوال ہے جبکہ بعض لوگوں کو یہ شبہ پیدا ہوا ہے کہ یہ [illegible]
ہندوستان کی دوسری دینی کوششوں سے تصادم نہ ہو جائے یا یہ تحریک ان کو کچھ نقصان نہ پہنچائے
جو عرصہ دراز سے جاری ہیں، اور جن کے اثرات اور فوائد روز روشن کی طرح واضح ہو چکے ہیں۔

ج۔ میں اس شبہ کو "اندیشہ دور دراز" سے زیادہ وقعت نہیں دیتا، اس لئے کہ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ یہ تحریک سب کے لئے مفید و معاون، اس کے لئے سازگار فضا پیدا کرنے کا ذریعہ ہے جس کے بغیر کوئی تحریک سکون و اطمینان کے ساتھ اپنا عمل نہیں کر سکتی۔ ہر کام کے لئے معتدل (Normal) حالات کی ضرورت ہے، اس کی ضرورت ہے کہ دماغ اپنا توازن نہ کھوئیں، طبیعت میں اشتعال، برہمی، اور بے جا بدگمانیاں نہ پائی جائیں۔ ان میں بات سننے کا موڈ اور اچھی بات کے قدر کی صلاحیت ہو، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ تحریک یہ مقصد پورا کرتی ہے۔

جہاں تک تصادم اور ٹکراؤ کا تعلق ہے تو ٹرین ٹرین سے لڑ سکتی ہے، موٹر موٹر سے ٹکرا سکتی ہے لیکن ٹرین اور کشتی یا جہاز میں کوئی ٹکر نہیں ہو سکتی اس لئے کہ ایک خشکی پر چلتی ہے دوسری پانی میں۔ تحریک "پیام انسانیت" کے مخاطب بلا تفریق مذہب و ملت ملک کے تمام باشندے ہیں اس کا موضوع انسانیت اور اخلاق ہے، اس کا مقصد اس ملک کے رہنے والوں میں زندگی کا سلیقہ اور شہریت کا احساس پیدا کرنا ہے۔

آخر میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ میں ان حضرات کو اس تحریک میں شامل کرنے کے بارے میں کتنا محتاط ہوں جو دوسری دینی، دعوتی و تبلیغی تحریکات میں شامل ہیں۔ ان کے بارے میں مطمئن ہوں اور مفید کام کر رہے ہیں۔ بلکہ عام طور پر ان کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اپنے کام میں پورے انہماک کے ساتھ لگے رہیں۔ اس کے بعد بھی اگر کسی کو مخالفت یا تصادم کا اندیشہ ہے تو آپ کو معلوم ہے کہ وہم کا علاج لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نیتوں کا جاننے والا اور قلوب کی حفاظت کرنے والا ہے۔ فنعم المولیٰ ونعم النصیر

اپنے حلقۂ اثر، محلہ، بستی، شہر اور اپنے ملک میں برادرانہ
ماحول پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کیجئے

ڈاکٹر حسن الدین احمد

عرب اور جنوبی ہند کے تعلقات

دنیا کو جب سے تجارتی تعلقات کی تاریخ کا علم ہے عرب تجارتی کاروبار میں منہمک اور مستعد نظر آتے ہیں۔ عربستان غیر زرخیز علاقہ ہے اس لئے وہاں کے باشندوں کو قدیم زمانہ ہی سے تجارت کو اپنا پیشہ قرار دینا پڑا۔ جنوبی ہند اور عربستان کے درمیان صرف سمندر حائل ہے اس لئے عرب تاجر ہزاروں برس پہلے سے ہندوستان کے جنوبی ساحل تک آتے تھے اور یہاں کی پیداوار کو مصر اور شام پہنچاتے تھے اور وہاں کے سامان کو ہندوستان، جزائر ہند، چین اور جاپان تک لے جاتے تھے۔

اس سلسلہ میں فینیشین قوم کا تذکرہ ضروری ہے جن کو دنیا کے پہلے بحری تاجر اور فن جہاز رانی میں دنیا کے امام قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ سامی نسل سے تھے۔ محققین کا کہنا ہے کہ یہ عرب تھے جو ساحل بحرین کے پاس سے اٹھ کر شام کے ساحل پر جا بسے تھے۔ مشرق میں بحرین اور شام میں ٹائر ان کی بندرگاہیں تھیں۔ بحرین سے وہ ایران، ہندوستان اور چین تک جاتے تھے۔ اس قوم کے ذریعہ یونان میں تہذیب و تمدن کا آغاز ہوا۔

توراۃ میں جس کو بین الاقوامی تاریخ کی قدیم ترین کتاب قرار دیا جا سکتا ہے اس تجارتی قافلہ کا ذکر ہے جو حضرت یوسفؑ کو مصر پہنچاتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کے زمانہ سے مارکو پولو اور واسکو ڈی گاما کے زمانہ تک ہندوستان کی تجارت کے مالک عرب ہی رہے۔

قدیم سے ہندوستان اور عرب کے تجارتی راستے دو تھے۔ ایک تو ہندوستان کے ساحل سے یمن اور پھر بذریعہ اونٹ بحر احمر کے کنارے کنارے شام اور مصر وہاں سے بحر روم ہو کر یورپ، اور دوسرا راستہ خلیج فارس کے ذریعہ۔

جب مصر پر یونانیوں کا قبضہ ہوا تو انہوں نے اس تجارت کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور ہندوستان سے

عزیز باغ ۔ بازار نور خاں ۔ حیدرآباد

اسکندریہ تک ایک راستہ قائم کر لیا جس سے جنوب مغربی عرب یعنی حضرموت اور یمن سے شمال تک ایک
دوسرا راستہ کھلا رہا۔ عرب جنوبی ہندوستان کے تمام ساحلی مقامات اور بحرِ ہند کے جزیروں پر سے ہوتے
ہوئے بنگال اور آسام تک پہنچ جاتے۔

حضرت مسیحؑ کے عہد تک اور اس کے بعد بھی عرصہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ حضرت مسیحؑ
کے چھ سو برس بعد جب اسلام پھیلا اور اس کی وجہ سے عربوں نے عروج پایا اور وہ مغرب سے بڑھ کر اسپین
تک پہنچ گئے تو بحر روم پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔ اس طرح دنیا میں بحری تجارت کا سب سے بڑا راستہ عربوں کے ہاتھ میں آگیا
جنوبی ہند کے بندرگاہوں کولم۔ ملیبار۔ راس کماری کے نام پہلی صدی ہجری سے عربی کتابوں
میں ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔

نویں صدی عیسوی کے ایک مشہور عرب تاجر سلیمان جہازوں کے راستے بتلاتے ہیں کہ بصرہ
اور عمان سے تمام سامان سیراف آجاتا ہے جہاں جہازوں پر لادا جاتا ہے۔ سیراف سے مسقط اور ایک
ماہ کا راستہ طے کر کے جہاز کولم ملی پہنچتے ہیں جہاں جہاز درست کرنے کا کارخانہ ہے۔ یہاں سے میٹھا پانی بھی لیتے ہیں۔
کولم اس وقت ریاست کیرالا میں ہے۔

دسویں صدی عیسوی کے آخر میں مسعودی لکھتے ہیں کہ جنوبی ہند کے جزائر سے عرب تاجر ناریل
بقم کی لکڑی بید اور سونا لے کر جاتے ہیں کہ وہ نیز طرح طرح کی خوشبوئیں کافور عود، لونگ جائفل، کباب چینی
جوتری، الائچی وغیرہ بھی لے جاتے ہیں۔

چودھویں صدی عیسوی میں یورپ کی عیسائی قوموں نے عربوں کی ہر ہر جگہ سخت مخالفت کی
عین اس وقت جب وہ اسپین اور شمالی افریقہ میں کامیاب ہو رہے تھے ترکوں نے اقتدار حاصل کیا اور
پھر بحر روم کا یہ راستہ مسلمانوں کے ذریعہ سے عربوں کے پاس رہ گیا۔

اب یورپ کی قوموں نے ہندوستان کا دوسرا راستہ دریافت کرنے کی کوشش کی
شمالی افریقہ اور بحر روم کو چھوڑ کر جنوبی افریقہ کے راستے سے ہندوستان کا سراغ لگا لیا گیا۔ ولندیزی
پرتگیزی، انگریز اور فرانسیسی ہندوستان کی اس تجارت کو جو عربوں کے ہاتھ میں تھی چھیننے لگے۔ اس کشمکش
میں جو سخت دریائی معرکہ ہندوستان کے سواحل پر ہوا اس میں مشرق کو شکست ہوئی اور یہی آئندہ تمام شکستوں کا
پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس کے بعد تمام جزائر ہند اور سواحل کی تجارت اہل یورپ کے ہاتھ میں آگئی۔
مدراس کے عربی النسل تاجر جو جنوبی ہند اور جزیروں کی تجارت کے مالک تھے ان کی جگہ غیر تاجر آ گئے۔
اس طرح عرب اور جنوبی ہند کے تجارتی تعلقات کا مجموعی زمانہ کم و بیش ۲½ ہزار برس کا

بہ دیا ہے کہ ایک طویل مدت تک عرب تاجر جنوبی ہند کا مال آگے لے جاتے رہے اور جنوبی
ہند کی پیداوار کو دور دراز ملکوں تک پہنچایا بلکہ علم و خیالات، تہذیب و تمدن کی حد تک بین الاقوامی
سہولتیں بہم پہنچائیں اور اس طرح تہذیب کی زبردست خدمات انجام دیں ۔ اس تمام عرصہ میں عربوں کے
جنوبی ہند سے نہایت خوشگوار تعلقات رہے۔ جنوبی ہند کے راجاؤں نے عربوں کو ہمیشہ خوش آمدید کہا
تھا۔ ابن بطوطہ نے جنوبی ہند کے ساحلی شہروں کا سفر کرتے ہوئے جا بجا لکھا ہے کہ یہاں کے ہندو راجہ عرب
مسافروں کو اس لئے ناخوش نہیں ہونے دیتے تھے کہ ان کے ملک کی آمدنی ان ہی کی آمد و رفت سے قائم تھی
مالک اور کارومنڈل کے راجہ اس بحری تجارت سے کثیر دولت کے مالک تھے ۔ کارومنڈل کی تمام تجارت
عرب اور عراق کے سواحل سے تھی ۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ صرف عرب ہی جہاز راں تھے اور اہل ہند اس
سے واقف نہیں تھے ۔ یہ صحیح ہے کہ ایک طویل عرصہ تک سمندر کی سیادت عربوں کو حاصل رہی اور دنیا کی
تجارت کے طویل بحری راستے ان کے تصرف میں تھے لیکن اہل ہند بھی جہاز رانی سے واقف تھے ۔ کارومنڈل
و گجرات کے جہاز جاوا لے جاتے تھے اور عربوں سے تجارتی تعلقات کی بناء پر جنوبی ہند کے تاجر بھی عربوں کی تجارت کرتے تھے

ان دیرینہ تعلقات اور مسلسل آنے جانے کی وجہ سے اہل عرب جنوبی ہند کی اشیاء اشخاص
اقوام سے اچھی طرح واقف تھے اسی طرح ان مقامات کے رہنے والے بھی عربوں سے واقف تھے ۔

جب اہل ہند کو ملکی حالات کی وجہ سے مجبوراً اپنا وطن چھوڑنا پڑا تو انہوں نے عربستان کا
رخ کیا اور اس طرح جب عرب اپنا وطن ترک کرنے پر مجبور ہوئے تو انہوں نے جنوبی ہند کا رخ کیا ۔

ہندوستانیوں کو ایسا موقع اس وقت آیا جب کہ یہاں بدھ مذہب کی مخالفت منظم طریقہ پر
ہوئی اور بدھ مذہب کے ماننے والوں کو اپنی جانیں بچانے کے لئے مجبوراً ملک چھوڑنا پڑا ۔ ان کی نظر دیرینہ
تعلقات کی بناء پر عرب پر پڑی اور انہوں نے ادھر کا رخ کیا ۔ اور جزیرۃ العرب میں آباد ہونے لگے ۔ ان کی
تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ ہر طرف منتشر ہو گئے ۔ عربوں اور ہندوستانیوں میں پہلے سے تعلقات
کی بناء پر وہ آسانی سے عربوں کی زندگی میں مل جل گئے ۔ یہ عام طور پر بلاد و قریات میں رہتے
سہتے تھے ۔ خلیج عرب کے سواحل پر ہندوستانیوں کا ایک گروہ قدیم زمانہ سے خانہ بدوشوں کی
طرح گھاس اور چارہ کی تلاش میں گھوم پھر کر زندگی بسر کرتا تھا ۔

جزیرۃ العرب میں جنوبی ہند کے جو لوگ بس گئے تھے ان میں قابل ذکر میدہ، سیابجہ
سیابجہ ہیں ۔ میدہ ساحلی مقامات کے وہ باشندے تھے جو سندھ میں ڈاکہ زنی کرتے تھے ۔ یہ بدھ مذہب
تھے اسی طرح زط کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بدھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے اور گیروا لباس پہنتے تھے

ہوتے ہوا کرتے تھے سیابچہ وہ لوگ تھے جو عرب کے جاکر کشتیوں اور جہازوں کی بحری نگرانی سے حفاظت کا پیشہ کرتے تھے اور جن کو لڑنے کے لئے جہازوں پر اجرت پر رکھا جاتا تھا۔ جب یہ لوگ مسلمان ہوئے تو اسلام کی فوج میں شامل ہوگئے اور یہی لوگ بصرہ کے بیت المال کے محافظ مقرر کئے گئے۔ بیاسرہ ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے کے بعد باہمی میل جول سے پیدا ہوئے اس کے بعد میں جزیرۃ العرب جاکر آباد بھی ہوئے۔

احادیث کے مطالعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رسول اکرم صلعم ہندستان کے لوگوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ عہد رسالت میں جنوبی ہند کی بہت سی اشیاء کا استعمال عام تھا ان کے خاص اور عام سے لوگ واقف تھے۔

عہد فاروقی سے حضرت معاویہؓ کے زمانہ تک عرب اور شمالی ہند کے تعلقات معرکہ آرائیوں کے رہے لیکن جنوبی ہند سے تعلقات تجارتی ثقافتی اور دوستانہ رہے۔

اسلام سے پہلے عربوں کے جنوبی ہند میں آکر بسنے کی کوئی شہادت نہیں ملتی البتہ اشاعت اسلام کے بعد عرب ہندوستان آکر وقتاً فوقتاً یہاں سکونت پذیر ہوتے گئے۔ عربوں کے لئے ہجرت اس وقت ناگزیر ہوئی جب کہ خاندان بنی ہاشم کے افراد کے ساتھ اس وقت کے حکمرانوں کا طرز عمل معاندانہ اور مخالفانہ رہنے لگا جنوبی ہند کی حد تک عربوں کی قابل لحاظ ہجرت ۵۰ ہجری سے ۸۰۰ ہجری کے عرصہ میں ہوئی جبکہ اہل نائطہ اپنے عیال و اطفال اور نوکروں کے ساتھ جہازوں پر سوار ہو کر ملیبار آئے اور کوکن میں مقیم ہوئے۔ کچھ اور عرب کیپ کیمرون میں سکونت پذیر ہوئے اور ربسابین کہلائے۔

اہل نائطہ حضرت عبداللہ بن حضرت جعفر طیارؓ کی اولاد سے ہیں۔ یہ فن جہازرانی کے ماہر تھے اور سمندروں میں عربوں کی سیادت ان ہی کے توسط سے قائم ہوئی۔ دیرینہ تجارتی تعلقات کی وجہ سے وہ جنوبی ہند سے اچھی طرح واقف تھے اس لئے انہوں نے یہاں مستقل وطنیت اختیار کی اور یہاں آنے کے بعد تجارت کے علاوہ تبلیغ اسلام کا فرض انجام دیا۔ یہی ہندوستان میں اسلام کے سب سے پہلے داعی اور مبلغ ہیں۔ ملکی سیاست میں یہ زیادہ دخل نہ دیتے تھے۔ حکومت وقت سے اچھے تعلقات قائم کئے ہوئے تھے اور دیسی حکومتوں نے بھی ان کی پذیرائی کی اور ان کو امان دیا۔ بعد میں اہل نائطہ نہ صرف تمام جنوبی ہند میں پھیل گئے بلکہ حیدرآباد، بمبئی اور دیگر اقطاع ہند میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس قوم کے افراد فضائل علمی میں ممتاز اور صاحب تصانیف گذرے ہیں۔ حیدرآباد میں ریاست کے نظم ونسق میں بھی ان کا نمایاں حصہ رہا۔

ڈاکٹر سید محمود الحسینی

ہم با اخلاق کیوں نہیں؟

یہودی، عیسائی اور اسلامی نقطۂ نظر

[یہ ایک سمپوزیم کی روداد کا اردو ترجمہ ہے جو کیمبرج یونیورسٹی (انگلینڈ) میں منعقد ہوا تھا۔ قارئین غور کریں کہ یہودیت اور عیسائیت کے علمبردار کتنے تہی دامن ہیں جب کہ اسلام کا نمائندہ توحید و ایمان و عمل کی دولت سے سرشار نظر آتا ہے]
(مترجم)

مسٹر مائیکل حارث صدر جوئیش سوسائٹی کیمبرج یونیورسٹی نے اس طرح خیالات ظاہر کئے۔

یہودی نقطۂ نظر

ہم اس کی ابتداء ابراہیمؑ سے کرتے ہیں کہ وہی اولین یہودی تھے اور جہاں تک روایات ہیں وہی پہلے آدمی ہیں جنہوں نے خدا کی وحدانیت کا اعلان کیا وہ ایک بت گر کے بیٹے تھے اور اس دور میں بت پرستی عام تھی۔ یہ دیکھ کر وہ پریشان ہوگئے۔ متفکر تھے کہ کیا کیا جائے۔ ایک دن انہوں نے تمام بتوں کو توڑ ڈالا۔ اور ایک بڑے بت کے ہاتھ میں لکڑی تھما دی جب ان کا باپ باہر سے گھر لوٹا تو ابراہم سے پوچھا کہ "یہ سب کیا ہے؟ کیسے ہوا؟"

ابراہم نے کہا کہ "اس بڑے بت نے ایسا کیا ہے"

ان کے باپ نے کہا "یہ تو پتھر کے بنے ہوئے ہیں؟ کیسے کر سکتے ہیں؟"

ابراہم نے کہا "یقیناً یہ کچھ نہیں کر سکتے"

اس طرح ابراہم نے ایک خدا کو تلاش کر لیا اور توحید کا پرچار شروع کر دیا۔ اسحاق اور یعقوب ان کے بیٹے اور پوتے تھے۔ یعقوب کے بیٹے یوسف نے مصر کی راہ لی اور وہاں مصریوں کو قحط سے بچایا۔ اس طرح یعقوب کی پوری نسل مصر آگئی۔ وہاں ایک فرعون آیا جس نے یہودیوں کو غلام بنا لیا۔ موسیٰ مصر میں اٹھے اور اپنی قوم کو صحرائے سینائی میں لے آئے۔

اب میں اس نازک موڑ پر آتا ہوں جو ہمارے مذہب کی اصل اساس ہے کہ کوہ طور پر

کیا قوانین و ہدایات دے گئے تھے۔ یہ کیسے ہی کیا اللہ تعالیٰ نے یہودی قوم کو تمیز دے کے
یہ طرز مختلف، چند دوسرے گروہوں کو دے گئے تھے۔ چنانچہ جب ایک گروہ سے کہا گیا کہ یہ ایک
قانون ہے اس پر عمل کرو تو انہوں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ ان سے کہا گیا کہ "تم کسی کو قتل نہیں کروگے"
چونکہ وہ سب قاتل تھے انہوں نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔

تب دوسرے گروہ سے کہا گیا کہ "تم کسی کا مال نہیں چراؤگے" چونکہ وہ سب چور ڈاکو تھے
انہوں نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔

بالآخر جب یہودیوں سے پوچھا گیا تو انہوں نے پہلے اس پر عمل کرنے کا وعدہ کیا۔ اور یہی
یہودیت کی بنیاد ہے جب کہ عیسائیت پہلے ایمان پر تکیہ کرتی ہے۔ کوہسار طور سینا پر موسیٰ کو پانچ
کتابیں دی گئیں یہ ایک تحریری دستاویز تھی لیکن اس کے علاوہ ایک "زبانی قانون" (Oral Law)
بھی تھا جو اس تحریری دستاویز کی تفصیل و تفہیم تھی چنانچہ یہ ایک واقعی امر ہے کہ ایک تحریری قانون،
زبانی قانون کے بغیر ناقابل افہام و تفہیم رہتا ہے۔ اس کی ایک مثال اس طرح دی جاسکتی ہے کہ
ہم کو "احکامات الٰہیہ" کے ذریعے جانوروں کو اپنے استعمال کے لئے ہلاک کرنے کی اجازت ہے" لیکن
اس سلسلہ میں مزید وضاحت موجود نہیں ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں یہودی قوم میں کئی قسم کی مذہبی
قربانیاں ہیں جو جانوروں کو ہلاک کر کے دی جاتی ہیں ظاہر ہے اس کی تمام تفصیلات زبانی قانون میں موجود ہیں۔

مختصر یہ کہ خدا نے احکامات اور قوانین کا ایک مجموعہ یہودی قوم کو عطا کیا۔ ایسا نہیں کہ
یہودی قوم ایک منتخب شدہ قوم ہے یا سب سے بہتر قوم ہے بلکہ اس لئے کہ اس کے دئے ہوئے قوانین
کو دوسری اقوام کے سامنے نمونہ بنا کر پیش کیا جائے تاکہ وہ خدا اور اس کے احکامات میں پوشیدہ
فلاح و بہبود کو سمجھ سکیں۔

"زبانی قانون" توارث میں سینہ بہ سینہ باپ سے بیٹے تک چلا آرہا ہے۔ چنانچہ اسی
قانون کی پاسداری میں یہودی قوم نے اپنی کھوئی ہوئی سرزمین حاصل کرلی۔

یہ ایک لمبی تاریخ ہے کہ ہیکل سلیمانی کو دو مرتبہ توڑا گیا اور پھر یہودیوں کو بے گھر کیا گیا
چنانچہ یہ مختلف ممالک میں پناہ لینے لگے لیکن جب ربیوں (Rabbis) نے اس قوم کی قیادت
سنبھالی تو قانون کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی کیونکہ یہ لوگ قانون کے ماہر تھے اور اس کی انتہائی معرفت رکھتے تھے
بہت سے ایسے قانون ہیں جن کا استدلال سمجھ میں نہیں آتا مثلاً سور کا گوشت کھانے سے منع کر دیا گیا لیکن
اس کی وجہ نہیں بتلائی گئی چونکہ یہ الٰہی قانون ہے اس لئے اس کی پابندی ضروری ہے۔ اسی طرح تمام

قومیں مشکلات کی لپیٹ میں ہیں۔ پرانے مذہب جو کہ یہودی قوم کو دیئے گئے ہیں۔

عیسائی نقطۂ نظر

(اس کو جان تنسپ نے پیش کیا جو اسٹوڈنٹ کرسچین موومنٹ کے ایک رکن ہیں)

جو بھی نقطۂ نظر ہم پیش کریں گے اس کا سرچشمہ یسوع مسیح کی ذات ہے ہو گا کہ وہ کون تھے؟ اور انہوں نے کیا پیغام دیا؟ کیسے عمل کیا؟ اور ہم اس سے کس حد تک علاقہ رکھتے ہیں۔ مسیحی تصور کے مطابق خدا نے اس دنیا کو پیدا کیا اور مردوں اور عورتوں کو اپنے سانچے میں ڈھال کر اپنا کچھ خصوصیات کے ساتھ اپنی کچھ خصوصیات کے ساتھ اس کرۂ ارض پر بھیج دیا۔ اور یہ آزادی بخشی گئی کہ انسان ایک مقصد کے تحت عمل کرے اور اسی مقصد کے تحت تخلیقی عمل جاری رکھے۔ لیکن لوگوں نے اس آزادی کا غلط مطلب لیا۔ اور اس کا استعمال غلط خطوط پر ہوا اور اپنے مفاد کی خاطر اس کا استعمال کیا گیا اور خدا کے اس محبت کے نظریئے کو مجروح کیا جو اس نے تمام لوگوں کے درمیان ہم آہنگی کے لئے دیا تھا۔ یسوع مسیح خود ایک خدائی قوت ہے جو لوگوں کو برائیوں سے بچانے کے لئے ظہور میں آئی۔ یسوع کے بچانے کی قوت ان کی خدمت میں مضمر ہے۔ انہوں نے پہلے انسانیت کی خدمت کی، اپنے آپ کی مشیت کی تکمیل کی۔ انہوں نے ہمیشہ ایک خدمت گزار کی حیثیت سے کام کیا اور مصیبتوں کو جھیلا اور عام غلام کی طرح موت کو سینے سے لگا لیا۔

عیسائیت کا اخلاقی نقطۂ نظر خدا اور انسان کی خدمت پر مرکوز ہے اور اس کی اصل وہ عہد عتیق ہے جو خدا نے ہمیں عطا کیا ہے۔ لیکن یہ بت پرستی ہو گی اگر ہم یہ تصور کر لیں کہ وہ "مجموعۂ قوانین" اٹل اخلاقی اصول ہیں کیونکہ آج عیسائی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ سب سے مقدس نظام قانون بھی اپنے تئیں تحدیات رکھتا ہے۔

سینٹ پال نے اپنی تنبیہات میں یہ واضح کیا ہے کہ کوئی آدمی قانون کی پابندی کرتے ہوئے اس کے سامنے اپنے آپ کو بے گناہ ثابت نہیں کر سکتا۔ جب تک وہ اپنا خود غرضی کا لبادہ نہ اتار پھینکے"

اس طرح ہمارا بنیادی مسئلہ یعنی خود غرضی کی لعنت سے نجات پانے کے لئے راستہ ڈھونڈنا چاہیئے کیونکہ ہم الٰہی قوانین کے سامنے اپنے آپ کو کمتر تصور کرتے ہیں۔ ہم اپنے میں اتنی سکت نہیں پاتے نہ یہ خود اعتمادی انسان کا مقدر نہیں ہے۔

ہر مذہب سزا و جزا کے ایک نظریئے کے تحت لوگوں کو نیکی کی طرف راغب کرتا ہے اور یہ ہو سکتا ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ اس نظریئے کے تحت نیک کام نہ کرے مسیحی عقیدہ کے مطابق یہ اخلاق

سے ارو بجرا کے نظریے کے تحت پیدا نہیں ہوتے کیونکہ وہ انسان کی کمزوریوں سے واقف ہے۔
عیسائیت کا اصل پیغام یہ ہے کہ انسان یسوع مسیح کی وساطت سے کفارہ پانے کے لئے زندگی
بسر کرے جس میں وہ اپنے آپ کو کھو دیتا ہے اور اس کی یہ سپردگی دوسروں کی خدمت کے لئے ہو۔ اس
عیسائیت اخلاق و تہذیب کے لئے ایک بنیاد مہیا کرتی ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر (اس کو جناب زین العابدین صدر مسلم اسٹوڈنٹس سوسائٹی کیمبرج یونیورسٹی (انگلینڈ) نے پیش کیا ہے)۔

"ایک مسلمان کا جواب یہ ہے کہ انسان کو قانون بنانے کا کوئی اختیار نہیں۔ صرف اللہ
جو اس کائنات کا خالق ہے اس کا اختیار ہے۔ وہی جانتا ہے کہ اس نے یہ کائنات اور مخلوقات کیوں بنائی۔
اسلامی اخلاقی قوانین کسی متقی پرہیزگار آدمی یا حضور اکرمؐ کے وضع کردہ نہیں ہیں چنانچہ جب حضرت
عائشہ صدیقہ رضؓ سے پوچھا گیا کہ "آنحضرت صلعم کے اخلاق کیسے ہیں؟" تو آپ نے جواب دیا کہ
"آپؐ کے اخلاق قرآن ہیں"۔ یعنی آپؐ وحی الٰہی کے عین مطابق عمل فرماتے رہے چنانچہ ہر مسلمان
آپؐ کی اسی سنت پر چلنے کی ہدایت دی گئی۔

اسلام ایک جامع کردار کا مذہب ہے اس طرح وہ جامع نظام حیات پیش کرتا ہے۔
حلال و حرام کا فرق، جائز و ناجائز کی تخصیص اور مکروہ و مستحب کی تمیز یہ سب فروعی ہیں۔ بعض
چیزیں تو ایسی ہیں کہ ان پر حکومت وقت بھی سزا دے سکتی ہے لیکن چند تو ایسے ہیں جو صرف
ضمیر کی آواز پر اس کے سوا بیدار چھوڑ دی گئی ہیں اس طرح اخلاقی نظام کی پابندی اللہ کی تابعداری اور عبا
اللہ کی عبادت ہمارے اس ایمان کا ایک منطقی نتیجہ ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے
بلکہ یہ مقصد تخلیق کی تکمیل ہے جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے:۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝

(ترجمہ) نہیں پیدا کیا جن اور انسان کو مگر عبادت کے لئے)

اسلام میں تو ہر وہ عمل عبادت ہے جو خدا کے اوامر کے ہدایات کے بموجب کیا گیا
اگر انسان کی نیت اچھی ہو تو اس کا عمل بھی اچھا ہوگا۔ اس لئے ہم کو ہدایت دی گئی ہے کہ ہم اپنے کام
کی ابتداء اسی خدائے بزرگ و برتر کے نام سے شروع کریں۔

خدا پر توکل و انحصار سے انکساری پیدا ہوتی ہے جو اس کو غرور اور خود غرضی کے جذبا
سے بچاتی ہے۔

تمام بنیادی نیکیاں جیسے سچائی، عدل، رحم، سادگی، محبت اور انکساری جنہیں نورِ الٰہی کی ہدایت کا پرتو ہیں اور یہی انوارِ الٰہیہ سے اخذِ نور کرنے کا پہلا زینہ ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ؕ

بعض لوگ یہ بحث کرتے ہیں کہ اسلام میں بہت سے ایسے مخصوص قوانین ہیں جو انسانی زندگی کو بے کیف بنا دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ کوئی انسانی قانون، انسانی مسرت اور غم کا کامل حل پیش نہیں کر سکتا۔ اس طرح ایک مذہبی بااصول عملی زندگی ہی ہم کو حقیقی مسرتوں سے ہمکنار کر سکتی ہے۔

آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ "اگر کوئی مسلمان اپنے اللہ سے محبت، رسولؐ سے محبت اور اپنے بھائیوں سے محبت قائم رکھے۔ اور یہ محبت اگر گہری ہوگی تو وہ تقویٰ کی حلاوت کو محسوس کرے گا۔"

اسلام ایک عملی مذہب ہے اور اس اعتبار سے وہ انسانی کمزوریوں کو پیش نظر رکھنے کی رعایت بھی دیتا ہے۔

"اگر آدم کے بیٹوں کو دو وادی بھر سونا دے دیا جائے تو وہ تیسری کی خواہش کریں گے"

بچوں کی محبت، دولت کی ضرورت، جنسی خواہش اور دوسری خواہشیں بذاتِ خود گناہ نہیں لیکن ان کی تکمیل اگر مقرر کردہ اصولوں اور ضوابط سے ہٹ کر کی جائے تو گناہ متصور ہوگی۔

اسلام کوئی رہبانیت کا نظریہ نہیں کہ جو دنیاوی آسائش کو ترک کرنے کا مشورہ دے۔ قرآن کہتا ہے:

وَابْتَغِ فِیْمَآ اٰتٰکَ اللّٰہُ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَکَ مِنَ الدُّنْیَا وَاَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ ۔ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ ؕ

(ترجمہ: تجھ کو خدا نے جتنا دے رکھا ہے اس میں عالمِ آخرت کی بھی جستجو کر۔ اور دنیا سے اپنا حصہ مت بھول اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی بندوں کے ساتھ) احسان کیا کر۔ دنیا میں فساد مت پھیلا" (القصص ۷۷)

اسلام کے اصول سوسائٹی کو بہتر بنانے کے لئے ہیں تاکہ انسان کی زندگی صالح اور خوبصورت بن جائے۔ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور اس کو انسان کی بندگی اس کی عظمت کے لئے ضروری نہیں۔ یہ قرآن نے شراب پر پابندی کے لئے کہا۔

"وہ مسکرات اور جوا کے متعلق پوچھتے ہیں، تو کہہ دیجئے کہ ان دونوں میں بہت گناہ ہے لیکن لوگوں کے لئے بہت کم فائدہ لیکن ان کا گناہ اس افادیت سے بدتر ہے"

نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج میں سماجی فائدے بہت ہیں۔ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا

زیادہ نیکیاں رکھتی ہے۔ یہ لوگوں کو برائی اور بے کاموں سے روکتی ہے۔ زکوٰۃ صاحب استطاعت کی
دولت کا وہ حصہ ہے جو سالانہ غرباء و مساکین کی امداد کے لئے نکالا جاتا ہے۔ روزہ ہم کو
غریبوں کی بھوک کا احساس دلاتا ہے۔ حج مختلف نسلوں، قوموں، زبانوں اور علاقوں کے مسلمانوں
کے درمیان مرکزی اجتماعیت کا آئینہ دار ہے۔ اسی طرح فرد اور سوسائٹی دونوں کو اسلامی اخلاق نظام
کے تحت ایک دوسرے پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اسلام شخص ترغیب و تحریص جو نیکیوں کی صورت میں
مہیا کرتا ہے۔ انسانی فطرت کے لحاظ سے ایک عظیم نظام بہبودی ہے۔ چنانچہ سزا و جزا کی جزوی
طور پر دنیوی زندگی میں اور اس کی تکمیل آخرت میں کر دی جاتی ہے۔ آخرت کا تصور انسان کو اپنے محاسبہ
کی طرف مائل کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ خدا رحمٰن و رحیم ہے لیکن وہ عادل بھی ہے اور منصف بھی۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝

(ترجمہ) پس جو شخص (دنیا میں) ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ (وہاں) اس کو دیکھ لے گا
اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔ (الزلزال: ۷، ۸)

اس طرح اسلام جو نظام اخلاق پیش کرتا ہے وہ اس کے عقیدہ کے مضمرات سے عبارت ہے
جہاں ایک خدا کی بندگی ہے۔ اور اس کے بھیجے ہوئے احکامات و ہدایات کی عملی تفسیر اس کے
رسول برحق ﷺ کی اسوہ حسنہ کی صورت میں موجود ہے۔ اور انسانی برادری کی خدمت کا جذبہ ہے
جو ایک عقلی نظام حیات بن گیا ہے۔

□□

اسلام میں دو خاص امتیازی نعمتیں "مساوات" اور "اخوت" ہیں جو دیگر ادیان میں نہیں
یوں کہنے کو دوسرے لوگ یہ الفاظ بولتے ہیں لیکن معنی کا پتہ نہیں۔ ہمارے پاس یہ نعمت عام ہے
کسی مسجد میں جائیے ایک غریب سے غریب مسلمان کو حق حاصل ہے کہ امیر کے برابر کھڑا ہو کر نماز
پڑھے، معانقہ کرے، ساتھ بیٹھ کر کھائے۔ اس کے برخلاف عیسائی ممالک میں عبادات کے لئے
گوروں کا چرچ الگ، کالوں کا الگ بلکہ ہوٹل مدرسے تک الگ۔ اسلام کے احکام کے مطابق
بانٹ کر کھاؤ تو کمیونزم، بالشویزم پیدا نہیں ہو سکتے۔ اپنی تعلیمات اخوت و مساوات
وسیع نظام وراثت اور زکوٰۃ، صدقات و خیرات کے ذریعہ اسلام ہی سب مصیبتوں کا حل ہے

خلیل شارق نیازی

گفتگو کی تربیت

اظہار خیال انسان کا فطری خاصہ ہے۔ گفتگو اظہار خیال کا ایک نہایت عمدہ اور کثیر الاستعمال ذریعہ ہے۔ یہ محض چند ہی اشخاص کا امتیاز نہیں ہو سکتا۔ کوئی اس وصف سے یہ کہہ کر کہ ؏

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

اپنے آپ کو محروم سمجھے تو یہ سخت غلط فہمی ہو گی۔ شائستہ گفتگو اور شستہ و رفتہ زبان، تربیت کتاب، صحبت اور ماحول سے آتی ہے۔ یہ مشکل ہے مگر محال نہیں۔ اس کو سیکھنے اور برتنے سے بھی اگر نہیں ہے

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ

گفتگو زندگی کی نہایت درجہ اہم ضرورت ہے۔ موجودہ زمانہ میں سیر و سفر کی سہولتیں، ٹیلیفون مائک کا رواج، ذاتی ملاقاتوں میں تبادلۂ خیال اور انٹرویو کے پیش نظر "روزمرہ" کو بہ نسبت تحریری زبان کے بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ علاوہ ازیں روزمرہ کو فنکارانہ اظہار خیال یعنی انشاء ادب اور شعر میں بھی دخل ہے۔ ڈرامے اور تمثیل میں مکالمے ہوتے ہیں۔ ان میں خوش لہجگی اور خوش بیانی ایک ادبی و فنی ضرورت ہو گئی ہے۔ ذہنی تشکیل اور جذبات کی نشو و نما میں بھی اظہار خیال کی صلاحیت کا حصہ کافی ہے لیکن مشاہدہ یہ ہے کہ بچے تو بچے ہی بوڑھے بھی اکثر گفتگو کرتے وقت ہکلاتے اور تتلاتے نظر آتے ہیں ان پڑھ تو ان پڑھ ہیں پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ بھی بات کرتے ہوئے جھجکتے ہیں، چبا چبا کر بولتے ہیں اور ذخیرہ الفاظ کے لحاظ سے اپنے حافظے کی مفلسی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان میں بھی لکھنؤ کے نواب ثما کی طرح اپنی اپنا ہاتھ پکڑے ہوئے ہر سوال کا خود جواب دینے کے بجائے کہتے ہیں "ٹوٹی ٹنڈے" اور اپنی تتلاہٹ چھپا نہیں پاتے۔ کتنے پڑھے لکھے ایسے ہیں کہ ان سے پوچھیے کہ آپ کی بجاوج کے آپ کون ہوئے؟ تو کہیں گے کون ہوئے؟ ہم رشتہ میں ان کے نند ہیں، مبہم اور ناقص تصورات، لفظوں کا بے موقع استعمال اور غلط

سابق پرنسپل گورنمنٹ جونیئر کالج آف ایجوکیشن بالاپور

غلط سلیقۂ زبان، غلط تلفظ، اثر تاثیر کی کمی یہ تمام خرابیاں لوگوں کی گفتگو میں پائی جاتی ہیں۔ اور اکثر لوگ مجلسوں اور دوستوں میں ایسے چپ بیٹھے ہیں گویا ان کے منہ میں زبان نہیں۔ بات یہ ہے کہ گفتگو کی تعلیم پر بچپن سے توجہ نہیں کی جاتی اور تربیت نہیں دی جاتی۔ بچوں کا بڑوں کے سامنے زبان کھولنا بے ادبی سمجھا جاتا ہے اور مدرسوں میں پڑھنے اور لکھنے کا کام ہے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ بات کرنا سیکھیں۔ تحریری امتحانات کے لئے طلباء کو تیار کرتے ہیں اور افسران معائنہ بھی تحریری قابلیت جانچتے ہیں۔ کالجوں میں بھی پرچے سیاہ کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے کیونکہ اس پر اچھے نتائج کا انحصار ہے۔ گفتگو کا سلیقہ اور تقریر کا ملکہ ثانوی چیزیں ہو گئی ہیں اور چند خاص طلباء کا امتیاز۔ اور وہ بھی ہنگامی ادبی جلسوں تک محدود ہیں۔ لباس فرنگ میں ملبوس کتنے فارغ التحصیل طلباء علوم وفنون کے مہر شدہ لفافے معلوم ہوتے ہیں۔ جن سے مل کر بسا اوقات حسرت رہ جاتی ہے۔ ع

بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

بنا بریں گفتگو کی تعلیم نہایت ضروری ہے۔ آدمی عمر بھر بولنے چالنے کی مشق کرتے رہنے پر مجبور ہے، چپ سادھ کر بیٹھے تو کیسے کام چلے — لیکن یہ مسئلہ کہ گفتگو کا سلیقہ کیونکر آئے بہت پیچیدہ بھی ہے ؎

یوں تو کہنے کو بہت آسان ہے ـــــ بات کرنا ہے بہت دشوار شاد

گفتگو کی تربیت کب ہو، کس طریقے سے ہو، یہ سوچنے سمجھنے کی باتیں ہیں۔ ان کا تعلق گھر سے، تربیت گاہ سے اور مدرسوں سے ہے — بولنے کی تعلیم گہوارے ہی سے شروع ہوتی ہے لیکن مدرسے میں یہ کام صحیح بنیادوں پر شروع کیا جانا چاہئے۔ مدرسے کی تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ مستقبل کا شہری ہر لحاظ سے مکمل ہو — وہ گفتگو کا سلیقہ رکھتا ہو، اپنے خیالات صحیح روزمرہ میں ادا کر سکے، اپنے الفاظ کا انتخاب کر سکے اور ان کے صحیح استعمال سے اپنی بات اپنے ساتھیوں کو اچھی طرح سمجھا سکے۔ اور زبان اور بیان کا حسن بھی قائم رکھ سکے، اس کے پاس خیالات ہوں، ذخیرہ الفاظ ہو، الفاظ کے استعمال کا سلیقہ ہو اور نہایت روانی سے صحیح لب ولہجہ میں بات کر سکے۔ اور سب سے زیادہ ضروری یہ امر ہے کہ یہ سب کچھ فطری طور پر ہو۔ اس میں تکلف اور تصنع نہ ہو۔ یہ اس کی ذہنی وجذباتی تربیت کے لئے بھی نہایت ضروری ہے۔

جب بچہ دنیا میں سانس لیتا ہے تو سب سے پہلے اپنی آواز نکالتا ہے۔ بولنا تو بعد میں آتے آتے آتا ہے۔ سننے اور دیکھنے کی نشو ونما کے ساتھ اپنے آس پاس کے لوگوں کی آوازوں کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے جنہیں وہ سنتا ہے۔ تو بولنے میں جن اعضاء اور اعصاب کا کام پڑتا ہے ان کی مدد سے وہ ان آوازوں کو

ہوتا ہے اور اس میں زبان، حلق اور ہونٹوں کی ان حرکات کی مشق ہوتی ہے جن سے بولنا
آ سکے۔ یہ حرکات اکثر خود ساختہ و خود پرداختہ ہوتی ہیں۔ کچھ آوازوں کی نقل سے اور کچھ مشابہت سے۔ غرض
بولنے کے سارے تفصیلی عمل پر غور و فکر سے قطع نظر ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم گفتگو سکھانے کے کام کی
بنا فطری نشوونما پر رکھیں تاکہ تربیت یقینی، قطعی اور صحیح ہو۔ اس تربیت کو بچوں کی دلچسپیاں اور فطری
رجحانات پر مبنی ہونا چاہیئے۔ بچے کو دلچسپی نہ ہوئی تو سارا کیا دھرا اکارت جائے گا اور بچہ کاہل، سست
و بے جان رہے گا۔ گفتگو فطری اور تدریجی نہ ہو، اور اعضائے گفتگو کی حرکات موافق نہ ہوں تو بچوں کی گفتگو
غلط سلط اور مصنوعی ہوگی۔ گھر پر مائیں لاپرواہ ہوتی ہیں اس لئے مدرسے میں مدرسین بہت زیادہ محتاط رہیں
گفتگو اور بول چال کا لب و لہجہ ابتدا ہی میں سکھا دینا چاہیئے۔ وہ صحیح اور بامحاورہ بولا کریں۔ اس سے
گفتگو کی صحیح عادت پڑے گی مشکل ہے کیونکہ اس عمر میں جو عادت پڑ گئی اسے چھوڑ کر دوسری ڈالنا دوبھر ہے

اس عام تبصرے کے بعد عملی تصویر پیش ہونی چاہیئے۔ بولنا سیکھنے میں مبتدی کو سب سے پہلے
قل سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہ بات کچھ اردو کے مدرسین کی بول چال اور فصاحت پر منحصر ہے۔ ننھے بچے کچھ
سمجھ تو نہیں سکتے جب ماں یا انا یا بہن یا بھائی بچے سے کچھ بولتے ہیں تو دیکھنا چاہیئے کہ کتنا واضح اور صاف
لتے ہیں۔ بعض اوقات لوری وغیرہ گیت گہوارے میں سنائے جاتے ہیں، اس کا دل بہلاوا ہی ہوتے ہیں
ر ان میں کچھ کام کے الفاظ بھی ہوتے ہیں۔ جو بچہ ۱۸ مہینے کی عمر کا ہو بول بھی لیتا ہے۔ ڈھائی تین سال کی عمر
ہوتا بچہ دو تین لفظ بولنے کے قابل ہو جاتا ہے اور اکثر ان کے معنی سمجھ کر بولتا ہے۔ وہ بعض وقت ایک ہی
کو کئی معنوں میں بولتا ہے۔ مم مم سے اس کا مطلب ہوتا ہے مجھے پانی دو۔

۵ سال کی عمر میں بچہ مدرسہ آتا ہے تو اسے کافی بولنا آ جاتا ہے۔ وہ اب گیت گا سکتا ہے
ی سن سکتا ہے اور دو چار جملے دہرا سکتا ہے۔ اس زمانہ میں بھی مدرس کا لہجہ اور آواز بہ نسبت لفظوں
ان کے معنوں کے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ یہ دیکھئے کہ لفظ کس طرح زبان سے ادا ہو سکتے ہیں۔ لب و لہجہ
نا خوش گوار، مترنم اور معنی خیز ہے۔ طلبا خود مدرس کی آواز میں آواز ملانا چاہیں۔ اردو میں نرسری
ت یا گہوارے کے گیت بہت کم ہیں۔ چند عام اور رائج گیت اس عمر میں ان کے لئے مفید ہو سکتے ہیں۔ ان
ن میں شاعری کا لطف نہ ڈھونڈئیے۔ ان کے ترنم کی جھنکار بچوں کے کانوں میں پڑے اور چند الفاظ
زبانوں پر چڑھ جائیں، بس یہی کافی ہے۔ مثلاً ایک گیت ہے :-

میرا طوطا آوے گا — ٹیں ٹیں کرتا آوے گا
اچھا دانہ کھاوے گا — اچھا گیت سناوے گا

ابتدائی [illegible]
میں تصورات کو وہ پیش کریں طلباء ان سے مانوس ہوں۔ چھوٹے بچے لگاتے ہیں انجن موٹر کے کھیل کے فقرے دہرا کر استعمال کرتے ہیں۔ کھلونوں اور نمونوں کی صورت میں سبھی وہ ان کو بخوبی جانتے ہیں۔ ان کے ساتھ ان سے شناخت کر لیتے ہیں کیونکہ ان کے ساتھ چند تلازمات شامل ہوتے ہیں۔ مواد فراہم کرنے میں یہ خیال رکھا جائے کہ ذخیرہ الفاظ محدود ہو اور اس میں بتدریج اضافہ کیا جائے۔ ابتدا میں کہانی ان کھیلوں کی توسیع کی شکل میں ہونی چاہیئے۔ جو بچے روزانہ اپنے درجہ میں کھیلتے ہیں ان سے ابتداء کی جائے وہ کھیل ختم کرنے کے بعد کھلونے اور سامان ایک طرف رکھ دیا کریں۔ ان کھیلوں اور چیزوں پر نام کی تختیاں لگی ہونی چاہئیں تاکہ وہ ان نشانات سے مانوس ہو جائیں اور باقاعدہ پڑھنا شروع کرنے سے پہلے ان الفاظ کو پہچاننے لگیں۔ مثلاً ایک ڈبے پر لکھا ہو "یہ اینٹیں رکھنے کا ڈبہ ہے" ریت اس برش سے صاف کرو۔ چند روز نظر کے سامنے رہنے کے بعد اگر بے موقع اور بے جگہ جو چیز رکھ دی گئی تو یقیناً بعض بچے اس پر نکتہ چینی کرنے کے قابل ہوں گے اور صحیح مقام پر رکھ سکیں گے۔

کہانی میں جن چیزوں کا ذکر آیا ہے ان سے بچوں کو بھی دلچسپی ہوتی ہے۔ حامد اور محمود کی کہانی سننے کے بعد بچے لکڑی کے ٹکڑوں سے ایک مکان تعمیر کریں گے۔ یا ان کے باغ کی تصویر بنائیں گے اور اس میں رنگ بھریں گے اور حامد و محمود کے گھر کے سامنے رکھ دیں گے۔ یا ممکن ہے وہ ان کا سوانگ بھریں کہ حامد و محمود وہ خود ہیں۔ اور گھر کے کام کاج اور گھر کی دیکھ بھال کا کھیل کھیلنا چاہیں۔ ان کاموں کے دوران میں الفاظ اور جملے پڑھا دینا مدرس کی ہوشیاری پر منحصر ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ اور واقعات اپنے کھیل میں ایجاد کر جائیں۔ جو کہانی کے دوسرے حصے میں مواد کا کام دیں۔ حامد و محمود اور ان کے والدین کی تصویریں کمرے میں روزانہ نظر کے سامنے رہتے رہتے مانوس ہو گئی ہوں تو کہانی کی مزید قسط شروع کی جا سکتی ہے۔ چاہے بچے خود کہانی بنالیں یا ان کے استاد کہانی کو آگے بڑھائیں۔ نئے نئے لفظ اور جملے پڑھانا اور باتیں کہلوانا اصل مقصد ہے جو استاد کے ذہن میں ہر وقت رہنا چاہیئے۔ کہانی کی تمثیل کرائی جا سکتی ہے۔ بچے اداکار بنیں اور کہانی کے مطابق کردار ادا کریں اور مکالمہ کے ذریعہ بات چیت کرنے کی مشق کریں۔ روزمرہ کے معمول میں بھی کئی مواقع مدرس کو ایسے مل سکتے ہیں جب گفتگو کے لئے بچوں کو آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ان سے کہا جائے کہ آج شام کو چوہے اور بلی کا کھیل کھیلیں گے، چوہے کیا کہتے ہیں اور بلی کیا کہتی ہے۔ پھر چوہے اور بلی کا کھیل کرایا جائے اور ان کا مکالمہ کہلوایا جاتا ہے۔ دستکاری اور نقاشی کی ساعتوں میں تصویریں تراشوائی جائیں تو مناظر پر گفتگو کریں مثلاً سڑک کی تصویروں پر گفتگو ہو۔ ساتھ ہی راستہ چلنے

گفتگو میں بات سمجھنے میں مشکل پیش نہ آئے۔ بچے اداکاری کریں، چلانے کی نقل کریں اور ایک بچہ پولیس سپاہی بن کر ٹریفک چلانے کی ہدایتیں دے۔ اس طرح بچے گفتگو کی ابتدائی منزلیں طے کرکے عبارت خوانی تک پہنچ جائیں گے۔

تجربہ اور تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ جو بچے چھ سال کی عمر تک پڑھنے میں سست رہتے ہیں وہ سات سال کی عمر میں اس طریقے سے اچھا بولنے اور پڑھنے لگتے ہیں۔ انہیں پرانے طریقہ تعلیم کے ستم زدہ بچوں کی طرح پانچ سال کی عمر میں سے ہجوں کی مشق نہیں کرنی پڑتی۔ مشہور کہانیوں کے کردار اور ان کی تصویریں یا کھیلوں کو حقیقت کا رنگ دیتی رہتی ہیں۔ ہر جملے عبارت خوانی کی تمہید کے طور پر بتائے جاتے ہیں کہ ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوتا جائے۔ سست لڑکوں کو خواہ مخواہ تیز چلانے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ انہیں لگائے رکھیں تاکہ وہ ہنستے کھیلتے ان کٹھن منازل سے گزر جائیں۔ بچوں کی دلچسپی اور کہانی کا راز یہ ہے کہ کہانی خود بخود فطری طور پر بنتی جائے۔ پہلے سے طے کیا ہوا پلاٹ اکثر ناکام ہو جاتا ہے۔ جب گفتگو میں اچھی طرح طاق ہو جائیں تو پھر کتاب شروع کی جائے۔ کتاب کی تصویروں پر بچوں سے باتیں کی جائیں اور ان باتوں میں کتابی جملے اور لفظ استعمال کئے جائیں۔ کہانی سننے کا طریقہ بھی رفتہ رفتہ آتا ہے۔ بچے بہت تھوڑی دیر تک کہانی سن سکتے ہیں اور انہیں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے دلچسپی ہوتی ہے جن میں واقعات اور کردار ان کی معلومات کے مطابق ہوں۔ خود انہیں کے درجہ کے دوسرے بچوں کی زندگی کے حالات کی اچھی کہانیاں بن سکتی ہیں۔ صبح سویرے جاگنا، اسکول جانا، سیر کرنا، کھلونے اور پالتو جانوروں کے کھیل۔ گھر کے کام کاج کر دینا، ریت اور گھروندوں میں کھیلنا۔ تقریبوں میں اور شادی بیاہوں میں جوش و خروش سے شرکت کرنا۔ بچوں کی کہانیوں میں اس طرح کی سادہ گھریلو باتیں ضروری ہیں۔ کہانی میں کسی فقرے کا بار بار آنا بچوں کو اچھا لگتا ہے جیسے بندر اور نائی کی کہانی یا چل رے مٹکے ٹمک ٹمک کی کہانی میں۔ ایسی کہانیاں ادبی ذوق پیدا کرنے کا سبب ہونگی۔ بعد میں زیادہ خیالی یا داستانی کہانیاں سنائی جا سکتی ہیں۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ کہانی میں دلچسپی اور توجہ اور آواز کا

اکثر گیت یا کہانی کے دلچسپ حصے اور مقفیٰ عبارت بچوں کے حافظے اور نقل کے رجحان کو متحرک کر دیتے ہیں اور وہ غیر ارادی طور پر تمثیلی حرکت کرنے لگتے ہیں جیسے لکڑی کے گھوڑے کا گیت پڑھتے ہوئے جب کہتا ہے۔ ؎

بابا نے ہم کو یہ لکڑی کا گھوڑا
سر اسر، سر اسر کا تیز گھوڑا

تا سمیلہ کا کر دار ادا کرنے لگتا ہے۔ شہباز کی نظم "سائیکل" یا اسمٰعیل میرٹھی کی نظم "ریل گاڑی"

"چیونٹی کا ظلم" "بیر بہوٹی" یا "گائے اور بکری" ایسی ہی نظمیں ہیں جو بچوں کو تمثیل کے لئے آمادہ کر لیتی ہیں خصوصاً اس وجہ سے کہ ان میں سوال جواب ہیں یا مکالمہ ہے۔ تمثیل بچوں میں خود اعتمادی، [illegible] اشتراک عمل اور شائستہ گفتگو سکھانے کا نہایت عمدہ طریقہ ہے۔ گفتگو کا فطری انداز، صاف صاف 'زبان بولنے' کی تعلیم ابتدائی مدارس کے درجات سے شروع کر دی جائے اور صحیح ادبی ذوق کی بنا ڈالی جائے تو آئندہ تعلیم کی اصل منازل میں بڑی سہولت ہوگی

بروقت اور حسب موقع گفتگو یا چھوٹی چھوٹی تقریریں فی البدیہہ بچوں سے کروانا چاہئے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنا چاہئے۔ ہر جماعت میں اس قسم کے تبادلہ خیال کے لئے بھی کچھ ساعتیں مقرر ہوں جن میں سات یا آٹھ سال کی عمر کے طلباء کو بھی کسی چیز کے مقابلہ و مشابہت، پسند و ناپسند پر باہم اظہار خیال کا موقعہ دیا جائے: اخبار کی ساعت میں دلچسپ خبریں یا اپنے محلہ کی گھر کی اور آس پاس کی ایک دوسرے کو سنائیں۔ ان پر تبصرہ ہو، کوئی سفر کے حالات سنائیں، کوئی تفریح کی روداد۔ بعض بچے اپنے پالتو جانوروں کے متعلق گفتگو کریں یا اسی قسم کے اور بہت سے مشاہدے ہو سکتے ہیں۔ کھیلوں کا عنوان بھی کافی دلچسپ ہوتا ہے۔ اس گفتگو کے دوران بھی بچوں کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کرنے اور ان کا حافظہ تازہ کرنے کی کوشش کرتا رہے گا لیکن یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ بچوں کی گفتگو روانی کے ساتھ جاری رہے۔ اور انہیں اطمینان سے بولنے دیا جائے بیچ میں روک ٹوک نہ ہو۔ یہ وقت اصلاح اور نکتہ چینی کا نہیں ہوتا۔ ان کی خامیوں کو اپنے پاس لکھ رکھے اور آئندہ کسی وقت میں ان کی اصلاح کی جائے۔ بچوں کی زندگی محدود ہوتی ہے۔ ممکن ہے بعض وقت انہیں گفتگو کا کوئی عنوان نہ مل پائے ایسے موقعہ پر گفتگو کے کھیل کھلائے جائیں۔ مثلاً انگشتی میاں کا قصہ بطور تمثیل بچے کھیلیں یا "بوجھو کیا چیز ہے" یا امیر خسرو کی پہیلی "بوجھو بتاؤ یہ پھول کیسا ہے" یا مکالمے کرائے جائیں۔ بازار جانے اور دوکاندار سے سودا خریدنے کا کھیل بھی بچوں کو بہت پسند آتا ہے۔ اس میں دوکاندار اور گاہک کے کردار خاص ہوتے ہیں، پھر چیزوں کے نام، نئی نئی چیزیں حافظہ پر زور دے کر یاد کی جاتی ہیں۔ یہاں بچوں کا ذہن خوب اختراعیں کرتا ہے۔ اسی طرح تار لینے دینے کا کھیل یا ٹیلیفون کے ذریعہ بات چیت کا کھیل بھی بہت مفید ہوتا ہے۔ بچے من مانے پیامات لیتے دیتے ہیں۔ تار کے بجائے دھاگے اور دیے کے ڈبے سے ٹیلیفون بنا لیا جاتا ہے۔ پلاسٹک کا ٹیلیفون بازار سے لے آتے ہیں تاکہ کھیل میں حقیقت کی جھلک آ جائے۔ لیکن بڑی جماعتوں میں یہ افسوس نہیں چلتا طلباء کے لئے کہانیوں کے بجائے افسانے اور واقعات مناسب ہیں جن کو ایک بار سننے کے بعد اجمالی طور پر دہرائیں یا چند طلباء مل کر واقعات کے مختلف حصے دہرائیں۔ خاص طور سے جب طلباء طریق قصہ بیان کر چکیں اتنی مہارت آ جانا مشق تخیل بروقت نہ کر سکیں

بستر میں بچے ایک سال کی عمر میں لیٹے لیٹے اپنے ہاتھ پیر چلا کر کھیلنے کی کوشش ہوگی۔ چھ سات سال کے بچے اکثر تعلیم
ہے اور تنگ سے تنگ حلقے میں خود بھی بڑی دلچسپی لیتے ہیں اس سے مشکل باتیں سمجھنے اور سمجھانے میں مدد ملتی

تمثیلی مکالمے اور ڈرامے کی ابتداء نقل سے ہوتی ہے۔ بچہ کسی کو مسکراتا دیکھ کر مسکراتا ہے
جواباً سر کو جنبش دیتا ہے یا ہاتھ ہلاتا ہے۔ اس کے بعد وہ آوازوں کی نقل اتارتا ہے اور جب عضلات
پر اپنے آپ پر زیادہ قابو حاصل کر لیتا ہے تو زمین پر رینگتا ہے کسی پالتو بلی یا کتے کی مجسم نقل بن جاتا ہے
یہاں تک اس سے بن پڑتا ہے اس کی آوازیں بناتا ہے۔ اور کسی کونے یا چارپائی یا کرسی کو اس کا گھر تصور
کرتا ہے۔ بچے کی اصل تمنا یہ ہوتی ہے کہ آزمائے، تجربہ کرے، ہوشیاری سیکھے۔ اس کا سوچنا تمام تر
"یا کرنا ہی ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بچے کی یہ تمام تمثیلی حرکات اس لئے ہوا کرتی ہوں کہ وہ اس چیز کو
اس شخص کو اچھی طرح سمجھ سکے جس کی وہ نقل اتارتا ہے۔

دیدن ہر چیز را شرط است ایں

یہ دریافت کرنے کے لئے کہ اور لوگ کیسے ہیں اور کس طرح سوچتے ہیں اور کیا محسوس کرتے ہیں
بہت عمدہ طریقہ یہ ہے کہ ان کے کردار کی نقالی کی جائے اور بچوں کا رجحان غالباً یہی ہوتا ہے کہ وہ اوروں
کی زندگیوں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار تمثیلوں اور کھیلوں کے ذریعہ کرتا ہے، یہ کرنا اور ہونا،
تنہائی میں ہوتا ہے کیونکہ بچہ خود اپنی نظر میں ہر چیز کا مرکز ہوتا ہے اور دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر
کا رجحان اس سے بتدریج ظاہر ہوتا ہے۔

نشوونما کی ایک منزل وہ آئے گی کہ بچہ صرف کمرے کو صاف کرنے پر قانع ہوگا۔ ریت اور
مٹی کے قلعے بنانے میں خوش رہے گا، یا رنگوں کے نمونے ترتیب دے گا۔ غرض وہ اس طرح کرتے ہوئے
ایک عجیب اطمینان محسوس کرے گا۔ اس کے بعد وہ کوٹ اور ہیٹ یا شیروانی وغیرہ پہن کر کچھ ہو جانے
کا لطف اٹھائے گا۔ میں ابا ہوں، میں پولیس کا سپاہی ہوں، میں صاحب ہوں، پھر درجہ بدرجہ وہ
اپنی شخصیت کو مربوط کر دے گا۔ اگر اس کی ابتداء اسکول یا دکان جیسی قسم کے کھیلوں سے ہوتی ہے
تو اس تمثیلی کھیل میں لفظ اور جملے شامل ہوتے جاتے ہیں اور اکثر حیرت انگیز طور پر نہایت وسیع ذخیرہ
الفاظ کے ساتھ استعمال کرنے لگے گا۔

تقریباً ۵-۱۰ سال کی عمر تک بچہ اس قسم کی اداکاری یا کردار نمائی میں طاق ہو جاتا ہے لیکن
دوسروں کے ساتھ مل کر اپنا کردار ادا کرنا اسے اکثر سات آٹھ برس میں آتا ہے اور اس کا بھی ہوتا
ہے کہ وہ تمثیل کر سکے۔

میری بکریا آئے گی　　میری گائے آئے گی
اچھا چارہ کھاوے گی　　اچھا دودھ پلاوے گی

یا گیت جو بچے اکثر گاتے ہیں۔

کالے بادل گھور گھور　　مینہ برساؤ زور زور

یا چندا ماموں کے متعلق جو گیت ہیں۔

چندا ماموں دور کے　　پوڑے پکائے بور کے
یا — چاند ماموں گورے　　دودھ کے کٹورے

ایک اور گیت کے بول ہیں۔

باجا باجے تن تن تن　　سننے والے سن سن سن
یا — سننے والے سن سن سن　　روپیہ چھنکے چھن چھن چھن

بچوں کے لکھنا سیکھتے وقت مندرجہ ذیل گیت لکھوائیے، بولتے جائیں لکھتے جائیں۔

بادل بادل آجا　　اپنا پانی لے جا　　میری سیاہی دے جا

ایک اور گیت ہے جو اکثر اسکولوں میں بچوں کی زبانی سنا جاتا ہے۔

تختی پہ تختی تختی پہ دانہ　　کل کا چھٹی پرسوں آنا

گیتوں میں کہانی بھی سناتے ہیں اور کہانی ایسی ہوتی ہے جو بچوں کو پسند آتی ہے۔ وہ اسے پڑھیں بھی، اس کی تمثیل بھی کریں۔ چند لڑکے پڑھیں باقی سنیں۔ رسالہ "آپا" میں ایسی کہانی چھپی

زید و زمانی جھرنے کے اوپر　　گئے جو بھرنے پانی
زید گرا اور پھوٹ گیا سر　　پیچھے لڑھکتی آئی زمانی
زید اٹھا اور بھاگا اٹھ کر　　بھاگا جیسے آندھی
ماں نے اسے بستر پہ لٹا کر　　سر میں پٹی باندھی

اگر مدرس کو روانی کا احساس ہے اور لہجے کا اتار چڑھاؤ سمجھتا ہو تو بچے اس کے ایک ایک لفظ بجائے فقرے کے فقرے دہرانے لگیں۔ گفتگو کی اکائی فقرہ ہونا چاہیئے نہ کہ لفظ۔ اس منزل میں مدرس کی ذمہ داری یہی ہے۔ اس کا لب و لہجہ صحیح ہونا چاہیئے۔ گفتگو آپ اپنا مقصد نہیں ہے بلکہ شہری زندگی میں اور خوش آئند اظہار خیال کی صلاحیت پیدا کرنا مقصود ہے۔ یہ شخصیت کی تعمیر کا حصہ ہے اور دوسری کئی صلاحیتیں بھی اس سے وابستہ ہیں۔ گفتگو کے ذریعہ توجہ، ذہانت، صحت نفس

مختلف حرکات معینات کی تربیت میں بہت مدد ملتی ہے گیت سنے جاتے ہیں اور اس کی تمثیل کر سکتے ہیں جس سے جسمانی تربیت سے انضباط پیدا کر سکتا ہے۔ اور نشست و برخاست، جسمانی توازن اور چستی و چالاکی کی تربیت دے سکتا ہے۔ سانس لینے اور آواز نکالنے اور حلق و زبان کو حرکت دینے کی مشق کرائی جاتی ہے گیت، قافیہ بازی اور تک بندی اس کام میں مدد دے سکتے ہیں۔ بچے عموماً تکرار پسند ہوتے ہیں اگر گیت اور مکالمے ہوں وہ زندہ دلی کے ساتھ بار بار دہرائے جائیں اور تلفظ کی غلطیاں واضح طور پر پیش کر کے درست کرائے جائیں پھر دوسرے گیت سنائے جائیں اور ان سے پڑھوائیں تو بہت مفید ثابت ہوں گے۔ ایک اور گیت میں یہ کہانی ہے۔

ایک تھی گوگو + گوگو نے مجھے پنکھا دیا + پنکھا کیکر پہ لٹکایا + کیکر نے مجھے کانٹا دیا

کانٹے سے میں نے کنواں کھدوایا + کنویں نے مجھے پانی دیا + پانی سے کھیت سینچایا

کھیت نے مجھے دھان دیا + دھان میں نے ڈال لیے اوکھلی میں + اوکھلی نے مجھے چاول دیئے

چاول میں نے ہانڈی میں ڈالے + ہانڈی نے مجھے بھات دیا + بھات سب نے مل کر کھایا

اس قسم کی نظمیں اور کہانیوں کے گیت اسمٰعیل میرٹھی، شہباز، اقبال، حامد اللہ افسر، صلاح الدین اور شفیع الدین نیر وغیرہ نے اکثر لکھے ہیں۔ بہت سے گیت زبان زد ہیں۔ بچوں کے رسالوں میں اس قسم کا مواد بہت مل سکتا ہے۔ ایسی کہانیاں اور گیت اکٹھے کر لئے جائیں تو بہت اچھی کتاب بن جائے گی۔ گیتوں اور نظموں اور کہانیوں کی کتابیں بچوں کے لئے تصنیف کی جائیں۔

اچھی نظمیں پڑھانے میں ترنم کا احساس ضروری ہے۔ فعل یک مصرعے میں فعل کی جگہ ہو اور اس لفظ پر ہو جہاں ضرورت ہو ترنم اور احساس کا ساتھ ہو۔ یا ایک ہی چیز سمجھئے نظم کہنے یا پڑھنے میں آواز یا لب و لہجہ بہترین اختیار کئے جائیں تاکہ طلبا صحیح نقل کر سکیں۔ پھر انہیں خود پڑھنے کا موقع دیا جائے رفتہ رفتہ نظم کا مفہوم اخذ کرائیں۔ روزمرہ گفتگو کی مشق تین خاص اعمال سے متعلق ہے۔ یہ طلباء اور مدرس پر منحصر ہے کہ نظم پہلے شروع کی جائے یا تمثیل و مکالمہ جیسے گفتگو کی جسمانی تربیت کہنا زیادہ موزوں ہوگا یا دونوں ساتھ ہوں۔ خاص حالات میں غیر ارادی طور پر کسی معاملہ پر بات چیت کی جا سکتی ہے لیکن زیادہ یہی مناسب ہے کہ خبروں، زبان دانی کے کھیلوں اور مباحثوں کے لئے علیٰحدہ علیٰحدہ وقت مقرر کیا جائے۔ ابتدا میں زیادہ سے زیادہ گفتگو نہ ہو۔ ایک وقت میں ایک کام کا اصول اچھا ہے۔ یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ طلباء کے استعداد کے مطابق بہترین نظمیں اور قصے پڑھائے جائیں جو بہت آسانی سے یاد کر لئے جاتے ہیں۔ غلط ملط قسم کی نظمیں نہ سنائی جائیں۔ ہمارے ادب میں ان کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے اور اکثر آسانی سے فراہم ہو سکتی ہیں۔

(بقیہ صفحہ پر)

طفیل سیفی کرم علی

چند لمحوں کی یادیں

۲۶ را پریل کی شب محترم ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور صاحب ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے۔ زندگی بھر کی جدوجہد .... مشقت اور محنت کرنے والا مجاہد! ابدی نیند سو گیا۔ خواجہ صاحب کے سانحۂ ارتحال سے آسمان علم و ادب کا ایک روشن ستارہ ڈوب گیا۔ آپ کی بے پناہ کاوشوں، محنت اور لگن اور خدمات کی بدولت آج مہاراشٹر اور حیدرآباد کے نہ جانے کتنے علمی، ادبی، ثقافتی اور سماجی ادارے ممتاز اور اعلیٰ مقام بنائے ہوئے ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ نے زبان اردو کے گلشن کو دل و جگر کے خون سے سینچا اور اردو کی ترویج و اشاعت کی خاطر اپنی زندگی وقف کر دی اس مختصر لیکن کامیاب زندگی نے انہیں بے پناہ عزت و شہرت سے نوازا۔ آپ بے شمار سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔

آپ ایچ۔ای۔ایچ دی نظامس چیریٹیبل ٹرسٹ حیدرآباد کے سکریٹری تھے — آپ ٹرانسپورٹ کمشنر بھی رہے اور سیلس ٹیکس کمشنر بھی۔ علی گڑھ یونیورسٹی کورٹ کے رکن بھی تھے۔ مہاراشٹر میں اردو اکادمی کا قیام آپ ہی کا مرہون منت ہے اور ابتداء سے آج تک اردو اکادمی کے سکریٹری چنے جاتے رہے۔ آپ نے مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے ذریعے اردو زبان و ادب کی جو شمع جلائی ہے اس کی روشنی دور دور تک اہل علم و ادب کی رہنمائی کرتی رہے گی۔

قہقہہ زار، سمن زار، گل و گلزار، لالہ زار، شگوفہ زار اور طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ" آپ کی قابل فخر اور قابل قدر تصانیف ہیں۔

مرحوم کے تعلق سے ۲۹ را پریل کے روزنامہ اردو ٹائمز کے اداریہ میں مدیر صاحب رقمطراز ہیں کہ — "غفور صاحب اپنی شریف النفسی کے طفیل اپنے سے چھوٹوں کا بھی احترام اور ادب کیا کرتے تھے" کس قدر صداقت جھلکتی ہے اس جملے سے — مجھے بخوبی یاد ہے ماہ جنوری کی وہ صبح جب سورج نئی امنگیں اور نئے ولولے لئے طلوع ہوا تھا۔ غفور صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی کس قدر خوشگوار

تھے جب انہوں نے سفر کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا ...... لمحہ لمحہ خود کو محسوس کرنے کا عمل بھی عبادت تک ہے لیکن اس ایک یاد اور ان چند لمحوں کے واقعات اور اس ملاقات کی منظر کشی بھی کرنی ہے۔ ان لمحوں کو کاغذ پر منتقل کرنا ہے جو ان کی یاد کا ایک روشن حصہ بن کر رہ گئے۔ لیکن قلم تھرتھرا رہا ہے باوجود کوشش کے سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے ابتداء کروں۔ ذہن میں ان چند لمحوں کی ملاقات اور باتوں کا زبردست ہجوم ہے ساتھ ہی درد و کرب کا طوفان ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ یہ غیر متوقع سانحہ جس نے تمام احساسات کو متزلزل کر رکھا ہے۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کیسے اس مختصر سی ملاقات کا ذکر کروں ......!

میں ان دنوں بمبئی میں مقیم تھا۔ وہ ماہ جنوری کی ایک صبح تھی ... اجلی اجلی، صاف شفاف ...... اسی دن بزم اردو انجمن خیر الاسلام ہائی اسکول میں کتابوں کی شاندار نمائش تھی۔ صبح تقریباً آٹھ بجے میرے عزیز دوست حق غازی آدھمکے اور حکم صادر کر دیا کہ آپ کو بطور مہمان خصوصی اس نمائش میں شرکت کرنی ہے جس کا افتتاح غفور صاحب فرمائیں گے۔ اگلے ہی لمحے ہم دونوں غفور صاحب کے دولت کدہ پر حاضر ہو گئے۔ چند لمحوں بعد ڈاکٹر صاحب ہمارے درمیان تھے۔ یہ میری پہلی ملاقات تھی اور شاید آخری بھی ---- گھر سے اسکول تک کا فاصلہ تعارف اور مختلف موضوعات پر گفتگو میں طے ہو گیا تب احساس ہوا کہ کس قدر مشفق، مخلص اور کتنی پرکشش شخصیت ہے یہ ...... نہ غرور نہ تکبر ..... محبت ہی محبت، خلوص ہی خلوص ......! انجمن خیر الاسلام پہنچ کر خواجہ صاحب نے نمائش کا افتتاح فرمایا اور اپنے بہترین خیالات پیش کئے۔ بزم سے تعاون کا یقین دلایا۔ جناب ریاض احمد خاں صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں کتابوں کی نمائش کو فال نیک سے تعبیر کیا اور اس طرح پروگرام نہایت کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

واپسی پر خواجہ صاحب کے علاوہ ریاض احمد خاں صاحب بھی ہمراہ تھے۔ اردو اکادمی کے دفتر پہنچ کر ہم لوگ کار سے اترے۔ میں نے خواجہ صاحب کو اپنے افسانوں کا مجموعہ "لمحوں کی حرکت" کی جلد پیش کی (جو مہاراشٹر اردو اکادمی کے مالی تعاون سے چھپ کر تیار ہے)۔ وہ مسکرائے نہایت سادگی سے شکریہ ادا کیا اور وہ آخری جملہ جو انہوں نے رخصت ہوتے ہوئے فرمایا آج ذہن کو جھنجھوڑ رہا ہے۔ یادیں رس رہی ہیں۔ غم و انتشار کا مواد بہہ رہا ہے ..... انہوں نے کہا تھا:- "آئندہ کب ملاقات ہوگی میاں؟" اور میرا جواب پا کر وہ دوبارہ مسکرا اٹھے۔ "اب تو ملاقاتوں کا سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا عمر ---" آہ وہ الفاظ کانوں کے پردے پھاڑ رہے ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ

چینی ہمتر ملاقات پاک بھیجے آخری ملاقات کا سب کیسے معلوم کہ ـــ کیسے ۹ سے ... ہوا ہوتا کاش آج بھی وہ ہمارے درمیان ہوتے ۔ کاش علم و ادب اور زبان اردو کا یہ بے لوث خادم آج بھی زندہ ہوتا ۔ کاش ایسا ہوتا ـــ کاش ویسا ہوتا ـــ لیکن یہ لفظ کاش جو نہ جانے اپنے وجود میں کتنی حسرتیں اور امیدیں سمیٹے ہوئے ہے ۔ یہ لفظ "کاش" جو فریب ہے ـــ دھوکہ ہے ـــ سمجھا ہوا کتنا بے معنی و مفہوم ہے ـــ لیکن حقیقت کچھ اور ہے یہ لفظ جتنا بے معنی و مفہوم ہے اتنا ہی بامعنی ہے، آج نہیں تو کل ہم اس کی اہمیت اور حقیقت کو تسلیم کر لیں گے ـــ اس وقت جب ملی، ادبی، ثقافتی اور سماجی اداروں کو خدانخواستہ کسی قسم کی مشکلات درپیش آئیں گی ۔ اس وقت جب زبان اردو کا لہلہاتا پودا مال و جگر کا خون مانگے گا تب ہمیں غفور صاحب اور ان جیسی قابل قدر ہستیوں کی ضرورت محسوس ہوگی اور تب بے ساختہ زبان سے نکلے گا ۔

"کاش علم و ادب اور اردو کے یہ بے لوث خادم آج ہمارے درمیان ہوتے ۔"

خدا مرحوم کو جزائے خیر دے ـــ آمین

□ □

"کہتے ہیں کہ اردو کا فارسی رسم الخط مشکل ہے ۔ غور کیجئے تو کیا انگریزی زبان اسی قدر مشکل نہیں ؟

برنارڈ شا نے ایک مرتبہ GHOTI لکھا اور کہا اس کو FISH پڑھیئے ۔ سب ہی حیران تھے کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے ؟ ۔ انہوں نے سمجھایا ENOUGH کے آخر میں جو GH ہے وہ F کی آواز دیتا ہے ۔ WOMEN میں O کو I کی آواز دے کر ویمن کہا جاتا ہے ۔ اور رہا TI تو آپ ATTENTION میں TION کو SHON نہیں بولتے یعنی کہ TI = SH ہو جاتا ہے تو لیجئے GHOTI بھی FISH ہوا نا ؟

انگریزی کا یہی O جب OVEN میں آتا ہے تو A یعنی آ کی آواز دیتا ہے A کو اے کہتے ہیں مگر ANDHRA لکھتے ہیں تو اسی A کا تلفظ آ ہو جاتا ہے ـــ بی سے بو ہے لکھتے ہیں تو B با بن جاتا ہے BUT بٹ تو PUT پُٹ SCHOOL میں I ہے نہ E لیکن اس کو اسکول پڑھتے ہیں اس طرح STATION کو اسٹیشن بولتے ہیں ـــ اب ہم آپ کو بتائیں کہ اردو کے حروف تہجی اتنے مشکل نہیں جتنے کہ سمجھے جاتے ہیں (خدیجہ ...)

[illegible]

اردو کے پہلے صوفی شاعر و ادیب

حضرت سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ؒ

بہمنیوں نے ۱۳۴۷ء سے ۱۵۲۵ء تک اس ملک کی تہذیب و معاشرت اور ادب و سیاست کی رہنمائی کی اور اپنے بعد ایسی مستقل یادگاریں چھوڑیں جو ان کے نام اور کام کی یاد دلاتی رہیں گی۔ ان یادگاروں میں سب سے اہم اردو زبان اور اس کا ادب ہے جو انہی کی سرپرستی میں پورے دکن میں پروان چڑھی اور دکنی علاقوں میں جگہ جگہ اس کے مرکز قائم ہو گئے جس میں گلبرگہ، بیدر، احمد نگر، بیجاپور، گولکنڈہ، کرنول، کڑپہ، بودھن، اورنگ آباد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس خاندان کے حکمرانوں میں فیروز شاہ بہمنی علم و فضل اور شعر و سخن کے علاوہ بین قومی تمدن کو رائج کرنے میں اس طرح مشہور ہوا جس طرح بعد کے زمانے میں جلال الدین اکبر بادشاہ، محمد قلی قطب شاہ اور ابراہیم عادل شاہ ثانی مشہور ہیں اور دراصل اسی کے عہد سے ہمیں اردو کی نثر و نظم کا پتہ چلتا ہے۔ اس کا پایہ تخت گلبرگہ دکن میں اردو کا پہلا مرکز تھا۔ یوں تو اس سے پہلے کے ایک بزرگ شیخ عین الدین گنج العلم کا ذکر بھی ملتا ہے جو دہلی میں پیدا ہوئے اور محمد تغلق کے عہد میں دکن چلے آئے تھے اور طویل عمر پا کر بیجاپور میں فوت ہوئے۔ ان کے بعض مذہبی اردو رسالوں کے نام ملتے ہیں لیکن ان کے نمونے اب تک شائع نہیں ہوئے۔

حضرت سید محمد حسینی جو عام طور سے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے نام سے مشہور ہیں ۸۱۵ھ میں سلطان فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں گلبرگہ آئے اور ۸۲۵ھ میں یہاں انتقال فرمایا۔

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ؒ اردو کے پہلے شاعر اور نثر نگار ہیں۔ جن کی نثر اور نظم دونوں کے نمونے اردو ادب میں موجود ہیں۔ آپ دولت آباد میں پیدا ہوئے اور اپنے والد شاہ راجو ؒ کی

لکچرر انگریزی، ۱۲-۱-۲۸۹/۱۰-۱-۷۔ حیدرآباد 500267 (اے پی)

وفات کے بعد دلی چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد ۸۰۱ھ میں تیمور شاہ میں کے بعد میں گلبرگہ چلے آئے۔ سلطان بادشاہ کے مزاج اور زمانہ کے رجحان کو دیکھ کر اردو میں تصنیف و تالیف کا آغاز کیا۔ دکن کے اس ابتدائی دور میں سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز کی شخصیت نمایاں حیثیت رکھتی ہے جن کے کارنامے تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔ آپ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ علم تصوف میں آپ کی متعدد تصانیف ہیں۔ آپ کے مریدین اور معتقدین کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ تبلیغ اور ہدایت کا سلسلہ جاری رہا کرتا۔ نماز ظہر کے بعد آپ طلباء اور مریدوں کو علم تصوف، حدیث اور سلوک کا درس دیا کرتے تھے۔ اور پھر کلام اور فقہ کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔ جو لوگ عربی اور فارسی سے ناواقف تھے ان کے لئے آپ دکھنی میں تقریر فرماتے اور انہیں کے لئے آپ نے اپنی تصانیف مرتب فرمائیں۔ آپ کے چند تصانیف کا پتہ چلتا ہے یعنی "معراج العاشقین" "ہدایت نامہ" اور رسالہ "سہ بارہ"۔ تینوں رسالے علم تصوف میں لکھے گئے ہیں افسوس ہے کہ ان رسائل کے زمانۂ تصنیف کا صحیح علم حاصل نہیں ہوا۔ مگر انہوں نے اپنی تصانیف کا سلسلہ گلبرگہ تشریف لانے کے بعد آغاز کیا۔ کیونکہ جنوبی ہند کے خطہ میں دکنی زبان کا رواج تھا۔ عام و خاص اس زبان کا استعمال کرتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ ۸۱۵ھ و ۸۲۵ھ کے درمیانی زمانہ کی تصانیف قرار دی جا سکتی ہیں۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

"نبی کے تحقیق خدا کے درمیان تے ستر ہزار پردے اوجیالے کے ہور اندھیارے کے اگر اس میں تے ایک پردہ اٹھ جائے تو اس کی آنچ تے میں جلوں۔ ہور ایک وقت ایسا ہوتا ہے سمجھو اور دیکھو بے پردا ۔۔ اندھیارے کے اوجیالے کے عارفاں ہیرے واصلاں پر پردے نورانی ۔۔ وے واصلاں کا صفا پردہ ہوتا ہے محمد کا نور۔ اے عزیزاں اول ربوبیت کا پردہ سوالے تن جمالی جسم کے پردے کو اپڑے باج اس جمالی الوہیت کے پردے ممکن الوجود و کون اپڑ سکے۔"

(معراج العاشقین)

"سوال :- ذاتی ایمان کونسا اور صفائی ایمان کونسا؟
جواب :- ایکنڈا حال ثابتی ہے، سو ذاتی ایمان وہ ہے ۔۔ ثابتی
آتی اور جاتی ہے۔ سو صفائی ایمان ۔۔"

(رسالہ سہ بارہ)

معراج نامہ یا معراج العاشقین کا مخطوطہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو (علی گڑھ) میں موجود ہے۔

وہاں بھی تاج پریس کی جانب سے شائع ہو چکا ہے۔ رسالہ "سبلہ" نواب عنایت جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

خواجہ بندہ نواز کی نظم کے مختلف نمونے دستیاب ہوئے ہیں جن کی یہاں صراحت کی جاتی ہے۔ آپ کا تخلص "شہباز" تھا۔

(۱) مختلف بیاضوں میں بعض بیماریوں کے نسخے اور بعض شعر آپ کے نام سے موسوم کئے گئے ہیں :-

پانی میں نمک ڈال مزا دیکھتا دسے
جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے
یو کھو خودی اپنی خدا سات محمد
جب گھل گئی خودی تو خدا بن نہ کوئی دسے

آنتوں بلیلہ آنتوں لون — بتیس کے گھر جائے کون

آنکھ کو ہلیلہ دانت کو لون — حکیم کے گھر جاوے کون

جتنا کا جل اتنا لون — اس سے دونا گوند گول
ذرا سی پھٹکری نمک لا تھوڑا — تم جیسے جوانتر کی گھوڑا

سن تو سیانے میری بات — بولوں دارو جن کس سے جات
جس کے منہ میں دکھتے دانت — ہلتے جلتے کٹے کٹے پات
وزن برابر سب کو تول — دارو ہووے یوں انمول
داتوں کا زن سی کر — خوبی کو تو دل میں دھر
زیرہ مرچیاں ستوا سونٹ — کتھا اجلا لے کر گھونٹ
نیلا طوطا دھنیا جوت — اس میں ملا تو سیندا لون
پان پلاس کے کانٹیاں آن — ماچل لوچن اور لوبان
جو ں جوں لائے پاوے سکھ — تب دانتوں کا جائے دکھ

---

(۱) مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو (پاکستان) نے اپنی تالیف "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں بعض نامکمل نظمیں شامل فرمائی ہیں جن کو حضرت گیسو دراز سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ آغا حیدر حسن صاحب پروفیسر اردو نظام کالج حیدرآباد کی ملوکہ بیاض میں خواجہ صاحب کے نام سے حسب ذیل کلام درج ہے ؎

میں عاشق اس پیو کا جنے مجھے جیو دیا ہے
او پیو میرے جیو کو برمالتیا ہے
اور معشوق بے مثال ہے نور نبی پایا
نور نبی رسول کا او میرے جیو میں بھایا
ایکوں اپنے دیکھنے کیسی آرسی لایا

کھڑے کھڑے پیو جیو میں اپیس آپ دکھاوے
ایسی میٹھی معشوق کوں کوئی کیوں دیکھنے پاوے
جنے دیکھے اوسی کوں اسے اور نہ بھاوے
کل شئے محیط ہے اسی کون پہچانے
جو کوئی عاشق اس پیو کے اسی جیو میں جانے
اسی دیکھت کم ہے جیسی میں دیوانے
خواجہ نصیر الدین جنے سائیاں پیو بنائی
جیوں کا کھول کٹھ کھول کر پیا مکھ آپ دکھائی
رکھے سید محمد حسینی پیو سنگ کہیا نہ جائی

دیگر: ۱۔ اے محمد بجلوہ جم جلوہ تیرا   ذات تجلی ہوئی اسیس سپورن سیرا
واحد اپنی آپ تھا اپیس آپ غبایا
پرگٹ جلوے کارنے الف میم ہو آیا
عشق رسا جلوہ دینے کر کاف نون بسایا

لولاک لما خلقت الافلاک خالق پالے
فاضل افضل چشمۂ رسل ہادی محمود ہو آئے
امت رحمت بخشش ہدایت تشریف پائے
معنی ناؤں معشوق دکھ ظاہر شہباز کہلائے
عشق کے جین چند بند اپنی آپ دکھائے
الان کما کان پر آپس میں آپ سمائے

دیگر۔ مشکل بازی عشق کی چھوٹے جیو کو انا
موتوا قبل ان تموتوا شاہد ہے معنا
اونچا مندر ہے عشق کا کوئی کیونکر پاوے
چاروں سیڑیاں جھنبکر توہے پار تا آوے
مجھ سیس دیوے پانؤں تل توبھی نہ پاوے
روئی دوئی تائی دور کر یک واحد ہونا
چاروں کپڑے جال کر مجنوں ہو رہنا
پورا مفلس ہوے تو اسے کیل جیت لانا
رہے عاشق شہباز ہے دو پہلو چگ کہلارا
خواجہ نصیر الدین سائیاں نیت راکھے ہمارا
نسنگہ کمیل توں پند و عشق کے تہارا

۳۔ چکی نامہ۔ اس نظم میں بارہ بند ہیں۔ یہ مخطوطہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے اپنی کتاب "تذکرہ اردو مخطوطات" میں اس کا تعارف کرایا ہے۔

دیکھو واجب تن کی چکی | پیو چاتر ہو کے سکی
سو کن ابلیس کھینچ کھینچ تھکی | کہے یا بسم اللہ ہو سو اللہ

الف اللہ اس کا دستا ——— یا نے محمد ہو کر بستا
پہنچی طالبیوں کو دستا ——— کہے یا بسم اللہ ھو ھو اللہ

دانے بھی سوچن چن لانا ——— شاید باتوں سے لے کر بہانہ
شریعت سے جھلکی یہی ——— کہے یا بسم اللہ ھو ھو اللہ

الف اللہ اس کا پالوں ——— پیر مرشد مسلک چالو
سیوانا اس سے چھانو ——— کہے یا بسم اللہ ھو ھو اللہ

لا دم وجود باسن ہوتا ——— اسی تو بر ستی دہونا
ذات کی یانے سو آملی کو مہنا ——— کہے یا بسم اللہ ھو ھو اللہ

خواجہ بندہ نوازؒ کا سب سے اہم کارنامہ یہ رہا ہے کہ سلسلۂ چشت میں سب سے پہلے صوفی ہیں جنہوں نے تصنیف و تالیف کا کام کیا اور اپنے عشق کو اپنی تصانیف میں جگہ دی اور آج بھی ان کی تصانیف اور آپ کی اردو ادب کی گرانقدر خدمات نمایاں حیثیت رکھتی ہیں اور تاریخ کے صفحات پر شفاف آئینہ کی طرح عیاں ہیں۔

□□

(سلسلہ صفحہ ۴۳ سے آگے)

ابتدائی جماعتوں کی یہی تربیت اعلیٰ جماعتوں میں زیادہ باقاعدہ اور مشکل تر مشغلوں اور مشغول کی صورت اختیار کرے گی۔ شعر و شاعری، مباحثے اور ادبی جلسے، ڈرامے، تقریریں اور سیمینار ہوں گے۔ ان کے متعلق تبصرے اور تنقیدیں ہوں گی، غیر نصابی مشاغل دراصل تعلیم و تربیت کے صحیح نصاب ہیں۔ جن کی بدولت زبان و ادب کے ذوق صحیح کے ساتھ شائستہ گفتگو کا انداز آ سکے گا، جو اظہار خیال کا نہایت اہم اور مروج ذریعہ اور لازمۂ زندگی ہے۔

□□

انیس چشتی

مراٹھی ادب شناسی

تحلیل، تجزیہ، ترجمہ

گرنتھالی ۔ ایک عزم ایک چیلنج

[انیس چشتی پونہ کے ایک کارکرد اور فعال ادیب ہیں جو اپنے گرد و پیش پر نظر رکھتے ہیں۔ اور اپنی تحریروں میں عوامی فلاح و بہبود کو اولیت دیتے ہیں موصوف نے دیکھا کہ مراٹھی ادب نے نئی کروٹ لی ۔ مراٹھی ادیبوں نے عوام کو بلکہ عوام کے پسماندہ اور کمزور طبقات اور قبائل کو قریب سے دیکھا اور ان کی جیتی جاگتی تصویریں اپنی تصانیف میں پیش کیں ۔ ساتھ ہی گرنتھالی جیسا انقلاب انگیز ادارہ وجود میں لایا اور اس کے ذریعہ اس عوامی ادب کو عوام تک پہنچا دیا گیا ۔ اس عظیم کام کو کس طرح اور کس خوبی اور کامیابی کے ساتھ انجام کو پہنچایا گیا اس کا جائزہ انیس چشتی نے اپنی تصنیف "مراٹھی ادب شناسی" میں لیا ہے "شاداب" کو خوشی ہے کہ اس کی قسط وار اشاعت کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے ۔ (ادارہ)]

ادھر کچھ دنوں سے مہاراشٹر میں ایک نئی تحریک کا آغاز ہوا ہے جس کا مقصد ہے ادب کی اشاعت ۔ صرف اشاعت ہی نہیں بلکہ اس کا سب سے اہم مقصد قاری کو کتابیں خریدنے پر آمادہ کرنا ہے ۔ ضروریات زندگی میں سب سے آخری نمبر اگر کسی چیز کے خریدنے کا ہے تو وہ ہے کتابوں کی خریداری ۔ حد یہ کہ کتابوں کی خریداری کا نمبر بچوں کے کھلونوں کے بھی بعد لگتا ہے ۔ کتب فروشی کا مسئلہ آج سارے عالم کو پریشان کئے ہوئے ہے ۔ انگریزی کے بڑے بڑے اخبارات اپنے بہترین فنڈ کے باوجود دم توڑ چکے ہیں ۔ ان کے دم توڑنے کا عمل اتفاق سے ان ملکوں میں واقع ہوا ہے جن کو آج مغربی دنیا کے علم و فن کی قیادت و سیادت ہے ۔ مثلاً یورپ اور امریکہ ۔ کتابیں

نہ پڑھنے کا شوق اور خاص طور پر خرید کر پڑھنے کا شوق دیگر زبانوں کی طرح مراٹھی میں بھی عام ہے۔ ایک مشہور انگریزی کتاب کی ہزار جلدیں چھاپتا ہے تو تقریباً تین سال کی فرصت ہو جاتی ہے۔ دوسری ریاستوں اور زبانوں میں یہ شکایت اور بھی زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر اردو کو ہی لیجئے۔ اگر آپ آبادی کا تناسب دیکھیں گے تو معلوم ہے کہ بھارت میں تقریباً ۲۲ کروڑ افراد اردو بولتے، لکھتے، پڑھتے اور سمجھتے ہیں۔ معاف کیجئے۔ کہیں آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ میں یہ آبادی صرف مسلمانوں کی بتا رہا ہوں۔ جی نہیں۔ سکھ، سندھی کاشتہ پنجابی اور بھارت کی کئی ریاستوں کے غیر مسلم افراد بھی اس میں شامل ہیں۔ اس میں وہ مسلمان شامل نہیں جن کی مادری زبان اردو کے علاوہ کوئی اور ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ کوئی جامعہ لمیٹڈ جیسا ادارہ اردو کے بڑے سے بڑے ادیب کی کتاب سات سو یا ہزار سے زیادہ نہیں چھاپ سکتا۔ معلوم ہے کہ پورے مہاراشٹر کی آبادی تقریباً چھ کروڑ ہے اس میں مراٹھی زبان بولنے والوں کی تعداد (۴½) ساڑھے چار کروڑ سے زیادہ نہیں۔

مریض لاعلاج

لوگوں میں پڑھنے کے رجحان کو بڑھاوا دینے اور سستے داموں اچھی کتابیں قاری کو مہیا کرنے "گرنتھالی" (~~[illegible]~~) جیسا فعال ادارہ وجود میں آیا۔ نئے لکھنے والوں کی کتابوں کے لئے ناشر نہیں ملتے۔ وہ اپنے طور پر کتابیں شائع کرتے ہیں تو بکتی نہیں۔ بکتی ہیں تو پیسہ مصنف کے ہاتھ نہیں آتا ساری بالائی ناشر اور کتب فروش کھا جاتے ہیں۔ کتابوں کی قیمتیں اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ اوسط درجے کا آدمی خرید نہیں پاتا۔ یہ اور ایسے سینکڑوں مسائل ہیں جو یا تو ادیب کو قاری تک نہیں پہنچنے دیتے یا قاری ادیب تک نہیں پہنچ پاتا۔ پچھلے کئی برسوں سے ہندوستانی سماج میں یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ تو نئے لکھنے والے (آبادی کے تناسب سے) پیدا ہو رہے ہیں اور نہ ہی نئے پڑھنے والے وجود میں آرہے ہیں۔ اس سے ہندوستانی معاشرے میں کئی مستقل امراض پیدا ہو گئے ہیں عوام میں محدود علم، دانشوروں کی بے اثری، ارباب اقتدار اور حکمران طبقہ کی علمی کم مائیگی، سستے اور اخلاق سوز لٹریچر سے عوام کی بڑھتی ہوئی دلچسپی، صرف اخباروں اور اشتعال انگیز رسالوں سے باخبری اور حالات کا اکتساب، نتائج سے بے خبر ہو کر محض نعرہ باز سیاست سے عوام کا ربط اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لکھنے پڑھنے کی دنیا سے دوری اور تیار شدہ (ریڈی میڈ) آگاہی پر قناعت۔ اس سے میری مراد ریڈیو، ٹیلی ویژن، کیسٹ، ویڈیو اور فلموں سے ہے۔ اس تساہل اور آسان طلبی کا نتیجہ مندرجہ ذیل شعر کے عین مطابق نکلا کہ ؎

ما در پس آئینہ طوطی صفتے داشتہ ایم آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گوئیم

...اچھا ادیب پیدا کرتا ہے

گرنتھالی نے تنظیم کے اغراض و مقاصد ہی نہیں بدل دیے بلکہ وہیں انقلاب بھی لے آئی۔ تاہم یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مراٹھی میں کتابوں کی اشاعت کا ایسا سلسلہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اس تحریک نے گاؤں گاؤں میں کتب بینی کی فضا پیدا کر دی۔ اچھے قاری کو پیدا کیا بلکہ ... اچھے ادیبوں کو جنم دیا۔ اس وقت مہاراشٹر میں کتب کی اشاعت کے تعلق سے "گرنتھالی" نام مراٹھی داں طبقہ کی نوک زبان پر ہے۔

اس تحریک کی ابتدا ۱۸ دسمبر ۱۹۷۵ء سے ہوئی گویا اس نے اپنی زندگی کے ابھی آٹھ سال ہی ... نہیں رکھے ہیں۔ تحریک کے ابتدائی اراکین کی تعداد محض دو سو اور آج ان کی تعداد بڑھ کر ہو گئی ساڑھے سات ہزار ... مستقبل قریب میں ہر کتاب کی اشاعت تقریباً دس ہزار ہوا کرے گی۔ گرنتھالی ... پہلے پانچ برسوں میں تقریباً (۱۸) کتابیں شائع کیں۔ اس کی پہلی اشاعت تھی درگا بھاگوت کی "رُوپ ... اشاعتی ادارے کی دوسری جو سب سے اہم خصوصیت ہے یہ کہ اس کی مجلس انتظامیہ کے کارپردازان ... معاوضے کے جز وقتی طور پر اپنی اپنی ملازمتیں سنبھالتے ہوئے ادارے سے منسلک ہیں۔ ان کے ... مجلس نے مراٹھی ادب کو نئے آفاق اور انوکھے موضوعات سے متعارف کروایا۔ ابتدائی اشاعتوں ... اُدھ وَشت شتیج (برباد افق)، رعلو، ستے جے موہرے (اقتدار کے مہرے)، زرا بکھیر اور ... کی نظمیں" قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ اچھید تیر بتائی"، "لکور دفارم"، "بلوتن (...)" اور "اپرا" ... آسمان سر پر کھڑا کر لیا۔

...سلامت کی بارش

دیا پوار کی سماجی اہمیت کی حامل آپ بیتی "بلوتن" کا پہلا ایڈیشن تین مہینے کے اندر اندر ختم ہو گیا۔ اب اس کے چوتھے ایڈیشن کی تیاریاں ہیں۔ ... آپ بیتی اپنی نوعیت کی اولین کوشش ہے۔ امریکہ کی بین الاقوامی شہرت یافتہ فورڈ فاؤنڈیشن نے ایک سوا لاکھ روپے کی اسکالرشپ دی تاکہ وہ اپنی کتاب میں مذکورہ "مہار" پس ماندہ فرقہ کے ... کا مزید مطالعہ کر سکیں۔ اسی نہج پر لکھی لکشمن مانے کی آپ بیتی "اُپرا" (उपरा) جو ... (خانہ بدوش) قبیلے کی سماجی زندگی کا احاطہ کرتی ہے، بے انتہا مقبول ہوئی۔ اس کتاب نے ... فاؤنڈیشن سے سوا لاکھ روپیہ حاصل کئے۔ اس کے علاوہ ان دونوں کتابوں نے ریاستی حکومت ... سے لے کر ساہتیہ اکادمی تک کے متعدد قومی انعامات بھی حاصل کئے۔

دیا ناتھ منوہر کے ناول "روبو" نے ریاستی حکومت کا انعام حاصل کیا۔ ڈاکٹر ...

کو ان کی پیشہ ورانہ آپ بیتی "کولہاٹم" پر "بلوتیکار" کے ادبی انعام سے نوازا گیا۔ اور [illegible]
کو "ستیاسین" کی نظم سیاسیات - "ستیاسین"، "بیرون"، "ادا نیلو" کی بہترین [illegible]
چھپ چکی ہیں۔ [illegible] انگریزی اور [illegible] سے گزر چکی ہیں۔

گلوکیٹ کر کی [illegible] سیاسی [illegible] "جو اکبر [illegible]" [illegible]
نے [illegible] کی سیاست اور جمہوریت کو نہایت [illegible] انداز میں پیش [illegible]

دسنت [illegible] کی "سنزل [illegible]" پر جا کر تحقیق کر کے "سمیا"، "دلت کی
"اندر کی بات"، "جینت گوکر کر کی "قدیم بھارت میں عورتوں کا مقام"، "یہ - مین - بیرا بیچی" کی "کالا
کلچر تہذیب" (اندھیاروں کی بوندیں) وغیرہ گرنتھالی کی شائع کردہ کتب کی طویل فہرست میں سے
چند ایک ہیں۔ جنہوں نے مراٹھی داں طبقے کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

علم کی گنگا تیرے دوارے — "گرنتھالی" تحریک کا سب سے عظیم الشان "گرنتھ یاترا"

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس ادارے کے کارپردازان نے دسمبر ۱۹۸۲ء
میں ایک انوکھا اقدام کیا۔ مہاراشٹرا کے (۱۳۴) اہم مقامات کا انتخاب کر کے وہاں "کتاب میلہ" منعقد کیا
اس کتاب میلے کے انعقاد کے سلسلے میں "گرنتھالی" کے جملہ کارپردازان، مراٹھی کے ادیبوں، شاعروں،
ناشروں، اخباری نمائندوں اور لاتعداد علم دوستوں نے تقریباً (۱۳۸) دن لگاتار محنت کی اور
"گرنتھ یاترا" کے انوکھے پروگرام کو کامیاب بنایا۔ ۳۵ مختلف مقامات پر کتابوں کی نمائش کی گئی۔
سیمینار منعقد کئے گئے۔ مراٹھی کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کو عوامی جلسوں میں پیش کیا گیا۔
پدیاترائیں نکالی گئیں، لاتعداد پوسٹر، بورڈ، دفتی اشتہارات، دستی رسالے (ہینڈ بل)، بکثرت
بینر آویزاں کئے گئے۔ بیل گاڑی، اونٹ اور گھوڑا گاڑیوں پر کتابیں سجا کر شہروں اور گاؤں کی گلیوں میں
طلباء، اساتذہ، ادیبوں اور شاعروں کے قطار بند جلوس نکالے گئے۔ بڑے بڑے ادیب اور شاعر
جنہیں لوگ کتابوں اور اخبارات کے ذریعے جانتے تھے اور جن کی کتابیں پڑھ کر طلباء امتحان کامیاب
کرتے ہیں، گلی گلی کوچہ کوچہ گھومے اور عوام نے انہیں قریب سے دیکھا، ان کی کتابوں پر ان سے دستخط لئے
ان کی تقریریں سنیں اور علم و ادب کی کہکشاؤں سے اکتساب نور کیا۔ ان پدیاتراؤں میں چھوٹے سے چھوٹا
ادیب کم سے کم تین کتابوں اور درجنوں اخباری مضامین کا مصنف تھا۔ بعض ادیب اور شاعر ایسے بھی تھے
جن کی کتابوں کے تین سے زیادہ ایڈیشن چھپ چکے تھے اور جن کے قلم کی سیاہی [illegible] عوام کے دلوں
کو چھو چکی تھی اور بعض مصنفین کے قلم نے سیاست کی کایا پلٹ کی تھی۔

[illegible] نوجوان [illegible]

[illegible]

[illegible] بی پی ایچ [illegible]

[illegible] تعلیم [illegible] ہمیں [illegible] کتابیں [illegible]

[illegible] کے اس سفر [illegible] جاتا [illegible]

[illegible] دیہاتوں میں کتابوں کی فروخت کا تناسب زیادہ [illegible] دیہات میں صرف

[illegible] گھنٹوں میں چار ہزار روپیوں کی ۔ بارش، سیاحت [illegible] ہزار روپیوں کی اور [illegible]

[illegible] روپیوں کی کتابیں فروخت ہو گئیں ۔ [illegible] زیادہ قیمت کی

کتابیں فروخت نہیں ہو پاتیں ۔ کتابوں کے بعض سیٹ سو روپے سے زیادہ قیمت کے تھے اس سلسلے میں

[illegible] سکریٹری [illegible] کا بیان آپ خود سن لیجئے جو [illegible] کے ماہنامہ "[illegible]"

[illegible] ۲۰۰۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے :-

"ضلع اور دیہاتی علاقوں کے پڑھے لکھے نوجوان طبقے میں کتابوں ، ادیبوں اور شاعروں سے متعلق زبردست تجسس ہے ۔ ان میں کتابیں خریدنے کا ذوق ہے اور ان میں اکثر کے پاس پیسہ بھی ہے ۔ وہ کتابیں خریدنا چاہتے ہیں شرط یہ ہے کہ وہ ان کے پاس پہنچیں ۔ کتابوں کی نشر و اشاعت کو اگر منصوبہ بند طریقے پر عمل میں لایا جائے تو تقریباً [illegible] فیصد پڑھے لکھوں کے ۶ کروڑ آبادی والے [illegible] اچھی کتابوں کی اگر کوئی یہ کہے کہ پچاس ہزار یا ایک لاکھ کی اشاعت فروخت ہو سکتی ہے تو اسے آپ ہرگز پاگل نہ گردانیں ۔ یہ ممکن ہے ۔ اس کیلئے ذرائع و وسائل اور مناسب تشہیر کی ضرورت ہے ۔"

تعلیم یافتہ نوجوانوں کے سماجی و تعلیمی حالات کا تجزیہ وہ اس طرح پیش کرتے ہیں :-

"یہ نوجوان طبقہ اولین تعلیم یافتہ طبقہ ہے ۔ ان کی زندگی ، ان کی [illegible] اور ان کا سیاسی ، سماجی اور معاشی ماحول بنا ہے ۔ اس نوجوان طبقے کو ریڈیو ، ٹی وی ، سنیما ، ناٹک اور سیر و تفریح جیسے وقت گزاری کے سامان میسر نہیں ہیں ۔ وہ تہذیب و معاشرت کا بھوکا ہے ، وہ پڑھنے کا بھوکا ہے اور دنیا کو [illegible] کے لئے بے قرار ہے ۔"

تام اور تامل ۔ [illegible] ۱۸ [illegible] کتابیں [illegible] ان کے مصنفین کے [illegible]

[illegible] شائع ہو چکی ہیں [illegible] مختلف [illegible]

کروا کر [illegible] جیسے [illegible] ایک گرنتھ [illegible] تھا۔ تفصیلات کچھ اس طرح ہیں :-

[illegible] ۲۰۰ [illegible] اس [illegible] یاترا میں [illegible]۔ [illegible]

[illegible] ہزار [illegible]۔ فروخت شدہ کتابوں کی کل تعداد اکتیس ہزار ایک سو [illegible] —

[illegible] فیصد کمیشن کاٹ کر کتابوں کی فروخت سے حاصل ہونے والی کل رقم چار لاکھ اکتیس ہزار ہے۔

کتب فروشی کی اس مہم [illegible] گرنتھالی [illegible]

[illegible] تقریباً دو سو تا سات سو [illegible] اسٹائل [illegible] اس کے علاوہ ہیں۔

تقریباً ۸ ہزار روپے صرف ڈاک اور اسٹیشنری پر خرچ ہوئے۔ کتابوں کے [illegible]

بھیجے نہیں جا سکتے تھے اور مصنفین اور گشتی نمائش کے ضروری سامان کے لئے ایک بس اور ایک میٹاڈور کرائے پر حاصل کی گئی تھی جس پر تقریباً ۲۸ ہزار روپے خرچ ہوئے۔ کارکنوں اور ادیبوں کا ریل اور بس پر بھی طور پر خرچ ۵ ہزار روپیہ اس کے علاوہ ہے۔ صرف کتابوں کے [illegible] پر ۵ ہزار روپے خرچ ہوئے جب کہ اشتہار بازی پر ۱۵ ہزار روپے خرچ ہوئے۔ اس طرح اخراجات کا کل میزان تقریباً ۱۷ ہزار پانچ سو روپیوں تک پہنچتی ہے۔ ان اخراجات کے لئے بنک آف مہاراشٹر، اسٹیٹ بنک آف انڈیا، مہاراشٹر کیمیکل اینڈ فرٹیلائزر کارپوریشن آف انڈیا اور ایس [illegible] کیمیکل اینڈ کمپنی نے مجموعی طور پر تقریباً ۲۱ ہزار روپے بطور امانت پیش کئے۔

کتابوں کے اس کارواں کا ہر شہر، بستی اور گاؤں میں نہایت ہی خلوص اور اہتمام کے ساتھ پذیرائی کی گئی۔ لوگوں کے ٹھہرنے اور کھانے کا خاطر خواہ انتظام تقریباً ہر جگہ انفرادی طور پر یا اداروں کے ذریعہ ہی کیا گیا۔ کارواں کی آمد کے انتظار میں طے شدہ وقت سے پہلے ہی علم کے پیاسے دیدہ و دل فرش راہ کئے شہر کے باہر گھنٹوں منتظر کھڑے رہتے تھے اور جلوس کی شکل میں "قافلہ" کو شہر میں لے جاتے تھے۔

گرنتھالی کا صدر دفتر ۲۲/۹۰۲ نہرو نگر، کرلا ویسٹ بمبئی نمبر [illegible] میں ہے۔ گرنتھالی کی دیگر شاخیں جن شہروں میں ہیں ان کے نام یہ ہیں :-

بمبئی [illegible]، [illegible]، [illegible]، ڈومبی ولی، پونہ، دھولیہ [illegible]

اورنگ آباد — گوا — بڑودہ — ناسک — [illegible] — کولہاپور

جن ۲۰ شہروں میں گرنتھالی نے گرنتھ یاترا منعقد کی ان میں سے ۲۲ کے نام یہ ہیں :-

ناشک، سہاڑ، رتناگری، سندھو درگ، پنجی، مڈگاؤں (گوا)،
سنکیشور، نپانی، اچل کرنجی، کولہاپور، میرج، سانگلی، کراڈ
ستارہ، پنڈھرپور، شولاپور، بلسی، عثمان آباد، بیڑ، لاتور،
امبے جوگائی (مومن آباد)، پربھنی، [illegible]، اورنگ آباد، جلگاؤں،
اَمل نیر، دھولیہ، [illegible]، شری رام پور، احمد نگر اور پونہ ۔

اس دائرہ کا محیط تقریباً دس ہزار کیلومیٹر بنتا ہے ۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ پنجی اور مڈگاؤں واقع ہیں اور بیلگام، سنکیشور اور نپانی کرناٹک میں واقع ہیں ۔ اور ان دونوں علاقوں کی بھی زبان مراٹھی نہیں ہے ۔

کتابوں کی تجارت کے پیشے سے دور کا بھی واسطہ نہ رکھنے والے افراد نے (نہایت ہی احتیاط سے غور و فکر کر) تاریخ میں پہلی بار اتنا بڑا کارنامہ انجام کر دکھایا جو غیر فوجی پیمانے پر کسی صورت ممکن نہ تھا ۔ ممبران کا ایک جوش ایک ولولہ تھا جو کام کر گیا ۔ آج جب کارپردازان بیٹھ کر سوچتے ہیں تو حیرت ہوتا ہے کہ جسم میں جناتی قوت سرایت کر گئی تھی جو اتنا بڑا کام کرا لے گئی ۔ ورنہ یہ انسانی کمالات نظر نہیں آتی ۔ گر قسمان کا نیک چاہنے والے اور مراٹھی کے نامور افسانہ نویس اور ڈرامہ نگار راجہ پاڑگاؤں کر اس مہم پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"یہاں سے آگے جو ہوتا ہے وہ ہوگا ۔۔۔! انسانی کوششوں کی تمام حدود منکشف ہو چکی تھیں ۔۔۔ اس کے بعد اگر یہ مہم کامیاب کرنی تھی تو کمپیوٹر، وائی ٹاکی، ہیلی کاپٹر وغیرہ کی مدد کی ضرورت پیش آئے گی اس کے لئے لاکھوں روپے خرچ کرنے ہوں گے ۔ اور اگر یہ ممکن نہیں ہے تو محض عوام کی نیک خواہشات کی زبردست پشت پناہی ضروری ہے"

□□

وہاب قیصر

کائناتی شعاعیں

(Cosmic Rays)

سنہ ۱۹۱۰ء میں ولسن (WILSON) نامی سائنسداں نے انگلینڈ میں اور دوسری طرف السٹر (ELSTER) اور جیٹل (GEITAL) نامی سائنسدانوں نے جرمنی میں یہ دریافت کیا کہ فضا میں کچھ نئی قسم کی شعاعیں موجود ہیں۔ اس انکشاف نے سائنسدانوں کے لئے تحقیق کے نئے باب کھول دئے لیکن ان کی شب و روز کی محنت کے باوجود پتہ نہ چل سکا کہ یہ شعاعیں کہاں سے آرہی ہیں اور ان کا مبدا کہاں ہے۔ ابتدا میں سائنسدانوں کا خیال تھا کہ یہ شعاعیں زمین میں پائے جانے والے تابکار عناصر سے نکل رہی ہیں لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ کیونکہ تحقیقات سے پتہ چلا کہ کانوں میں بہت ہی کم طاقت والی شعاعیں پائی جاتی ہیں۔ پھر اس کے بعد سائنسدانوں کا خیال سورج کی طرف منتقل ہوا۔ بعض سائنسداں چاند کو اس کا مبدا تصور کرتے تھے۔ لیکن تجربات کی روشنی میں ہر خیال غلط ثابت ہونے لگا بالآخر سنہ ۱۹۲۵ء میں ملیکان (MALLIKAN) اور دیگر سائنسداں اس نتیجہ پر پہنچے کہ شعاعیں کائنات میں کہیں دور سے آرہی ہیں چنانچہ اسی مناسبت سے انہیں "کائناتی شعاعیں" یا (COSMIC RAYS) کا نام دیا گیا۔ تجربات کے دوران یہ بھی پتہ چلا کہ سورج بھی اعظم ترین شمسی عمل (Solar Activity) کے دوران ایک حد تک کائناتی شعاعیں پیدا کرتا ہے۔

کائناتی شعاعیں پروٹان، الفا ذرات اور وزنی قسم کے جواہر کے مرکزوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ جہاں تک ان اجزاء کا تعلق ہے ان شعاعوں میں ۸۹ فیصد پروٹان، ۱۰ فیصد الفا ذرات اور ایک فیصد وزنی قسم کے جواہر کے مرکزے پائے جاتے ہیں۔ یہ شعاعیں خلاء میں تقریباً روشنی کی رفتار سے سفر کرتی ہیں۔ جب یہ شعاعیں کرۂ ہوائی میں سے گذر کر سطح زمین پر پہنچتی ہیں تو ان کی طاقت میں بہت زیادہ کمی واقع ہوتی ہے چنانچہ اسی لئے خلاء میں پائے جانے والی شعاعوں کو ابتدائی کائناتی شعاعیں اور سطح زمین تک پہنچنے والی شعاعوں کو ثانوی کائناتی شعاعیں کہا جاتا ہے۔

کائناتی شعاعوں کی طاقت زمین پر ہر جگہ یکساں نہیں ہوتی۔ زمین کے مقناطیسی میدان کی وجہ سے خط استوا پر ان کی طاقت بہت کم اور شمالی و جنوبی قطبین پر بہت زیادہ ہوتی ہے۔ شرقی طول بلد کی جانب زیادہ طاقت والی اور غربی طول بلد کی جانب کم طاقت والی شعاعیں پائی جاتی ہیں۔ کسی مقام پر ان شعاعوں کی طاقت کا انحصار موسم اور وقت پر بھی ہوتا ہے۔ سردیوں کے موسم میں زیادہ طاقت والی اور گرما کے موسم میں کم طاقت والی شعاعیں پائی جاتی ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ دن کی بہ نسبت رات میں ان شعاعوں کی طاقت میں تھوڑی سی کمی واقع ہوتی ہے۔

کائناتی شعاعوں کو اب تک کی دریافت شدہ تمام شعاعوں میں سب سے زیادہ طاقتور ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ان میں نفوذ پذیری (مادوں کو چھیدنے کی صلاحیت) لاشعاعوں (X-Rays) اور گاما شعاعوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔

کائناتی شعاعیں جانداروں کے لئے کافی نقصان دہ ہوتی ہیں۔ اور یہ جسمانی ریشوں کو برباد کر دیتی ہیں چنانچہ یہی وجہ ہے کہ خلائی جہازوں اور خلائی سوٹ کی تیاری میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ خلاء میں آسٹروناٹ کے جسم پر ان شعاعوں کا کوئی اثر نہ ہو۔

خلائی دوروں نے کائناتی شعاعوں کی تحقیق میں کافی مدد دی ہے۔ امریکہ کے ہر ایک اپالو اور روس کے ہر ایک سویز مشن کے دوران کائناتی شعاعوں پر تحقیق کی گئی چنانچہ دسمبر ۱۹۷۲ء میں جسم، دماغ اور آنکھوں پر ان شعاعوں کے اثرات کا اندازہ لگانے کے لئے اپالو-۱۷ کے ساتھ چاند کے اطراف چکر لگانے والے لونار ماڈیول میں اعلیٰ نسل کے پانچ جیبی چوہوں کو بھیجا گیا تھا جن کے جسم میں کائناتی شعاعوں کے اثرات کا پتہ لگانے والا ایک ایکسرا آلہ بھی جڑا ہوا تھا۔

کائناتی شعاعیں فضا میں موجود گیسوں کے سالموں سے ٹکرا کر نہ صرف ان میں تعاملیت پیدا کرتی ہیں بلکہ کئی ایک عناصر کے ریڈیو آئی سوٹوپس (Radio Isotopes) پیدا کرتی ہیں۔ ان میں ہائیڈروجن، بریلیم، بوران اور کاربن کے ریڈیو آئی سوٹوپس قابل ذکر ہیں جن کا مطالعہ اغراض کے لئے کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

کائناتی شعاعوں کی وجہ سے فضا میں پیدا شدہ بریلیم کا ریڈیو آئی سوٹوپ بارش کے ساتھ مل کر زمین تک آتا ہے۔ بارش کے پانی میں اس کی صحیح مقدار کی موجودگی بادلوں کی حرکت جاننے میں مدد دیتی ہے۔ اس کے علاوہ سطح زمین کے نیچے پائے جانے والے ذخائر میں ہائیڈروجن کے ٹریٹیم آئی سوٹوپ کی مقدار کی مدد سے پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ پانی وغیرہ

میں ایک اور کسی شے سے شامل ہو گیا ہے۔ اس تکنیک کے ذریعے (۱۴) سال پرانے آبی ذخیرہ
بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

کاربن کا ریڈیو آئی سوٹوپ جاندار مادوں میں جذب ہوتا رہتا ہے۔ جب جاندار مر
زمین کی پرتوں کا ایک حصہ بن جاتے ہیں تو آئی سوٹوپ کا جاذبی عمل بند ہو جاتا ہے جب کہ مردہ
مادوں جیسے لکڑی، ہڈیوں وغیرہ میں موجود آئی سوٹوپ اپنا تابکاری عمل جاری رکھتے ہیں۔
کاربن ریڈیو آئی سوٹوپ کے تابکاری عمل کا مطالعہ کرکے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کسی جاندار کو
مرے ہوئے کتنے سال بیت چکے ہیں۔ اس طرح کسی بھی مردہ چیز کی دس ہزار سال کی عمر تک
معلوم کی جا سکتی ہے۔

کائناتی شعاعوں کا پیدا کردہ بیران ریڈیو آئی سوٹوپ بارش کے پانی کے ذریعے سمندر
میں پہنچ کر اس کی تہہ میں جم جاتا ہے اس طرح سالہا سال سے جمع شدہ مٹی کی پرتوں میں موجود
بیران ریڈیو آئی سوٹوپ کا مطالعہ سمندری مٹی کی پرتوں کی تہہ کاری کی شرح معلوم کرنے
مدد دیتی ہے جو شعبہ طبقات الارض میں تحقیق کے کام آتی ہے۔ علاوہ ازیں اس کی مدد سے کئی سو
قبل کائناتی شعاعوں میں پائی جانے والی طاقت کا پتہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔

کائناتی شعاعوں پر دوسرے ملکوں کی طرح ہمارے ملک میں بھی کافی تحقیق ہو رہی ہے جس
ابتدا ۱۹۴۵ء میں ہومی بھابھا نے ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ بمبئی میں کی تھی۔ انہوں نے نہ صرف سائنسی اعتبار
تحقیق کی بلکہ انسانی فلاح و بہبود کے لئے ان شعاعوں کے استعمال پر کارآمد اور غیر متوقع کامیابیاں حاصل
چنانچہ آج بھی ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ سطح زمین سے نیچے پائے جانے والے آبی ذخائر کا مطالعہ اور انسانی
کے لئے ان کا صحیح استعمال برسنے والے مانسون بادلوں کی نقل و حرکت کو سمجھنے اور [illegible] کی تا
معلوم کرنے میں ان شعاعوں کی تحقیق سے مدد لے رہا ہے۔

کائناتی شعاعوں کی تحقیق پازیٹران (Positron) اور میزان (Meson) جیسے اہم
کی دریافت کا باعث بنی۔ اس دریافت کی وجہ سے جوہر کی ساخت کو سمجھنے میں مدد ملی ہے۔ ان
پر آج تک اتنی تحقیق ہو چکی ہے کہ ان پر بیسیوں کتابیں اور سینکڑوں مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ اس
باوجود ان شعاعوں کا مبدا آج بھی دنیا کے سائنسدانوں کے لئے ایک چیلنج بنا ہوا ہے۔

□□

ناصرہ

ننھی منی کہانیاں

① ٹھنڈی سڑک

کتنی کڑی دھوپ ہے۔ سورج کی تیز کرنیں کتنی تمازت رکھتی ہیں۔ میں تو کب سے چل رہی ہوں لیکن کیا یہ دھوپ یہ گرمی کی حدت پہلے نہیں تھی؟ کیا سورج آگ نہیں برسا رہا تھا؟ میں ایک لمحہ کے لئے رکتی ہوں اور پلٹ کر دیکھتی ہوں ــــ اب تک، نصف صدی کا طویل راستہ ــــ میں ایک سایہ دار درختوں والے راستے پر چل رہی تھی۔ لیکن وہ راستہ طے ہو گیا ــــ اب تو بس یہی گرم راستہ ہے، زندگی کے راستے پر درختوں کا سائبان بنی ٹھنڈی چھاؤں میری اماں تھیں ــــ

---

② تلاش

مدراس میں شادیوں میں قاعدہ تھا کہ بی بیوں (خواتین) میں پان بانٹے جاتے تھے یہ کام چھوٹی چھوٹی بچیاں کیا کرتی تھیں ــــ ہماری تائی ماں بتلایا کرتی تھیں کہ انہیں محفلوں میں پان بانٹنے کا بہت شوق تھا۔ ان کی ماں جب مری تھیں تو وہ تین چار سال ہی کی تھیں۔

تائی ماں جب بال بچے والی ہو گئیں تو بتاتی تھیں کہ وہ پان اس لئے بانٹتی تھیں کہ وہ سمجھتی تھیں کہ کہیں نہ کہیں انہیں اپنی ماں نظر آجائیں گی۔

---

③ دیوانی

اس گھر کو کھجور کے جھاڑ کا گھر کہتے تھے کیونکہ اس گھر کے سامنے ایک بڑا کھجور کا درخت تھا وہ جہاں معظم جاہی مارکٹ ہے۔ مارکٹ بنتے وقت وہ سب گھر مارکٹ کے احاطے میں آگئے۔ اس کھجور کے درخت کے گھر میں وہ رہا کرتی تھیں۔ بس سارا دن گھر کے سامنے جھاڑو دے جھاڑتی رہتی تھیں لوگ کہتے کہ وہ دیوانی ہیں۔

اس گھر کے مالک کی وہ تیسری بیوی تھیں۔ بیٹا یا تیسں صاحب خانہ کا عالم میں جاتا تھا، بعد میں اس کے حالی احوال بھی نہیں پوچھتے تھے لیکن وہ تو بھی اسی گھر میں تھیں۔ سہ پہر کے وقت ان کے دوستوں کی محفلیں جمتی تو لوگ مذاق سے کہتے کہ ایک گھڑا سبز سینڈھی روزانہ لائی جاتی ہے۔ انہیں ان محفلوں سے کوئی تعلق نہ تھا وہ تو بس ہاتھ میں جھاڑو لئے گھر کے سامنے جھاڑو دیا کرتیں۔ لوگ کہتے تھے دیوانی ہے دیوانی ــــ وہ کہتیں "ای، کیتے کانٹے پڑے ہیں رستے میں، جھاڑو نہ دوں گی تو چبھیں گے نا لوگاں کو "۔

الف لیلیٰ

میں جب چار پانچ سال کی تھی تو اماں مجھے کہانیاں سناتی تھیں۔ ایک بار جب وہ میرا سر دبا رہی تھیں تو انہوں نے کہانی سنائی تھی:

"ایک بادشاہ تھا وہ بہت ظالم تھا۔ ہر روز وہ ایک شادی کرتا اور دوسرے دن صبح میں اپنی دلہن کو مار ڈالتا۔ لوگ اسے اپنی بیٹی دینے سے ڈرتے تھے۔ شہر میں ایک غریب آدمی تھا اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک رات بڑی بہن اور چھوٹی بہن باتیں کر رہی تھیں۔ چھوٹی بہن نے کہا کہ بادشاہ کتنا ظالم ہے کتنی عورتوں کو مروا ڈالا۔" بڑی بہن نے جواب دیا۔ "وہ سب بیوقوف عورتیں تھیں چپ چاپ مر گئیں۔ اگر میں ان کی جگہ ہوتی تو ہرگز نہیں مرتی۔" اتفاقاً اس رات بادشاہ شہر میں گشت لگا رہا تھا۔ جب اس نے بڑی بہن کی بات سنی تو اس کو خیال آیا کہ اس لڑکی سے شادی کرنی چاہیئے اور جب صبح لڑکی کے باپ کے پاس بادشاہ کا پیغام پہنچا ہے تو وہ دہشت سے تھر تھر اجاتا ہے لیکن جب لڑکی کو معلوم ہوتا ہے وہ دلاسہ دیتی ہے اور آہستہ اپنی چھوٹی بہن کو بلا کر کہتی ہے ــــ "رات کو تم میری پلنگ کے نیچے چھپ جانا اور جب آدھی رات گذر جائے تو مجھ سے ایک کہانی سنانے کے لئے کہنا۔" چنانچہ آدھی رات کو چھوٹی بہن بڑی بہن سے کہنے لگی "آپا! صبح ہوتے ہی تم تو قتل ہو جاؤگی۔ اب رات کٹنے کے لئے ایک کہانی ہی سنا دو ــــ شہرزاد کہانی شروع کرتی ہے لیکن وہ بڑی ہوشیار لڑکی تھی جب صبح کی اذان ہوتی ہے تو وہ کہانی کو ادھورا چھوڑ دیتی ہے اور کہتی ہے "خدا حافظ اب صبح ہو گئی کہانی بڑی لمبی ہے اب وہ پوری نہ ہو سکے گی۔" بادشاہ کو بھی کہانیاں سننے کا بڑا شوق تھا، دن کو کہانیاں سنتے ہیں تو مسافر راستہ بھول جاتے ہیں اس لئے وہ شہرزاد کو

پہنچا کر قتل... اس طرح بہت سی جانیں قتل ہونے سے بچ گئیں۔ لیکن شہرزاد نے جو بہت ہوشیار لڑکی تھی
بڑی ہوشیاری سے پہلی کہانی ختم کرتے کرتے دوسری شروع کر دی جس کی باتیں ایسی تھیں کہ بادشاہ اس کو سننے کے لئے بے چین رہتا۔ پھر وہ دوسری کہانی شروع
ہے۔ یہ کہانی بیچ میں ادھوری رہ جاتی ہے۔ اس طرح ہر صبح شہرزاد قتل سے بچتی رہی اور ہر رات
ادھوری چھوڑتی رہی۔ اس طرح سے ایک ہزار رات وہ کہانیاں سناتی رہی اور قتل سے
بچتی رہی۔ پھر اس کو ایک لڑکا ہوا اور بادشاہ کو سمجھ آگئی کہ بیوی کو قتل نہ کرنا چاہئے۔ سب
بہانہ بنایا تھا۔ ایک کتاب ہے الف لیلیٰ جس کے معنی ہیں "ہزار راتیں" اس میں بڑی
اچھی کہانیاں ہیں جیسے الہ دین کا چراغ، سندباد جہازی، علی بابا اور چالیس چور
پڑھنا جلد سیکھ جاؤگی تو خود ہی ایسی اچھی اچھی کہانیاں پڑھ سکوگی۔

جب میں کہانیاں کہنے لگی تو جو بھی کہانی سننے کی خواہش کرتا ضرور شہرزاد کی
اس تعارف کے ساتھ سناتی کہ کب اور کیسے سنی اور جس طرح میرے دل میں الف لیلیٰ
کا اشتیاق پیدا ہوا تھا اسی طرح ہر کہانی سننے والا بچہ الف لیلیٰ پڑھنے کا اشتیاق ظاہر کرتا

⑤ ایک لاکھ روپیہ کی کتاب

ہمارے اجداد میں ایک جد کو طب میں بھی بڑا دخل تھا۔ وہ نوابان کرناٹک کے
دربار سے وابستہ تھے۔ نواب صاحب بیمار ہو گئے تھے ان کی دوا سے بہت فائدہ ہوا۔ اچھے
ہونے کے بعد نواب صاحب نے ایک جاگیر دینی چاہی جس کی قیمت اس زمانہ میں ایک لاکھ آنکی جاتی
۔ لیکن ہمارے جد نے نواب صاحب سے عاجزانہ التجاء کی تھی کہ انہیں جاگیر نہیں چاہئے پھر
کیا چاہتے تھے؟ انہوں نے نواب صاحب کو بتایا کہ وہ تو بس ایک کتاب چاہتے ہیں" جو
نواب صاحب کے کتب خانہ میں موجود ہے ۔۔۔ اور وہ کتاب ان کو مل گئی۔

⑥ استاد اور شاگرد

ہمارے انہیں جد کے بچپن کا زمانہ تھا ان کو عربی کی ایک کتاب پڑھنے کا بے حد شوق تھا
ایک بہت بڑے عالم تھے جو نواب صاحب کے دربار میں بڑے عہدہ پر تھے اور روزانہ ... دیا

... ہو کر دریا کنارے یا گھر پر ... نے پڑھنے کا شوق ظاہر کیا۔ انہوں نے کہا کہ
پڑھانے سے تو انکار نہیں ہے لیکن وقت کا سوال ہے۔ ان کو اس وقت فرصت ملتی ہے جب وہ اپنے گھر سے نواب صاحب کے دربار تک اپنے میانے میں جا رہے ہوتے ہیں۔ اگر پڑھنا ہو تو اس وقت آجانا۔ استاد کے ساتھ میانے میں بیٹھنا یا دوسرے میانہ پر سوار ہو کر برابر چلنا استاد کی بے ادبی تھی۔ اس لئے میانے کے ساتھ دوڑتے دوڑتے پڑھنا پسند کیا۔ اور یہ فاصلہ دور دراز کا فاصلہ تھا دریا کنارے سے لے وادم کی پہاڑی تک دوڑتے جاتا تھا۔ چند دن اس طرح انہوں نے تعلیم حاصل کی پھر معلوم ہوا کہ ان کے استاد محترم ان کے شوق علم کی آزمائش کر رہے تھے۔ جب اندازہ ہوا کہ شوق علم کتنا گہرا ہے تو پھر ان کو اپنے گھر پر بلا کر پڑھایا۔

---

۵ آزادی نسواں

کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ ؟
آزادی نسواں کہ زمرد کا گلوبند

یہ ایک سوال ہے جو اقبالؒ نے عورتوں کے سامنے رکھا تھا۔

میں نے کشیدہ کاری سیکھی تھی اور پہلے ایک گلے کے گریبان پر کروشیا بنی تو شوق سے اماں کو بتلانے لگی۔ انہوں نے دیکھا، کچھ دیر خاموش رہی تھیں اور پھر پوچھا تھا کہ اس کے کرنے میں تم کو کتنی دیر لگی؟ میں نے وقت بتایا۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس بناوٹ پر جو وقت صرف ہوا اتنی دیر میں اگر تم ایک مضمون لکھتیں تو وہ شاید تمہاری بہتر صلاحیتوں کو صیقل کرنے میں مددگار ہوتا۔

□□

عورت کا حقیقی مقام اس کا اپنا گھر اور کنبہ ہے
عورت گھر اور کنبہ کی زینت اور عزت ہے

عربی کے سبق

فعل امر

جس فعل میں کسی کام کے کرنے کا حکم پایا جائے اسے فعل امر کہتے ہیں۔

امر حاضر معروف بنانے کا قاعدہ یہ ہے کہ (۱) مضارع حاضر معروف کی علامت (تـ) کو گرا کر آخر حرف کو جزم دیا جائے جیسے تَقِفُ سے قِفْ

(۲) اگر علامت مضارع (ت) گرانے کے بعد مادہ کا پہلا حرف ساکن رہ جائے تو شروع میں ایک ہمزہ لگا دیا جائے۔ (۳) اگر مادہ کے دوسرے حرف پر پیش ہو تو اس ہمزہ پر بھی پیش لگا یا جائے یعنی مضموم ہوگا جیسے تَنْصُرُ سے اُنْصُرْ

(۴) اگر مادہ کے درمیانی حرف پر زیر (ـِ) یا زبر (ـَ) ہو یعنی یہ مکسور یا مفتوح ہو تو یہ ہمزہ مکسور ہوگا جیسے تَغْسِلُ سے اِغْسِلْ اور تَفْتَحُ سے اِفْتَحْ

(۵) اگر مادہ کا آخری حرف، حرف علت یا نون اعرابی ہو تو مجزوم ہونے کے بجائے وہ گرا دیا جاتا ہے جیسے تَدْعُوْ سے اُدْعُ۔ (۶) ہمزہ سے شروع ہونے والے مادوں میں علامت مضارع (ت) کے ساتھ مادہ کے ہمزہ کو بھی گرا دیا جاتا ہے اور کچھ بھی اضافہ نہیں کیا جاتا جیسے تَأْكُلُ سے كُلْ تَأْخُذُ سے خُذْ (۷) امر کے ہمزہ کو کسی کلمہ سے ملایا جائے تو وہ گر جاتا ہے، جیسے اِذْهَبْ سے وَاذْهَبْ، اِجْلِسْ سے وَاجْلِسْ، اُعْبُدْ سے وَاعْبُدْ

امر غائب معروف و امر متکلم معروف بنانے کا قاعدہ یہ ہے کہ (۱) مضارع غائب معروف اور مضارع متکلم معروف کے صیغوں کے شروع میں لام مکسور لگا کر آخر حرف کو جزم دے دیا جائے، جیسے يَضْرِبُ سے لِيَضْرِبْ، اَضْرِبُ سے لِاَضْرِبْ

(۲) اگر آخر حرف، حرف علت ہو تو یہاں بھی بجائے مجزوم ہونے کے وہ گر جاتا ہے جیسے نَشْتَرِیْ [illegible]

گردان فعل امر معروف

	مذکر واحد	مذکر تثنیہ	مذکر جمع	مؤنث واحد	مؤنث تثنیہ	مؤنث جمع
حاضر	اُعْبُدْ [illegible] اِفْتَحْ اِضْرِبْ	اُعْبُدَا [illegible] اِفْتَحَا اِضْرِبَا	اُعْبُدُوْا [illegible] اِفْتَحُوْا اِضْرِبُوْا	اُعْبُدِیْ [illegible] اِفْتَحِیْ اِضْرِبِیْ	اُعْبُدَا [illegible] اِفْتَحَا اِضْرِبَا	اُعْبُدْنَ [illegible] اِفْتَحْنَ اِضْرِبْنَ

	واحد	تثنیہ	جمع	واحد	تثنیہ	جمع
غائب	لِيَنْظُرْ لِيَفْتَحْ لِيَضْرِبْ	لِيَنْظُرَا لِيَفْتَحَا لِيَضْرِبَا	لِيَنْظُرُوْا لِيَفْتَحُوْا لِيَضْرِبُوْا	لِتَنْظُرْ لِتَفْتَحْ لِتَضْرِبْ	لِتَنْظُرَا لِتَفْتَحَا لِتَضْرِبَا	لِيَنْظُرْنَ لِيَفْتَحْنَ لِيَضْرِبْنَ

	مذکر و مونث واحد	مذکر و مونث تثنیہ و جمع
متکلم	لِاَذْهَبْ ـ لِاَضْرِبْ	لِنَذْهَبْ ـ لِنَضْرِبْ

قِفْ أَمَامَ الْمَسْجِدِ (تو (مرد) مسجد کے سامنے ٹھیر ـ اِغْسِلْ يَدَيْكَ قَبْلَ الطَّعَامِ (تو (مرد) کھانے سے پہلے اپنے دونوں ہاتھ دھو) اُدْعُ الصَّائِغَ الْمَاهِرَ (تو (مرد) ماہر کاریگر کو بلا)

اُعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ (تم سب مرد) اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمھیں پیدا کیا)

اِرْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (تم سب، رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو) ـــ

اَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (تم سب اللہ کی راہ میں خرچ کرو) ـــ

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (تم سب نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو) ـــ

تُوْبُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا (تم سب مرنے سے پہلے توبہ کرو) ـــ

لِيَشْرَبْ مَعَنَا الشَّايَ (اس (مرد) کو ہمارے ساتھ چائے پینا چاہیے)

لِيَنْطِقَا بِالصِّدْقِ اَبَدًا (ان دونوں (مردوں) کو ہمیشہ سچ بولنا چاہیے)

لِتَفْتَحْ نَوَافِذَ الْحُجْرَةِ (اس (عورت) کو کمرہ کی کھڑکیاں کھولنی چاہئیں)

لِتَلْبَسَا الْمَلَابِسَ النَّظِيْفَةَ (ان دونوں (عورتوں) کو صاف کپڑے پہننے چاہئیں)

لِنَشْتَرِ الْقِرْطَاسَ وَالْحَقِيْبَةَ (ہمیں کاغذ اور کتابوں کا بستہ خریدنا چاہیے)

اَيُّهَا الْوَلَدُ! اِنْهَضْ مِنَ النَّوْمِ صَبَاحًا وَاعْبُدْ رَبَّكَ وَكُلْ وَاشْرَبْ وَالْبَسْ ثِيَابَكَ وَاذْهَبْ اِلَى الْمَدْرَسَةِ وَاجْلِسْ فِي الصَّفِّ بِالْاَدَبِ ـ وَاقْرَأْ دَرْسَكَ وَافْهَمْهُ ثُمَّ ارْجِعُوْا اَيُّهَا الْاَوْلَادُ! اِلَى الْبُيُوْتِ وَاشْرَبُوا الشَّايَ فَاخْرُجُوْا اِلَى الْحَدَائِقِ وَالْعَبُوْا مَعَ اَصْدِقَائِكُمْ، ثُمَّ ارْجِعُوْا قَبْلَ الْمَغْرِبِ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَاكْتُبُوْا

مِنْ رِزْقِ اللّٰهِ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا ثُمَّ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَارْقُدُوْا إِلَى الْفَجْرِ —

(اٹھ کر) صبح سویرے اٹھو اور اپنے رب کی عبادت کرو، پھر کھانا کھاؤ اور اپنا لباس پہن لو اور مدرسہ جاؤ اور جماعت میں ادب سے بیٹھو، اپنا سبق پڑھو اور اسے سمجھو۔ پھر اسے یاد کرو! اپنے گھروں کو واپس ہو جاؤ اور چائے پیو، اس کے بعد میدان کی طرف جاؤ اور اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلو پھر مغرب سے قبل واپس ہو جاؤ، اللہ کی عبادت کرو، مدرسہ کا ہوم ورک لکھ لو، اللہ کے دیے رزق سے کھاؤ پیو، پھر اپنے رب کی عبادت کرو اور فجر تک سو جاؤ۔

فعل نہی

جس فعل میں کسی کام کے کرنے سے روکا جائے اسے فعل نہی کہتے ہیں۔

نہی بنانے کا قاعدہ یہ ہے کہ (۱) مضارع کے شروع میں "لا" لگا کر آخر حرف کو جزم دیدیا جائے جیسے تَحْزَنُ سے لَاتَحْزَنْ (تو غمگین نہ ہو)۔ (۲) اگر آخر حرف، حرف علت ہو تو بجائے مجزوم ہونے کے وہ یہاں ہی گر جائے گا۔ جیسے تَمْشِیْ سے لَاتَمْشِ (تو مت چل)

گردان فعل نہی معروف

	مذکر واحد	مذکر تثنیہ	مذکر جمع	مؤنث واحد	مؤنث تثنیہ	مؤنث جمع
حاضر۔	لَاتَضْرِبْ	لَاتَضْرِبَا	لَاتَضْرِبُوْا	لَاتَضْرِبِیْ	لَاتَضْرِبَا	لَاتَضْرِبْنَ
غائب۔	لَايَضْرِبْ	لَايَضْرِبَا	لَايَضْرِبُوْا	لَاتَضْرِبْ	لَاتَضْرِبَا	لَايَضْرِبْنَ
متکلم۔	(مذکر مؤنث واحد) لَا اَضْرِبْ			(مذکر مؤنث تثنیہ جمع) لَا نَضْرِبْ		

لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (تو غم نہ کر درحقیقت اللہ ہمارے ساتھ ہے)

وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا (اور تو زمین پر اکڑ کر نہ چل)

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ (اور تم سچ کو جھوٹ کے ساتھ نہ ملاؤ)

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَاۗؤُكُمْ (اور تم ان سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپوں نے نکاح کیا)

وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (اور تم گناہ اور سرکشی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو)

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ — (اور تم فواحش کے پاس نہ پھٹکو)

وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ (اور تم شیطان کے قدم بقدم نہ چلو)

لَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ (تو کافروں اور منافقوں کی اطاعت مت کر)

وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ — (اور عورتیں اپنا سنگھار ظاہر نہ کریں)

وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ (اور عورتیں چوری نہ کریں اور زنا نہ کریں)

لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ (کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ)

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ إِمْلَاقٍ (اور مت قتل کرو تم اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے)

لَا تَذْهَبْ إِلَى الْمَدْرَسَةِ بِالتَّأْخِيرِ وَلَا تَضْحَكْ عَلَى أَحَدٍ وَلَا تَحْزَنْ دَائِمًا

وَلَا تَحْزَنْ وَلَا تَكْسَلْ (دیر سے مدرسہ مت جاؤ، کسی پر مت ہنسو اور ہمیشہ دل گیر نہ رہو غم نہ کرو اور سستی نہ کرو) —

لَا تَكْذِبُوا فَإِنَّ الْكِذْبَ خَصْلَةٌ مَذْمُومَةٌ (تم سب جھوٹ نہ بولو کیونکہ جھوٹ بری عادت ہے)

وَلَا تَقْرَؤُوا وَقْتَ اللَّعِبِ وَلَا تَلْعَبُوا وَقْتَ الْقِرَاءَةِ (کھیل کے وقت مت پڑھو اور پڑھائی کے وقت مت کھیلو)

لَا تَسْأَلُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ (لوگوں سے ان کی چیزیں مت مانگو)

وَلَا تَجْعَلُوا مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ (اللہ کے ساتھ کسی دوسری طاقت کو شریک نہ بناؤ)

وَاعْبُدِ اللّٰهَ وَلَا تَتْرُكِ الصَّلٰوةَ أَبَدًا (اللہ کی عبادت کر اور نماز کو کبھی ترک نہ کر)

وَاذْهَبْ إِلَى الْمَدْرَسَةِ فِي وَقْتِهَا وَاجْلِسْ فِي الصَّفِّ بِالْأَدَبِ

(مدرسہ وقت پر جا اور جماعت میں ادب کے ساتھ بیٹھ)

كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللّٰهِ وَاشْكُرُوا لَهُ (اللہ کے (دئے ہوئے) رزق سے کھاؤ پیو اور اس کا شکر ادا کرو)

اُنْصُرُوا الْمَسَاكِينَ وَارْحَمُوهُمْ وَلَا تَظْلِمُوهُمْ (مساکین کی مدد کرو، ان پر مہربانی کرو اور ان پر ظلم نہ کرو)

اِفْعَلُوا الْخَيْرَ وَاصْدُقُوا دَائِمًا فَإِنَّ الصِّدْقَ مَحْمُودٌ وَلَا تَكْذِبُوا فَإِنَّ الْكِذْبَ مَذْمُومٌ

(اچھا کام کرو، ہمیشہ سچ بولو بے شک سچ قابل تعریف ہے اور جھوٹ نہ بولو بے شک جھوٹ قابل مذمت ہے) —

اِعْمَلُوا بِهٰذِهِ النَّصَائِحِ (ان نصیحتوں پر عمل کرو)

حرف آخر

سب سے پہلے آپ کو ایک معیاری اور افادی رسالہ کی تخلیق پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ "شاداب" کا تیسرا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ شاداب اردو ادب کا ایک منفرد رسالہ ہے اور اس میں آپ کی محنت و عرق ریزی عیاں ہے۔ وہ بھی انگریزی میڈیم کے ماحول شہر سے ایک ایسا خوبصورت، مقصدی، علمی، ادبی، سماجی، تہذیبی و معاشی مضامین پر مشتمل رسالہ نکالنا آسمان سے تارے توڑنے کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر صفی تبسم اور جناب مصطفیٰ بشیر وانی کے مضامین بے حد پسند آئے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کا انٹرویو بھی نہایت دلچسپ اور شگفتہ ہے۔

"دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار" کہتے ہوئے میں آپ تمام اراکین ادارہ کو ہدیہ تہنیت پیش کرتا ہوں۔ قادر مطلق آپ کے حوصلوں کو ہمیشہ توانا اور قائم رکھے۔ آمین۔

(میر تراب علی سید اللہی صدر شعبہ اردو پربھنی
رکن اردو اکیڈیمی مہاراشٹرا)

"شاداب" برابر نکھرتا جا رہا ہے اس کے لئے مبارکباد قبول فرمائیں۔ تازہ ترین شمارے کے سبھی مضامین خوب ہیں۔ مئی کے شمارہ میں "تہذیب و ثقافت" کے زیر عنوان ڈاکٹر غلام کبریا خاں کا مضمون نوجوان نسل کی رہنمائی کے لئے کافی ہے۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد کا مضمون "جامعہ عثمانیہ کا تخیل" اور محترمہ شیخ نامرہ بیگم کا جائزہ "تہذیب کا مشرع فرد یا معاشرہ" بے حد پسند آئے اور ان معلوماتی مضامین کو پڑھ کے مسرت ہوئی۔ یہاں اورنگ آباد کے ادبی حلقوں میں "شاداب" اب جگہ بنا رہا ہے۔ خوب سے خوب تر بنانے کے لئے آپ کی کوششیں لائق ستائش ہیں۔ طنز و مزاح کو نظر انداز نہ کرنے کا مشورہ پہلے بھی دیا تھا اب بھی دے رہا ہوں۔ ان مضامین کی کمی شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے۔

حسینی جاوید
جبرقست (اورنگ آباد)

"شاداب" ایک علمی، ادبی، دینی اور سماجی میگزین ہے۔ زیر نظر شمارہ ماہنامہ "شاداب" کا چھٹا شمارہ ہے جو ماشاء اللہ اچھے اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ اس میں کئی بلند پایہ تحقیقی مضامین شریک اشاعت ہیں مثلاً ڈاکٹر محسن الدین احمد صاحب کا "جامع [illegible] کی تحلیل" اور ڈاکٹر غلام کبریا خان شبلی کا "تہذیب و ثقافت" نیز دوسرے ادبی مضامین و نظمیں و غزلیں بھی ہیں۔ غرض ادب، علم اور فن سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے بہت خوب ہے۔ گٹ اپ عمدہ، کاغذ و طباعت اعلیٰ اور کتابت غنیمت ہے

(حکیم محمد اجمل خان مدیر مجلہ اہلحدیث)

"شاداب" کا ساتواں شمارہ بڑا جامع اور پرکار ہے۔ ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور ہم سے جدا ہو گئے۔ قوم کا آخری انٹرویو "اردو سے خواجہ صاحب کا رومان" اردو سے ان کے تعلق خاطر کو ظاہر کرتا ہے ضرورت ہے کہ اردو کے لئے ان کے کام کو آگے بڑھایا جائے۔ ڈاکٹر منشاء کا منظوم خراج عقیدت دل سے اور دل پر اثر کرتا ہے۔ لیڈی زینب کے دلچسپ اور اثر انگیز تاثرات سفرنامہ حرمین جاری ہیں۔ نیز "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" میں اس کی تشریح و وضاحت کے ساتھ نئے زاویے سے اس کی کلیدی حیثیت بتایا گیا ہے۔ "واقعہ ہجرت کا معاشی اشتراک" بھی فکر انگیز ہے۔ ادبی حصہ بھی اعلیٰ پایہ کا اور معیاری ہے۔ "امام اقبال" پر حیات آفریں نظر ڈالی گئی ہے۔ "لغات غالب" ایک خالص ادبی مضمون ہے جب کہ "بلبل دانش" پر جناب جگن ناتھ آزاد کا مضمون ان کی شاعری اور شخصیت دونوں کو اجاگر کرتا ہے ہم احسان دانش کو مجسم اپنے سامنے پاتے ہیں۔

(ڈاکٹر محمد منصور خان۔ چھندواڑہ)

"شاداب" کا ساتواں شمارہ ملا، بہت خوب ہے۔ جہاں "صوتی آلودگی" جیسا مضمون لکھ کر کے آپ نے اردو داں طبقہ کے لئے سائنسی معلومات کی فراہمی کا اہتمام کیا ہے وہیں "نیند پر ایک" سا دلچسپ انشائیہ "دامن دل" کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے موجود ہے۔ خواجہ عبدالغفور کو منظوم خراج عقیدت اور ان کا آخری انٹرویو، اردو کے لئے ان کی خدمات کا اعتراف ہے۔ شاداب کے معیاری حصے نثر و نظم، بڑے جاندار ہیں۔

میر لائق علی۔ مراد نگر حیدرآباد

حمد باری تعالیٰ

فارسی ترجمہ فاطمہ شاہد پروین

الٰہی! بڑا تیرا احسان ہے
کہ مخلوق کا تو نگہبان ہے

ہے رزاق سارے زمانے کا تو
کہ مختار ہے دانے دانے کا تو

ترا شکر ادا کر سکے کیا زباں
زباں میں بھلا اتنی طاقت کہاں

ترے فیض کا ہے اثر چار سو
چمن کو دیئے پھول پھولوں کو بو

بلندی پہاڑوں کو دی اس قدر
کہ تھکتی ہے چوٹی پہ جا کر نظر

نہ کیونکر ترا شکر بلبل کرے
کہ خوشبو سے پھولوں نے دامن بھرے

کرم سے ہے تیرے یہ ساری بہار
نہیں کچھ تری نعمتوں کا شمار

بڑی تیری قدرت، بڑی تیری شان
کیا تو نے سورج سے روشن جہاں

•—•

الٰہی بزرگ است احسانِ تو
کہ با خلق ہستی نگہبان تو

تو رزاق ہستی بہ ایں کل جہاں
و مختار ہر دانہ زیں کل جہاں

کجا ایں زباں شکر گوید ترا
کجا ہست قدرت زبان مرا

ایں تاثیر فیضان تو چار سو
چمن را گلے، گل پر از رنگ و بو

بلند آں چناں کوہ را کردئی
نگہ خستہ شد چوں بر آں بردئی

تشکر نیارد چرا عندلیب؟
کہ خوشبو بہ گلہا تو کردی نصیب

ز بخشائش تو جہاں پر بہار
کجا ایں بشر کرد نعمت شمار

عظیمی و قادر تو اے لامکاں
ز خورشید کردی تو روشن جہاں

•—•

نعت رسول

نام احمد جو کان میں آئے
جان در اصل جان میں آئے

بارشِ نور ہو گئی ہر سو
آپ جب اس جہان میں آئے

سب خدا کی یہ مصلحت ہے کہ آپ
لامکاں سے مکان میں آئے

خاک کی عظمتیں بڑھانے کو
آپ اس خاکدان میں آئے

رتبۂ عالی شہ کونین
کیسے ذہن و گمان میں آئے

ایسی رفعت کسے نصیب ہوئی
نام نامی اذان میں آئے

اللہ اللہ شانِ لطف و کرم
جانی دشمن امان میں آئے

سیر افلاک اک معجزہ ہے
جا کے بس ایک آن میں آئے

ہستی والا شان کے صدقے
خاک والے بھی شان میں آئے

دین و دنیا اسی کی سمجھیں گے
اسوۂ پاک دھیان میں آئے

احمد و احد خود سمجھ لیں گے
میم کیوں درمیان میں آئے

اب کرم کیجیے کہ عشرتؔ بھی
طیبہ کے گلستان میں آئے

ڈاکٹر عشرتؔ

غزل حافظ شیرازی

آزاد ترجمہ رشید [illegible]

الا یا ایها الساقی ادر کاساً و ناولها
که عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلها

مجھے ہے انتظارِ گردشِ ساغر، پلا ساقی
کہ عشق آسان ہے پہلے، مگر انجام مشکل ہے

به بوئے نافه کاخر صبا زاں طره بگشاید
ز تاب جعد مشکینش چه خوں افتاد در دلها

قسم ہے اس کی جو خوشبو نسیمِ صبح لائی ہے
ترے گیسو کے پیچ و خم نے کتنا خوں رلایا ہے

به مے سجاده رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
که سالک بے خبر نبود ز راه و رسم منزلها

اگر حکمِ مغاں ہو تو مصلیٰ غرقِ مے کر دے
کہ سالک منزلوں کے پیچ و خم سے خوب واقف ہے

مرا در منزل جاناں چه امن عیش چوں هر دم
جرس فریاد می دارد که بر بندید محملها

مقامِ عشق میں راحت میسر ہو تو کیسے ہو!؟
ہے فریادِ جرس ہر دم کرو چلنے کی تیاری

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں هائل
کجا دانند حال ما، سبکساران ساحلها

اندھیری رات، ڈر موجوں کا، گرداب بلا حائل
ہمارا حال کیا جانیں "لبِ ساحل" جو بیٹھے ہیں

همه کارم ز خودکامی به بدنامی کشید آخر
نهاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلها

مری خود کامیوں نے آخرش بدنام کر ڈالا
چھپے وہ راز کیوں کر، ذکر جس کا محفلوں میں ہو

حضوری گر همی خواهی، از او غائب مشو حافظ
متیٰ ما تلق من تهویٰ دع الدنیا و اهملها

نہ ہو تو اس سے غافل قرب کا خواہاں ہے گر حافظ
تمنائے وصالِ یار ہے تو ترکِ دنیا کر

غزل

محمد منظور احمد

آغازِ سفر کے اپنے سپنے
دیوانے کا خواب ہو گئے ہیں

پڑھتا ہے تو کوئی پڑھ لے ہم کو
اب ہم بھی کتاب ہو گئے ہیں

وعدے، قول و قرار، رشتے
سب مثلِ حباب ہو گئے ہیں

انمول سے زندگی کے لمحے
بس نذرِ سراب ہو گئے ہیں

پل بھر کے لئے تھے جلوہ فرما
کس کس بیحساب ہو گئے ہیں

جو لمحے کہ تری دھن میں بیتے
لمحات ثواب ہو گئے ہیں

تھی ایک نگاہ دلربا وہ
کس کس سے خطاب ہو گئے ہیں

بیتی ہوئی زندگی کے قصے
اب ایک عذاب ہو گئے ہیں

ہشیاری کی جن سے تھی کچھ امید
وہ مست و خراب ہو گئے ہیں

اس دور کے نوجوان منظور
مانندِ شباب ہو گئے ہیں

— ♦ —

غزل

نعیم

عشق کا زخم دل و جاں میں نہاں ہوتا ہے
حسن والوں کو یہ احساس کہاں ہوتا ہے

حسن معصوم جہاں رو بہ جواں ہوتا ہے
آنکھ والوں کو قیامت کا سماں ہوتا ہے

مجھ کو اپنوں نے فریبوں سے نوازا اتنا
دوست پر بھی مجھے دشمن کا گماں ہوتا ہے

امن کا شہر تو اب قتل گہ امن بنا
جس سے ملئے وہ فقط نوحہ کناں ہوتا ہے

عشق اور مشک چھپائے سے نہیں چھپ سکتے
درد اٹھتا ہے تو چہرے سے عیاں ہوتا ہے

حسن کے جور کو بس جور نہ سمجھو اس میں
ناز کرنے کا بھی انداز نہاں ہوتا ہے

یوں تصور میں شب و روز رہا کرتا ہوں
جیسے کوئی مری جانب نگراں ہوتا ہے

آنے والے سبھی لمحات ہیں اپنے بس میں
وقت گذرا ہوا قابو میں کہاں ہوتا ہے

اعتراف آپ کریں یا نہ کریں یہ سچ ہے
دل پسند نگہ ناز بتاں ہوتا ہے

کبھی ہنس ہنس کے عزیزوں کے ستم سہتے تھے
اب تو احساسِ محبت بھی گراں ہوتا ہے

بھولنا چاہے تو وہ اور بھی یاد آئے نعیم
یاد کے ساتھ ہی ہر زخم جواں ہوتا ہے

غزل

عزیز قیسی

بھڑکے دیپ سسکتے ہیں کوئی اک سادے
کوئی تو آئے جو سینوں کی برف پگھلا دے

سنا ہے درد میں پائندگی بھی ہوتی ہے
اک ایسے درد کی حاجت ہے کوئی دلا دے

سحر سے شام ہوئی صرف گفتگو کب تک
لفافہ بند کرو اور اس کو لب سے چپکا دے

یہ میری عمر ہے یا تیری رات زلف دراز
سحر نہیں نہ سہی میری نیند لوٹا دے

تجھے قبول نہیں گر عطائے شبنم بھی
تو اس اجاڑ بیاباں پہ آگ برسا دے

ہے آستین بھی اجلی مرے کفن کی طرح
اس احتیاط پہ قاتل کو پھول پہنا دے

گواہ گور غریباں سے لاؤں تیرے خلاف
خدا مجھے جو گھڑی بھر دم مسیحا دے

بندھا ہے رخت سفر بجھ رہا ہے دل کا الاؤ
عزیز قیسی کو پھر سے پیام لیلیٰ دے

غزل

عرفان پربھنوی

زندگی نور بھی، خوشبو بھی ہے نغمہ بھی ہے
زندگی دھوپ بھی، تپتا ہوا صحرا بھی ہے

باتیں ہمدردی کی کرتے ہیں یہاں سب لیکن
بانٹ لے دکھ جو کسی کا کوئی ایسا بھی ہے

یوں تو شیشے کئی ٹوٹے ہوئے دیکھے ہوں گے
دل کسی کا کبھی ٹوٹا ہوا دیکھا بھی ہے

اس کو نزدیک سے دیکھا ہے سبھی نے لیکن
زندگی کیا ہے کسی نے اسے سمجھا بھی ہے

چاند کی مٹی پرکھنے کو چلے ہو عرفان
اپنی مٹی کو کبھی آپ نے پرکھا بھی ہے

غزل

عبدالرحمٰن خاں ہمدم
کسام گانوی

تو فریبِ ذوقِ نمو نہ کھا، یہ جہاں جہانِ حجاب ہے
کہ طلسم خانۂ کن فکاں ہی خود ایک نقش بر آب ہے
ترے رعبِ حسن کے سامنے کسے لب کشائی کی تاب ہے
ہے مرا سکوت ہی ترجماں، نہ سوال ہے نہ جواب ہے
تو خودی سے اپنی ہے سرنگوں، کوئی شکوہ پیرِ مغاں سے کیوں
کہ جہاں میں روزِ الست ہی سے تہی سبوئے حباب ہے
ابھی پہلی ہچکی ہے نزع کی، ذرا سن لے نغمۂ واپسیں
ابھی مرتعش کوئی اور دم، مری زندگی کا رباب ہے
ترے اک عمامہ کی کائنات ہی شیخ توبہ فروش کیا
کہ یہاں تو دولتِ عقل و دیں ہی صرفِ رہنِ شراب ہے
تجھے ڈھونڈوں جا کے کنشت میں تو لے کعبہ بڑھ کے قدم مرے
جو تری رضا کا سبب بنے تو خطا بھی عین ثواب ہے
جو ملی ارم نہ ملا خدا، تو اسیرِ دامِ طلب رہا
نہ ہو جنگ بیم و رجا اگر تو ثواب ہے نہ عذاب ہے
یہاں جبر و قدر کی وسعتیں ہی ابتدائے ذوقِ گنہ نہ تھیں
نہ خفا ہو رحمتِ ایزدی کہ یہ مجرموں کا جواب ہے
ابھی اور دینا ہے امتحاں، نہ مٹے وفا کا مری نشاں
اے حیات پا بہ رکاب رک کہ تجھی سے انقلاب ہے
وہ حقیقتیں، ہوئی ایک عمر تباہ جن کی تلاش میں
ہوئیں بے نقاب تو یہ کھلا کہ وہاں بھی ایک نقاب ہے
لے معصیت کے عوض اگر تو زکاۃ ڈالوں نہ خلد میں
نہ ہو جس میں رنگ گناہ کا تو اسے شیخ شانِ ثواب ہے

رفقاء سے

انور کمال کانوی

دوستو! آؤ زمانے کے مقابل ہو جائیں
ہم سے برہم ہی رہے گا یہ زمانہ کب تک
تذکرہ صبح جہاں تاب کا چھیڑیں ہم بھی
یہ شب غم کی سیاہی کا فسانہ کب تک

اس شب تیرہ کو پیغام سحر دینا ہے
اک نئی صبح کی دینا ہے زمانے کو خبر
دور کرنا ہے طبیعت سے شب دوش کا غم
غم کے ماروں کو دکھانا ہے خوشی کا منظر

ساتھیو! منزل مقصود کی جانب لپکو
زندگی کی نئی راہوں سے گذرنا ہے تمہیں
راہ میں آئیں گے دشوار مقامات کئی
آتش غم سے گذر کر ہی نکھرنا ہے تمہیں

راہ دشوار ہے پرخار ہے لیکن پھر بھی
انہیں کانٹوں کو کچلتے ہوئے جانا ہوگا
راہ پرپیچ میں آئیں گے کئی سنگ گراں
عزم محکم ہے تو ان سب کو ہٹانا ہوگا

راہیو! راہ کی سختی سے نہ گھبرا جانا
دل کو ہر وقت ہے اپنی ہی منزل کی لگن
شوق تازہ ہے تو منزل پہ پہنچ کر دم لو
عیش بنجاتی ہے منزل پہ مسافر کی تھکن

محبت اور حسن

مترجم: مسز غواص لاہوری

(کشمیری نظم کا انگریزی سے ترجمہ)

بات اس وقت کی ہے جبکہ
نہ تو محبت اندھی تھی اور نہ حسن گونگا تھا
ایک دن دونوں ایک ساتھ گھوم رہے تھے کہ
پونم کا چاند طلوع ہوا

محبت کی نظریں چاند پر جم گئیں!!
حسن کو یہ بات بڑی ناگوار گذری

اس نے اپنی بڑائی
اور چاند کی برائی شروع کر دی!

محبت کو اس پر بڑا تاؤ آیا
اور دونوں میں ہاتھا پائی ہونے لگی!
حسن نے بڑھ کر محبت کی آنکھیں پھوڑ دیں
محبت نے حسن کی زبان کھینچ لی!!

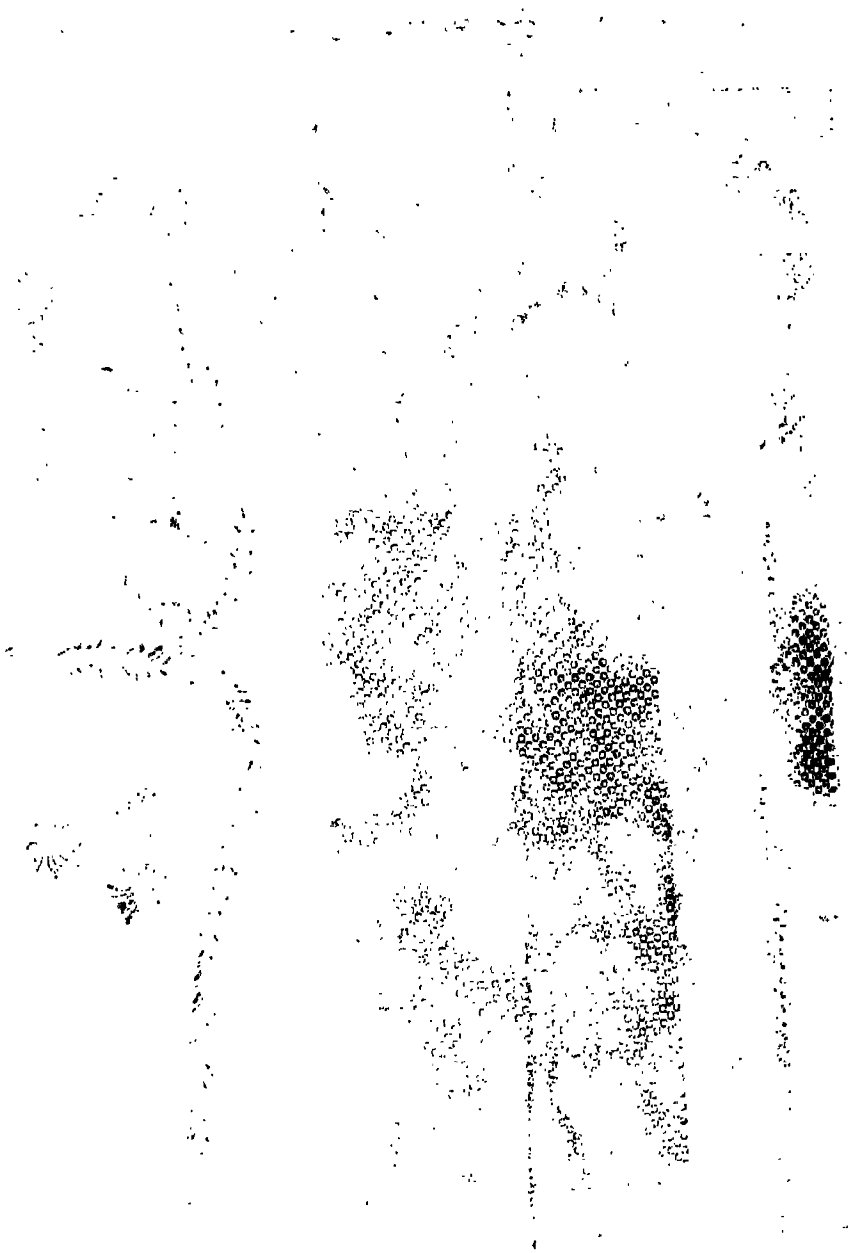
اس وقت سے
محبت اندھی اور حسن گونگا ہے!!

Monthly SHADAAB Hyd

11-5-147, RED HILLS, HYD-500 004.

Vol 1 No 8 JULY 1984.

میرے افکار کے گلشن میں جو جھانکے کوئی
دُور تک منظرِ شاداب دکھائی دے گا



علمی، ادبی، دینی و سماجی اقدار کا نمائندہ

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد (۱) اگسٹ سنہ ۱۹۸۴ء شمارہ (۹)

ایڈیٹر
محمد قمر الدین صابری

زر تعاون فی پرچہ پانچ روپیے

	ہندستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپیے
دو سالہ	90 "	270 "	65 "	36 "	225 "
تاحیات	1000 "	2600 "	450 "	300 "	2000 "

ترسیل زر کا پتہ ۱-147-5-11 ریڈہلز حیدرآباد 500004 (اے پی)

پرنٹر پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل آرٹ پرنٹرز پریس چار مینار میں چھپوا کر ریڈ ہلز حیدرآباد ... اے پی سے شائع کیا

فہرست

حرفِ اول

غالب انسٹی ٹیوٹ ڈاکٹر ذاکر حسین، فخر الدین علی احمد اور محترمہ اندرا گاندھی کی ذاتی دلچسپیوں اور توجہات کا نتیجہ ہے اور مرزا غالب کی یاد کو شایانِ شان طریقے سے تازہ رکھنے کی قابلِ تعریف کاموں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ یہاں ایک ریسرچ لائبریری ہے جہاں غالب سے متعلق سبھی مواد جمع ہے۔ غالب میوزیم ہے جس میں پہنچتے ہی غالب کے زمانے کی ایک جھلک آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ہر سال غالب کی یاد میں ایک انٹرنیشنل سمینار ہوتا ہے جہاں غالب فہمی کے نئے نئے گوشے روشن ہوتے رہتے ہیں۔ غالب سے متعلق کتابیں چھاپی جاتی ہیں۔ اور ادارہ کا ششماہی رسالہ "غالب نامہ" سال میں دو بار شائع ہو کر غالب پریمیوں کی علمی پیاس بجھاتا ہے۔ اس ادارے کا ایک حصہ "ہم سب ڈرامہ گروپ" اردو ڈرامے اسٹیج کرکے اسٹیج ڈراموں کی کمی پورا کر رہا ہے۔

اس ادارے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر سال غالب کی یاد میں چار انعامات دیے جاتے تھے ۱۔ اردو نثر ۲۔ اردو شاعری ۳۔ تحقیق و تنقید اور ۴۔ اردو ڈرامہ۔ ۱۹۸۲ء میں ان کی تعداد سات ہو گئی طنز و مزاح، اردو صحافت اور خوشنویسی کے لئے تین انعامات کا اضافہ ہوا۔ سالِ حال ۱۲ جولائی کو محترمہ اندرا گاندھی نے ان انعامات کو تقسیم کیا۔ ہم تمام انعام یافتگان کو مبارکباد دیتے ہیں، خصوصاً جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست اور جناب مجتبیٰ حسین کو کہ انہیں صحافت اور طنز و مزاح کا انعام دیا گیا۔ جناب عابد علی خاں صاحب نے صحافت کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا ہے اور جناب مجتبیٰ حسین صاحب نے طنز و مزاح نگاری میں جو اعلیٰ مقام حاصل کیا ہے، ان اصحاب کو غالب ایوارڈ دے کر صحیح معنوں میں ان کے اعلیٰ مقامات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ "شاداب" بطورِ خاص ان دونوں کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے۔

جناب محمد شفیع قریشی سکریٹری غالب انسٹی ٹیوٹ نے محترمہ اندرا گاندھی کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اردو بورڈ کی طرف موصوفہ کی توجہ مبذول کی کہ انہوں نے اردو زبان کی ترقی کے لئے اردو بورڈ قائم کیا۔ اس بورڈ نے بہت کچھ کیا ہے مگر ابھی تک اس کا کوئی ...

شہر ہے اور اردو والوں سے دور اس کا دفتر ہے۔ جب تک اس کی اپنی عمارت مناسب جگہ پر نہیں ہوگی، اس کی افادیت اتنی نہیں ہو سکے گی جتنی ہونی چاہیئے۔

دوسری نہایت اہم بات جس کی طرف ہماری وزیر اعظم کو متوجہ کیا گیا وہ اردو کے فروغ کے لئے حقیقی کام کی ضرورت ہے۔ جناب شفیع قریشی نے کہا کہ اردو اس ملک کی بیش قیمتی دولت ہے۔ سیکولرزم اس کی روایت اور بے تعصبی اس کی بنیادی خصوصیت رہی ہے۔ جنگ آزادی میں اس زبان نے کیا کارہائے نمایاں انجام دئے، کیسی خون گرما دینے والی نظمیں کہی گئیں، کیسے کیسے نعرے اس زبان نے ملک کو عطا کئے لیکن اب صورت حال ایسی ہوتی جا رہی ہے کہ اگر صحیح معنوں میں اس زبان کے فروغ کے لئے ضروری کارروائی نہیں کی گئی تو یہ ساری نظمیں اور ساری کتابیں میوزیم کی الماریوں کا زینت بن کر رہ جائیں گی۔ نچلی سطح پر زبان کا دائرہ سمٹتا جا رہا ہے۔ اگر پرائمری اسکولوں اور ہائر سکنڈری اسکولوں میں اردو نہ رہی تو پھر قومی سطح پر نئی تہذیبی رہنمائی اور نئے شعور کے لئے اردو والے باقی نہیں رہیں گے۔

جناب شفیع قریشی نے ہماری وزیر اعظم سے توقع کی ہے کہ یہ اہم مسئلہ ان کی خاص توجہ کا مستحق قرار پائے گا لیکن اردو والوں کو بھی چاہیئے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہ رہیں بلکہ اپنے بچوں کو اردو ذریعہ تعلیم کے مدرسوں میں شریک کرائیں تا کہ طلباء کی کمی کے بہانے اردو مدرسوں کی تخفیف کی گنجائش باقی نہ رہے بلکہ اور نئے اردو مدرسے کھولے جانے کی ضرورت محسوس ہو۔

ایڈیٹر

لیڈی ایولن کبولڈ زینب

سفر نامہ حرمین - مکہ

۳- اپریل ۱۹۳۳ء ۔ ساری رات اونٹ لدتے رہے۔ ان کے بڑانے اور شور وفغاں کی
زیں کسی وقت موقوف نہیں ہوئی۔ نیند کا کیا ذکر ہے عام شور وغل اور جوش وخروش کے
وہ اشتیاق و امید کے جذبے نے بھی نیند اڑا دی ہے۔

میں صبح اٹھی اور حج سے قبل طواف کرنے کے لئے بیٹھے ہوئے اونٹوں کی بیچ میں سے
ـنے اتر گئی۔ ابھی اندھیرا ہے۔ دن نکلنے میں ایک گھنٹہ ہے۔ میں اور میرا مطوف حرم میں داخل
ے اور میں طواف کرنے والوں کے ساتھ کعبہ کے گرد گھومنے لگی۔ اس وقت بہت سے آدمی
یت اور استغراق کے عالم میں چلا چلا کر دعائیں مانگ رہے ہیں۔ طواف ختم کرکے میں ایک
ب سماں دیکھنے کے لئے سیڑھی پر ٹنگ گئی۔ جس طاق میں حجر اسود نصب ہے دو سپاہی
یاں اور کوڑے لئے اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔ حاجی اس کو چومنے کے لئے دیوانہ وار جھپٹ
ہے ہیں، لڑتے مر رہے ہیں، جنگ ہو رہی ہے، سپاہی انتظام قائم رکھنے کے لئے ادھر ادھر ہاتھ
ـ رہے ہیں۔ اتنے میں میری ملاقاتی ایک بی بی میرے پاس آگئیں اور ہم یہ دھینگا مشتی دیر
دیکھتے رہے۔ میں کہنے لگی کہ اس پتھر کو چومنے کے لئے میری ہمت تو کبھی نہیں پڑ سکتی ۔
بیں کہ کیوں؟ میرا ارادہ تو اسے چومنے کا ہے"۔ میں نے کہا "نہیں نہیں! ایسی کوشش
مت کرو" اسی وقت ایک لمبا آدمی آیا جس کو انہوں نے بھائی بھائی کہہ کر پکارا اور مجھ سے
ت کرائی۔ اس نیک بخت بی بی نے میرا ہاتھ پکڑا اور حجر اسود کی طرف مجھے لے چلیں۔ ان کے
ہانے بھی منع کیا مگر انہوں نے نہ سنا۔ میں نے زیادہ انکار کرنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ فرض کہ
نوں ان کے بھائی اور مطوف کی حفاظت میں مجمع کو چیرتے پھاڑتے حجر اسود کی طرف بڑھے وہاں
پہنچنا غیر ممکن تھا۔ مدہوش بدویوں نے جو اس کو چومنے کی تمنا میں دیوانے ہو گئے تھے ہمیں ایک
ے دھکیل دیا اور میں شکر کرتی ہوئی صحیح سالم واپس آگئی۔ میری ملاقاتی بی بی کا بھائی ایک
بی بی کو جو اس دھکا پیل سے تکلیف اٹھا چکی تھیں ہمارے پاس یہ کہتا ہوا لایا "میں [illegible]

تم سے کہا تھا" ہم پہونچ گئے اور حاجیوں کی حالت دیکھنے کی ہے۔ مذہبی جوش زوروں پر تھا۔ بیخودی و خود فراموشی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ اب تمام شور و غل اور دعاؤں پر غالب آکر اذان سنائی دے رہی ہے۔ بیت اللہ کے ہر مینار سے آواز آسمان کی طرف چڑھ رہی ہے۔ دن ڈھل رہا ہے۔ اب یہ جوش حاجیوں پر سکون نازل ہوتا ہے۔ شور و غل ختم ہو جاتا ہے اور سب نماز میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

عظیم الشان مجمع کی یکساں حرکت اور عجیب خاموشی جو نماز کے وقت بستی پر چھا جاتی ہے خصوصاً جب کہ نمازیوں کی پیشانیاں زمین پر ٹک جاتی ہیں۔ تصور و تخیل کو شدت کے ساتھ اپنی طرف مائل کرتی ہے۔ پھر جب کہ ہزار ہا نمازی ایک ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں تو ان کے کپڑوں کی سرسراہٹ اس خاموشی کو توڑ دیتی ہے مگر یہ کیفیت ہوا کے جھونکے کی طرح ادھر آتی ہے ادھر چلی جاتی ہے

۴ر اپریل ۱۹۳۳ء م ۸ر ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ

آج صبح ہر شخص خوش و بشاش نظر آ رہا ہے۔ زنانخانے کی تمام لڑکیاں مجھے آج کی صبح کی مبارکباد دینے آئی ہیں۔ یہ صاف سفید کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ مسکراتی ہوئی مجید کی بیوی نے مجھے روز سے دوگنا گرم پانی لاکر غسل کے لئے دیا ہے۔ چونکہ ہم دوپہر کے بعد روانہ ہوں گے اس لئے میں نے ان لوگوں سے کہہ دیا ہے کہ عین وقت پر میں احرام باندھوں گی۔ خوش قسمتی سے آج ذرا ٹھنڈک بھی ہے۔ صرف اس ایک گھر والوں کے لئے تین اونٹ کملیوں، برتنوں اور سامان خورد و نوش سے بھر کر آگے جا چکے ہیں۔ میرے اونٹ پر توشک، تکئے، کمبل اور منیٰ کے مکان کی چھت پر سونے کا سامان ہے۔ اچھے مکان کی تلاش کے بعد آخر اس مشکل کو یوں حل کیا گیا ہے کہ منیٰ میں رات کسی مکان کی چھت پر گذاروں۔ ڈیرہ بھی ملنا ناممکن تھا۔ کوئی ایک ہزار سے زیادہ خیمے نصب ہو چکے ہیں۔ میرے میزبان نے چھوٹے چھوٹے دو مکان کرایہ پر لئے ہیں ایک اپنے یہاں کی عورتوں کے لئے، اس کی چھت پر میں سوؤں گی۔ دوسرا مکان اپنے اور اپنے لڑکوں اور دوستوں کے لئے۔ میں نے اپنے کمرے میں تنہا کھانا کھایا اور میں احرام باندھ ہی رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور عورتوں کے ایک غول نے اندر آنے کے لئے مجھ سے اجازت چاہی۔ یہ اس مکان کی رہنے والیاں تھیں، ان کے ساتھ مہمان عورتیں بھی شریک تھیں۔ یہ سب کی سب کپڑے بدلے ہوئی، برقعے اوڑھے منیٰ چلنے کے لئے تیار تھیں۔ میں انہیں رنجیدہ کرنا نہیں چاہتی تھی اس لئے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے میں نے ان کا خیر مقدم کیا اور ساتھ ساتھ ہر طرح جلدی میں اپنی تیاری میں لگی رہی۔ مصطفیٰ کی ماں بھی ان کے ساتھ ہے یہ عبدہ ہے کل ہی آئی ہے جس کے لئے سب نے بھیجے

اسے اپنے ساتھ موٹر میں عرفات لیجانے کا وعدہ بھی کر لیا ہے۔ اس کے سلسلے میں حقیقت یہ ہے جب صورت مجھے زیر معلوم ہوتی ہے۔ اس پہ مقبول عقد کے شہادت سے قطع نظر کر کے میں اس ملک کے قانون کی خلاف ورزی بھی نہیں کرنا چاہتی جس کی رو سے تمہارا کو نوشہ [illegible] ہے۔ غضب یہ ہے کہ بھی دو دو ہیں۔ ایک اس کا ایک اس کے بیٹے مصطفیٰ کا۔ بدقسمتی سے اس معاملے میں بحث کا بھی بیکار ہے وہ بھی اپنے بیٹے کی طرح اس کو جدا کرنے سے صاف انکار کر دے گی۔ میں [illegible] خوف ہے کہ آپ کے ساتھ کہیں گھن بھی نہ پس جائے ان کو یہ ترغیب دی کہ ان کا کیس سلسلہ جو پیچھے آ رہا ہے اس میں یہ قابل نفرت عقد بھی رکھ دیں اس میں شک نہیں کہ بغیر عقد کے ان کا [illegible] رہے گا۔

جب حج کی آخری منزل کے لئے میں موٹر میں سوار ہونے کے لئے نیچے اتری میں سمجھ رہی تھی کہ نارنجی کوٹ پہنے بڑا عمامہ باندھے میرا ڈرائیور سلیمان بیٹھا ہو گا۔ دیکھتی کیا ہوں اس میں تو کرتے تولیہ پہنے ننگے سر کوئی نوجوان آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ میں یہ کہتی ہوئی کہ میرا ڈرائیور کہاں گیا الٹے پاؤں لوٹی اس کا جواب گھر کے لڑکوں نے جو پیچھے واپس ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے شور اور قہقہوں سے دیا اور سلیمان بھی جس کی کایا پلٹ ہو گئی تھی مسکرانے لگا۔ سچ ہے ایک نورصورت بزار [illegible] کپڑا۔ سلیمان جو اب تک ایک مشین صورت کا آدمی تھا اور ایک ذلیل فورڈ موٹر چلاتا جس کی کمر [illegible] تھا وہ احرام باندھ کر ایک کالا لڑکا نظر آنے لگا تھا۔

ہماری موٹر اونٹوں، حاجیوں، شتر فروشوں، شتربانوں اور گدھوں کے لامتناہی سلسلے میں آہستہ آہستہ چلتی رہی۔ قبرستان معلیٰ سے گندی اور بادشاہ کے محل سے آگے بڑھ کر مشرق کی طرف مڑ کر ہم ان پہاڑیوں کی وادی میں پہنچے جن کے بڑے بڑے چٹان اس بات کا پتہ دے رہے تھے کہ تاریخ سے قبل کے زمانے میں آتش فشاں پہاڑ کے تصادم سے اڑے ہوں گے۔ اس کے سنگلاخ علاقے میں بدویوں کے کسی قبیلے کے ڈیرے لگے ہوئے تھے۔ یہ لوگ غاروں میں رہتے ہیں۔ گرمیوں کے دنوں میں یہ اپنی بھیڑوں اور اونٹوں کے لئے کسی نئی چراگاہ کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔ اس وقت یہ کالے ڈیرے ان کے عارضی گھر ہو جاتے ہیں۔

اونٹوں کو اس شاندار جلوس اور قابل تصویر سواریوں کے ساتھ اس عجیب جنگلی زمین میں سے رستہ نکالتے ہوئے دیکھنا نا قابل بیان منظر ہے۔ رنگ برنگ کے [illegible] کا چلتا [illegible] بغیر ٹھہرے چلے جانا، ان کے پیچھے بھورے اور زرد رنگ کے چٹانوں کا پردہ ایک منظر فریب [illegible] معلوم ہوتا ہے

الف لیلیٰ کی کہانی کا مزہ آرہا ہے۔ تھوڑی دور چل کر ہم اس نالے میں داخل ہوئے جو سابق سلطان سعود نے درست کرایا تھا۔ اس سے گذر کر ہم منیٰ پہنچ رہے ہیں۔ یہ وہ صحرائی گاؤں ہے جو حاجیوں کے زیر قبضہ سال میں ایک مرتبہ سوتے سے جاگتا ہے۔

جانب بائیں جانب پہاڑی کے بازو ایک بڑا سنگین ستون ہے اسے بڑا شیطان کہتے ہیں۔ ستمبر کو واپس ہو کر کل ہم اسے کنکریاں ماریں گے۔ اب ہم منیٰ کی لمبی گلی میں داخل ہو گئے۔ یہاں کی چھوٹی بہت سی دکانیں ہیں۔ پیٹ سامنے سے کھلے ہوئے چوکھونٹے حجرے ہیں جو گلی کی سطح سے کسی قدر نیچے ہیں۔ منیٰ میں عام لوگوں کے بہت چھوٹے چھوٹے مکان بنے ہیں جو زیادہ تر یک منزلہ ہیں ان پر چڑھنے کے لئے پیچھے کی طرف سیڑھیاں ہیں۔ ان مکانوں کی کھڑکیاں سڑک کی طرف کھلتی ہیں جن پر لکڑی کی چقیں پڑی ہیں۔ ان مکانوں کے پیچھے سے ہم اپنا موٹر لے چلے لیکن کوئی دو سو گز سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ہمارے مکان اور مسجد خیف کے درمیان ساری زمین حاجیوں اور خیموں سے پٹی پڑی ہے۔ اونٹ یہاں کی پہاڑیوں میں بہت سے ابتدا کر چرنے کے لئے چھوڑ دئے گئے ہیں۔ میرے میزبان، ان کی بیوی اور ان کے دو بلند قامت لڑکے سامنے والی موٹر میں ہیں۔ پیچھے کی لاری میں دوسری عورتیں بچے اور چھوکریاں بھری ہوئی ہیں۔ ہم سیڑھیوں پر چڑھ کر اس مکان میں پہنچ گئے جو عورتوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ میرے میزبان اور ان کے دونوں لڑکے اس سامان کو جو تین اونٹوں پر صبح روانہ کیا گیا تھا اتار اتار کر ٹھیک رہے ہیں۔ ایک کمرے کے سامنے چاندنی بیچ جس وقت مرد لنہ رہتا ہے تو بہت سی عورتیں اس خوف سے کہ دکھائی نہ دے جائیں پردے کے پیچھے ہو جاتی ہیں۔ جب میرے میزبان کھانے پکانے کے برتنوں، اوڑھنے بچھونے اور سامان خورد و نوش اور دوسرے سامان سے نبٹے تو اب وہ میرا ٹھکانہ بنانے اور میرا بچھونا کر دینے کے لئے ایک کمزور سیڑھی کے ذریعہ سے چاندنی پر چڑھے اور ایک شطرنجی بچھا کر اس کے بازو میرا کمبل اور سوٹ کیس رکھ دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے چھوٹے سے مکان کا رخ کیا جو اسی سے ملحق ہے۔ اور اس کے بعد رات کو پھر وہ نظر نہ آئے۔ میں اپنی ہوادار چھت سے خوش ہوں یہ ٹھنڈی جگہ ہے اور اس کے نیچے کا منظر بہت ہی پر لطف ہے۔ اب بھی اونٹوں کی قطاریں مشرق کی طرف چلی جا رہی ہیں۔

میری میزبان بی بی مجھے بلا رہی ہیں اور میں اتر کر نیچے جاتی ہوں۔ یہاں ان کا سارا خاندان بھرا ہوا ہے میں نے گنا عورتیں بچے کل بائیس ہیں، مجھے حیرت ہے کہ رات کو یہ سونے کا کیا انتظام کریں گی۔ ان سب کے لئے لیٹنا تو ناممکن ہے۔ ان میں سے دو ایک کو مجھے اپنے چھت پر بلا لینا پڑے گا۔ اس وقت بڑھی عورتیں حقہ پی رہی ہیں۔ جوان عورتیں بعض چائے قہوہ بنا رہی ہیں بعض اپنے بچوں کو سنبھال رہی ہیں، چار بچے

خوش ہو ہو کر ساتھ پاؤں مار رہے ہیں یہ بالکل چھوٹے ہیں مگر میں نے ان کو کبھی روتے نہیں دیکھا۔

میں کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی اور چلمن میں انگلیاں ڈال کر حاجیوں کے اونٹوں کی قطاریں دیکھنے کے لئے گنجائش کر لی۔ ان کا تانتا رات بھر بندھا رہے گا تاکہ صبح ہی عرفات پہنچ جائیں۔ بعض بعض شبریاں بڑی خوبصورت ہیں۔ ان پر خوش نما غلاف پڑے ہیں۔ اونٹوں کی قطاروں کے علاوہ جو بڑی متانت اور سنجیدگی سے چلے جا رہے ہیں بیچارے گدھے بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ ان کے سوار بالکل ہی پیچھے پیٹھ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ بعض نے اپنے سامنے بچے کو بھی بٹھا لیا ہے۔

سلطان کا ایک محل منیٰ میں بھی ہے۔ یہاں وہ حج کے دنوں میں قیام کرتے ہیں اور معزز اور مشہور حاجیوں کو کھانے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ اس طرح ان کو دنیا بھر کے مسلمانوں کی رائیں معلوم ہو جاتی ہیں اور اسلامی ممالک کے بعض حکمرانوں سے تبادلہ خیال بھی کر لیتے ہیں۔ افسوس ہے کہ عورت ہونے کی وجہ سے میں نہ یہاں ان سے مل سکتی ہوں اور نہ مکہ میں۔

عورتیں کھانے کے لئے ایک بڑے دسترخوان کے اطراف بیٹھی ہیں۔ میں ان کے مسالہ دار کھانے کھاتے کھاتے بیزار ہو گئی ہوں اس لئے میں نے اپنے لئے انڈے ابلوا لئے ہیں۔ کھانا کھا کر میں اوپر چاندنی پر گئی اور وہاں چھت پر سونے کے لئے دو عورتوں کو بلایا مگر وہ اس بودی سیڑھی پر چڑھنے سے ڈر رہی ہیں۔ جب تک عرفات میں حج کی تکمیل نہ ہو جائے احرام کھولنا منع ہے۔ اس لئے میں انہی کپڑوں سے پڑ جاتی ہوں۔ خوش قسمتی سے آج کچھ سردی بھی ہے، اس ریگستانی گاؤں میں مچھر بھی نہیں ہیں۔ چاند بہت صاف ہے اور تارے نیلے آسمان پر چراغوں کی طرح جھلملا رہے ہیں۔ آس پاس کے پہاڑ اس آگ سے روشن ہیں جو ان کی چوٹیوں کے غاروں میں رہنے والے بدویوں نے جلا رکھی ہے۔ میرے کوٹھے کے نیچے ایک طرف کچھ حاجی کھانا کھا رہے ہیں کچھ نمازیں پڑھ رہے ہیں کچھ سو رہے ہیں۔ دوسری طرف اونٹوں کی قطاریں ہیں جن کا کوئی سرا ہی نہیں ہے۔

۱۵ اپریل ۱۹۳۲ء۔ صبح کی اذان سے میں جاگی۔ مسجد خیف میں ابھی تک چراغ جل رہے ہیں۔ میں چھت کی مٹی سے تیمم کر کے دو رکعت نماز فجر پڑھتی ہوں اور سو جاتی ہوں۔ دو گھنٹے بعد میرے میزبان نے مجھے نیچے سے پکارا۔ میں نے اپنا سامان اکٹھا کیا۔ اپنا سوٹ کیس ان کو دے دیا اور ڈگمگاتی ہوئی سیڑھی سے نیچے اتر آئی۔ میں نے ہاتھ دھو کر ناشتہ کیا اور دن نکلے ہم عرفات روانہ ہو گئے۔ میں اس خیال سے کہ اس اژدحام میں ہماری رفتار بہت دھیمی ہو گی اپنے ساتھ ایک انگریزی کتاب لائی ہوں اس کا نام "پاسیجز فرام عربیا ڈزرٹا" ہے۔ ایک جگہ جب موٹر ٹھیری تو میں نے اس کتاب کے

نکلا اور برقعہ کے اندر ہی سے پڑھنے لگی۔ قریب کی موٹر میں سے کسی نے پوچھا "کیا یہ عربی کتاب ہے؟" سلیمان نے جھٹ کو جواب دیا کہ "ہاں! عربی کتاب ہے" اور مجھ سے چپکے سے کہا "بند کر دو"۔ میں نے انکار کیا۔ پھر وہی آواز آئی "کیا تم قسم کھا کر کہہ سکتے ہو کہ یہ عربی کی کتاب ہے اور مسلمانوں کے پڑھنے کی ہے؟" اب سلیمان سٹپٹایا مگر قبل اس کے کہ وہ جواب دے میں نے سوال کرنے والے کو کتاب دے کر کہا "یہ انگریزی کتاب ہے میں انگریز مسلمان ہوں اور سلطان کی اجازت سے حج کو آئی ہوں۔" چند منٹ متحیر رہ کر اس شخص نے "الحمد للہ" کہہ کر کتاب واپس کر دی۔

ہمارا راستہ گہری ریت میں ایک ایسی زمین پر سے ہے جو کسی زمانے میں ندی کی گذرگاہ ہوگی۔ یہ کہیں چوڑی اور کہیں تنگ ہے۔ ہمارے بائیں جانب وہ مقام ہے جہاں جنگ فیل ہوئی تھی۔ چند میل اور آگے چل کر ہم مزدلفہ پہنچے یہاں ایک شکستہ مسجد ہے اس سے آگے خشک پہاڑیوں سے ہوتے ہوئے ہم بڑھے چلے گئے یہاں تک کہ ان ستونوں کے پاس پہنچے جہاں حدود حرم ختم ہوئی ہیں اس کے آگے میدان عرفات ہے جو اس وقت حاجیوں، اونٹوں اور ڈیروں سے پٹا پڑا ہے۔ جب یہاں پہنچے تو حاجیوں کے نعرے لبیک اللھم لبیک نے تمام آوازوں کو دبا دیا تھا۔ مرد عورت مل کر کوئی ایک لاکھ ہوں گے جو اپنی عمر [illegible] آرزو پوری کر رہے تھے۔

مکے کے سوا یقیناً دنیا کا کوئی اور شہر اس بات کا فخر نہیں کر سکتا کہ اس کی اتنی بڑی تعداد کو دیر سے کسی معینہ مدت تک تمام جنسی تعلقات سے اس طرح پرہیز کرتی ہے۔ جنوبی اور مشرقی اقوام کے لئے تو ان کا مذہب فی الحقیقت ایک زندہ معجزہ ہے جو ان کو یہ پرہیز کرنے کے قابل بنا دیتا ہے۔

میرے میزبان کا ایک شاندار ڈیرہ جبل رحمت کی طرف رخ کئے ہوئے ہے۔ جہاں سے بھی کچھ دیر میں آئیں گے۔ یہ خیمہ صرف میرے میزبان، ان کے لڑکوں اور دوستوں کے لئے ہے۔ عورتوں کا گھٹا ٹوپ ڈیرہ اس کے پیچھے ہے جہاں سے نہ وہ کسی کو دیکھ سکتی ہیں اور نہ ان کو کوئی دیکھ سکے۔ میرے میزبان نے مجھے اپنے ڈیرے میں بلا لیا ہے اور میں شکریہ کے ساتھ یہاں آگئی ہوں۔

(باقی آئندہ)

تو ہے محیط بیکراں میں ہوں ذرا سی آبجو — یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر
میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو — میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہر شاہوار کر

ڈاکٹر حسن الدین احمد

سجودِ ملائک

”میری منزل مسلمانوں کو منفرداً اور جماعت اسلامیہ کو حقیقی منہاج نبوت پر دیکھنا ہے۔ میرا کام میری مجلس کی قراردادیں اور میری تقاریر اسی اجمال کی تفسیر ہیں۔ گو ہمت عالی کے نزدیک یہ منزل بھی سنگ میل ہے۔ حقیقی منزل تاج خلافت الٰہیہ کا زیب سر کرنا اور فرشتوں کو اپنے سامنے سجدہ ریز دیکھنا ہو سکتا ہے۔“

سرحد نژاد - طویل قامت، دوہرا بدن، خدوخال سے معمر، مذہب سے معتبر، اور لباس سے معزز۔ عوام کے لئے تاج بادشاہ اور عظیم خطیب۔۔

تاریخ عالم میں جو بڑے خطیب گزرے ہیں ان میں بلاشبہ محمد بہادر خاں کا شمار ہو سکتا ہے۔ خطابت ان کی عظیم شخصیت کا جز تھی۔ خطابت کو ان کی شخصیت سے اور ان کی شخصیت کو خطابت سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اردو زبان کو انہوں نے خطابت کی انتہائی بلندیاں عطا کیں۔ عام طور پر محمد بہادر خاں کو ایک عظیم خطیب کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ لیکن وہ ایک عظیم تر انسان تھے۔

ایک دفعہ میلاد النبیؐ کے جلسہ کو مخاطب کر رہے تھے۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام شریک محفل تھے۔ اور تقریر کو عقیدت سے سن رہے تھے۔ یکایک محمد بہادر خاں نے للکارا۔

”اے محمد عربیؐ کے تاج پوش غلام سن اور مجھ سے سن کہ تیری جہاں بانی کیا ہے“ اور پھر سرکار دو عالمؐ کے بتائے ہوئے حکمرانی کے اصول بیان کئے۔ اس دن محمد بہادر خاں سے نواب بہادر یار جنگ ہو گئے۔

دو قومی نظریہ کی حمایت کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اگر پاکستان بہ اتحاد نہیں مل سکتا ہے

عزیز باغ - بازار نور خاں - حیدر آباد

تو ہم بزور حاصل کریں گے ۔ اور پھر گریز کرتے ہوئے مسلم لیگ کی پلاننگ کمیٹی سے مطالبہ کیا کہ وہ ایسی تجاویز مرتب کرے جو اسلامی دستور حیات، اسلامی نظام تعلیم، اور اسلامی معاشی نظام کے رائج کرنے میں مددگار ہوں ۔ اور پھر قائداعظم کو مخاطب کر کے کہا ۔ قائداعظم میں نے پاکستان کو اسی طرح سمجھا ہے اگر آپ کا پاکستان یہ نہیں ہے تو ہم ایسا پاکستان نہیں چاہتے ۔ (ص ۲۶ دسمبر ۱۹۴۳ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کراچی میں کی گئی تقریر)

محمد بہادر خاں کے مورث اعلیٰ کو سلطنت آصفیہ کی جانب سے تعلقہ اور ضلع نلگنڈہ میں مواضعات کنڈور، ولکٹ پلی اور ریگڈا کرماپلی بطور جاگیر عطا ہوئے تھے ۔

بہادر خاں کی ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ اور مفید الانام میں ہوئی اس وقت منشی اور مولوی کامیاب طلباء صرف انگریزی کا امتحان دے کر میٹرک کی سند حاصل کر سکتے تھے ۔ بہادر خاں نے انگریزی درس کے لئے دارالعلوم میں شرکت کی ۔ شریف حسین (جو بعد میں جامعہ عثمانیہ میں ورزش جسمانی کے انسٹرکٹر مقرر ہوئے تھے)، عبداللہ مسعود عیسیٰ، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، اور سید ابراہیم خاں، ان کے ساتھی تھے ۔ دوپہر کے وقفہ میں کشتی اور پنجہ کشی بہادر خاں اور شریف حسین کا مشغلہ تھا ۔ میٹرک کا امتحان دینے سے قبل ہی سلسلہ تعلیم منقطع ہو گیا ۔ خانگی طور پر سعادت اللہ خاں اور مولوی سید اشرف شمسی سے جو تفسیر، فقہ، حدیث کے جید عالم تھے تعلیم حاصل کی ۔

والد کے انتقال پر بہادر خاں کو مصائب سے دو چار ہونا پڑا لیکن انہوں نے نہایت صبر و استقلال سے آٹھ دس سال کے عرصہ میں جاگیر کی پیچیدگیوں کو سلجھا کر رفتہ رفتہ قرضہ جات سے نجات حاصل کر لی ۔

۱۹۳۱ء میں اپنے خاندان کے اسی افراد کے ساتھ حج کیا ۔ اس سال حکومت آصفیہ کی جانب سے ان ہی کو حجاج کے قافلہ کا سالار مقرر کیا گیا تھا ۔

واپسی کے بعد حیدرآباد کے مسلمانوں نے مجلس اتحاد المسلمین کا احیاء کیا جس کا مقصد دکن کے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت تھی ۔ محمد بہادر خاں نے مجلس سے وابستگی اختیار کی اور ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۵ء تک ریاست کے چپہ چپہ میں تقریریں کر کے سیاسی ہلچل پیدا کر دی اور اضلاع میں مجلس اتحاد المسلمین کی شاخیں کھول دیں ۔ اور اس میں ایسی تنظیم پیدا کی کہ ہندوستان کی کوئی دوسری تحریک اس کا جواب پیش نہیں کر سکتی ۔

۱۹۳۸ء کے لگ بھگ حیدرآباد کے ایک فرقہ وارانہ فساد میں دو نوجوان پٹھان لڑکوں کو

جن سے بہادر یار جنگ کی ودر کی رخصت داری تھی قتل کر دیا گیا۔ مسلمان جلوس کی شکل میں نکل پڑے حیدرآباد کے لئے یہ ایک نازک لمحہ تھا۔ اس سے قبل حیدرآباد میں کبھی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا تھا۔ دوکانیں بند ہوگئیں۔ حکومت پریشان تھی۔ بہادر یار جنگ نے اس مجمع کو آدھے راستے میں جالیا اور دو گھنٹے تقریر کی۔ بالآخر جلوس کو منتشر کر دیا اور واپس کر دیا۔ جو کام پولیس کے دستے نہ کر سکتے تھے بہادر یار جنگ کی خطابت نے کیا۔

بہادر یار جنگ کا دائرہ عمل وسیع سے وسیع تر ہونے لگا۔ اور اب ممالک محروسہ تک محدود نہ رہا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ دکن کے مسلمان دوسرے مسلمانوں سے علیٰحدہ نہیں رہ سکتے مشترکہ ملی تنظیم سے وابستگی ضروری ہے۔ بہادر یار جنگ تمام ہندوستان میں تیزی سے ابھرتے ہوئے قائد کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔ مسلم لیگ کے زعماء میں ان کا شمار ہونے لگا۔ اسی زمانہ میں قائداعظم نے حیدرآباد کا سفر کیا تو ان کا نہایت شاندار استقبال ہوا۔ بہادر یار جنگ قائداعظم کے حضور میں اس طرح دست بستہ رہتے جیسے کوئی خادم اپنے آقا کے حضور۔ قائداعظم بھی انہیں اپنا دست راست سمجھتے تھے۔

اب حیدرآباد کے ارباب اقتدار کو تشویش ہوئی۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام نے فرمان جاری کیا کہ خطاب یافتہ جاگیرداروں کو اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ سیاست میں حصہ لیں تو بہادر یار جنگ نے "عطائے تو بہ لقائے تو" کے مصداق اپنا خطاب اور جاگیرات ۳ مارچ ۱۹۴۴ء کو بطور نذر بارگاہ خسروی میں پیش کر دیا۔ اعلیٰحضرت حضور نظام نے اسی دن فرمان جاری کیا لیکن جاگیر کو نہ تو شریک خالصہ کیا گیا اور نہ ہی معاش کو دوسرے حصہ داروں کے نام بحال کیا بلکہ انکے انتقال کے بعد ان کے حصہ کی بچت شدہ رقم ادائی قرضہ جات کے لئے سالانہ بیوہ کو دلائی گئی۔

اسی زمانے میں حکومت کا یہ تاثر تھا کہ بہادر یار جنگ کی جادو بیانی اس کے لئے خطرناک ہو سکتی ہے تو ان کی زبان بندی کی گئی۔ زبان بندی کے دوران دلچسپ واقعات پیش آئے۔

ایک ریلوے اسٹیشن پر بہادر یار جنگ کی آمد کا پتہ چلا تو عوام نے بعد نماز جمعہ تقریر کے لئے اصرار کیا۔ بہادر یار جنگ نے مجمع سے مخاطب ہو کر کہا حضرات میری زبان بندی ہے لیکن اگر مجھے کہنے کی اجازت ہوتی تو میں یہ کہتا کہ .... اس طرح ایک گھنٹے سے زائد خطاب کیا

اور وقتاً فوقتاً یہ مطالبہ کرتے کہ ان کی زبان بند کی جائے۔ جب یہ حربہ کارگر نہ ہوسکا تو حکومت نے ان سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ ثابت قدم رہے۔ انہیں جاگیر عہدہ کی پیش کش ہوئی تو کہا ۔

"مجھے کرسی وزارت پر بیٹھ کر امور مملکت پر غور کرنے کے لئے نہیں بلکہ گنبد کو چھوڑ کر بے نیاز ہو کر قلوب کی دنیا میں طوفان برپا کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے"

مگر افسوس کہ زیادہ دن تک یہ طوفان برپا نہ کر سکے۔ ۲۵ جون ۱۹۴۴ء کو وہ اپنے ایک قریبی دوست ہاشم علی خان کے ہاں ڈنر کے لئے گئے تھے۔ کھانے میں ابھی دیر تھی، وقت گزاری کے لئے حقہ منگوایا گیا۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور سکندر علی وجد سے اقبال کے اس شعر

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

سے متعلق اپنے تاثرات بیان کر رہے تھے کہ حقہ کے پہلے ہی کش کے ساتھ ایک ہچکی آئی اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی ۔

قائد ملت عمر بھر تفسیر قرآن اور سیرت نبوی کے طالب علم رہے۔ ان موضوعات پر ان کا مطالعہ بڑا وسیع تھا ۔ اقبال کے کلام کے دلدادہ تھے۔ فجر کی نماز کے بعد تفسیر اور بیت الامت میں ہفتہ وار درس اقبال کا باقاعدہ اہتمام تھا ۔

قائد ملت کو عوام کا بے پناہ پیار ملا۔ کوئی اور ہوتا تو بہک جاتا۔ لیکن انہوں نے کبھی خوشامد کو روا نہ رکھا۔ البتہ عوام کے دیئے ہوئے خطاب قائد ملت کو سیاسی مصلحت کے پیش نظر قبول کیا ۔

اکبر یار جنگ کی صدارت میں مجلس اتحاد المسلمین کا جلسہ عام منعقد ہوا تھا۔ لاکھوں افراد کا مجمع بہادر یار جنگ کی تقریر کا منتظر تھا۔ ایک نوجوان شاعر نے اپنے قائد کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس نے صرف دو شعر سنائے تھے کہ بہادر یار جنگ نے صدر جلسہ سے درخواست کی کہ شاعر کو نظم پڑھنے سے روک دیا جائے اور ہچکیوں کے درمیان حدیث نبوی کا واسطہ دیا کہ

"مومن کے منہ پر اس کی تعریف کرنا اس کو ہلاک کرنے کے برابر ہے۔"

مختار مسعود نے بہادر یار جنگ کی بصیرت کی چند مثالیں دی ہیں۔

۱۹۳۱ء میں کہا کہ یہودیوں کو اب فلسطین سے نکالنا اتنا آسان نہیں رہا جتنا عربوں نے

ڈاکٹر خواجہ عبد الغفور

زبانوں میں زبان اردو زبان ہے

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

آیئے آج ہم اُردو زبان کی بات کریں۔ اردو جو ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہندوستان بھر میں شمال، جنوب، مشرق، مغرب، میں ہر صوبہ کی زبان کے ساتھ ساتھ یہ بھی سبھوں کو پیاری ہے اور آپس میں ایک دوسرے کو ملاتی ہے۔ اصل میں تو اس زبان نے اسی دیس میں جنم ہی لیا ہے۔ اس طرح یہ کہ باہر سے آنے والوں سے رابطہ قائم کرتا تھا۔ وہ فارسی بولتے اور یہاں کے لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے۔ فوجی لشکر کو بھی تو اپنی ضروریات پوری کرنی تھیں۔ آپس میں بولنا بنتا تھا۔ اسی طرح پھر ایک خوبصورت زبان بنی۔ جو لشکر سے نکلی بھی تو زبان زدِ عام ہوئی۔ اور بڑھتے بڑھتے شاہی دربار اور رئیسوں امیروں، راجوں، مہاراجوں کے حلقوں میں عوام میں مقبول ہوئی۔ پڑھے لکھے لوگوں نے اپنایا، شاعرانہ مزاج دیا۔ نفاست دی۔ خوش کلامی اسی زبان کو حاصل ہوئی۔ ایک دور گل و بلبل، عشق و محبت کا دیا۔ پھر صوفیوں اور بزرگانِ دین نے اس کو استعمال کیا۔ آزادی کی تحریک میں ممد و معاون رہی۔ برطانوی سامراج کو اکھاڑ پھینکنے والی تحریک آزادی اسی زبان کی وساطت سے پھیلی! بغاوت پھر انقلاب، اور پھر بالآخر مکمل آزادی اسی کی بدولت نصیب ہوئی۔

حضرت امیر خسرو نے سب سے پہلے اردو میں شاعری کی ہے

بیا برادر آدرے بھائی
بنشیں مادر بیٹھ ری مائی

محمد اسی طرح کی شاعری کے ذریعہ فارسی کو اردو کے سانچے میں ڈھالا

اردو کو سبھی بولتے اور سمجھتے ہیں! ہندی کے روپ میں سینماؤں اور فلموں میں اسی کا

چلتے ہیں۔ اس کو چاشنی ہے۔ غزلوں کے یہ کلام تبدیل ہو رہے

اب سوال صرف لپی یعنی رسم الخط اور تحریر کا ہے۔ کہتے ہیں کہ فارسی کا رسم الخط مشکل ہے خود دیکھئے تو کیا انگریزی زبان اسی قدر مشکل نہیں؟

ABC کو دیکھئے، کہتے اے ہیں مگر اسی اے سے انگریزی میں آندھرا لکھتے ہیں تو اے کا تلفظ "آ" ہو جاتا ہے۔ "بی" سے بوسے لکھتے ہیں تو بی "با" بن جاتا ہے۔ آپ میں سے کوئی انگریزی کی اسی طرح سے مثال دے سکتے ہیں؟ جی ہاں! BUT بَٹ ہوتا ہے تو PUT پُٹ ہو جاتا ہے۔ شاباش یہ بڑی پتہ کی بات بتائی۔

برنارڈ شا نے ایک مرتبہ GHOTI لکھا اور کہا اس کو FISH پڑھئے۔ سب بہت حیران تھے کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ انہوں نے سمجھایا۔ ENOUGH کے آخر میں جو GH ہے۔ وہ F کی آواز دیتا ہے۔ WOMEN میں "او" کو I کی آواز دیکر وی من کہا جاتا ہے۔ اور رہا TI تو آپ ATTENTION میں TION کو SHON نہیں بولتے۔ یعنی TI SH بھی ہو سکتا ہے تو لیجئے GHOTI، FISH ـــــ FISH بن گیا!

انگریزی کا یہ "O" جب "OVEN" میں آتا ہے تو "A" یعنی "آ" کی آواز دیتا ہے۔

SCHOOL میں "ا" ہے نہ "E" لیکن اس کو اسکول پڑھتے ہیں۔ STATION لکھ کر اسٹیشن بولتے ہیں۔

الف کے لئے تو سیدھا سادھا کھڑا "ا" لکھ دیتے ہیں۔ یہ ہر حال میں اور ہر جوڑ کے ساتھ اسی طرح ایستادہ ہوتا ہے۔ بلکہ اگر کوئی سیدھا کھڑا ہو تو کہتے ہیں "الف" ہے۔ یہ انگریزی کی I جیسا لگتا ہے۔ ہندی میں अ اتنا سیدھا سادا نہیں

انگریزی میں ا یعنی A کی آواز کے لئے O کا بھی سہارا لیتے ہیں۔ جیسے OVEN میں ـــ

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے۔

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

یہ کچھ اشعار ہیں جو الف سے شروع ہوتے ہیں۔

آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ ا ب ز س، اس قسم کا نشان بنائیں۔ آپ تو اس کی آنا ناونچی ہو جاتی ہے: "آم" "آنا" "آرے" "آپ" "آگے"

یہ لیجئے یہ ایک سیدھی لکیر ہے۔

اب اس کے پانچ ٹکڑے کرتے ہیں۔

پہلے ٹکڑے کے نیچے ایک نقطہ دیتے ہیں ـبـ تو یہ ب ہو گیا۔ دوسرے ٹکڑے کے نیچے تین نقطے دیتے ہیں ـپـ یہ پ ہو جاتا ہے۔ تیسرے ٹکڑے کے اوپر دو نقطے اس کو ـتـ بنا دیتے ہیں۔ چوتھے ٹکڑے کے اوپر تین نقطے لگا کر ہم ـثـ بنا لیتے ہیں۔ ہے نا سیدھا سادا طریقہ۔ اب ایک اور حرف ہے ـطـ، اسی سیدھے خط کو نقطوں سے نہیں بلکہ ایک چھوٹے سے ط سے ٹ بنا لیا جاتا ہے۔

ایک سیدھی سی لائن کو کاٹ کر ہم نے ب پ ت ٹ ث یعنی ۵ حرف آسانی سے بنا لئے۔ اب آپ ان کو یاد رکھ لیجئے بلکہ گرہ میں باندھ لیجئے۔ (یہ محاورہ ہے)

ان ہی پانچ حروف کے ساتھ کچھ دلچسپ شعر سنئے، ـــ

شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور مجھ سے کہہ دیا
آپ بی اے پاس ہیں تو بندہ بی بی پاس ہے۔

ـــ

آتی ہے بات بات مجھے بار بار یاد
کہتا ہوں دوڑ دوڑ کے قاصد سے راہ میں

ـــ

پانی پیا پڑا ہے پائپ کا
حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

ـــ پہنچے پکڑا کے بی بی کہاں
مگر وہ لیڈر سے لیڈر ہوئے۔

ـــ جو یہ نہ ایسا جانتے پڑھتے کے دکھ ہوتے، مگر وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کے پڑھتے پڑھت کرتے کرتے

ے تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

ے اے ابرِ کرم آج ذرا تھم کے برسنا
آجائے مرا یار تو پھر جم کے برسنا

بھاشا سے بھاشا نہ ملے تو اس کا مطلب پھوٹ نہیں

ے اک ڈالی پر رہ کر جیسے پھول جدا ہے پات جدا
بُرا نہیں گر یوں ہی وطن میں دھرم جدا ہوں ذات جدا

ان کے آگے جو حروف تہجی آتے ہیں ان میں بھی چار ایک ہی شکل کے ہیں اور صفر لگانے پر آواز ج چ ح خ یہ سب ایک ہی قسم کے ہیں جو ح سے بنتے ہیں. ایک نقطہ اس کے پیٹ میں دیا ج. تین نقطے دیئے چ. بے نقطہ چھوڑ دیا ح رہ گیا. اور اسی کے اوپر ایک نقطہ دیا تو خ. حرف پہ یاد رکھیئے کہ نقطوں کا سب کھیل ہے. اوپر نیچے پیٹ میں سر پر نقطہ دیدیا تو وہی ب پ ت ٹ ث ہو گئے.

دیکھیئے ج چ ح خ نقطوں کے پھیرے اور طرح کے حروف تہجی بن گئے.

ج اور ح .. انگریزی میں ج J اور ح H تو ہے. چ کے لئے CH جوڑتے ہیں. خ کے لئے KH اور یہ CH کہیں K بھی بن جاتا ہے! جیسے CHORUS ' CHRIST

ے جلنا جانا جلدی کیا ہے ان باتوں کو جانے دو
ٹھہرو ٹھہرو دل تو ٹھہرے مجھ کو ہوش تو آنے دو

ے خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ے خدا کرے کہ محبت میں وہ مقام آئے
کسی کا نام لوں لب پہ تمہارا نام آئے

ے چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا.

ے پھر [illegible]
[illegible] پر آئی ہوئی.

د۔ ڈ۔ ذ۔ یہ تین حروف بھی یکساں ہیں۔ دال بالکل خیالی خولی ہوتی ہے۔ دوسرے
پر چھوٹا سا "ط" لگا دیجئے "ڈ" ہوگیا۔ اور جب د کے نقطہ لگا دیجئے تو "ذ" ہوگیا۔
انگریزی میں د، ڈ جیسے الگ الگ نہیں ہیں۔ اسی "D" کو SOFT یا HARD بنا
بولتا ہے۔
HARD کو چاہے تو انڈو بولیے یا اردو۔ "ڈ" اور "ذ" والے اشعار سنیئے۔

ـہ شکر ہے تم نے مرے درد کی کچھ داد تو دی
نہ دوا کی، نہ سہی رخصت فریاد تو دی

ـہ کوٹھی میں رہتے ہے نہ ڈپارٹمنٹ ہے جکس میں
تلاش کر دیا ہے دو چار تھیلکس میں

ر، ڑ، ز ـــــ سادہ سے لیے نقطہ "ر" ہے، جیسے رام میں یا ما نستے میں۔ اس پر "ط" لگا دو تو یہ "ڑ" کی آواز دے گا۔ لڑکی میں "ڑ" ہے۔ صرف ایک نقطہ لگا دیجئے تو "ز" ہے جو زخم میں آتا ہے۔ اور اس "ر" کے اوپر تین نقطے رکھیئے تو "ژ" ژالہ باری (برف باری) یہ بہت کم استعمال ہوتا ہے۔

"ر" اور "ز" والے اشعار ملاحظہ کیجئے: ـہ

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

ـہ ممکن نہیں ہے اسے مس ترانوٹس نہ لیا جائے
کمال ایسے پری زاد ہوں، ادا کیں نہ لیا جائے۔

س، ش۔ سادہ سا "س" سیتا میں۔ سورج سیم میں۔ اس پر تین نقطے دیجئے تو "ش"۔ شور، شان، شراب، اس س، ش کو سے ساشن بھی لکھا جاتا ہے۔ لیکن آواز یا معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم نے س کو تین نقطوں سے بہ آسانی "ش" بنا لیا۔ انگریزی میں S اور H کو ملا کر "ش" بناتے ہیں۔

ـہ یہودی کتار نے تم کو سوچ سمجھ کر کرنا کچھ
ایسے کرنی مت کرنا جو کر کے پھر پچھتاؤ جی

ـہ انہیں شوق عبادت بھی ہے اور گانے کی عادت بھی [illegible] بن کر

؎ : شباب لٹ گیا یاد شباب باقی ہے
ہے جو غریب کی ساغر میں اب شراب نہیں

ص ض ۔ــــ دو اور حروف بھی ہیں۔ ان کی آوازیں ث اور ذ، ز، س سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن یہاں سے بہت مختلف ہیں۔

ص کیجئے۔ اس سے صبر، صندوق وغیرہ بنتے ہیں۔ اسی پر ایک نقطہ دیدیجئے تو ض، ز اور ظ سے ملتا جلتا۔ جیسے ض سے فرضی، قاضی۔

ط ۔ ت جیسا ہے۔ AT ۔ THA بہت ہی SOFT ط سے طالب علم

ظ ۔ اوپر ایک نقطہ دیدیا۔ ظ۔ یہ ز۔ ض۔ ذ کی بھی آواز دیتا ہے۔ ظالم، ظاہر۔

کہئے نہ بھولا اس کو ظفر جو صبح کا بھولا سانجھ آئے

ع ۔ جیسے ع عـ ـعـ ـع لکھا اسی شکل اور صورت کو یہ عین ہے۔ ع سے عباس، عابد، عالم، اسی پر نقطہ دیجئے غ بن گیا۔ غبارہ، غالب۔ ؎

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

ف ۔ ق ۔ یہ بہت اہم حروف بھی ہیں۔ فرق نقطوں کا ہے۔ اور کچھ تھوڑا سا پیچ و خم دینے کا ہے۔ ف سے فرض، ق سے قرض

قاآنی کا شعر سنئے : ؎

فنا کے بعد یہ مجبوریاں ظاہر ہے تو یہ
کوئی مزار میں کوئی سر مزار ملا
قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

اب تک نقطوں سے حروف اور ان کی آوازیں بدلتی رہیں۔ تمام تر نقطوں کا کمال ہے

ک اور گ میں نقطے نہیں صرف ایک اور دو اوپر کی لکیروں کا فرق ہے۔ اسی کاف سے کبوتر، کتاب، کاغذ لکھتے ہیں۔

ایک اور لکیر اوپر بڑھا کر گاف بناتے ہیں۔ گما، گاما پہلوان کا نام سنا ہے نا؟

غالب، مالوی جی! اپنے راختر پتا باپو جی سے

کہتا ہے زراہ کبیر فلک ۔ !

کیا تجھ سے ملوں کہیں کا تو ڈاک نہ ملا

سے کیر کہوں کہ انسی کو سی بیر ہریت

مدعو یاں رحیم دا بہ نا دلبر جانت مشکل جہاں

سے پالا ہے باغ جہاں میں ہم نے گل کی زندگی

رنگ بن کر آئے ہیں تو بو بن کر اڑ جائیں گے۔

ل اور م — یہ بڑے ہی سیدھے سادے حروف ہیں۔ نہ نقطے ہیں نہ کوئی لکیریں نہ ان سے ملتی جلتی آواز کے کوئی اور حروف ہیں ... ل سے انسان، لاہور، الہ جی، م سے مالاس.

سے لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد

ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

سے موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس

یوں تو دنیا میں سب ہی آئے ہیں مرنے کے لئے

سے موت سے کس کو رستگاری ہے

آج وہ کل ہماری باری ہے۔

ن — بھی اسی طرح تن تنہا ہے۔ البتہ اگر اس کے پیٹ میں نقطہ ہو تو منہ بھر کر آواز نکالا ہوتی ہے۔ جیسے "نود" "نون" "بن" "خون میں" "نارنگی" وغیرہ۔ اور یہ جب آخر میں آتی ہے اور اس میں نقطہ نہیں ہوتا تو بڑی مدھر خاموش اور دھیمی سی آواز ہوتی ہے۔ بلکہ آواز ہوتی ہی نہیں مگر یہ اپنی جگہ پر ڈٹی رہتی ہے۔ جیسے "مجنوں" "تحقیں" میں نون بے آواز ہے اس بے آواز نون سے کوئی لفظ شروع نہیں ہوتا ہے

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے

مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

و — اپنے آپ ایک پہرہ دار جیسا ہے۔ واہ واہ، لو دو۔ آگے پیچھے کہیں بھی کھڑا کر دیجئے یہ ٹوٹتا نہیں اور اپنی شکل پر قائم رہتا ہے۔

ھ۔ ह - है - हाहा : HA ۔ آہ، واہ اور جب اس کی آواز میں زور پیدا کرنا ہو تو ہے

تو وہ لکھ کر دیکھو، دو شکلیں اس میں دیکھتے ہیں جیسے چونچ ہو۔
ھ۔ یہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ تنہا ہو تو نیچے اور کہیں بیٹھنا ہو تو نیچے سے بہک کر تو ٹ، گے، لنے، پراٹے اور اس کی واؤ سے بڑی دوستی ہے۔ آؤ، جاؤ، کھاؤ سے جچتی ہے۔

ی ۔ ے ۔ اب حروف تہجی کے آخری "ی" اور "یے" ہیں۔ لے لی ۔ دے دی ۔ کی جوئی، لیے، جوڑے، بڑے چھوٹے۔

اس طرح سیدھے سادے طریقہ پر حروف تہجی لکھتے ہیں تو رسم الخط کچھ بھی تو مشکل نہیں البتہ دقت ہے تو یہی کہ ہماری زبان کی تحریر SHORT HAND کی سی ہے۔ ہم لکھنے کی سہولت کے مدنظر ہر حرف کے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں۔

الف ہر حال میں سیدھا سیدھا رہتا ہے۔ اور دیگر حروف اس کے ساتھ اسی حال میں جڑ جاتے ہیں۔ جیسے آنا۔ لانا۔ نانا۔ چاچا

ب پ ت ٹ ث کو کسی سے جوڑنا ہو تو اسے مختصر کر دیتے ہیں۔

بہ پہ تہ ٹہ ثہ ۔ ب سے بابا بنا لیا۔ ت سے تالا بنا لیا۔ پ سے پتا، ث سے ثابت، ٹ کو چھوٹا کر کے ٹاٹا کرنا آسان ہے اور سہل ہے۔ حروف تہجی یاد رہیں تو ان کی آواز خود بخود معنی خیز ہو جاتی ہے۔

اسی طرح ج چ ح خ سب کو کاٹ کر صرف اوپر کا علامتی مختصر سا حصہ رکھ لیا۔ ج کو الف سے جوڑ کر جا، چ کو چا، ح کو حا، خ کو خا کر لیا۔ آواز اصل ہے چاروں حروف تھوڑی سی کاٹ چھانٹ کر گلے کی مالا کی طرح جڑ گئے۔

اسی طریقہ پر ص، ض کے نچلے جسم کو کاٹ کر ان کے سر باقی رکھ لیجئے اور کسی بھی حرف کی شروعات یا بیچ میں جوڑ دیجئے۔ یاد رکھئے آخر میں آئیں گے تو یہ مضبوط رہیں گے۔ آپ ان کا دھڑ نہیں کاٹیں گے۔ ص کے ساتھ الف جوڑئے تو صاحب کا صا، صابن کا صا واؤ کے ساتھ صورت۔ ض کو مختصر کر کے ضامن، فرضی میں جوڑیئے۔

ہم آگے بتائیں گے کہ کچھ حروف پسند نہیں کرتے کہ ان کی کانٹ چھانٹ ہو۔ ابھی تو آپ نے ط دیکھا۔ آگے پیچھے درمیان میں ہر جگہ یہ اپنی وضع پر قائم رہتا ہے۔ چاہے طوطا ہو کہ طالب، اس پر نقطہ لگائیے تب بھی وہ ظ کے روپ میں قائم رہتا ہے۔ ظالم

ع اور غ کے نچلے حصوں کو اسی طرح کاٹ دیجئے۔ اور ان کی جگہ ..... کے اسی طرح دوسرے حروف کے ساتھ جوڑتے جائیے۔ بالکل جیسے ہیں آپ بغیر کسی جھجک یا پس و پیش الف سے جوڑیئے عا جیسے عابد میں۔ غ کے لئے غا جیسے غالب میں، واؤ سے جوڑیئے تو عورت، غ کو واؤ سے لگایئے غوغا۔

جس طرح ع اور غ کی گردن کو کر نچلا حصہ کاٹ دیا تھا۔ اسی طرح ع اور غ کے ساتھ بھی کاٹ کوٹ کر دی جاتی ہے۔ س ش ص ض ف ق ک گ ل م وغیرہ۔ کہتے ہیں۔

ف اور ق بھی کٹ کٹا کر مختصر نہ جاتے ہیں۔ ف سے الف جڑ کر فا سے و سے چپکائیے تو فوری کا فو۔ ق بھی اسی طرح الف سے قابل کا "قا" و سے قدرت

خدا کی قسم اس نے کمائی جو آج
قسم ہے خدا کی مزا آگیا۔

ک اور گ بھی بالکل اسی طرح الف سے لگائیے تو کاغذ کا "کا" گا۔ گانا، ل سے گلاب سے۔

کوئی آیا نہ آئے گا لیکن
کیا کریں گر نہ انتظار کریں

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا۔

"ل" بھی کٹ کٹا کر الف سے جڑے گا۔ تو مختصر سا "لا" رہے گا۔ لال، لت لانبا، لانگ، ل سے لطیفہ یعنی چٹکلہ، مزہ مار بات، لیکن بہت ہی مختصر۔ دامن نے اپنی سمجھ کے مطابق بہت ہی دلچسپ لطافت بیان کی۔ اور جب دیکھا کہ کوئی ہنستا نہیں ہے کہا۔ ابھی میں نمک مرچ لگا کر چٹخارہ دار بنا دوں گا۔ کسی نے کہا ہاں ہاں ضرور نمک مرچ لگا کر اس لطیفہ کا اچار ڈالیئے۔

"م" بھی چھوٹا سادہ سا ہے، جب کسی اور سے اس کو جوڑنا ہوتا ہے۔ اس کا جسم مختصر ہو جاتا ہے۔ مالک، ماحد، ماما لیکن آخر میں ل اور م آتے ہیں تو اپنا پورا جسم اور دیگر تمام حروف کی طرح قائم رکھتے ہیں۔

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

"ن" بھی کٹ کر چھوٹا ہو جاتا ہے۔ تانا، تانا، نون کی آواز کے لئے الف کو آخر ...لکھ کر "ں" اس طرح کی علامت جوڑنے پر بیچ بیچ نون کی آواز نکلتی ہے۔ جیسے دواں، آتاں، کھاتاں۔

"و" ہر حال میں ہر جگہ اپنی وضع قطع برقرار رکھتا ہے۔ چاہے وہ شروعات میں ...ے کہ درمیان یا آخر میں۔ واہ واہ، کہاوت، ولی، بولی، ڈولی۔

"ہ" دو قسم کی ہے۔ "آہ، واہ" میں تو قائم رہتی ہے لیکن شروع میں آئے تو کٹ ...اتی ہے۔ ہاں، ہانڈی، ہاتھ میں اس کا روپ تھوڑا سا بدل جاتا ہے۔ ایک اور طرح سے ...ہ کو جب دو چشمی لکھتے ہیں تب بھی یہ ھ کہیں نہیں بدلتی۔ "چھ" "مونچھ" "کچھ" ... کا اور ... ان کو توڑ تاڑ کر چھوٹا بناتے ہیں تو یہ ب ت کی طرح ایسے ہو جاتے ہیں ...ان کے نیچے دو نقطے لگتے ہیں۔ اردو تحریر تمام کی تمام نقطوں پر ٹکی ہوئی ہے بس۔

دنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد
اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد

کسی زمانے میں پہیلی، معمہ، PUZZLE کا اردو میں بڑا رواج تھا۔ اس کو بوجھ ...جواب تو دیکھئے۔

جس نے رکھ دیا سر پر ہاتھ
چپکی چل دی اس کے ساتھ
گھوم گھوم کر پیر کی چیلی
اور پھر بھی کہلائے اکیلی

(برتنے، استعمال کی چیز، چھتری)

صورت دیکھی یا نہیں دیکھی
مورت دیکھی بھالی
دو ڈھالیں اور دو تلواریں
بیچ میں لٹکی اک دو نالی

(حیوانوں میں - ہاتھی)

تالاب کھولنے کے اندر جا نکلی
پھر میں چاہے زہر چھپا کل
(استعمال کی چیز، بٹوہ)
پہلے کیا فرق تھا ہم میں کیا فصل
آپ کچھ اور گئے "بن" وہ اصل
(پہیلی میں نام موجود — بندر)

ان ہی حروف کی کسی نہ کسی ترکیب سے آوازیں بدلی جاتی ہیں۔ جن کے لئے (ــ) کی علامت ہے کہ جو حرف الف پر لگائی جاتی ہے۔ تاکہ الف کی آواز اوپر چڑھے آ سے آواز، آخر، آگے۔

زیر، زبر، پیش، تشدید ——— کسی حرف کے نیچے زیر لگایئے جیسے بسلم زیر سے جلم جڑ گئے۔ اور جلم بن گیا۔ اس علم کی ع پر زبر لگائے تو عَلَم ہو گیا۔ پیش چھوٹی سی واؤ ہے۔ غلام کی غ پر یہ لگائی جائے تو غو کی آواز نکلتی ہے۔

کسی حرف پر زور دینا ہے تو اس کو دوبارہ نہیں لکھتے بلکہ تشدید چڑھا دیتے ہیں غلہ سے غلّہ، ل پر تشدید کے بعد غلّہ بن جاتا ہے۔ ورنہ یہ غَلہ بھی ہو سکتا تھا اور غِلہ بھی۔ ہندی میں حروف کو دو بار لکھا جاتا ہے جیسے कच्चा

"ا" کے زیر سے انسان، "ا" کے زبر سے انیس "ا" کے پیش سے "اُنس" اور الف نے بدن پر تشدید سے "اُنّیس"

ہم نے بتلایا تھا کہ اردو SHORT HAND والی زبان ہے۔ اور ہر لفظ توڑا جا سکتا ہے۔ سوائے د ڈ ذ ر ڑ ژ ز ط ظ و ا ء چاہے وہ شروعات میں ہو، درمیان میں ہو۔ لیکن ایک بھی حرف کسی لفظ کے آخر میں آتا ہے تو وہ کبھی نہیں ٹوٹتا، سالم کا سالم رہتا ہے۔ جیسے لال، آم، جام، کاف، آج، پیچ۔

اردو میں مذکر اور مونث بھی آسان ہے۔ لڑکا کے الف کو نکال کر ی لگا دیجئے تو لڑکی بچہ سے بچی، بچہ، بچی۔

ملتی جلتی آواز والے حروف نئے سیکھنے والوں کو ضرور پریشان کر سکتے ہیں ———

...نا ہے کس کو کہاں جلایا جائے۔ صوتیاتی لحاظ سے وہ ایک سے ہیں۔ لیکن ان کا مخرج
...مقام کہ جہاں سے وہ بن کر آتے ہیں جدا ہوتے ہیں۔ اس لئے ان میں فرق ہوتا ہے۔
تا اس نوبت پر آپ اس فرق کو بالکل بھلا ڈالیئے۔ اور جہاں آپ کو جو سمجھ میں آئے وہ
...ال کیجئے۔ ت ط، ث س ص، ہ ح، ذ ظ ز، خ ق۔

دیکھا آپ نے اردو کے ۳۶ حروف تہجی کو ہم نے مشابہت رکھنے والے ۱۵ حروف میں
...لیا۔ اب آپ کو پورے پورے ۳۶ حروف کو A B C D وغیرہ کی طرح یاد رکھنے کی مشق
...رورت نہیں۔ نقطوں کی مدد سے ہم نے اردو کے حروف تہجی کو باقاعدہ طور پر خانوں میں
...یکر لیا۔

ان سبقوں کی مدد سے کچھ ہی گھنٹوں میں اردو لکھنا پڑھنا بہ آسانی آ جائے گا۔ اور اب
جس زبان کو آپ صرف سمجھتے اور بولتے تھے اب لکھ پڑھ سکیں گے۔

اب آپ کی دلچسپی کے لئے ہم کچھ مکرنیاں سناتے ہیں۔ بات اس طرح شروع کی جاتی
...کہ مطلب کچھ سمجھ میں آئے لیکن اسی بات کو اس طرح بدل دیا جاتا ہے کہ دوسرے ہی
نکلتے ہیں۔

آئے کم ترسائے زیادہ
منھ دکھلایا، یہ جا وہ جا
ہوگا کون بھگوڑا ایسا
اے سکھی ساجن؟ نا سکھی پیا

دونوں ہاتھ سے سر کو گھیرے
تینوں سے وہ نین ملاوے
کان چھوئے اور چھوے مستک
اے سکھی ساجن؟ نا سکھی عینک

سمٹ کے اس کو اپنا آیا
بول اٹھے ہیں من میں کیا کیا
ڈھل مل ڈگمگ اس کے بھاؤ
اے سکھی ساجن؟ نا سکھی ناؤ۔

بانکی چھب پر جو لپٹائے
منھ کھولے تو دس پٹکائے
رام کے سنگ لوں اسکا نام
اے سکھی ساجن؟ نا سکھی آم

نیچے سے اوپر لے جائے
یونہی تیرا جی تھکائے
سانس چڑھے اور پھولے سینہ
اے سکھی ساجن؟ نا سکھی زینہ

آپ ہی میں نے سر پہ چڑھایا
کانپ رہی تھی جب پٹایا
دور سے آیا میرے دیس
اے سکھی ساجن؟ نا سکھی کیس

ہاتھ سے جب چھیڑا تھرائی
پیر سے جب دابا غرائی
ناپے سڑکیں اور بازار
کیا بھائی ناری؟ نا بھائی کار

پیروں بیٹھا سبھا سجائے
سانگ بھرے اور کتھا سنائے
تاکنے آئے پڑوس کی بیوی
اے سکھی ساجن؟ نا سکھی ٹی وی

آپ ہی آپ لپٹا جائے
پچھلی باتیں رٹتا جائے
جو بولوں سو لوٹ دے کھٹ کھٹ
اے سکھی ساجن؟ نا سکھی کیسٹ

راحت محمودہ

تعلیم سے دلچسپی رکھنے والی دو شاہی بیگمات

یہ ایک واقعہ ہے کہ آزاد ہند تعلیمی ترقی میں امریکہ، آسٹریلیا، یورپ بشمول سوویت روس تو کجا (کہ ایک پیرس شہر میں سترہ یونیورسٹیاں ہیں) بعض ایشیائی اور افریقی ملکوں مثلاً جاپان، ترکی، افغانستان، مصر، تیونس، الجزائر اور مراکش سے بھی ہنوز بہت پیچھے ہے۔ اب جب کہ برطانوی سامراج سے ہندوستان آزاد ہو چکا ہے سیاسی مسائل سے زیادہ تعلیمی مسائل پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ملک کی معاشی ترقی ہو یا سماجی اصلاح و ترقی یا دیہات سدھار کا کام غرض ہر جہتی ترقی کا سنگ بنیاد تعلیم ہے۔

وقفہ وقفہ سے ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخباروں رسالوں اور کتابچوں وغیرہ کے ذریعہ آزاد ہند کے باشندوں کو تعلیم کا شوق دلانے کے لئے تعلیمی تشہیر کی سخت ضرورت ہے۔ ہندوستان ایک آزاد جمہوریہ ہے اور جمہوریت کی ترقی کے لئے تعلیمی ترقی ازبس ضروری ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ تعلیمی ترقی کی رفتار بڑھانے اور باشندوں میں تعلیم کا شوق پیدا کرنے کے لئے ہمارے اخبار اور ہمارے رسالے ہر سال اپنے تعلیمی نمبر نکالیں۔ پھر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ جمہوریت میں ہر کام حکومت نہیں کرتی بلکہ باشندگان ملک کو بھی باقاعدہ ہاتھ بٹانا پڑتا ہے چنانچہ امریکہ جیسے اعلیٰ ترقی یافتہ جمہوری ملک میں حکومت کے علاوہ عیسائی اکثریت کی بھی خانگی یونیورسٹیاں ہیں۔ نیز یہودی اور سیاہ فام حبشی اقلیت کے قائم کردہ مڈل سکول، ہائی اسکول اور کالج ہی نہیں ہارورڈ یونیورسٹی سے قریب ہوارڈ یونیورسٹی حبشیوں کی قائم کردہ ہے اس طرح پورے امریکہ میں پھیلے ہوئے صرف چند لاکھ یہودی اقلیت کے نہ صرف دینی مدرسے اور دینی کالج ہی نہیں بلکہ بہت سارے آرٹس کالج، سائنس کالج، کمرشیل کالج اور ٹیکنیکل کالج بھی ہیں۔ آئنسٹائن یونیورسٹی بھی یہودیوں کی قائم کردہ ہے اور امریکہ

ایم فل۔ ریسرچ اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

کی ایک بڑی یونیورسٹی شمار ہوتی ہے۔ پھر امریکہ میں کئی ایک زنانہ کالج ہیں مثلاً آ
کالج اور ریڈکلف زنانہ کالج جہاں لڑکیاں آرٹس اور سائنس ہی نہیں بلکہ عربی
ترکی اور اسلامک اسٹڈیز میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے اعلیٰ ریسرچ کرتی ہیں۔

قدیم ہندوستان کے بدھ مت دور میں بہار میں بین الاقوامی شہرت کی حا
یونیورسٹی تھی جس کے تین منزلہ کھنڈر بڑی بڑی لال اینٹوں سے بنی ہوئی پختہ عمارت
کے رقبہ پر آج بھی پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ پشاور کے قریب بدھ مت والوں کو
تھی۔ اس کے بھی اب کھنڈر باقی رہ گئے ہیں۔ ان جامعات میں اپنی علمی پیاس بجھ
دور دور سے طلباء آتے تھے۔ چینی سیاح فاہیان اور ہیونگ سانگ وغیرہ بھی تو
کی غرض سے آئے تھے۔ اس نوبت پر اس کا بھی اشارہ بے جا نہ ہوگا کہ نلگنڈہ سے آ
کرشنا کے قریب بدھ مت کے راہب ناگرجونا کی ایک بڑی خانقاہ تھی جس میں تعل
انتظام تھا۔ اسی کے نام پر اب ناگرجونا ساگر اور ناگرجونا یونیورسٹی قائم کی گئی ہے

ہند کے عہد وسطیٰ میں حکومت کے علاوہ بادشاہ کے وزراء، امیر امرا
بڑے تاجر اور عالم بھی مدرسے قائم کرتے تھے۔ ہر پنڈت کے گھر یا گھر کے سامنے کے چبوتر
گھنے درخت کے نیچے ایک پاٹ شالہ ہوتا تھا۔ ہر عالم یا مولوی کے گھر ایک چھوٹا یا
یا کم از کم ایک مکتب ضرور ہوتا تھا۔ شہزادیاں بھی مدرسے جاتی تھیں مولانا س
گیلانی نے اپنی ضخیم دو جلدوں کی کتاب "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام ت
میں تفصیل سے بتایا ہے کہ ہندوستان کے ہر بڑے شہر، گاؤں دیہات اور قص
پر مدرسے قائم تھے۔ بہمنی سلطنت کے وزیر اعظم خواجہ محمود گاواں نے بڑا عالی شا
"مدرسہ محمود گاواں" قائم کیا تھا۔ آج بھی بلدہ حیدرآباد سے (۵۰) میل دور بی
"مدرسہ محمود گاواں" کی سہ منزلہ شاندار عمارت کھڑی ہے۔

پھر شاہی بیگمات بھی ہندوستان کی تعلیمی ترقی سے بڑی دلچسپی لیتی
دہلی کی شاہجہانی ملکہ فتح پوری بیگم اور دکن کی قطب شاہی ملکہ حیات بخشی بی
تعلیمی ترقی سے خاص دلچسپی لیتی تھیں ان دونوں کے بنائے ہوئے شاندار مدر
جو موجود ہیں اور سب کے لئے ایک پیام عمل ہیں۔

ملکہ فتح پوری بیگم کا مدرسہ : فتح پوری بیگم، مغل شہنشاہ شاہجہاں کی ایک

ملکہ کی یادگاروں میں آگرہ کی خوشنما مسجد ہے اور دوسرے پایہ تخت دہلی کی فتح پوری مسـ
جد ہے۔ مسجد کے احاطہ میں ملکہ فتح پوری بیگم نے اپنے ذاتی صرفہ سے ایک بڑا شاندار مدرسہ بنـ
اور دور دور سے آنے والے طلباء کے قیام کے لئے مدرسہ سے متصل ایک دارالاقامہ (بورڈنگ ہاؤس)
بھی قائم کیا تھا پھر اس زمانہ میں مسجد سے متصل مدرسہ اور مدرسہ سے متصل کتب خانہ کا قیام لازم
و ملزوم تھا۔ غرض پایہ تخت دہلی میں شاہجہانی ملکہ فتح پوری بیگم کا فیض عام آج بھی جاری ہے
ایک اقامتی عربی کالج اور کتب خانہ و دارالمطالعہ (ریڈنگ روم) آج بھی کام کر رہے ہیں
عصر حاضر کے ایک ہندوستانی عالم محمد سعید احمد مارہروی نے اپنی مشہور کتاب "آثار خیر"
میں "مدرسہ عربی فتح پوری" دہلی کے تحت لکھا ہے:

"فتح پوری بیگم، شاہجہاں کی ایک بیگم کا خطاب تھا، جن کے آثار خیر سے
دہلی اور آگرہ میں ایک، ایک مسجد اس وقت تک موجود ہے۔ دہلی کی مسجد
کے احاطہ میں انہوں نے ایک مدرسہ بھی تعمیر کرایا تھا جو اب تک جاری ہے۔
اس میں ایک بورڈنگ ہاؤز بھی موجود ہے۔ مسجد اور مدرسہ کی کل آمدنی
اس وقت (۱۳۲۳ھ میں) آٹھ سو روپیے ماہوار سے زیادہ ہے جس
میں سے سو روپیے ماہوار مسجد کے اخراجات کے واسطے مخصوص ہیں اور دو سو
روپیے ماہوار مدرسہ پر خرچ کیا جاتا ہے، بقیہ روپیہ بنک میں جمع کیا جاتا ہے
مدرسہ سے متعلق ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی موجود ہے۔"

(آثار خیر ص۵)

پھر اپنی اسی کتاب "آثار خیر" میں صفحہ (۵۱) پر لکھتے ہیں:-
"اکبر آبادی بیگم، شاہجہاں کی ایک بیگم کا نام یا خطاب تھا۔ یہ بڑی نیک
اور قابل بی بی تھیں۔ انہوں نے آگرہ اور دہلی میں ایک ایک مسجد تعمیر
کرائی تھی۔ دہلی کی مسجد ۱۰۶۰ھ میں بن کر تیار ہوئی۔ بادشاہ بھی ان
کی خاطر سے اس کے ملاحظہ کے واسطے تشریف لے گئے۔ بیگم نے جواہر اور
مرصع آلات پیش کش کئے۔"

یہ مسجد دو سال کے عرصہ میں دس ہزار روپیہ کے صرف سے تیار ہوئی۔ اس کے اخراجات
کے واسطے تقسیم میں درآمد کے مطابق ایک بڑی جائداد وقف کی گئی۔ مسجد کے احاطہ میں ایک مدرسہ

میں تعمیر کروایا جس کے معلموں اور طالب علموں کا خرچ اس وقت سے دیا جاتا رہا ...
مغلیہ دور میں آگرہ کا قدیم نام اکبر آباد تھا اور فتح پور سیکری آگرہ سے تقریباً چند میل کے فاصلہ پر ایک مقام ہے جس کو شہنشاہ اکبر نے آباد کیا تھا۔

ملکہ حیات بخشی بیگم کا مدرسہ

ملک دکن کی تاریخ میں قطب شاہی ملکہ حیات بخشی بیگم اور اس کے کارنامے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ملکہ حیات بخشی بیگم، ایک بادشاہ کی شاہزادی (بیٹی)، ایک بادشاہ کی ملکہ (بیوی) اور ایک بادشاہ کی والدہ (ماں) تھیں۔ اپنے کم سن شہزادے عبداللہ قطب شاہ کی کم سنی کے زمانہ میں تولیق کی وہ مسند نشین بھی تھیں۔ پندرہ سال تک بڑے ٹھاٹھ سے حکمرانی کی اور پھر زندگی بھر بادشاہ کی مشیر رہیں۔ انہوں نے شمالی ہند کے مغل بادشاہوں سے خوشگوار سیاسی تعلقات قائم کئے، یہی نہیں بلکہ وائسرائے دکن اورنگ زیب کے شہزادے محمد معظم جو ایک ایرانی بیگم کے بطن سے تھا بڑی حکمت عملی سے اپنا پوتر داماد بنالیا اور اپنے لڑکے سلطان عبداللہ قطب شاہ کی شہزادی سے شہزادہ محمد معظم کی شادی کرادی۔ اس طرح مغلوں سے سیاسی تعلقات کے علاوہ معاشرتی تعلقات بھی قائم کئے۔ اگر یہی دور اندیشی پالیسی برقرار رہتی تو شاید شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کو بعد میں قطب شاہی سلطنت گولکنڈہ پر چڑھائی کی نوبت نہ آتی۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کو کوئی بیٹا نہ تھا اور اس کی دوسری چھوٹی شہزادی کا نکاح ابوالحسن تاناشاہ سے ہوا اور چند کوتاہ اندیش امیروں نے مل کر بڑے داماد شہزادہ معظم کی بجائے چھوٹے داماد ابوالحسن تاناشاہ کو گولکنڈہ کے تخت پر بٹھا دیا۔

قصہ مختصر بلدہ حیدرآباد سے سرور نگر سے ذرا آگے مچھلی بندر (مسولی پٹنم) اور اسحاق پٹنم (وشاکھا پٹنم) بحری بندرگاہوں کو جانے والی کاروانی شاہراہ پر ملکہ حیات بخشی بیگم نے "حیات نگر" کے نام سے ایک بستی بسائی تاکہ جو مسافر اور تاجر مشرقی ساحل کی بندرگاہوں کو جائیں یا ملک کے مشرقی اضلاع سے حیدرآباد آئیں یہاں ٹھیر سکیں۔ حیدرآباد سے آنے جانے والے تجارتی کاروانوں کے لئے حیات نگر ایک اچھی منزل تھی۔ اس نوبت پر اس کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ قطب شاہی سلطنت میں بحری جہازوں کے ذریعہ یورپی تاجر خصوصاً پرتگالی، ولندیزی، فرانسیسی اور دیگر تاجر اپنا تجارتی سامان لے کر پہنچتے اور پھر یہاں سے تجارتی مال اور صنعتی اشیاء خرید کر یورپ و امریکہ لے جاتے تھے۔

حیات بخشی بیگم نے اپنے شہزادے سلطان عبداللہ قطب شاہ کی تخت نشینی کے پہلے
سال [illegible] میں حیات نگر آباد کیا ۔ صناع اور کاریگروں کو بھی یہاں آباد کیا ۔ ایک شاہی محل
بھی وہاں بنایا اور مسافروں اور تاجروں کے لئے ایک کاروان سرائے بھی بنائی یہ جو سرائے ماں صاحب
کے نام سے موسوم ہے (اتنا سا اشارہ کافی ہے کہ ماں صاحب کے تالاب کو بھی اسی ملکہ حیات بخشی بیگم
نے بنایا تھا) اس کے احاطے میں ایک خوشنما مسجد بنائی جو فن تعمیر کا بہترین نمونہ تھی ۔ شہزادہ
عبداللہ قطب شاہ کی تخت نشینی کے بعد حیات بخشی بیگم کا قیام زیادہ تر حیات نگر کے شاہی محل
میں رہتا تھا ۔ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں آصف سادس نے بھی اپنی کمسنی کے زمانہ میں کچھ عرصہ
اسی شاہی محل میں قیام کیا تھا اس زمانہ میں حیات نگر ایک پر فضا مقام تھا ۔ حیات بخشی بیگم نے
حیات نگر کے اطراف میں خوشنما باغات لگوائے تھے حیدرآباد کے لوگ ان تفریحی مقامات پر پکنک
اور خوشیاں منانے کے لئے حیات نگر جاتے تھے ۔ شاہی محل کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا باغ تھا وہ ابھی ابھی
حال تک "عرفاص باغ" کے نام سے موسوم تھا ۔ اس بڑے احاطے میں اب بھی بڑے بڑے اونچے
درخت موجود ہیں ۔ باغ بڑا سرسبز و شاداب تھا اور اعلیٰ حضرت حضور نظام کے عرفاص کی نگرانی
میں تھا ۔ کاروان سرائے کے کمرے مرور زمانہ اور نگہداشت نہ ہونے سے اب ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں
شاہی محل کے عین سامنے جامع مسجد بنائی گئی جو آج بھی موجود ہے ۔ کرسی (بیسمنٹ) نہایت
بلند ہے ۔ پوری عمارت پتھر کی بنی ہوئی ہے ۔ مسجد کے پانچ گنبد ہیں اور مسجد کے بڑے بڑے
ستون ہیں ۔ پوری مسجد پر مضبوط چونے کا پلاسٹر ہے ۔ مسجد کے خوشنما اور بلند مینار لوگوں
اور مسافروں کو دور دور سے دکھائی دیتے ہیں اور دیکھنے والوں کو ان کی خوشنمائی حیرت زدہ
کر دیتی ہے ۔ چند سیڑھیاں طے کرنے کے بعد مسجد کا پہلا صحن ملتا ہے اس صحن میں ایک بڑا
حوض ہے ۔ اس حوض میں باغ کے کنویں سے زمین دوز مٹی کے مضبوط پائپ لائن سے پانی آتا تھا
اس میں فوارہ بھی ہے ۔ اس صحن کے بعد اصل مسجد کے زینے آجاتے ہیں ۔ مسجد کی سیدھی جانب
ایک حجرہ ہے جس کے اندر سے مسجد کی چھت پر جاتے تھے کی سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں ۔ مسجد کی وسیع چھت
پر چاروں طرف چھجے ، کنگورے ، آثار اور خوبصورت جالیاں دیدہ زیبی دیتے ہیں جیسا کہ
اوپر بیان کیا ہے مسجد اس عہد کے فن تعمیر کا ایک اچھا نمونہ ہے

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو : مخبر سید عبدالمجید صدیقی ۔ تاریخ گولکنڈہ ص ۲۲۲

مسجد کے تذکرہ کے بعد اب میں اپنی دادی صاحبہ مرحومہ کے چھوٹے بھائی اور ... صاحب
ی فرید الدین صاحب مرحوم کے بھی چھوٹے بھائی یعنی مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب مرحوم کی تحریر
فید معلومات آفرین کتاب "ملکہ حیات بخشی بیگم اور ان کے کارنامے" [illegible] کے چند حصے
پیش کرتی ہوں ؛

"جس وقت مسجد کی تعمیر ہوئی اس کے ساتھ ہی مسجد کی شمالی جانب طلباء کے قیام کے لئے کمرے تعمیر ہوئے۔ کمروں کے آگے سائبان ہے اور سائبان سے باہر وسیع میدان ہے۔ یہ مدرسہ گویا اقامتی تعلیم گاہ کی حیثیت رکھتا تھا کمروں کی تعداد ایک سو چھبیس ہے۔ غالباً ہر کمرے میں دو دو تین تین طالب علم کو رکھا گیا تھا کیونکہ کمرے کی کشادگی متقاضی ہے کہ ایک طالب علم کیلئے اتنے وسیع کمرے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"کمروں کے سائبان کے سامنے جو صحن ہے وہ نہایت وسیع ہے۔ جس قدر قطب شاہی زمانے کی مساجد حیدرآباد میں موجود ہیں، سب میں مسجد کے سامنے صحن موجود ہے لیکن حیات آباد کی مسجد کا صحن سب سے بڑا ہے۔ خیال ہے کہ طلباء کے قیام کی وجہ سے خصوصیت سے بڑا صحن رکھا گیا ہوگا تاکہ وہ کھلی ہوا سے مستفیض ہو سکیں۔"

"تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی زمانے میں سرکاری طور پر کئی مدرسے تعمیر ہوئے تھے اور سلطنت کی جانب سے ان کے اخراجات ادا ہوتے تھے"[1]

"حیات بخشی بیگم کے اس شاندار مدرسے کے متعلق بعض حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو ... صرف ہوسکے۔ اس مدرسہ کے اخراجات میں ... مدرسہ کی نگرانی علامہ محمد ابن خاتون جیسے مستند و جید شخص کے تفویض تھی۔ علامہ ابن خاتون اپنے زمانے میں میر جملگی کی اہم خدمت پر فائز تھے۔ اور قطب شاہی دور میں یہ خدمت نہایت اہم اور بلند پایہ تصور کی جاتی تھی۔ بادشاہ کے بعد اسی خدمت کا منصب تھا جو قابل ترین اور معتبر شخص کو دی جاتی تھی۔"

---

[1] تفصیل کیلئے دیکھئے مولانا نصیر الدین ہاشمی صاحب کی کتاب "[illegible] کی قدیم تعلیم"

"علماء کی نگرانی سے مدرسہ کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ مدرسہ کس درجہ اہم ہوگا اور یہاں کی تعلیم کس طرح بلند مرتبہ ہوگی، کیونکہ علماء کی نگرانی اس کی متقاضی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ میں ہر درجہ کے طلباء ہوتے تھے امیر کے پہلو بہ پہلو غریب بھی تعلیم کی دولت سے مستفید ہوتے تھے۔"

"اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ علامہ ابن خاتون ہفتہ میں ایک مرتبہ یہاں آتے اور طلباء کی تعلیم وغیرہ کے متعلق مدرسین کو ہدایت دیتے تھے۔" [1]

"سلطان ابوالحسن تاناشاہ کے آخری عہد تک مدرسہ قائم رہا۔ ۱۰۹۸ھ میں جب عالمگیر نے گولکنڈہ فتح کر کے سلطنت مغلیہ میں شامل کرلیا تو مدرسہ کی جانب کوئی توجہ نہیں کی، اس لئے مدرسہ بند ہوگیا۔"

"آج سے چند سال قبل عالمگیر تحریک قرآن کی انجمن نے اس مدرسہ کو از سر نو آباد کرنے کا ارادہ کیا تھا اور ایک مدرسہ بھی قائم ہوا تھا۔ مگر چند سال کے بعد اس انجمن کے بانی حیدرآباد سے چلے گئے تو مدرسہ بھی ختم ہوگیا۔ اب پھر غیر آباد صورت میں اس کے کھنڈر اپنے بانی کی یاد دلاتے ہیں۔" [2]

کاش جدید وقف بورڈ اس مدرسہ کو پھر سے آباد کرے اور سابق صدر وقف بورڈ الحاج سید عبداللطیف کی طرح یہاں فنی، پیشہ ورانہ اور ٹیکنیکل تعلیم و تربیت کا انتظام کرے۔

اس نوبت پر اس کا تذکرہ ضروری ہے کہ فتح پوری بیگم نے ۱۰۶۰ھ میں دہلی میں اپنا مدرسہ "فتح پوری" تعمیر کیا تھا اور دکن کی ملکہ حیات بخشی بیگم نے ۱۰۴۳ھ میں حیات نگر کا مدرسہ

---

[1] عبداللہ قطب شاہ والیٔ گولکنڈہ کا پیشوا شیخ محمد ابن خاتون بڑا ذی علم اور اہل علم کا قدردان
[illegible] خدمات شاہی کے انجام دینے کے بعد درس و تدریس میں مشغول رہتا تھا۔ [illegible]
کے وقت علماء، فضلاء، شعراء اس کے یہاں جمع ہوتے تھے اور کتب تفسیر، حدیث، فقہ
[illegible]ت، ریاضی، منطق وغیرہ اس سے پڑھتے تھے۔ [illegible] شنبہ کے دن تعطیل رہتی تھی۔ اس دن
[illegible] ارباب کمال حاضر ہوتے اور علمی بحث و مباحثہ میں مشغول رہتے تھے۔ (تاریخ دکن [illegible])

[2] نصیرالدین ہاشمی "حیات بخشی بیگم اور ان کے کارنامے" [illegible]
— [illegible] حیدرآباد

میر کیا تھا یعنی حیات بخشی بیگم نے پچیس سال قبل دکن میں اپنا یہ شاندار مدرسہ تعمیر کیا تھا۔

اس مضمون کا مقصد

مشرقی مورخین ہوں یا مغربی مورخین ہر ایک نے بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں اسپین کا ہر شخص لکھنا پڑھنا جانتا تھا اور خود ہندوستان کے چپہ چپہ میں تعلیمی ادارے تھے تقریباً دو سو سالہ برطانوی سامراج سے سیاسی آزادی کے بعد اب ہماری یہ کوشش اور جد و جہد ہونی چاہیے کہ ہندوستان کا ہر شخص لکھنا پڑھنا سیکھ لے۔ یکجہتی ترقی کے لئے تعلیم ازبس ضروری ہے چنانچہ پیغمبر اسلام ﷺ نے ہم کو بار ہا بتایا ہے کہ "علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان عورت پر فرض ہے"

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَۃٍ

اس طرح ہمارا وطن پہلا سا بلند مقام اقوام عالم میں حاصل کرے گا جس کا تذکرہ شاعر مشرق علامہ سر محمد اقبال نے اپنے قومی ترانہ میں کیا ہے ؎

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا — سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

□□

حرفے از لبش شنیدہ ام

کرنل فقیر سید وحید الدین مصنف "روزگار فقیر" فرماتے ہیں:

"ایک وفد نے علامہ اقبالؒ سے زمانہ کی ناقدر شناسی کا تذکرہ کیا اور کہا کہ لوگ اپنے ملک کے بڑے بڑے شاعروں، قومی رہنماؤں اور عظیم المرتبت انسانوں کی زندگی میں قدر نہیں کرتے۔

علامہ اقبالؒ اس سوال سے بہت متاثر ہوئے اور تھوڑے تامل کے بعد فرمایا تم غور کرو تو معلوم ہوگا کہ جب شاعر کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں تو دنیا کی بند ہوتی ہیں اور جب شاعر کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتی ہیں تو دنیا کی کھل جاتی ہیں اور وہ صدیوں تک اس کے گیت گاتی رہتی ہے۔

انیس چشتی

مراٹھی ادب شناسی

لکشمن مانے کی "اُپرا"

مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کی شہرہ آفاق تصنیف "غبار خاطر" کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کرنے کی جب لوگوں نے اجازت چاہی تو مولانا نے اسے سختی سے منع کر دیا۔ اس کی وجہ تھی کتاب کا اسلوب، زبان کی چاشنی اور اس کا مخصوص معاشرتی ماحول۔ ترجمے میں خطرہ ہے کہ یہ باتیں مفقود ہو جاتیں جو اس کتاب کا اصلی جوہر ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ (صرف زبان و اسلوب کی حد تک) لکشمن مانے کی مشہور مراٹھی تصنیف "اُپرا" کے ساتھ ہے۔ یہ کتاب دراصل مصنف کی سماجی آپ بیتی ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع اور اسلوب نگارش کی وجہ سے مراٹھی ادیبوں اور قارئین سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن دسمبر ۱۹۸۰ء میں منظر عام پر آیا۔ "اُپرا" کو متعدد سرکاری و نیم سرکاری اکادمیوں کی جانب سے انعامات بھی مل چکے ہیں۔ اسی طرح امریکہ کے بین الاقوامی ادارے "فورڈ فاؤنڈیشن" کی جانب سے لکشمن مانے کو سوا لاکھ روپے کی اسکالرشپ بھی مل چکی ہے۔ تاکہ وہ اپنے فرقے کے مسائل اور ان کے حل سے متعلق مزید تحقیقات کر سکیں۔

لکشمن مانے کا تعلق کیکاڑی (مہاراشٹرا کے ایک خانہ بدوش قبیلے) سے ہے۔ عرب اور دیگر صحرائی علاقوں کے خانہ بدوش قبیلوں اور کیکاڑی فرقہ میں تھوڑا سا فرق ہے۔ صحرائی خانہ بدوش اپنے مخصوص جغرافیائی ماحول کی وجہ سے چارے اور پانی کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ بھٹکتے رہتے ہیں۔ مہاراشٹرا کوئی صحرائی علاقہ تو نہیں۔ پھر یہ خانہ بدوش قبیلہ کہاں سے وجود میں آیا؟ کیکاڑی فرقہ کی خانہ بدوشی اس علاقے کے مخصوص سماجی ماحول کی دین ہے۔ یہ قبیلہ چارے اور پانی کی تلاش میں تو نہیں البتہ روزگار کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ

۵۵م، کیولری روڈ ۔ پونے ۴۱۱۰۰۱، مہاراشٹرا

منتقل ہوتا رہتا ہے۔ ان کے ساتھ ذکر لوٹتے ہوتے ہیں اور نہ ہی کوئی عبادت گاہ۔ مسلسلاً ان کا اثاثۂ زندگی اور رختِ سفر گدھوں پر لدا رہتا ہے۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں یہ روزگار کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ جنگل سے لکڑیاں اکٹھی کرنا، درختوں کی گیلی شاخوں سے چھوٹی بڑی ٹوکریاں اور چٹائیاں بننا؛ فصل کے دنوں میں پڑاؤ والے مقام پر کھیتوں میں کام کرنا۔ شادی بیاہ کے دنوں میں باراتوں کے آگے بینڈ بجانا بھی ان کا شغل ہے۔

شاید اس بات کے اعادہ کی ضرورت نہیں کہ بھارت کا ہندو سماج مختلف طبقوں میں بٹا ہوا ہے۔ سماج کے چار طبقوں سے تو سبھی واقف ہیں ـــــ برہمن، کھتری، ویش اور شودر، ـــــ کیکاڑی فرقہ کا تعلق آخری اور سب سے نچلے طبقے یعنی شودر سے ہے۔ شودر فرقہ کو عام طور پر دلت سماج یا پسماندہ طبقہ بھی کہا جاتا ہے۔ گاندھی جی نے اس فرقے کی کسمپرسی کی جانب توجہ دی تو اس سب سے نیچے فرقہ کو انہوں نے باعزت مقام دینا چاہا اور انہیں ہریجن کہا۔ یاد رہے کہ ہریجن فرقہ میں بھی لاتعداد فرقہ وارانہ اکائیاں ہیں۔ مثلاً دھیڑ، ملنگ، ملہار، وڈارے، کولاٹی، گوندھلی، گوساویں، مانگ گاروڑی، وڈر، دھوبی، چمار، بھنگی، بھشتی، کوشٹی (جُلاہے)، جوتشی، کیکاڑی، مداری، اور بہروپیوں میں کئی فرقے بندر والے، ریچھ والے، سانپ والے، راستوں پر تماشہ دکھانے والے، سرکس کے کرتب دکھانے والے کلاونت وغیرہ۔ ان میں جنگل کے آدیباسی شامل نہیں ہیں۔ یہ فہرست انتہائی غیر مرتب عارضی اور سرسری ہے۔ صرف مہاراشٹرا کی درج فہرست ذاتیں اور قبائل کی یادداشت میں تقریباً تین سو ذاتیں شامل ہیں اور ان میں آئے دن اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ حکومت کی سہولیات سے مستفید ہونے کے لئے نئے نئے فرقوں کا اندراج اور تحقیق و تفتیش کا کام لگاتار جاری ہے اور اس کے لئے الگ محکمہ قائم ہے۔

آزادی کے بعد ہندوستان بھر کے پسماندہ فرقوں میں اپنے حقوق کے حصول اور خود شناسی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ یہاں یہ باور کرا دینا ضروری ہے کہ مندرجہ بالا فرقوں میں آپسی تعلقات سیاسی مفاد کے لئے تو ہیں لیکن ان میں یہ احساس پیدا ہو چلا ہے کہ اس ملک کے اصل وارث ہم ہیں۔ اگر جمہوریت میں سر گنتا ہی ٹھہرا تو ہندوستان کی بڑی آبادی ہم پر مشتمل ہے۔ اور یہ سب فرقے مل کر اکثریت بن جاتے ہیں۔ ان میں اگر مسلمان کو بھی شامل کر لیا جائے تو ملک کی مجموعی آبادی کا ۸۵ فیصد حصہ بن جاتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ حکومت و اقتدار ہمارے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ وہ کون سے عوامل ہیں جن کی وجہ سے آبادی کا صرف ۱۵ فیصدی حصہ ہم پر حکومت کرتا ہے۔ اس سلسلے کے اعلانات ڈی ایس فو

... دولت ہوشنت ... سنگھرش سمیتی بام سیف BAMCEF (بیک ورڈ اینڈ مائناریٹی کمیونٹی ایمپلائز فیڈریشن) اور دلت سنگھرش سمیتی کی شاخیں جنوبی صوبوں اور مہاراشٹر میں پھیل رہی ہیں۔ ان فرقوں کو ختم کرنا اور انہیں ایک پلیٹ فارم پر لانا، ان میں خود شناسی اور خود آگاہی پیدا کرنا انہیں اوہام اساطیر کے چکر سے نکالنا اور انہیں تعلیم یافتہ بنانا بڑی حد تک دلتوں اور مظلوم طبقوں کا مقصد ہے

پسماندہ طبقات میں برہمن بیزاری کا عام رجحان پایا جاتا ہے۔ ان کے لیڈروں نے اپنے پیروؤں کو یہ باور کرادیا ہے کہ اب تک برہمنوں نے اور ہندوؤں کے مذہب تہذیب [illegible] ہوتا رہا ہے اور اس وقت بھی اگر تم نہیں جاگے تو مزید کئی ہزار برس ماضی کی تاریخ دہرائی جائے گی۔ اور برہمن ود نو بدھوں کو اونچی ذات کے ہندو سماجی، سیاسی اور جسمانی طور پر کچلتے رہیں گے۔ ہندو قانون میں اچھوتوں کا کوئی مقام نہیں ہے۔ ہندو قانون کی قدیم کتاب منوسمرتی میں ایک چھپکلی، چوہے اور کوے مارنے کا کفارہ اور ایک شودر کو مارنے کا کفارہ برابر ہے۔ گیتا، وید اور اپنشد کی تعلیم صرف برہمنوں کے لئے مخصوص ہے اور زمانۂ تاریخ میں گیتا سننے اور پڑھنے والے اچھوت کی سزا بالترتیب کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالنا اور تالو سے زبان کھینچنا تجویز کی گئی تھی۔ یہ کسی نہ کسی تبدیلی کے ساتھ آج جاری ہے۔

اچھوتوں نے اپنی نجات کے لئے بڑی بڑی کوششیں کیں۔ ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کی قیادت میں انہوں نے اجتماعی طور پر اپنا مذہب تبدیل کیا اور بدھ مت کے ماننے والے بن گئے۔ مساوات برابری کے لئے انہوں نے عیسائی مشنریوں سے اثر قبول کیا اور عیسائی بن گئے۔ لیکن مسئلہ جوں کا توں ہے۔ نہ تو عیسائی اور نہ ہی بدھ اونچی ذات بن پائے اور ہندوستانی سماج میں بلند اور برابری کا مقام حاصل کر سکے۔ پسماندہ عیسائی نہ تو اونچی ذات کے عیسائیوں کے چرچ میں جا سکتے ہیں اور نہ ہی ان کے قبرستانوں میں دفن ہو سکتے ہیں۔ اور نہ ہی کسی گوشے سے رشتہ داری قائم کر سکتے ہیں۔ تقریباً یہی نو بدھوں کا ہے ——— سماجی مساوات کی تلاش میں مزید ایک تحریک نے جنم لیا ——— برہمنزم کو خیرباد کہو۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ جنوبی ہندوستان کے میناکشی پورم جیسے اجتماعی قبول اسلام کے عمل میں اس تحریک کو بھی دخل ہے یا نہیں۔

اس مختصر سے پس منظر میں آپ لکشمن مانے کی تصنیف اُپرا کی اہمیت کا اندازہ لگائیے۔ مصنف کی آپ بیتی اس کے پورے سماج کی آپ بیتی ہے۔ دلتوں کے ادب [illegible] سے یہ کتاب [illegible] ہوتا ہے۔ لکشمن مانے نے اپنی یہ کتاب اپنے ماں باپ [illegible] اور سماج [illegible]

ہے نام منسوب کیا ہے۔

ماں باپ کے نام اس لئے کہ انہوں نے اپنا پیٹ کاٹ کر بھوکے رہ کر اور محنت کر کے مصنف کو پڑھایا لکھایا۔ یہ لیبر کلاس کی اولین اولاد ہے جو تعلیم یافتہ ہے۔ اپنی بیوی شانتی کے نام اس لئے کہ ایک دولت مند گھرانے کے باپ کی بیٹی ہوتے ہوئے بھی اس نے اپنا سب کچھ تج کر ایک نیچ ذات کے لڑکے کے ساتھ شادی کر لی؛ سماج وادی دوستوں کے نام اس لئے کہ انہوں نے نئی تحریک کے ذریعہ مصنف کو سیاسی آگاہی بخشی۔ اپرا سے آپ بیتی میں مصنف نے نہ تو کہیں فلسفہ جھاڑا ہے اور نہ ہی کسی قسم کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ کتاب کی تحریر میں وہ بے ساختگی ہے جو کسی غیر پیشہ ورانہ مصنف کے قلم میں یا کسی باذوق فنکار کے کیمرے میں ہوتی ہے۔ اس قسم کی تصنیف میں عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ مصنف اپنے معاشرے کی لاچاری اور پسماندگی کا رونا لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور شکایتوں کے دفتر کھولنے لگتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں پوری تحریر SOS یا اپیل اور اپیل پیغام بن کر رہ جاتی ہے۔ حالات کو من و عن پیش کرنا اور اسلوب اس طرح کا اختیار کرنا کہ موضوع کا نفسیاتی تجزیہ قاری خود کرے۔ لکشمن مانے کا ہی حصہ ہے۔ منظر کشی اور فردی تجربات کے برمحل استعمال نے کتاب کی قدر و قیمت بڑھا دی ہے۔ حقیقت نگاری بعض مقامات پر ابتذال کی حد تک ہے۔ جو مراٹھی ادب کا خاصہ ہے۔ کتاب کے طویل طویل اقتباسات کا جہاں جہاں ترجمہ پیش کیا ہے۔ وہاں اس قبیل کے شذرات سے گریز کیا گیا ہے کیوں کہ اردو داں طبقہ اور میرا قلم اس بے باکی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ "اپرا" ایک سچی داستانِ حیات ہے۔ جو مانے کے بچپن سے شروع ہوتی ہے۔ اور بحال یعنی عمر کی پختگی پر ختم ہوتی ہے۔ یہ تحریر دسمبر ۱۹۸۰ء میں چھپ کر منظر عام پر آئی۔

اُپرا کے کسی حصے میں مصنف نے عوامی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے کسی ایسے واقعے کا تذکرہ نہیں کیا ہے، جو فرضی، من گھڑت، یا مافوق الطبعیاتی ہو۔ اس میں ایک ایسے سماج کا تذکرہ ہے جو اپنا سامانِ زندگی پیٹھ پر لادے لگاتار سفر میں مبتلا ہے۔ ایک ختم نہ ہونے والا سفر — چلنا چلنا مدام چلنا کے مصداق ——— آپ بھی مصنف کے ساتھ چلے چلتے ہیں اور چلتے ہوئے تھکتے بھی نہیں۔ مصنف کسی جگہ بھی اس بات کی دہائی دیئے بغیر آپ کو ساتھ لئے چلتا ہے اور واقعاتِ سفر یعنی حاصل واقعاتِ زندگی کیا تھا، کیا ہونا چاہیئے، کچھ اس طرح آپ کے سامنے ترتیب وار رکھتا چلا جاتا ہے کہ آپ کو خود بخود مصنف سے، اس کے پورے قبیلے سے، حتیٰ کہ اس قبیلے کے مجرموں

سے بھی ہمدردی ہو جاتی ہے ۔

یہ آپ بیتی بڑی حد تک ایک سلسلہ وار ناول بھی ہے۔ جس کا ہیرو خود لکشمن مانے ہے۔ جب تک مصنف بچہ تھا اس کی دنیا بڑی محدود تھی۔ اس میں تذکرہ ہے۔ ماں کا، باپ کا جسے وہ "موف" یا "با" کہتا ہے۔ اور اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کا اور گدھوں کا۔ کیونکہ اس کے ذمہ جو کام ہے "سنگار پنے" اور ناک کی رینٹ پونچھتے رہنے کے علاوہ کم عمری میں جو سب سے اہم کام تفویض کیا گیا ہے وہ ہے گدھے سنبھالنے کا۔ کیکاڑیوں کی ساری زندگی گدھوں کے اطراف گردش کرتی ہے۔ حد یہ ہے کہ پنڈھرپور میں کیکاڑی جماعت کا جو مٹھ ہے وہاں مندر کی مورتی تک بھی گدھے کا سر لگا ہوا ہے۔ دنیا کے ہر حصے میں خانہ بدوش قبیلے پائے جاتے ہیں اور ہر قبیلے کی ایک مخصوص سواری ہے۔ مثلاً ریگستان میں اونٹ یا گھوڑے، افغانستان کے دشوار گذار پہاڑی علاقوں میں گھوڑے یا خچر، تبت میں یاک اور لاما، شنڈ لے کے برفانی علاقوں میں رین ڈیر، کیکاڑیوں کے حصے میں گدھا آیا۔ بڑا کم خرچ نہایت کارآمد ——— کم خرچ اس طرح کہ اس کی غذا کا کوئی خاص اہتمام نہیں کرنا پڑتا۔ گاؤں کے کوڑے پر چھوڑ دیجئے۔ کچرے میں سے اپنی غذا تلاش کرے گا۔ کاغذ کھا کر دن گذار لے گا۔ کارآمد اس طرح کہ بھر پور سامان لاد دیئے۔ تیر چوں دھرا کے گردن جھکائے رات دن چلتا رہتا ہے۔ اس کے فرار ہونے کے سارے راستے مسدود۔ کم رفتاری کی وجہ سے دوڑ کر پکڑ لیجئے۔ چوری جانے کا احتمال نہیں۔ اپنے بے ڈھب ڈیل ڈول کی وجہ سے بستی کے لوگوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کی ساخت میں گھوڑا پن بھی ہے اور بار برداری میں بیل پن بھی۔ بیچنے جائیے تو اچھا خاصہ دام بھی دے جاتا ہے ——— یہی وجہ ہے کہ کیکاڑی اسے بہت عزیز رکھتے ہیں۔ اور اس کی نگرانی کیکاڑیوں کے بچے بھی کر لیتے ہیں۔

جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں، ہندوستان کے پس ماندہ طبقات میں برہمن اور بنیا بیزاری کا عام رجحان پایا جاتا ہے۔ لیکن لکشمن مانے نے برہمنوں پر حملے کر کے اپنی کتاب کو دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لئے استعمال نہیں کیا ہے۔ اس کا قلم بڑی حد تک بیباک بھی ہے اور اس کی تحریر صداقت پر مبنی بھی ہے۔ جس شخص نے مصنف کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا ہے اس نے بلا روک ٹوک ان کا تذکرہ کیا ہے۔ جہاں کہیں برہمن دوستوں نے اس کی مدد کی ہے وہاں اس نے ان کے احسان کو مانا ہے۔ اگر مسلمانوں نے اس کا ساتھ دیا ہے تو مصنف نے کھل کر اس کا اعتراف کیا ہے۔ اس کے اپنے لوگوں نے جہاں اس کے ساتھ دغا کی ہے اس کا بھی تذکرہ نہایت بیباکی سے کیا ہے۔

میر ایق علی

دکن کا داغ صفی اورنگ آبادی

حکیم میر بہبود علی صفی اورنگ آبادی (۷ رجب ۱۳۱۰ھ - ۱۲ مارچ ۱۹۵۴ء) دکن کے نامور شاعر اور استاد سخن تھے۔ ولی اور سراج کے وطن اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ - اور فارسی کی تعلیم پائی۔ ایک آزاد اور سیدھے سادے مسلمان تھے۔ ۶۳ سال کی عمر میں مرض سے انتقال کر گئے۔ اور درگاہ حضرت سردار بیگ کے احاطہ حیدرآباد میں مدفون ہوئے۔ ح رضی الدین حسن کیفی حیدرآبادی کے شاگرد اور جانشین، آزاد منش اور پرگو شاعر تھے۔ غم اور غم دوراں ان کی شاعری میں ملے جلے ملتے ہیں۔ دکنی محاوروں اور روزمرہ کو حضرت صفی استادانہ طور پر برتا ہے۔ ان کی غزلوں میں زبان و بیان کی سادگی اور شیرینی کے ساتھ ساتھ اور تازگی بھی ملتی ہے۔

صفی نے ترستی ہوئی زندگی اور برستی ہوئی آنکھوں سے مسکراتی ہوئی غزلیں دیں جلتے ہوئے چراغ، بجھتے ہوئے لفظ، بولتے ہوئے محاورے اور کھنکتے ہوئے شعر دیئے ادب کی یہ لافانی امانتیں ہم تک پہونچانے کے لئے انہیں خود سے دور ہوتے جانا پڑا۔ دور ہوتے گئے اور اس قدر دور ہو گئے کہ اپنی شخصیت کا وہ کنارہ خود ان کی نظروں سے ہو گیا۔ اور بالآخر وہ صرف شاعر رہ گئے۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے ان کی شعری خدمات کا کیا گیا تھا اور ایک مجموعہ نظم و نثر صفی صاحب کی شخصیت اور فکر و فن پر "یادگار صفی" کے نام سے خواجہ حمیدالدین شاہد نے مرتب کر کے شائع کیا۔ صفی کی وفات کے

A 12-1-489/10 درگاہ گنج شہیداں۔ آصف نگر۔ حیدرآباد (500267)

عبارت الہیات ونعت کا مرتبہ انتخاب کلام مثنی اور خواجہ شوق کا مرتبہ پراگندہ منشا نے چھکر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

مثنی نے نظمیں بھی موزوں کی ہیں لیکن غزلوں کے مقابلے میں ان کی تعداد نہایت قلیل ہے۔ یہ غزل گو شاعر ہیں۔ مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے ہیں اور رسالوں میں بھی اپنا کلام شائع ہونے نہیں دیتے۔ ان کی خودداری اور قناعت پسندی مشہور ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

دنیا مثال دیتی ہے مجنوں کے عشق کی۔
دیوانہ اپنے کام میں کیا ہوشیار تھا

قیامت آئی یا اس فتنہ قامت کو شباب آیا
حیا آئی، غرور آیا، ادا آئی حجاب آیا۔

مثنی کی جان نکل جائے تو بس ہے اس کے کوچہ میں
وہاں سے زندہ آیا تو سمجھو کامیاب آیا

ادا پیدا نظر سے شان رخ سے آن تیور سے
ترے قربان آخر دل ہے کس کس کیلئے ترسے

وہ کونسا صدمہ ہے جو ہم پر نہیں ہوتا۔
لیکن نہیں ہوتا انہیں باور نہیں ہوتا۔

آتش ڈھائیں غضب برپا کیا ☆ خیر تم نے جو کیا اچھا کیا

معشوق کو بدنام بھی کرنا نہیں آتا۔
لوگوں کو برا کام بھی کرنا نہیں آتا۔

دوستی عاشقی نہیں ہوتی ؛ عاشقی دل لگی نہیں ہوتی

ہوائے معصیتِ دنیا صفیؔ میں کیا مانگوں
غضب ہوا جو مرا کام بے مدعا نہ ہوا

تیرا خیال کیا اِدھر آیا اُدھر گیا
جیسا ہوا کے گھوڑے پہ کوئی سوار تھا

ایک نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

جیتے جی بھی ہوتے ہیں انساں پر لاکھوں عذاب
کیا بتاؤں ان کی گنتی کیا کروں ان کا حساب

ایک ان میں قرض وہ بھی قرض سودی کی بلا
جس کو یہ لپٹی ہوا پھر اس کا گھر کا گھر خراب

جیز پر، تنخواہ پر، جائیداد پر قرضہ ملا
وہ بھی، جس کی تین میں گنتی نہ تیرا میں حساب

سو میں ستر ہاتھ آئے تو بڑی دولت ملی
کم ہو گیا اب سر کا سودا اور دل کا پیچ و تاب

ایسے پیاسے کی طرح مقروض کی حالت ہوئی
دوڑے جو پانی سمجھ کر اور وہ نکلے سراب

صفیؔ کی شاعری پر نظر ڈالیے تو وہ سچ مچ فصیح الملک استاد داغؔ کے سچے جانشین ہیں۔ صفیؔ داغؔ کے راست شاگرد نہیں تھے۔ اسی لئے یہ کہنا بالکل غلط نہیں ہے کہ داغؔ کی زبان دانی و فصاحت کے وارث تھے۔ لیکن داغؔ کی شہرت اور مقبولیت پر نظر کیجئے قدردانی و شاعر نوازی کا تصور کیجئے اور صفیؔ کی بیرون حیدرآباد گمنامی اور زمانہ کی ناقدرشناسی کو دیکھئے تو دونوں کے مزاج کا فرق آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔

علاوہ بندش محاورہ کا برمحل استعمال، نکھری ہوئی زبان، الفاظ کی مزاج شناسی اور چستی بندش، چھوٹی چھوٹی ترکیبیں، اور جذبات نگاری و معاملہ بندی کا جہاں تک تعلق ہے۔ وہ داغ کے سچے شاگرد تھے۔ یہ سب خصوصیات ان کے کلام میں بھی موجود ہیں۔ بلکہ ایک خصوصیت اضافہ ہے۔ کیفی کا شاگرد ہونے کی وجہ سے انہیں رقت اور سوز و گداز بھی ملے ہیں۔ کیونکہ کیفی اہل دل تھے اور ان کے کلام میں صفائی زبان اور لطف بیان کے ساتھ ساتھ سوز و گداز و رقت کے جوہر بھی موجود تھے۔ ان دونوں خصوصیات کا یکجا ہونا یعنی داغ اور کیفی کے طرز ادا میں ڈھل جانا ایسی چیز ہے کہ چاہیئے تھا ان کی شراب شاعری دو آتشہ ہو جاتی مگر داغ اور صفی کے مزاج میں بنیادی فرق ہے۔ داغ نے قلعہ معلی میں آنکھیں کھولیں۔ دہلی کی تباہی کے باوجود انہیں سرپرستی اور رفاقت کے لئے امرا مل گئے۔ جب دلی کی لٹی ہوئی دولت بھی سمٹنے لگی تو داغ نے رامپور کا رخ کیا اور پھر وہاں سے حیدرآباد چلے آئے تو یہیں کے ہو رہے۔ ریاست بڑی تھی۔ داغ دربار کے مزاج آشنا تھے۔ طبیعت میں دل کو خوش کر دینے والے جوہر موجود تھے۔ ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ استاد سلطان بنے خطاب و منصب سے سرفراز ہوئے۔ پھر کیا تھا خوشی و خوشحالی ان کے قدم چومنے لگی۔ محفل طرب کی وہ جان بن گئے۔ اسی لئے داغ کے کلام میں خوش دلی و شگفتگی جھلکتی ہے عیش و نشاط کا احساس فراغت ہے۔ قدردانی ملنے پر سیر چشمی ہے "شوخی ہے" بانکپن ہے اس کے ساتھ محاورے کی چاشنی اور روزمرہ کا چٹخارہ یہ مسالہ لفظ موتیوں میں ڈھل گیا۔ دربار ہی میں نہیں دربار کے باہر بھی قدردانوں نے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ اس کے برعکس صفی کی سرگذشت سنیئے۔

اورنگ آباد کے ایک حکیم کے گھر جنم لیا۔ سات سال کی عمر میں والد کے ساتھ حیدرآباد آ گئے۔ ابتدائی تعلیم جامعہ نظامیہ میں حاصل کی مگر تکمیل درس نہ کر سکے۔ خاندانی فن طب میں دخل چاہا مگر باقاعدہ مطب نہیں کیا۔ خطاطی و خوشنویسی سیکھی مگر کمال پیدا کرنے سے پہلے طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ چنانچہ وہ ادھورے اور ناتمام رہے۔ طبیعت نے ٹک کر جم کر کوئی کام نہیں کرنے دیا۔ ان سب نے بس دل بہلایا۔ البتہ مطالعہ کے شوق نے زبان کی ساری گرہیں کھول دیں۔ طبیعت کی خودداری نے دربار سے دور رکھا۔ قسمت نے حاجت مند تو بنایا مگر خودداری نے دست سوال دراز کرنے سے روکا۔ اسی لئے ساری عمر حسرت و افلاس کی کشمکش میں گذری۔ دل بجھا بجھا، افسردہ و ناکام، اسی کیفیت نے محفلوں و مشاعروں سے گریزاں رکھا۔ مگر شاعری میں خوب نام کمایا۔ بقول کسے جس مشاعرہ میں غزل پڑھتے تو داد کے ڈونگرے برسنے لگتے۔ لیکن طبیعت کی قلندری ہر مشاعرہ میں شرکت سے بھی

ملائم طبع، شہرت بیزاری کا یہ عالم کہ کبھی اپنا کلام چھپوانے کی طرف توجہ نہیں کی۔ کسی نے زبردستی کوئی غزل چھاپ دی تو چھپ گئی، سو بھی بہت اصرار و خوشامد سے۔ مگر کلام چھپا بھی تو مقامی اخبارات اور رسالوں میں۔ اسی لئے داغ کی ہندوستان گیر شہرت کے مقابلے میں ان کی شہرت مقامی بن کر رہ گئی۔ پھر بھی یہ کیا کم ہے کہ لطفِ زبان نے لوگوں کے دلوں میں اس طرح گھر کر لیا تھا کہ ان کی غزلیں ہر محفل میں گائی جاتی تھیں۔ آج سے چند سال پہلے تک ان کا کلام پڑھا اور گایا جاتا تھا اور سننے والوں کی زبان پر یہ شعر ہوتے تھے۔

خدا کی قسم کھا کے وہ ہنس پڑے
خدا کی قسم ہے مزہ آ گیا

نہ ہم دوسرے ہیں نہ وہ دوسرے
زمانہ مگر دوسرا آ گیا

سمجھتا ہوں سب کچھ مگر دوستو
یہ دل ہے جدھر آ گیا آ گیا

محبت سے نہ دیکھو تم تو دشمن کی نظر دیکھو
خفا ہو کر، بگڑ کر، روٹھ کر دیکھو، مگر دیکھو

کسی کو جب سے دیکھا ہے دکھائی کچھ نہیں دیتا
ہوئی میری نظر کو دوستو کس کی نظر دیکھو

ادا پیدا نظر سے، شان رخ سے، آن تیور سے
ترے قربان آخر دل ہے کس کس کے اثر سے

صفی کو مسکرا کر دیکھ لو غصے سے کیا حاصل
اسے تم زہر کیوں دیتے ہو جو مرتا ہے شکر سے

نہ پابندی سلیقے کی نہ آزادی قرینے کی
مروت کچھ نہیں معلوم ہوتی اپنے جینے کی

یہی آنکھیں یہی دل ہے تو بس اللہ حافظ ہے
نہیں معلوم کیا ترکیب ہے دنیا میں جینے کی

اس طرح مفتی کے کتنے شعر بچے بچے کی زبان پر تھے۔ بعض تو یہ جانے بغیر کہتے تھے کہ مفتی انہیں کے شہر حیدرآباد کے ایک محلے مغل پورہ میں اپنی زندگی کے دن گھڑیاں گن گن کر کاٹ رہے ہیں۔ اور بس ایک نام کا سہارا کافی سمجھتے ہیں ۔

اللہ کو پکار اگر کوئی کام ہے
غافل ہزار نام کا یہ ایک نام ہے ۔
وقت کو اے مفتی برا نہ کہو
وقت پیغمبروں پر آتا ہے ۔

مفتی کی قلندرانہ کیفیت کے باوجود ان کے گھر پر شاگردوں کا ایک جمگھٹا رہتا تھا ۔ لیکن ایک وقت وہ بھی آیا جب یہ قدردان دنیا سے اٹھ گئے۔ چنانچہ آخری عمر میں مفتی کی کسمپرسی اور افلاس نے بھیانک شکل اختیار کرلی۔ طبیعت کا رنگ ایسا ہوگیا تھا کہ آبگینہ بن گئے تھے۔ اسی لئے لوگ کام آنے کی بات بھی منہ سے نکالتے ڈرتے وہ تو کہیئے کہ خوبی قسمت مفتی ہمیشہ سادگی کو اپنا رنگ قرار دے لیا تھا اور معمولی آدمی سا بھی رہن سہن اپنے لئے پسند کرتے تھے۔ اسی لئے افلاس کی انتہا کو بھی زمانے نے وضعداری پر محمول کیا اور آبرو رہ گئی ۔

آبرو کھو کر کوئی کیوں اہل دولت سے ملے
یاد مولا کا کہ نعمت ہے جو عزت سے ملے

ظاہر ہے ایسے آدمی کی زندگی میں اور داغ کی زندگی میں نمایاں فرق ہوگا۔ اور یہ فرق ہے جس نے زمانے کے رویّہ کو متعین کیا ہے۔ مفتی نے پاس عزت وضعداری کی خاطر بہت دکھ جھیلے۔ خون جگر پیا اور اسی خون جگر نے ان کو غزلوں کے ہلکے پھلکے مضامین میں بھی دلسوزی کا جوہر پیدا کردیا۔ مگر دلسوزی کا بیان بھی ایسے ہلکے پھلکے انداز میں ہوتا ہے کہ سننے والا ظاہری رنگینی میں کھو جائے اور خون جگر کی کیفیت کو محسوس نہ کرسکے ۔

رنگینی غزل میں ہے خون دل مفتی ۔۔۔ میری خزاں ہے اور غزل کی بہار دیکھ

صفی بڑے پرگو اور قادرالکلام شاعر تھے۔ داغ عام طور پر چھوٹی زمینوں اور رواں بحروں میں شعر کہتے تھے۔ ان کے برعکس صفی مشکل سے مشکل سنگلاخ زمینوں میں کئی کئی شعر آسانی سے نکال لیتے تھے۔ مانوس اور اجنبی قافیوں کو بھی ایسا روانی کے ساتھ باندھتے ہیں کہ طبیعت عش عش کرنے لگے۔ مثلاً چھپر کا قافیہ اپنی غزل میں یوں باندھا ہے ؎

وہ چھپر پھاڑ کے دیتا ہے سنتے ہیں وہ کیا دیگا
جب آنکھیں لگ گئیں چھت سے تو کیا امید چھپر سے

بعض اشعار میں خالص حیدرآبادی دفتری ترکیب بڑی روانی سے استعمال کرتے ہیں۔

حکومت کے الفاظ لکھتے ہیں مجھ کو
یہ نالے ہیں یا نیم سرکاریاں ہیں۔

ایسا قادرالکلام شاعر زندگی بھر مفلس و مجبور رہا کہ اپنے دیوان "پراگندہ" کو اپنی زندگی میں نہ چھپوا سکا ؎

یہ پراگندہ ہے جو کچھ بھی غنیمت ہے صفی
میں غریب آدمی دیوان کہاں سے لاؤں۔

یہ بات باعث طمانیت ہے کہ زندگی میں نہ سہی بعد ہی سہی مگر ان کا دیوان چھپ گیا ہے۔ وہ دیوان جس کے بارے میں صفی نے کہا تھا ؎

منتخب وہ شعر ہی تو ہے جو رکھوں اپنے دیواں میں
سراسر جس کے مطلب سے انہیں انکار ہو جائے

□□

یوسف ناظم

دو کہانیاں

(ان کہانیوں کا نقص یہ ہے کہ ان میں پلاٹ آگیا ہے۔ یہ پلاٹ کیسے اور کہاں سے آگیا ہے مصنف اس کے بارے میں لاعلم ہے۔ ویسے دیکھا جائے تو مصنف کئی باتوں سے لاعلم ہے۔ علم کم ہو تو یہ صورت حال یقینی طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کہانیوں میں پلاٹ کے آجانے کی وجہ سے یہ کسی ہندوستانی فلم کے لئے بھی کارآمد نہیں ہیں — ان دو نقائص کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو یہ کہانیاں اچھی خاصی ہیں اور کوشش کرنے پر نثری نظم کی طرح پڑھی جا سکتی ہیں۔ ترکیب مطالعہ یہ ہے کہ ہر جملہ کے بعد ٹھہر جانا چاہئے لیکن زیادہ دیر نہیں۔ لکھنے کو ایک کے نیچے ایک جملہ لکھا جا سکتا تھا لیکن اس میں اسٹیشنری زیادہ خرچ ہوتی۔ پڑھنے کی تیج بدل دیجئے اس میں کچھ خرچ نہیں ہوتا)

عنوان "پہلی کہانی"

مقام واقعہ : لندن۔ برطانیہ عظمیٰ

زمانہ : بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کی پہلی سہ ماہی

لندن کے ایک کنوارے نوجوان کے ذہن میں اچانک یہ خیال آیا کہ اب بہت ہو چکا ایک شادی کر لینی چاہیئے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مذکورہ نوجوان شادی کے رموز و نکات سے واقف نہیں تھا یہ بنے سوچا مسلسل تجربے کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ اکثر ملکوں میں شادی کی کسی کو کوئی جلدی نہیں ہوتی ہی ہے۔ وہاں کے لوگ بالغ اپنے وقت پر ہو جاتے ہیں لیکن خود کے عاقل ہونے کے انتظار میں ٹھہرے رہتے ہیں جبکہ دوسرے ملکوں میں معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اس نوجوان نے اپنی شادی کے معاملے میں کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے اپنے والد کو اپنے عزائم سے مطلع کرنا ضروری سمجھا (حالانکہ یہ کچھ الیا

موجود نہیں تھا)، لیکن دونوں باپ بیٹے ایک ہی گھر میں رہتے تھے اور جب سے اس نوجوان کی والدہ نے وہاں کے عام دستور کے مطابق طلاق لینے کے بعد علیحدگی اختیار کر لی تھی، یہی دونوں ایک دوسرے کے دکھ درد کے شریک تھے، ہمدم و ہمراز تھے، غمخوار و غمگسار تھے (لیکن ان دونوں کو کوئی غم تھا بھی نہیں اور دکھ درد بھی کم ہی ہوتا تھا، کبھی سر میں درد ہو گیا یا ایسی ہی کوئی بات ہو گئی تو ہو گئی ورنہ دونوں اچھے بھلے تھے)۔ جب والد نے اپنے بیٹے کی زبان سے شادی کی بات سنی تو وہ بولے ہاں خوب یاد آیا، میں بھی کافی دنوں سے غیر شادی شدہ ہوں، تم شادی کر لو تو پھر میں بھی اپنا کوئی انتظام کر لوں اس گفتگو کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کی صحت کا جام نوش کیا (جب بھی کسی شخص کو اپنے مقررہ کوٹے سے ایک پیگ زیادہ پینا ہوتا ہے وہ اسے کسی اور کے جام صحت کے نام سے پی لیتا ہے)

مذکورہ نوجوان کو اپنی شادی کی کوئی ایسی عجلت نہیں تھی لیکن صرف اس خیال سے کہ دیکھیں تو سہی کہ شادی ہوتی کیسی ہے اس نے ایک لڑکی سے اپنا عندیہ بیان کیا (اظہار خیال سے پہلے اس نے ایک شام اس لڑکی کے ساتھ گزاری جسے ڈیٹنگ کہا جاتا ہے اور ڈنر کے بعد اپنا مدعا بیان کیا کیونکہ اس قسم کا مدعا عام طور پر ڈنر کے بعد ہی بیان کیا جاتا ہے)۔ یہ لڑکی اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتی تھی اور اس کا بھی ارادہ کچھ ایسا ہی تھا کہ اب ماں کی بجائے کسی مخالف جنس کے فرد کے ساتھ رہنا چاہیے۔ اس نے کہا میں انکار تو نہیں کرتی لیکن شادی کے لیے کورٹ جانے سے پہلے کم از کم آٹھ دن کورٹ شپ میں گزرنے چاہئیں تاکہ ہم دونوں ایک دوسرے کی عادتوں اور خصلتوں سے کما حقہٗ واقف ہو سکیں — ۸ دن ہوتے ہی کتنے ہیں۔ پلک نہیں جھپکی تھی کہ گزر گئے اور کورٹ شپ کے دن تو یوں بھی تیزی سے گزرا کرتے ہیں لیکن ۸ دن کے بعد لڑکی نے کہا۔ کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہو رہا ہے، یوں تم مجھے پسند ہو لیکن کہیں نہ کہیں کوئی بات کھٹک رہی ہے، کچھ دن اور گزرنے دو پھر دیکھا جائے گا۔ نوجوان کو یہ بات کھلی (کھلنی ہی چاہیے تھی) اور اس دوران لڑکی کے گھر آتے جاتے لڑکی کی ماں سے بھی اس کی ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں اور یہ ملاقاتیں ملاقات کا عنوان بدل کر رغبت کی شکل اختیار کر رہی تھیں (یاد رہے کہ لڑکی کی ماں بیوہ تھی) لڑکی کی طرف کی ہچکچاہٹ سمند عشق پر ایک اور تازیانہ ہوئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مہینے کے اندر اندر اس نوجوان کا اس بیوہ سے عقد ہو گیا۔ یہ کوئی ایسا غیر معمولی واقعہ نہیں تھا کیونکہ وہاں کے عام دستور کے مطابق اس قسم کے واقعات ہر دوسرے ہفتے ہونے ہی چاہئیں ورنہ برطانیہ صرف برطانیہ معلوم ہوتا ہے — برطانیہ عظمیٰ نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن جب عقد کے موقعہ پر فریقین کے عزیز و اقارب ایک دوسرے سے

مطمئن ہوگئے تو نوشابہ کے والد کی ملاقات عروس کی بیٹی سے ہوئی اور دونوں کو بیک وقت یہ محسوس ہوا کہ قدرت نے تو انہیں ایک دوسرے کے لئے بنایا ہے۔ اس قسم کے جذبات ہر ملک میں رائج ہیں کہیں کہیں ان جذبات پر کچھ پابندیاں عائد ہیں اور ان کے بارے میں صرف شعر شاعری کی اجازت ہے۔ بعض ملکوں میں ان جذبات کو روبہ عمل تو لایا جاتا ہے لیکن عوام الناس کو روشناس نہیں کرایا جاتا اور چند ملک ایسے ہیں جہاں ان جذبات پر بحث و تمحیص نہیں کی جاتی بلکہ ان کی فوری تقلید کی جاتی ہے — نوشابہ کے والد اور عروس کی دختر نیک اختر نے بھی یہی کیا اور کچھ ہی [illegible] عرصہ بعد وہ سیول میرج سے قانع ہوگئے (اب سیول میرج [illegible] ملک کی ملٹری کے لوگ بھی سیول میرج سے مستفید ہو سکتے ہیں)۔

یہ شادی بھی کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہے لیکن اس شادی کی بنا پر چند سوالات اٹھ کھڑے ہوئے ہیں وہ یہ کہ نوجوان بٹلیر پریشان ہے کہ اس کے والد کی نئی بیگم سے اس کا کیا رشتہ ہے جب کہ نئی بیگم (جو ایک لحاظ سے اس کی ممی ہوئیں)، کی والدہ خود اس کی زوجہ ہیں۔ لڑکے کے والد بھی پریشان ہیں کہ وہ اپنے بیٹے کی بیوی کو اپنی بہو مانیں یا اپنی ساس! یہی کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ لیکن — ایسے معاملات میں غیروں کے خیالات کی پرواہ نہیں کرنی چاہئے۔

دوسری کہانی

مقام واقعہ — نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱، ہندوستان۔

زمانہ — وہی جو پہلی کہانی کا بتایا گیا ہے۔

کے۔ این۔ ملک ایک شریف اور اچھے بھلے آدمی — دلی کے رہنے والے ایک دن صبح سو کر اٹھے اور حسب معمول اپنے مقررہ ملک بوتھ سے دودھ حاصل کرنے گھر سے روانہ ہوئے۔ اپنا روزانہ کا بتانے کہ جب وہ گھر واپس پہنچے تو ان کی بیٹی نے دیکھا کہ دودھ کی بوتل میں ایک تندرست و توانا مینڈک بھی موجود ہے جو شباب کی منزل کو پہنچ چکا ہے (اس کی مسیں بھیگ چکی تھیں دودھ سے نہیں بلکہ عمر کی ہے) اور اس کا دم بوتل کے پیندے کو چھو رہا ہے۔ بیٹی کے بتانے پر والد محترم نے اپنی آنکھیں کھول لیں بتا یہ ہے کہ جب لوگ صبح سویرے دودھ لینے جاتے ہیں تو ان کی آنکھیں ٹھیک سے کھلی نہیں ہوتیں ایسے معاملات اضطراری طور پر طے پاتے ہیں۔ جانا بوجھا راستہ اور کھلی آنکھوں کا سے طے ہوتا ہے مستقر پر جتنے پیسے ادا کرنے ہوتے ہیں وہ جانتے ہی ہیں گن کر رکھ لیتے ہیں اور دودھ کی بوتلیں تھما دی جاتی ہیں وہ آنکھوں سے دیکھے بغیر حاصل کر لی جاتی ہیں! بعض لوگ یہ حق رکھتے ہیں (حالانکہ یہ

نادانی کی جیت) کہ دودھ صرف دودھ ہی فراہم کیا جائے گا جسے شرفی الارض تبدیل نہیں ہونے دیا جائے گا...
جائیں گے تو اس لئے کہتے ہیں۔ ملک کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ دودھ کی بوتل بھی چوری کی مشق کی جاسکتی ہیں۔ (الیشین گیمس کے چوری کے ایسے شاندار اور خوبصورت مقابلے اور مناظر دیکھنے کے بعد بچے اور جوان یا آمادہ بہ چوری ہو گیا ہے) بمبئی اور دوسرے شہروں میں بھی ملک بوتھ سے جھینگر وغیرہ فراہم کئے جاتے ہیں بلکہ بعض صورتوں میں چھپکلیاں بھی پیش کی گئی ہیں کیونکہ جھینگروں اور نومولود چھپکلیوں کے لئے دودھ کی بوتل سے بہتر سوئمنگ پول اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا لیکن معاملہ چونکہ راجدھانی کا ہے اس لئے وہاں دودھ کی ہر بوتل، حوض خاص بن سکتی ہے جس میں مچھلیاں غسل کے لئے اتر سکتی ہیں۔ مشاق اور تجربہ کار چوہے غسل سے فارغ ہونے کے بعد اپنے بلوں میں واپس چلے جاتے ہیں لیکن نومشق اور ناتجربہ کار چوہے بوجہ بلا نوشی بدوران غسل اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دیتے ہیں۔

کے۔ ین۔ ملک کو چاہئے تھا کہ وہ اس واقعہ کو فراموش کر دیتے لیکن ان سے رہا نہیں گیا۔ صبح صبح دھوکر کھانا کسی بھی شریف آدمی کو پسند نہیں آتا۔ وہ دوبارہ ملک بوتھ گئے جو بتانے کے لئے کہ دیکھو میں تمہارے ہاں سے کیا دولت سمیٹ لے گیا تھا اور تمہیں خبر تک نہ ہوئی۔ ملک بوتھ کے عملے کے شوقین لوگوں نے صاحب بوتل سے یہ قیمتی بوتل حاصل کرنے کی بہت کوشش کی۔ ایک نئی بوتل کا لالچ دیا کہ ہم آپ کو ایسی بوتل دیں گے جس میں کوئی چوہا نہ ہوگا لیکن کے۔ ین۔ ملک کسی قیمت پر بھی اس بوتل کی مفارقت پر راضی نہیں ہوئے اور اخبار کے دفتر پہنچ گئے۔ بوتل ساتھ تھی (ایسے موقعوں پر اخبار کا دفتر ہی کام آتا ہے)

پلچل ہوئی۔ ٹیلیفون پیر (جو شاید اس دن کام کر رہا تھا) گفت و شنید ہوئی اور کچھ ہی دیر میں محکمہ رسانی کے دو عہدہ دار اخبار کے دفتر پہنچ گئے۔ پہلے تو ان افسروں نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ دودھ کی بوتل میں چوہا ان کے محکمے نے داخل کیا۔ ان کا شبہ کے ین ملک پر تھا۔ وہ تو کسی بیرونی ہاتھ کی مداخلت کا بھی ذکر کرنے والے تھے لیکن شاید صبح کے اوقات میں ایسا کرنا انہیں ٹھیک نہیں معلوم ہوا اور ازراہ اخلاق انہوں نے صاحب کو نئی بوتل فراہم کرنے کی پیشکش کی۔

ہماری رائے میں دودھ کے معاملے کو زیادہ طول دینا مناسب نہیں ہے۔ صاحب بوتل کو یاد رکھنا چاہئے کہ اس ملک میں عام طور پر یہ دعا دی جاتی ہے کہ دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔ شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس دعا میں اتنا اثر تو پیدا ہوا کہ بات... جیسے تو دودھ ... آئندہ کبھی باری بھی ... □□

انگلستان سے ایک خط

سوانسی - ۱۰ر جون ۱۹۸۲ء

محترم بھائی فاروقی صاحب - السلام علیکم - امید کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ سب
بافیت ہوں گے - میں سوانسی میں ایک ماہ رہنے کے بعد آج پیٹس برگ کے لئے روانہ ہو رہی ہوں -
ب خیریت سے پہنچائے - لندن میں چار پانچ روز رہی - وہاں یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ اردو کی
کی سبب لوگ بہت کوشش کر رہے ہیں - تین چار اردو اخبار نکلتے ہیں اور کئی انجمنیں بھی ہیں
میں اکثر مشاعرے ہوتے ہیں اور ادبی محفلیں جمتی رہتی ہیں - میرے بہنوئی غلام یزدانی ایڈوکیٹ اکثر انجمنوں
بستہ ہیں اور ان کے گھر پر بھی بیٹھکوں کا اہتمام ہوتا رہتا ہے - ایک دن دو تین اصحاب ان سے ملنے
تھے - یزدانی میاں نے میری ملاقات ان سے کروائی - ہم لوگ جو کوچنگ کلاس چلا رہے ہیں ان کا
نظر اور ہماری موجودہ کوششوں کی پوری تفصیل میں نے ان کو سنائی تو ان لوگوں نے ہمارے کام کی
ستائش کی اور مالی مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے - لیکن ابھی تک وہ لوگ آئے نہیں - دیکھیں کتنی مدد
ہیں ـــــ لندن کی زمین دوز گاڑیاں (Tube Train) مجھے بہت پسند آئیں - بالکل وقت پر
یا، ایک منٹ بھی دیر نہیں کرتیں - ان میں بھیڑ بھاڑ بالکل نہیں ہوتی اور نہ ریزرویشن کا کوئی سوال ہے
میں بہت ساری سیٹیں خالی رہتی ہیں - یہ ریل گاڑیاں بہت ہی تیز رفتار ہوتی ہیں - اور بہت کم
میں لندن میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتی ہیں - بس دن تمام وقفہ وقفہ سے چلتی رہتی ہیں
میں مکانوں کی تعمیر کا کام اور شہر کی پلاننگ جب کبھی بھی ہوئی ہوگی (یہ پروفیسر یادی بتا سکیں گے)
ماہرین پلاننگ کے ہاتھوں ہوئی ہوگی - جس محلہ میں چلے جاؤ ایک ہی قسم کے مکانات سلیقے سے
ہیں - فٹ پاتھ کافی چوڑے ہیں - سڑکوں کے کنارے اکثر مقامات پر خوبصورت درخت لگے ہوئے ہیں
باغیچے، پارک اس کی خوشنمائی میں اضافہ کرتے ہیں - کہیں کہیں آبادی کے درمیان جنگل ہیں -
ان کو ہر جگہ محفوظ کیا گیا ہے - اپنے یہاں جنگلات کا محکمہ ہوتے ہوئے بھی لوگ جنگل کاٹ
ڈالتے ہیں - یہاں بالکل ایسا نہیں -

لندن سے واپس سوانسی ہم لوگ انظہر بابا کی کار میں آگئے۔ کوئی ۲۰۰ میل کا فاصلہ ہے۔ سڑک کے دونوں طرف طرح طرح کے درخت ہیں۔ کسی درخت کے پتے لال ہیں، کسی کے نارنجی۔ کوئی پیلے پھولوں سے لدا ہوا ہے تو کوئی جامنی رنگ کے پھولوں سے۔ زمین پر جنگلی پھول آج کل بہت شان دکھا رہے ہیں۔ تو ایسا لگا جیسے کسی مالی نے بڑی محنت سے ان جنگلوں میں منظم طریقے سے پودوں کی کیاریاں بنائی ہیں اور ان کی آبیاری کی ہے۔ سوانسی میں داخل ہوتے ہوئے آپ نے ایک بار اس شہر کی خوبصورتی کی تعریف کی تھی۔ وہ سب یاد آیا۔ واقعی یہ چھوٹا سا شہر بہت ہی خوبصورت ہے۔ برسٹل چینل کے کنارے آباد ہے۔ اس کی بیشتر آبادی اور مکانات سب سمندر سے قریب ہی ہیں۔ یہاں میں ایک ہوٹل میں گئی تھی جو بالکل سمندر کے کنارے ہی ہے۔ وہاں سمندر کے اندر بہت دور تک لکڑی کا ایک مضبوط پل بنایا گیا ہے جو میرے اندازے کے مطابق ۴۰ فٹ سے زیادہ چوڑا ہے۔ لوگ تفریح کے لئے وہاں آتے ہیں۔ یہاں ایک خوبصورت پارک بھی ہے۔ اس ہوٹل میں اور مختلف شاپنگ سنٹرز میں مجھے جو خواتین نظر آئیں وہ سب ایک دوسرے سے مشابہ معلوم ہوئیں۔ رخشاں کا بھی یہی خیال ہے۔ اور وہ سب کی سب انتہائی حسین ہیں۔ لمبی ناکیں، کتابی چہرے، صورتوں پر شرافت اور چال میں وقار پایا جاتا ہے۔ شاید ویلز میں کوئی خاص نسل چلی آرہی ہے اور اس کا تحفظ اب تک یہاں باقی ہے (ڈاکٹر سید عبدالباری بتا سکیں گے کہ یہ حسن اس مقام پر کدھر سے آیا) یہ خواتین پاوڈر شاید لگاتی ہوں لیکن لپ اسٹک کی سرخی یا روغن سے کسی کا چہرہ آلودہ نہیں نظر آیا۔ کتنی عجیب بات ہے۔ البتہ ایک خاص بات یہ نظر آئی کہ بوڑھی خواتین بڑی سج دھج سے باہر نکلتی ہیں۔ کانوں میں بندے، ہاتھوں میں انگوٹھیاں اور گلوں میں قسم قسم کے مالے پہنے ہوئے، لپ اسٹک لگائے ہوئے تفریح کو بھی آتی ہیں اور شاپنگ سنٹرز میں جگہ جگہ بنچوں پر بیٹھی ہوئی گپ شپ لگاتی رہتی ہیں۔ یہ زیورات تو نوجوان خواتین بھی پہنتی ہیں لیکن بوڑھی خواتین کو ان کا کچھ زیادہ ہی خیال رہتا ہے۔ لباس بھی ان بوڑھیوں کا پھولدار، قدرے شوخ رنگ کا ہوتا ہے۔ بڑے اہتمام سے پہنتی ہیں۔ میں نے ان کے بارے میں بہت سوچا، آخر میں اس نتیجہ پر پہنچی کہ بہ خود فریبی ان کے لئے ضروری ہے۔ اسی دھن میں کچھ دن اور جی لیں گی۔

سوانسی سے ایک دن بذریعہ ٹرین میں لندن گئی تھی۔ بہن مہر النساء اور بھتیجی ڈاکٹر عابدہ نے بلایا تھا۔ ریلوے اسٹیشن پورا کا پورا کانچ کی چھت سے ڈھکا ہوا ہے۔ اسٹیشن پر بھیڑ بالکل نہیں تھی۔ یہاں ریزرویشن کرانے کی مصیبت ہی نہیں۔ ٹرین بالکل وقت پر آئی۔ ہم ہندوستانی ایک منٹ دیر سے اسٹیشن پہنچے تھے۔ بس ہم آئے اور سامنے سے ٹرین نکل گئی۔ میں نے دل ہی دل میں ٹرینوں کی اس پابندیٔ وقت کی

بہت تعریف کی اور ساتھ ہی اپنی [illegible] لئے ہم نے بلاک کوک سے [illegible]
[illegible] کا وقت پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ سوا دس بجے آئے گی اور [illegible] ٹرمینل پر ٹھہرے گی۔ یہی ٹرین
لندن جائے گی۔ یہاں کی صورت تمام باتوں کا رعب مجھ پر تھا میں نے اس کی بات کو بالکل صحیح سمجھا۔
لیکن گاڑی سوا گیارہ بجے آنے والی تھی اور [illegible] ٹرمینل پر ٹھہرنے والی تھی۔ لڑکی کی اس غلط اور
غیر ذمہ دارانہ رہبری کا [illegible] ان چھوٹی باتوں میں یہ مقام اب ہندوستان کی ہمسری کر سکتا ہے!
شاپنگ سنٹرز میں [illegible] دکانیں (Mother Care) کے نام سے ہیں۔ یہاں صرف [illegible] ساری
چیزیں ملتی ہیں جن کا تعلق ماؤں اور ان کے بچوں سے ہے۔ دوسری کوئی چیز نہیں ملتی۔ یہاں دن تمام
عورتوں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کا ہجوم رہتا ہے۔ امریکہ میں بھی شاید ایسی دکانیں ہوں لیکن میں نے نہیں
دیکھیں۔ یہاں کی زندگی بڑی پرسکون معلوم ہوئی۔ امریکہ کی جیسی بھاگ دوڑ نظر نہیں آئی۔ ہو سکتا ہے
کہ [illegible] وغیرہ میں ایسا ہی ہو لیکن میں نے تو گرد و نواح کے مقامات دیکھے ہیں۔

اور تو سب خیریت ہے۔ میری صحت اللہ کے فضل سے اچھی ہے۔ ڈاکٹر سید عبد الباری صاحب
[illegible] صاحب رشید قریشی صاحب سب کو سلام کہئے گا۔ قمر میاں ملیں تو پوچھنا کہ میٹرک میں ان کی
کلاس کے کتنے بچے پاس ہوئے اور موجودہ کلاسیں کیسی چل رہی ہیں؟

آپ جواب وہیں تو پیٹس برگ کے پتہ پر ہی دیں۔ پتہ میں نے لفافہ پر لکھ دیا ہے۔ پیٹس برگ
میں پندرہ دن رہنے کے بعد انشاء اللہ ہوسٹن جاؤں گی۔ دیکھیں وہاں کتنے روز رہنا ہوتا ہے۔
مسز فاروقی، شاہ اور شاہد سے دعائیں کہنا۔ خیر طلب۔ آپ کی بہن۔

عائشہ بیگم

ایک سوال

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے — ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال — مرد بیکار و زن تہی آغوش

(اقبالؒ)

طفیل سیماب کھام گانوی

خلاء اور بھوک

اس نے اپنی بھوکی ماں کے پیٹ سے فٹ پاتھ پر جنم لیا۔ اور کسی کیڑے کی طرح رینگتا رہا۔ جب ہوش سنبھالا تو سُنا کہ دنیا گول ہے۔ وہ مسکرا دیا۔ پھر کسی نے بتایا کہ انسان چاند پر پہونچ چکا ہے۔ وہ پھر مسکرا اُٹھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا گیا۔ ایک دن اُسے علم ہوا کہ اسکائی لیب تیزی سے زمین کی طرف آرہا ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا لئے جیسے دعا مانگ رہا ہو کہ اے مالک اسکائی لیب آسمانی آفت بن کر ٹوٹے اور دنیا کا ایک ایک غریب اس میں پس کر رہ جائے تاکہ غربت کا خاتمہ ہو۔ پھر کسی سے سُنا کہ دنیا میں اس قدر ایٹمی اسلحہ تیار ہو چکا ہے کہ پلک جھپکتے دنیا راکھ کا ڈھیر بن جائے۔ وہ دوبارہ آسمان کی طرف دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو دیکھ تیری مخلوق نے تیرا کام کتنا آسان کر دیا۔ اب تجھے قیامت ڈھانے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ کسی دن سڑک کے کنارے پڑے کاغذ کے ٹکڑے کو اُٹھا کر دیکھا۔ لکھا تھا "خلائی ہیرو اپنے خلائی سفر سے کامیاب لوٹ رہا ہے"۔ اس کے سوکھے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر یکایک وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ چند لمحوں بعد خاموش ہو کر خلاء میں گھورتا رہا۔ پھر اس روٹی کی طرف متوجہ ہو گیا جو کاغذ میں لپٹی فٹ پاتھ پر اس کے سامنے پڑی تھی۔ روٹی کو ہاتھوں میں تھاما اور اس کی گولائی پر انگلی پھیرنے لگا۔ ساتھ ہی راستہ چلتے لوگوں، اونچی اونچی عمارتوں اور چمکتی کاروں کو دیکھتا رہا۔ جیسے کہہ رہا ہو تم کہتے ہو دنیا گول ہے؟ تم نے دنیا کی گولائی ناپ لی؟ چاند کی سرزمین پر جھنڈے گاڑ دیئے؛ تمہاری خلائی پرواز قابل قدر اور ناقابل فراموش لمحہ ہے؟ تم اتنی طاقت

(بقیہ صفحہ ۵۹ پر)

جلال پورہ، کھام گاؤں ۴۴۴۳۰۳، ضلع بلڈانہ، مہاراشٹرا

ڈاکٹر غلام کبریا خان شبلی

"لمحوں کی حرکت" پر ایک نظر

"لمحوں کی حرکت" کے پیش لفظ میں سیماب کے فن کے متعلق ڈاکٹر منشا لکھتے ہیں۔
موضوعات افسانہ حیات انسانی اور فطرت انسانی کی گوناگوں کیفیتوں کے حامل ہیں۔"
سار دیوسف خاں صاحب، تحریر کرتے ہیں۔ "(جو) لکھنے والے کا دل (ہے وہ) ہومینی
قدروں کی تلاش میں ہے"۔ سلمیٰ صدیقی رقمطراز ہیں "افسانہ نگار نے کم سے کم وقت اور
الفاظ میں کائنات کے درد کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں وہ کامیاب بھی
نجم رومانی لکھتے ہیں " زندگی سے نبرد آزما ہونے کا یہ فن ان کے متعدد افسانوں میں زندہ اور
تا ہے"۔ خان محمد اظہر حسین تحریر فرماتے ہیں" سیماب نے سماج اور زندگی کے ہر پہلو کو اجاگر
کامیاب کوشش کی ہے"۔ تعارف و تبصرہ کے تحت ڈاکٹر ایم آئی ساجد رقمطراز ہیں" ان
نشتر کی چبھن ہے تو مرہم کا اثر بھی ہے"۔ انسان کے متعلق خود مصنف کا یہ نظریہ ہے کہ "انسان
ملے سے بکھرتا ہے ۔ زندگی کی چکی میں پستا ہے تب کہیں تلخ و تند تجربات کے پانی میں
پختہ اور مکمل انسان وجود میں آتا ہے"۔

یہی حیات و فطرت انسانی کی گوناگوں کیفیات، ہومینی کی عمدہ قدروں کی تلاش و
دکائنات اور مسائل زندگی سے نبرد آزمائی کا زندہ و بیدار حوصلہ، یہی سماج اور
ہر پہلو کو اجاگر کرنے کی خواہش اور نشتروں کی چبھن اور یہی ٹوٹنا بکھرنا اور گندہ جانا،
از ہائے درون سینہ ہیں۔ جنہیں وہ برسر منبر کہنا مناسب نہیں سمجھتے کیوں کہ یہ قیمتی راز
کے لئے دار کے متقاضی ہیں۔ غالب صرف یہ کہہ کر رہ گئے ؎

جونیر کالج ۔ کھام گاؤں ۔ ضلع بلڈانہ (مہاراشٹرا)

آں راز کہ در سینہ نہان است نہ وعظ است
بر دار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

نظیری نے اپنی اسرار کے واشگاف اعلان کے لئے اپنے جنگل کی پھانس لکڑی کو جس سے منبر نہ بن سکا دار بنا لیا ہے

نیست در خشک و تر بیشہ من کوتاہے
چوب ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم ۔

طفیل سیماب نے جرأت پنہاں کی باتیں سرِ راہ کہہ کر نظیری کی تقلید کی ہے ۔

قصہ طوطا مینا اور داستانِ امیر حمزہ کے دن لد گئے ۔ جب زمانہ ٹہر ٹہر کر، رک رک کر گذرا کرتا تھا ۔ آج مصنوعی سیاروں کا دور ہے ۔ زندگی روشنی کی رفتار کے حصول میں سرگرم عمل ہے ۔ فرصت کی کمی نے طویل اور غیر حقیقی قصوں کی کوکھ سے زندگی کے نسبتاً قریب تر ناولوں کو جنم دیا ۔ فرصت مطالعہ اور کم ہوئی تو ناول سکڑ کر افسانے بنے ۔ آج کے مشینی دور میں فرصت کے لمحات تقریباً مفقود ہو گئے تو افسانے سمٹ سمٹا کر منی افسانے بن گئے ۔ شعری ادب میں "رباعی" اور افسانوی ادب میں "منی افسانے" کہنہ مشق تجربات کی گو ناگوئی، زبان و بیان پر قدرت چاہتے ہیں ۔ اپنے تجربے کے بھرپور تاثر کو کم سے کم لفظوں میں موثر انداز میں بیان کرنا کارِ طفلاں نہیں ہے ۔ یہ رنگ سنگ سے لہو نچوڑنا لینے ہے ۔ یہ مقام گو اس وقت حاصل ہوتا ہے جب عمر طبعی شیب اور فن شباب کی منزل میں ہوں ۔ سیماب عمر کے اعتبار سے نہ سہی لیکن تجربات کے تنوع کے اعتبار سے پختہ کار ہیں ۔ برائے اس جواں سال و جواں فکر فنکار طفیل سیماب نے اس کم عمری میں سماج کے رستے ہوئے ناسوروں کی نہ صرف شناخت کی بلکہ نشاندہی کی جو جرأت کی ہے وہ سماج پر ان کی گہری ناقدانہ نظر اور معاملانہ بلند ہمتی کی دلیل ہے ۔ جس عمر تک لوگ گدلے پانی میں قدم دھرتے ڈرتے اور گھبراتے ہیں اس عمر میں سیماب نے نہ صرف یہ کہ منجدھار میں چھلانگ لگائی بلکہ غوطہ لگا کر تہہ تک کی خبر لے آئے ۔ موتیوں کے ساتھ ساتھ چند سنگ ریزوں کا آ جانا لابدی ہے جیسا کہ ڈاکٹر منشا نے پیش لفظ میں لکھا ہے " البتہ کہیں کہیں رومانیت کے رنگ میں جنسیت کی تہہ داری غالب نظر آتی ہے ۔ تاہم اس حد تک بھی نہیں کہ عکس بے چارے کے اعصاب پر عورت سے سوار ؟ کہا جائے ۔ یہ بات بھی وہاں پیدا ہوئی ہے جہاں سیماب کی سیمابی فطرت نے ٹہر ٹہر کر تجربہ کی دلچسپی اور

[illegible] کے ساتھ جہاں پختگی کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ ناگزیر نتیجہ ہے کچی عمر کے کچے پکے تجربات کا۔ مگر اس ادھ کچے پن میں بھی میٹھا مزا ہے۔ ایک سوندھی سوندھی خوشبو ہے۔ یہ بیتر شکل کی نشاندہی کرتی ہے جو مصنف کو خود اعتراف ہے کہ ٹوٹنے بکھرنے اور پراگندہ جانے کے مرحلوں سے گزر جانے کے باوجود بھی وہ اپنے آپ کو ادھورا پاتا ہے۔ یہ شاید اس لئے کہ ابھی چند آنچوں کی کسر رہ گئی ہے۔ ابھی زندگی کے گلشن میں اسے اور تپنا ہے اور نکھر کر سونا کر اپنے خالص ہونے کا ثبوت دینا ہے۔

۸۰ صفحات کے اس مختصر سے مجموعے میں ۲۶ افسانچے ہیں جن میں "اور فساد نہ ہوا"، "کفن چور"، "اعتماد"، "دائرہ زندگی"، "موت کا جشن"، "عنوان کیا دوں"، اور "جعلی نوٹ کا انتقام" نمائندہ افسانے کہے جا سکتے ہیں۔ ان افسانوں میں فن کی مضراب جب تجربے کے تاروں کو چھیڑتی ہے تو قاری کا دل اور جذبات اسی آہنگ کو جذب کر کے مرتعش ہو جاتے ہیں۔

"الناس باللباس" لوگوں پر ہی نہیں کتاب پر بھی صادق آتا ہے۔ مجموعی حسن کے اعتبار سے بھی کتاب بہت خوبصورت ہے۔ گرد پوش پر شکیل اعجاز کا سادہ سا آرٹ کتاب کے نام سے مناسبت رکھتا ہے۔ کتابت علیم بن عبدالرحمان نے کی ہے۔ کتابت کیا کی ہے فن کتابت کا حق ادا کر دیا ہے۔

کتاب کے آخری صفحے پر شناخت نامہ ہے جس سے پتہ چلا کہ مصنف ندین پروڈکشنز کی زیر تکمیل فلم "آخری رات" کے مکالمہ نگار ہیں۔ کاش یہ ہونہار افسانہ نگار فلموں کی وادی پر خار میں قدم رکھنے سے مجتنب ہو جائے۔ ◻◻

(بقیہ صـ[illegible] سے آگے)

ذریعہ دنیا فتح کرنا چاہتے ہو؟ پھر وہ زور زور سے بڑبڑانے لگا۔

لیکن تم اس روٹی کی گولائی اور اس کی اہمیت سے ناواقف ہو..... صرف میں جانتا ہوں اس گولائی کو .... میں سمجھتا ہوں اس کی اہمیت کو... کیوں کہ بچپن سے آج تک میں اس گولائی میں الجھا رہا۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ تمہارے سائنس سے بھی زیادہ طاقتور.... پھر روٹی کو چومتے ہوئے کہنے لگا

یہی میری دھرتی ہے..... اور یہی ہے میرا چاند...... لیکن جہاں پہ یہ ختم ہوتی ہے وہاں خلاو نہیں.... بلکہ ہے صرف بھوک۔ ◻◻

تبصرہ

شاعر : اسحٰق ملک
تخلیق : نوشگفتہ
صفحات : ۱۱۸ ، قیمت دس روپے

ناشر : انجمن تعمیر ادب۔ سلطان پورہ۔ حیدرآباد (اے پی)
سن اشاعت ۱۹۸۴ء

ناشر کے علاوہ کتاب کی تیاری میں شامل سبھی افراد اور اداروں کے نام بھی کتاب میں دیئے گئے ہیں۔

یہ کتاب آندھرا پردیش اردو اکیڈمی، محکمہ تعلیمات، حکومت آندھرا پردیش، فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی اور ادبی ٹرسٹ حیدرآباد کی اعانت سے شائع کی گئی ہے۔ کاغذ، طباعت اور کتابت اوسط سے اچھے ہیں۔

جب بھی سخن فہمی کا موقعہ آتا ہے تو مجھے شعرالعجم پھر سے پڑھنے کا خیال آتا ہے۔ اسحٰق ملک کی کتاب پر ریویو کرتے ہوئے بھی میں نے اس کا موقع نکال ہی لیا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اسحٰق ملک بھی فرصت میں ایک بار اس میں سے شعر کی ماہیت و حقیقت کے بارے میں پڑھ لیں گے۔

شبلی نعمانی ہمارے ادب کی قدآور شخصیت تھے۔ ان کی تصنیف شعرالعجم کا اردو کے کلاسیک میں اہم مقام ہے۔ کتاب کے آغاز میں شبلی شعر کا مفہوم سمجھاتے ہیں۔ بعض یوروپین محققوں کے نظریۂ شعر پر بحث کرتے ہیں اور پھر اپنے ہم عصر عالم عبدالحمید فراہی کی کتاب جمہرۃ البلاغہ (عبدالحمید فراہی کو اب کم ہی لوگ یاد کرتے ہیں) سے شعر کی حقیقت بیان کرتے ہیں۔ "شاعر کے لغوی معنی شعور کے ہیں۔ شعور اصل میں احساس (فیلنگ) کو کہتے ہیں۔ یعنی شاعر وہ شخص ہے جس کا احساس قوی ہو۔ شاعر کی طبیعت پر رنج یا خوشی یا استعجاب کے طاری ہونے کے وقت ایک خاص اثر پڑتا ہے۔ یہ اثر موزوں الفاظ کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے۔ اسی کا نام شاعری ہے"۔ شبلی اس کی تشریح کرتے ہیں "شیر کی گونج، طاوس کی جھنکار، کوئل کی کوک، بلبل کا ترانہ سب جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ یہی جذبہ حرکات میں ظاہر ہوتا ہے اور طاؤس ناچنے لگتا ہے۔ سانپ جھومتا اور لہراتا ہے۔ انسان پر جب جذبہ طاری ہوتا ہے تو نطق و نغمہ کی شکل اختیار

جگہ لیتے ہیں توبعض الفاظ زبان سے نکلتے ہیں۔ انسان گنگنانے لگتا ہے ۔ جذبہ تیز ہونے پر انسان ناچنے لگتا ہے ۔ یہ سب باتیں جمع ہو جائیں تو یہی اصل شعر ہے ۔ یعنی شعر، الفاظ، وزن، نغمہ اور رقص کے مجموعہ کا نام ہے "

شبلی اپنی تصنیف شعر العجم کے چوتھے حصے میں بڑی تفصیل وضاحت اور مثالوں کے ساتھ شعر کی حقیقت اور عناصر کے بارے میں لکھتے ہیں خود ان کا خیال تھا کہ یہی حصہ ساری کتاب کی جان اور اس کی روح ہے ۔

آج بھی کم و بیش شعر کی یہی تعریف قائم ہے البتہ کچھ نئی اصطلاحوں جیسے اظہار (EXPRESSION) اور ترسیل (COMMUNICATION) وغیرہ سے اس تعریف کو واضح کیا جاتا ہے ۔

زیر نظر تصنیف نوشگفتہ میں شامل ایک تعارفی مضمون " شاعر + مزدور = اسحاق " میں رفیق جعفر (بمبئی)، رقمطراز ہیں " زبان، بیان، عروض و قواعد کے نکات پر غور و فکر کرنے اور اسے اہمیت دینے والوں کے نزدیک اسحق ملک کا کلام زیادہ پر اثر نظر آئے گا لیکن لفظوں کے انتخاب اور بات کہنے کے انداز پر توجہ دیں تو پتہ چلے گا کہ شاعر غیر ضروری لفاظی اور حشو بیان کا قائل نہیں بلکہ اپنے طور پر بات کہنا چاہتا ہے ۔"

بات تو ٹھیک ہے ۔ لیکن بات تو اس وقت بنتی ہے جب بات سننے والا بھی یہ سوچنے لگے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا ۔ اور عموماً اسی معیار پر پرکھنے والے کو جانچا جاتا ہے ۔ اسحق ملک کو ذاتی طور پر نہیں بلکہ اسحق ملک شاعر کو بھی اسی معیار پر جانچا جائے گا ۔

رفیق جعفر کے مطابق اسحق ملک ۲۵ سال سے شاعری کرتے آئے ہیں۔ کئی مقامی انعام حاصل کر چکے ہیں اور ان کا کلام ہند و پاک کے ادبی و نیم ادبی رسالوں میں چھپتا رہا ہے وہ مزدور شاعر بھی (احسان دانش کی روشن مثال ہمارے سامنے ہے)

کتاب کی ابتداء میں شاذ تمکنت، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، خواجہ عبدالغفور (اب مرحوم) اور رفیق جعفر نے شاعر کا تعارف کرایا ہے ۔ اور خود شاعر نے اپنے بارے میں ضروری تفصیلات (قارئین کے لئے ضروری ہے) دی ہے " نوشگفتہ " کو اور اس کے بارے میں پڑھ کر شاذ تمکنت کے الفاظ دہرائے جا سکتے ہیں ۔

" اسحق ملک کا یہ شعری مجموعہ جس میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی ایک عہد کی

کا امکان ہے۔ شاعر کا یہ عہد و پیماں اپنے قارئین سے ہے۔ جنہیں خوب سے خوب تر کی تلاش رہتی ہے۔ عہد و پیماں سے ایفائے عہد کی منزل سخت دشوار گذار راستوں کا سفر ہے۔ اسحٰق ملک کی لگن، خلوص باطنی اور انہماک سے توقع ہے کہ وہ یہ سفر تیزی کے ساتھ مگر خوش گامی کو پیش نظر رکھتے ہوئے طے کریں گے ؎

مخدوم محی الدین، احمد ندیم قاسمی، شہریار کا دس جی، اور پروفیسر سید محمد پر نظمیں لکھ کر اسحٰق ملک نے اپنی پرخلوص طبیعت کا ثبوت دیا ہے۔ اردو کے بارے میں پوچھا گیا سوال جرأت مندانہ ہے سرورق پر شاعر کی فوٹو اور پیچھے خاربانہ تیکوں کی کامنطقہ کتاب میں شاعر نے ۹۰ افراد سے اظہار تشکر کیا ہے۔

چنانچہ اشعار پیش ہیں ؎

وابستہ جن کے ہاتھ تھی ہر حسرت نظر
وہ کم نظر نظر نہ ملائیں تو کیا کریں

تاروں نے گو بچھا دی چمک سارے ملک
کچھ رات تھی تو نہ تنہا انتظار تھا

اہل گلشن فضا نظر رکھنا ؎ ہم نہ محو بہار ہو جائیں۔

فاصلے آپ چل کے آتے ہیں
چاہیئے صرف طاقت پرواز

دیکھ کر میرا عزم سفر ؎ راستے ہم سفر ہو گئے۔

سر سے گذرے ہیں کتنے ہی طوفان غم
ہم کو ہر حال میں مسکرانا پڑا

(ا۔ و۔ شیٖ)

عربی کے سبق

اَبوابُ الفعل

افعال ثلاثی (سہ حرفی افعال) کے فعل ماضی معروف اور فعل مضارع معروف میں مادہ کے درمیانی حرف کی حرکت مختلف مادّوں میں مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً۔

فَتَحَ ، سَمِعَ ، كَرُمَ — يَفْتَحُ ، يَضْرِبُ ، يَنْصُرُ

افعال ثلاثی میں ماضی و مضارع میں مادّہ کے درمیانی حرف میں جو تبدیلی ہوتی ہے اس کے لحاظ سے عربی میں (۶) اوزان مقرر ہیں ان کو ابواب الفعل کہا جاتا ہے اور وہ یہ ہیں۔

ماضی	مضارع	ماضی	مضارع	ماضی	مضارع
فَتَحَ	يَفْتَحُ	ضَرَبَ	يَضْرِبُ	نَصَرَ	يَنْصُرُ
سَمِعَ	يَسْمَعُ	حَسِبَ	يَحْسِبُ	كَرُمَ	يَكْرُمُ

(یہ تبدیلی صرف معروف (Active) افعال کی حد تک محدود ہے۔ مجہول (Passive) افعال میں مادّہ کے درمیانی حرف کی حرکت بھی مقرر ہے یعنی ماضی میں زیر (ـِ) اور مضارع میں زبر (ـَ) مثلاً فُعِلَ يُفْعَلُ)

مثالیں

۱- فَتَحَ يَفْتَحُ

ذَهَبَ يَذْهَبُ (جانا) جَمَعَ يَجْمَعُ (جمع ہونا) ذَبَحَ يَذْبَحُ (ذبح کرنا)
قَرَأَ يَقْرَأُ (پڑھنا) مَنَعَ يَمْنَعُ (منع کرنا) قَطَعَ يَقْطَعُ (کاٹنا)
دَفَعَ يَدْفَعُ (باز رکھنا) رَكَعَ يَرْكَعُ (رکوع کرنا) نَهَضَ يَنْهَضُ (اٹھنا)
خَافَ يَخَافُ (ڈرنا) سَأَلَ يَسْأَلُ (سوال کرنا) لَجَأَ يَلْجَأُ (پناہ لینا)
وَدَعَ يَدَعُ (اجازت دینا) وَقَعَ يَقَعُ (واقع ہونا - [illegible]) لَدَغَ يَلْدَغُ (کاٹنا)
طَبَخَ يَطْبَخُ (پکانا) صَنَعَ يَصْنَعُ (بنانا - تیار کرنا) جَهَدَ يَجْهَدُ (مشقت کرنا)
فَرَغَ يَفْرَغُ (کام پورا کرنا) مَدَحَ يَمْدَحُ (تعریف کرنا) سَبَحَ يَسْبَحُ (تیرنا)

٢- ضَرَبَ يَضْرِبُ

جَلَسَ يَجْلِسُ (بیٹھنا) رَجَعَ يَرْجِعُ (واپس ہونا) نَزَلَ يَنْزِلُ (اترنا)

سَالَ يَسِيْلُ (بہنا) بَاعَ يَبِيْعُ (بیچنا۔ تجارت کرنا) دَانَ يَدِيْنُ (ادھار دینا)

بَكٰى يَبْكِيْ (رونا) مَشٰى يَمْشِيْ (چلنا) رَمٰى يَرْمِيْ (پھینکنا)

قَضٰى يَقْضِيْ (فیصلہ کرنا) جَرٰى يَجْرِيْ (بہنا۔ بھاگنا) رَوٰى يَرْوِيْ (بیان کرنا)

آمَنَ يُؤْمِنُ (ایمان لانا) وَلَدَ يَلِدُ (پیدا کرنا) وَجَدَ يَجِدُ (پانا)

٣- نَصَرَ يَنْصُرُ

خَرَجَ يَخْرُجُ (باہر آنا) دَخَلَ يَدْخُلُ (داخل ہونا) ذَكَرَ يَذْكُرُ (بیان کرنا)

كَتَبَ يَكْتُبُ (لکھنا) اَخَذَ يَاْخُذُ (لینا) كَتَمَ يَكْتُمُ (چھپانا)

قَالَ يَقُوْلُ (کہنا) حَدَثَ يَحْدُثُ (واقع ہونا) شَغَلَ يَشْغُلُ (مشغول ہونا)

ظَنَّ يَظُنُّ (خیال کرنا) عَدَّ يَعُدُّ (گنتی کرنا) عَضَّ يَعَضُّ (کاٹنا)

قَعَدَ يَقْعُدُ (بیٹھنا) قَامَ يَقُوْمُ (کھڑا ہونا) مَاتَ يَمُوْتُ (مرنا)

٤- سَمِعَ يَسْمَعُ

لَعِبَ يَلْعَبُ (کھیلنا) شَرِبَ يَشْرَبُ (پینا) لَحِقَ يَلْحَقُ (جا ملنا)

حَفِظَ يَحْفَظُ (یاد کرنا۔ حفاظت کرنا) فَرِحَ يَفْرَحُ (خوش ہونا) اَذِنَ يَاْذَنُ (اجازت دینا)

بَقِيَ يَبْقٰى (باقی رہنا۔ ٹھہرنا) خَشِيَ يَخْشٰى (ڈرنا) قَوِيَ يَقْوٰى (طاقتور ہونا)

عَمِلَ يَعْمَلُ (کام کرنا) حَمِدَ يَحْمَدُ (تعریف کرنا) رَكِبَ يَرْكَبُ (سواری کرنا)

فَهِمَ يَفْهَمُ (سمجھنا) لَبِسَ يَلْبَسُ (کپڑے پہننا) ضَحِكَ يَضْحَكُ (ہنسنا)

٥- حَسِبَ يَحْسِبُ

نَعِمَ يَنْعِمُ (عیش کرنا) حَرِقَ يَحْرِقُ (جلنا) صَلِبَ يَصْلِبُ (سخت ہونا)

شَرِكَ يَشْرِكُ (شریک بننا) عَجِزَ يَعْجِزُ (کام کے ناقابل ہونا) وَثِقَ يَثِقُ (بھروسہ کرنا)

٦- كَرُمَ يَكْرُمُ

قَرُبَ يَقْرُبُ (قریب ہونا) بَعُدَ يَبْعُدُ (دور ہونا) ثَقُلَ يَثْقُلُ (وزنی ہونا)

كَبُرَ يَكْبُرُ (بڑا ہونا) قَصُرَ يَقْصُرُ (کوتاہ ہونا) حَسُنَ يَحْسُنُ (خوبصورت ہونا)

شَرُفَ يَشْرُفُ (بزرگ ہونا) كَثُرَ يَكْثُرُ (تعداد میں زیادہ ہونا) يَسُرَ يَيْسُرُ (آسان ہونا)

کل ہند حلقہ پیام انسانیت

۲۸، ۲۹، اور ۳۰ دسمبر ۱۹۷۴ء کو الٰہ آباد سے ایک نئے تجربہ کا آغاز ہوا۔ ملک کی دن بدن بگڑتی صورت حال اور بیان انسانی اور اخلاقی قدروں کی پامالی سے متاثر ہو کر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء) نے بلا تفریق مذہب و ملت ہر طبقہ سے رابطہ اور خطاب کی مہم شروع فرمائی۔ اس مبارک اور بر وقت کام کی ابتداء الٰہ آباد سے کی گئی جس کی وجہ مولانا نے اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کی ہے:-

"الٰہ آباد سے ہم نے کام کو شروع کیا ہے کیونکہ اس کا نام ہی "الٰہ آباد" یعنی خدا کی نگری ہے۔ یہیں سے خدا پرستی کی تحریک اور انسانیت کے احترام کی دعوت شروع ہونا چاہیے خدا کے بندوں کی عزت، انسانیت کو نئی زندگی دینے اور انسانوں کو انسانیت و اخلاق کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کا کام اسی شہر سے ہونا چاہیے تھا جو خدا کے نام سے آباد ہے۔"

مولانا کی اس دعوت و فکر کو ملک کی ایک ہمہ گیر انسانی اور اخلاقی تحریک اور مہم (Campaign) کی شکل دینے کے لئے لکھنؤ میں "کل ہند حلقہ پیام انسانیت" کا قیام عمل میں آیا ہے۔ یہ کوئی نئی جماعت یا سیاسی پارٹی نہیں بلکہ یہ ایک نئی اور نامانوس صدا لگانے والوں کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم ہے۔

اگر آپ اس تحریک و دعوت کو ملک کے لئے ضروری سمجھتے ہیں تو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی قیادت میں اس نئے کاروان حق اور قافلہ انسانیت کے ساتھ شامل ہو جائیے۔!

حلقہ پیام انسانیت

پروگرام ۱۔ خالص انسانی رشتے اور ہندوستانی ناطے سے ملک میں عام محبت و بھائی چارہ کی فضا قائم کرنے اور اخلاقی گراوٹ کا ماحول ختم کرنے کے لئے عوامی رابطہ کی مہم، جلسوں اور سیمینار کا انعقاد، صحیح اخلاقی لٹریچر کی مختلف زبانوں میں اشاعت۔

خدمت خلق کے کاموں ... [illegible]

حقیقی لطف اور صحیح مقصد سے روشناس کرانا ۔

۳ - معاشرہ سے رشوت، اقربا پروری، سفاکی، ذخیرہ اندوزی، منافع خوری، نشہ آور اشیاء کے استعمال کو دور کرنا اور بے حیائی و عریانی کے خلاف بھرپور جدوجہد ۔

۴ - غلط اور فضول رسم و رواج کے انسداد کی کوشش ۔

۵ - ملک کے مظلوم، پسماندہ، غریب اور پریشان حال افراد کی بلا امتیاز مذہب و ملت ہر ممکن امداد ۔

۶ - نوجوان نسل خاص طور سے طلباء میں سنجیدگی، علمی لیاقت اور سماج کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا تاکہ ہمارے ملک کو ان خطرات سے بچایا جا سکے جو نئی نسل کی بے راہ روی سے پیدا ہو رہے ہیں ۔

۷ - اپنے حلقۂ اثر، محلہ، بستی، شہر اور پورے ملک میں برادرانہ ماحول پیدا کرنے میں ہر ممکن کوشش ہو ۔

طریقۂ کار

۱ - حلف کا فارم پر کرنا اور اپنی زندگی میں عملی تبدیلی کی کوشش ۔

۲ - بلا تفریق مذہب و ملت انسانیت کے دکھ درد میں شرکت مثلاً کوئی حادثہ پیش آئے خواہ اس کا تعلق کسی طبقہ سے ہو تو حلقۂ پیام انسانیت کے ہمدردوں کا پہلا فرض ہوگا کہ وہ اس موقع پر بے لوث خدمات پیش کریں اور اس مصیبت کو دور کرنے میں عملی حصہ لیں ۔

۳ - شادی بیاہ کے ان ظالمانہ رسوم کا انسداد اور اس کے خلاف ذہن پیدا کرنے کی کوشش جنہوں نے زندگی کو تلخ اور خوشی کو عذاب و مصیبت بنا دیا ہے ۔

۴ - ہر کارکن ہفتہ میں کچھ وقت انفرادی ملاقاتوں کے ذریعہ اپنے ماحول میں انسانی محبت و ہمدردی کی فضا پیدا کرنے کی تبلیغ و کوشش میں صرف کرے گا ۔

۵ - پیام انسانیت کے نام سے ایک ہندی اور اردو اخبار کا اجراء ۔

۶ - ہر شہر اور ضلع میں ایک سنٹر کا قیام جہاں تعمیری لٹریچر اور اخبار کی اشاعت کا انتظام، جلسے، نشستیں اور سیمینار منعقد کئے جا سکیں ۔

۷ - حلقہ کی ہفتہ وار یا پندرہ روزہ نشست جس میں رفقائے پیام انسانیت اپنی دعوت حکیمانہ اسلوب و طریقہ کار کی مشق اور اپنے کاموں کی روداد پیش کریں گے ۔ اس نشست میں کوئی مقالہ یا مضمون پڑھا جائے گا جو حلقہ کے اغراض و مقاصد میں ... اور رفقاء کی تربیت کیلئے

انسانیت ہی سے انسان انسان ہے ورنہ صرف حیوان ناطق

حلف نامہ

میں جس بالاتر ہستی کو اپنا مالک و خالق سمجھتا ہوں اس کی قسم کھا کر یہ وعدہ کرتا ہوں کہ:

(۱) اگر میں طالب علم ہوں تو میرا مقصد علمی ترقی، سماجی بہبود، انسانیت کی خدمت اور ایک اچھا شہری بننا ہوگا جو مستقبل میں اس ملک کی قیادت سنبھالنے کا اہل ہو۔ میں تشدد اور تخریبی کاموں سے پرہیز کر کے اپنی عمر، جوانی، علم اور صلاحیت کو تعمیری کاموں کے لئے صرف کروں گا۔

۲۔ اگر میں ملازم ہوں تو میرا اصول محنت، دیانتداری اور عوام کی خدمت ہوگا اور میں رشوت، اپنے کام میں کاہلی اور بددیانتی سے پرہیز کروں گا۔

۳۔ اگر میں تاجر ہوں تو میں ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، ناجائز منافع خوری اور عوام کے معاشی استحصال سے پرہیز کروں گا۔

۴۔ اگر میں معلم (ٹیچر)، صحافی یا ادیب و شاعر ہوں تو ایسے خیالات و مقاصد کی اشاعت کروں گا اور اپنی صلاحیت صرف کروں گا جو انسان دوستی کا جذبہ ابھارتے ہیں۔ نفس و ماحول کی گندی ترغیبات، اشتعال انگیزی، منافرت، برادرکشی، انسانیت دشمنی اور تخریبی ذہن پیدا کرنے میں مدد نہ کروں گا۔

۵۔ میرے سپرد کوئی ذمہ داری کا عہدہ ہوا تو میں اپنے حدود اور دائرۂ عمل میں انصاف کرنے اور حق دار کو اس کا حق دلانے کے لئے پرخلوص جد و جہد کروں گا۔

۶۔ میرا سماج کے جس طبقہ سے بھی تعلق ہو میں اس ملک کو اپنا وطن سمجھ کر، یہاں کے ہر شہری سے محبت، ہمدردی، تعاون اور بھائی چارہ کا برتاؤ کروں گا۔

۷۔ اس ملک کو اخلاقی پستی اور انسانی زوال سے بچانے کے لئے "کل ہند حلقہ پیام انسانیت" جو کام کر رہا ہے اس کے طے کئے ہوئے پروگرام سے میں ہمدردی اور دلچسپی لوں گا اور اس کے ساتھ جس قدر ممکن ہوگا تعاون کروں گا۔

دستخط .... پورا نام .... پیشہ ....

مکمل پتہ ....

حلقہ پیام انسانیت ـ پوسٹ بکس ۹۳ ندوہ لکھنؤ (انڈیا)

انسانیت کو ابھار دینا وقت کی اہم ضرورت ہے

حرف آخر

جولائی کے شمارہ کے اکثر مضامین پسند آئے۔ گلبرگہ سے متعلق محمد کلیم الدین احمد صاحب کا مضمون تو بہت بلکہ عام استفادہ کی چیز ہے! ۔ انیس چشتی کا جائزہ "مراٹھی ادب" شاہ اردو والوں کو دعوت غور و فکر دیتا ہے۔ میر الطاف علی نے حضور بندہ نوازؒ گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ بارے میں جو مضمون لکھا ہے وہ معلوماتی ہے۔ ہاں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ حضرت بندہ نواز دولت آباد میں پیدا ہوئے، یہ صحیح نہیں ہے۔ محض شاداب کے معتبر تاریخی کی مزید معلومات خاطر عرض کرنا چاہوں گا کہ :-

آپ کی ولادت ۴ رجب ۷۲۱ھ / ۱۳۲۰ء کو دہلی میں ہوئی ۔ حضرتؒ کی عمر جب دس سال کی تھی تو اس وقت آپ کے والد بزرگوار حضرت سید شاہ یوسف الحسینی المعروف بہ سید شاہ راجو قتال حسینی کی وفات ۵ رشوال ۷۳۱ھ میں ہوئی ۔ حضرت بندہ نوازؒ (۲۲) واسطوں سے امام حسینؓ کی آل اور حضرت علیؓ کی اولاد سے ہیں ۔ گلبرگہ میں آپ کی آمد بعض مورخین کے مطابق ۸۰۱ھ میں ہوئی ۔ حضرت بندہ نوازؒ نے (۱۰۴) سال (۴) ماہ اور (۱۲) دن کی عمر پائی ۔ آپ کا وصال ۱۶ ذی قعدہ ۸۲۵ھ / ۱۴۲۲ء دوشنبہ کو اشراق اور چاشت کے درمیان ہوا ۔ تاریخ رحلت "مخدوم دین و دنیا" ہے۔

حضرت بندہ نوازؒ کی تصانیف (۱۰۵) ہیں ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض نقائص دین کی وجہ سے ترقی کی ہیں چنانچہ اردو زبان پر حضرت بندہ نوازؒ کا احسان عظیم ہے۔

حضور بندہ نوازؒ کا نام سید محمد، کنیت ابوالفتح، لقب صدر الدین اور ولی الاکبر ہے۔ آپ کی ولادت کے وقت غیاث الدین تغلق تخت دہلی پر متمکن تھا۔ اس کے انتقال کے بعد سلطان محمد تغلق اپنی سلطنت کی وسعت کے پیش نظر دارالسلطنت کو مرکزی مقام پر منتقل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ دولت آباد (اورنگ آباد کے قریب) دارالسلطنت مقرر ہوا۔ اسی زمانہ میں حضرت سید شاہ راجو قتال حسینی بھی دولت آباد منتقل ہوئے۔ جس وقت پایہ تخت دولت آباد منتقل ہوا یہیں ایک مشہور بزرگ رہا کرتے تھے جن کا نام حضرت شیخ برہان الدین تھا۔ حضرت بندہ نوازؒ کے والد بزرگوار نے اپنے دونوں صاحبزادوں کو حضرت شیخ سے بیعت کروا

ان دونوں کو دیکھ کر کہا کہ آپ کا یہ بڑا لڑکا (حضرت سید شاہ چلن حسینیؒ) سوداگر ہے
اور یہ چھوٹا لڑکا (حضرت بندہ نوازؒ) عارف ہے، ولی ہے، مرشد ہے اور ان اوصاف کا حامل ہے
خصائص اولیاء سے متعلق ہیں۔ ان پیران بزرگ نے مزید فرمایا کہ "جو کچھ کہ میں دیکھ سکا اظہار کر
کر دیا لیکن وہ ان سے بھی بلند مقامات کے حامل ہیں اور اس سے آگے میری نظر کا پہنچنا محال ہے"

حضور بندہ نوازؒ نہ صرف ایک ولی اور ہادی ہی تھے بلکہ وہ ایک بلند پایہ عالم اور صاحب تصنیف بھی تھے۔ عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں آپ کی متعدد تصانیف ہیں جنہیں علم و ادب کا سرمایہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ مولانا سلیمان ندوی نے سچ ہی کہا ہے "سیدنا بندہ نوازؒ کو خاندان چشت کا "سلطان القلم" کہنا چاہیئے۔ عادل شاہی دور کے بادشاہ علی عادل شاہ نے سیدنا بندہ نواز گیسو درازؒ کی تعریف یوں کی ہے ؎

پانچ تن کا مہر سو تیرے اوپر بھرپور ہے
چشت کے سب خاندان میں معتبر کوں دستور ہے
راج مارگ پاوے تیرا عمل دستور ہے
دو صفت پایا تہیں یعنی حقیقت ہور مجاز

وجہی، غواصی، نصرتی جیسے مشہور دکنی شاعروں نے آپؒ کی مدح سرائی میں احترام و عقیدت کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ ان کے کلام سے قدیم دکنی ادب پر بھی روشنی پڑتی ہے غواصی کہتا ہے ؎

نوازے ہو ہیں بندیاں کو بندہ نواز "
اوصاف جگ میں کے ہیں گیسو دراز "

بیجاپور کا مشہور شاعر نصرتیؔ آپ کی فضیلت کا یوں اعتراف کرتا ہے ؎

فضیلت میں تجھ آج ہے بے خطا   کہ علم لدنی تجھے ہے عطا
تو جامع فضائل منصب ہوا   تو عالم سوں دل کے قریب ہوا

سیدنا بندہ نواز کی تبلیغ مسیحائی کا انداز لیے ہوتی تھی۔ آپ نے عارفانہ دل پذیر انداز میں یوں سمجھایا ہے :-

"پیر حق کے سو پرہیز کرنا، مراقبہ کی گولی مشاہدے کے کاڑھے میں ملا کر ندم کے پانی سوں، جلی کا کاڑا کر کو پیلانا، شگن کا کاٹا دینا نرگن ہوا تو شفا ہووے گا۔ طبیب فرمائے تہوں پرہیز کرنا۔" (معراج العاشقین)

بہرحال اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ حضور بندہ نواز گیسو دراز رح اردو کے اولین شاعر و ادیب ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس موضوع پر مزید تحقیق ہو اور وہ مخطوطات منظر عام پر لائے جائیں جن پر ابھی تک پردے پڑے ہیں۔

خادم کو حضور بندہ نواز گیسو دراز رح کی اولاد میں ہونے کا شرف حاصل ہے تاہم

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

حسینی جاوید - جرنلسٹ
اورنگ آباد

شاداب کا پہلا شمارہ دیکھا۔ اردو کے لئے اس پرآشوب دور میں ایسا رسالہ نکالنے پر مبارکباد قبول فرمائیں۔ خداوند کریم سے دعا ہے کہ آپ کے حوصلوں کو بلند رکھے یوں تو آئے دن نئے نئے پرچے نکلتے ہیں لیکن بہت جلد انجام کو بھی پہنچ جاتے ہیں۔ اسی لئے ہر نئے رسالے کو دیکھ کر دل میں یہ خیال بھی آتا ہے خدا اس کو لمبی عمر عطا کرے۔

سلیم محی الدین - پربھنی

شاداب پابندی سے موصول ہو رہا ہے۔ شاداب کے تمام مضامین بقول شاعر ؎

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

مختصر یہ کہ تمام مضامین اپنی انفرادی حیثیت و نوعیت کے مالک ہوتے ہیں اور رسالہ بھی ایک مقام رکھتا ہے۔ اس کے لئے آپ واقعی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

عبدالعزیز عرفان - آکوٹ (مہاراشٹرا)

کل ہی شاداب کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ تازہ شمارہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خوب سے خوب تر کی تلاش جاری ہے جس سے شاداب کی شادابی اور تر و تازگی بڑھتی محسوس ہو رہی ہے، اداریہ میں اگر تعالی کی رپورٹ اور اس پر مشتمل مضمون بھی مفید ہے۔ کاش ہماری قوم بھی علم و ادب کی اشاعت میں اس قسم کی کوئی مثال پیش کرتی۔ اردو سائنسدانوں کی انجمن کا قیام ایک مبارک قدم ہے، خدا کامیابی دے گفتگو کی تربیت نئے شمارہ میں بہت مفید مضمون ہے۔ اس کمی کو ہم سب ہی محسوس کرتے ہیں۔ نئی نسل مادری زبان سے ہٹ کر کئی زبانوں کے ہجوم میں ایسی گھر گئی ہے کہ وہ کہیں کی نہیں رہتی۔ اے کاش اہل علم اس طرف توجہ دیں اور اس قسم کی ہلکی پھلکی کتابیں (جو تربیتی ہوں زبان اور آداب دونوں ہی کیلئے) مرتب کریں۔ اگر ادارہ شاداب دلچسپی لے تو یہ کام بہتر طریقہ پر انجام پا سکتا ہے۔

زبیر - اکیڈیمی آف لنگول اسٹڈیز - اندور

ڈاکٹر [illegible] منشا

غزل

بسم گل کو ہم نے دیئے ہیں رنگ کے ساماں تم سے زیادہ
بھر کر پھر کیوں نہ اٹھائیں لطف بہاراں تم سے زیادہ

فرطِ جنوں میں صحرا صحرا خاک اڑائی ہے ہم نے
دنیا بھر کو ہم نے کیا ہے ششدر و حیراں تم سے زیادہ

ژگاں خوں آلودہ آنسوؤں کے دیپ جلا کر
وشنی میں ہم نے کئے ہیں جشن چراغاں تم سے زیادہ

ہنستے ہنستے پتھر کھائے رستے زخموں کو سہلائے
ہم نے لہو کے پھول کھلائے بر سرِ داماں تم سے زیادہ

ساحل پر غرقِ سکوں تھے موجوں سے ہم ٹکرائے
وں نہ اچھلے نام ہمارا طوفاں تم سے زیادہ

غم کی کثرت ، درد کی شدت سوز کی حدت کرب کا لطف
ایسے حسنِ قسمت پر ہیں ہم بھی شاداں تم سے زیادہ

انا اسبابِ مسرت ہم کو میسر کچھ نہیں پھر بھی
کھتے ہیں ہم اپنے دل میں جینے کے ارماں تم سے زیادہ

اپنی ادائے ظلم و ستم پر تم کتنا بھی اتراؤ
اپنے شیوۂ صبر و رضا پر ہم ہیں نازاں تم سے زیادہ

بھی کسی کا دل ٹوٹے ہم ہو جاتے ہیں پژمردہ
و قیمتِ انساں پر ہم رکھتے ہیں ایماں تم سے زیادہ

قول کے سچے ، دھن کے پکے ہم ہیں سب کے خیر اندیش
حسبِ منشا کیوں نہ ہو ہم پر رحمتِ یزداں تم سے زیادہ

یوسف شہدی

محبت اور حسن

(ماہنامہ شاداب بابتہ جولائی ۸۴ء میں جناب سرنواس لاہوتی کی نظم بعنوان محبت اور حسن شائع ہوئی ہے جو کشمیری نظم کا انگریزی سے ترجمہ ہے۔ میں اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہوں لہٰذا ترجمہ کو منظوم کر دیا ہے۔ امید ہے کہ قارئین شاداب بالعموم اور سرنواس صاحب بالخصوص میری نظم پڑھ کر محظوظ ہونگے)
(س۔ ا)

یہ بات اس وقت کی ہے یہ ہے قصہ اس زمانے کا
محبت جب نہ تھی اندھی نہ تھا جب حسن ہی گونگا

محبت، حسن باہم ایک دن تفریح کرتے تھے
انھوں نے چاند یوں نکلا جو دیکھا کھل اٹھے چہرے

محبت کی نگاہیں چاند پر ہی جم گئیں جا کر
مگر اس بات پر ہی حسن برہم ہو گیا یکسر

غرورِ حسن سے اپنی بڑائی پر اتر آیا
برائی چاند کی کرنے لگا اور خود پہ اترایا

محبت کو بڑا ہی تاؤ آیا حسن پر پھر پھر
وہ دونوں ہاتھا پائی پر اتر آئے، لڑے جم کر

بڑھا پھر حسن آگے پھوڑ دیں آنکھیں محبت کی
محبت نے زبان حسن آخر کھینچ ہی ڈالی

محبت اس زمانے سے ہے اندھی حسن ہے گونگا
محبت، حسن کا افسانہ اس انجام کو پہنچا

غزل

مجیب سراہی

کچھ نہیں پھر بھی مکافاتِ عمل باقی ہے
آج تو بیت گیا خیر سے کل باقی ہے

باوجود اس کے کہ کچھ لوگ غزل دشمن ہیں
اب بھی رنگینیٔ اشعارِ غزل باقی ہے

ہو کے برباد بھی ہوں وضع پہ اپنی قائم
جل گئی رسی مگر آج بھی بل باقی ہے

زندگی کشتی تھی سو کٹ گئی جیسے تیسے
مرحلہ ایک بس اب اور اجل باقی ہے

اس پہ آئیں گے بہرطورِ طلب کے پتھر
پیڑ پر آس کے جو ایک بھی پھل باقی ہے

سوچتے سوچتے تھک جاؤ تو بتلا دینا
مسئلہ کا مرے پاس اور بھی حل باقی ہے

آدمیت ابھی تکمیل کو پہنچی ہے کہاں
اس میں تو اور بھی کچھ رد و بدل باقی ہے

مٹ گئی ہے ترے ملنے ہی تھکن جتنی تھی
صرف احساس میں تھوڑی سی کسل باقی ہے

ٹوٹنے ہی کو ہے بس تیرگیٔ شب کا فسوں
آمدِ صبحِ بہاراں کو ئی پل باقی ہے

اب مسائل سے نپٹنے کے لئے اے سراہی
کونسا راستہ ہے کونسا حل باقی ہے

بارسی ٹاکلی 444401 - ضلع آکولہ - مہاراشٹرا

غزل

صلاح الدین نیر

نیند کھلی تو خواب کی تعبیر رہ گئی
وہ جا چکے ہیں میز پہ تصویر رہ گئی

اک نسل میرے سامنے ہے کیا جواب دوں
اجڑے ہوئے مکانوں کی تعمیر رہ گئی

سورج کو سے کے ہاتھ میں ہم مطمئن رہے
آگے اندھیرے بڑھ گئے تنویر رہ گئی

جو نقش تھے حیات کے سب مٹ گئے مگر
کتبے پہ اس کے نام کی تحریر رہ گئی

تعریف خد و خال کا آسان تھا مرحلہ
لیکن تمہاری آنکھوں کی تفسیر رہ گئی

جتنے خطوط لکھے تھے میں نے وہ مل گئے
جلدی میں اس کی میز پہ تصویر رہ گئی

دُہ تیز ہوا کا جھونکا تھا، آکر چلا گیا
لیکن اسی ایک خوشبو کی تاثیر رہ گئی

بازار روپ لعل - حیدرآباد

غزل

اُس کا لہجہ بھی کس درجہ سرد ہونے لگا
پتہ پتہ درختوں پہ زرد ہونے لگا

نہ مل سکے گا مرے شہر میں عمل تم کو
ہر ایک شخص ہی باتوں کا مرد ہونے لگا

ودر بات کہ مسموم ہو گیا ہر شخص
یقین ہے کہ میں لاجورد ہونے لگا

لکھا تو کچھ بھی نہ تھا ہجر کے قلم نے ابھی
مگر یہ رقعۂ جاں فرد فرد ہونے لگا

شخص رات کی رنگینیوں کا خالق تھا
دن نکلتے ہی صحرا نورد ہونے لگا

مری کہانی ابھی تو پڑھی نہ تھی تم نے
کیوں لفظ لفظ میں محسوس درد ہونے لگا

ابھی سفر کا ارادہ کیا تھا میں نے رئیس
مرا وجود مگر گرد گرد ہونے لگا

1725 دہلی گیٹ علی گڑھ (202001)

غزل

پھول، وعدے نئی کتابوں میں
ایک بیتی صدی نصابوں میں

آئینوں میں بسے تری خوشبو
یا مری آنکھ کے گلابوں میں

ایک لڑکی بہت اکیلی سی
زندگی کو پڑھے کتابوں میں

میں منظم بھی تھا سوالوں سا
وہ بکھرتا رہا جوابوں میں

سوچ بھی ریت ریت اب ہے سلیم
کون مجھ سا یہاں عذابوں میں

گمارشی پورہ نزد عاشور خانہ - پربھنی

محمد ابراہیم خاں شوق اکوٹوی

غزل

خوف تنہائی اور وحشت ہے
آج کل ان کی اپنی سنگت ہے

دل مرا صاف ہے مرے ہمدم
مثل آئینہ خوب صورت ہے

رشک گلشن بنا جو دل میرا
ہر طرف آپ ہی کی شہرت ہے

خود کو دیکھے کہ وہ تجھے دیکھے
آئینہ خود ہی محو حیرت ہے

شوق سن لو کہ لوگ کہتے ہیں
ان کی محفل میں کس کی عزت ہے

اردو جونیر کالج اکوٹ 444101 مہاراشٹر

سید نذیر ممتاز

غزل

میں ادھر آتا ہوں اور آپ ادھر جاتے ہیں
چھوڑ کر راہ وفا آپ کدھر جاتے ہیں؟

انتہا یہ ہے کہ بت کو بھی خدا کہنے لگے
ہم محبت میں کبھی حد سے گذر جاتے ہیں

اپنا شیوہ تو محبت میں ہے تسلیم و رضا
کیسے ناکام محبت ہیں جو مر جاتے ہیں

ہم سمجھتے ہیں دل و جان کو نذرانۂ حسن
وادیٔ عشق میں بے خوف و خطر جاتے ہیں

آئے ہیں ہو کے پشیمان جہاں پھر آج
دل کی بے تابیاں ہیں پیش نظر جاتے ہیں

یہ ندامت کے ہیں ان کو نہیں کہتے آنسو
جن کے یہ دامن رحمت میں گہر جاتے ہیں

دل جگر ہوتے ہیں مجروح نہ دعویٰ نہ ثبوت
جس طرف آپ کے جب تیر نظر جاتے ہیں

ان کو کچھ کہہ نہیں سکتے وہ ہیں دل کے مختار
عہد و پیماں سے ہیں جب چاہیں مکر جاتے ہیں

کوئے جاناں میں وقار آپ چلے ہو جاتا
ہم یہ کہتے تھے نہ جائیں گے اگر جاتے ہیں

سنگا ریڈی ـ ضلع میدک (آندھرا پردیش)

غزل حافظ شیرازی

ترجمہ (اردو) مہشید انصاری

دل می رود ز دستم صاحب دلاں خدا را
دردا، کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

دل میرا نہ رہا تھا تو مجھ کو، فریاد، اے دل والو!
وہ راز جو اب تک پنہاں تھا کم بخت نہ افشا ہو جائے

آں تلخ وش، کہ صوفی، ام الخبائثش خواند
اَشْھیٰ لَنَا وَاَحْلیٰ مِنْ قُبْلَةِ الْعَذَارا

شراب تلخ کو واعظ برا کہتا ہے کہنے دو
شراب تلخ تو دوشیزہ کے بوسے سے بہتر ہے

در کوئے نیک نامی ما را گذر ندادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

گلی میں نیک نامی کی مجھے جانے نہیں دیتے
قضا کو پھیر دے، تجھ کو اگر اچھا نہیں لگتا

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف، با دشمناں مدارا

انہی دو سے، تجھے راحت ملے گی دونوں عالم میں
تواضع دشمنوں سے اور محبت اپنے یاروں سے

ہنگام تنگدستی در عیش کوش و مستی
کیں کیمیائے ہستی قاروں کند گدا را

قاروں بنا دیتی ہے اک پل میں گدا کو
ہنگام تہی دستی میں بھی پی کے ذرا دیکھ

دو روزہ مہر گردوں، افسانہ است و افسوں
نیکی بجائے یاراں، فرصت شمار یارا!

محبت چرخ کجرفتار کی بے اصل ہے ہمدم
غنیمت جان موقع، دوستوں کے ساتھ نیکی کر

کشتی شکستگانیم اے باد شرطہ، برخیز
باشد کہ باز بینم آں یار آشنا را

سفینے کی یہ حالت ہے یہاں ٹوٹا، وہاں ٹوٹا
مدد کر اے ہوا! ممکن ہے پھر اس یار کو دیکھوں

در حلقه گل و مل، خوش خواند دوش بلبل
هات الصبوح هبوا یا ایها السکارا

خوشی سے گا رہی تھی بزمِ ناؤ نوش میں بلبل
کہ اے ساقی! شرابِ ناب کے رند و بادہ خوار

ے صاحب کرامت! شکرانهٔ سلامت
روزے تفقدی کن درویش بے نوا را

خدا تجھ کو سلامت رکھے، تو ہے مرتبہ والا
گدائے بے نوا کے حال پر اک دن کرم فرما

ئینہ سکندر، جام جم است بنگر
بر تو عرضه دارد احوال ملک دارا

سکندر کا یہ آئینہ ہے، یہ ہے جامِ جم دیکھو
کہ ہو جائے نمایاں حال سارا ملک دارا کا

رکش مشو که چون شمع از غیرتت بسوزد
ل بر، که در کف او موم است سنگ خارا

نہ ہو سرکش کہ مثلِ شمع غیرت سے جلا دے گا
وہ دلبر، موم ہو جاتا ہے جس کے ہاتھ میں پتھر

ر مطرب حریفان این پارسی بخواند
ر رقص حالت آرد پیران پارسا را

اگر یاروں کا مطرب بزمِ مے میں یہ غزل گائے
تو پیرانِ طریقت کو بھی اک دم وجد میں لائے

بان پارسی گو، بخشندگان عمر اند
اقی، بده بشارت پیران پارسا را

یہ فارسی کے حسیں سارے حیات افروز ہوتے ہیں
مرے ساقی! تو پیرانِ طریقت کو بشارت دے

افظ بخود نپوشید این خرقهٔ مے آلود
ے شیخ پاک دامن! معذور دار ما را

شراب آلودہ خرقہ خود نہیں پہنا ہے حافظ نے
مجھے معذور سمجھیں یا خدا! دیر و حرم والے

انسانیت کی خدمت اللہ کی بہترین عبادت ہے

رباعیاتِ عمر خیام

ترجمہ عزیز احمد جلیلی

یارب تو کریمی و کریمی کرم است
عاصی ز چہ رو برون ز باغ ارم است
با طاعتم ار ببخشی آں نیست کرم
با معصیتم اگر ببخشی کرم است

کریم تو ہے ترا کام ہے کرم کرنا
گناہ گار کو بھی کیوں نہ حق ہو جنت کا
ملے جو خلد عبادت میں یہ نہیں ہے کرم
گناہ گار کو بخشے تو ہے کرم تیرا

ساقی قدحے کہ ہست عالم ظلمات
جز روئے تو نیست در جہاں آبحیات
از جان و جہاں ہر چہ در عالم ہست
مقصود توئی و بر محمد صلوٰت

تاریکیوں میں ساقی ڈوبی ہوئی ہے دنیا
چہرا ہے تیرا اس میں آبحیات گویا
مقصود اس جہاں کا در اصل تو ہے احمد
ان پر درود بھیجو نام ان کا لب پہ آیا

مے بر کف من نہ و برآور غلغل
با نعرۂ عندلیب و صوتِ بلبل
بے نغمہ اگر روا بدے مے خوردن
مے در شیشہ با نکردے قلقل

جام شراب ہاتھ میں دے اور گیت گا
بلبل کے ساتھ تو بھی سر اپنا ملا کے گا
نغمہ بغیر پینا پلانا ہے بے مزہ
مینا میں اس لئے تو ہے قلقل کی یہ صدا

آج کا مسلمان

عامر شاکر

تھے جس کے نقش پا راہ روی کی منزل کہکشاں تو ہے
مگر صد حیف اب تو صرف گرد کارواں تو ہے

یہ سچ ہے تھی کبھی تجھ پر نظر سارے زمانے کی
زمانے کی نظر میں اب فقط ننگ جہاں تو ہے

کبھی تجھ پر ہوا پیہم نزول نصرت غیبی
اترتی ہیں فقط رسوائیاں ہی اب جہاں تو ہے

کبھی تیری اذانوں سے فضائیں کانپ اٹھتی تھیں
مگر اب تو فضائیں گونجتی آہ و فغاں تو ہے

کبھی خود ہی زمانے سے ستیزاں تیری فطرت تھی
زمانہ ساز کی صورت زمانے پر عیاں تو ہے

سمجھتا ہے تو اوروں کے طریقوں ہی میں عزت ہے
بصد ایقان ان کے ذکر میں رطب اللساں تو ہے

ترے ضمیر میں خود غرضی، کجروی ہی ان کا شیوہ ہے
قیادت میں حکمراں کی رواں دواں تو ہے

ترے کل اور تیرے آج میں شاکر ہے فرق اتنا
خدا پر تھا یقیں تجھ کو خدا سے بدگماں تو ہے

حقیقت معراج

انور کمال گانوی

ہے راکٹوں کی رسائی کا اک جہاں شاہد
میزائلوں سے سکون فضا ہوا تاراج

مہ و نجوم تو کیا شے ہے فہم انساں کی
شعاع مہر جہاں تاب دے رہی ہے خراج

تعینات زمان و مکاں ہیں خواب و خیال
بدل رہی ہے زمانے کی قدر رسم و رواج

نہیں خدا کا، کمال ہنر کا تجھ کو یقیں
سمجھ رہا ہے جسے لعل اصل میں ہے زجاج

نہیں تو عرش رسا ایک مرد حق ہی نہیں
مہ و نجوم کا فاتح ہو بندہ محتاج

اگر یقیں نہیں معجزات روشن کا
تو میرے پاس نہیں تیرے وہم و شک کا علاج

عروج حکمت و سائنس سے ہوا ثابت
ہے ایک زندہ حقیقت حقیقت معراج

Regd. No. H/HD 593.

Monthly **SHADAAB** Hyd

11-5-147, RED HILLS, HYD-500 004.

Vol 1 No 9 AUGUST 1984.

نیا آگرہ

بشیر باغ — چادر گھاٹ

نیا آگرہ، اس کو ہم کہتے ہیں — سلیقے کے نوکر یہاں رہتے ہیں
سلیقہ یہاں کا تو مشہور ہے — یہاں جو بھی آتا ہے مسرور ہے
سبھوں کو کرو خوش یہ دستور ہے — شکایت یہاں سے بہت دور ہے
لذیذ اس کے سالن لذیذ اس کی چائے — یہی سب کا کہنا یہی سب کی رائے
بلند اس کا معیار ہے بالیقیں — کسی کی زباں پر "نہیں" تو نہیں
یہاں کا ہے قانون اور قاعدہ — نہ بدلے یہاں کا کبھی ذائقہ
خوش اخلاق ہر کارکن ہے یہاں — ملازم یہاں کے ہیں شیریں زباں
شکایت کسی سے بھی اب تک نہ کی — سبھوں نے کی تعریف و توصیف ہی
محاسن گنانے سے کیا فائدہ — مناسب ہے خود دیکھیں باقاعدہ
ہے فرنیچر اس کا بہت خوشنما — یہی ہم نے لوگوں کو کہتے سنا
خوشی سے یہ کہتے ہیں دیوار و در — کبھی آئیے، ڈالیے اک نظر
جو ہے ہاتھ کنگن تو کیا آرسی! — یہ اردو زباں ہے نہیں فارسی
یہ ہے شرط، اک بار تشریف لائیں — یہاں کی ہر اک جنس اک بار کھائیں
اتر آئیں گے آپ تعریف پر — یہاں قصہ کرتے ہیں ہم مختصر
بہت خوب ہے طول سے اختصار — رہے گا ہمیں آپ کا انتظار

میرے افکار کے گلشن میں جو جھانکے کوئی
دُور تک منظرِ شاداب دِکھائی دے گا

قیمت : پانچ روپے

علمی، ادبی، دینی و سماجی افکار کا نمائندہ

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد (۱)   ستمبر ۱۹۸۴ء   شمارہ (۱۰)

زر تعاون فی پرچہ ــ پانچ روپے

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
دو سالہ	90 "	[illegible] "	65 "	36 "	225 " "
تا حین حیات	1000 "	2500 "	450 "	300 "	2000 " "

ترسیل زر کا پتہ : 11-5-147 ریڈ ہلز ... [illegible]

[illegible]

فہرست

حرفِ اول

شاداب کا دسواں شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ شاداب نہ صرف خوب سے خوب تر ہو بلکہ آپ کی توجہات اور دلچسپیوں کا مرکز بھی بنا رہے۔ اسی لئے اس شمارہ سے "شاداب علمی معمہ" کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ اس کا مقصد آپ کے علمی ذوق کو صیقل کرنا اور اسے جِلا دینا ہے۔ اس کی کوئی فیس نہیں ہے، کوئی رقمی انعام بھی نہیں ہے۔ اشارے علمی و ادبی نوعیت کے ہیں۔ جن سے ذہنی ورزش ہو اور اردو کتب و رسائل کے مطالعہ کا شوق بڑھے۔ اگر ہمارے پڑھنے والوں کو پسند آئے تو شاداب علمی معموں کا سلسلہ جاری رکھا جائے گا ورنہ منقطع کر دیا جائے گا۔ اس بارے میں آپکی رائے اور گرانقدر مشوروں کا انتظار رہے گا۔

اردو زبان و ادب کے فروغ کے لئے جو ادارے کام کر رہے ہیں ان میں غالب میموریل ویلفیر سوسائٹی ایک اعلیٰ مقام کی حامل ہے۔ یہ سوسائٹی ۱۹۶۸ء میں جشن غالب کے موقع پر قائم کی گئی تھی۔ تب سے سوسائٹی چھوٹے بڑے تقریباً (۵۰) سیمینار، مشاعرے اور ادبی تقریبات منعقد کر چکی ہے۔ پچھلے پندرہ سال سے ادیبوں اور شاعروں کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر انعامات دے رہی ہے، ۱۹۸۳ء کے انعامات کے لئے مندرجہ ذیل مشہور و ممتاز مصنفین کو انعامات کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔

۱۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ برائے تنقید
۲۔ ڈاکٹر خلیق انجم برائے غالبیات
۳۔ پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی — برائے ادبی و لسانی خدمات
۴۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی برائے تحقیق
۵۔ جناب جوگندر پال برائے ناول و افسانہ

سوسائٹی نے ان ادیبوں کو منتخب کر کے ان کی خدمات کا صحیح معنوں میں اعتراف کیا ہے۔ اور اپنے اعلیٰ ذوق کا عملی ثبوت دیا ہے۔ ہم ان سب انعام یافتگان کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں

مدیر

مولانا عبدالماجد دریابادی

بلاغت قرآن

"تفسیر ماجدی" (طبع ثانی) کے افتتاحیہ سے ماخوذ)

قرآن مجید جہاں یکتا و منفرد اور حیثیتوں سے ہے وہاں اس اعتبار سے بھی ہے کہ وہ بہ یک وقت زندہ جاوید اور ہمہ وقت تازہ اور عالمی یا آفاقی صحیفہ ہدایت بھی ہے اور بہ قید زمان ومکان، ایک متعین ملک اور متعین ماحول کے لئے مخصوص بھی۔ یعنی ایک طرف تو وہ دنیا کے ہر ملک واقلیم کے لئے ہے، اس کی مخاطب چین وجاپان، ایران وہندوستان، یورپ وامریکہ اور افریقہ، مشرق مغرب شمال جنوب کی ساری ہی قومیں ہیں اور وہ بھی کسی مخصوص ومحدود زمانہ کی نہیں بلکہ پہلی صدی ہجری کی طرح چودھویں صدی ہجری کی بھی۔ خواہ ان کی تہذیب وتمدن اور ماحول کچھ بھی ہو۔ اور دوسری طرف اس کی مخاطب اول و براہ راست ایک مخصوص ملک عرب کی وہ قوم تھی جو تاریخ کے ایک متعین زمانہ، ساتویں صدی عیسوی کے ثلث اول میں موجود وآباد تھی اور اپنی ایک مخصوص ذہنیت، ثقافت ومعاشرت اور مخصوص فکری و وجدانی ہئیت کے ساتھ — قرآن مجید کی یہ دوگانہ حیثیت یعنی ایک طرف عالمی وآفاقی اور دوسری طرف قومی ووطنی موجود ہی نہیں بلکہ برابر ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ گو ظاہر ہے کہ ترتیب زمانی کے لحاظ سے یہ دوسری حیثیت پہلی پر مقدم ہے۔

یہ ایک کلیدی وبنیادی حقیقت ہے اور اس کو مستحضر رکھنے سے دو نتیجے خود بخود لازم آجاتے ہیں

(۱) قرآن شریف کی معنویت گو آفاق گیر ہے لیکن اپنی صورت وقالب کے لحاظ سے وہ بہر حال عربی کلام ہے، نہ انگریزی یا اردو یا کچھ اور، اور جہاں تک اسلوب بیان اور طرز ادا کا تعلق ہے وہ عربی ہی کے لغوی، نحوی، لسانی، ادبی، انشائی، اسلوبی مقتضیات کا پورا کرنے والا ہے، نہ کہ کسی اور زبان کے تقاضوں کا۔ سجع، وزن اور قافیہ اگر بلاغت عرب کے اجزا ہیں تو وہ ضرور اس میں موجود ہوں گے۔ بعض موقعوں پر اگر فقروں کی تکرار عربی حسن ادب کی جان ہے تو وہ یقیناً اس میں پائی جائے گی شہادت پیش کرنے کے موقعہ پر اگر قسم کھانا عربی زور بیان کا ایک جزو ہے تو وہ لازمی طور پر اس میں شامل ہوگا

وقس علیٰ ہذا ۔ غرض یہ کہ اس میں زبان کی سلاست و لطافت اور بیان کی فصاحت و بلاغت جو کچھ بھی ملے گی سب عربی ہی کے معیار کے مطابق ۔ نہ کہ ہندی یا فارسی یا سنسکرت یا انگریزی یا جرمنی زبان کے معیار کے تحت ۔ اس صریح و واضح معیار کو چھوڑ کر اسے کسی بھی غیر عرب پیمانے سے ناپنے کا مطالبہ کرنا خود اپنے جہل اور نامعقولیت کا مظاہرہ کرنا ہے

(ز) مخاطب اول و براہ راست قوم عرب تھی ۔ ساتویں صدی عیسوی کے ثلث اول کی ۔ اس لئے مخاطبت میں ان کے فہم و استعداد کی اور ان کے مسلمات عقل و نقل کی رعایت (جب تک کہ اس سے کوئی دینی، روحانی، اخلاقی گمراہی نہ پیدا ہو رہی ہو) حد درجہ ضروری تھی ۔ حکایات و امثال میں اگر ذکر ارجن و بھیم کا، یا رستم و اسفندیار کا، یا روم و یونان کے مشاہیر کا چھیڑ دیا جاتا یا گردش ارض و آفتاب کے ضمن میں اگر نیوٹن و آئنسٹائن کے زمانے کے نظریات و تحقیقات کا حوالہ دیا جانے لگتا یا تاریخ و جغرافیہ عام علوم و فنون کے سلسلہ میں کوئی بھی ایسی بات وضاحت و صراحت کے ساتھ فرما دی جاتی جو مخاطبین اول کی فہم و استعداد سے بالاتر ہوتی تو یہ سرتاسر خلاف حکمت و مصلحت ہوتا ۔ کلیدی یا بنیادی اصلاحی حقیقتوں کا منوانا بجائے خود ہی کیا کم دشوار تھا کہ ایک اور محاذ جنگ خواہ مخواہ ایسے عجیب و نامانوس مذاکرات کا قائم ہو جاتا اور توحید، رسالت و آخرت کے منکرین کو ایک اور وسیع میدان انکار و تکذیب کا خواہ مخواہ ہاتھ آجاتا ۔

اس لئے قرآن مجید نے انتہائی حکیمانہ طریقہ یہ اختیار کیا کہ ان ساری فرعی، ضمنی اور ثانوی بحثوں سے متعلق اس نے صراحت تو ایک بار بھی مذاق عرب کے خلاف نہیں کی اور اہل عرب کے علمی، عقلی، فکری مزعومات کو ان کے حال ہی پر چھوڑے رکھا لیکن اشارے ایسے برابر رکھ دیئے اور کلام میں لچک اتنی پیدا کر دی کہ آئندہ نسلیں اپنے اپنے دور کے ماحول فکری کے مطابق اس کتاب الٰہی کی تعبیر و تشریح میں آزاد رہیں ۔

یہ انتہائی نازک و دشوار مقام تھا ۔ کوئی بشری عقل و حکمت اس سے عہدہ برآ ہو ہی نہیں سکتی تھی ۔ یہ قرآن ہی کا اعجاز ہے اور اس کے کتاب الٰہی ہونے پر ایک مستقل دلیل ۔

سائنس اور ایک سائنس ہی پر کیا موقوف ہے ۔ ریاضی کے ممکن استثناء کے بعد سارے ہی دنیوی علوم و فنون کا یہ حال ہے کہ ان کی یافت اور تحقیق برابر بدلتی رہتی ہے اور ثبات و قرار ان علوم میں سے کسی کے بھی نصیب میں نہیں ۔ اسی مسلسل و مستمر بے ثباتی کا نام ان علوم کی "ترقی" یا "ارتقاء" رکھ دیا گیا ہے ۔ نظریات و ظنیات ہی نہیں ان علوم کے بڑے بڑے

مقبول و معروف مسلمات و قطعیات تک ہر تھوڑی مدت گذر جانے پر کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ اور "قدیم" کے پرستار "جدید" کے معتقدین کا بس منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں! — قرآن مجید بشری علوم کی ان نیرنگیوں اور تلون مزاجیوں کا ساتھ کیونکر دے سکتا تھا۔ اس نے ان ہونی ہونی کر دکھائی کہ اپنی عبارت کے اندر لچک اس غضب کی اور اتنی حیرت انگیز رکھ دی کہ جس طرح اب تک کسی دور کے بھی "محقق" اسے عصری تحقیقات کے منافی و معارض نہ پا سکے۔ آئندہ بھی کسی دور میں انشاءاللہ نہ پا سکیں گے۔

قرآن مجید نے متعدد غیر قوموں کا ذکر کثرت سے کیا ہے۔ کبھی ان کے حال سے سبق لینے اور کبھی اپنے مخاطبین پر حجت قائم کرنے کو۔ ان کے عقائد اور ان کے اعمال کو جابجا صراحت سے بیان کیا ہے اور ان کی تلمیحات کو کثرت سے لایا ہے۔ یہود و نصرانیوں کے علاوہ قوم اسرائیل، قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط، قوم یونس، قوم شعیب و قوم فرعون وغیرہ کے صحیح تذکرے تو ظاہر ہی ہیں۔ باقی ذکر مجوس اور صابئین اور قوم تبع اور قریش اور اصحاب فیل کا بھی نام لے کر کیا ہے اور کفر و شرک میں مبتلا، معاصر اور گذشتہ کتنی ہی آخرت فراموش قوموں کی جانب اشارے کہیں مجملاً اور کہیں خوب مفصل کئے ہیں۔ اور ملکوں میں نام مصر اور بابل اور مدین کے، اور اشخاص میں نام علاوہ حضرات انبیاء کے مریم، قارون، فرعون، ہامان، عمران، سامری، ابولہب، ام موسیٰ، امراۃ لوط، امراۃ فرعون وغیرہ کے، اور بتوں میں نام لات، عزیٰ، منات، بعل کے لئے ہیں۔ اس لئے لازمی ہے کہ جدید مفسر و شارح قرآن تاریخ اقوام پر بھی نظر رکھتا ہو اور جغرافیہ عالم پر بھی، اور یہودیت، نصرانیت، مجوسیت اور عرب اور نواح عرب کے مشرکیہ مذاہب سے بھی فی الجملہ واقفیت رکھتا ہو اور جدید سائنس کے بھی مختلف شعبوں (خصوصاً فلکیات) سے بھی مطلقاً بے بہرہ نہ ہو ورنہ باوجود تدین و تقویٰ، صالحیت و مقبولیت کے سخت علمی غلطیوں کا شکار ہو جائے گا۔ اور اس کا قلم کہیں فرعون اور لشکر فرعون کی غرقابی کو بجائے بحر قلزم کے دریائے نیل میں دکھائے گا۔ کبھی حضرت مسیح کا تلوار سے قریب القتل ہو جانا بیان کرے گا اور کہیں فرعون کو کسی تاجدار کا شخصی نام سمجھ کر دعویٰ الوہیت اسی کی شخصیت کی جانب منسوب کرنے لگے گا۔ مفسر کا محض صالح و متقی ہونا ہرگز اس کی ضمانت نہیں کہ اس کی تاریخی، جغرافی اور عام سائنسی معلومات بھی صحیح ہیں۔ قرآن مجید یقیناً ایک دینی صحیفہ ہے لیکن اس کا علمی پایہ بھی ہرگز ایسا نہیں کہ کسی کو اس پر کسی اعتبار سے بھی حرف گیری کا موقع مل سکے۔

قرآن مجید معنوی اعتبار سے بھی ایک نہایت مرتب و منظم کتاب ہے اور انشائی اعتبار

انتہائی طرح اور اسی نسبت سے قدرتاً ایک دشوار ترین کتاب بھی۔ اس کے دقائق و اسرار تو الگ آ
اس کی ظاہری و لفظی ترکیب تک بھی ہر جگہ آسان نہیں۔ اس کی تفسیر کو کوئی ایک بندہ تو کیا
سارے ہی بندے مل کر بھی چاہیں کہ درجۂ تکمیل کو پہنچادیں تو یہ حدِ بشری سے خارج ہے۔ اور نہ
انسان اس کا مکلف ہے۔ جس کو جتنی یافت قرآن کے اندر میسر آجائے بس وہی اس بندے
مرتبہ و شرف کے لئے بہت ہے۔ قرآن مجید نے آسان جو فرمایا ہے وہ موعظت اور عبرت پذیری
کے پہلو سے قابلِ عمل ہونے کے لحاظ سے ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مذکر سکنہ قمر کے پہلو کہ

ایک طرف یہ سب ہے لیکن دوسری طرف یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ قرآن وقت کے چلتے ہوئے
اور اصطلاحی مفہوم میں کوئی "علمی" یا "ادبی" یا "تحقیقی" مقالہ نہیں۔ اصلاً وہ محض کتاب
ہدایت ہے، یا انسانی زندگی کا انفرادی و اجتماعی دستور العمل۔ اس کی دنیا سر تا سر حکمت و اخلاق
روحانیت، عبدیت و انابت کی دنیا ہے۔ اس کی فضا سکینتِ قلب کی فضا، اور اس کا ماحول تقویٰ
و طہارت کا ماحول ہے۔ اس کے مغز تک پہنچنے کے لئے تقویٰ و طہارت کسی درجہ میں بہرحال ناگزیر
طہارتِ جسم کی طرح طہارتِ قلب کا ذرا سا بھی اہتمام کئے بغیر، محض زبان و لغت کے بل پر قرآن فہم
کی سعی یکسر سعی لاحاصل ہے۔ آخر ابوجہل (عمرو بن ہشام مخزومی) اور ابولہب (عبد العزیٰ بن
عبد المطلب ہاشمی) تو خالص قریشی تھے اور ٹکسالی اہلِ زبان۔ کوئی لسانی اشکال انہیں کیوں
پیش آنے لگا تھا۔ لیکن بدنصیبوں نے اپنی روح کو روحانیتِ قرآنی سے تمام تر بیگانہ و نا آشنا رکھا
قرآن ان پر ذرہ بھر بھی نہ کھل سکا، بند کا بند ہی رہا۔ اور ان کو اور ان کے ساتھیوں کو قرآن
فہمی کی سعادت درجۂ ادنیٰ میں بھی نصیب نہ ہوئی۔

کلام اس غیرت والے غنی عن العالمین کا ہے جس سے بڑھ کر نہ کوئی غیور ہے نہ بے نیاز
اور متکلم کی شانِ غیرت و غنا کا عکس پوری طرح کلام میں جلوہ گر۔ جو بڑا بننا چاہتا ہے لازم ہے
وہ چھوٹا بن کر اس دروازے میں داخل ہو۔ عارفِ رومی نے سو فی صدی صحیح کہا ہے ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ
جز کہ اشکستہ نہ گیرد دستِ شاہ

استاد کی ضرورت جب چھوٹے سے چھوٹے علم اور سہل سے سہل فن میں پڑتی ہے تو قرآن
کا علم تو سارے علوم کا بادشاہ اور سب سے بڑھ کر مہتم بالشان ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ قرآنیات
کوئی طالبِ علم استاد سے اور اگلے ماہرینِ فن کے نتائجِ تحقیق سے بے نیاز رہ کر اس کی منزلیں طے کر۔

اور اگر کسی کو بدقسمتی سے (ان سطور کے راقم کی طرح) کوئی زندہ استاد کامل الفن نہ میسر آئے (گو ان سطور کے راقم کو مولانا حمید الدین فراہیؒ صاحب نظام القرآن اور حضرت مولانا تھانویؒ صاحب بیان القرآن کی صحبتیں کچھ مدت تک ضرور نصیب رہی ہیں) تو اس خلاء کو اکابر مفسرین اور محقق شارحین کی کتابیں ایک بڑی حد تک پر کر سکتی ہیں۔

ان حضرات کی تلاش، تفحص، تحقیق کی داد دل سے دیجئے۔ ان کی سپاس گزاری کیلئے قلب کی گہرائیوں کو وقف کر دیجئے۔ ان کے کارنامے اگر رہنمائی کو موجود نہ ہوتے تو آج کس کی ہمت ہوتی کہ اس امر مہم عظیم کو چھیڑ بھی سکتا۔ بے شک اپنے پیشروؤں کی سعی و محنت سے بنی بنائی راہیں مل گئی جن پر قدم رکھنا ہر متاخر کے لئے آسان ہو گیا ہے لیکن اس انتہائی قدر و منزلت اور آخری احترام و اعتراف کے بعد بھی یہ حقیقت ذہن میں تازہ رکھئے کہ نبی معصوم کے بعد کوئی بھی معصوم امت میں نہ ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے اس لئے فکر، فہم و اجتہاد کے لحاظ سے ہر بڑے سے بڑا محقق بھی غیر معصوم ہی ہے۔ اس لئے پیروی کسی کے بھی قول کی ہر حال میں کئے جانا اور صریح دلیل مخالف کے باوجود بھی کرتے رہنا طریق حق و ثواب نہیں۔ اللہ کے کلام کی شرح و تفسیر، اگلوں اور پچھلوں کے کسی حصہ میں بھی آخری اور انتہائی نہیں ہو سکتی۔ کون اس علیم کل کے کلام کے سارے گوشوں اور پہلوؤں کو اپنے ذہن کی گرفت میں لا سکتا ہے؟ کس کا علم علیم مطلق کی کتاب کے سارے اطراف کا احاطہ کر سکتا ہے؟ — نئے نئے گوشے فکر و نظر کے ہمیشہ ابھرتے آئیں گے اور نئے نئے میدان علم و تحقیق کو دعوت ہر دور میں دیتے رہیں گے۔ نئے نئے سوال برابر پیدا ہوں گے اور نئے نئے جواب کتاب الہدیٰ کے صفحوں میں تلاش سے برابر ملتے رہیں گے۔

□□

اے نیک نام شکر کر اللہ کا ادا — جس نے بنایا نیک تجھے کر کے نیک نام
ہوتا اگر نہ پاس تجھے نیک نام کا — پھر دیکھتے کہ کرتا ہے تو کیسے نیک کام
حاشا کہ تجھ کو خوف خدا کا ہو اس قدر — جتنا کہ خوف طعنہ و تشنیع خاص و عام

(حالی)

ڈاکٹر حسن الدین احمد

مالک کشور تخت نہ افسر

تاریخ کے اہم دور میں جب کہ انسانیت دوراہے پر کھڑی تھی اور اس کے مزید چند غلط قدم اس کو تباہی و انجام کی طرف لے جاتے عرب کی ایک عظیم المرتبت ہستی نے انسانیت کے سامنے ایک نیا پیغام دیا تھا۔ آپ نے انسانیت کو تاریکی سے نکال کر ایسے راستے پر ڈالا جس پر چل کر وہ آج یہاں تک پہنچی ہے۔ تہذیب جدید جس کی توانائیوں اور خوبیوں سے ہم واقف ہیں وہ دراصل اسلامی تہذیب کی بنیاد پر قائم ہے۔ اگر آج اس میں کچھ خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں اور یقیناً پیدا ہوگئی ہیں تو ان کو دور کرنے کی تدابیر کی جاسکتی ہیں لیکن جن بنیادوں پر تہذیب نو قائم ہے وہ مضبوط ہیں۔ اس تہذیب کی آفاقیت، انسان دوستی، جمہوریت پسندی اور اس کا سائنسی مزاج اسلام کی اور محض اسلام کی دین ہے۔

دنیا کا ہمیشہ سے دستور رہا کہ اقتدار ظلم و جبر کے ذریعہ قائم ہوتا رہا اور انہی بنیادوں پر رہا کیا۔ کبھی اور کبھی ان لوازمات کا استعمال کم ہوتا رہا تو کبھی اور کبھی زیادہ۔ لیکن اس کے بغیر اقتدار کا تصور ممکن نہ تھا اور عوام کا یہ حال رہا۔ ؎

طاقت کے در پہ سر کو جھکائے ہوئے تھے لوگ

تاریخ عالم میں پہلی مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے بالکل نئے انداز سے حکومت اور اقتدار کو نافذ کیا۔ آپ نے آن کی آن میں عرب کے ذہن کو بدل دیا اور اعلان فرما دیا کہ اقتدار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے جو رحمٰن و رحیم ہے اور مکمل انصاف کرنے والا ہے۔ اور جس نے آپ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے۔

اسلام سے پہلے دنیاوی حکمران مثلاً فغفور چین، فرعون مصر وغیرہ شاہی احکامات کی منادی کرواتے تو یہ کہلواتے کہ فلاں حکمران کی طرف سے ہے جو قہار اور جبار ہے وغیرہ۔ آنحضرت صلعم نے قرانی احکام کی منادی یوں کروائی:۔

"اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے" (بسم اللہ کے معنی "شروع کرتا ہوں" لئے جاتے ہیں جو مراد ہیں لغوی معنی "اللہ کے نام سے" ہیں)۔

منزل ... - بازار نور خاں - حیدرآباد

اسی طرح جو لوگ اقتدار کی نمائندگی کرتے تھے ان کے معیار بھی فرعونوں کے ہاں مختلف تھے
نسل و ذات پر بنیاد افتخار بشر قائم تھی - آنحضرت صلعم نے ایک بہتر و برتر معیار سامنے رکھا کہ
اللہ کے نزدیک تم میں صاحب اکرام وہ ہے جو تقویٰ کا پابند ہو اور اسی معیار کو خود اپنے لئے بھی متعین
فرمایا - تاریخ شاہد ہے کہ تمام امت میں آپؐ کا تقویٰ سب سے زیادہ تھا -

شان و شوکت کے مظاہرہ اور طمطراق paraphernalia کے ذریعہ بھی حکومت کا اثر
دلوں پر بٹھایا جاتا تھا - زر و جواہر کا شاندار تخت مرصع تاج عالیشان دربار چوبدار اور نقیب کہ اہل دربار
کو آداب شاہی کا پابند کریں - کر و فر، باوردی افسر حکومت کا لوازمہ سمجھے جاتے تھے - شاہوں کی
داد و دہش استحقاق کی بنیاد پر کم اختیار تمیزی کی بنیاد پر زیادہ ہوتی تھی - اصولوں سے وابستگی
کی بنیاد پر کم تخت و تاج سے وفاداری کی بنیاد پر زیادہ ہوتی تھی -

آنحضرت صلعم نے یکلخت ان تمام ڈھکوسلوں کو ختم فرما دیا - پسماندہ عربوں کی ذہنی تربیت
شاندار طریقہ پر کی اور ان وحشیوں کو جینے کا سلیقہ سکھایا - آپؐ نے انسانیت کے اعلیٰ اقدار کو جزو
حکومت بنا دیا - عدل و انصاف اور دوسرے اقدار کے اعلیٰ معیارات، کردار کی بلندیوں اور حکومت کرنے
والوں کے احساس فرض اور احساس ذمہ داری کے ذریعہ جو کیفیت پیدا فرمائی، وہ - ع

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

کا مصداق رہی - یہ کیفیت مصنوعی سے کہیں زیادہ پر اثر تھی -

آپؐ نے جو حکومت قائم فرمائی اس میں سربراہ حکومت کی شان تھی ہاتھ کا تکیہ خاک کا بستر
اس میں نہ تاج تھا نہ تخت، شان و شوکت اور دبدبہ کے مصنوعی طریقے تھے، نہ ان مصنوعی طریقوں کو
نافذ کرنے کے لئے افسروں کو متعین کیا گیا تھا - تاریخ کا طالب علم آنحضرت صلعم کے اعلیٰ معیارات کا مطالعہ
کرتا ہے تو بصدق دل یہ اقرار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ - ع

تو واقعی رسولؐ ہے تو واقعی رسولؐ

آنحضرت صلعم سے پہلے ایک عظیم المرتبت پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہودی مذہب کے
ٹھیکہ داروں کی جتھہ بندی نے دار تک پہنچا دیا تھا - چھ سو برس تک حضرت عیسیٰؑ کے ایثار کو نظر انداز کیا گیا
اور دنیوی اعتبار سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کا مشن ناکام ہو چکا ہے لیکن انسانیت کے بے غرض
محسنوں کا کام کبھی ضائع نہیں کیا جاتا اور حق کے رسول کبھی ناکام نہیں ہوتے -

یہ بات عقیدہ کی بنا پر نہیں بلکہ تاریخ کی شہادت سے کہی جا رہی ہے کہ آنحضرت صلعم نے

سیاست اور مذہب کے ٹھیکہ داروں کو عملاً بالکل بے اثر کر کے حضرت عیسیٰؑ کی مظلومیت کا پورا پورا بدلہ لیا اور انسانیت کو مذہبی اجارہ داریوں اور جبھہ بندیوں سے آزاد فرما دیا اور اس طرح حضرت عیسیٰؑ کے مشن کو کامیاب فرمایا۔

آنحضرت صلعم نے حکومت ضرور قائم فرمائی اور اقتدار ضرور حاصل فرمایا لیکن آپؐ نے حکومت اور اقتدار کو مقصد نہیں بنایا بلکہ خدا کے دین اور اس کے مشن کو آگے بڑھانے اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ آپؐ نے حکومت کے قیام کے لئے اور حصول اقتدار کے لئے جدوجہد فرمائی۔ اس جدوجہد میں اصل مقصد اور اپنے پیغمبرانہ موقف کو کبھی نظر انداز نہیں فرمایا۔ ذرائع اور طریقہ کار Means کو اہمیت دی، قربانیاں دیں، مصیبتیں جھیلیں، جماعت کو تیار کیا۔ کبھی پائے استقامت میں لغزش نہ آنے دی۔ اپنی ربانی تحریک کی برتری کو ہمیشہ واضح رکھا۔ دشمن اور مخالفین بھی اس طرز عمل کے قائل اور اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے بلکہ دنگ رہ گئے۔

جب آپؐ ۸ ہجری میں مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تو گویا آپ کو پورے جزیرۃ العرب پر اقتدار حاصل ہو گیا۔ یہ داخلہ نہایت پرامن رہا اور بغیر کسی خونریزی کے ہوا۔ آپؐ نے مکہ معظمہ میں پرامن داخلہ کی شعوری طور پر تیاری کی۔ ہجرت کے بعد سے خواہ جنگ کی Strategy ہو یا حالت امن کی پالیسی، جو طریقہ کار آپؐ نے اختیار فرمایا اور فتح مکہ کے موقع پر اپنی قوت اور برتری کا جو مظاہرہ فرمایا تاکہ قریش مرعوب ہوں اور مقابلہ اور مزاحمت کا خیال نہ کریں۔ تالیف قلوب کے جو طریقے اختیار فرمائے گئے ان سب کا مقصد اور مطمح نظر مکہ میں پرامن داخلہ کو ممکن بنانا تھا جو ایک نبی کے شایان شان ہو۔ مکہ کی یہ پرامن فتح تاریخ عالم کا ایک محیر العقل واقعہ ہے۔

جب آپؐ مکہ معظمہ میں داخل ہو رہے تھے جہاں سے آٹھ سال قبل ناموافق حالات میں ہجرت کر کے مدینہ جانا پڑا تھا تو فاتح ہونے کے باوجود آپؐ کے انکسار کا یہ عالم تھا کہ آپؐ اونٹ پر تشریف فرما تھے تو اتنا جھک گئے تھے کہ آپؐ کا فرق مبارک اونٹ کے کوہان کو لگتا تھا۔ مکہ معظمہ پہنچے تو یہ معرکۃ الآرا خطبہ ارشاد فرمایا جو تاریخ عالم میں اہمیت کا حامل ہے :-

"اللہ ایک ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا اور اپنے بندے کی مدد کی اور اکیلے سارے جتھوں کو شکست دی۔ آج انتقام کا دن نہیں ہے ہر قسم کے فخر اور خون و مال کے دعوے میرے قدموں کے نیچے ہیں۔ اے جماعت قریش! اب تمہاری جاہلیت کے گھمنڈ اور نسب کے فخر کو اللہ نے مٹا دیا۔ تمام انسان

آدم کی اولاد ہیں، جو خاک سے بنے تھے ۔"

آنحضرت صلعم سچے نبی ہیں جن کی رسالت حق پر ہوئی، آپؐ کی انقلابی تحریک کا مقصد دنیا میں صالح معاشرہ قائم کرنا تھا ۔ چنانچہ اپنی زندگی میں اس معاشرہ کی بنیاد ڈال دی ۔ آپؐ نے باکردار افراد کی ایک جماعت تیار کی ۔ اپنے مشن کی بنیاد اس عقیدہ پر رکھی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ قرانی تعلیمات کو ضابطۂ حیات قرار دیا اور ان ہی تعلیمات کی روشنی میں عمل صالح کو رائج کیا ۔

سیرت النبیؐ کا مطالعہ بے پناہ اہمیت کا حامل ہے ۔ مذہبی نقطۂ نظر سے سیرت النبیؐ سے واقفیت ہر مسلمان کے لئے ضروری نہیں تاگزیر ہے ۔ آنحضرت صلعم نے اپنی زندگی کو بطور نمونہ پیش کیا اور کردار کی بلندی کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا ۔ خود قران مجید نے کہا ہے :

" اے بنی نوع انسان تمہارے لئے تمہارے رسولؐ کی زندگی بہترین نمونہ ہے "

اس لئے آپؐ کی مثال مسلمانوں کے لئے شمع ہدایت ہے ۔

دوسرے پیغمبروں اور مذاہب عالم کے بانیوں کے برخلاف جو ماقبل تاریخ دور کے ہیں آنحضرت صلعم ایسے دور سے تعلق رکھتے ہیں جس کی تاریخی تفصیلات بہت واضح طور پر پوری پوری دستیاب ہوتی ہیں اسلام نے تاریخ عالم کو جس طرح متاثر کیا ہے اس سے سب ہی واقف ہیں ۔ تاریخ عالم کے مطالعہ کیلئے بھی آنحضرت صلعم کی سیرت کا گہرا مطالعہ بہت ضروری ہے ۔

مساوات انسانی آنحضرتؐ کی زندگی کے بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے ۔ آنحضرتؐ نے یہ معیار مقرر کیا تھا کہ اللہ کے نزدیک وہی عزت والا ہے جو متقی ہو ۔ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسانوں کو مطیع بنائے ۔ ظاہر ہے کہ اس معیار کی موجودگی میں نسل، خاندان، ذات، عہدہ دولت وغیرہ کی بنیاد پر کوئی شخص بڑا نہیں مانا جاسکتا ۔ اور ایک عام آدمی کو بھی اس کا موقع ملا کہ وہ تقویٰ اختیار کرے اور سوسائٹی میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاسکے ۔ آپؐ نے اپنے غلام حضرت زیدؓ کے ساتھ اپنی اولاد جیسا برتاؤ کیا اور اپنی پھوپی زاد بہن حضرت زینب رضؓ کی شادی ان سے کی حضرت بلالؓ حبشی کے ذمہ ایک اہم خدمت تفویض کی گئی یعنی ان کو مسجد نبویؐ کا موذن مقرر کیا گیا ۔ ایک اہم مذہبی خدمت پر حبشی غلام کو مقرر کرنا عہد جاہلیت کے نقطۂ نظر سے ایک انوکھی بات تھی ۔

آنحضرتؐ نے یہ اصول بھی سامنے رکھا کہ کسی انسان کے لئے یہ درست نہیں کہ وہ دولت کی ذخیرہ اندوزی کرے یا ذرائع دولت کو اپنی ملکیت بنائے ۔ آپؐ نے یہ اصول بھی سامنے رکھا کہ مذہبی پیشوائیت انسانیت کے لئے مضر ادارہ ہے کیونکہ اللہ ہر انسان سے یکساں فاصلہ پر ہے ۔

آپؐ نے اس پر بھی زور دیا کہ صنفِ نازک کے ساتھ انسانی برتاؤ کی اور برابری کے برتاؤ کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ نچلے طبقہ کے عوام کے لئے ان تعلیمات میں بڑی کشش تھی۔ جب یہ تعلیمات عوام میں اپنا اثر پیدا کرنے لگیں تو قریش نے جن کے پاس دولت، طاقت، اثر، کعبہ کی تولیت سب کچھ تھا آپؐ کی سخت مخالفت شروع کی اور اس مخالفت کے لئے جتھہ بندی کی۔ ان تمام کا مقابلہ کرنے کے لئے آنحضرت صلعم کے پاس اگر کچھ تھا تو اس بات کا پختہ یقین تھا کہ جو تعلیمات وہ پیش کر رہے ہیں وہ صداقت پر مبنی ہیں۔

ہجرت سے قبل کا دور جس میں مخالفت انتہا کو پہنچ چکی تھی بڑا ہمت طلب مرحلہ تھا۔ آنحضرت صلعم نے تمام مخالف قوتوں کو پیغمبرانہ شان سے زیر کیا اور اپنی ربانی تحریک کے لئے تاریخ عالم میں ایک مستقل مقام حاصل کر لیا۔

اگر ہم آنحضرت صلعم اور ان کے مشن کے مضمرات سے واقف نہیں ہونا چاہتے تو یہ انسانیت کی بدقسمتی ہے۔ آنحضرت صلعم اور ان کا مشن اس افسوس ناک صورت حال سے بری ہے۔

جو آنحضرت صلعم کے مشن اور ان کی تحریک اسلام کو نہیں جانتے اور اسی لئے نہیں مانتے کہ وہ اس تحریک کے مضمرات کو نہ جانیں اور اس کے فوائد سے انسانیت کو مستفید نہ ہونے دیں تو نہ تو کوئی تعجب کی بات ہے اور نہ افسوس کی۔ لیکن افسوس کی بات تو یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کے نام لیوا بھی زبانی عقیدت اور عقیدہ سے آگے نہیں بڑھتے۔ جب وہ اپنے ذہن ہی میں اس تحریک کے مضمرات اور عالمگیر اثرات کا پوری طرح احاطہ نہیں کرتے تو پھر دنیا کو اس سے کیسے واقف کرائیں گے؟

یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ آنحضرت صلعم کی انسانیت نواز تعلیمات کی اشاعت کے لئے آج سب سے بڑی رکاوٹ خود آپؐ کے پیرو ہیں۔ آپؐ نے اللہ کے اقتدار کو نافذ کرنے کے سلسلہ میں نہایت دانشمندی اور حکمت سے عمدہ قابل عمل اور قابل تقلید تدابیر اختیار کیں۔ یہ تدابیر ان تمام کی ملک ہیں جو ان کو آزمانا چاہتے ہیں۔

لفظ آزمانا ان تدابیر کے لئے موزوں لفظ نہیں ہے کیونکہ ایسے نظریات کو آزمایا جاتا ہے جو بدلتے رہتے ہیں، ان کے نتیجے مفید بھی ہو سکتے ہیں اور مضر بھی۔ کیونکہ ان میں حق و باطل کی آزمائش ہوتی ہے۔ ایسے نظریات وقتی طور پر انسانیت کے لئے مفید ہو سکتے ہیں، پھر ہم دوسرے نظریات کا تجربہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ تدابیر اس طریقے آزمانے کے نہیں برتنے کے ہیں۔ عمل آوری کے ہیں۔ یہ انسانیت کے بنیادی اقدار ہیں جن کی تخلیق حق پر ہوئی ہے۔ اور جو باطل کی آویزش سے پاک ہیں، جو سادہ اصولوں پر مبنی ہیں اور جن پر عمل کرنا انسانیت کی سربلندی کی دلیل ہے۔

اگر انسانیت کے مظلوم اور پسماندہ طبقات کو اس بات کا علم ہو جائے کہ اس محسن اعظمؐ نے

ان کو اوپر اٹھانے اور جائز مقام دلانے کے لئے کیا کیا جتن کئے ہیں اور انسان انسان کے درمیان جو مصنوعی دیواریں کھڑی کی گئیں ہیں ان کو کس طرح منہدم کیا ہے تو یقین ہے کہ یہ طبقات ان کی تعلیمات کی قدر کریں گے اور ان کی تحریک سے استفادہ کر سکیں گے ۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ آنحضرت ؐ کی تحریک یعنی اسلام کے انقلابی اور ترقی پسند رجحانات کو سمجھا جائے اور ان کے مضمرات سے پوری طرح واقف ہونے کی کوشش کی جائے ۔ ہر انقلابی اور ترقی پسند تحریک کے لئے ہر زمانہ میں رکاوٹیں ہوتی ہیں ۔ وقتی اور مقامی اختلافات کے پیش نظر رکاوٹوں کی اشکال بدلتی رہتی ہیں ۔ آنحضرت صلعم کے سامنے مخالف قوتیں کس رنگ میں اور کس طرح آئیں ۔ اور آپؐ نے کس طرح ان کا مقابلہ کیا اور کس طرح آپؐ نے اپنی شاندار تحریک کو کامیاب بنا کر انسان کو ایک بلند مقام عطا فرمایا ۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ اس نقطہ نظر سے آنحضرت ؐ کی سیرت طیبہ کا اور اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے ۔ اسلام کے بعد اور اس کے اثر کے تحت تاریخ عالم ہی میں نہیں ، انسانیت کی تہذیب میں ، انسانیت کے اعتقادات میں ، علم و فلسفہ میں ، بین الاقوامی اور قومی قانون میں ، طرز حکومت اور سیاست میں ، علم و ہنر میں ، غرض کہ زندگی کے ہر شعبہ میں بنیادی اور نمایاں تبدیلیاں واقع ہوئیں ۔ ان تمام تبدیلیوں کی ابتدا اسلامی تعلیمات اور آنحضرت ؐ کی سیرت پاک میں واضح انداز میں ملتی ہیں ۔ اگر ہم ان تبدیلیوں کو آنحضرت صلعم کی سیرت پاک میں تلاش کر کے آج کی دنیا کے سامنے رکھیں تو یہ حقیقی معنوں میں آنحضرت صلعم کی بڑائی اور عظمت کا اعتراف اور ہماری عقیدت کا ثبوت ہوگا ۔

اس نقطہ نظر سے سیرت نبویؐ کا مطالعہ کرنے کے لئے ہر ہر قدم پر قرآن مجید سے مدد لینی ہوگی کیونکہ قرآن مجید کی تعلیمات کو عملاً نافذ کرنا آنحضرت صلعم کی مبارک زندگی کا عین مقصد تھا ۔ ظاہر ہے کہ سیرت النبیؐ بغیر قرآن فہمی کے مکمل نہیں ہو سکتی اور قرآن فہمی آنحضرت صلعم کی سیرت پاک کے حوالوں کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی ۔

□□

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو
(مخدوم)

لیڈی ایولن کبولڈ زینب

سفر نامہ حرمین ۔ مکہ

نماز ظہر کے بعد میرے ڈیرے میں ہل چل مچی ۔ ابن سعود کی اونٹوں کی فوج یعنی موحدین اونچے
اونچے اونٹوں پر سوار سلطان کے لئے جو جبل رحمت کی طرف جا رہے ہیں رستہ صاف کرتے آ رہے ہیں۔

سلطان اس وقت موٹر میں تھے اس وجہ سے میں اس حکمران کی صرف ایک جھلک دیکھ سکی
جس نے اپنی شخصیت اور قوت مقناطیسی سے عرب میں جہاں فرمانروائی نسل شاہی ہونے پر منحصر نہیں ہے
وہ مرتبہ حاصل کر لیا ہے جو آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوا تھا۔

سلطان کے ساتھ دیدارو اور دکھاوے کے متعدد آدمی ہیں ان میں وان ڈرپول صاحب ڈچ بنکر
بھی کچھ کم نہیں ہیں ۔ چند سال ہوئے انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے ۔ ان سے میری ملاقات جدہ کے انگریزی
سفارت خانے میں ہوئی تھی ۔ اس وقت یہ اس شعلہ فشاں سورج میں احرام باندھے ننگے سر ایک خوشنما
اونٹ پر آ رہے ہیں جس کی قرمزی رنگ کی زردوزی کی جھول دھوپ میں چمک رہی ہے ۔ ان کے پیچھے
ایسے ہی شاندار تین سوار اور بھی ہیں ۔ وان ڈرپول صاحب الجزائر میں سکونت پذیر ہیں اور ہر سال حج کیلئے آتے ہیں

ہم نے امام کو نیلے آسمان کے نیچے جبل رحمت کی چوٹی پر کھڑے ہوئے دیکھا ۔ اس کا ایک رخ
نظر آ رہا تھا ۔ اگلے زمانے میں اونٹ پر بیٹھ کر خطبہ دیا جاتا تھا ۔ اب وہ خطبہ جبل دیتے وقت ستون کے
پاس کھڑا ہے اس کی آواز ہم تک نہیں پہنچتی اس لئے ہم عصر کی نماز پڑھتے ہیں اور پھر وہی لبیک پکارتے ہیں

اب سورج غروب ہو رہا ہے ۔ سلطان واپس ہوتے ہیں ۔ ڈیرے اکھڑتے ہیں اور دیکھتے
دیکھتے اونٹوں اور موٹروں پر سامان لاد دیا جاتا ہے ۔ حج کا سب سے بڑا منسک ختم ہو گیا ۔ وہ تمام لوگ
جو میدان عرفات میں جمع ہوئے تھے اب مرتے دم تک حاجی کا لقب استعمال کرنے کے مستحق ہو گئے۔

اب ہم پھر چل رہے ہیں ، اس وقت ہمارا رخ مغرب کی طرف ہے ۔ ہزاروں جانور جو ذبح ہونے
کے منتظر ہیں ان کو دیکھ کر مجھے ترس آ رہا ہے ہر مستطیع مسلمان پر قربانی واجب ہے ۔ سینکڑوں جوان اونٹ
بھیڑ بکرے دن نکلے تک عرفات میں رہتے ہیں پھر ان کو منیٰ لے جاتے ہیں وہاں ایک کھلی جگہ میں جو مسجد خیف

ہے کچھ زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے، ذبح کرتے ہیں۔ چونکہ یہ قربانی ہوتی ہے اس لئے ضرورت ہے کہ حدود حرم ہی میں ذبح کئے جائیں ـــــ تھوڑی دیر میں ہم مزدلفہ پہنچ گئے۔ ہماری موٹریں اونچی جگہ ٹھیر گئیں۔ ہم نے نماز پڑھی۔ کمبل بچھائے اور تاروں بھرے آسمان کے نیچے سو گئے۔

آدھی رات گئے پھر ہم چل کھڑے ہوئے۔ ہم میں سے ہر شخص سات کنکریوں سے مسلح ہو گیا تھا جو ہم نے یہاں کے ریگستان سے چن لی تھیں۔ یہ منیٰ میں شیطان کو ماری جائیں گی۔ چونکہ مقام رجم تک پیدل چلنا چاہیئے اس لئے منیٰ پہنچ کر ہم نے موٹریں چھوڑ دیں۔

مصطفیٰ کی ماں ابھی تک موٹر میں پڑی سو رہی ہے۔ کتنا ہی جھنجھوڑو اٹھنے کا نام نہیں لیتی۔ اس لئے ہم اسے موٹر کی سیٹ ہی پر پڑا چھوڑتے ہیں۔ یہ حج کی پوری مدت سوتی ہی رہی۔ میں نے اسے طواف کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ بڈھی عورت ہے غالباً اس نے اپنے کسی بیٹے کو حج کے لئے اپنا نائب مقرر کر دیا ہوگا۔ ابوبکر (اس کا بڑا بیٹا) اس کو جدے سے لایا ہے اور اب وہ اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ حج کر رہی ہے۔ وہ خود تو سوتی رہتی ہے اور اپنے حج کے مناسک اپنے بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دیئے ہیں۔

ہماری قیام گاہ سے رجم کی جگہ کوئی ایک میل ہے لیکن رات کے وقت آدمیوں کی بھیڑ میں سے آہستہ آہستہ چل کر وہاں پہنچنے میں دیر لگے گی۔ خصوصاً زنانخانے کی غریب عورتوں کو جو کبھی پیدل نہیں چلتیں۔ کچھ دیر میں ہم اس ستون کے پاس پہنچے جو شیطان کے نمودار ہونے کی جگہ بنا ہوا ہے۔ اور ہم بسم اللہ کہہ کر ہم میں سے ہر ایک نے سات سات کنکریاں اس پر پھینکیں۔ یہ رسم سنت ابراہیمؑ ہے جب ان کو اپنے بیٹے کے ذبح کا حکم ہوا تو شیطان نے ظاہر ہو کر ان کو خدا کی عدول حکمی کے لئے ورغلانا چاہا لیکن ابراہیمؑ نے اس کی بات پر توجہ نہ کی اور ایک کنکری اس کی طرف پھینکی اور وہ بھاگ گیا۔

جب ہم واپس ہوئے تو دیکھا کہ مصطفیٰ کی ماں اب بھی سو رہی ہے۔ ہم نے اسے موٹر سے اتار کر منیٰ کے چھوٹے سے مکان میں سونے کے لئے دھر دیا۔ اور خود موٹر میں بیٹھ کر مکہ واپس ہوئے۔ دن نکلے وہاں پہنچ گئے اور صبح کی نماز اور طواف کے لئے سیدھے بیت اللہ گئے۔ یہاں سے فارغ ہو کر ہم اپنی مکہ کی قیام گاہ کو گئے۔ اگرچہ اس مکان کو چھوڑے ہوئے دو ہی دن ہوئے تھے مگر مجھے دو دن بھی سو برس معلوم ہوئے۔ جب میں سیڑھیوں پر چڑھی اجالا ہو گیا تھا۔ سلیمان میرا سوٹ کیس لئے تھا مصطفیٰ مجھ سے بیت اللہ میں بچھڑ گیا تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے احرام اتارا اور سو گئی۔

۶ر اپریل ۱۹۳۳ء۔ جب میں جاگی تو ایک مسکراتی ہوئی چھوکری نے مجھے حج کی مبارکباد دی غسل کر کے ہم نے اچھے کپڑے پہنے اور جوتیاں اور برقعے اوڑھ کر پھر بیت اللہ کو طواف اور سعی کیلئے گئے۔

حرم اس وقت آدمیوں سے بھرا ہوا ہے۔ کوئی حاجی یہاں سو بھی نہیں رہا ہے۔ سب احرام باندھے ہیں اور اب یا تو طواف کر رہے ہیں یا خوش نما نیا لباس پہنے نماز پڑھ رہے ہیں۔ مطوفوں کی بلند آوازوں اور حاجیوں کی عاجزانہ دعاؤں سے بیت اللہ گونج رہا ہے۔

کعبہ پر اب نیا غلاف پڑا ہے۔ یہ اون اور ریشم سے بنا ہوا ہے۔ اس کی پندرہ فٹ بلندی پر زرین کتبے ہیں جو مشرقی خوشنویسی کا سب سے بڑا نمونہ ہیں۔ یہ کتبے دو فٹ سے زیادہ چوڑے ہیں اور دور سے بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔

حج کی گذشتہ رسوم میں سے جو اب باقی رہ گئی ایک محمل بھی تھا یعنی وہ پالکی جو ہر سال مصر سے اونٹ پر آیا کرتی تھی۔ ابتدا میں اس میں مکے کے محتاجوں کے لئے رقمیں اور تحفے تحائف آیا کرتے تھے لیکن بعد میں محمل اس قدر بھاری ہونے لگا کہ اس میں کوئی اور بوجھ لادنے کی گنجائش نہ رہی اور رقموں اور غلاف مکہ کے لئے دوسرے اونٹوں کی ضرورت ہونے لگی۔

غلاف کعبہ میں اٹھارہ سیاہ پردے ہوتے تھے جن کا دبیز کپڑا سوت اور ریشم سے بنا ہوتا تھا اس پر خط نسخ میں آیات قرآنی بنی رہتی تھیں، جس سے کپڑے کی وضع مشجر کی سی ہو جاتی تھی۔ غلاف کے بیچ میں خالص سنہری تاروں سے کڑھے ہوئے کتبے ہوا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ کعبہ کے دروازے کے لئے سنہری اور روپہلی کام کا ایک پردہ آیا کرتا تھا۔ اسے برقع بھی کہا کرتے تھے جس کی مناسبت سے عربی شاعر اپنے گیتوں میں کعبہ کو عروس مکہ لکھتے ہیں۔

چند سال گذرے یہ تجویز کی گئی تھی کہ ہاتھ کا بنا ہوا غلاف موقوف کر کے مشین سے بنایا جائے چنانچہ زر کثیر صرف کر کے کپڑا بننے کے اوزار بھی مانچسٹر سے لائے گئے مگر کامیابی نہ ہوئی اور وہی پرانا طریقہ ہاتھ سے بننے کا قائم رہا۔

(باقی آئندہ)

اٹھارویں صدی کے اواخر میں جب نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو مراد بک نے جامع ازہر کے علماء کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیئے؟ علمائے ازہر نے باتفاق یہ رائے دی کہ جامع ازہر میں "صحیح بخاری" کا ختم شروع کر دینا چاہیئے کہ انجاح مقاصد کے لئے تیر بہدف ہے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ابھی صحیح بخاری کا ختم ختم نہیں ہوا تھا کہ اہرام کی لڑائی نے مصری حکومت کا خاتمہ کر دیا (غبار خاطر ص۱۱۲)

ابو الکلام آزاد

معارف قرآن

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ (۴۸:۵۲)

اللہ کی تسبیح و تحمید کرنے کا حکم ہے جو اصل مقصد زندگی بھی ہے اور مصیبتوں سے بچنے کا علاج بھی۔ اللہ کی حمد کی تسبیح کیا کریں جب کہ آپ کھڑے ہوں

کھڑے ہونے سے مراد سو کر اٹھنا بھی ہو سکتا ہے۔ ابن جریر نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو امام احمدؒ نے حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص رات کو بیدار ہوا اور اس نے یہ کلمات پڑھے تو جو دعا کرے گا قبول کی جائے گی، وہ کلمات یہ ہیں: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ پھر اگر اس نے نماز پڑھنے کا ارادہ کیا اور وضو کر کے نماز پڑھی تو اس کی نماز قبول کی جائے گی۔ (ابن کثیر)

حضرت مجاہد اور ابوالاحوص وغیرہ ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ "حِيْنَ تَقُوْمُ" سے مراد یہ ہے کہ آدمی جب کسی مجلس سے اٹھے تو یہ کہے کہ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ۔

حضرت عطا ابن ابی رباح نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ "تم جب اپنی مجلس سے اٹھو تو تسبیح و تحمید کرو۔ اگر تم نے اس مجلس میں کوئی نیک کام کیا ہے تو اس کی نیکی میں زیادتی اور برکت حاصل ہو گی اور اگر کوئی غلط کام کیا ہے تو یہ کلمات اس کا کفارہ ہو جائیں گے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ "جو شخص کسی مجلس میں بیٹھے اور اس میں اچھی بری باتیں ہوں تو اس مجلس سے اٹھنے سے پہلے اگر وہ یہ کلمات پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ اس کی سب خطاؤں کو جو اس مجلس میں ہوئی ہیں معاف فرما دیں گے ——

وہ کلمات یہ ہیں:

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

(معارف القرآن جلد (۸) صفحہ ۱۸۲ تا ۱۸۶)

محمد شوکت حیات

میر کا جنون
ایک نفسیاتی جائزہ

میر کی شخصیت کی تعمیر میں نسلی اور خاندانی وراثت، مزاج اور ماحول بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ بچپن سے ان تینوں کا اثر میر کی شخصیت پر کافی گہرا رہا۔ اس کا اثر زیادہ راست میر نے خصوصی طور پر محسوس کیا۔ اور اس کے گہرے نقوش بھی ہمیں ملتے ہیں جن میں "قوت مقاومت" اور "انتقام و احتجاج" موجود ہے جن کو میر نے شاعری کے روپ میں پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر محمد حسین کی یہ توجیہ قابل ذکر ہے۔ موصوف میر کی ان امتیازی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "انہوں نے جہاں ظلم و ستم کی بے پایانی کو بیان کیا ہے وہاں پہلو بہ پہلو مظلوموں کے انتقام اور ان کے احتجاج اور ان کی شانِ مقاومت کو بھی بیان کیا ہے۔ میر کی شاعری محض سپردگی کی ہی شاعری نہیں ہے قوت مقاومت اور انتقام اور احتجاج کی شاعری بھی ہے"[1]

مثلاً میر کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ظالم زمیں سے لوٹتا دامن اٹھا کے چل
ہوگا کمیں میں ہاتھ کسو داد خواہ کا

رکھا ہے اپنے تیں روک روک کر ورنہ ؎ سیاہ کر دیں زمانے کو ہم جو آہ کریں

---

1. پروفیسر محمد حسین۔ دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر ص ۴۹

ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو۔ ایس وی یونیورسٹی۔ تروپتی۔ آندھرا پردیش

میر کو یہ (ABNORMAL) رویہ ورثہ میں ملا تھا خود میر کے والد اور چچا شروع ہی سے نقطۂ اعتدال سے ہٹے ہوئے (ABNORMAL) نظر آتے ہیں۔ اور میر کے چچا خلل دماغ سے ہی وفات پا چکے تھے۔ اس طرح سے ان کی طبیعت میں آوارگی کی ان کو ورثہ میں ملی تھی اور وہ بے حد حساس ہو گئے تھے۔ [illegible] پر اگر انہوں نے [illegible] سے گھبرا کر لینا اور قنوطیت کے رنگ میں ڈوب جانا اپنے طرز پسند کر لیا اس کا ثبوت میر کے اس شعر سے ہو جاتا ہے ؎

یہ جو مصیبت کہ ہمیں خوش [illegible] طرب کے جاوے
نہ ہوا کہ ہم ہو [illegible] پہ لیا [illegible] ان

میر کے ایک نفسیاتی ناقد پروفیسر حامدی کاشمیری نے میر کے بارے میں یوں لکھا ہے

"بچپن سے لے کر تا دم مرگ ان کی زندگی درد و داغ کی ایک طویل اور جگر گداز داستان ہے۔ یتیمی، بے کسی، محرومی، نامرادی اور تنگ دستی نے ان کی نفسیاتی زندگی کو بری طرح متاثر کیا۔ ان کو قدم قدم پر جن حالات کا سامنا کرنا پڑا وہ مضبوط سے مضبوط انسان کے لئے بھی ذہنی اختلال یا اعصابی شکست کا باعث ہو سکتے تھے۔ میر کی زندگی میں بھی ایک وقت ایسا آیا جب وہ ان حقائق کے سامنے ٹھہر نہ سکے۔ وہ مخبوط الحواس ہو گئے۔ یہ عارضہ جنون ان کے اعصابی نظام کی درہمی کو ظاہر کرتا ہے" [۲]

پروفیسر حامدی کاشمیری کا یہ جائزہ مولوی عبدالحق کے اس نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا ہے کہ میر نے ساری زندگی مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کیا۔

"میر صاحب کی زندگی مصائب و آلام کا ایک سلسلہ تھی جس کا تار بچپن سے لے کر مرتے دم تک کبھی نہ ٹوٹا" [۳]

پروفیسر حامدی کاشمیری نے ایک اور جگہ اس طرح سے لکھا ہے۔

"انہوں نے فرائیڈ کے خیال کے مطابق انا اور فوق الانا کی [illegible] تحت الشعوری خواہشوں اور مسرتوں کو ارتقائی بلندی سے گذار کر شعری شکل عطا کی

۲۔ پروفیسر حامدی کاشمیری۔ کارگہ شیشہ گری ص ۴۵ و ۴۶

۳۔ مولوی عبدالحق، مقدمہ انتخاب کلام میر، ص ۱۲

انہوں نے جس تخیلی دنیا کی دریافت کی اس کے لئے شعوری تقاضے کی کاوش
گوہر نایاب ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے شخصی تحفظ کی پناہ گاہ بھی بن گئی تھی

میر کے ذہن میں ماحول اور معاشرت کی پابندیوں نے ایک کشمکش کی چنگاری پیدا کر دی جو آگے چل کر آتش فشاں کی صورت میں منتقل ہوئی۔ ان پابندیوں کی وجہ سے میر جنسی عشق کی لذت حاصل نہ کر سکے۔ اس وجہ سے طرح کی الجھنوں میں مبتلا رہے۔ میر اس ذہنی کشمکش (CONFLICT) کو دبائے رہے لیکن کشمکش کی شدت کی وجہ سے وہ روکنے کے باوجود دب نہ سکی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

جگر جور گردوں سے خوں ہو گیا
مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا

اس شعر میں الفاظ "رکتے رکتے" کو خاص اہمیت ہے اور کشمکش (CONFLICT) اور دباؤ (SUPRESSION) کو ظاہر کرتا ہے جس کا نتیجہ بالآخر جنون ہے۔

میر کا جنون ان حالات اور تربیت کا ایک ایسا فطری نتیجہ تھا جس کا ذکر وہ مثنویوں غزلوں اور مجلس میں کرتے ہیں۔ میر کے قلبی اضطراب کے لئے علاج کئے گئے اور میر کی روایت کے مطابق خواجہ محمد حسن کی بیوی کی جو ان کی رشتہ دار تھیں علاج کا انتظام کیا گیا۔ اسی طرح میر موسم خزاں میں صحت مند ہو گئے۔

اس جنون کے عالم میں میر کو چاند میں ایک شکل نظر آتی تھی۔ اسی لئے انہوں نے محبوب کیلئے ماہ، ماہتاب، چاند، مہ پارہ، اس قسم کے الفاظ کا استعمال کیا ہے جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے

اس ماہ چاردہ کا چھپے عشق کیوں کہ آہ
اب تو تمام شہر میں مشہور ہو گیا۔

واسطے جس کے تھے ہم آوارہ —
ہاتھ آیا میرے وہ مہ پارہ

منہ کی جھلک سے یار کے بے ہوش ہو گئے —
شب ہم کو میر پرتو مہتاب لے گیا

۴۔ پروفیسر حامدی کاشمیری، کار گہ شیشہ گری، ص ۹۶

ـ صورت کو چاند پر گر پڑی

تو کو یکی جلی سی دل پہ پڑی

پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی کی نظر میں میر کا یہ جنون" مدافعانہ" (DEFENCEWE) نوعیت کا تھا۔ میر کے جنون نے ان کی شخصیت کو مفلوج نہیں کیا۔ بلکہ اس جنون نے ان کی ذہنی صلاحیتوں کو اور بھی اجاگر کر دیا۔ جو آگے چل کر جہاں شاعری میں ان کی عظمت اور وسعت کا باعث بنا اور جس نے ایک نئی طرح کی جنیا ڈالی۔

میر کی پریشانی اور پراگندگی ان کی شاعری کی جان ہے جس کو انہوں نے فطری طور پر اپنے ماحول اور ذاتی حالات سے قبول کیا تھا۔ چنانچہ میر فرماتے ہیں ؎

دو بھی حال گیا ہے سارے مجموعہ دیوان میں

سیر کر تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا

؎ چشم و دل و جگر یہ سارے ہوئے پریشاں

کس کس کی تیرے غم میں حالت تباہ دیکھوں

دراصل میر کی پریشانی ان کے عہد کا عطیہ تھا جس میں وہ خود بھی شامل ہیں۔ اس عہد کے سخت سیاسی اور سماجی انتشار، سماجی تبدیلیوں، سیاسی خلفشار نے میر کے مزاج سے ہم آہنگ ہو کر ان کے کلام میں جو درہمی پیدا کی وہ محض ان کی ذات کا المیہ نہیں ہے۔ بلکہ ان کے عہد کا عطیہ بھی ہے۔ یہ اضطراب ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر گیا۔ اس کا اظہار ذیل کے اشعار سے ہو جاتا ہے۔ ؎

جوں برگ ہائے لالہ پریشان ہو گیا

مذکور کیا ہے اب جگر لخت لخت کا

؎ آوارگان عشق کا پوچھا جو میں نشان

مشت غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

ـ شاید کہ کام صبح تک اپنا نہ کھینچے میر

احوال آج شام سے درہم بہت ہے یاں

ـ تیرے فراق میں جیسے خیال مفلس کا

گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری

پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی ایک لطیف فنی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور غم و یاس کے مفہوم و کیف میں جو فرق ہوتا ہے اس کو نمایاں کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

میر کا غم اکثر کہا جاتا ہے یہ بات صحیح ہونے کے باوجود قدرے گمراہ کن ہے۔ عام طور سے غم اور مایوسی کے درمیان میں ایک رشتہ فرض کر لیا گیا ہے۔ اور مبتلائے غم کو فطری طور پر مبتلائے یاس بھی سمجھا جاتا ہے۔ میر کا غم لطف و کیف کا حامل ہے۔ اس میں محرومی کے اوپر افسوس اور حسرت ملتی ہے جبکہ اس میں یاس کی طرف رجحان نہیں ملتا۔[5]

میر کی عشقیہ شاعری میں تمام حسرت انگیز ضرور ہے لیکن یاس انگیز نہیں ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وصل و ہجراں یہ جو دو منزلیں ہیں راہ عشق کی
دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا۔

واسطے جس کے تھا میں آوارہ
ہاتھ آئے مرے وہ مہ پارہ

میر کے ہاں عشق کا ایک خاص طور اور اس سے ایک شدید وابستگی ملتی ہے، جو ان کے دل و دماغ میں فطرت نے پیوست کر دیا تھا۔ ان کی یہ وابستگی [illegible] کی شدید سرشاری اور سرمستی کی غمازی کی طرف لے جاتی ہے۔ بیداری کی حالت میں ان کے آگے اگر ان کے محبوب کا نام لے لیا جائے تو اس کا ردعمل میر کے نزدیک یوں ہوتا ہے ؎

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا۔

اور کبھی میر نیند میں تڑپ کر جاگ اٹھتے ہیں۔ یہ ایک ایسی قلبی ارتباط کی کیفیت ہے جو بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہے اس کی ایک اور صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ؎

۵۔ پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی: تنقید و تحقیق، [illegible] ۱۹۸[illegible]

سے — یہ نگاہ اس کی چشم سے لگ کر خواب میں دیکھی تھی
صبح ہونے سے اٹھا تو سامنے ہوتا تھا

میر کا عشق مہذب ہے جس میں انہوں نے بے خودی کے خاص رنگ کو اپنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ سے

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

ڈاکٹر مسیح الزماں نے میر کے تغزل کی خصوصیات پر تبصرہ کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے

"میر کی غزل احساس و شعور فن و تجربہ کا وہ تاج محل ہے جس میں اٹھارویں صدی کی شہری تہذیب اپنی محرومیوں اور آرزوؤں، شادکامیوں اور حشر سامانیوں کے ساتھ موجود ہے"۔ ۲۶

۲۶۔ ڈاکٹر مسیح الزماں ۔ مرتبہ کلیات میر ۔ حصہ دوم ص (ب)

عبد العزیز عرفان

ھندوستان میں فارسی مرثیہ کا آغاز و ارتقاء

ایک جائزہ

مرثیہ عربی لفظ ہے۔ عربی لفظ رثا سے مشتق ہے جس کے معنی رونے کے ہیں۔ اس لئے مرثیہ اس صنف سخن کو کہتے ہیں جس میں کسی مرنے والے کی صفات حسنہ بیان کر کے اور حزن و ملال کا اظہار کیا جائے۔ اور سانحہ مرگ پر بھی اظہار ماتم کیا جائے۔ مولانا حالی اس کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں "مرثیہ کے معنی ہیں کسی کی موت پر غم کا اظہار اور اس کے محاسن بیان کر کے اس کا نام دنیا میں زندہ کرنا۔" انگریزی زبان کی صنف "Elegy" پر مرثیہ کا اطلاق ہوتا ہے جس کے معنی نوحہ۔ مرثیہ نظم ماتمی بحر میں ہوتے ہیں۔ بقول انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں "ایلجی" کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ "مرثیہ وہ حزنیہ اور الم انگیز مختصر نظم ہے جو کسی عزیز یا معزز شخص کی وفات پر یا غم و درد کے ایک عام احساس کے ماتحت کہی جاتی ہے۔ گویا مرثیہ درد و غم کا سیلاب بہاتا ہے۔ مرثیہ موضوعی صنف سخن ہے اور شاعر کے داخلی جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

مرثیہ کی قدامت مسلم ہے۔ قدیم مورخین حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا کا پہلا مرثیہ گو قرار دیتے ہیں۔ طبری نے حضرت آدم علیہ السلام کو پہلا مرثیہ گو قرار دیا ہے۔

مصباح اللغات ص ۳۱۸ ۔ ۲۔ مقدمہ شعر و شاعری خواجہ الطاف حسین حالی ص ۱۹۳

STUDENT'S STANDARD ENG-URDU DICTIONARY. ABDUL HAQ. Page 357

۳۔ ENCYCLO paedia VOL. VIII Page 344

تاریخ طبری فارسی ترجمہ نولکشور ۱۲۹۱ھ ص ۲۹

معلم پرلیشد ہائی اسکول آکوٹ ضلع اکولہ ۔ مہاراشٹرا

مرثیہ کی قدامت کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی رقمطراز ہیں۔ مرثیہ کو دنیا کی قدیم ترین صنف اور نسل انسانی کی مشترک صنف کلام قرار دینا شاید غلط نہ ہوگا ۳؎ اس کی قدامت کا ثبوت توریت میں بھی ملتا ہے جس میں مختلف انبیاء کے نوحوں کا بیان ہے توریت کا باب و بھی بھی مرثیہ [illegible] ہے۔ توریت صحیفۂ قدیم کا ایک باب ہے ۴؎ مرثیہ کی قدامت کا اظہار مولانا شبلی نعمانی نے موازنۂ انیس و دبیر میں کیا ہے شبلی نعمانی رقمطراز ہیں شاعری جو فارسی اور اردو شاعری کا مرثیہ ہے اس میں شاعری کی ابتدا مرثیے سے ہوئی ۵؎ فارسی مرثیہ کی بنیاد عربی مرثیہ پر رکھی گئی ہے۔ عرب شعراء اپنے مراثی کے لئے مشہور تھا۔ عربی مرثیہ ہر خاص و عام میں مقبول صنف تھی؛ فارسی شاعری نے بھی عربی مرثیہ کی تقلید شروع کی اور فارسی مرثیہ اپنی ترقی کی راہ پر گامزن ہوگیا۔

تیسری صدی ہجری میں فارسی زبان نے موجودہ فارسی کی شکل اختیار کرلی تھی۔ شاعروں نے اسی زبان میں شعر کہنے شروع کئے۔ فارسی زبان میں مرثیے کا آغاز ساسانی دور سے ہوتا ہے۔ رودکی کو سب سے پہلا مرثیہ گو شاعر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن تمام شرائط و شکل و صورت کے لحاظ سے غزنوی دور میں مرثیہ کا آغاز ہوتا ہے۔ فرخی کا مرثیہ "مرثیہ سلطان محمود" مکمل اوصاف کا حامل ہے۔ اسے اپنے دور کا کامیاب ترین مرثیہ گو کہا جاتا ہے۔ اس دور کا دوسرا کامیاب اور مشہور ترین شاعر فردوسی گذرا ہے۔ شاہنامہ فردوسی کا شاہکار ہے۔ اس نے اپنے بیٹے کی موت پر پر درد مرثیہ کہا ہے۔ اسی طرح سہراب کا مرثیہ ماں کی زبانی بڑے ہی دردناک انداز میں کہا ہے۔ غزنوی دور کے شعراء لاہور میں مسعود سعد سلمان کا نام آتا ہے۔ مسعود نے سب سے زیادہ غمگین اور درد انگیز مرثیہ اپنے بیٹے صالح کی موت پر لکھا ہے۔ ان کے یہاں تڑپ اور درد و غم پایا جاتا ہے۔

سلاطین دہلی کا عہد ۱۲۰۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ امیر خسرو فارسی زبان کے ہندستانی بلند پایہ شاعر تھے۔ مرزا غالب انہیں ہندستان کے سخنوروں میں مسلم الثبوت تسلیم کرتے ہیں۔ آپ نے سات بادشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا۔ تغیر و تبدیلی سے واقف تھے۔ بادشاہ ان کے قدردان تھے

۳؎ دبستان دبیر۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی۔ ص ۶۷

۴؎ OLD TESTAMENT P.758

۵؎ موازنۂ انیس و دبیر۔ مولانا شبلی نعمانی ص ۱

اثر سے خاص حیثیت رکھتے ہے۔ بے انتہا محبت کی وجہ سے مرثیوں میں بلا کے اثر درد وغم پایا جاتا ہے۔ انہوں نے دالد کی جدائی میں مرثیہ لکھا جس کا مطلع ڈاکٹر وحید مرزا نے نقل کیا ہے ۹

سیف از سرم برفت و دلم لبس دونیم ماند

دریای من روان شد و دردم یتیم ماند

کبھی وہ نانا کی وفات پر گریہ وزاری کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی ملتان کی تباہی اور شہزادہ محمد کی شہادت کا دردناک واقعہ بیان کرتے ہیں چنانچہ جب خسرو نے یہ مرثیہ بوسر دربار پڑھا تو ایک کہرام مچ گیا۔ بلبن اتنا رویا کہ اسے بخار ہو گیا اور اسی صدمہ کے باعث چند دنوں میں وفات کر گیا۔ ۶۹۸ھ میں ان کی ماں اور چھوٹا بھائی رحلت کر گئے۔ خسرو نے دونوں کا مرثیہ "مجنون ولیلیٰ" میں پیش کیا ہے ۱۰ اس مرثیہ کا ذکر دیگر مورخین اور مصنفین نے بھی کیا ہے ۱۱ اس مرثیے کے بارے میں جیلانی کامران رقمطراز ہیں "امیر خسرو کا ذاتی دکھ ماں اور بھائی کے انتقال کی عالمگیری کے باعث میرا اور ہم سب کا دکھ بن جاتا ہے ۱۲ ڈاکٹر رضازادہ شفق مثنوی "مجنوں ولیلیٰ" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اس مثنوی کا سب سے پُر اثر حصہ وہ اشعار ہیں جن میں شاعر نے اپنی ماں اور اپنے بھائی کی وفات کا ماتم کیا ہے" ۱۳ ڈاکٹر وحید مرزا ۱۴ اور مولانا شبلی نعمانی ۱۵ نے بھی اسے پردرد اور پُراثر کہا ہے۔

بادشاہوں میں علاءالدین خلجی، قطب الدین مبارک شاہ، ناصرالدین محمود کے مرثیے اور ساتھ بیٹے صاحبی کا مرثیہ قابل تحسین ہیں۔ خسرو نے ان لوگوں کے علاوہ پرندوں کا بھی مرثیہ کہا ہے۔ یہ واقعی ایک دردانگیز اور رقت انگیز مرثیہ معلوم ہوتا ہے۔ اور شاعر کے اعلیٰ جذبات اور

---

۹ امیر خسرو۔ ڈاکٹر وحید مرزا ص ۳۹

۱۰ مجنوں ولیلیٰ۔ مولانا حبیب الرحمان خان شیروانی ص ۱۴۲

۱۱ شعرالعجم جلد دوم مولانا شبلی ص ۱۱۲

۱۲ صحیفہ سہ ماہی لاہور۔ جولائی ۱۹۶۲ء ص ۶۴ ۱۳ تاریخ ادبیات ایران مبدا التیا رضا ص ۲۸۵

۱۴ امیر خسرو ڈاکٹر وحید مرزا ص ۱۶۵

۱۵ شعرالعجم جلد دوم مولانا شبلی نعمانی ص ۱۱۴

احساسات کا عکس اس میں جھلکتا ہے بتایا ۱۶۲ امیر خسرو ایک کامیاب اور عظیم ترین مرثیہ گو شاعر گذرے ہیں۔ دوسرے مرثیہ گو شاعر امیر حسن سنجری ہیں جنہیں "سعدی ہندوستان" کہا جاتا ہے آپ کا نثری مرثیہ بہت ہی دردانگیز ہے۔ جو خان شہید کی وفات پر لکھا تھا۔ امیر حسن کا مرثیہ نثری ہونے کے باوجود درد و غم کے جذبات سے بھرپور ہے۔

دور مغلیہ تاریخ کا ایک عہد زرین تھا۔ فارسی زبان مغلوں کی دفتری زبان تھی، شاہان مغلیہ علم و ادب کے دلدادہ تھے۔ شاعروں کی قدر کرتے تھے۔ فیضی نے بڑے ہی جاں گداز مرثیے کہے ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی ہندوستان کے فارسی شعراء میں صرف خسرو اور فیضی کو اہل زبان سمجھتے ہیں ۱۶۳ عبدالغنی فیضی کو دوسرا بڑا فارسی گو شاعر کہتے ہیں ۱۶۴ دوسرے نظیری نیشاپوری کے یہاں خانوادگی مرثیے اور تشریفاتی مرثیے ملتے ہیں۔ خانوادگی مرثیے میں اپنے بھائی بیٹے اور بیوی کے مرثیے قابل ذکر ہیں۔ جو نظیری کے دیوان میں شامل ہیں ۱۶۵ تشریفاتی مرثیے میں اکبر اعظم اور شہزادہ مراد کے مرثیے شامل ہیں۔ بقول مولانا شبلی شہزادہ موصوف کے مرثیہ میں دلی جذبات نظر آتے ہیں ۱۶۶ سید صباح الدین عبدالرحمان نے بھی اسی مرثیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "نظیری کو شہزادہ مراد سے بڑا قلبی تعلق تھا۔ شہزادے کی موت پر اس نے بڑی دلسوزی کے ساتھ مرثیہ لکھا ہے" ۱۶۷ اسی طرح عرفی کے مرثیوں میں گوناگوں خصوصیات موجود ہیں۔ براؤن عرفی کو اپنی صدی کا مشہور شاعر بتلاتے ہوئے کہتا ہے "ہر چند کہ عرفی کی قدر و منزلت ترکی اور ہندوستان کی بہ نسبت اس کے وطن میں کم کی گئی لیکن عرفی اپنی صدی کا سب سے زیادہ مشہور و مقبول عام شاعر ہے ۱۶۸" عبدالقادر بدایونی نے بھی اس بیان کی تائید کی ہے

---

۱۶۲. امیر خسرو، ڈاکٹر وحید مرزا ص ۲۰۸

۱۶۳ شعرالعجم. جلد سوم، مولانا شبلی نعمانی ص ۲۸

۱۶۴ HISTORY OF PERSIAN LANGUAGE AND LITERATURE AT THE MUGHAL COURT. M.A. GHANI . P.39

۱۶۵. دیوان نظیری نیشاپوری تہران. ص ۴۶۶

۱۶۶ شعرالعجم. جلد سوم، مولانا شبلی ص ۱۲۶

۱۶۷ بزم تیموریہ ص ۳۹۲

۱۶۸ A LITERARY HISTORY OF PERSIA . BROWN Vol III P. 241

عبدالقادر بدایونی کے مرثیے سوز و غم اور جدت و ندرت کے حامل ہیں۔ مولوی محمد حسین آزاد نے شاعر کے واقعات کے ساتھ مرثیے کے اشعار بھی تحریر کئے ہیں بیٹے اور بھائی کی موت کا ذکر کیا ہے۔[۲۳]

شاہجہانی عہد کا مشہور شاعر ابو طالب کلیم تھا۔ اس کا مختلف رنگ تھا۔ بشارت نوحہ کے ساتھ اپنے فن کا بھی مظاہرہ کرتا ہے۔ جدت فکر اور مضمون آفرینی کی چاشنی ہوتی ہے حزیں بھی پر درد نوحے لے کر منظر عام پر آئے ہیں۔ عبدالقادر بیدل اور زیب النساء کے ہمعصر تھے۔ ڈاکٹر رضا زادہ شفق انہیں ہندستان کا آخری بڑا فارسی گو شاعر کہتے ہیں۔ ان کا ذکر اپنی کتاب تاریخ ادبیات ایران میں کرتے ہیں۔ نعمت خاں عالی نے طنزیہ مرثیے لکھ کر نام روشن کیا آپ کی ستم ظریفی مشہور ہے۔ حزیں نے اپنے چچا کی وفات پر مرثیہ لکھا ہے[۲۴] بعد میں ۱۱۲۷ھ میں والد ماجد اور ۱۱۲۹ھ میں والدہ ماجدہ داغ مفارقت دے گئیں۔ ان صدموں سے حزیں بہت غمگین ہو گئے تھے خود کہتے ہیں۔

" ازیں حوادث مرا دماغ شوریدہ شد ولیسر برون دراں منزل دشوار گشت "[۲۵]

اس لئے آپ کا قلم حقیقت نگاری سے قریب نظر آتا ہے۔

مغلیہ عہد کے آخری اور ممتاز ترین شاعر مرزا غالب تھے۔ انہیں فارسی میں کافی دستگاہ تھی۔ اس لئے آپ کے مرثیے اس فن کے مکمل نمونے ہیں۔ شہزادہ فرخندہ شاہ کا مرثیہ رثا گوئی کی بہترین مثال ہے۔ اسی وجہ سے مولانا حالی نے مرزا کے اس مرثیے کو نظیری کے مرثیے "مرثیہ سلطان مراد" پر فوقیت دی ہے۔ جو نہایت موثر اور دلخراش مرثیہ ہے[۲۶] ان کا مقابلہ ایرانی فارسی شعراء جامی، فیضی، امیر خسرو، وغیرہ سے کیا جا سکتا ہے۔ بقول عبدالماجد دریا بادی " حضرت غالب کا مرتبہ فارسی شاعروں میں یقیناً بہت بلند ہے۔" اس لئے مرزا کے بارے میں یہ شعر بالکل صادق آتا ہے ؎

۲۳۔ دربار اکبری، مولوی محمد حسین آزاد ص ۴۸۴

۲۴۔ تذکرہ حزیں، اصفہان ص ۲۱

۲۵۔ کلیات حزیں۔ تاریخ احوال خود نوشت ص ۴۴

۲۶۔ یادگار غالب۔ خواجہ الطاف حسین حالی۔ ۱۹۲۴ء ص ۲۹۴

چو تو رفتی کجاست خاطرِ بطر و معانی
بتو ہیچ کس نماند تو بہ ہیچ کس نہ مانی [۲۴]

مرزا غالب کی وفات پر مرزا الفت نے ایک پر درد مرثیہ کہا ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے اس مرثیہ کا ذکر اپنے مقالہ میں کیا ہے [۲۵]۔ آج ہندستان میں فارسی زبان و ادب کی طرف بہت ہی کم توجہ دی جا رہی ہے۔ جس کی وجہ سے فارسی زبان دم توڑ رہی ہے۔ اس کے ارتقاء کی رفتار تھم سی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے بعد چند دیوانے فروز نظر آتے ہیں جو اس زمانے میں بھی فارسی شعر و ادب کی آرائش زلف میں معروف ہیں۔ لیکن ان کے یہاں شاعرانہ سرمایہ موجود نہیں ہے۔

حاصل کلام یہ کہ اگر ہندستان میں مسعود سعد سلمان فارسی مرثیے کی روایت کے آغاز کنندہ تھے تو غالب اس روایت کے خاتم۔

---

[۲۴] ادبی خطوطِ غالب مرزا محمد عسکری ص ۳

[۲۵] رسالہ آج کل۔ اردو ماہنامہ ستمبر ۱۹۸۲ء ص ۷

حرفے از لبش شنیدہ ام

خواجہ سجاد حسین، بڑے باپ مولانا حالی کے بڑے بیٹے تھے۔ خواجہ صاحب بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ ان کی ہنسی میں ان کا وقار، ان کی زندہ دلی ان کی مہر و محبت اور ان کا خلوص قوس قزح کے رنگوں کی طرح جھلکتا تھا۔ بیگم صالحہ عابد حسین نے خواجہ صاحب کا تذکرہ صرف ایک ہی جملہ میں بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ فرماتی ہیں:

"میں نے آج تک ان کے سوا کسی میں یہ صفت نہیں دیکھی کہ محض ہنسی میں اس کی شخصیت کی خوبیاں سمٹ آئیں ——"

قاضی جلیل احمد

چکنائی اور امراض قلب

(ذیل کا مضمون ڈاکٹر JAMES LE FANU کے ایک آرٹیکل RUNNING TO FAT سے ماخوذ ہے جو لندن کے ہفتہ وار OBSERVER کی ۸ر جولائی ۱۹۸۸ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا)

یہ بات اب مسلمات کے درجے میں گنی جانے لگی تھی کہ چکنائی یعنی FATS اور خصوصاً ایسی چکنائیاں جو حیوانات سے حاصل کی جاتی ہیں مثلاً گھی، مکھن، گوشت وغیرہ کا زیادہ استعمال کرنا امراضِ قلب کو دعوت دیتا ہے۔ حالانکہ اس ادعا کی تائید میں دراصل کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ اس کے برخلاف وسیع پیمانوں پر کیے جانے والے کئی تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کسی بھی قسم کی چکنائی کے استعمال کا آبادی کی ایک بڑی اکثریت پر سرے سے کوئی اثر ہی نہیں یعنی نہ ان کے استعمال سے عارضۂ قلب میں مبتلا ہونا لازمی ہوتا ہے اور نہ ان کا ترک کرنا ان امراض سے محفوظ رہنے کی گیارنٹی ہے۔

امراضِ قلب اور چکنائی کے تعلق کے پس منظر میں جو نظریہ کارفرما ہے وہ یہ ہے اگر آپ بجز چکنائی SATURATED FAT کا زیادہ استعمال کریں گے تو اس کی وجہ سے آپ کا جسم بڑی تعداد میں کولسٹرول (cholesterol) پیدا کرنے لگ جاتا ہے۔ کولسٹرول ایک قسم کی چکنائی ہے جو کلیجی میں پیدا ہو کر خون میں شامل ہونے لگتی ہے اور پھر جیسے گندی نالیوں میں بہنے والی چکنائیاں رفتہ رفتہ نالیوں کے بہاؤ کے راستے کو تنگ کرکے بالآخران کو بند کرکے ان کی شکست و ریخت کا موجب ہوتا ہے۔ خون کی نالیوں میں بھی کولسٹرول کے جماؤ کی وجہ سے دورانِ خون میں رکاوٹ پیدا ہونے لگتی ہے جو بالآخر خون کی رگوں کے پھٹ پڑنے

۶۔ کولسٹن روڈ ۔ لندن E7 ، یو۔کے

کا باعث ہوتی ہے۔ نیز جوں جوں یہ مادہ فاسد یعنی کولسٹرول شریانوں میں جمع ہوتا چلا جاتا ہے وہ امراض قلب کو جنم دینے کا باعث ہوتا جاتا ہے۔

مرتکز چکنائی SATURATED FATS اور امراض قلب کے تعلق کا یہ نظریہ ایک امریکی ڈاکٹر ANCEL KEYS کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس صدی کے پانچویں دہے میں دنیا کے سات ملکوں میں امراض قلب کے تعلق سے اعداد و شمار جمع کیے جس کے نتیجہ میں ان پر بعض دلچسپ حقیقتیں روشن ہوئیں۔ ان سات ملکوں کی قطار میں سرفہرست امریکہ تھا۔ جہاں امراض قلب کی شرح سب سے زیادہ تھی۔ اور سب سے نچلے پائیدان پر جاپان تھا جہاں کی شرح سب سے کم تھی۔ ڈاکٹر KEYS نے جب مختلف ممالک کے زیر تجربہ افراد کی غذائی اعداد پر نظر ڈالی تو انہوں نے دیکھا کہ جاپان کے زیر نظر افراد مرتکز چکنائیوں کا کم ترین استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے خون میں کولسٹرول کی مقدار سب سے کم ہے۔ اور جس کے نتیجہ میں قلب کی بیماریاں بھی بہت کم ہیں۔ اس کے برخلاف امریکہ کے زیر تجربہ لوگ گھی مکھن اور بیف کا سب سے زیادہ استعمال کرنے والے تھے جس کی وجہ سے ان کی شریانیں گندی نالیوں کی طرح کولسٹرول سے اٹی ہوئی تھیں اور نتیجۃً ان میں امراض قلب کی شرح سب سے زیادہ تھی۔

بات دل کو لگنے والی تھی اس وجہ سے میڈیکل پروفیشن نے اس کو بخوشی قبول کر لیا۔ پھر بڑے زور و شور کے ساتھ بیف مکھن اور گھی کے خلاف پرچار شروع ہو گیا۔ لیکن جب ڈاکٹر KEYS کی تحقیقات پر گہری نظر ڈالی گئی تو ان کے اخذ کردہ نتائج میں کئی اسقام نظر آئے۔ مثلاً ڈاکٹر KEYS نے جن پانچو جاپانیوں پر تجربات کئے تھے وہ سب کے سب سمندر میں مچھلیاں پکڑنے والے مچھیرے تھے۔ اس کے برخلاف امریکہ کے دو ہزار پانچو زیر تجربہ افراد ریلوے کے مزدور تھے۔ ظاہر ہے کہ ان دو گروہوں کی طرز زندگی میں غذا کے علاوہ بھی بیشمار اور اختلافات تھے لہٰذہ صرف غذا کو مورد الزام ٹھہرانا کیوں کر درست ہو سکتا تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ابتدائی تحقیق میں دراصل اس کے سواء اور کچھ ثابت نہیں ہوا تھا کہ معاشرہ جتنا غیر متمدن ہوگا۔ اس میں دل کی بیماریاں اسی پیمانے سے کم ہوں گی۔ مثلاً جب اسکاٹ لینڈ اور سوئڈن کا امراض قلب کے تعلق سے مقابلہ کیا گیا تو سوئڈن میں اسکاٹ لینڈ کی بہ نسبت دل کی بیماریاں پانچ گنا زیادہ پائی گئیں حالانکہ دونوں ملک والوں کے دونوں میں کولسٹرول کی مقدار تقریباً یکساں تھی۔ البتہ سوئڈن اسکاٹ لینڈ کی بہ نسبت زیادہ متمدن ملک شمار ہوتا ہے۔

لیکن چونکہ بار بار نظریاتی شہادت اس امر کی کافی تھی اس لئے قرار دیا گیا کہ امراض قلب سے بچنا ہو تو مرتکز چکنائیوں سے حتی الامکان پرہیز کرو یعنی گھی کے بجائے تیل کھاؤ اور بیف کی جگہ مرغ و ماہی۔ ویسے ترکاریوں کا استعمال افضل ہے۔ لیکن دلیل تا حال اس امر کی کوئی نہیں تھی۔ ایسا حتمی ثبوت صرف اسی صورت میں مہیا ہو سکتا تھا۔ اگر کافی طویل مدت تک ادھیڑ عمر کے لوگوں کی غذا میں مرتکز چکنائیوں کے جزو کو کم کر کے ان کے نتائج کی جانچ کی جاتی چنانچہ ۱۹۷۰ء میں انہی خطوط پر تجربے شروع ہوئے۔ یہ تجربے ۶۰ ہزار مردوں پر کئے گئے۔ مردوں پر اس لئے کہ عورتوں میں قلب کے امراض نسبتاً کم پائے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑے پیمانے پر تجربات ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کی سرپرستی میں یورپ کے پانچ ملکوں کے ۴۸ ہزار آدمیوں پر ہوئے۔ دوسرا تجربہ امریکہ کے ۱۲ ہزار آدمیوں پر کیا گیا۔ چھوٹے پیمانے پر ایک اور تجربہ ناروے میں ہوا۔ ان تجربات کے نتائج کی رپورٹ گزشتہ سال شائع کی گئی۔ خلاصہ ان تجربات کا یہ ہے کہ تجربہ کے لئے مساوی تعداد رکھنے والے دو گروپ بنائے جاتے تھے۔ ایک گروپ INTERVENTION گروپ کہلاتا تھا اور دوسرا گروپ CONTROL گروپ۔ انٹروینشن گروپ کے لوگوں کو ترغیب دی جاتی تھی کہ وہ اشیائے خورد و نوش کی خریداری، پکوان کی ترکیب، اور کھانے پینے کے مروجہ طریقے میں ڈاکٹروں کی ہدایات کے مطابق تبدیلیاں کریں۔ اور ان ہدایات کی کما حقہ پابندی کی جائے۔ اسی طرح سگریٹ کے استعمال سختی کے ساتھ ممانعت تھی۔ اور جو لوگ سگریٹ نوشی ترک کرنے سے عاجزی ظاہر کرتے ان کی مدد ہپناٹزم کے عمل کے ذریعہ ترک کرانے کی سعی کی جاتی۔ اس کے برخلاف کنٹرول گروپ پر کوئی امتناع نہ تھا۔ انہیں پوری آزادی تھی کہ جس طرح اب تک زندگی بسر کرتے آئے تھے اسی طرح زندگی بسر کرتے رہیں۔ انہیں کسی قسم کی کوئی ہدایت نہیں دی گئی۔ یہ عمل بارہ سال تک جاری رہا۔ ماہرین ان بارہ سالوں میں برابر تبدیلی کو نوٹ کرتے رہے۔ بارہ سال کے بعد پہلے تجربات کی جو رپورٹیں شائع ہوئیں۔ ان کے مطابق امراض قلب سے متاثر ہونے کی شرح دونوں گروپوں میں برابر تھی۔ البتہ سویڈن کے چھوٹے سے تجربہ میں یہ بات ثابت ہوئی کہ جن لوگوں کی غذا میں مرتکز چکنائی کم کی گئی تھی ان میں دوسرے گروپ کی بہ نسبت امراض قلب کی شرح کم تھی۔ لیکن یہ تجربہ صرف بارہ سو آدمیوں پر کیا گیا تھا۔ اس کے لئے جن اشخاص کو تجربہ کے لئے منتخب کیا گیا تھا ان کا تعلق ایک خاص طبقہ سے تھا جس کا تناسب آبادی میں ۵ فیصد سے زیادہ نہ تھا۔ اور یوں بھی ان کے خون میں کولسٹرول کی مقدار زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ انہیں جس حد تک

سے مزید چکنائیوں کا پرہیز کر دیا گیا تھا، اس کی ہر ایک سے توقع کم ثابت ہے۔

ان تجربات کے علاوہ جس میں ایک خطیر رقم اور عظیم مشاغل صرف ہوئی ایک اور تجربہ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ امراض قلب پر غذا کا کوئی اثر نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ گذشتہ ۱۵ سالوں کے اعداد و شمار سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ امریکہ میں ان پندرہ برسوں میں امراض قلب کا تناسب ایک چوتھائی گھٹ گیا ہے باوجودیکہ کسی خاص عمر یا صنف سے وابستہ نہیں ہے بلکہ ہر عمر اور صنف میں اتنی ہی کمی پائی گئی ہے۔ حالانکہ امریکیوں کے کھانے پینے کی عادتوں میں کوئی انقلابی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ ان تجربات سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مرکبہ چکنائی کے استعمال میں معتدبہ کمی سے بعض لوگوں کو جن کے خون میں کولسٹرول کی مقدار زیادہ ہے فائدہ پہنچ سکتا ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ محض پرہیز ہی سے ان کا کام چل جائے۔ بلکہ کولسٹرول کو کم کرنے والی ادویات کا استعمال بھی لازمی ہے۔ ان لوگوں کو چھوڑ کر باقی لوگوں کے لئے مرکب چکنائی کا پرہیز قطعاً غیر ضروری ہے۔

ان تجربات کے منظر عام پر آتے ہی یورپ کی ڈیری انڈسٹری نے اپنے کس بل دکھانے شروع کر دیے ہیں کل تک یہ لوگ جیسے اپنے وجود سے بھی شرمندہ تھے اپنی مصنوعات یعنی گھی، پنیر اور مکھن کی تشہیر سے بھی گریز کرتے تھے اور سارے بازار میں مارجرین کا بول بالا تھا جو بناسپتی گھی کی طرح موم اور دیگر نباتاتی تیلوں سے بنائی جاتی ہے اور جس کے ذائقہ کو بعض کیمیائی اجزا کی ملاوٹ کے ذریعہ مکھن کے قریب لانے کی کوشش کی جاتی ہے اور تو اور کریم کے خلاف تعصب اتنا بڑھا تھا کہ آئسکریم بھی دودھ کی کریم کی بجائے ان ہی تیلوں سے بنائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان سے نئے نئے یہاں آنے والوں کو یہاں کی آئسکریم نہیں بھاتی۔ لیکن اب آہستہ آہستہ گوشت، مکھن اور گھی کا بول بالا ہونے لگا ہے۔ یہی نہیں بلکہ دودھ کی آئسکریم بھی بازار میں آنے لگی ہے۔ □□

لوگ کہتے ہیں بدلتا ہے زمانہ سب کو
مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں
(اکبر الہ آبادی)

ڈاکٹر سید خواجہ معز الدین

بخار

ہم اکثر و بیشتر ڈاکٹر کے پاس بخار کے لئے رجوع ہوتے ہیں۔ جسم کے نارمل سے بڑھے ہوئے درجۂ حرارت کو بخار کہتے ہیں۔ بخار کوئی مرض نہیں ہے جیسا کہ اکثر خیال کیا جاتا ہے۔ بخار ایک شکایت اور علامت ہے جو چند ایک امراض میں ظاہر ہوتی ہے۔

(Thermoregulatory) تھرمو ریگولیٹری نامی عمل جسم کے درجہ حرارت کو نارمل حدود میں رکھتا ہے۔ اس عمل کے ذریعہ جسم میں جتنی حرارت پیدا ہوتی ہے اتنی ہی خارج بھی کی جاتی ہے جس کی وجہ سے جسمانی درجہ حرارت نارمل حدود سے بڑھ نہیں پاتا۔ جب جسم میں زیادہ حرارت پیدا ہوجاتی ہے تو یہ عمل اس زائد حرارت کو خارج نہیں کر پاتا جس سے بخار آجاتا ہے۔ (PYROGENS) نامی کیمیائی اجزاء جسم میں زیادہ حرارت پیدا کرتے ہیں۔ ہمیں بخار اکثر بیماریوں میں انہیں کی وجہ سے آتا ہے۔ اس کے علاوہ درجہ حرارت کو قابو میں رکھنے والے عمل کے بیکار ہونے پر بھی بخار آتا ہے۔ اس بخار کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ جسمانی درجہ حرارت مسلسل بڑھتا رہتا ہے جسے HYPER PYREXIA کہتے ہیں۔

ہمارے ملک میں بخار کی عام وجہ متعدی امراض ہیں۔ ان میں وائرس (VIRUS) کی وجہ سے ہونے والی بیماریاں جیسے فلو، زکام، انفلوئنزا اور ششش میں چھوت کی بیماریاں پیش پیش ہیں۔ اکثر حالات میں بخار کی وجہ طبی معائنہ سے معلوم ہوجاتی ہیں۔ بعض وقت بخار کی وجہ معلوم نہیں ہوتی ایسے بخار کو پی یو او (PYREXIA OF UNKNOWN ORIGIN) کہتے ہیں۔ بخار عموماً دو تین دنوں میں کم ہوجاتا ہے۔ لیکن جو بخار پانچ دنوں سے زائد ہے اس کی صحیح تشخیص کے لئے چند ایک معائنوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

۲۳-۱-۱۴۱، چار مینار ایسٹ، حیدرآباد (500002) اے پی

۹۶٫۸ تا ۹۹ ڈگری فارن ہیٹ یا ۳۵٫۹ تا ۳۷٫۲ ڈگری سنٹی گریڈ، جسم کا نارمل درجہ حرارت ہے۔ چوبیس گھنٹوں میں جسمانی درجہ حرارت میں ایک تا دو ڈگری فارن ہیٹ کی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ صبح کے اوقات میں درجہ حرارت کم رہتا ہے۔ شام اور رات میں دن بھر کی تھکان کی وجہ سے جسمانی درجہ حرارت میں ایک ڈگری فارن ہیٹ کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ جسمانی درجہ حرارت مسلسل اور زیادہ بڑھا ہوا رہنا دماغ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتا ہے۔ جسمانی درجہ حرارت کا ۱۰۵ فارن ہیٹ یا ۴۱ ڈگری سنٹی گریڈ سے تجاوز کرنا دماغ کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے۔

جسم کا درجہ حرارت تھرمامیٹر سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ بڑے لوگوں کے لئے تھرمامیٹر کو منہ میں زبان کے نیچے رکھا جاتا ہے۔ جبکہ بچوں کے لئے سہولت کی خاطر تھرمامیٹر بغل میں رکھا جاتا ہے۔ تھرمامیٹر کو کم از کم ایک منٹ تک رکھنا چاہئے۔ آج ایسی کیمیائی پٹیاں ملتی ہیں جو جلد پر رکھنے سے درجہ حرارت بتلاتی ہیں۔ بغل اور جلد سے معلوم کیا ہوا درجہ حرارت اصل جسمانی درجہ حرارت سے ایک ڈگری فارن ہیٹ یا آدھا ڈگری سنٹی گریڈ کم ہوتا ہے۔

بخار کی وجہ سے دل کی دھڑکن اور تنفس میں اضافہ ہوتا ہے۔ جسمانی درجہ حرارت میں ایک ڈگری فارن ہیٹ کے اضافہ سے دل کی دھڑکن میں (۸) بڑے لوگوں کیلئے اور (۱۲ تا ۱۵) بچوں کے لئے فی منٹ کا اضافہ ہوتا ہے۔ چند امراض میں یہ اضافہ نہیں پایا جاتا۔ بلکہ دل کی دھڑکن میں کمی واقع ہوتی ہے۔ ایسے امراض میں قابل ذکر میعادی بخار ہیں جس میں ٹائیفائیڈ شامل ہیں۔
جسمانی درجہ حرارت میں فی ڈگری فارن ہیٹ کے اضافہ سے تنفس میں ۲ تا ۳ فی منٹ اضافہ ہوتا ہے
بخار کی شدت مرض کی سنگینی کو ظاہر نہیں کرتی۔ معمولی سا مرض جیسے فلو میں بخار کافی شدت سے آتا ہے۔ جسمانی درجہ حرارت ۱۰۴، ۱۰۵ ڈگری فارن ہیٹ تک بڑھ جاتا ہے۔ جبکہ دوسرے کئی امراض میں بخار صرف ۹۹ تا ۱۰۰ ڈگری فارن ہیٹ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر تپ دق کو پیش کیا جا سکتا ہے۔
بچوں میں جسمانی درجہ حرارت کو نارمل حدود میں رکھنے کا عمل بہتر طریقے سے کام نہیں کرتا جس سے بچوں کا جسمانی درجہ حرارت کبھی بڑھ جاتا ہے تو کبھی یکدم سے کم بھی ہو جاتا ہے۔ اسی لئے دوران بیماری بچوں میں بخار کے علاوہ دیگر شکایتوں اور علامتوں پر توجہ دینی چاہئے جیسے غذا کا حاصل نہ کرنا، سست پڑنا، کھیل کود میں حصہ نہ لینا، چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرنا وغیرہ۔

بعض بخار سردی یا جاڑے سے شروع ہوتے ہیں۔ جسم میں جراثیم یا ان کی طرف سے پیدا کردہ کیمیائی اشیاء یا پھر خارجی پروٹین سے جسم کا درجہ حرارت یکدم سے گر جاتا ہے۔ جسم اپنے درجہ حرارت کو نارمل

بڑھانے کے لئے زیادہ حرارت پیدا کرتی ہے۔ جو جاڑے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ مریض کپکپاتا ہے اوڑھانے کے لئے کہتا ہے۔ اس کے دانت بجنے لگتے ہیں۔ ہاتھوں اور پیروں میں کپکپی ہونے لگتی ہے۔ اس طرح کی کیفیت کوئی پندرہ تا تیس منٹ برقرار رہتی ہے۔ اس کے بعد مریض کا درجۂ حرارت بڑھنے لگتا ہے۔ مریض اوڑھنے ہٹانے کے لئے کہتا ہے۔ گرمی کی شکایت کرتا ہے۔ بڑھا ہوا جسمانی درجہ حرارت پسینے تک برقرار رہتا ہے۔ یا پھر بذریعہ پسینہ بخار اتر جاتا ہے۔ اس طرح جاڑے سے شروع ہونے والے بخاروں میں ملیریا، نمونیا اور پیشاب کی نالیوں میں عفونت کی بیماریاں قابل ذکر ہیں۔

بحالت بخار جسم کے تمام اعضاء کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔ اسی لئے بخار کے دوران آرام کرنا چاہئے۔ بخار سے جسم میں استحالی عمل بڑھ جاتا ہے جس سے مریض کو دوران بخار زیادہ قوت اور وٹامن درکار ہوتے ہیں۔ لہٰذا مریض کی غذا میں پروٹین، کیلوریز اور وٹامن کی زیادہ مقدار ہونی چاہئے۔ بخار میں ہاضمہ متاثر رہتا ہے۔ اکثر متلی رہتی ہے۔ قے بھی ہو سکتی ہے۔ خراب ہاضمہ، متلی اور قے کے پیش نظر بخار میں سیال اور جلد ہضم ہونے والی غذائیں استعمال میں لائی جانی چاہئیں۔ دودھ، ہریرہ، ساگودانہ، گلوکوز، ہارلکس، بورن ویٹا اور ایسی ہی دوسری اشیاء کا زیادہ استعمال کرنا چاہئے۔ دودھ کو اچھی طرح سے ابال کر بالائی کے بغیر پینا مفید ہے۔

بڑھے ہوئے جسمانی درجہ حرارت کو کم کرنے کے لئے جسم سے پانی بشکل پسینہ خارج ہوتا ہے۔ اسی لئے اکثر بخار پسینہ آنے کے بعد کم ہو جاتا ہے۔ پسینے کے ذریعہ بخار کے دوران پانی کے علاوہ چند ایک معدنیات بھی جسم سے خارج ہوتے ہیں۔ ان میں نمک پیش پیش ہے۔ پانی بذریعہ پسینہ خارج ہونے اور پانی کے کم استعمال سے قارورہ کم اور گہرے رنگ کا آتا ہے۔ پیشاب میں جلن بھی رہتی ہے۔ لہٰذا دوران بخار مریض کو پانی وافر مقدار میں دیا جانا چاہئے۔ برف کا پانی دینا مناسب نہیں ہے۔ اس لئے کہ حد سے زیادہ ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے مریض زائد مقدار میں استعمال نہیں کر پاتا اور آہستہ آہستہ چسکیاں لیتا ہوا ہوا پیٹ میں جاتی ہے جس سے پیٹ پھول جاتا ہے۔ بخار میں عموماً پانی اور غذا کے کم استعمال سے قبض رہتا ہے۔ پانی کے زائد استعمال یا پھر قبض کشا دواؤں سے اس شکایت پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

مریض کو بخار کے ساتھ ساتھ چند دوسری شکایات بھی لاحق ہوتی ہیں۔ سر، کمر اور پیٹھ میں درد، آنکھوں میں جلن، اعضاء شکنی، نیند کا نہ آنا، منہ کا مزا تبدیل رہنا، تشنگی وغیرہ جیسی شکایات رہتی ہیں۔ جو بخار کے کم ہونے کے ساتھ دور ہو جاتی ہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے بخار ایک علامت ہے جو چند امراض میں ظاہر ہوتا ہے۔ بخار کی وجہ کا علاج کیا جانا چاہیئے۔ لیکن اکثر بخار کم کرنے والی دوائیں جنہیں ANTI PYRETICS کہتے ہیں استعمال کی جاتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مختلف اوقات میں جسمانی درجۂ حرارت کی کیفیت سے مرض کا پتہ چلتا ہے۔ صحیح تشخیص اور علاج کے لئے بخار کم کرنے والی دواؤں کے استعمال کی بجائے ہر چار گھنٹے بعد جسمانی درجہ حرارت معلوم کریں اور ایک چارٹ میں درج کریں

تاریخ	۸ ساعت صبح	۱۲ ساعت دوپہر	۴ ساعت سہ پہر	۸ ساعت شب	رات میں اگر نیند سے بیدار ہوں

بخار کی وجہ معلوم ہونے کے بعد صحیح سمت میں علاج ہوتا ہے۔ احتیاطاً بخار کو ۱۰۲ ڈگری فارن ہیٹ سے زیادہ بڑھنے نہ دیا جائے۔ صاف کپڑے یا تولیہ کو گیلا کر کے جسم پر رکھنا اور پونچھنا چاہیئے۔ مریض کو گرم کمبل میں لپیٹ کر نہیں رکھنا چاہیئے۔ ٹھنڈی جگہ ہلکے پھلکے اور نرم کپڑے مفید رہتے ہیں۔ چند ایک بیماریوں کو بخار کی زیادتی سے دور رکھتے ہیں جنہیں دواؤں سے قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ بڑھے ہوئے جسمانی درجہ حرارت سے دماغ کو ناقابل تلافی نقصان پہونچتا ہے۔ ان امور کے پیش نظر بخار کم کرنے والی دواؤں کا استعمال حق بجانب ہوتا ہے۔

□□

ہم دشمن بھی یکجا ہوں تو الفت ہو ہی جاتی ہے
یہ وہ ہے مل بیٹھنا ایسا محبت ہو ہی جاتی ہے
(داغ دہلوی)

انیس چشتی

مراٹھی ادب شناسی (مسلسل)

لکشمن مانے کی "اپرا"

ـبہ حیاتو ہمات: رسم و رواج کا چکر اور فرضی اعتقادات کسی بھی قوم کے ضمیر کو نہ صرف یہ کہ
ـا کر دیتے ہیں بلکہ بڑی حد تک مردہ بھی کر دیتے ہیں۔ کسی ترقی یافتہ معاشرے میں ان اوہام و
یا گذر ممکن نہیں۔ اوہام دراصل ایک قسم کا میٹھا زہر ہے جو کسی معاشرے کو اندر ہی اندر کھاتا چلا
ہے۔ اپنی برادری کے مسدود العقل ہونے کے امکانات کو مصنف نے بغیر کسی رازداری اور تبصرے
ـا کتاب میں کئی جگہوں پر بیان کیا ہے۔ اس کے بچپن کے ایک وہمی واقعہ کا متن و
جمہ قارئین کی دلچسپی کے لئے یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

"...... دن غروب کے قریب پہونچ چکا ہوگا۔ بھوبھا کے ساتھ پانچ چھ مرد آئے
تھے۔ ماں نے چائے بنانے کے لئے کہا۔ نانی (چچی) نے چائے بنا کر دی۔ سب لوگوں نے
پیا۔ میں سبھوں کو پہچانتا تھا...... دونوں باتوں کی ترنگ میں تھے۔ اتنے میں با اور چچا شروں
ـا رکھے آئے۔ لوگ جم چکے تھے۔ با نے جلدی کی۔ جلد بیٹھیں کرا چکے تھے۔ چاولوں کی پوٹلی باندھی۔ سینی
دراتی کو ایک ٹوکری میں ٹھونسا۔ نمک، مرچ، تیل، پوجا کا سامان، سب باندھا۔ باندھی کی گٹھری اور
چلنے کے لئے کہا۔ اس نے سارا سامان سر پر رکھا۔ با نے دیو کے نذرانے کا سامان لیا۔ ایک
ـا دیا لیا۔ کنکی کا چھوٹا گولا چھوٹے طباق میں رکھا۔ ہاتھ میں دراتی لی۔ اس نے وہ گولا کام
ـا بازو کو پھینکا۔ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتے ہوئے سب لوگ نیچے کی طرف سرکنے نکلے۔ با نے
ـے کہا۔

"پیچھے پلٹ کر کوئی نہ دیکھے۔ کچھ رہ گیا ہو تو رہنے دو۔ پیچھے دیکھنا نہیں"

---

۴۲۰ - کیداری روڈ - پونے ۴۱۱۰۰۱ - مہاراشٹرا

سارے مرد خاموشی سے ایک کے پیچھے ایک بھیڑوں کی طرح سیاہ فام اندھیرے میں چل رہے تھے۔ میں چچا کے پیچھے بکرے کو ہنکاتا ہوا چل رہا تھا۔ میرے پیچھے بابا ہرے رام، رام نام کی رٹ لگائے چلا آ رہا تھا۔ پیچھے کیوں نہیں دیکھنا چاہیے؟ دل میں خیال آ رہا تھا لیکن کس سے پوچھا جائے؟ سب میت میں شریک ہونے والوں کی طرح چپ چاپ چلے جا رہے تھے۔

چاروں طرف اندھیرے کا راج تھا۔ آنکھوں میں انگلی ڈالنے پر بھی کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اس پر یہ کہ پیروں میں کچھ نہ تھا۔ ٹھوکریں لگ رہی تھیں، کانٹے ٹوٹ رہے تھے۔ 'ارے ماں' 'ماں' کے نام سے میں چیختا — بابا کہتا "کیا ہوا ہے؟" کچھ کہنے کی نہ ہمت، نہ اجازت۔ دبی آواز میں کچھ کہتا۔ بابا ڈپٹتا۔

"آنکھیں پھوٹی ہیں کیا؟ چچا کے پیچھے پیچھے چل"

آس پاس آدمی نہ آدم زاد۔ رات ڈھلے کو آئے جیسے لگے۔ چاروں طرف اندھیرا گھپ: رات کے کیڑے بول رہے تھے سارا ماحول بھیانک، ڈراؤنا لگتا تھا۔ اندھیرے میں بکرا بھی ٹھیک سے نہ چلتا تھا۔ یوں چکراتا جیسے موت دکھائی دے رہی ہو۔ کوئی بھی بولتا نہ تھا۔ سب سے آگے چچا تھا۔ ذرا کھلا میدان دیکھ کر چچا رک گیا۔ اس کے رکتے ہی سب رک گئے۔ وہ آگے سے ہی بولا —

"ارے بھیا، یہاں جھاڑ ہے، آڑ ہے.... اور کھلی جگہ بھی ہے..... یہیں رکیں کیا؟ گاؤں سے بہت دور آ نکلے ہیں ہم"۔ بوجھ اتار لیا گیا۔

بابا نے دیاسلائی رگڑی۔ اجالا ہو گیا۔

"قندیل ساتھ لاتے تو...." میں نے کہا

پھوپھا بگڑ گیا۔

"ابے چپ! یوں نہیں کہتے"

بابا نے اس وقت تک کروندے کا جھاڑ توڑ کر آدھا کر لیا تھا۔ اچھی طرح سے آڑ کر دی۔ ڈبے میں میٹھا تیل بھرا، اور جلا دیا۔ دھندلا سا اجالا پھیل گیا۔ سب لوگ اجالے کے قریب اکٹھا ہو گئے بابا نے پتھر کے دس بارہ ٹکڑے اکٹھے لئے۔ پانی سے دھوئے۔ ایک قطار میں سجا کر رکھ دیئے۔ ان پر سیندور گلال ڈالا۔ چوڑیاں رکھیں۔ چولی کا کپڑا، سپاری، پان، لیموں، سب سج چکا۔ پھوپھا نے ناریل چھیل دیا تھا۔ پھٹاک سے ناریل پھوٹا۔ سودیو اگائی۔ کافور سلگایا۔ نہایت عقیدت سے دیوتا کو ہاتھ جوڑے.....

تنے میں جنگل میں گیدڑ چیلایا۔ بدن پر کانٹے ابھرتے محسوس ہوئے۔ میں دیوتا کی جانب پیٹھ کر آدمیوں کے بیچ میں بیٹھ گیا۔

چچا نے بکرا زمین پر گرا دیا۔ کسی غیر مرد نے چھری پھیرنی چاہیئے۔ بابا نے چچا سے کہا۔ وہی غیر مرد آیا ہوا تھا۔ چچیا نے چھری پھیری۔ خون کھل کھل کرنے لگا۔ خون کی پہلی پچکاری ہی پھوٹی۔ بابا نے اندھیرے میں ہی پکڑ لی۔ دیوتا کے سامنے چھڑکا۔ بکرے کی کھال چھلی گئی۔ اور بابا نے چیڑا نکالا۔ سری اور کھر دیوتا کے سامنے رکھ دیئے۔ چچیا اور پھوپھا نے پتے بچھے۔ چچا اندھیرے میں ہی لکڑیاں جمع کیں۔ آگ لگا دی۔ اور وہ دہکنے لگی۔ اس وقت ذرا اچھا لگا۔ کافی اجالا پھیل چکا تھا۔ سرد ہوا جسم کو ٹھٹھراے دے رہی تھی۔ میں چولہے کی طرف سرک گیا۔ ذرا اوب لگ رہی تھی۔ لوگ آپس میں گپیں ہانک رہے تھے۔ اور گاؤں میں کتے بھونک رہے تھے۔ بابا نے سارا گوشت چولہے پر چڑھا دیا۔ چچا نے روٹیاں بنائیں۔ بابا روٹیاں سینک رہا تھا۔ سب دھیان اس بات پر تھا کہ گوشت کب گلے گا۔ چچیا بولا۔

"نرم ہے ابھی گل جائے گا۔ ذرا سپاری کا ٹکڑا ڈال دے..... بابا نے چھالیہ کے اُبال میں ڈال دیئے۔ آگ دہک رہی تھی۔ پیٹ میں کوّے بول رہے تھے۔ بابا نے پاکھیلا۔

"نانی کو ساتھ لاتے تو؟"

میں نے پوچھا۔ بابا نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ارے عورتوں کو ساتھ نہیں لاتے۔ دیوتا کو نہیں جچتا!"

سب کام مرد ہی کر رہے تھے۔

گوشت پک گیا۔ کلیجی کا سرا دھاگے میں باندھ کر اُبال میں ڈالا۔ اُسے نکال کر تھالی میں روٹی اور اسی کلیجی کا تودا رکھا۔ لوٹے میں پانی لیا اور نیچے جھک کر بابا نے نذرانہ چڑھایا۔

تھالیاں چار ہی تھیں۔ دو دو ــــ چار چار تھالیاں دیکھ کر بیٹھ گئے۔ سالوں بیت شریا نے نذرانے کے لئے لایا ہوا پرساد سب کو دیا۔ تجھے رات کو لوٹنا ہے۔ اس لئے نہیں دیا گیا۔ سب نے شراب کی بوتل خالی کر دی۔ اور تھالیوں پر تھالیاں خالی ہونے لگیں۔ شوربہ مزیدار تھا۔ یہیں ختم ہو جانا چاہیئے۔ اس میں سے کچھ واپس نہیں لے جایا جا سکتا۔ مزے گوشت ہی کھایا۔

منڈلی اول قول بکنے لگی...... میں خاموشی سے کھا رہا تھا۔ میں تنہا ہوش میں تھا۔ باقی
سب مدہوش تھے۔

کھانا ہو چکا۔ با نے سب کچھ صاف کیا۔ بتی کا تیل ختم ہونے کے قریب تھا۔ با نے جلدی کی۔ سارا سامان لپیٹا گیا۔ اور سب لوگ گرتے پڑتے راستے پر ہو لیئے..... اماوس کی رات ...... مجھے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اندھا اور سہما ہوا۔ آنکھیں پھاڑنے پر بھی کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ با نے مجھے کندھے پر لاد لیا اور ہم سب ٹیلے کے کنارے پہونچے ـــــ سارے لوگ جلدی جلدی پانی میں اترنے لگے...... سب نہائے۔ مجھے ننگا کر دیا۔ نصیب! مجھے نہلایا نہیں۔ بدن پر رتی بھر کپڑا نہ تھا۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ لیکن نیند غائب تھی ـــــ جھپکی لگتی لیکن سردی سے بھاگ جاتی ـــ"

جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں، لکشمن ملنے کی یہ سوانح ایک سماجی ناول بھی ہے۔ اگر مصنف کتاب کے دیباچے میں یہ اعلان نہ کرتا کہ:ـــ

"کتاب سے متعلق کیا لکھوں! جس طرح سے جیا / جیسی گذری، جو تجربہ اٹھایا، دیکھا ہر ہر بات ویسی ہی لکھتا گیا۔ پھر ایک بار دوبارہ جیا جیتا رہا۔ کسی پر الزام دھرنا یہ مقصد نہیں تھا۔ لالچ کے باوجود بھی متعدد بار خود کو سنبھالتا رہا۔ بعض جگہوں پر بعض شخصیتوں کے نام بدلے ہیں، وہ بھی محض مجبوراً ـــ اس کے علاوہ (پوری کتاب میں) میرا اپنا سرمایہ کچھ بھی نہیں ہے...."

تو یہ کتاب مکمل ناول کا روپ اختیار کر سکتی تھی۔ اس میں ناول کے تمام لوازمات موجود ہیں جو ایک کامیاب ناول کے لئے ضروری ہیں۔ پلاٹ، کردار، مکالمہ، منظر نگاری، اسلوب اور مصنف کے اپنے سماج کا مخصوص فلسفۂ حیات ـــــ ناول میں فلسفۂ حیات کو بالواسطہ یا بلاواسطہ دونوں طریقوں سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہر مصنف کا اپنا فلسفۂ حیات جدا ہوتا ہے۔ فلسفۂ حیات مسائل سے ہم آہنگی کے بعد رفیق بن جاتا ہے۔ اور اس پر سے ناول نگار کی اجارہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ اور وہ سماجی اور بڑی حد تک عوامی بن جاتا ہے۔ یہی فلسفۂ حیات اور پلاٹ ہم آہنگ ہو کر ناول اور ناول نگار دونوں کو آفاقی اور بعض حالات میں ابدی بنا دیتا ہے۔ موضوع، پلاٹ، اور فلسفۂ حیات کا باہمی ربط بڑی جان جوکھوں کا کام ہے۔ چھوٹے فن کاروں کے ہاں جو اتفاق سے اپنی علمی کم مائیگی کے باوجود اس بات پر مصر ہیں کہ ہماری کاوش کو شاہکار تسلیم کیا جائے اور ہمارے

اول کی ظلمیندی بھی کی جائے۔ دراصل یہ بیچارے نہیں سمجھ پاتے کہ ان کا پلاٹ عام معیار کے نقطۂ
ادے نیچے ہے۔ ان کے کرداری ڈھانچے اپنی پوری ذہانت کے ساتھ خود کلامی کے کرب میں مبتلا
دہ فلسفۂ حیات ناول نگار کی عدم واقفیت پر ماتم کناں ہے ——— طوائف سے مسلم
عاشرے نے کب ہمدردی کی۔ یہ طبقہ ہمیشہ سے قابل گردن زدنی سمجھا جاتا رہا ہے۔ لیکن امراؤ جان
ا کو ابدی بنانے کے لئے مرزا ہادی رسوا کی سوجھ بوجھ، فن کارانہ چابکدستی اور ناول کے تمام اجزاء
کے باہمی ارتباط کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ شامل ہے۔

لکشمن مانے کی اُپرا اس لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ اس میں فرانسیسی ناولوں کی طرح
کرداروں کی بھرمار ہے۔ یہ اُپرا کے لئے ضروری بھی ہے اور ایک مجبوری بھی۔ مصنف کی یہ آپ
تین دہائیوں سے زیادہ اس کی عمر کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ جس میں دوران سفر لاتعداد
وں، بستیاں اور شہر ہیں۔ اس کا لاتعداد افراد سے سابقہ ہے۔ اور ہر فرد اپنی جگہ ایک کہانی
ہے ——— لکشمن مانے کے کردار آپ کو پریشان نہیں کرتے۔ ورنہ بعض ناولوں میں کرداروں کو
رکھنا اور ان کے ذمہ دیے گئے کاموں کو ذہن میں رکھنا قاری کو دماغی الجھن میں مبتلا کر دیتا ہے
کرداروں کی وجہ سے ناول کی نمو میں ایک قسم کا بوجھل پن پیدا ہو جاتا ہے۔ اُپرا کے کردار
بڑی سادگی ہے اور اور چونکہ وہ خود کسی نہ کسی وجہ سے پریشان ہیں اس لئے قاری سے ہمدردی
مستحق ہیں۔ پوری کتاب میں آپ کو سماجی عدم استحکام اور پریشانی کی ایک عام فضا ملے گی۔ یہ
ماحول ہمارے ملک کے معاشی عدم توازن پر ماتم کناں ہے۔ معاشرے کا ایک مفلوج بازو پورے
شہرے کی الجھن اور بےچینی کا باعث ہے۔ اور یہ عام بےچینی ہم خود اس وقت پورے ملک میں
رہے ہیں۔ اُپرا اس بڑی بےچینی کے صرف ایک کونے کا عکس ہے۔

زبان کے معاملہ میں مصنف بہت محتاط ہے۔ کسی مخصوص رپورتاژ کے دوران اس نے
اروں کی زبان سے ادا ہونے والے کیکاڑی زبان کے جملے من وعن لکھ دیے ہیں۔ اور قوسین
ان کا مراٹھی ترجمہ بیان کر دیا ہے۔ کیکاڑی زبان ایک بولی بھاشا ہے۔ اس سے مصنف نے
ام لیا ہے۔ جب وہ مراٹھی کرداروں کی موجودگی میں لیکن ان سے چھپا کر کوئی بات کہنا چاہتا ہے
طریں سے کیکاڑی زبان میں بات کرتا ہے۔ کیونکہ مراٹھی جاننے والے کیکاڑی نہیں سمجھتے۔ مصنف
ھر میں کیکاڑی زبان بولی جاتی ہے لیکن بستی میں مراٹھی مستعمل ہے۔ اس لئے مصنف کی برادری
سانی (بائی لنگول) ہے۔ لیکن اس کا مراٹھی لہجہ پیا ہے اور دیہاتی طرز کی مراٹھی بولنے والوں

جیسا ہے بلکشن ملا نے پوری کتاب میں لگاتار اسی لہجے کا استعمال کیا ہے۔ مکالموں کے دوران بھی اور اپنے بیان میں بھی۔ لیکن انتہائی غیر محسوس طریقے پر جب وہ کولہاپور اور ستارہ جیسے شہروں میں بڑے لوگوں کا تذکرہ کرتا ہے تو اپنا روایتی لہجہ چھوڑ کر خالص کتابی مراٹھی استعمال کرتا ہے جسے عام زبان میں پوتیری (پونہ کی) مراٹھی کہتے ہیں۔

لکشمن مانے ترقی پسند اور خاص طور پر ساد ھنا تحریک سے متاثر ہے۔ جس کا مقصد ہے سماجی مساوات، عورتوں کی آزادی اور پسماندہ طبقے کی ترقی ـــــــ اس تعلق کی بھی وجوہات ہیں۔ اس تحریک نے مصنف کا برے وقتوں میں ساتھ دیا ہے۔ اس طبقے کے علاوہ مسلمانوں نے بھی، چونکہ ان کے ہاں سماجی طبقاتی نظام نہیں ہے، مصنف کا ساتھ دیا ہے۔

اپنی پسند کی شادی کرنے کے بعد اور اپنی برادری، اپنے دوستوں اور اپنے گاؤں سے فرار کے بعد لکشمن مانے جب ایک عدد سوٹ کیس اور نئی دلہن کے ساتھ بے یارو مددگار ستارہ پہونچتا ہے تو اس کے پاس نہ تو مکان ہے نہ جان پہچان نہ پھوٹی کوڑی پیسہ ـــــــ اجنبی شہر اور سر چھپانے کے لئے ہتھیلی بھر جگہ کی ضرورت۔ اس کس مپرسی اور بے روزگاری کے عالم میں اسے کم از کم ایک کھولی چاہیئے۔ تاکہ وہاں اپنی نئی دلہن شستی کو رکھ سکے۔ شستی جس نے ماں باپ کے ہاں نہایت آرام کے دن گذارے ہیں۔ اور جسے اس کے گھر والوں نے عاق کر دیا ہے وہ ہر اس جگہ پہونچتا ہے جہاں "مکان خالی ہے" کی تختی لگی ہے۔ مکان مالک اس سے نام پوچھتے ہیں، ذات پوچھتے ہیں، لیکن جب انہیں پتہ چلتا ہے کہ وہ نیچ ذات کا ہے تو مکان مالکان کی نگاہیں بدل جاتی ہیں اور وہ صاف انکار کر دیتے ہیں۔

شادی کے بعد پہلی رات آدھی ستارہ کے بس اسٹیشن پر اور آدھی پولیس اسٹیشن پر گذارنے کے بعد دوسرے دن جب وہ مکان کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے تو بدھوار پیٹھ میں ایک مسلمان کے ہاں اس کی امید بر آتی ہے۔ "ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو کرایہ چاہیئے۔ ورنہ دوسری تاریخ کو سامان راستے پر ڈال دوں گا" کی شرط پر اسے مکان مل جاتا ہے۔ اس وقت مصنف کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اسے جنت مل گئی ہو۔ (باقی آئندہ)

جھک کے ملنا بڑی کرامت ہے
اس سے دنیا مرید ہوتی ہے
(صفی اورنگ آبادی)

بنت السبیل

سرِ راہ چلتے چلتے

بنت السبیل ایک راہ چلنے والی جو سوچتی ہے ؎
کس سے کہیں حالِ دلِ زار اے اوا
بیگانگی میں جس نے زمانے کی سیر کی۔

مرزا رسوا نے شاید بیگانگی کی جگہ آوارگی میں لکھا تھا۔ امراؤ جان ادا کی مناسبت سے لیکن بنت السبیل تو بس یونہی گھومتی ہے۔ بیگانگی میں۔ شمع کی طرح سب سے جدا سب کی رفیق۔ اس تماشہ گاہ عالم میں جینے کا یہی طرز ہو سکتا ہے۔

سردی جا رہی ہے۔ گرمی ابھی آئی نہیں۔ پھولوں کا موسم، گلابوں کا موسم، رجب کا مبارک مہینہ بھی انہیں دنوں آ جائے تو پھر کیا کہنا۔ سارا شہر بد شگونیوں اور خوشیوں کا شہر بن جاتا ہے۔ بنت السبیل سارے شہر میں گھومتی پھر رہی ہے۔ اسے کون روک سکتا ہے۔ راستہ کی بیٹی — ایک مسافر —

پھولوں کی دوکان گلابی ہو رہی ہے۔ ہمارے شہر میں تو ہاروں میں پتوں کا استعمال ہوتا نہیں لیکن یہ نئی سی خوشبو یا گہری سبز طراوت کیسی ہے۔ یہ تو بڑا پودینہ کا ہار ہے۔ گہرے سبز خوشبودار پتے۔ آنکھوں میں طراوت کے ساتھ۔ محفل عروسی کی بھینی بھینی خوشبو کے ساتھ پودینہ کی موجودگی سے اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبو۔

پودینے کا ہار !!! ہاں، پودینے کا ہار"۔ "یہ کس لئے"؟ "دولہا کے لئے چوتھی کے دن کے لئے" ہنسی مذاق کا دن ہوتا ہے۔ پھولوں کے بجائے۔

پودینہ، نعناع، بہترین ہاضمہ کی دوا۔ غذا کو بامزہ اور صحت مند بنانے والا پودینہ ہار سے ٹوٹ کر، پھوتی پر ٹنگ کر سوکھ جائے گا۔ یا پتہ پتہ ہو کر سفید چاندنیوں پر بکھر جائے گا۔

اور جھٹک کر صاف کر دیا جائے گا۔ بنت السبیل کو بڑی بوڑھیوں کی کہتی یاد آئی۔ رزق کو مت ٹھنڈا لو، برکت جاتی رہتی ہے۔

تین ستم رسیدہ دن۔ دو بے خواب راتیں۔ برسوں زندگی بڑی بھری تھی۔ آرزوئیں تھیں، اور امیدیں تھیں۔ اگرچہ زندگی میں کم کم ہی خوشیاں دیکھنے کو ملی تھیں۔ پھر بھی سوچتی تھی کہ سر کا سردار سلامت ہے۔ اور اچانک ایک زندگی ختم ہو گئی۔ ایک گھر تباہ ہو گیا۔ اب آئندہ کیا ہو گا، کیسا ہو گا۔ ذرا سا آنکھ لگی تو دیکھا گھر بھرا ہے۔ ابھی تنخواہ آئی ہے۔ پہلی تاریخ ہے۔ گھر میں بھی کچھ بنوایا ہے۔ میاں بھی لمبے چندے آئے ہیں۔ آنکھ کھلی تو سب غائب، آج سیوم ہے میاں کا۔ ہاتھ میں رقم ضرور ہے مگر کچھ نہ کچھ آمدنی کی سبیل ہونے تک گھر کیسے چلے۔ مگر سیوم ہونا ضروری ہے۔ گھر میں چولہا جلنا ضروری ہے۔ آنے والوں کو کھلانا ضروری ہے۔ اور اپنی حیثیت کے مطابق کھلانا بھی ضروری ہے۔

بنت السبیل کو کسی بلاوے کی ضرورت نہیں ہے۔ راستے کی بیٹی ہے۔ جہاں چہل پہل دیکھتی ہے، پہنچ جاتی ہے۔

اس نے دیکھا۔ ہاں کیا دیکھا۔ چار بیٹیاں اور ماں باپ۔ چھ آدمیوں کے گھر میں صرف ایک پلنگ جس پر کچھ صاف ستھرا بچھونا۔ صرف گھر والے کے لئے باقی سب فرش پر سوتے ہیں۔ کہنہ بستر، پرانا دھرانا سامان، پھٹے پیوند لگے کپڑے، گنتی کے برتن، تانبہ ٹھیکرا، برتن بھانڈے، فرش فروش قسم کی چیزیں پرانی اصطلاح میں کہیں موجود نہ تھیں۔ اور نہ نئے زمانے کے آرائشی ساز و سامان۔

ہر آنے والا آتا ہے۔ گھر والی سے ملتا ہے اور روتے روتے اس کا حال تباہ آنکھیں سرخ سوج گئی ہیں۔ ہونٹوں پر پپڑی سی جمی ہے۔ بال بکھرے، سر سوکھ کر خاک کا ہلا ہے۔ سیاہ بالوں میں چاندی کے تار، اس کے علاوہ ہاتھ گلے میں نہ سونا ہے نہ چاندی۔
دستر خوان بچھ گئے۔ قورمہ کا سالن خوشبودار گرم گرم، کدو کا رائتہ، نرم شیرمال۔
کوئی جانا چاہتا ہے، گھر والی روتے روتے ہر ایک ہاتھ پکڑتی ہے کہ ذرا سا تو کھا لو
بنت السبیل نوالہ توڑ نہیں سکتی۔ رسول اکرمؐ کی ہدایت یاد آ کر رہ جاتی ہے۔ میت کے گھر تین دن تک کھانا بھیجو۔

کھانے ۔ کھانے، کھانے!

بنت السبیل رنگارنگی تقریبوں میں گھومتی پھر رہی ہے ۔

سانچی کا کھانا، مہندی کا کھانا، چوتھی کا کھانا، جھگی کا کھانا: پارٹیاں، پک نک، مبارکبادیاں... قیاں، کانفرنس، سیمینار، ورکشاپ، سمر اسکول!

وہ کسی دور دراز اسکول سے آیا تھا۔ ماں باپ کے بڑھاپے نے انہیں کمانے کے قابل نہیں رکھا ... ا۔ سیدھا سادہ، پڑھنے سے دل لگا ہوا، نوکری بھی شاید کہیں مل ہی جاتی مگر اعلیٰ تعلیم کی دل میں ... ں تمنا تھی کہ نوکری کے بارے میں سوچا نہیں۔ ایک بار پی ایچ ڈی ہو جائیں تو اچھی سی نوکری اچھی سی ... رگی۔ دانشگاہوں کے طور طریقوں سے ناواقف چپ چاپ آنا، لائبریری میں بیٹھنا: اپنا ریسرچ ورک ... نا اور چلا جانا؛ اسکالرشپ کا بڑا حصہ ماں باپ کو بھجوا دیتا۔ ہاسٹل میں اسے جگہ نہیں ملی ... ے اور کیسے نہیں معلوم۔ ایک دور افتادہ محلے میں کرایہ کی کوٹھریا میں گذر بسر ہوتی تھی۔

شاید بیمار ہو گیا ہو۔ شاید بھوک کی کمزوری سے گھر رہا ہو۔ دیمک دروازہ بند رہا۔

بنت السبیل نے دیکھا۔ ایک دروازہ توڑا جا رہا ہے۔ سڑی ہوئی لاش کی بو نے محلے والوں ... دروازہ توڑنے پر مجبور کر دیا۔ ایک شکستہ جسم، حسرت ناک موت، ایک بکس ایک دو جوڑ کپڑے ... ہ کتابیں ہی کتابیں۔ اسے تو نہ جانے کتنے دنوں سے دوا غذا نہ ملی۔ مگر جسم اس کا کیڑے مکوڑوں کی ... نا بنا ہوا تھا ______

بنت السبیل نے سوچا نہ جانے کتنے دن سے اس کے ماں باپ شہر سے آنے والی منی آرڈر ... راہ تک رہے ہوں گے۔

کبھی ایسی ہی کہانی عصمت چغتائی کی پڑھی تھی۔ جانبہار طالب علم اپنی مفلسی، بے لباسی کو ... چھپاتے چھپاتے قبر میں سو گیا ______ ۔

□□

> ممکن نہیں یہ کہ ہو بشر عیب سے دور
> ہر عیب سے بچیئے تا بمقدور ضرور
>
> عیب اپنے گھٹاؤ پر خبردار رہو
> گھٹنے سے کہیں ان کے نہ بڑھ جائے غرور
>
> (حالی)

علیم جہانگیر

ہائے یہ قرضہ جات

دنیا میں صرف دو ہی قومیں پائی جاتی ہیں۔ قرض خور اور قرض خواہ۔ یہ آپ فیصلہ کریں کہ آپ کا تعلق کس قوم سے ہے۔ از راہ کسر نفسی کوئی خود کو مقروض سمجھنے میں تامل کرنے لگے تو کوئی ہرج نہیں۔ کوئی قرض لیتا رہے تو کوئی دیتا رہے۔

ہمیں یہاں پر ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا ہے۔ ہم ایک دن کسی قبرستان کے قریب سے گزر رہے تھے ہمارے دوست نے اچانک ایک قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "آپ وہ جو بوسیدہ قبر دیکھ رہے ہیں۔ وہ اس شخص کی ہے جس نے مرتے وقت بھی بڑی فراخدلی کا ثبوت دیا ہے!"

ہم نے اشتیاق سے پوچھا "بھلا مرحوم نے ایسی کونسی فراخدلی کے ثبوت دیے ہیں!"

دوست نے فوری بتایا "وہ زندگی بھر لوگوں کو قرض دیتا رہا۔ مرتے وقت چار لڑکیاں اور دو لڑکے یتیم خانے کے حوالے کر دیئے!"

اگلے وقتوں کے لوگ بھی عجیب تھے۔ وہ قرض کو محبت کی قینچی سمجھتے تو "آج نقد کل اُدھار" "ادھار مانگ کر شرمندہ نہ کیجئے" کے بورڈ خوش خط اور جلی حرفوں میں کم و بیش ہر دکان پر آویزاں رکھتے تھے۔ درحقیقت وہ خوشامد کو پبلک ریلیشنگ، جھوٹ اور مکاری جیسے کریہہ الفاظ کو ڈپلومیسی کہہ کر سراپا بے حیائی کی گندی چادر اوڑھنے کے عادی نہ تھے۔ حتیٰ چادر ہوتی اتنے ہی پاؤں پسارتے

اب ادھار لین دین کرنا قرض دے کر فخریہ اعلان کرنا عیب نہیں رہا۔ بڑے بڑے ملک ایک دوسرے سے لیتے اور دیتے ہیں۔ عوام میں باہمی تعلقات پر قرض حسنہ، دھنا سیٹھوں اور ساہوکاروں سے سود در سود، رہن بالقبض سودی قرض حاصل کرتے ہیں یا پھر مرض سے مردانہ وار مقابلہ

مدیر "آسرا" قاضی واڑہ - اورنگ آباد (۴۳۱۰۰۱)

کرتے ہیں

سوسائٹی کے اعتبار سے قرض کی شکلیں، شرحیں، حدیں، اور وسائل تک لا محدود ہوتے ہیں۔ اعلیٰ سوسائٹی کے قرض الگ۔ مڈل سوسائٹی کے الگ، مڈل کلاس میں اپر مڈل اور لوور مڈل کے قرضوں میں خاصہ فرق پایا جاتا ہے۔ غرض اس دور میں بچے، بوڑھے، مرد اور عورتیں جسے دیکھیں ہر ایک کا دست طلب دراز ہو گیا ہے۔

اعلیٰ سوسائٹی کے بڑے لوگ دیتا پیمانے پر مختلف ذرائع سے بھاری قرض اٹھا کر ناجائز راستے بھی اختیار کرتے ہیں۔ ہم ایک دفعہ دودھ ساگر میں بخیر قلی اور بوتل کے صاف شفاف کانچ کی گلاس میں گرم گرم دودھ پھونک پھونک کر پینے اور بالائی دانتوں سے چبا چبا کر کھانے میں مصروف تھے۔ وہیں دو تاجر کسی بنک سے قرض لے کر بڑی بے فکری سے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک بولا "اگر کاروبار کی حالت جلد نہ سدھری تو میرا خیال ہے۔ مجھے بنک لوٹنا پڑے گا۔" دوسرا بولا "اگر کاروبار کی حالت جلد نہ سدھری تو میرا خیال ہے کہ میں بنک کو لوٹ چکا ہوں۔"

بعض بنکوں کے اعلیٰ عہدیدار کسی گبر آسامی کو گانٹھ کر قرض کے بہانے اس کا دیوالیہ نکال دیتے ہیں۔ پھر رہی سہی کسر وہ فوجداری اور دیوانی میں پوری کر لیتے ہیں۔

ہمارے دفتر میں ایک بابو ہیں۔ وہ قرض اٹھانے میں ماہر ہیں۔ ان کے خیال میں وہ ہر سرکاری لون لے کر نہ صرف۔ ساہوکاروں کے سود سے بچے جاتے ہیں۔ بلکہ تنخواہ لیتے وقت اسٹامپ لگانے کی زحمت بھی نہیں اٹھاتے۔

غیروں کی کیا بات کریں۔ ہم خود اپنی مثال آپ ہیں۔ ہم سپاہی کا قاعدہ پہلی کا وعدہ پر آناب شناب قرض اٹھاتے ہیں۔ لیکن ہمیں آج تک کسی قرض خور کے گھر جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہر پہلی تاریخ کو از خود ساہوکاروں کی پلٹن قرض وصول کرنے دفتر بلکہ گھر تک چلی آتی ہے۔ ہم اپنی مکاری اور چاپلوسی سے فیصد پرسنٹ قرض بنتے کے بہی کھاتے کی طرح کیری فارورڈ کراتے ہیں اور خالی جیب نہ شکاشے گھر چلے آتے ہیں۔

اس ترقی پذیر زمانے میں اب ہمارے وعدے نے بھی ترقی کی جانب ایک قدم اور آگے بڑھا دیا ہے۔ اب ہم سپاہی کا قاعدہ مہنگائی بھتہ کا وعدہ پر قرض اٹھاتے ہیں۔ بیچارے ساہوکاروں کا جب بھی انہیں غیر متوقع آفس میں پاتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں یہ بات فوری آجاتی ہے کہ آج ضرور کسی مہنگائی بھتہ کی واجب الادا قسط ملنے والی ہے۔ ایسے نازک موقعہ پر ہمارا ذہن جارسا انہیں چکما دینے کا خفیہ منصوبہ

تیار کر لیتا ہے۔ جس پر ہم بنا سوچے سمجھے فوراً عمل پیرا ہو جاتے ہیں۔ اب اس کا کیا کریں کہ ہماری مدیرہ کسی ساہوکار سے ہو جائے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے اس نے ہمیں سر بازار ننگا کر دیا ہو۔

مردوں کی طرح عورتوں میں بھی قرض کی نوعیت جدا جدا ہوتی ہے۔ مثلاً غیر مہذب قسم کی عورتیں گھر کی چار دیواری میں اپنے بچی کو آٹے میں دم کئے ہوتی ہیں۔ گو جو کچھ بھی ہے متعلق فوری احتیاج سے لے کر دو روپیہ تک ادھار پڑوسن سے ادھار مانگ مانگ کر ان کا جینا محال کر دیتی ہیں۔

مہذب قسم کی عورتیں ہوٹلوں، نائٹ کلبوں میں اپنے شوہروں کے ساتھ آتی ہیں۔ مسلمان دوسروں کی کاروں میں واپسی کا کافی تجربہ ہوتا ہے۔ یہ سمجھدار خواتین اپنے مسٹر کے سامنے بوائے فرینڈ کے ہمراہ بڑی مستعدی سے رقص کرتے، وہسکی کے پیگ [illegible] لیے، ہوٹل کے بل پر ادھاری کے جاتے ہیں کی تعریفیں بجائے ایک آدھا بوسہ [illegible] ہوتی ہیں۔ ایسی بیویوں کے شوہروں [illegible] یا انگلیوں پر گننے کی فرصت نہیں ہوتی۔ وہ بیوٹی کلینک سے فیشن شاپ تک میک اپ، جیولری، پارچہ فروش، اور لیڈیز شو [illegible] کے بل ادا کرنے کی ترتیب سے پورے مہینے کی تاریخ زبانی یاد رکھتے ہیں۔

کچھ اہل نظر قرض چکانے میں زیرک، معاملہ فہم اور باذوق ہوتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست نے اپنا ہی ایک واقعہ سنایا۔ وہ کسی دوست سے لیا ہوا قرض حسنہ لوٹانے حسب وعدہ جب دوست کے گھر پہنچے تو دوست کی حسین و جمیل بیوی نے ازراہ انسانیت انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہوئے کہا "وہ گھر میں نہیں ہیں"

دوست نے موقع غنیمت جان کر محترمہ کو چھیڑ چھاڑ کے دوران پانچ ہزار نقد سکہ رائج الوقت کی پیش کش کر دی وہ اس آفر پر فوری راضی ہو گئیں۔ موصوفہ کے شوہر نے بزنس سے لوٹتے ہی پوچھا "بیگم بخش اللہ خان آئے تھے"؟

وہ بولیں "جی ——— وہ نہیں آئے تھے"!

موصوف نے تیوریوں پر بل ڈالے کہا "تعجب ہے۔ وہ شخص وعدہ خلاف نہیں ہے۔ اس نے پانچ ہزار روپے مجھ سے مستعار لئے تھے اور آج دوپہر میں لوٹانے کا پکا وعدہ کیا تھا"!

ایک بات ذہن سے اتر گئی تھی۔ وہ بھی سن لیجئے۔ گو کہ مرزا غالب کو ایسے حادثات کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ لیکن وہ بھی قرض کی ذلت [illegible] سے خوف زدہ رہتے تھے۔ فرماتے ہیں ؎

قرض کی پیتے تھے مے اور سمجھتے تھے کہ ہاں رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

قاضی جلیل احمد

البدر

(گزشتہ اشاعتوں میں ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ کے پس منظر اور تیاریوں کی جھلک دکھائی گئی تھی اب یہاں سے آپ کو ہم راست جنگ کے میدان میں لئے چلتے ہیں)

شامی فوجیں گولان میں:۔ ۶ر اکتوبر۔ گیارہ اسرائیلی طیارے آندھی اور طوفان کی طرح جنگ بندی لائن کو عبور کر کے شام (سیریا) کی سرحد میں داخل ہو گئے۔ ان کے درمیان وہ کمانڈ شپ بھی تھی جس میں راڈرز کو بے اثر بنانے والے برقی آلات نصب تھے۔ اسکوڈرن کمانڈر بھی اسی جہاز میں تھا۔ اچانک شام کی سرزمین نے اپنی خود رو سبز جھاڑیوں اور پہاڑی چٹانوں کے پیچھے سے آگ و آہن کا ایک عظیم آتشیں مرغولہ فضاء میں اچھال دیا۔ اور چشم زدن میں ۷ اسرائیلی طیارے زمین بوس ہو گئے۔ اسرائیلی کمانڈ شپ بھی ان میں شامل تھا چشم فلک نے ایسا نظارہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ کوئی دوسری جنگ کے زمانے کے گلوسٹرز اور سوپر فورٹریس نہ تھے۔ یہ ویتنام میں مار کھانے والے B52 بمبار بھی نہ تھے۔ یہ تو فضائے بسیط کے آفتاب و ماہتاب فینٹم اور اسکائی ہاک تھے۔ جن کے مقابلے میں ابھی تک کوئی طیارہ کامیابی سے ٹھہر نہ سکا۔ یہ فینٹم اور اسکائی ہاک اتنی بڑی تعداد میں یوں چیل کوؤں کی طرح مار گرائے جائیں گے یہ بات ان اسرائیلی طیارہ رانوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ باقی چار طیاروں نے کنی کاٹ کر اپنی طیارہ گاہوں کا رخ کیا۔

۶ر اکتوبر کے دن دو بجے گولان کے سارے محاذ پر شام کی دو ہزار توپوں نے

۹۔ کولسٹن روڈ۔ لندن E7 ۔ یو۔ کے

شدید گولہ باری شروع کردی۔ اور کوئی دم میں شامی فوجیں اپنی یلغار کے لئے حرکت میں آنے والی تھیں۔ دشمن کی طرف سے جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ اب اسرائیل کو موقع تھا کہ اپنی بے پناہ ہوائی طاقت کو کام میں لاکر شامی افواج کے آرمر اور توپوں کو جنگی بندی لائن عبور کرنے سے پہلے ہی تہس نہس کر کے رکھ دے۔ اور اس غرض سے جنوبی سیکٹر کے اسرائیلی ہوا بازوں نے پہل کر کے شام کی صف اول پر تاخت کے لئے پرواز شروع کی تھی کہ یہ حادثہ پیش آیا۔ حادثہ ہی تو تھا۔ کیوں کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایر ڈیفنس راکٹ بھی اتنے تباہ کن ہو سکتے ہیں کہ ایک ہی حملہ میں اتنے طیاروں کو مار گرائیں۔

ایک گھنٹے کی شدید گولہ باری کے بعد دن کے ٹھیک ۳ بجے تل الفارس کی ڈیفنس لائن سے شام کے تین آرمڈ اور چار میکانائزڈ بریگیڈز نے آگے بڑھ کر اسرائیلی چھاؤنی رفید کا رخ کیا۔ گولان سیکٹر کی جنوبی سمت میں رفید اسرائیلیوں کا ایک مستحکم قلعہ تھا جو خشنیہ، نفک اور آل آن جانے والی سڑکوں کے سنگم پر واقع تھا۔ اس علاقے کے سب سے اونچے مقام پر اسرائیلیوں نے ایک آبزرویشن پوسٹ قائم کیا تھا۔ جہاں طاقتور برقی آلات اور دوربینیں لگی ہوئی تھیں جن کی مدد سے دشمن کی نقل و حرکت کا پتہ لگایا جاتا تھا۔ اسرائیلی کمانڈر کو پل پل کی اطلاع مل رہی تھی۔ اتنے میں آبزرویشن پوسٹ کو تین فینٹم واپس آتے دکھائی دیئے۔ آبزرویشن نے فوراً ان سے ریڈیو پر ربط قائم کیا۔ اور دوسرے ہی لمحے رفید کے اسرائیلی کمانڈر کو پتہ چل گیا کہ گیارہ کے منجملہ آٹھ طیارے شام کی سرزمین پر تباہ ہو چکے ہیں۔ اس خبر سے اس کا وہ اطمینان رخصت ہو گیا جو طیاروں کی روانگی سے پیدا ہوا تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ اسرائیلی طیارے شامی آرمر اور ٹینکوں پر ایسی ضرب لگائیں گے کہ ان کے لئے فوری حملہ کرنا ممکن نہیں رہے گا۔ اور اگر کوئی حملہ ہو جائے تو اس میں وہ شدت باقی نہیں رہے گی اور اسرائیل کی ریزرو فوج کے آنے تک اسے بہ آسانی روکا جا سکے گا۔ لیکن اس خبر سے ظاہر تھا کہ دشمن کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر ہی اسرائیل کے آٹھ طیارے تباہ ہو چکے ہیں۔ لیکن اس نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنی ایر ڈیفنس یونٹ کو خبردار کر دیا کہ دشمن کا ہوائی حملہ یقینی ہے ہمیں کسی ایر کور کی امید نہیں ہے۔ اس لئے اینٹی ایرکرافٹ گنز اور راکٹوں کو فائر کے لئے پوری طرح تیار کر لو۔ اتنے میں آبزرویشن پوسٹ نے راڈر پر شامی طیاروں کے دکھائی دینے کی اطلاع دی۔ چشم زدن میں اسرائیل کا تربیت یافتہ عملہ اپنی جگہ شامی طیاروں کے استقبال کے لئے مستعد ہو گیا۔ شامی طیاروں اور اسرائیلی ایر ڈیفنس کے مابین

گھن گرج کا تبادلہ شروع ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شامی لیڈروں کا مقصد زیادہ تر دشمن کی توجہ کو شامی فوج کی پیش قدمی کی طرف سے ہٹانا تھا تاکہ شامی آرمر کم سے کم نقصان کے ساتھ رفید پہونچ سکے۔ اپنے اس مقصد میں ان کو خاصی کامیابی ہو رہی تھی۔ لیکن اسرائیلی ڈیفنس کا اندازہ صحیح تھا کہ شامی لیڈروں کے لئے نیچی اڑان کر کے اسرائیلی آرمر اور ٹینکوں کو نشانہ بنانا مشکل ہو گیا تھا۔ اور اسی کوشش میں کئی طیارے اسرائیلی راکٹوں کا نشانہ بن گئے۔ لیکن اس تعطل سے فائدہ اٹھا کر شامی ٹینک اور آرمڈ کاریں رفید سے قریب پہونچنے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔

جب شامی ٹینک رفید کے قریب پہونچے تو اسرائیلی توپوں نے ان کا استقبال کیا۔ بڑھتے ہوئے شامی ٹینک بڑی تعداد میں اس فائرنگ کا نشانہ بننے لگے۔ ابھی تک بیس اور پچیس کے درمیان شامی ٹینک اسرائیلی توپوں کا نشانہ بن چکے تھے۔ لیکن پھر بھی باقی ٹینک کسی نقصان کی پروا کئے بغیر دیوانہ وار آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ رفید کے کمانڈنگ آفیسر نے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کر کے اطلاع دی ...... دشمن نقصان کی پروا کئے بغیر آندھی اور طوفان کی طرح چڑھا چلا آ رہا ہے۔ اگر وہ رفید کے حصار میں پہونچنے میں کامیاب ہو جائے تو ہماری اس چھوٹی سی فوج کے لئے مقابلہ کرنا ممکن نہیں رہے گا ...... صرف ایک موثر ہوائی کارروائی ہی رفید کو دشمن سے بچا سکتی ہے۔ ہیڈ کوارٹر میں جنرل ہتی اور اس کے چیف آف اسٹاف مسلسل یہی خبریں ہر جگہ سے وصول کر رہے تھے۔ ہر جگہ سے مدد کی درخواستیں آ رہی تھیں لیکن کہیں بھی مدد پہونچانا ممکن نہ تھا۔ آج سارے گولان سیکٹر پر جو نقصانات اسرائیل کو برداشت کرنے پڑے تھے، خصوصاً ہوائی جہازوں کے نقصان، ان کی نظر کرنے جنرل ہتی نے ساری ہوائی کارروائیوں کو بند کر کے جنرل دایان سے ہیڈ کوارٹرز پہونچنے کی خواہش کی تھی۔ لہٰذہ رفید کو بھی کوئی مدد پہونچانا ممکن نہ تھا۔ جنرل ہتی نے رفید کے کمانڈنگ افسر کو پیچھے ہٹ کر نفک میں قدم جمانے کا حکم دیا ...... ایک گھنٹہ بعد یعنی شام میں پانچ بجے رفید پر شامی فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔

لیکن رفید پر شامیوں نے دم نہیں لیا۔ یہاں پہونچ کر انہوں نے فوج کے دو حصے کئے۔ ایک حصہ کرنل حسان ترکمانی کی قیادت میں خشنیہ کی طرف بڑھا جس کا مقصد خشنیہ اور نفک کو فتح کرتے ہوئے بنات یعقوب کے پل پر قبضہ کرنا تھا۔ یہ پل گولان کے وسطی سیکٹر میں اسرائیل کے ریزرو افواج کے پہونچنے کا قریب ترین راستہ تھا۔ دوسرا حصہ بریگیڈیر مصطفیٰ شربہ کی کمان میں بجانب جنوب ال آل کی طرف بڑھا تاکہ جھیل طبریہ پر پہونچ کر جنوب سے

ئیلی فوجوں کے گھات میں داخل ہونے کے راستے کو کاٹ دے۔

بریگیڈیر مصطفیٰ شریف کی قیادت میں فوج جبل لبیرا کی جانب بڑھی وہ شام تے ہوتے ال آل کے بڑے قصبے تک پہونچ گئی۔ اس فوج کو راستے میں کسی اسرائیلی مقاومت سامنا نہیں پڑا۔ راستے میں کئی اسرائیلی نو آبادکاروں کی بستیاں ملیں جو بالکل سنسان اور ویران ں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے انہیں بڑی جلدی اور روا روی میں خالی کرنا پڑا ہو۔

ادھر کرنل ترکمانی کی فوجیں رفید سے بمشکل دو میل آگے بڑھی ہوں گی کہ اسرائیلی ہوابازوں نے انہیں آن گھیرا۔ ہوا یہ کہ وزیر جنگ موشے دایان اور کمانڈر انچیف جنرل ایلازار جب ن کے ایریا کمانڈر جنرل ہوفی کی درخواست پر وہاں پہونچے تو جو کچھ انہوں نے دیکھا اور سنا وہ کے بدترین اندیشوں سے بھی سوا تھا۔ سینکڑوں کی تعداد میں دشمن کے ٹینک کسی نقصان کی رکاوٹ کے بغیر آندھی اور طوفان کی طرح اندرون ملک گھسے چلے آتے تھے۔ دشمن کی اینٹی ایر کرافٹ فائرنگ اتنی تباہ کن تھی کہ جتنے طیارے دشمن سے مقابلے کے لئے روانہ کئے جاتے تھے میں سے ساٹھ ستر فیصد واپس آنے سے قاصر رہتے۔ اسی نقصان سے خائف ہو کر جنرل ہوفی نے لم شامی دشمن کے خلاف ہوائی کاروائی بند کر دی تھی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شامیوں کو ے بڑھنے کی چھٹی مل گئی۔ مٹھی بھر اسرائیلی فوج دشمن کو روکنے سے قاصر تھی۔ ایریا ہیڈکوارٹرس کونسل آف وار منعقد ہوئی۔ بری اور ہوائی یونٹوں کے کمانڈروں کی رپورٹیں پیش ہوئیں جن سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسرائیلی فضائیہ کے علاوہ کسی اور میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ ان بڑھتی ئی فوجوں کے قدم روک سکے۔ دایان نے فیصلہ دیا "ہمارے پاس ایک انچ زمین چھوڑنے گنجائش نہیں ہے۔" اسرائیلی طیاروں کو دوبارہ جنگ میں جھونک دیا گیا۔ ان طیاروں کا زور اس فوج کی پیش قدمی روکنے میں صرف ہو رہا تھا جو کرنل ترکمانی کی قیادت میں خشنیہ کی ب بڑھ رہی تھیں۔

اسرائیلی طیاروں کی آمد کی اطلاع اپنے راڈار پر پاتے ہی شامی ایر ڈیفنس کا راکٹ لانچنگ کے لئے پوزیشن لینے لگا۔ شامی میزائل بردار انفنٹری کے جوان اپنے کندھوں پر میزائل سنبھالے بیباکانہ انداز میں کھلی فضا میں ڈٹ گئے۔ ان کا کام کھلی فضاء اور نیلے آسمان کے نیچے ہی ہو سکتا تھا۔ وہ نہ کسی بنکر کی پناہ تلاش کر سکتے تھے اور نہ چٹانوں کی آڑ لے سکتے تھے۔ ان کا فینٹموں اور میراجوں سے راست مقابلہ تھا۔ گویا گوشت پوست

کے زندہ انسان آگ و آہن کے دیو قامت عفریتوں کو للکار رہے تھے۔

لیکن راڈار پر ان کی آمد کی اطلاع پانے اور ان جہازوں کے سر پر آدھمکنے کے بیچ اتنا کم وقفہ تھا کہ شامی میزائیل انفنٹری کے لئے اس قدر کم مدت میں مناسب پوزیشن لینی ممکن نہ تھی۔ لہٰذہ اسرائیل کے دس طیاروں کی اس پہلی ٹکڑی نے شامی صفوں میں تباہی مچادی۔ کئی ٹینک اور اے پی سی گاڑیں تباہ ہو گئیں۔ اس کے علاوہ ان جہازوں نے جو بم برسائے ان سے سینکڑوں سپاہی کھلے میدان میں ہلاک یا زخمی ہو گئے۔ لیکن اسرائیلی جہازوں کی دوسری ٹکڑی کے پہنچنے تک شامی ایر ڈیفنس کا عملہ پوری طرح تیار اور مستعد ہو چکا تھا۔ لہٰذہ جوں ہی دوسری ٹکڑی نے قیامت خیز رفتار میں میدان میں قدم رکھا۔ زمین سے پرواز کرنے والے میزائیلوں نے سدھائے ہوئے عقابوں کی طرح جھپٹ کر ان کی مزاج پرسی کی اور فضاء میں قیامت خیز اور ہولناک دھماکوں کے ساتھ ان جہازوں کے پرخچے اُڑتے دکھائی دینے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسرائیل کے آٹھ جہاز شعلہ پوش ہو کر زمین سے ٹکرائے اور پاش پاش ہو گئے۔ جہازوں کے پائیلٹ جو صرف ایک بٹن دبا کر بڑی آسانی کے ساتھ جہاز کے باہر ہو سکتے تھے اس آفت ناگہانی سے اتنے بوکھلے ہو چکے تھے کہ اکثر یہ سیفٹی بٹن دبانے سے بھی قاصر رہے۔ اور جہاز کے ساتھ جل کر خاکستر ہو گئے بمشکل دو چار جہاز بچ نکلے؛ جنہوں نے پیچھے آنے والی تیسری ٹکڑی کو صورت حال کی خوفناک ہلاکت خیزی سے آگاہ کیا۔ چنانچہ تیسری ٹکڑی حملے کے لئے غوطہ لگا کر نیچی پرواز کرنے کے بجائے فضاء میں اور بلند ہو گئی۔ پانچ تا آٹھ سو گز کے بجائے بیس بائیس ہزار گز کی بلندی سے انہوں نے بم اور راکٹ برسانے شروع کر دیئے ظاہر ہے یہ حملہ اتنا کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ جتنا کہ پہلا حملہ ہوا تھا۔ ادھر اتنی بلندی پر بھی شام کے سام ۶ میزائیلوں نے مزید دو اور جہازوں کو نشانہ بنایا اور یوں ۸ بجکر ۳۰ منٹ پر جنرل ترکمانی خشنیہ میں داخل ہو گیا۔

لیکن خشنیہ ترکمانی کی منزل نہ تھی۔ اس پر تو ایک ہی دھن سوار تھی کہ کس طرح آغاز جنگ کے ۳۶ گھنٹوں کے اندر اندر بنات یعقوب کے پل تک پہونچ کر اسرائیل کی مزید فوج کا گولان میں داخل ہونے کا راستہ کاٹ دے۔ اسلئے خشنیہ میں دم لئے بغیر نفک کی سمت آگے بڑھ گیا۔ اب اسرائیلی طیاروں کا پورا زور ترکمانی کی پیش قدمی کو روکنے یا دھیما کرنے پر صرف ہونے لگا۔ گولان کی بلندیوں پر رات کی تاریکی مسلط ہو چکی تھی لیکن بالائے بنفشی شعاعوں سے آراستہ شامی ٹینک رات کے اندھیرے میں بھی اپنا راستہ تلاش کرنے کے قابل تھے۔ پھر بھی عام ہیڈلائیٹس کی تیز روشنی اور

ان شاموں میں بڑا فرق تھا ٹینک جس رفتار سے آگے بڑھ رہے تھے۔ اس میں راستے کے نشیب وفراز اور سرنگوں اور ٹینک ٹراپ کے خطرات کو بروقت معلوم کرنا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ کئی ٹینک اور آرمرڈ کارز ان رکاوٹوں کا شکار ہو گئے۔ اسی طرح راستے میں اسرائیلیوں کو وہ زمین دوز پناہ گاہیں بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل رہیں جن میں وہ چھپے بیٹھے تھے۔ چنانچہ جیسے ہی شامی دستے ان کے وجود سے بے خبر آگے بڑھے پیچھے سے ان پر شدید گولہ باری ہونے لگی۔ اس زد سے بچاؤ کی وہ ابھی کوشش ہی کر رہے تھے کہ اوپر سے اسرائیلی طیاروں نے انہیں پھر آلیا۔ لیکن شامی عساکر ان تمام نقصانات سے بے پروا آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ اسرائیلی حیران تھے کہ یہ کس قسم کی فوج ہے جو پاگلوں کی طرح موت کے منہ میں گھستی چلی آ رہی ہے۔ کیا یہ وہی حقیر شامی ہیں جنہوں نے ۱۹۶۷ء کی جنگ میں بغیر لڑے بھڑے گولان کی ناقابل تسخیر دفاعات کو اسرائیل کے حوالے کر دیا تھا۔ جن کی بزدلی اور کم ہمتی کے چرچے اسرائیل کے بچے بچے کی زبان پر تھے۔ جن کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ اگر پھر بھی کوئی جنگ ہوئی تو دمشق کی فصیلوں تک شامی کا پتہ نہ چلے گا۔ وہی بزدل اور کم ہمت شامی برستی ہوئی آگ و آہن کے طوفان سے یوں گزر رہے تھے جیسے ہرن سبزہ زار میں کلیلیں کر رہے ہوں۔ ان کا جانی نقصان سینکڑوں سے بڑھ کر ہزاروں تک پہنچ چکا تھا اور انہیں کوئی پروا نہ تھی۔ اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے انہوں نے بہت زیادہ اسلحہ ضائع کیا تھا اور بہت زیادہ امیونیشن خرچ کر چکے تھے لیکن اس سارے نقصان کے باوجود ان کے عزم اور ارادے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ان کے آگے بڑھنے کی رفتار دھیمی پڑ چکی تھی لیکن ان کے قدم رکے نہیں تھے۔ بلکہ آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ صبح کا ذب کی ملگجی سپیدی میں قنیطرہ کی مسجدوں کے مینار اب انہیں دکھائی دینے لگے تھے۔ مسجدیں جو عرصے سے ویران تھیں کیوں کہ کوئی نمازی وہاں نہیں رہا تھا۔ لگ بھگ اٹھارہ گھنٹوں میں وہ تہائی فاصلہ طے کر چکے تھے۔ اور بنات یعقوب کا پل اب زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا ● ●

> دعائیں فائدہ ضرور پہنچاتی ہیں مگر انہیں کو پہنچاتی ہیں جو عزم و ہمت رکھتے ہیں۔ بے ہمتوں کے لئے وہ ترک عمل اور تعطل قویٰ کا حیلہ بن جاتی ہیں۔ (غبار خاطر صفحہ ۱۹۷)
>
> ابوالکلام آزاد

محمد ایوب فاروقی

"تردید" (محبوب راہی) پر ایک نظر

"تردید" محبوب راہی کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ ہے جسے خود مصنف نے نعمانی پریس میں شائع کروایا ہے۔ کتابت و طباعت کی عمدگی کے ساتھ خوبصورت سرورق سے مزین کتاب کی قیمت بیس روپے فی زمانہ واجبی معلوم ہے کہ آج کل نصف سے زائد کتابیں یونہی تقسیم ہو جاتی ہیں۔ اس سے قبل "ثبات" مہاراشٹرا اردو اکادمی کی اعانت سے منظرِ عام پر آیا تھا۔ اور جسے خواص و عوام میں پسند کی نگاہوں سے دیکھا گیا تھا۔ مہاراشٹرا میں اردو کی ترقی اور ترویج کے لئے جو کام ہو رہا ہے اسے ہم دکن والے غنیمت سمجھتے ہیں۔ وہاں اب تو وہ گذرے ہوئے کل کا سا ماحول بھی نہیں رہا۔ جہاں اساتذہ کہتے تھے ؎

میں غریب آدمی دیوان کہاں سے لاؤں

"ثبات" میں نے دیکھا نہیں۔ جمیل نظام آبادی اور دوسروں سے سنا ضرور تھا کہ جدید لحن کے ساتھ اب نئے شاعر بڑی تیزی سے ابھر رہے ہیں۔ البتہ محبوب راہی کو چیدہ چیدہ گونج ہفتہ وار میں دیکھا پڑھا ہے۔ اور اب پرکھنے کی منزل پر آ گیا ہوں۔ زیرِ مطالعہ مجموعے کے سرورق پر تین بڑے ہی بیحد اہم نام دیکھے۔ ایک ڈاکٹر وزیر آغا ہیں اور دوسرے ظ انصاری، تیسرے جدید غزل کے قابلِ احترام شاعر مظفر حنفی۔ مقصود تبصرہ در تبصرہ نہیں۔ خود اپنے احساس کو رقم کرتا ہے۔

ابھی کل ہی کی بات ہے نظام آباد میں منعقدہ کل ہند مشاعرے میں کیفی اعظمی نظمیں پڑھ رہے تھے۔ خمار بارہ بنکوی نے ان سے کسی پرانی غزل کی فرمائش کی "کلیجہ نکل پڑے"۔ کیفی اعظمی نے تعمیل ارشاد کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا "اگر خمار صاحب کی فرمائش نہ ہوتی تو میں یہ غزل ہرگز نہ سناتا کیونکہ یہ ابتدائی دور کی ایک روایتی غزل ہے۔" خمار نے تکرار کے ساتھ کہا "کیفی صاحب، روایت

یعقوب منزل ۸۳-۶-۱ پھولانگ۔ نظام آباد (اے پی)

عظیم ہوتا ہے۔ روایت بڑی عظیم چیز ہے۔" دونوں شاعری ہیں ایک طرح سے معرکے لیے لڑا دیا ایک ترقی پسند، دوسرا روایت نواز؛ یوں لگتا ہے کہ گذشتہ نصف صدی اسی کشاکش میں گذر گئی کہ روایت سے بغاوت کی جائے یا نہیں، اور اگر کی جائے تو کس طرح! اسالیب ہوں یا طرزِ بیاں، جدت طرازی نے نئی راہیں ہموار کیں۔ تخلیق کرنے والوں نے نئے لہجے کو اپنایا اور ایک ایسی آواز نے جنم لیا جو بقول مظفر حنفی۔

"اپنے پیش روؤں کے لہجے یا آواز کی بازگشت نہیں، جو اپنی رمزیت، ایمائیت اور تہ داریت کے باوصف بامفہوم بھی ہے اور بلیغ بھی۔" محبوب راہی نئی غزل کے حامیوں کے اس لشکرِ جرار میں صفوں کو چیرتے ہوئے اگلی صفوں کی طرف رواں دواں دکھائی دے رہے ہیں۔ محبوب راہی گذشتہ بیس برس سے غزل کہہ رہے ہیں اور خوش سلیقگی کے ساتھ اب وہ اس منزل پر ہیں جہاں ان کی فکر رسا میں ٹھہراؤ اور پختگی ہے۔ ابتدائے عشق کی وہ ہما ہمی نہیں جہاں خوشبو کی تلاش میں لوگ شاخوں سے پھول ہی نہیں کچی کلیاں بھی توڑ لیتے ہیں۔ اب وہ پختہ کار شاعر ہی نہیں وقت اور ماحول کے پارکھ بھی ہیں۔ ؎

وہ شخص جو بظاہر معصوم لگ رہا ہے
کس سادگی سے ساری دنیا کو ٹھگ رہا ہے۔

ہر ایک آستیں میں ہے خنجر چھپا ہوا
ہر ایک ہاتھ میں ہے گلِ تر خلوص کا

آج گل ہائے عقیدت جس پہ برسائے گئے
اس پہ کل سنگِ ملامت بھی اچھالے جائیں گے۔

بنیادی طور پر غزل کا شاعر نہ شعلہ افشاں ہوتا ہے نہ آتش گفتار؛ یہاں تو جنگل کی سی دھیمی آگ میں جلنا ہوتا ہے۔ یہ بات لوگ میر کے بارے میں کہتے ہیں، غالب کو بارود کا دھماکا جانتے ہیں۔ لیکن غالب کے پاس بھی تو احساس کی وہ تپش ملتی ہے جو کسی کو فوراً پل میں جلا کر خاکستر نہیں کرتی۔ غالب شمع کی طرح ایک ہی رات میں جل بجھنے کے تمنائی ضرور تھے لیکن ان کی طویل عمر بھی سحر کی تلاش میں زائچے بناتے گذری۔ "تردید" میں شامل بیشتر غزلوں کی بحریں تیز رو ضرور ہیں لیکن ان میں جہاں نغمگی اور ترنم ریزی ہے وہاں دریا کے وسیع پاٹ اور پانی کے دھیمے بہاؤ کے دل آویز، پُرشکوہ حسن کا سا انداز نہیں ہے۔ میں راہی کے اس نظریے سے متفق نہیں ہوں ؎

زخمی، تلخ، کٹیلا، تیکھا، تیر و نشتر والا لہجہ

جی میں آتا ہے اپناؤں وہی مظفر والا لہجہ

مظفر حنفی، مظفر حنفی ہیں، محبوب راہی کو محبوب راہی ہی ہونا ہے۔

یہ اُداسی یہ شکستہ بام و در ایسے نہ تھے
کچھ برس پہلے مری بستی کے گھر ایسے نہ تھے

چاند کو اخلاص کے تم یونہی گہناتے رہو
ہم ہیں خورشید وفا، اس کو اُجالے جائیں گے۔

سنگ باری پے بہ پے بے مہریٔ احباب کی
عکس احساس شکستہ آئینہ در آئینہ

یہ میں ہی نہیں خود محبوب راہی بھی کہتے ہیں

تھا وسیلہ اک وہی راہی مری پہچان کا
عکس میری ذات کا جو بکھرے فن پاروں میں تھا۔

اپنی شناخت کا یہ وسیلہ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب بھی راہی یوں دے گئے ہیں

ڈوب جاتا ہے بحرِ تخیل میں جب
اپنی پہچان تک بھول جاتا ہے وہ۔

محبوب راہی کی "تردید" اس خیال کی تائید کرتی ہے کہ ان کے ہاں اچھے شعر کہنے کی لگن ہے پختہ کاری کی یہ منزل مستقبل میں بھی ان سے اچھے شعر کہلوائے گی۔ لیکن بقول ظ انصاری "بہت کچھ کہہ جانے کی لگن میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ تغزل اور معنی آفرینی کا یہ رنگ پائندہ رہے تو کیا کہنے

پیاس سے باطن کی چادروں جاں بلب
ابر تر، دریا، سمندر اور میں

بڑے سکون سے یہ رات ہم پہ گذری ہے
نہ جانے صبح کا سورج کدھر سے نکلے گا

پھر کیسے لیتے آپ یہ رہتا ہے اختیار
دل میں کسی کو تو کبھی بسا کے تو دیکھنا

کچھ تعلق تو ہے اس سے کوئی نسبت بھی تو ہے
وہ مری آنکھ کا تیجری ہی سہی ہے تو سہی

رکھ آئیں وہاں پھر کوئی مہتاب درخشاں
جلتے ہوئے خورشید کو منظر سے نکالیں

جدت طرازی نادانستہ ہو تو دل پذیر ہوتی ہے۔ بغاوت کا اعلان ہو تو وہ شاعری نہیں جریدہ سرکاری کا اعلامیہ بن جاتی ہے۔ پھر آیتوں پر گرد تہہ در تہہ جم جائے تو زمانے سے شکایت کیسی؟ شاعری ریاضت بھی چاہتی ہے اور انتخاب کے سلسلہ میں تنقیدی شعور بھی لیکن لیکن اسے کیا کیجئے کہ ہر شعر تخلیق ضرور ہوتی ہے لیکن ہر شاعر نقاد نہیں ہوتا۔

انفرادیت کی تلاش ہو تو غزل کے تیور میں بانکپن اور رکھ رکھاؤ کو نمایاں ہونا ہے۔ اور یہی ایک شاعر کی اپنی نہج اور اس کا اپنا رنگ کہلاتا ہے۔

محبوب راہی کی "تردید" یقیناً درمیانی کڑی ہے۔ ایک سنگ میل، لیکن ایک ایسا نشانِ راہ جہاں تک پہونچ کر ایک راہی منزل شناس ضرور محسوس ہوتا ہے ؎

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

انیسویں صدی کے اوائل میں جب روسیوں نے بخارا کا محاصرہ کیا تھا تو امیر بخارا نے حکم دیا کہ تمام مدرسوں میں ختم خواجگاں پڑھا جائے۔ ادھر روسیوں کی قلعہ شکن توپیں شہر کا حصار منہدم کر رہی تھیں اور ادھر لوگ ختم خواجگان کے حلقوں میں بیٹھے یا مقلب القلوب یا محول الاحوال کے نعرے بلند کر رہے تھے بالآخر وہی نتیجہ نکلا جو ایک ایسے مقابلہ کا نکلنا تھا جس میں ایک طرف گولہ بارود ہو دوسری طرف ختم خواجگاں۔ (غبار خاطر ص ۱۶۷)

ابوالکلام آزاد

تبصرہ

نام سووینیر : "شاہین" جلگاؤں
مدیران : معین الدین عثمانی یم۔اے
صغیر احمد بی۔اے
طابع وناشر : ادارہ شاہین لائبریری جلگاؤں
خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ : ادارہ شاہین لائبریری جلگاؤں۔ شاہو نگر جلگاؤں مہاراشٹرا (425001)

زیر نظر شمارہ یا سووینیر ادارہ شاہین کا تیسرا سالنامہ ہے۔

اردو میں اب سووینیر، یادگار مجلہ یا ارمغان کی اشاعت عام ہو چکی ہے۔ مختلف نوعیت کی عام یا خصوصی تقریبات کے موقعوں پر نیز اداروں، انجمنوں اور لائبریریوں کی جانب سے یادگار مجلہ شائع کئے جاتے ہیں۔ جن میں اس تقریب یا ادارہ کی کارکردگی کی رپورٹ اور کارکنوں کے تعارف کے علاوہ کچھ ادبی مواد اور اشتہار بھی شامل ہوتے ہیں۔ مقصد ایک طرف تو ادارہ یا خاص تقریب کے لئے مالیہ کی فراہمی ہے تو دوسری طرف اس کی کارکردگی کی تشہیر ہوتا ہے۔

محبوب یا معزز شخصیتوں کی سالگرہوں یا اہم موقعوں پر یادگار تحفوں کی پیشکشی بھی بہت ہی بہت پرانا رواج ہے۔ خود لفظ سووینیر کے معنی بھی نشانی یا یادگار کے ہیں۔ قلمکاروں نے مادی یادگاروں کی بجائے اپنی یا دوسروں کی قلمی تخلیق کو تحفہ بنایا کہ بہت دنوں تک دل میں رہے ویسے غالب نے سہ کافی ہے نشانی ترا چھلے کا نہ دینا
کہہ کر ہی دل بہلانے کا سامان کر لیا۔

انیسویں صدی کے درمیانی زمانے میں ایسے ادبی سالنامے انگریزی میں بہت مقبول ہو رہے تھے۔ خاص کر متوسط طبقہ میں اسے اعلیٰ تمدن کا اظہار سمجھا جاتا تھا۔ یہ سالنامے جذباتی شاعری، کہانیوں، مضامین اور نقاشی یا فنکاری کے نمونوں پر مشتمل ہوتے تھے اور عام طور سے کرسمس، سال نو یا کسی کی سالگرہ کے موقعہ پر دیئے جانے کے لئے شائع کئے جاتے تھے۔
ان کے عنوانات ایسے رکھے جاتے تھے جن میں تحفہ یا یادگار (Momento) کا اشارہ شامل ہوتا تھا ان ادبی یادگاروں یا تحفوں میں ادبی مواد کم اور صناعی زیادہ ہوتی تھی۔ مواد سے زیادہ مبالغہ آمیز مقبول بدائع سے بھر پور زبان کا استعمال ہوتا تھا۔ سنہری منقش صفحات، نفیس چمڑے کی جلد سیپ کے نقش ونگار سے مزین؛ ان کی خصوصیات تھیں اور انہیں خصوصیات پر ان سالناموں کی

قدر و قیمت آنکی جاتی تھی۔ ناشر کبھی ایک ہی سالنامے کو مختلف ناموں سے بازار میں لاتے تاکہ خرچ کم اور آمدنی زیادہ کی صورت پیدا ہو۔

ابتدائی دنوں میں ان سالناموں پر رومانیات کا غلبہ رہا۔ آگے چل کر مذہبی اور سماجی حقائق نے اس کی جگہ لے لی کہ شاید فرد کا مرکز و نقطہ (point) یہی ہے اور اس کے لئے خرچ آسانی سے کر دیا جاتا ہے۔ آج کل ان کے موضوع متنوع ہوتے ہیں اور اہم تقاریب کے موقعہ پر شائع کئے جاتے ہیں

ترقی یافتہ ملکوں میں ان کا شمار سالناموں میں کیا جاتا ہے، انہیں لائبریریوں میں محفوظ کیا جاتا ہے اور ان کی فہرستیں اور اشاریہ مرتب کئے جاتے ہیں اور ان لائبریریوں کی نشاندہی کی جاتی ہے جہاں ایسے سالنامے محفوظ ہوتے ہیں۔ ایسی ہی ایک فہرست رالف تھامپسن کی مرتبہ "امریکی سالنامے اور ارمغان ۱۸۲۵-۱۸۶۵ء" ہے۔ اس فہرست کے مطابق سب سے پہلا مطبوعہ سالنامہ "المنارخ دی میوز" ہے جو ۱۷۶۵ء میں پیرس سے شائع ہوا تھا اور پہلا تحفہ کتاب "مجھے نہ بھولو" کے نام سے رڈلف آکرمین نے ۱۸۲۸ء میں شائع کی تھی۔

اردو زبان میں چھپنے والے سالناموں کی اب تک ایسی کوئی فہرست شائع نہیں ہوئی ہے اور عام طور پر انہیں لائبریریوں میں محفوظ بھی نہیں کیا جاتا حالانکہ اکثر ان میں اہم اور محفوظ رکھنے کے قابل مواد شائع ہوتا رہتا ہے۔

"شاہین" کا زیر نظر سالنامہ بھی ایک ادبی سالنامہ ہے جو اپنے مرتبین کی محنت کی داد دے رہا ہے۔ قابل تحسین بات یہ ہے کہ ہر قسم کا مواد گروہ بندی سے ہٹ کر جمع کیا گیا ہے جو بقول اس کے مدیروں کے "محض تفریح کا باعث نہیں بلکہ ادبی ذوق کی تسکین کا سبب بنے گا اس میں قدیم و جدید اور ہر مکتبہ فکر کے فنکاروں کا تعاون حاصل کیا گیا ہے اور ایک خاص ادبی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مضامین میں "خطہ اعظم گڑھ ایک اجمالی تعارف" "تذکرہ شاعران کامٹی" "ہندوستان میں فارسی مرثیہ کا آغاز و ارتقا" دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اس قسم کے عنوانوں کے لئے پورا یا کم از کم آدھا سالنامہ مختص کر دیا جائے اور موضوع کو پورے بسط و تحقیق کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اس طرح اردو ادب اور اردو والوں کے آثار ان صفحوں میں محفوظ ہو جائیں گے کیونکہ یہ آثار اور ان کو سنبھالنے والے بڑی تیزی سے بکھر رہے ہیں۔

اس سالنامے میں کئی افسانے بھی شامل ہیں جن میں سے زیادہ تر نئے لکھنے والوں نے لکھے ہیں

مشہور نام تو ایک واجدہ تبسم ہی کا ہے ویسے ان کی کہانیاں اب زیادہ تر ایک ہی فارمولہ کی ہو کر رہ گئی ہیں۔

دوسرے افسانوں میں اصلاحی پہلو نمایاں ہے جس کی کچھ اور تراش خراش ہو جاتی تو وہ زیادہ نکیلے اور کٹیلے بن کر اور زیادہ با اثر ہو جاتے۔ کالگوں سے پرہیز ہمارے نوجوانوں میں صحت مند رجحان کو ظاہر کرتا ہے۔ احمد عثمانی کے بے نام افسانوں کے بے نام کرداروں کی زبان ایک سوالیہ ہے جو پوچھ رہا ہے کہ ایا ہماری آئندہ زبان اسی طرح کی ہو گی۔ ایک کردار کی زبان سے نکلا ہوا ایک جملہ دیکھی کے چاولوں کی نمائندگی کے لئے آپ کے سامنے پیش ہے:

"یار تو یہ ادھورے قصے نہ سنایا کر۔ سالا ذہن بھٹک جاتا ہے کہ اس قصے میں یہ ہوا ہوگا"۔

جدید سائنس و ٹکنالوجی (جن کی بہت زیادہ ضرورت اردو والوں کو ہے) کے بارے میں کوئی مضمون اس سالنامہ میں شامل نہیں ہے مگر طب کے بارے میں چند اچھے مضامین شائع کئے گئے ہیں۔ ایسے مضامین شاہین کی بلند پروازی میں معاون ہوں گے۔

احمد کلیم فیض پوری اور محمد فاروق اعظمی کے تبصرے تبصرہ نگاری کا حق پورا کرتے ہیں۔

جملہ ۴۰ صفحوں پر مشتمل قدیم و جدید شعراء کی شعری تخلیقات اپنی اہمیت آپ ہیں اور ان میں اچھی اچھی غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ تو بھی یہ تبصرہ نگار سوچتا ہے کہ کب تک ہم اور ہمارے تخلیق کار فردوس خیالی میں بیٹھے بتوں کو تراشتے رہیں گے!!

بے لاگ طریقہ سے کہا جا سکتا ہے کہ شاہین کا یہ سالنامہ ایسے عام سالناموں سے مختلف ہے جنہیں بہت سارے لائبریرین ختم سال بے ردی کے حوالے کر دیتے ہیں۔ تاہم سائنس و ٹکنالوجی کے متعلق مضامین شامل کئے جائیں اور عام تعلیم و تعلم کی طرف بھی توجہ کی جائے تو یہ سالنامہ مزید مفید اور بار آور ثابت ہوگا۔

(ا - و - ش)

کتاب کا نام: خرگوش پروری مصنف: ڈاکٹر محمد عماد الدین

رفقائے کار: مسٹر غلام احمد، ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال

ناشر: حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس - ہیڈکوارٹرز - حیدرآباد ۱

سنہ اشاعت - ۱۹۸۴ء قیمت دو روپیے

صفحات - ۲۳ (سرورق اور اشتہارات کے صفحات اس کے علاوہ ہیں)

زیر نظر کتاب جیسا کہ اس کے عنوان اور ذیلی عنوان سے واضح ہوتا ہے خرگوش پروری

اس کی نشوونما نیز اس کی تجرباتی اور معاشی اہمیت کے بارے میں مختصر سی کتاب ہے۔ ایک صدر شعبہ علاج حیوانات ایک زراعتی ماہر اور ایک اردو کے لکچرر نے مل کر اس کتاب کو لکھا ہے اور اسے مفید تر بنانے کی کوشش کی ہے۔

آج کل اردو زبان میں شائع ہونے والی کتابوں کی اکثریت ادبی کتابوں پر مشتمل ہوتی ہے اس میں شعر و شاعری سرفہرست ہے لیکن اردو داں طبقہ خصوصاً نوجوان نسل زندگی کی جدوجہد میں آگے ہی آگے بڑھ رہی ہے اور کچھ کرنا چاہتی ہے۔ صرف مشاعرے سن کر کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ آج انہیں رہنما کتابوں کی سخت ضرورت ہے۔ خرگوش پروری کی اشاعت اس لحاظ سے وقت کا ایک اہم قدم ہے جس کا اندازہ کتاب میں شامل سرخیوں سے ہوتا ہے۔

خرگوش کی خصوصیات۔ خرگوش دنیا کے ہر حصہ میں پایا جاتا ہے۔ خرگوش کی اقسام سرد ملکوں کے خرگوش، گرم ملکوں کے خرگوش، خرگوش کے بھٹ۔ کسان اور چرواہے خرگوش سے نا۔ جنگلی خرگوش کا شکار۔ پالتو خرگوش، کسانوں کی معاشی خوشحالی کا ایک ذریعہ۔ خرگوش کی نسل بڑی تیزی سے پھیلتی ہے۔ خرگوش کی معاشی اہمیت۔ آسٹریلیا کے خرگوشوں سے لاکھوں پونڈ کی آمدنی۔ یورپ اور امریکہ میں خرگوش کی پرورش اور اس سے آمدنی۔ خرگوش کا گوشت بطور غذا۔ خرگوش کے بالوں کے لباس۔ خرگوش پروری میں ترقی کے امکانات۔ خرگوش کی غذا، پانی، ہوا۔ خرگوش کا گھر، گھاس کا بستر۔

کتاب پڑھنے کے بعد دل میں ایک امنگ پیدا ہو گئی کہ واقعی یہ ایک منفعت بخش پیشہ ہے۔ میں نے تصور کیا کہ میں ایک نوجوان گریجویٹ ہوں، نوکری کرنا نہیں چاہتا اور چاہوں تو بھی ملتی کہاں؟ کہیں نہ کہیں سے کچھ نہ کچھ سرمایہ بھی فراہم کر سکتا ہوں۔ شہر سے قریب زراعتی علاقہ میں رہ بھی سکتا ہوں۔ محنتی بھی ہوں اور پیشہ کی عزت بھی سمجھتا ہوں۔ خرگوش پروری کے بارے میں بھی میں سوچ سکتا ہوں۔ اس نقطۂ نظر سے میں نے کتاب پڑھی اور میرے سامنے حسب ذیل سوال آ گئے:

خرگوش پروری کی ابتدا کے لئے کم از کم کتنا سرمایہ درکار ہوگا اور اس سے مجھے ماہانہ کتنی آمدنی ہو سکتی ہے اور اس کے لئے کتنا عرصہ لگے گا؟ خرگوش کا ایک فارم بنانے کے لئے (جس کی آمدنی سے میں خود مکتفی ہو جاؤں) کتنی جگہ درکار ہوگی اور کتنے افراد کو متعین کرنا ہوگا؟ اپنے فارم کے لئے اعلیٰ نسل کے خرگوش کفایت کے ساتھ حیدرآباد میں، آندھرا پردیش، ہندوستان میں کہاں سے خریدوں؟ کیا حیدرآباد، آندھرا پردیش، ہندوستان میں کوئی ایسا ادارہ ہے جو میرے مجوزہ فارم کے بارے

میری رہنمائی کرے ؟ مزید کونسی کتابیں انگریزی میں یا اردو میں ایسی ہیں جن سے خرگوش پروری کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں ؟

ان سوالات کا جواب بہت والے نوجوانوں کی رہنمائی کے لئے ضروری ہے۔ ایک مختصر ضمیمہ مندرجہ بالا سوالات کی تکمیل کر کے زیر نظر کتاب میں شامل کر دیا جائے تو کتاب مفید تر سے مفید ترین ہو جائے گی۔ بطور یاد دہانی آج کل کے بچے باغ عامہ میں نہیں بلکہ زوگارڈن میں خرگوشوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔

مصنف کے ایک رفیق کار کا نام سرورق پر غلام محمد اور اندرونی صفحہ پر غلام احمد طبع ہوا ہے غالباً پروف میں تصحیح نہیں ہو سکی۔

ایجوکیشنل کانفرنس اور اس کے لائق معتمد ڈاکٹر یوسف الدین صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ اردو میں ایک مفید کتاب شائع کی ہے۔ امید کہ مختلف اکاڈمیز اور ادارے اس کتاب پر انعام دیں گے اور ایجوکیشنل کانفرنس کی ہر طرح سے اعانت کریں گے۔

یہ بھی ایک جدت ہے کہ اس کتاب میں ایجوکیشنل کانفرنس، اس کے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں تفصیل بیان کی گئی ہے اور اس کے ممبروں کی تفصیل شائع کی گئی ہے، جو مقامی تاریخ کی خاطر محفوظ رہنا چاہیئے۔

(ا - د - ش)

عربی کا سبق

واحد، تثنیہ، جمع

تعداد کے اعتبار سے اسم کی تین قسمیں ہیں :۔
۱۔ واحد ۔ وہ اسم جو ایک پر دلالت کرے ۔ مثلاً وَلَدٌ (ایک لڑکا) اِمْرَءَةٌ (ایک عورت)، طَاوِلَةٌ (ایک میز)، بَیْتٌ (ایک مکان)۔

۲۔ تثنیہ ۔ وہ اسم جو دو پر دلالت کرے ۔ تثنیہ بنانے کے لئے واحد کے آگے "ان" اضافہ کرتے ہیں ۔ مثلاً ۔ ولد+ان = وَلَدَانِ (دو لڑکے) اِمْرَءَتَانِ (دو عورتیں)، طَاوِلَتَانِ (دو میز)، بَیْتَانِ (دو مکانات)

۳۔ جمع ۔ وہ اسم جو دو سے زیادہ پر دلالت کرے ۔ مثلاً اَوْلَادٌ (لڑکے) نِسَاءٌ (عورتیں)، طَاوِلَاتٌ (میزیں)، بُیُوتٌ (مکانات)۔

جمع : عربی میں جمع دو قسم کی ہوتی ہے ۱۔ جمع سالم ۲۔ جمع مکسّر

۱۔ جمع سالم ایسی جمع ہے جس میں واحد اسم کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں کچھ اضافہ کیا جاتا ہے ۔ مذکر کی جمع کے لئے "ون" اور مونث کی جمع کے لئے "ات" کا اضافہ کرتے ہیں مثلاً

مُسْلِمٌ + ون = مسلمون مُسْلِمَةٌ + ات = مُسْلِمَاتٌ

اگر واحد مونث کے آخر میں تائے تانیث ہو تو جمع سالم بناتے وقت وہ گر جاتی ہے، جیسے :

صَالِحَةٌ = صَالِحَاتٌ مُعَلِّمَةٌ = مُعَلِّمَاتٌ

تثنیہ کے "ان" اور جمع سالم کے لئے "ون" اسم کی حالت نصبی میں لگایا جاتا ہے ۔

حالت نصبی اور حالت جری میں "ان" اور "ون" کو "ین" سے بدل دیا جاتا ہے ۔

حالت رفعی = هٰذَانِ بَیْتَانِ (یہ دو گھر ہیں) حالت نصبی = رَاَیْتُ بَیْتَیْنِ (میں نے دو گھر دیکھے)

حالت رفعی = اُولٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا (یقیناً وہ مومن ہیں)

حالت نصبی = وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ مَسٰكِنَ طَیِّبَةً (اللہ نے مومنین کے لئے عمدہ مکانات کا وعدہ کیا ہے)

" " = اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ (بے شک اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے) ۔

حالت جری ـ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (مومنوں کیلئے) لِلْمُسْلِمِيْنَ (مسلمانوں کے لئے) ـ

۲ ـ جمع مکسّر ـ ایسی جمع ہے جس میں واحد اسم اپنی اصلی شکل میں برقرار نہیں رہتا ـ جمع مکسر بنانے کے کئی اوزان ہیں، یہاں چند مثالیں درج ہیں ـ

۱ ـ رَجُلٌ ـ رِجَالٌ (بہت مرد) بروزن فِعَالٌ ـ ۲ ـ قَوْلٌ ـ أَقْوَالٌ (باتیں) بروزن أَفْعَالٌ

۳ ـ جَدِيْدٌ ـ جُدُدٌ (نئے) بروزن فُعُلٌ ـ ۴ ـ ضَيْفٌ ـ ضُيُوْفٌ (مہمان) بروزن فُعُوْلٌ

العدد NUMBER

واحد	جمع	معنیٰ	واحد	جمع	معنیٰ
مِنْضَدَةٌ	مَنَاضِدُ	(میز)	مُعَلِّمٌ	مُعَلِّمُوْنَ	(مدرس)
كُرْسِيٌّ	كَرَاسِيُّ	(کرسی)	تِلْمِيْذٌ	تَلَامِيْذُ	(طالبعلم)
مَائِدَةٌ	مَوَائِدُ	(دسترخوان)	مِفْتَاحٌ	مَفَاتِيْحُ	(کنجی)
حَدِيْقَةٌ	حَدَائِقُ	(چمن)	أَبٌ	آبَاءٌ	(باپ)
فَاكِهَةٌ	فَوَاكِهُ	(میوہ)	أُمٌّ	أُمَّهَاتٌ	(ماں)
ثَمَرٌ	أَثْمَارٌ	(پھل)	أَخٌ	إِخْوَةٌ	(بھائی)
كُوْبٌ	أَكْوَابٌ	(گلاس)	أُخْتٌ	أَخَوَاتٌ	(بہن)
فِنْجَانٌ	فَنَاجِيْنُ	(پیالہ)	اِبْنٌ	أَبْنَاءٌ	(بیٹا)
طَبَقٌ	أَطْبَاقٌ	(رکابی)	قِرْطَاسٌ	قَرَاطِيْسُ	(کاغذ)
صَحْنٌ	صُحُوْنٌ	(صحن)	كَلِمَةٌ	كَلَامٌ	(لفظ)
شَيْخٌ	شُيُوْخٌ	(بوڑھا)	بَلَدٌ	بُلْدَانٌ / بِلَادٌ	(شہر)
كَهْلٌ	كُهُوْلٌ	(ادھیڑ)	عَبْدٌ	عَبِيْدٌ / عِبَادٌ	(بردہ غلام) (اللہ کے بندے)
أُسْبُوْعٌ	أَسَابِيْعُ	(ہفتہ)	أَمَةٌ	إِمَاءٌ	(کنیز)
إِصْبَعٌ	أَصَابِعُ	(انگلی)	هَدِيَّةٌ	هَدَايَا	(تحفہ)
مِلْعَقَةٌ	مَلَاعِقُ	(چمچہ)	شَارِعٌ	شَوَارِعُ	(سڑک)
جِدَارٌ	جُدُرٌ	(دیوار)	رِيَالٌ	رِيَالَاتٌ	(ریال)
دُكَّانٌ	دَكَاكِيْنُ	(دکان)	قِرْشٌ	قُرُوْشٌ	(چھوٹا سکہ)
مَنْزِلٌ	مَنَازِلُ	(مکان)	كُرَةٌ	كُرَاتٌ	(گولا)

حرف آخر

شاداب کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ حضرت مولانا دامت برکاتہم کا انٹرویو دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ آپ کا موقر جریدہ پابندی سے مل رہا ہے۔ مضامین کا تنوع، ترتیب کا حسن اور دین و ادب کے ملاپ نے بڑی کشش پیدا کردی ہے

"اللہ کرے حسن ترا اور زیادہ"

(اسحٰق حسینی ندوی۔ حلقہ پیام انسانیت)

شاداب پابندی سے موصول ہو رہا ہے۔ شاداب کے تمام مضامین بقول شاعر ؎

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

مختصر یہ کہ تمام مضامین اپنی انفرادی حیثیت و نوعیت کے مالک ہوتے ہیں اور رسالہ بھی اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ اس کے لئے آپ واقعی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

(عبد العزیز عرفاں۔ اکوٹ مہاراشٹرا)

شاداب کی مجلس مشاورت میں تقریباً سبھی نام اچھے خاصے جانے پہچانے ہیں۔ ان میں خواجہ عبد الغفور صاحب کی ناگہانی رخصت تمام اردو دنیا بالخصوص مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ شاداب کے اس میرمجلس اس نیک نفس، شریف الطبع وضعدار، پاک طینت صاف ستھرے، سنجیدہ اور متین شخصیت کے انتقال پر اظہار تعزیت کرتا ہوں۔

شاداب واقعی اسم بامسمیٰ ادب کا ایک شاداب نخلستان ہے۔ سائز کی انفرادیت کے علاوہ مضامین کا تنوع اور جدید و قدیم کی تفریق سے ہٹ کر حقیقی ہم عصر ادب کی نمائندگی اس رسالے کی اہم خصوصیات ہیں۔ خدا بصیر تر تمام ارباب اردو کو توفیق عطا کرے کہ وہ اردو کے اس گلشن کی آبیاری کرکے ہر سو اسے شاداب رکھنے میں آپ کی معاونت کریں۔

محبوب راہی

(بارسی ٹاکلی۔ مہاراشٹرا)

شاداب کے شمارے نظر سے گذرے۔ اس پر آشوب گرانی اور اردو والوں کی رسائل سے بے اعتنائی کے دور میں، میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ "اردو والے" اردو رسائل پڑھتے ہی نہیں، پڑھتے ہیں، خرید کر پڑھنے کا رجحان کسی حد تک گھٹ گیا ہے اور پھر ادبی رسائل کے خریدنے کا فیصد تو معدودے چند کی حد تک گھٹ چکا ہے، اس دور میں آپ اپنے قدم جمانے کی کوشش بڑی تیزی سے کر رہے ہیں، مبارکباد تجارتی نقطہ نظر سے تو آپ کا رسالہ یقیناً خسارہ ہی میں ہوگا۔ لیکن اردو کی بقاء و ترویج کیلئے جو آپ کر رہے ہیں وہ یقیناً ثمر آور ہوگی۔ خیر میں خود دراصل اپنے موضوع سے ہٹ گیا ہوں۔ میرے اس خط کے تحریر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کے رسالہ کی ادبی اہمیت پر روشنی ڈالوں۔

اب تک جن شماروں کو میں پڑھ چکا ہوں، اس سے یہ بات کسی حد تک کہی جاسکتی ہے کہ آپ مضامین کا انتخاب خوب کرتے ہیں اور اس بات کا کسی حد تک انصاف بھی کرتے ہیں کہ قاری کے ذوق کی مکمل نہ سہی جزوی طور پر تسکین ہو۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہر قاری کسی نہ کسی موضوع سے ایک خاص شغف رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کے رسالہ میں مختلف موضوعات پر مضامین ہوتے ہیں تاکہ ہر ذوق کے تقاضوں کی تشنگی دور ہو۔ آپ کے رسالہ میں مجھے ادبی، نیم ادبی، سائنسی، معلوماتی، طبی اور تحقیقی مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، یہ ایک طرح سے اردو کا زکی عملی حمایت ہے۔

ماہ اگست ۸۴ء کا شمارہ نظر سے گذرا۔ اس مرتبہ آپ نے دوسری زبانوں کے ادب کی اہمیت کو اردو قارئین سے روشناس کروایا ہے اور قسط وار سلسلہ "سفرنامہ حرمین" ایک نومسلم کی ایسی تصنیف ہے جس کے پڑھنے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ گذرے ہوئے وقت کی صحیح تصویر اور حال کے آئینہ میں اس کی اہمیت اسلاف کی اخلاقی پاکیزگی کی مظہر۔

لکشمن کی "ابرا"، انگلستان سے ایک خط، "خلاء و مہوک" مضامین اور خاص طور پر میر لائق علی صاحب کا مضمون "دکن کا داغ — صفی" - یہ موضوع انہوں نے بڑا اچھا چنا ہے۔ حقیقت پسندی سے دیکھا جائے تو صفی مرحوم کی شاعرانہ عظمت سے کون انکار کرسکتا ہے اس پر ابھی بہت تحقیقی کام کیا جاسکتا ہے میر لائق علی نے صفی مرحوم کو دکن کا داغ کہہ کر نہ صرف دکن والوں کی اہمیت کو اجاگر کیا بلکہ ریسرچ کرنے والے طلبا کے لئے اچھوتی راہیں استوار کی ہیں۔

آپ کا "شاداب" ہمیشہ شاداب رہے اور افکار کی گلشن سدا مہکتا ہی رہے۔

محمد حمید الظفر - ایس وی آر ایڈیٹر ہیمورٔیل اسٹریٹ، حیدرآباد

غزل
حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز
مترجمہ رشید انصاری

(ماہنامہ "شاداب" بابت جولائی ۱۹۸۴ء میں جناب میر لائق علی نے "اردو کے پہلے صوفی شاعر و ادیب" کے عنوان سے حضرت سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کو روشناس کرایا ہے۔ میں قارئین "شاداب" کو حضرت موصوف کی ایک تصنیف "بحر المعانی" کی فارسی غزلوں سے واقف کراتا ہوں۔ ایک دوست کی فرمائش پر حضرت شیخ عبد اللطیف لاابالی رحمۃ اللہ علیہ کی دو قلمی کتابوں کو (جو دکنی زبان میں ہیں) مروجہ اردو زبان میں ڈھالا۔ ان کتابوں میں شعرائے متقدمین کا جتنا کلام ہے میں نے ان سب کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے۔ حضرت لاابالی رحمۃ اللہ علیہ نے بحر المعانی سے جو غزلیں نقل کی ہیں میں یہاں فارسی غزلیں مع اردو ترجمہ پیش کرتا ہوں یہ کہتے ہوئے کہ "فارسی پڑھیے ملیں گے نقشہائے رنگ رنگ")
(رشید انصاری)

ما از ازل، امروز که آشفته و مستیم
آشفته نگوئیم که آشفته شده ستیم
زاں ساقی بدمست که امروز در آمد
صد عذر بگفتیم ازاں مست نه رستیم
زاں باده که داری و ازیں عقل که از ما
معذور همی دار که ما جام شکستیم
رندان خرابات بخوردند و برفتند
مائیم که جاوید بخوردیم و نشستیم
بالا همیں باغ آمد و پستی به همیں کنج
ما بوالعجبانیم، نه بالا و نه پستیم
هرچند پرستیدن بت مایه کفر است
ما کافر عشقیم، گزیں بت نه پرستیم
یک لحظه، بلانوش ره عشق قدیمیم
یک لحظه بلی گوئے مناجات الستیم
با هستی خود، او بر ما کرد تجلی
هستیم برآں شان که ندانیم که هستیم
امروز سر زلف تو مستانه گرفتیم

ازل سے آج تک ہم لوگ ہیں مست اور آشفتہ
ہوئے آشفتہ سر ایسے، نہیں کہتے پراگندہ
اک ایسا ساقی بدمست آیا خانۂ دل میں
بہت کی عذر خواہی پھر بھی اس نے مست کر ڈالا
شراب کہنہ تری اور ہماری عقل ناکارہ
بہت معذور ہیں ہم، جام چکنا چور کر ڈالا
چڑھائی، اور رفو چکر ہوئے سب رند میخانہ
ہمیں بیٹھے ہوئے، پیتے ہوئے ہر ایک نے دیکھا
ہم آئے باغ جنت سے گرے اس کنج پستی میں
تحیر کی جگہ ہے، ہم نہیں ہیں پست یا بالا
اگرچہ بت پرستی کفر کا سرمایہ ہے لیکن
ہیں کافر عشق کے ہم ایسے بت کی کیوں کریں پوجا
کبھی ہم کو بلا خواہ رہ عشق ازل کہیے
کبھی قالوا بلیٰ کہتے ہوئے آگے بڑھے گویا
بذات خود ہمارے روبرو یوں جلوہ فرما تھا
کہ ہم واقف نہ تھے "ہم ہیں" کچھ ایسا تھا وجود اپنا
تری زلفوں کو ہم نے عالم مستی میں پکڑا ہے

غزل — حضرت خواجہ بندہ نوازؒ

ترجمہ رشید انصاری

آہ! درآں شمع منور چہ بود	نہیں معلوم اس شمع منور میں وہ کیا شئے تھی
آتشے زد در دل و در شش جہت	لگا دی آگ کیسی شش جہت میں اور دل میں بھی
اے زدہ اندر دل من آتشے	لگا دی آگ میرے دل میں چپکے سے میں حیراں ہوں
سوختم اے دوست! بیا زود زود	میں جلتا ہوں خدا کے واسطے اے دوست آ جلدی
صورت دل صورت مخلوق نیست	اگر حسن خدا نے دل کی صورت جلوہ دکھلایا
گر رخ دل حسن خدا رو نمود	نہیں ہے صورت دل صورت مخلوق کی جیسی
جانِ من! اول کہ بدیدم ترا	تجھے پہلے پہل جب میں نے دیکھا تھا مرے جاناں!
جانِ من! از جان تو چیزے شنود	تو میری جان تیری جاں سے کوئی بات سنتی تھی
جز شکرش نیست مرا چارۂ	سوائے اس کی شکر کے نہیں کوئی مرا چارہ
جز لب او، نیست مرا ہیچ سود	سوائے اس کے لب کے کچھ نہیں ہے میری خوشنودی

غزل

عبدالرحمٰن خاں مرحوم کھام گانوی

(یہ غزل خان صاحب مرحوم کی آخری غزل ہے)

چلا جو گلشن تو ذوق پرواز پر لگا ایک تازیانہ
تو آج رکھتا ہوں دوش برق تپاں پہ بنیاد آشیانہ

نہ چھیڑ مطرب بہار عہد شباب کا پھر کوئی ترانہ
کہ زندگی ہے فریب حسرت، حقیقت عیش اک فسانہ

نہ عزم حیدرؓ، نہ زور خالدؓ نہ دل میں ایماں کا شرارہ
اے پست فطرت، ہے اعتراف شکست تقدیر کا بہانہ

قدم قدم پر ہے اپنی منزل، ہے موج طوفاں ہی اپنا ساحل
شکستہ لنگر ہے کشتی عشق، حسن اک بحر بیکرانہ

غیاب کا حال یہ ہے ہمدم، حضور کا پوچھنا ہی کیا ہے
ابھی تو پہچان ہی نئی ہے ابھی تو چاہت ہے غائبانہ

ہے طالب مرد راہ الفت، ہے عشق صادق تو منزل آساں
اے مرغ پا لنگ و پر شکستہ، بلند ہے شاخ آشیانہ

نہ اب برہمن ہے کفر ساماں نہ شیخ طاعت پہ اپنی نازاں
کسی کی زنار ہے شکستہ، کسی کی تسبیح دانہ دانہ

بیگم عائشہ یوسف الدین رباب

روزگار

(اس نظم میں ایک سیکل رکشا چلانے والے کی بیوی کے تاثرات ہیں۔ اس کے بچے خوبصورت، ذہین ہیں ہر ایک اپنی جماعت میں اول ہے۔ رکشا والا دن بھر محنت کرتا اور اپنے بیوی بچوں کو پالتا ہے لیکن انتھک محنت سے کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ بیوی فکرمند ہے۔ سوچتی ہے کاش وہ کچھ کما سکتی اور اپنے شوہر کا ہاتھ بٹا سکتی —— یہ نظم کوی سمیلن میں سنانے کے لئے لکھی گئی تھی) ——

وہ تھی ایک چھوٹی سی جھونپڑی
جہاں روپ تھا جہاں پریت تھی
جہاں غم کا نام و نشاں نہ تھا
کوئی وہم کوئی گماں نہ تھا
مری رہگذر میں تھا وہ مکاں
وہ زمیں وہ چھوٹا سا سائباں
وہیں ایک رہتی تھی سندری
تبھی ہوتی ستھری سی اک دری
کبھی شاذ آیا ہوا ایسا کام
نہ کیا ہو اس نے مجھے سلام
مگر ایک دن وہ کچھ اور تھی
کہ ہو غم کی جیسے وہ مورتی
لگی اپنے دوار کھڑی ہوئی
وہ تھی چپکے چپکے سے رو رہی
میں نے پوچھا یہ سرِ شام کیا؟
ترے پاس غم کا ہے کام کیا؟

بھری ٹھنڈی سانس وہ بول اٹھی
جو تھا دل میں راز وہ کھول اٹھی
کہا، راہی! تجھ کو بتاؤں میں؟
مرے دل کے زخم دکھاؤں میں؟
مجھے ریت دوارہ پریت ملی
مرے ہر ہر پتھ مجھے جیت ملی
مجھے ہیروں سے بڑھ چڑھ لال ملے
ہر وصف سے مالا مال ملے
ہے مگر گلے میں میرے گھٹن
مرے دل میں رہتی ہے ایک چبھن
کہ وہ گھور رن میں، میں گاؤں کیا
وہ ہے بیچ دھوپ، میں چھاؤں کیا
کوئی کام اس کے نہ آ سکی
نہ ہی اس کا ہاتھ بٹا سکی
مرا ویر سپاہی اکیلا ہے
مرا جیون ساتھی اکیلا ہے
یہی رنج مجھ کو ستائے ہے
مجھے بار بار رلائے ہے

سکندر توفیق

تمہید زمینی

(نوٹ :۔ جیسا کہ اقبالؔ کے تمام محققین اور قدردانوں کو معلوم ہے، اقبالؔ شاعری کے ترجمے کے سخت خلاف تھے ۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں انہوں نے صاف الفاظ میں ترجمہ کی مخالفت اس بنیاد پر کی تھی کہ ترجمہ میں نہ تو شعر کی روح سے انصاف کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کے حسن سے ۔ لیکن وہ شعری تجربہ کی تشکیل نو کے نہ صرف قائل تھے بلکہ اس پر عمل پیرا بھی ـــــ چنانچہ انہوں نے کئی مشرقی اور مغربی شعراء کی خوبصورت نظموں کو اردو اور فارسی کا جامہ پہنایا ہے مثلاً ایمرسن، بھرتری ہری، گائیتری لانگ فیلو، ٹینی سن، عبدالرحمٰن، انوریؔ، خوشحال خاں خٹک، گوئٹے وغیرہ
میں نے بھی اقبالؔ کی پیروی کی کوشش کی ہے چنانچہ "جاوید نامہ" کا مندرجہ ذیل حصہ جس کا عنوان "تمہید زمینی" ہے ۔ ترجمہ سے زیادہ تشکیل نو کی سعی ہے ۔ اس حصہ میں اقبالؔ اور رومیؔ دونوں ہی کا کلام آگیا ہے ۔ ترجمانی پیش ہے لیکن بالکل اردو کے مزاج سے ہم آہنگ کرنے کے بعد ــــ)

(مولانائے رومؒ کی روح نمودار ہو کر اسرار معراج کی تشریح کرتی ہے)

عشق شوریدہ نہیں پابستۂ نحوائے شہر — حکم نم رکھتا ہے اس شعلے کو یہ غوغائے شہر
ڈھونڈ لیتا ہے وہ خلوت، دشت میں کہسار میں — یا لب دریا کسی ویران منظر غار میں
میں کہ یاروں میں مجھے محرم ملے نہ رازداں — ساحل دریا پہ ہوں استادہ گویا شکوہ ساں
موج دریا، اس پہ ہنگام غروب آفتاب — اس شفق سے آب ہے لعل رواں، موج شراب
اپنے دل سے گفتگو ہونے لگی زیر فسوں — آرزو کی، جستجو کی، وہ کہانی کیا کہوں؟
آنی، بیشک ۔ جاودانی سے مگر رشتہ ہے کیا؟ — زندہ، بیشک ۔ زندگانی سے مگر رشتہ ہے کیا؟

بیت ثمین 2/1108-2-2 تلک نگر ۔ حیدرآباد

یاس او تشنہ، مگر کھا گیا چشمے سے دور — درد کا اظہار کر دیتا ہے لحنِ ناصبور

"شیریں کلام دلبر — ہوں حلاوتیں میسر — مجھے آرزو رہی ہے
ترا رخ مری نظر ہو — یہ چمن بہار پر ہو — مجھے آرزو رہی ہے
ترا ہاتھ ہاتھ میں ہو — اور سبو بھی ساتھ میں ہو — مجھے آرزو رہی ہے
رہیں محوِ رقص باہم — سرِ محفلِ دو عالم — مجھے آرزو رہی ہے
کہے ناز سے دل آرا — "مجھے مت ستا خدارا" — رہے اوج پر ستارا
ترے لب پہ ہو دوبارہ — "مجھے مت ستا خدارا" — مجھے آرزو رہی ہے
اے خرد بڑی خوشی سے — تو زقند شوق بھر لے — یا فلک کی سیر کر لے
مرے عشق نکتہ پیدا — مجھے اور کر دے شیدا — مجھے آرزو رہی ہے
میں تو عشق ماہی پیکر — بحر و نہنگ خوگر — مجھے آرزو رہی ہے
دل پر، خراش غم کے — فرعون کے ستم کے — ہامان کے کرم کے
موسیٰ کا پھر عصا ہو — اعجاز رونما ہو — مجھے آرزو رہی ہے
پھرتا ہے شیخ در در — کف پر چراغ لے کر — روشن ہے سارا منظر
ہر سمت دیو و حیواں — ملتا نہیں ہے انساں — مجھے آرزو رہی ہے
ملے سست گام راہی — مرے دل کی ہے تباہی — مرے بخت کی سیاہی
کوئی ہوتا شیر پیشہ — لئے تیز ایک تیشہ — مجھے آرزو رہی ہے
کہا سچ "نہیں ملے گا" — نہیں پھول یہ کھلے گا — مرا دل یونہی جلے گا
نہ ملے وہ شخص پھر بھی — مجھے جستجو رہے گی — مجھے آرزو رہی ہے"

بستر شفاف پر پانی کے پڑ کر سو گئی — موج مضطر اپنی بے چینی پہ آنسو رو گئی
لے گیا سورج، افق کو ساتھ ہی لیتا گیا — ایک ریشہ دامنِ گیتی کو یاد دیتا گیا
شام کی وہ ساری دولت لٹ گئی اندھیر ہے — تارہ، جیسے بام پر ایک بیسوا کی سیر ہے

(روح رومیؒ نمودار ہوتی ہے)

(باقی آئندہ)

ڈاکٹر ایم۔ اے۔ ساجد

سراب منزل

برسوں سے چل رہا ہوں
منزل کی جستجو میں
منزل سراب بن کر
رہتی ہے اوجھل
آنکھوں سے میری ہردم !
تقدیر کا لکھا بھی !
کیسے کہوں میں اس کو
تدبیر کا کرشمہ
کہنا پڑے گا اس کو
سارے رسوخ والے
منزل کو پا چکے ہیں
اور میں بھٹک رہا ہوں
منزل کی جستجو میں !
ان ڈگریوں کو لے کر
جو کام کی بھی ہو کر
کچھ کام کی نہیں ہیں !

—— ⁂ ——

نزد کچی مسجد۔ کھام گاؤں۔ مہاراشٹرا
444303

اسد کھنڈوی

غزل

چھین کر دولت غم خوشی دے گیا
اک تڑپتی ہوئی زندگی دے گیا

وہ فرشتہ نہیں ایک انسان تھا
ان اندھیروں کو جو روشنی دے گیا

بن کے جھونکا بہاروں کا آیا تھا وہ
کتنے روتے ہوؤں کو ہنسی دے گیا

رکھ دیئے ہونٹ پر ہونٹ جلتے ہوئے
چوم کر لب مرے تشنگی دے گیا

زندگی کا سفر ختم کیوں ہو اسد
موت دے کر نئی زندگی دے گیا

—— ⁂ ——

اسد اللہ خاں اسد۔ ڈی ایچ ایم۔ ایم ایس پردیسی پورہ کھنڈوہ

غزل

کامران نجمی

یوں ہی سبھی کہ کرمک شب تاب مر نہ جائے
تاریکیوں پہ حادثہ ایسا گذر نہ جائے

احساس کے بدن کو لہو میں ڈبوئے رکھ
یہ زخم جاں گداز کسی وقت بھر نہ جائے

میرا بھی کچھ قصور ہے اس میں اسے بچاؤ!
الزام خود نمائی کا اس کے ہی سر نہ جائے

اتنا نہ اس فضا میں اڑا مجھ کو اے ہوا
آشوب رنگ و بو میں مرا خواب مر نہ جائے

ہوں جستجوئے ذات میں سب لوگ گم اگر
پستی میں کوئی آسماں کیسے اتر نہ جائے

لے دے کے اک یہی تو متاع فقیر ہے
آنکھوں سے اشک روح سے تنہائی ڈر نہ جائے

ہے وجہ کامرانی یہی گردش مدام
سورج مرے نصیب کا نجمی ٹھہر نہ جائے

محمد عارف۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ (۸۰۰۰۰۴)

غزل

محمد الوصالح
سہسرانوی

بدلا جہاں شوق کا تیور دکھائی دے
الجھا تیوں سے آج کا آذر دکھائی دے

ٹوٹا ہوا اک آئینہ بستر شکن شکن
کمرے میں بند آندھی کا منظر دکھائی دے

سینے میں آگ ہونٹوں پہ ویران قہقہہ
آنکھوں میں بے بسی کا سمندر دکھائی دے

زندہ دلی تو یہ ہے کہ مقتل میں شان سے
نیزوں پہ مسکراتا ہوا سر دکھائی دے

انداز شکوہ یہ ہو کہ محشر بھی ہو خموش
یہ کیا ذرا سی بات پہ خنجر دکھائی دے

معرفت نیاز اعظمی۔ سی۔ ۴۱ آریہ پل [illegible]
[illegible]

شرائطِ معمہ

۱۔ معمہ کی کوئی فیس نہیں لی جائے گی
۲۔ معمہ صرف شاداب میں چھپے ہوئے خاکوں پر قبول کیا جائے گا ۳۔ انعام صرف صحیح حل پر دیا جائیگا
۴۔ ایک سے زیادہ صحیح حل ہونے کی صورت میں قرعہ اندازی سے انعام پانے والے کا تعین کیا جائے گا اور انعام میں ایک سال تک شاداب بھجوایا جائے گا۔
۵۔ صحیح حل بھیجنے والے بقیہ اصحاب کے نام شاداب (۵۰) فیصد رعایت سے جاری کیا جائے گا۔
۶۔ اگر انعام یافتگان پہلے ہی سے شاداب کے خریدار ہوں تو ان کے بتائے ہوئے نام پر شاداب جاری کیا جائیگا۔

اشارے (آڑے)

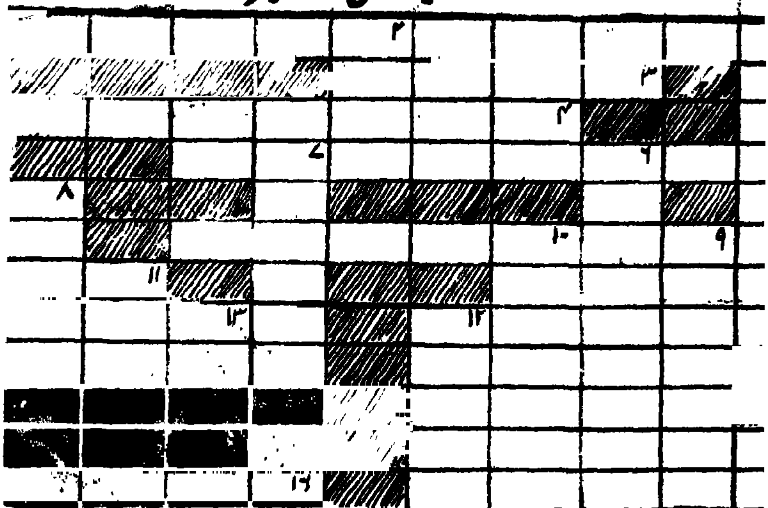
۱۔ ایک جلیل القدر پیغمبر کے بھائی جو ہمیشہ ان کے دست راست بنے رہے (۵)
۲۔ یہ عقیدہ تمام ادیان میں کسی نہ کسی شکل میں پایا جاتا ہے۔ (۵)
۳۔ اقبال کی ایک مقبول عام نظم جس کی بعض حلقوں میں شدید مخالف ہوئی تھی (۴)
۴۔ امریکہ کے سابق صدر نکسن کے ساتھ یہ نام لازم و ملزوم ہو کر رہ گیا ہے (۷)
۵۔ خلائی پرواز کرنے والوں کو ...... بھی کہا جاتا ہے۔ (۸)
۱۰۔ یونان قدیم کا ایک نامی حکیم جس کو استاد اول بھی کہتے ہیں۔ (۵)
۱۴۔ اس دشت جگر تاب کی خاموش فضا میں فطرت نے فقط ریت کے ٹیلے کیے تعمیر
...... کی عظمت سے نگونسار ہیں افلاک کس دست نے کھینچی ابدیت کی یہ تصویر (۵)
۱۵۔ چٹانوں پر بنایا نقش دل کی بیقراری کا سکھایا گر اسے ...... کی آئینہ داری کا (۵)
۱۶۔ نظام الملک ...... ملک شاہ سلجوقی کا وزیر با تدبیر، عمر خیام اور حسن بن صباح کا ہم مکتب تھا (۴)

اشارے (کھڑے)

۱۔ ...... دنیا کا سب سے طویل اردن ڈیم جو اڑیسہ میں واقع ہے (۸)
۶۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ایک ناول جو لکھنؤ اور نینی تال کے پس منظر میں لکھا گیا ہے (۸)
۷۔ امرتسر میں سرکار کی حالیہ فوجی کارروائی کے دوران سکھوں کی اس مقدس عمارت کو نقصان پہنچا (۷)
۸۔ رابندرناتھ ٹیگور کا شعری مجموعہ جس پر انہیں نوبل پرائز ملا تھا (۸)
۹۔ خلفائے عباسیہ کا ایک طاقتور حکمران جس کے عہد میں فرقہ معتزلہ کو عروج حاصل ہوا (۵)
۱۰۔ ...... میرگی بنانے کا قافلہ مورنا تواں کا ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا (۵)
۱۱۔ راجہ دسرتھ کی ایک بیوی جس کے بطن سے لکشمن جی نے جنم لیا (۵) — ۱۲۔ اس مذہب کے ماننے والوں کا بنیادی مسلک اہنسا ہے (۵)
۱۳۔ ایک عظیم یونانی مفکر جس کا اثر جدید تجرباتی سائنس کے احیاء سے پہلے تمام مروجہ علوم پر محیط تھا (۵) -

□□

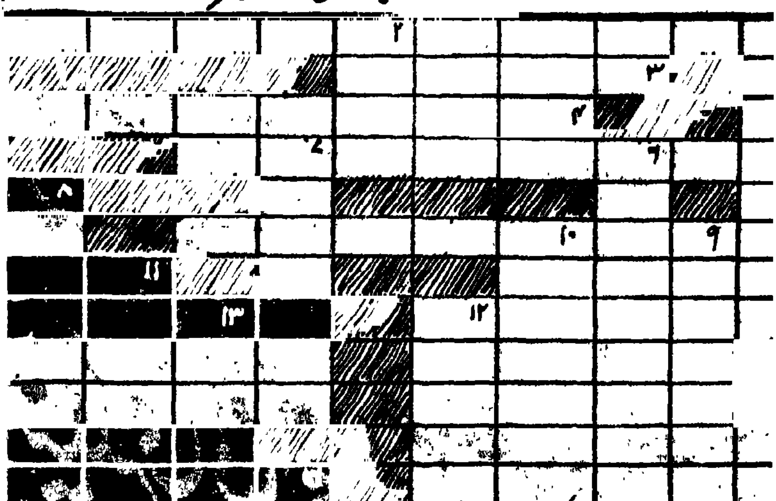
خاکہ شاداب علمی معمہ نمبر ا



میں اقرار کرتا ہوں کہ اس معمہ کے تعلق سے شاداب کا ہر فیصلہ مجھے منظور ہوگا

نام . . . . پتہ . . . .

خاکہ شاداب علمی معمہ نمبر ا



میں اقرار کرتا ہوں کہ اس معمہ کے تعلق سے شاداب کا ہر فیصلہ مجھے منظور ہوگا

نام . . . . پتہ . . . .

Regd. No. H/HD 593.

Monthly **SHADAAB** Hyd

11-5-147, RED HILLS, HYD-500 004.

Vol 1 No 10

SEPTEMBER 1984.

میرے افکار کے گلشن میں جو جھانکے کوئی
دور تک منظرِ شاداب دکھائی دے گا



علمی، ادبی، دینی و سماجی اقدار کا نمائندہ

ماہنامہ

شاداب
حیدرآباد

جلد (۱) — اکتوبر سنہ ۱۹۸۴ء — شمارہ (۱۱)

مجلسِ مشاورت

ایڈیٹر
محمد قمر الدین صابری

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
دو سالہ	90 "	270 "	65 "	36 "	225 " "
تاحیات	1000 "	2500 "	450 "	300 "	2000 " "

خط و کتابت کا پتہ: 11-5-147 [illegible] حیدرآباد 500004 اے پی

[illegible] پبلشر محمد قمر الدین صابری نے [illegible] حیدرآباد میں چھپوا کر دفتر رسالہ [illegible] سے شائع کیا

فہرست

حرفِ اوّل

پارلیمانی الکشن قریب آرہے، اُردو کا ذکر بھی اخباروں میں بڑھتا جارہا ہے۔ سیاسی جماعت کی طرف سے وعدے وعید کیے جارہے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر الکشن سے پہلے ایسا ہ ہے اور الکشن کے بعد خاموشی ۔ اس صورت حال کے ذمہ دار بڑی حد تک اُردو والے ہی ہیں۔ ہما اسٹیٹ میں اُردو میڈیم اسکولوں میں طلباء کی تعداد کافی کم ہوگئی ۔ برسوں یہی حال رہا۔ حکومت پہلے تو ایسے ایک سے زاید مدرسوں کو ایک ہی عمارت میں منتقل کردیا ۔ اور پھر یہ تصفیہ کیا کہ ان مدار کو ضم کرکے ایک ہی مدرسہ کردیا جائے اور باقی مدارس کی تخفیف عمل میں آئے ۔ اُردو مدارس پر اُردو داں اساتذہ کا تقرر ہوتا ہے ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اُردو والے اساتذہ کافی تعداد دستیاب بھی نہیں ہیں ۔ حکومت نے اُردو اکیڈیمی قائم کی ۔ اُردو کی بقاء کے لیے کام کرنے کی بجائے اکی کے سربراہوں نے آپس میں لڑنا شروع کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے اُردو اکیڈیمی کی امداد ہی بند کر اور جو تھوڑے بہت کام کررہے تھے وہ بھی بند ہوگئے ۔ اُردو والے مطالبہ کرتے ہیں کہ حکومت یہ تصفیہ کرے حکومت وہ حکم دے، حکومت اُردو کو زبانِ دوم قرار دے وغیرہ وغیرہ ۔ مگر خود اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہ کرتے ۔ اگر اُردو والے چاہتے ہیں کہ اُردو باقی رہے اور ترقی کے راستے پر گامزن رہے تو انہیں اپنے اپنے مقام پر انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح سے یکسانگی، مستقل مزاجی اور ہوش مندی سے کام کرنا ہوگا۔ تب اُردو والوں کا مقصد پورا ہوسکتا ہے اور اسی صورت میں سیاسی لیڈر اور سربراہانِ حکومت اُردو کے صرف وعدے نہیں کریں گے بلکہ عملی اقدام کے لیے بھی تیار ہوں گے ۔

"شاداب" کو اس بات پر ناز تھا کہ ہر ماہ کا شمارہ اس کے پہلے کے مہینے کی ۲۶ و ۲۷ تاریخوں میں

رپوسٹ کردیا جاتا تھا اس طرح اگر اس ماہ سے دو تین قبل پہلے نہیں تو کم از کم پہلی تاریخ کو ضرور قارئین کے ہاتھوں میں ہوتا تھا۔ مگر کرفیو کی پابندیوں نے اس امتیاز کو متاثر کردیا ہے۔ اگست کا شمارہ تو جوں توں کر کے اس کے ابتدائی تاریخوں میں ڈاک کے حوالے کیا گیا تھا۔ ستمبر کے شمارہ کی ترسیل میں ایک ہفتہ کی تاخیر ہو گئی اس کے بعد چونکہ کرفیو کی وجہ سے ٹائپ کا کام متاثر رہا۔ خبر نہیں وہ شمارہ قارئین کو کب ملا؟ اکتوبر کے شمارہ کیلئے تو مشکلات اور بڑھ گئیں کہ شاداب کے کاتب اور پریس کرفیو زدہ علاقہ میں ہیں اور ادارہ شاداب کی پہنچ سے باہر۔ پھر بھی کوشش کی گئی ہے کہ شاداب وقت پر قارئین کو مل جائے اس کیلئے مجبوراً کچھ صفحات کم کرنے پڑے جس کا ہمیں افسوس ہے۔

لیڈی ایولن کبولڈ زینب

سفرنامہ حرمین

آنحضرت صلعم کا حجتہ الوداع

سنہ ھ میں آنحضرت صلعم نوے ہزار حاجیوں کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے۔ یہ سفر خوشی اور رنج کا مجموعہ تھا۔ آپ نے مختلف قبائل کی ایک ایسی قوم کو جو لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے متفرق تھی متحد کر دیا تھا۔ اور بت پرست قوم کو خدائے واحد کی عبادت کا طریقہ سکھا دیا تھا۔ یہ کام بیس سال کی محنتوں اور قربانیوں کے بعد ہوا تھا۔ دس برس تک تو آپ مکے میں انواع و اقسام کی تکلیفیں اٹھاتے رہے اس کے بعد جب مدینہ پہنچے تو وہاں دس برس مسلسل لڑائیوں میں گذرے۔ آپ مسن آدمی تھے اور آپ کو اس کا علم ہو چکا تھا کہ آپ تبلیغ رسالت کا عظیم الشان کام ختم کر چکے ہیں۔

سلطانِ دو جہاں کی سادہ زندگی

اگرچہ آپ فی الحقیقت اس وقت عرب کے بادشاہ تھے اور گرد و نواح کے سلاطین و حکمران آپ کی دوستی کی تمنا رکھتے تھے۔ آپ نے شاہانہ شان و شوکت کبھی اختیار نہ کی۔ وہی سیدھی سادی زندگی گذارتے رہے۔ آپ اپنے گھر میں خود جھاڑو دے لیتے۔ اپنے پھٹے ہوئے جوتے آپ مرمت کر لیتے۔ آپ کی فروریات کے بعد جو روپیہ بچ رہتا وہ شہدائے جنگ کی بیواؤں اور یتیموں پر صرف کرتے تھے۔ آپ کے اوقات مقرر تھے۔ دن میں نماز سے فارغ ہو کر وفود سے ملاقات کیا کرتے اور انتظام مملکت کے بارے میں گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ رات کو بہت کم سوتے اور زیادہ تر عبادت میں مشغول رہتے۔ آپ کی غذا اکثر کھجوریں اور پانی ہوتا تھا۔ دنیا کے خزانوں کی کنجیاں آپ کے قدموں پر تھیں مگر آپ نے ان کو ہاتھ نہ لگایا۔

عرفات میں آنحضرتؐ کا خطبہ

اس محترم پیغمبرؐ نے الوداع کے وقت اس انبوہ کثیر کے سامنے جو کچھ مدت قبل بتوں کا پوجنے والا تھا۔ یہ فرمایا:

"لوگو میری باتیں غور سے سنو، نہیں معلوم پھر کبھی میں تمہارے ساتھ اس جگہ کبھی موجود ہو سکوں گا یا نہیں۔ جس طرح اس دن اور اس مہینہ کی حرمت سب پر واجب ہے اسی طرح تمہاری جانیں اور تمہارا

مال قیامت تک ایک دوسرے پر حرام ہے۔ یاد رکھو تم سب کو خدا کے دربار میں حاضر ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا پڑے گا۔ خدا نے میراث میں ہر حق دار کا حق مقرر کر دیا ہے۔ لہذا وارثوں کے بارے میں (اس کے خلاف) کوئی وصیت ناجائز ہے۔

لوگو! تمہارا حق عورتوں پر اور عورتوں کا حق تم پر ہے۔ تم ان کے ساتھ محبت اور مہربانی سے پیش آؤ۔

سود حرام ہے۔ قرض دار صرف اصل رقم ادا کرے

زمانہ جاہلیت کے کشت و خون کے تمام جھگڑے آج کی تاریخ سے مٹاتا ہوں اور خون کا انتقام موقوف کرتا ہوں۔

جو شخص اپنے باپ کے سوا کسی اور کو اپنا باپ یا جو غلام اپنے آقا کے سوا کسی اور کو اپنا آقا قرار دے اس پر خدا کی، فرشتوں کی اور تمام بنی آدم کی لعنت۔

جو حقوق تم پر عاید کئے گئے ہیں ان کو پورا کرو۔ گناہوں سے بچتے رہو۔ اپنے غلاموں کا خیال رکھو جو تم خود کھاؤ ان کو کھلاؤ، جو تم آپ پہنو وہی ان کو پہناؤ، اگر وہ کوئی ایسا قصور کریں جو تم معاف نہ کر سکو تو ان کو اپنے پاس سے علیحدہ کر دو، وہ خدا کے بندے ہیں ان کے ساتھ بدسلوکی نہ کرنا۔

لوگو! میری باتیں سنو اور سمجھو۔ سب مسلمان آپس میں بھائی ہیں اور تم ایک دوسرے کے بھائی ہو۔ ناانصافی کرنے سے اپنے کو بچاؤ۔ جو یہاں موجود ہے وہ میری باتیں اس تک پہنچا دے جو اس وقت یہاں نہیں ہے، ممکن ہے جو لوگ اس وقت میری باتیں نہیں سن رہے ہیں، ان سننے والوں سے زیادہ یاد رکھیں"

اس خطبہ کے بعد آنحضرت صلعم اس مجمع کثیر کو دیکھ کر جس میں سے اکثر اسلام کے دشمن رہ چکے تھے، فرط مسرت سے آبدیدہ ہو گئے اور پھر فرمایا،

"یا اللہ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا اور تیرے احکام کامل طور سے پہنچا دیئے۔"

تمام حاضرین نے ہم آواز ہو کر عرض کیا، "بے شک آپ نے اپنا کام پورا کیا۔"

اس کے بعد آپ نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور کہا " خداوند تو گواہ رہنا، خداوند تو گواہ رہنا" خداوند تو گواہ رہنا۔"

آنحضرت صلعم کی علالت اور وفات

آنحضرتؐ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بالکل ساکت و صامت رہے۔ اگرچہ علالت کی وجہ سے ضعف بہت تھا۔ پھر بھی وفات سے تین دن قبل تک امامت فرمائی۔ آخری مرتبہ مسجد میں آپ اس طرح تشریف

ان کے ہمراہ ایک طرف علی اور دوسری طرف فضل بن عباس تھے۔ آپ ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر سہارا لیے ہوئے تھے۔ آپ کے چہرے سے صحت کے آثار نمایاں تھے جس سے تمام صحابہ کو اطمینان ہو گیا۔ نماز پڑھا چکنے کے بعد آپ نے حاضرین سے فرمایا:

"مسلمانو! اگر میں نے کسی کے ساتھ کوئی برائی کی ہے تو میں اس وقت تیار ہوں۔ وہ مجھ سے بدلہ لے لے۔ اگر کسی کا قرضہ میرے ذمہ ہے تو جو کچھ میرے پاس ہے وہ حاضر ہے۔"

یہ سن کر مجلس میں سے ایک شخص اٹھا اور تین درہم کا مطالبہ کیا جو اس نے آپ کے حکم سے کسی فقیر کو دیئے تھے۔ یہ قرضہ آپ نے فوراً ادا کر دیا اور فرمایا:

"آخرت کی رسوائی سے دنیا کی شرمندگی بہتر ہے۔"

اس کے بعد آپ نے موجودہ مسلمانوں کے لیے اور جو مر چکے تھے ان کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔ فرائض مذہبی کی انجام دہی اور امن و صلح کی زندگی گزارنے کی وصیت کی اور اپنی گفتگو کو اس آیت پر ختم فرمایا:

"آخرت کی بھلائی ہم نے ان لوگوں کے لیے رکھی ہے جو اس دنیا میں برتری تلاش نہیں کرتے۔ عاقبت کا میدان متقیوں کے ہاتھ رہے گا۔"

اس دن کے بعد آپ باہر نہیں دکھائی دیئے۔ آپ کی طاقت جلد جلد گھٹتی چلی گئی — اور بارہویں ربیع الاول ۱۱ھ مطابق ۸ جون ۶۳۲ء کو دوشنبہ کے دن دوپہر کے وقت آپ کی روح رفیق اعلیٰ کے پاس پہنچ گئی اور اس طرح اس زندگی کا جو ابتداء سے انتہا تک مخلوق کی بھلائی اور خالق کی عبادت میں بسر ہوئی خاتمہ ہو گیا۔

آنحضرت صلعم کی نسبت مسٹر پول کی رائے

ایک انگریز مصنف مسٹر پول آنحضرت صلعم کی نسبت لکھتے ہیں:

"آپ میں شجاعانہ اوصاف کے علاوہ عورتوں کی سی نرم مزاجی اور رحم دلی بھی ایسی تھی کہ آپ کے متعلق رائے قائم کرتے وقت اس امر کا اندیشہ ہوتا ہے کہ محبت اور عقیدت کے جوش میں آ کر اس مقدس ہستی کی نسبت کہیں اندھا دھند رائے قائم نہ ہو جائے۔ وہ شخص جو برسوں تک اپنی قوم کی عداوت کا مقابلہ کرتا رہا جب وہ ان پر قابو پاتا ہے تو ان کی دستگیری کرنے سے ہاتھ نہیں کھینچتا۔ بچوں کے ساتھ ایسا شفیق کہ جب کبھی بچوں کے غول پر اس کا گزر ہوتا کبھی مسکرائے بغیر اور ان سے محبت کے ساتھ باتیں کئے بغیر آگے نہ بڑھتا۔ خالص دوستی

غیر فانی بنانے خوب بنا دیں، ایسی صفات میں جن سے عیب گوئی کا تعریف میں بدل جاتا ہے۔

اسلام کی نسبت کارلائل کی حق گوئی

تقریباً سو برس پہلے کارلائل اسلام کی نسبت یہ لکھ گئے ہیں:

" ان بارہ سو برس سے اسلام تمام بنی آدم کے پانچویں حصہ کا مذہب اور زندگی کا رہنما چلا آ رہا ہے۔ علاوہ اس کے جو یہ لوگوں کے یہ دل سے قبول کیا ہوا مذہب ہے۔ عرب اپنے مذہب پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اسی کے موافق عمل کی کوشش کرتے ہیں۔ عربوں کے لیے یہ مذہب گویا ان کو اندھیرے سے اجالے میں لاتا تھا۔ ملک عرب پہلے پہل اس مذہب کی بدولت زندہ ہوا۔ ایک غریب خانہ بدوش، ریوڑ چرانے والی قوم جو ابتدائے آفرینش سے ریگستان میں گم نام پڑی تھی اس میں ایک ہادی پیغمبر ایسے کلام کے ساتھ بھیجا گیا جس پر وہ ایمان لا سکتی تھی۔ دیکھو جس کو کوئی نہیں جانتا تھا وہ قوم ساری دنیا میں مشہور ہو گئی چھوٹی سی چیز سارے عالم پر چھا گئی اور ایک صدی کے اندر اندر عرب کے ایک ہاتھ میں غرناطہ تھا دوسرے ہاتھ میں دلی تھی —

" عرب بڑی شان و شکوہ اور فہم و تدبر کے ساتھ دنیا کے بڑے حصے پر زمانہ ہائے دراز تک چمکتا رہا۔ عقیدہ بڑی چیز ہے، عقیدہ قوم میں جان ڈال دیتا ہے۔ جونہی کوئی قوم ایمان لے آتی ہے اس کی تاریخ بار آور، روح افزا اور عظیم الشان ہو جاتی ہے۔

" یہ عرب! ہادی ان کا محمدؐ! اور ایک صدی!!

اس میں شک نہیں کہ ایک چنگاری گری — صرف ایک چنگاری، ایسی زمین پر جو سیاہ مردہ ریت معلوم ہوتی تھی۔ لیکن دیکھو! وہی ریت بھک سے اڑ جانے والی بارود نکلی۔ اس کے آسمان سے باتیں کرنے والے شعلوں نے دلی سے غرناطہ تک منور کر دیا "۔

خلفائے راشدین:

آنحضرت صلعم کے بعد حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ یکے بعد دیگرے خلیفہ ہوئے۔ یہ خلفائے راشدین کہلاتے ہیں۔ یہ رعایا کی بہبودی اور سادہ زندگی میں کامل طور پر رسول اللہؐ کی اتباع کرنے والے تھے۔ ان کے در تک ہر ستم رسیدہ کی رسائی ہو جاتی تھی۔ وہ ادنیٰ سے ادنیٰ شخص کی داد فریاد کو پہنچتے تھے۔ وہ بغیر کسی جاہ و حشم کے محض اپنے اخلاق کے زور سے لوگوں کے دلوں پر حکومت کیا کرتے تھے۔

آنحضرت صلعم کا مقصد عظیم پورا ہو چکا۔ ان کے کارنامے اور ان کی زندگی پردۂ راز میں نہیں ہے۔ ان کی ہستی ایک پیغمبر کی حیثیت سے ہر زمانہ کے لیے ایک نمونہ ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی

پیام انسانیت

[مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ایک تقریر جو ٹاؤن ہال مراد آباد میں ۱۳ر دسمبر ۱۹۸۰ء کو کی گئی جبکہ علی گڑھ میں فسادات ہو رہے تھے اور اطراف میں کشیدگی تھی۔ سامعین میں بڑی تعداد غیر مسلم برادران وطن کی تھی۔ فسادات کی صورت حال آج بھی وہی ہے۔ تقریر میں انسانیت کا جو پیام دیا گیا ہے، آج بھی اس کی اہمیت و افادیت مسلّم اور ضرورت برقرار ہے۔ اس لئے تلخیص ہدیۂ قارئین ہے۔]

نئے مہمانوں کی آمد

دنیا میں انسانوں کی آمد کا سلسلہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں سال سے جاری ہے، اور کوئی دن نہیں کہ دنیا کی تاریخ میں نئے مہمان نہ آتے ہوں۔ جو بچہ بھی اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے وہ چاہے کسی براعظم میں پیدا ہو، ہندوستان میں پیدا ہو یا یورپ و امریکہ میں، مشرقِ وسطیٰ میں پیدا ہو یا مشرقِ بعید میں، وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے (اور ایسا صاف اور ایسے پیارے طریقے پر اعلان کرتا ہے کہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے) کہ ابھی اس سنسار کا پیدا کرنے والا انسان سے مایوس نہیں ہے، وہ ان کو بسانا چاہتا ہے، وہ ان کی مدد کرتا ہے۔ کتنی لڑائیاں ہوئیں، انسانوں نے اس دنیا کو تباہ کرنے کی کتنی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ یہ جو دو عالمی جنگیں (FIRST AND SECOND WORLD WARS) اس لڑائی کی آگ بھڑکانے والوں نے اپنی پوری ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ یہ دنیا ختم ہو جائے لیکن یہ دنیا پھر بھی قائم ہے اور اس کی رونق باقی ہے۔

نوشتۂ دیوار

اگر خدا کا ہاتھ اس دنیا کی پیٹھ پر نہ ہوتا، انسانوں کے سر پر نہ ہوتا، خدا کی حفاظت نہ ہوتی تو

یہ یورپ و امریکہ کے جادوگر جو ہماری قسمت کے مالک بنے بیٹھے ہوئے ہیں، یہ کب کا اس سنسار کو ختم کر چکے ہوتے، مگر ان کی اتنی منظم سائنٹفک آرگنائزڈ کوششوں کے باوجود جن کی پشت پر سائنس تھا، ٹکنالوجی تھی، اور اب ایٹامک انرجی بھی آگئی ہے، اس کے باوجود یہ اس سنسار کو تباہ کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے؟ یہ دیوار کا نوشتہ ہے کہ خدا اس دنیا سے مایوس نہیں ہے۔ ہم کو قرآن میں بتایا گیا ہے " اِنَّمَا اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ " کہ اس کے ارادے کی دیر ہوتی ہے اس نے ارادہ کیا اور کام ہوا، ارے بھائی ہم ٹیلی فون کرتے ہیں، اٹھایا رسیور، نمبر ملایا فوراً بات ہوگئی، تو خدا کو کیا دیر لگ سکتی ہے؟ کیا آپ خدا کا منشا نہیں سمجھتے؟ خدا کو ابھی دنیا باقی رکھنا ہے، مگر ہمارا آپ کا طرزِ عمل کیا ثابت کرتا ہے؟ خدا چاہے اس دنیا سے خوش ہو اور پیار کرے مگر ہم اس دنیا سے خوش نہیں۔

راوڑکیلا، جمشید پور، علی گڑھ جہاں جہاں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہیں، وہاں کے ان شریف آدمیوں نے کتنے سانپ بچھو مارے ہوں گے، اگر اس کا کوئی دفتر ہوتا تو میں وہاں جا کر پوچھتا اس کے اعداد وشمار دیکھتا کہ بھائی ہر شخص بتائے کہ اس نے کتنے بچھو مارے، کتنے سانپ مارے، کتنے بھیڑیئے، چیتے اور شیر مارے؟ ان میں بعض لوگوں کی زندگی گذر جاتی ہے، اور موذی جانور مارنے کی توفیق نہیں ہوتی، مگر انسان، انسان کو کس طرح مارتا ہے، دیکھئے خدا اور انسان کے کام میں ایک ٹکراؤ اور تضاد ہے، خدا چاہتا ہے یہ دنیا پنپے، پھلے پھولے، سرسبز وشاداب ہو، بارونق ہو، یہاں اس کی رحمت کی، محبت کی ہوائیں چلیں، یہاں محبت کی اور پریم کی بانسری بجے، یہاں محبت کی خوشبو پھیلے، وہ دیکھ کر خوش ہوتا ہے مگر آپ کا طرزِ عمل یہ بتاتا ہے کہ آپ خدا کی مرضی پر خوش نہیں ہیں۔ خدا کچھ چاہتا ہے آپ کچھ چاہتے ہیں۔ خدا بنانا چاہتا ہے، آپ بگاڑنا چاہتے ہیں۔ خدا سرسبز وشاداب رکھنا چاہتا ہے، آرام پہنچانا چاہتا ہے، آپ کہتے ہیں ہم آرام نہیں پہنچنے دیں گے، یہ ہمارا طرزِ عمل ہے گویا ہمیں خدا سے لڑائی ہے۔ معاف کریں ہمارے ہندو مسلمان بھائی، ہم سب مذہبی لوگ ہیں، ہم سب یقین کرتے ہیں مذہب کی حقیقتوں میں، اس کی سچائیوں میں، لیکن ہم اپنے طرزِ عمل سے ثابت کرتے ہیں جیسے ہم کو خدا سے ضد ہو، وہ دن کہے تو ہم رات کہیں، وہ رات کہے تو ہم دن کہیں وہ اچھا کہے تو ہم برا کہیں، وہ برا کہے تو ہم اچھا کہیں۔ وہ کہے کہ مل کر رہو، محبت سے رہو ہم کہیں کہ ہمیں منظور نہیں۔

خدا کی بُردباری دیکھیے

یت دکان پر آپ چلے جائیے اور وہ ایک برتنوں پر ہاتھ صاف کر دیجیے، بے ترتیبی کر دیجیے
رڈنا نہیں اس کا ذکر کیا، بے ترتیب رکھ دیجیے تو دکان والا خواہ آپ کا کیسا دوست ہو
یف آدمی ہو وہ بگڑ جائے گا اور آستین چڑھالے گا کہ آپ کو کیا حق ہے، ہماری دکان کا
م کرنے کیوں آئے۔ خدا کی بُردباری دیکھیے کہ برابر انسانوں کو بھیج رہا ہے، جانور بھیجتا
ہے، زمین فلہ اگارہی ہے، آسمان پانی برسارہا ہے، کسی چیز میں کوئی ہڑتال کوئی اسٹرائک
خدا نے وہ چیز روک دی ہو ہماری نالائقی سے، لیکن ہمارا کیا طرز عمل ہے؟ ہم خدا کو برابر
ناچلاتے ہیں، شکر ہے، اسی کی تعریف ہے کہ وہ بچوں کی طرح غصہ میں نہیں آتا۔ ورنہ
ے کرتوتوں سے وہ غصہ میں آجاتا تو کب سے یہ دنیا لپیٹ کر رکھ دی جاتی۔ یہ اس بات
مت ہے کہ خدا اتنے دنوں سے برداشت کر رہا ہے، خدا ابھی اس دنیا سے مایوس نہیں ہے،
ا ہے اور ہم بات بات پر خفا ہوتے ہیں، ہمیں چاہیئے تھا کہ خدا کا ہمارے ساتھ جو معاملہ
ہ اذکر اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنے بھائیوں کے ساتھ وہ معاملہ کرتے۔
خدا تو ایسا کہ جو چاہو کر گذرو، اور وہ خفا نہیں ہوتا یعنی اس طرح سے ناراض نہیں ہوتا کہ
ہ کر کے رکھ دے، الٹ کر رکھ دے کہ بس ختم، وہی زمین و آسمان، چاند سورج، بارش و ابرا
نِ قدرت (COSMIC LAW) برابر چلے آرہے ہیں، ہزاروں لاکھوں برس سے، مگر
ہ تو سوچنا چاہیئے کہ آخر یہ کب تک ہوتا رہے گا؟

خطرہ مول لینا پڑتا ہے

میرے بھائیو اور دوستو! ابھی خدا نے ہمیں مہلت دی ہے اور دیکھیے اب بھی آواز میں، سچائی میں
یں، سادگی میں اثر ہے، درد میں اثر ہے کہ ابھی آدمیوں کو یہ درد بلا سکتا ہے، تڑپنے والے
ولے دل و دماغ ہمارے ملک میں بڑی تعداد میں موجود ہیں، لیکن قصہ یہ ہے کہ کوئی ہمت
یا، جو فسادات ہوتے ہیں، اس میں سب لوگوں کو ہسٹریا کا دورہ نہیں ہوتا، سب پاگل نہیں ہو
، مگر ہوتا یہ ہے کہ چند بدمعاش، خدا سے نہ ڈرنے والے، انسان کو کوئی چیز نہ سمجھنے والے میدان
تے ہیں، اور ہر شریف آدمی اپنی خیر منانے لگتا ہے کہ ان غنڈوں اور بدمعاشوں کے کون
و ان کے سامنے کون آئے، اپنی عزت بھی خاک میں ملائے، شریف لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے

جاتے ہیں اور اپنی میر سانسے لگتے ہیں، ورنہ کوئی شہر، کوئی گاؤں بچے، شریف آدمیوں سے خالی نہیں ہے لیکن وہ طے تھے نہیں بچھاتے ہیں۔ ان کا زور جادو چل جاتا ہے جدید معاشی میں ملا سے نہیں ڈٹے شریف آدمی اپنے کونوں میں بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں بھائی ان بدبوؤں، کمینوں، غنڈوں کے کون منہ آئے، کون ان کے سامنے آئے۔ لیکن اگر اس دنیا میں ایسا ہی ہوتا رہے تو یہ دنیا چل نہیں سکتی۔ اس میں تو خطرہ مول لینا پڑتا ہے۔

ایک بلیغ مثال

میری معلومات زیادہ تر مذہبی ہیں، ہمارے پیغمبر صاحب نے ایک مثال دی، اس سے بہتر مثال مجھے اب تک نہیں ملی، اس لیے بھی اسے بیان کرتا ہوں کہ ایسی تصویر کھینچ دینے والی مثال مجھے نہیں ملی۔ ظلم و ستم، انارکی، بدنظمی، فتنہ و فساد یہ اگر دنیا میں آئے تو اس کو روکنا چاہیے بہت کر کے سمجھا ہے اس میں کتنا نقصان ہو جائے۔ اگر نہیں روکو گے تو تم بھی نہیں بچو گے، اس کی آپ نے مثال دی کہ ایک کشتی ہے، اس پر لوگ جا رہے ہیں، دنیا کا سفر ہے، اس میں ایک اپر کلاس ہے، ایک لوئر کلاس ہے، ایک اوپر کا حصہ ہے جیسے کہ آج کل فرسٹ کلاس ہوتا ہے اور نیچے ڈیک ہوتا ہے، کچھ مسافر ڈیک پر ہیں اور کچھ مسافر فرسٹ کلاس میں ہیں۔ پانی کا انتظام اتفاق سے اوپر ہی ہے کشتی تو دریا میں چل رہی ہے لیکن دریا سے پانی لینا ہر ایک کے بس کا کام نہیں، ڈول ہو رسی ہو تو یہ نیچے والے پانی لینے اوپر جاتے ہیں۔ پانی کی فطرت یہ ہے کہ وہ گرتا، چھلکتا ہے، جب پانی لے کر آئے تو کشتی چلنے والی، تھوڑا سا اس پر ٹپکا تھوڑا سا اس پر ٹپکا۔ صاحب لوگوں نے، اپر کلاس والوں نے آستینیں چڑھا لیں کہ صاحب پانی کی ضرورت آپ کو، پانی کی غرض آپ کو اور پریشان ہم ہوتے ہیں، دیکھیے ہم نے کپڑا بچھا رکھا تھا، فرش بچھا رکھا تھا آپ نے اس کو بھگو دیا دیکھیے ہمارے اوپر چھینٹے پڑ گئے، ہم آپ کو پانی نہیں لے جانے دیں گے۔

انھوں نے کہا پانی کے بغیر کیسے رہا جا سکتا ہے، انھوں نے کہا چاہے جو ہو ہم آپ کو پانی نہیں لے جانے دیں گے۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا نیچے والوں نے سمجھا کہ پانی تو ہم ضرور لیں گے، پانی کے بغیر گزارہ نہیں، ایسا کرو کہ نیچے سوراخ کر لو اور وہیں سے اپنا ڈول، لوٹا ڈال کر پانی نکال لیا کرو۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر ان لوگوں میں سمجھ ہے اور ان کو زندگی پیاری ہے کچھ ہوش گوش ہے تو یہ خوشامد کریں گے، ان کے پاس جائیں گے کہ تم پانی لینے آئے تھے اور ہم ناراض ہوتے تھے، ہم خود پانی پہنچا دیں گے، لیکن اگر

کے لئے ہمارے اوپر رحم کھاؤ، کشتی میں سوراخ مت کرو، اور اگر انہوں نے کہا کہ ہماری بلا سے، ارے بھئی سوراخ تو نیچے ہو رہا ہے، اوپر تو نہیں ہو رہا ہے، ہم تو اوپر رہتے ہیں، ہم تو بالا نشین ہیں، ہم تو فرسٹ کلاس کے لوگ ہیں، اور یہ لوور کلاس کے ذلیل لوگ ہیں، سوراخ کر رہے ہیں تو نیچے کر رہے ہیں، ہم تو بچے رہیں گے، آپ نے فرمایا جب سوراخ ہوگا تو نہ لوور کلاس والے بچیں گے اور نہ اپر کلاس والے بچیں گے، کشتی ڈوبے گی تو سب کو لے ڈوبے گی۔

آج ہماری سوسائٹی میں، صرف ہندوستان کو نہیں کہتا، ہمارا یہ موجودہ بیسویں صدی کا سماج ایسی ہی کشتی بن گیا ہے کہ اس میں اپر کلاس والے بھی ہیں اور لوور کلاس والے بھی ہیں، اپر کلاس والوں کی پیشانی پر بل آتے ہیں، اور یہ بات بات پر اپنا امتیاز ثابت کرتے ہیں اور یہ احساسِ برتری (...) میں مبتلا ہیں، یہ نیچے والے کہتے ہیں (نیچے اوپر کا فرق یوں سمجھئے کہ جس کو ضرورت پڑتی ہے اس کو آپ لوور کلاس سمجھ لیجئے اور جسے ضرورت نہیں پڑتی اسے اپر کلاس) کہ ہمیں کام سے کام ہے، ہم کچھ نہیں دیکھتے، ہمارا کام تو نکلنا چاہیئے، کرپشن ہے، ذخیرہ اندوزی ہے، بلیک مارکٹنگ ہے، بے ایمانی کام چوری ہے، مزدور کام نہیں کرتا، مزدوری زیادہ لینا چاہتا ہے، اور جو مالک ہے مل اور کارخانے کا وہ چاہتا ہے کہ یہ کام تو کرے پورا سولہ آنے، اور اگر کوئی ایسا قانون ہو کہ ایک آنہ ہم دے سکیں تو ایک آنہ دیں، نتیجہ یہ ہے کہ ہر ایک کام نکالنا چاہتا ہے، سب لوگ اِن ڈائرکٹ طریقے پر سوراخ کرنے کی فکر میں ہیں، پوچھنا پاچھنا کچھ نہیں اپنا کام ہے، اللہ نے ہم کو ہاتھ دیئے ہیں، پاؤں دیئے ہیں، سمجھ دی ہے جو کچھ ہماری سمجھ میں آئے گا کریں گے، اب سماج میں جو لوگ سمجھدار ہیں، دانشور ہیں، لیڈر ہیں، محبِ وطن اور ملک کو چاہنے والے ہیں، اگر انہوں نے کہا ہماری بلا سے یہ جائیں آگ کا کام چلا دیں، ہم آنکھیں بند کر لیتے ہیں، یہ جائیں مریں، جئیں تو نتیجہ کیا ہوگا؟

کشتی میں پانی بھرے گا، کشتی ڈوبے گی، اور بھائی جب کشتی ڈوبے گی تو امتیاز نہیں کرے گی، آگ جب کسی گاؤں میں لگتی ہے تو امتیاز نہیں کرتی کہ یہ مسلمان کا گھر ہے، یہ ہندو کا گھر ہے، یہ شریف آدمی کا گھر ہے، یہ خان صاحب کا گھر ہے، یہ شیخ صاحب کا گھر ہے، یہ پنڈت جی کا گھر ہے، یہ فلاں کا گھر ہے کچھ نہیں، آگ اندھی بہری ہوتی ہے، جب لگتی ہے تو سب جلا کر خاک سیاہ کر دیتی ہے، سیلاب آتا ہے تو وہ اونچ اور نیچ میں کوئی فرق نہیں کرتا۔

میرے بھائیو! ہم اور آپ ایک کشتی کے سوار ہیں، ایک دنیا کے مسافر ہیں، ہماری دنیا ایک ہے، لیکن یہ بہت بڑا سوراخ کرنے کا ارادہ کیا ہے ہمارے ہی سماج کے بہت سے لوگوں نے ...

سوراخ تو بہت سے ہیں اور بہت دنوں سے ہیں۔ پانی تھوڑا تھوڑا آ رہا تھا، لیکن یہ کشتی چونکہ بڑی ہے اور بڑی کشتی دیر سے ڈوبتی ہے، چھوٹی ناؤ ہو تو فوراً ڈوب جائے، ہمارے دیش کی کشتی بڑی ہے، اس لیے ابھی آپ کو نظر نہیں آ رہا ہے کہ اس میں کتنا پانی آ گیا، ایک جگہ آ رہا، ایک جگہ نہیں آیا۔ کئی منزلیں ہیں اور بہت بڑی بڑی، اس کا کوئی اور چھور نہیں، یہ ۹۵ کروڑ کا ملک ہے اور بہت بڑا ملک ہے، کہتے ہیں ہاتھی کو مرتے مرتے دیر لگتی ہے، ایک چڑیا ہے کو آپ انگلی میں لیجیے اور مسل ڈالیے، اس کا گلا گھونٹ دیجیے۔ لیکن ہاتھی تو دیر میں مرے گا۔

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اب تو ہم کو اور آپ کو مل کر اس کشتی کو سنبھالنا ہے، اور نا بتی دیش کی خبر لینی ہے، بھائی، تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں" ظلم کے بعد کوئی ملک پنپ نہیں سکتا"۔ نے کہا تھا

ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں

ہم نے بچپن میں یہ سبق پڑھا تھا، اور آج بڑے بڑے منتریوں کو، بڑے بڑے پردھو لیڈروں کو پھر آج سنانے کی ضرورت ہے کہ "ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں"۔

ہم نے دیکھا کہ کتنی حکومتیں یہاں آئیں اور چلی گئیں، انگریز جانے والے تھے، انگریز کو لوگ کہتے تھے، معمولی حکومت تھی، جس کی حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا، لیکن انہوں نے کیا تھا، یہی آپ کا شہر مراد آباد ہے کہتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے یہاں کے سیکڑوں آدمی پھانسی پر چڑھا دیا تھا، اور پھر ایسا بوریہ بستر ان کا بندھا جیسے کہتے ہیں کہ گدھے کے سر سے سینگ، بھائی، کوئی مذہب ہو، کوئی پارٹی ہو، کوئی فرقہ ہو، کوئی سماج ہو، ظلم کو خدا برداشت نہیں کرتا، اگر آپ یہ سمجھتے ہیں، کوئی فرقہ، کوئی طبقہ، کوئی کلاس یہ سمجھتا ہے کہ ہم ظلم کر کے، بے گناہ کو مار کے اور بچوں کو دیواروں پر پٹک کر اور بھٹی میں ڈال ڈال کر ہم اپنا سکہ بٹھا لیں گے، ہم اپنے ملک کا پٹہ لکھوا لیں گے تو وہ بھول میں ہے، اس کو اپنی بھول سے نکلنا چاہیے، خدا اس طرح کرتا ہے، لیکن کرنے کے بعد پنپنے نہیں دیتا۔ یہ جینے کے لچھن نہیں ہیں، جو ہم ہندوستان میں کر رہے ہیں، بھائی، انسان کے معنی تو یہ ہیں کہ انسان، انسان کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے، بچھو اور سانپ بھی، بھیڑیے بھی ساتھ چلتے ہیں، لیکن یہ کس طرح کا انسان ہے کہ یہ انسان کو برداشت نہیں کر

دوڑ رہا اس پر پٹرول ہے ؟

کوئی مسافر بے چارہ کہیں سے آیا، آپ کے مراد آباد اسٹیشن سے کہیں نکلا تھا، کچھ نہیں دیکھا کہ کون ہے ؟ اپنی ماں کی خبر لینے جا رہا ہے یا اپنی بیوی کے منہ میں کچھ رکھنے کو بے چارہ بھوکی ہے کچھ کما کر آ رہا ہے، اور اس نے اپنا پسینہ بلکہ خون بہا کر کچھ پیسے جمع کئے، کسی ظالم نے خنجر نکالا اور اسے گھونپ دیا۔

اسے تو نے کس کو مارا ؟ خدا کے بندے ذرا دیکھ، تو نے کس کو مارا ؟ اس کو مارا جس کو ماں نے دودھ پلا پلا کر، چھاتی سے لگا لگا کر راتوں کو نیند حرام کر کے پالا تھا اور خدا نے ... اس کی روزی بھی کتنے دور سے اس کی روزی بھیجی تھی، بیمار ہوا تو کیسے کیسے اس کے علاج ہوئے تھے ؟ کس کس طرح بچایا گیا ؟ اور جب یہ جوان ہوا، کھانے کمانے کے قابل ہوا، تو نے اے ظالم، اے دشمن، اے خدا اور انسان کے دشمن، اے اندھے انسان تو نے کس کے چھرا گھونپا ؟ اگر تجھے معلوم ہو جائے تو ہزار مرتبہ دعا کرے اور کبھی نہ مارے، اس کے مرنے سے کیا اثر ہوگا، جب اس کے گھر خبر پہنچے گی، لاش پہنچے گی کیا ہوگا ؟ تو خدا کو منہ دکھانے کے قابل ہے، ظلم اندھا اور بہرا ہوتا ہے، چھرا نکالا اور کسی کو گھونپ دیا، میں ہندو مسلمان کسی کو نہیں کہتا، اس چھرا مارنے والے کو نہ میں مسلمان سمجھتا ہوں نہ ہندو، اسلام کی بھی توہین سمجھتا ہوں، ہندو مذہب کی بھی توہین سمجھتا ہوں، ہزار بار ان کا مذہب ان سے بیزار اور وہ ہزار بار اپنے مذہب کی کتاب اپنے سر پر رکھ کر قسم کھائیں کہ ہم مسلمان ہیں، ہندو ہیں، خدا کی لعنتیں برستی ہیں ان کے اوپر، خدا بیزار ہے، ایسے لوگوں سے، مذہب ؟ مذہب یہ تربیت دیتا ہے ؟ یہ سمجھاتا ہے، تصور کرے کوئی مارا جائے کوئی۔

یہ لمبی نیند ہے

مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں ـــــ خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ملک سویا ہے، مرا نہیں، سویا ہوا جگایا جا سکتا ہے، لیکن مرا ہوا جلایا نہیں جا سکتا۔ ہم سوئے ہوئے ہیں۔ مرے نہیں، خدا کا شکر ہے، رب کا شکر ہے، پیدا کرنے والے کا شکر ہے ہم کئی بار سوئے کئی بار جاگے، یہ انسانیت کئی بار سوئی کئی بار جاگی، جاگی تو ایسی جاگی کہ اپنے سونے کی سب تلافی کر دی، ہمیں امید ہے کہ ہمارا ملک جب جاگے گا تو اس سے نیند میں جو حرکتیں ہوئیں، وہ جو سوتے ہوئے اس کا ہاتھ کسی پر پڑ گیا تھا، کسی کو تکلیف ہوئی تھی سب کی معافی مانگے گا، یہ سونے والا جب جاگے تو سب کی معافی مانگے گا، سب کے پاؤں پکڑ لے گا کہ

ہونے میں اگر کوئی بات ہوئی ہو تو ہمیں معاف کیجئے، ہمیں خبر نہ تھی، یہ سب ایک لمبی المیہ ہے جس کو آپ دیکھ رہے ہیں۔

میں ان فسادیوں کو سویا ہوا انسان سمجھتا ہوں، ان کو راکشس نہیں سمجھتا، ان کے اندر کا انسان سو گیا ہے اور ان کے باہر کا حیوان جاگ گیا ہے اور چاہیئے یہ کہ ان کے باہر کا حیوان سو جائے، اور ان کے اندر کا انسان جاگ جائے۔

ہمیں اپنے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں، اپنے متعلق ہمیں کوئی دھوکا نہیں کہ ہم دنیا میں کوئی بڑا انقلاب لے آئیں گے، ہمیں اپنی حقیقت خوب معلوم ہے، مگر کیا کریں بیٹھا نہیں جاتا ہم اخبار ہی دیکھنے کے لیے زندہ رہ گئے؟ ہم فسادات کی خبریں ہی سننے کے لئے زندہ رہ گئے۔ ہم انسانیت کی ذلیل دیکھنے کے لئے ہی زندہ رہ گئے، ہم سے زیادہ بدقسمت کون ہے؟ ارے بھائی بجائے اس کے ہم اخبار میں پڑھیں ہم سے جو کچھ ہو سکتا ہے ہم وہ کریں۔

میں نے ۵۱-۱۹۵۲ء سے یہ کام شروع کیا تھا، جب میں ہندوستان کے باہر سے آیا اور یہاں دیکھا تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے اسی وقت پکار لگائی میرے جو مضامین ہیں "ماںوتا کا سندیش" وغیرہ سب شائع کئے ہیں، مگر اس کے بعد میں دوسرے کاموں میں لگ گیا۔

خدا مجھے معاف کرے، میرا مالک مجھے معاف کرے، مجھے اس کام کو سب پر مقدم رکھنا چاہیئے تھا۔

بس میں اپنی بات ختم کرتا ہوں، میں نے آپ کا بہت وقت لیا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں نے یہاں جو بات کہی وہ خدا لگتی بھی کہی اور آپ کی اپنی کہانی سنائی آپ کو۔

اے نیک نام شکر کر اللہ کا ادا
جس نے بنایا نیک تجھے کر کے نیک نام
ہوتا اگر نہ پاس تجھے نام نیک کا
پھر دیکھتے کہ کرتا ہے تو کیسے نیک کام
حاشا کہ تجھ کو خوف خدا کا ہو اس قدر
جتنا کہ خوف طعنہ و تشنیع خاص و عام

حالیؔ

محمد مجتبیٰ صدیقی ایم اے۔ بی ایڈ

ترقی تعلیم میں مذہب کا کردار

صرف تحصیل علم کے منازل کا احاطہ ہی نہیں کرتی بلکہ حصولِ تعلیم کے نتائج پر بھی محیط ہوتی حیات میں تحصیل علم کے بعد کی منزل "عمل" کی ہوتی ہے۔ اور اس عملی دور میں حصول نتائج و اثرات بھی سامنے آتے ہیں۔ اگر نتائج انسانی معاشرہ کی فلاح و بہبود کے لیے ہیں تو ہم انہیں مفید نتائج کا نام دیں گے اگر یہی نتائج و اثرات ضرر رساں ہوں تو انسانی لیے ظاہر ہے، مضر ہوں گے۔

اس بات کے آرزو مند ہیں کہ تعلیم، بہبود افزا نتائج ہی کا سرچشمہ بنے تو پھر ہمیں اس تسلیم کرنا پڑے گا کہ مذہب کے بغیر "تعلیم" سے بہتر نتائج پیدا نہیں ہو سکتے۔
نے کہا ہے ؎

این چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم
ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر می بینم
ہیچ رحمی نہ برادر بہ برادر دارد
ہیچ شفقت نہ پدر را بہ پسر می بینم
دختران را ہمہ جنگ است و جدل با مادر
پسران را ہمہ بدخواہ پدر می بینم
اسپ تازی شدہ مجروح بہ زیر پالان
طوقِ زریں ہمہ در گردنِ خر می بینم

یا قدروں میں ہمارا عجیب تضاد ہے اور اس تضاد کے سبب سارا جہاں تخریب و خلفشار

پتہ: ۔۔۔ حیدرآباد ۔۔۔ اے۔ پی۔

[illegible] شرافت سے محروم ہے۔ دیہاتی بھائی کا ہمدرد، نہ باپ بیٹے میں محبت، نہ ماں بیٹی میں یگانگی [illegible] ہے کہ گھوڑے اور گدھے کی تمیز بھی باقی نہ رہی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا آخر سبب کیا ہے؟ زمانہ ترقی تعلیم میں کچھ اس رفتار سے منازل طے کر چکا ہے کہ پچھلی صدیوں کا ارتقاء ہیں جو دہی جمود [illegible]۔ بات صاف ہے۔ کسی ابہام کی ضرورت نہیں [illegible] علم انسان کی ترقی کے باوجود کسی شے کی کمی [illegible] ہے۔ اور یہ کمی بہتر سے بہتر تعلیم کی محدود تاثیر ہے۔ کمترین نتائج ہیں۔ اسی احساس کے [illegible] سومرسٹ ماہم کے اس قول میں تو رہے ہیں

"کوئی بھی تعلیم، روحانی تعلیم کے بغیر مکمل نہیں ہوتی"

[illegible] یہ ہے کہ تعلیم کو مذہب سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ خانۂ تعلیم میں ایک ایسا روزن ضرور ہونا چاہیے جس سے مذہب کی خوش گوار اور حیات بخش "ہوا" آتی رہے۔ اگر مذہب کو تعلیم سے علیحدہ کیا جائے تو انسان جسمانی طور پر تو زندہ رہے گا مگر روحانی طور پر اس کا وجود ملیا میٹ ہو کے رہ جائے گا اور یہ انسانیت کی موت ہوگی۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اپنی کتاب "مذہب اور سماج" میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک [illegible] نے اپنے ایک استاد کو خط لکھا کہ "آپ نے میرے والد سے کہا ہے کہ آپ مجھ کو فلسفہ پڑھائیں گے۔ یہ [illegible] ہے کہ آپ نے برسوں مجھ کو مختلف چیزوں کے متعلق ہوائی (خیالی) باتیں بتلائیں جس سے نہ مجھ [illegible] روحانی تسکین ہوئی اور نہ وہ باتیں انسانی سماج کے لیے کوئی کارآمد ہیں۔ یہ محض تصوراتی دنیا کی سیر [illegible] اور کیا ہے؟ گو ان باتوں کو سمجھنے میں دیر لگی مگر بھولنے میں دیر نہ لگے گی۔ مگر کیا آپ نے کبھی اس طرف بھی توجہ کی کہ کس طرح ملک کا محاصرہ کیا جائے اور کس طرح محاصرہ میں، جنگ میں مدافعت کی جائے؟ یہ سب چیزیں میں نے سیکھیں ضرور مگر دوسروں سے۔" اس سلسلہ میں ڈاکٹر رادھا کرشنن آگے لکھتے ہیں کہ "آج دنیا بے چینی اور کشمکش میں اس لیے ہے کہ وہ "محاصرہ کرنا" اور "مدافعت کرنا" تو سیکھتی ہے مگر اس نے زندگی کی برتر قدروں کو، فلسفہ کو اور مذہب کو جاننے کی کوشش نہیں کی ہے۔ [illegible] دنیا میں اس وقت تک اسی طرح تباہیاں اور بربادیاں آتی رہیں گی جب تک کہ مذہب اور مذہبیت [illegible] عروج نہ ہو جائے۔"

ڈیوک آف ولنگٹن نے بھی اپنے انداز میں اس بات کو یوں کہا ہے:

"Educate men without religion, and you make them but clever devi

پر قبضان "داتا شیطان" کا لبادہ اوڑھے جو کچھ کر رہا ہے، وہ ہم سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن اس انا کو یوں ہی آزاد نہیں چھوڑا گیا ہے بلکہ خدا نے مذہب کی زنجیروں سے اس کو جکڑنے کے سامان مہیا کئے ہیں۔ اور اس گرفتاری سے انسان کو گھٹن نہیں ہوتی بلکہ "ذہنی سکون" اور "الہی غط" میسر آتا ہے۔ اور یہ "ذہنی سکون" صرف مذہب کی دین ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "کسی خاص مسلک کو قبول کرنا مذہب نہیں ہے بلکہ ایک اندرونی زندگی اور روحانیت کا نام مذہب ہے جو ہم کو سچائی کی طرف، سماج کی بھلائی کی طرف، صحیح انسانی راستہ کی طرف اور ایثار و قربانی کی طرف لے جاتا ہے"۔

اور ایک بے معنی و بے مقصد زندگی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جدید انگریزی کا شاعر T.S. Eliot کہتا ہے:

"where is the life, we have lost in living?"

زندگی کی بھیڑ میں نہیں معلوم ہم نے "حیات" (ابدی) کہاں کھو دی؟

چنانچہ اس حیات جاوید کی تلاش، انسانی جبلت کا خود ایک تقاضہ ہے جو فطرت انسانی میں ودیعت کر دیا گیا ہے اور اسی طلب اور پیاس نے ہر دور میں فرد اور قوم دونوں کو کسی نہ کسی مسلک کو اپنانے کی طرف راغب کیا ہے۔ مشہور فلسفی کانٹ نے فلسفہ کے تین بڑے سوال قرار دیئے ہیں کہ ۱۔ میں کیا جان سکتا ہوں؟ ۲۔ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ ۳۔ میں کیا امید کر سکتا ہوں؟ اور اس تیسرے سوال کی امید کی کرنیں، مذہب کے خورشید تابندہ سے ہی نکلتی ہیں کہ جس کی روشنی میں ان تمام سوالوں کا جواب پاتے ہیں کہ اس کائنات کا نقطۂ آغاز کیا ہے؟ اور اس کا انجام کیا ہوگا؟ انسان کا مقصد حیات کیا ہے؟ اور بقائے دوام کی خواہش کیسے پوری ہوگی؟ وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال، مذہبی تعلیم ہی انسان کو "اصل تہذیب احترام آدم است" کا درس دے سکتی ہے۔ کیونکہ سائنس جامد اور ساکن اور غیر متبدل اشیاء کا علم رکھ سکتی ہے لیکن زندگی کی ہمہ گیر ہنگامہ خیزی تک اس کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ نصف صدی قبل حکیم الامت شاعر مشرق اقبال نے اسی طرف یوں اشارہ کیا تھا:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

علامہ "مسن مشاعر فراستم" کا ہی منصب تھا کہ آج سے ۵۰ سال پہلے انسانی ارتقاء کے احساس کو اجاگر کر دیا گیا کہ اگر مادی "ترقی" روحانی ترقی سے متصف نہ ہو تو پھر یہ ترقی معکوس ہی ہوگی۔ نئے عصر حاضر کے کوائف و احوال بھی اس بات کی شہادت دیتے ہیں۔

محبوب راہی ایم اے

جوشؔ کی باغیانہ انانیت پسندی

جوشؔ ملیح آبادی کی ہمہ گیر شخصیت کے کئی پہلو ہیں ۔ ان کی ہمہ رنگ شاعری سے کئی گوشے برآمد ہوتے ہیں اور جن کی کثیر الجہات زندگی بے شمار پر پیچ زاویوں پر محیط ہے جس کے ہر پہلو، ہر گوشے اور ہر زاویہ پر محض چلبلاتی روشنی ڈالنے کے لیے بھی عمیق مشاہدے، وسیع مطالعے اور وسعت فکر و نظر کی ضرورت ہے۔ میں اس مختصر مضمون میں جوشؔ کے مجموعۂ اضداد نظریات متنازعہ فیہ رجحانات اور متضاد عقاید و عوامل دلائل و شواہد کی روشنی میں تجزیہ کرنے اور ان کی باغیانہ فطرت اور بے مثال انانیت پسندی کو اجاگر کرنے کی امکان بھر سعی کر رہا ہوں۔

جوشؔ ملیح آبادی کی ذات ہمیشہ جارحانہ اعتراضات کا نشانہ اور ان کی شخصیت معاندانہ نکتہ چینیوں کا ہدف رہا ہے۔ ہنگامہ آرائیاں ان کی زندگی سے قدم قدم پر دست و گریباں رہی ہیں۔ ان کی شاعرانہ عظمتوں اور فنکارانہ بلندیوں کا اعتراف تو خیر ان کے کٹر سے کٹر مخالفین نے بھی کیا ہے کہ سوائے اس کے کوئی چارۂ کار بھی نہیں۔ تنازعات کی آماجگاہ تو صرف ان کی شخصیت کے وہ گوشے ہیں جن پر خود جوشؔ نے منافقت اور ریاکاری کے رنگین پردے نہیں ڈالے بلکہ اپنے افعال، اقوال اور اشعار کے ذریعہ انتہائی بے باکی اور جسارت سے اجاگر کرتے رہے ہیں۔ سب سے بڑا ہنگامہ ان کی مذہب بیزاری کا برپا ہوا۔ انتہا یہ کہ بعد از مرگ بھی کہ اب جوشؔ کا معاملہ خدا کے ہاتھ ہے ان کے مخالفین اور معترضین نے ان کی شخصیت کو ہدف ملامت بنانے سے گریز نہ کیا۔ ایروں غیروں کی بات چھوڑیئے کہ اسے ان کے [illegible] رہے

نزد [illegible] مسجد - بارسی ٹاکلی۔ ضلع اکولہ۔ مہاراشٹر

ہی میں ایک مضمون طلب کیا جا سکتا ہے۔ غرض یہ کہ پاکستان کے قومی شاعر اور شاعر اسلام کے خلاف مضمون لکھنے والے مرحوم تھے کہ اب ان کے معاملات بھی خدا کے ہاتھ ہیں جوش کے انتقال پر اپنے تعزیتی بیان میں جوش کو اسلام، آنحضور صلعم اور پاکستان کا دشمن قرار دیا اور انتہائی بے رحمانہ انداز میں فرمایا "جوش کو مرنے سے پہلے ہی مرجانا چاہیئے تھا"۔ معاصرانہ چشمک اور فن کارانہ رقابت کے زیر اثر یا حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مرحوم حفیظ جالندھری کے اس شدید ریمارک کی انتہا پسندی پر فیض احمد فیض نے بھی اظہار تاسف کیا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں جوش نے خود اپنے کچے، پکے اعمال و کلام سے مسلمان ہونے کا کبھی اصرار نہیں کیا۔ وجود خداوندی سے منکری کا الزام تو خیر ان پر نہیں آتا، ہاں یہ ضرور ہے کہ وحدت خداوندی اور انبیائے کرام کی رسالت کا وہ تصور ان کے پاس نہیں جو ایک مومن کے لیے شرط لازم ہے۔ لہذا خدا کے ساتھ ان کے معاملات کچھ اس قسم کے ہیں ؎

ہم اپنے دماغ اپنے وطن سے آئے ۔۔۔ ہم اپنا جوانی کے چمن سے آئے
اللہ نے وری کی بہت کی تدبیر ۔۔۔ اللہ سے ہم لڑ کے دکن سے آئے

اسلام کے بنیادی سرچشموں کو شعری علائم کے طور پر برت کر اور ایک عالی دین پر چوٹ کرتے ہوئے اظہار انانیت کے ان کے یہ تیور ملاحظہ کیجیے ؎

مبنی ترا حدیث و آیات پہ دیں ۔۔۔ میں خوگر تامل و تفکر کا امیں
تو شیفتۂ نطق رسالت اور میں ۔۔۔ حرف ناگفتۂ نبوت کا امیں

اور یہ بھی ملاحظہ فرمایئے ؎

مجھ کو انعام حق پناہی دے گا ۔۔۔ میری نیت کو تاج شاہی دے گا
میرے سینے میں انبیاء کا دل ہے ۔۔۔ اللہ سے پوچھ وہ گواہی دے گا

اور اس رباعی میں جوش کی شاعرانہ جسارت ملاحظہ فرمایئے۔ تعلّی اپنی تمام تر حدود پار کر کے کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے ؎

دانائے رموز ایں قرآں ہوں اے جوش ۔۔۔ مولائے الابد جہاں ہوں اے جوش
کیوں اہل نظر پڑھیں نہ کلمہ میرا ۔۔۔ میں شاعر آخر الزماں ہوں اے جوش

الفاظ و علائم کے آزادانہ اور بے لگام استعمال سے قطع نظر اس حقیقت سے انکار کی بھی گنجائش نہیں کہ جوش شاعری کے معاملے میں ایک خاص طرز کے موجد تھے اور خاتم بھی۔ اور تشبیہات اور

صداقت اور اچھوتی تراکیب ہے تو وہ گویا ملک الفاظ کے شہنشاہ ہیں۔ اردو کے دیگر شعراء پر ان کی عظمت، فضیلت اور برتری کا اعتراف کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے کچھ اس طرح کیا ہے ؎

علم و عشق کا کوئی تعین نہ کوئی حد
بونوں کے درمیاں وہ مرد دراز قد

اور علامہ کوثر نیازی فرماتے ہیں :

"اقبال کی نظریاتی عظمت کا پیکر اردو شاعری کے حرم سے ہٹا دیا جائے تو دیکھنے والے دیکھیں گے کہ جہاں تک زبان کے شکوہ، اس کے طنطنے اور دبدبے، اس کی فصاحت و بلاغت، اس کی نزاکت بیان، اس کے جوش و خروش، اس کی ترکیبات و تشبیہات کا تعلق ہے اردو نظم کی پوری تاریخ میں جوش ملیح آبادی کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ اپنے طرز کا موجد بھی ہے اور خاتم بھی۔ نہ اس سے پہلے کبھی اتنا بڑا ناظم پیدا ہوا اور نہ شاید ہو گا..."

سچ تو یہ ہے کہ بیدی اور کوثر نیازی کے یہ دعوے صدفی صد مبنی بر صداقت ہیں لیکن سر دست یہ سب میرے موضوع سے غیر متعلق اور خاصی تفصیل طلب بحث کی احتیاج رکھتے ہیں۔

تو میں عرض کر رہا تھا جوش کے مذہبی عقاید کے بارے میں خدا، رسول اور دین و مذہب پر جوش کی بے باکانہ تنقید اور فکر انگیز باتوں نے جو ہنگامے کھڑے کیے، انہیں کھلے بندوں منکر خدا، کافر، ملحد اور دشمن اسلام کہا گیا۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ جوش کے ان چند اشعار ہی کو بنیاد بنا کر ان کے بارے میں ایسے حتمی فیصلے اور قطعی فتوے صادر کیے جا سکتے ہیں تو ان کے عقیدت حسین سے سرشار سلام، واقعات کربلا پر درد و الم سے لبریز ان کے لافانی اور لاثانی مرثیے، آنحضور صلعم کی شان و عظمت میں کہی گئی ایمان افروز نعتیں اور توحید کے اقرار و اثبات پر مبنی ان کے لاتعداد اشعار کو کس خانے میں رکھا جائے اور انہیں نظر انداز کر دینے کا کیا جواز ہے ہمارے پاس؟ اور جوش کے اس لافانی اور لاثانی شعر کا کیجیے گا جو ضرب المثل کا درجہ اختیار کر چکا ہے ؎

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لیے
اگر رسول نہ آتے تو صبح کافی تھی

وحدانیت کا ایسا مثالی اور جامع اعتراف جو بیک وقت رسالت کا صداقت نامہ بھی ہے۔ اردو شاعری میں اس شعر کی نظیر ملنا مشکل ہے اور آنحضور صلعم کے حضور اس عقیدت و خلوص کے ساتھ نذرانۂ محبت و عقیدت پیش کرنے کے بعد بھی کیا جوش پر لگائے گئے فتویٰ الحاد پر نظر ثانی نہیں کی جا سکتی ؎

گر رو بیٹھی کفر کی بستی رسالت کی نگاہ
گر گئے طاقوں سے بت ختم ہو گئی لیت و لعل

پھر عرب سے آئے وہی پیغام صدق لا الٰہ
تا دوست کہہ کر ہو گئی آدم کے ماتھے پر جلا

...چھپا ... ہے مسلمان ہے ساغر ایمان ... گیا ...
... بڑھ ... دل کے ہونٹوں پر تبسم آ گیا

سوز و تڑپ اور درد و اثر سے معمور ان کا یہ دعائیہ شعر ہے

روحِ عدم میں ... بار خدا ادا ... ہو — یہ نہیں تو دل نور ... جائے ہو قصہ پاک ہو

اس شعر کے علاوہ جوش کے مسلمان ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ان کا سورۂ رحمٰن کا منظوم ترجمہ ہے جس کی ہر سطر میں وہ صرف ایک مسلمان ہی نہیں ایک مبلغِ اسلام کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے

اے فنا انجام انساں کب تجھے ہوش آئے گا — تیرگی میں ٹھوکریں آخر کہاں تک کھائے گا
اس تمرد کی روش سے بھی کبھی شرمائے گا — کیا کرے گا سامنے سے جب حجاب اٹھ جائے گا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

اس باب میں جوش کے اکلوتے فرزند سجاد حیدر کے اس بیان کو بھی غیر مستند ٹھہرانے کی کوئی وجہ نہیں جس میں وہ اپنے والد کے مذہبی عقاید پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"میرے والد مرحوم ایک سچے مسلمان تھے اور خدا کی وحدانیت کو سچے دل سے تسلیم کرتے تھے جس کا ثبوت قرآن مجید کی سورۂ رحمٰن کا منظوم ترجمہ ہے۔ میرے والد رات کے آخری لمحوں میں خدا کی عبادت کرتے تھے۔ جب ہم ان سے اس کے بارے میں پوچھتے تو وہ کہتے تھے کہ وہ اپنے خدا سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں"

دین سے جوش کی برگشتگی کے اسباب ان تحریروں میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ دیندار وں اور دھرماتماؤں کی نمائشی دینداری سے کس شدت کے ساتھ اظہارِ نفرت کرتے ہیں، ملاحظہ فرمائیے:

"دین دین۔ دھرم دھرم! کلیجہ پیپ ہوا جاتا ہے ان جھوٹی اور کھوکھلی آوازوں سے۔ کانوں میں زخم پڑ جاتے ہیں ان مولویوں اور پنڈتوں کی نامراد صداؤں سے...!"

آپ کہیں گے اگر یہ سب ہے تو وہ کیوں ہے جو جوش کے لیے کفر و الحاد کے فتوے صادر کرنے کا موجب ہوا؟ جواباً عرض ہے کہ یہی تو ہے جوش کی فطرت کا وہ پہلو جس کی وجہ سے ان کی زندگی ... تضادات کا ایک عجیب و غریب مجموعہ بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ جوش چاہے قدرت کی مناعی سے انکار کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ خود جوش صناعِ فطرت کا ایک عجیب و غریب اور لازوال شاہکار تھے۔ ایسے کہ ... اوصاف ... ایسی ... خوبیاں، ایسی ہمہ جہت صلاحیتیں، ایسی بے مثال ... بیک وقت

کسی ایک شخص میں شاذ ہی یکسانی دیکھی گئی ہو [illegible] صفتوں کے ساتھ ایک پیچیدہ
ان کی ذات اور شخصیت کو سب سے منفرد اور پیچیدہ بنا دیتے ہیں وہ ہیں ان کے متضاد رجحانات۔
مجھے عرض کرنے دیجیے کہ جوش کی فطرت کا خمیر بغاوت کی مٹی سے تیار ہوا تھا۔ وہ باغی ہیں روایاتی
رواجوں اور اصولوں کے۔ وہ باغی ہیں مذہب کے، حکومت کے، سماج کے حتیٰ کہ والدین کے۔ وہ باغی
ہیں اصولوں کے، پابندیوں کے، اپنے آباؤ و اجداد کے اور خود اپنے آپ کے بھی۔ ان کا یہ باغیانہ رویہ
زندگی کے ہر راستے پر قدم بہ قدم ان کے ساتھ چلتا ہے۔ لہٰذا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو باغیوں کا ہوا کرتا ہے
قدم قدم پر لمحہ لمحہ انھیں مصائب کی سولیوں پر مصلوب کیا جاتا ہے۔ طعن و تشنیع کے پتھروں سے سنگسار
کیا جاتا ہے۔ تہمت و دشنام کے تیروں کی بوچھار کی جاتی ہے ان پر۔ لیکن جوش ہیں کہ مستانہ وار
نعرۂ انا الحق بلند کرتے رہتے ہیں۔ جوش کے حالاتِ زندگی کی روشنی میں ان کی شخصیت کا تجزیہ کیجیے
ان کے مزاج کا ایک عجیب پہلو سامنے آتا ہے وہ یہ کہ جوش ہر ہست کو نیست اور ہر نیست کو ہست میں
بدل دینا چاہتے ہیں، حتی المقدور بدلتے بھی رہے ہیں۔ ان کی انفرادیت پسندی کہہ لیجیے، انانیت کہیے
خودسری کہیے یا ہٹ دھرمی، ضدی پن اور خودنمائی، انھیں ہر موجود اور مروجہ بات سے گویا چڑ
ہے۔ ان کی یہ ضد اور ہٹ دھرمی ان کے اقوال اور افعال میں جا بجا جھلکتی ہے۔ چند مثالیں پیش
ہیں جو جوش کی باغیانہ روش اور ان کے مجموعۂ اضداد ہونے کے ناقابلِ تردید دلائل ہیں۔

جوش صاحب کا خاندان برسوں سے سنی مسلک کا پیرو تھا۔ جوش اپنے خاندانی مسلک سے نکل
شیعیت کے دائرے میں آ گئے۔ حالانکہ مذہب سے ان کا تعلق معلوم۔ صرف اپنی بغاوت پسندی کا اظہار تھا

شاعری میں انھیں عزیز لکھنوی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ استاد کی رغبت کلاسیکی غزل کی جو
تھی۔ اس ڈگر پہ وہ جوش کو بھی ڈالنا چاہتے تھے۔ جوش اپنی افتادِ طبع سے مجبور۔ غزل کی
مخالفت شروع کر دی اور نظم گوئی کی جانب مائل ہو گئے۔

جوش کے آباؤ و اجداد کی ایک کشادہ اور لق و دق محل نما حویلی تھی جس میں رہنا انھوں نے
ترک کیا اور ملیح آباد سے دو فرلانگ فاصلے پر اپنے لیے ایک الگ کوٹھی "قصرِ لحد" تعمیر کروائی اور تن تنہا
اس میں بسیرا کر لیا۔

چونکہ ان کے خاندان میں شراب سے سخت نفرت کی جاتی تھی، جوش نے یہاں بھی روایت شکنی کا
ثبوت دیا۔ اور نہ صرف یہ کہ شراب پینے لگے بلکہ رندی و سرمستی کی دنیا میں مثال بن کر رہ گئے۔

انگریزی حکومت پسند نہ آئی۔ اسے بدلنے کے لیے اپنی تمام تر فطری صلاحیتوں کے ساتھ [illegible]

پھولوں جیسا دین کوئی نہیں ہے اور یہی انقلابی شاعری کی کس طرح سے قہر و استبداد کی منزلیں کرتی ہیں۔ آزادی ملی۔ آزادی کے متوالوں نے اپنے ہم وطن بھائیوں کے خون کی ہولی کھیل کر آزادی کا جشن منایا۔ جوش نے اس بربریت پر نظم "ماتم آزادی" لکھ کر اپنی برہمی کا اظہار کیا۔

دولت ملی تو اور بھی نادار ہو گئے — صحت ہوئی نصیب تو بیمار ہو گئے
اُترا جو بار اور گراں بار ہو گئے — آزادیوں سے اور گرفتار ہو گئے

پگھلا جو آسماں تو زمیں سنگ ہو گئی
یوں پو پھٹی کہ صبح چمن دنگ ہو گئی

آزادی کے فوراً بعد ہندوستان میں آئے دن رونما ہونے والے فسادات جنگیوں نے ان کی کیا حالت بنا رکھی ہے، انہیں کی زبانی سنیے۔ انداز میں وہی تیزی و تندی ہے جو ان کی فطرت کا خاصہ ہے۔

"اے ہندوؤ اور اے مسلمانو۔ اے بھارت ماتا کے سپوتو! تمہاری آئے دن کی خانہ جنگیوں نے مجھے دیوانہ بنا کر رکھا ہے۔ تمہارے دیر و حرم اور ناقوس و اذاں کے جھگڑوں نے کھو دیا ان اور آ بیجاں بنا دیا ہے۔ میں تو دیوانہ وار خود ہی اپنی بوٹیاں نوچ رہا ہوں۔ خدا کے لیے بتاؤ۔ میں یہ لہجہ کہاں سے لاؤں!..."

عسرت نے مجبور کیا۔ حضور نظام کی فیاضیوں کے چرچے سُن کر حیدرآباد پہنچے۔ بمشکل دربار تک رسائی حاصل ہوئی۔ نظام کی مطلق العنانیت جہاں خلافِ ادب ایک لفظ ادا ہو جائے تو زبان سے کھینچ لی جاتی ہے، وہاں نظام کے خلاف کچھ لکھ دیا۔ عتابِ شاہی نازل ہوا۔ معذرت طلب ہوا، رعایت دی گئی۔ جوش کی خود دار اور انا پسند طبیعت کو کب گوارا تھا۔ تمام عیش و آرام اور سکون و فراغت کو قلندرانہ شان کے ساتھ ٹھوکر مار کر ریاست سے نکل آئے۔

آزاد ہندوستان میں وزیر اعظم پنڈت نہرو ان کے والا و شیدا، ابو الکلام ان کے رفیق، سروجنی ان کی پرستار، آنند نارائن ملا، فراق، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، جگن ناتھ آزاد اور ٹیگور جیسی بلند قامت ہستیاں، افسر اور عوام سب آنکھوں پر بٹھانے کو تیار۔ ایک سے ایک صاحب اثر و اقتدار ان کی مدد کو موجود لیکن تنک مزاجی کا وہ عالم کہ پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتے۔ مولانا آزاد سے ملنے کے لیے گئے ہیں۔ مولانا انتہائی مصروف آدمی۔ ذرا سی تاخیر پر جز بز ہو کر لکھ بھیجتے ہیں ؎

نامناسب ہے خون کھولانا — پھر کسی اور وقت مولانا

دلی قلعہ میں جشنِ جمہوریت کے مشاعرے میں تشریف فرما ہیں۔ نشہ بندی کا قانون نافذ ہے

جوش صاحب پنڈت نہرو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے برجستہ فرماتے ہیں ۔

کہتے نہیں جن کو اہلِ دعوت سے ساقی
اوہام کے بندے ہیں وہ چندے ساقی
جس کو پھر اسکا نہ الذّاب تک
اس سے کو پھر اُٹھاتے ہیں بندے ساقی

حرف لفظے پر بھی [illegible] نہیں کرتے ۔ بے باکی اور جسارت کی آخری حدوں کو پھلانگ جاتے ہیں ۔

ہم [illegible] زمیں لگے یہ کھلونے دیکھو
چہرے جیسے پہلے بچھڑنے دیکھو
جس کوہ سے گر چکے ہیں تنکا والے
اس کوہ پہ چڑھ رہے ہیں بونے دیکھو

کانگریس حکومت کا دور دورہ ہے ۔ حکومت کے تمام ذمہ داروں اور کانگریس کے تمام متعدد رہنماؤں کی رفاقت انہیں حاصل ہے لیکن جوش ہیں کہ رفاقت و دوستی کے تمام تقاضوں سے بے نیاز تمام مصلحتوں سے بے پروا انتہائی بے باکی اور صاف گوئی سے ان کے چہروں سے منافقت کی نقابیں اتار رہے ہیں ۔

در پر سیاہ پوشش سیاہ کار آگئے
کھدر پہن پہن کے بداطوار آگئے
شیطان ایک رات میں انسان بن گئے
جتنے نمک حرام تھے کپتان بن گئے

پنڈت نہرو کو نظم سنائی ۔ انھوں نے تعریف کی، اس تنبیہ کے ساتھ کہ سردار ولبھ بھائی پٹیل کے کانوں پر اس کی بھنک نہ پڑنے پائے ۔ وزیر داخلہ ہیں برداشت نہیں کر پائیں گے ۔ لیکن بات دبے سختی بلاغت کے بعد سردار پٹیل تک پہنچ گئی ۔ جوش صاحب کی طلبی ہوئی ۔ وزیر داخلہ کے کمرہ خاص میں پہنچ کر دیکھے تھی پنڈت اور دیگر سرکردہ کانگریسی لیڈروں اور سرکاری افسروں کی موجودگی میں سردار پٹیل کو دانستہ یہ نظم سنا دی ۔

ہندوستان نے عظمتوں کا زریں تاج ان کے سر پر رکھا ۔ پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا ۔ ماہنامہ آجکل کی ادارت انہیں سونپی ۔ دولت، عزت، شہرت، عظمت وہ کون سی نعمت تھی جو ہندوستان نے ان کے قدموں پر نچھاور نہیں کر دی ۔ اس کے باوجود وہ پاکستان ہجرت کر گئے ۔

جوش کے ہجرت پاکستان کے سانحے کو بھی ان کے مزاج کے ضدی اور سیمابی فطرت کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے ۔ وہ کسی ایک نظام سے زیادہ دنوں تک مطمئن ہی نہیں رہ سکتے تھے ۔ ورنہ ان کے ترکِ وطن کا بظاہر کوئی معقول جواز نظر نہیں آتا ۔

پاکستان اسلامی نظریات کی بنیادوں پر قائم ہوا اور اسلامی افکار و اقوال سے جوش کا تعلق کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ۔ ہندوستان کے حالات انہیں راس آ چکے تھے ۔ اپنی فطری افتاد سے مجبور ان پُرسکون حالات میں ان کا جی کیا لگتا ۔ ان کے باغیانہ خیالات کے لیے تو اس وقت پاکستان کے حالات کی زمین نہایت

نظیر تھی ۔ پاکستان کے ارباب اقتدار کی دعوت پر اپنے وطن عزیز سے منہ موڑ کر اپنے لاکھوں مداحوں اور عقیدت مندوں سے ناطہ توڑ کر پاکستان جا پہنچے ۔ پاکستانیوں نے شروع شروع میں خوب آؤ بھگت کی۔ چند روز تو سکون و آشتی سے گزر گئے لیکن جوش تو ٹک کر بیٹھنے والے تھے ۔ کچھ ہی دنوں بعد شست سوٹ کر میدان کارزار میں کود پڑے اور پیچھے دھجیاں اڑانے پاکستانی حکومت، پاکستانی عوام اور نظریۂ پاکستان کی ۔ مخالف عناصر نے زور پکڑا ۔ حکومت اور عوام میں معتوب ہوئے ۔ ان کے خلاف سازش اور ریشہ دوانیوں کا ایک سلسلۂ لامتناہی شروع ہو گیا ۔ انہیں ذہنی طور پر مفلوج کرنے کی کوششیں کی گئیں تنگ حالی اور تنگی میں مبتلا کیا گیا ۔ لیکن جوش نے اپنی فطرت میں ذرا سی لچک نہ آنے دی ۔ شیر کی طرح غراتے رہے، دھاڑتے رہے ۔

پاکستان سے بطور مہمان ہندوستان آئے ۔ ٹائمز آف انڈیا کو ایک انٹرویو دیا جس میں پاکستانی حکومت کے رویے پر بھی کچھ اظہار خیال کر ڈالا ۔ انٹرویو چھپا ۔ جوش کے ایک بدخواہ ملیح آبادی بھی ان کے ساتھ لگے ہوئے تھے ۔ انھوں نے اس انٹرویو کا تراشا اور جوش کی سرگرمیوں کی من مانی رپورٹ ٹنک لگا کر حکومت پاکستان کے سامنے پیش کر دی ۔ پاکستان پہنچتے ہی حکومت کا عتاب نازل ہوا اور نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھے ۔ خود ان ہی کی ایک نظم کا ایک شعر ان کے حالات کا ترجمان بن گیا ۔ جس کا مقطع ہے ؎

میں کراچی میں ہوں اے جوش کہ کوفے میں حسین
سب شہادت کے ہیں آثار چنا جور گرم

اس چنا جور گرم اور ہجرت پاکستان کے واقعہ پر ہندوستان کے منفرد طنز نگار شاعر شاد عارفی نے جوش پر بڑی دلچسپ اور کراری چوٹیں کی ہیں ۔ دو شعر پیش خدمت ہیں ؎

یہ دوسری بات ہے کہ ہجرت نہ کر کے در در کی خاک چھانے
بچے نہ بیچے کا جوش کی طرح ذوقِ شعر و سخن ہمارا

واعظ کہتا ہے جنت میں بے ایمان نہیں جائے گا ÷ لیکن شاد مسلماں ہو کر پاکستان نہیں جائے گا

کس کس بات کا ذکر کیا جائے ۔ کس کس واقعہ کو بیان کیا جائے ۔ ایسے ہی بے شمار متضاد اور متنازعہ واقعات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو مہد سے لحد تک جوش کی زندگی سے وابستہ ہے ان کی شخصیت کا احاطہ کیے ہوئے ہے ۔

اور زندگی بھر مخالفتوں کو دعوت دینے والا، مخالفتوں سے کھیلنے والا، مصائب سے آنکھ مچولی کھیلنے والا، شعلوں کو ہوا دینے والا، فتنوں کو جگانے والا، بے باک، نڈر اور سرفروش مجاہد ۲۲ فروری

… ختم ہو گیا ۔

جوش کے انتقال پر دنیا بھر کے شاعروں، دانش وروں اور سربراہان مملکت نے تعزیتی پیغامات بھیج کر ان کے شایان شان انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کہتے ہیں " یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نظام شمسی سے آفتاب ہمیشہ غروب ہو گیا۔ اب تا قیامت اندھیرا ہی اندھیرا رہے گا۔ وہ پیر مغاں جس پر لاکھوں زاہد قربان۔ وہ بت پرست جس پر ہزاروں واعظ نچھاور۔ وہ منکر خدا جس پر ایمان لانے کو جی چاہتا ہے آج ہم میں موجود نہیں ہے۔

ساغر نظامی فرماتے ہیں " جوش اردو زبان کا عظیم شاعر تھا۔ بڑی حیرت کی بات ہے کہ جوش جیسے شاعر کو جس نے نظم کی پندرہ سولہ گراں قدر تصانیف قوم کو دیں، ناآسودگی کی زندگی بسر کرنی پڑی۔ پھر بھی اس ناآسودگی کے باوجود وہ نہ انگریزوں کے ہاتھ بکا نہ کسی دوسری جماعت کے۔ یہ بلاشبہ ایک عظیم کردار کی بات ہے۔ ان کی شاعری کی سطحیں بڑی وسیع اور گہری ہیں مگر ان کے عہد کے تقریباً سبھی ناقدوں نے ان کے ساتھ پورا انصاف نہیں کیا۔ یہ ادبی بد دیانتی ہے۔ سب ان سے ناخوش تھے۔ محض اس لیے کہ وہ ایک بے سہارا انسان تھا۔ نیاز فتح پوری نے محض ذاتی عداوت کی بنا پر ان کے پیچھے اٹھا دیے تھے۔

پاکستانی شاعر رئیس امروہوی جوش کی زندگی کے آخری ایام کی کسمپرسی پر اظہار تاسف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں " جوش صاحب کے ساتھ ان کی آخری عمر میں وہی سلوک ہوا جو فردوسی کے ساتھ ہوا تھا اور یہ اتنا بڑا سانحہ ہے جس پر اردو شاعری اور اردو شعراء ابد تک ماتم کرتے رہیں گے۔"

جوش کی تضاد پسند طبیعت کا اندازہ ان کے مجموعوں کے ناموں سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ ہر مجموعہ کا جڑواں نام اور ایک دوسرے کی ضد، ملاحظہ فرمایئے۔

شعلہ و شبنم، سموم و صبا، عرش و فرش، فکر و نشاط، نقش و نگار، سیف و سبو، سنبل و سلاسل، قطرہ و قلزم، نجوم و جواہر، الہام و افکار، جنون و حکمت، موجد و مفکر، سرود و خروش، آیات و نغمات، ۔

تو یہ تھے جوش۔ تضادات کا مجموعہ۔ بغاوت کا مجسمہ۔ ایک لازوال، نادر المثال اور عجوبۂ روزگار شخصیت کے مالک۔

"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

میر لائق علی

کرشن چندر کا مقبول ناول "شکست"

کرشن چندر ایک مشہور افسانہ نگار ہیں۔ ممکن ہے وہ ناول نگار کی حیثیت سے بدلتے ہوئے زما
ں حد تک متاثر نہ دے سکے ہوں جس کی ان سے توقع کی جا سکتی ہے۔ مگر وہ ایک افسانہ نگار
یثیت سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ عزیز احمد جیسے ہمدرد ناقد ہوں یا کشن پرشاد کول اور احسن فارو
یسے نقاد اِن کے فن سے خامیاں ڈھونڈیں یا ڈاکٹر اعجاز حسین یہ کہہ کر کرشن چندر کی وقعت کو کم کر
یں کہ "چند ظاہری خصوصیات کی بنا پر ہم کرشن چندر کو ترقی پسند مصنفین کی صف میں پاتے ہیں"۔
کرشن چندر نے اپنا ناول "شکست" ۱۹۴۳ء میں لکھا۔ جدید دور کی ناول نگاری میں "شکست"
بعض خصوصیات کے لحاظ سے امتیازی مقام رکھتا ہے۔ لیکن "شکست" کے بارے میں بعض متضا
ئیں بھی ملتی ہیں۔ عزیز احمد نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

"غالباً وہ اُردو کا بہترین ناول ہے"۔

احسن فاروقی نے "شکست" کو صحافتی اور وقتی دلچسپی کی چیز" قرار دینے کی کوشش کی ہے
ور لکھا ہے:

"ناول کا قصہ بھی ایسے سطحی عشق سنسنی خیز فرضی اور وقتی اثر رکھنے والے واقعات پر
مبنی ہے جو اخباری اور فلمی قصوں میں عام طور پر انہیں کامیاب بنانے کے لیے داخل
کئے جاتے ہیں"۔

یہ ناول اس طرح جدید دور کے انتشار اضطراب بےچینی اور کرب کا پوری طرح سے پیش کرتا ہے
دل کی تبدیلی سے نوجوانوں کے ذہنوں میں اور خیالات میں جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں یا پیدا ہو
ان کو بھی اس ناول میں ہر جگہ نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ تمام باتیں کشمیر کے فطری حسن کے پس منظر میں

پس منظر میں پیش کی گئی ہیں۔ "شکست" میں فرسودہ نظام کے مقابلے میں صحت مند اقدار و توانا قدر کی فطری اور صحت مند محبت کی شکست پیش کی گئی ہے۔ ان دونوں کی کشمکش کو پیش کرتے ہوئے کرشن چندر نے فرسودہ نظام کی فولادی اور مضبوط گرفت کو ظاہر کیا ہے جس میں شیام اور ونتی کی محبت کامیاب ہوتی ہے نہ ہی چندرا اور موہن سنگھ کا عشق کامیابی حاصل کرتا ہے۔ چندرا اپنے پریمی موہن سنگھ کے مرنے پر پاگل ہو جاتی ہے کیونکہ پنڈت سروپ کشن مذہب کا ٹھیکیدار اور فرسودہ سماجی نظام کا پاسبان تھا۔ وہ کس طرح گوارہ کر سکتا تھا کہ ایک راجپوت کا دھرم بھرشٹ ہو جائے۔ کیونکہ ایسا ہو جانے پر اس کی خود غرضی اور عیارانہ اہمیت ختم ہو جاتی تھی۔ ونتی اور شیام بھی برہمن سماج کے فولادی ہاتھ سے نہ بچ سکے۔ کیونکہ پنڈت سروپ کشن ونتی کی شادی اپنے انتہائی کم رو بد صورت لڑکے درگا داس سے کرنا چاہتا تھا تاکہ اس سے اپنے گھناؤنے مقاصد کی تکمیل کا موقع حاصل ہو سکے۔ ونتی کی شادی اس کے ماموں کو رشوت دے کر درگا داس سے کر دی جاتی ہے۔ لیکن شیام کے شگن کے دن ونتی ان مصائب کی تاب نہ لا کر جان دے دیتی ہے۔ کرشن چندر نے چونکہ ایک پامال موضوع کو اپنایا ہے۔ اس لیے عباس حسینی کا اس ناول پر اعتراض ہے کہ

"یہ زندگی وہی ہے جو رومانیت سے پُر ہے جس میں محبت کرنے کی آزادی نہ ملنا ہی سب سے بڑی اذیت ہے، اور جس میں جنسی تعلقات پر سے ہر طرح کی پابندی اٹھ جانا سب سے بڑی راحت ہے۔"

"شکست" کی رومانیت صرف رومانیت ہی نہیں ہے بلکہ اس دور کی حقیقت نگاری بھی ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں پورے قدیم عقائد ٹوٹ چکے ہیں اور نئے حالات میں نئی قدروں کی تلاش ہو رہی ہے۔ پرانی بندشوں سے یہ بیزارگی نئے حالات اور وقت کا مطالبہ بھی ہے۔ یونگ کا کہنا ہے کہ ہم اپنے ذہنوں کے ایک "نقلی تصور" سے دور آ رہے ہیں۔ اس لیے حقیقت کی اعلیٰ قوت سے بے حد متاثر ہیں۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ دنیا کی تصویر اور اس کا جو تصور ہم رکھتے ہیں کبھی کبھی بدل سکتا ہے۔ جیسا کہ ہمارے متعلق خود ہمارا تصور بدل جاتا ہے۔ ہر نئی دریافت ہر نیا خیال دنیا کو ایک نئی شکل دیتا ہے۔ ہم کو اس کے لیے یعنی اس تبدیلی کے لیے تیار رہنا چاہیے ورنہ ہم یکایک اپنے آپ کو فرسودہ دنیا میں پائیں گے۔

کرشن چندر نے "شکست" میں ہندوستانی زندگی کے تلخ سماجی حقائق کو پیش کیا ہے اور ان کو بھرپور طریقے پر پیش کرنے کے بعد ہی اپنی رومانیت ظاہر کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کرشن چندر کی یہ رومانیت بھی وقعت رکھتی ہے اور اس ناول کی اہمیت میں اضافہ کرتی ہے۔

جس طرح علی عباس حسینی نے ناول سے غلط نتیجہ اخذ کر کے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے، [illegible]

اسی انداز سے عزیز احمد نے "شکست" میں ان خوبیوں کو دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے جو اس میں نہیں ہیں۔ اس ناول کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"اس دیہاتی زندگی میں سرمایہ اور محنت کا تنازعہ آہستہ آہستہ ابھر کر ایک مہیب شکل اختیار کر لیتا ہے۔ سرمایہ اور محنت کی اس لڑائی میں محبت کا خون ہو جاتا ہے۔ ہر طرح کی کشمکش جو بقول کرشن چندر کے اس "سماجی نظام" کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلے میں واقعتاً یا ضمناً اپنی جھلک دکھاتی ہے"۔ معلوم نہیں ناول کے کس واقعہ سے "سرمایہ اور محنت" کا تنازعہ عزیز احمد کو ابھرتا ہوا نظر آیا۔ محبت کا خون سرمایہ اور محنت کی لڑائی کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ سماج کے فرسودہ رسوم اور سماجی ٹھیکے داروں کی عیاری کی وجہ سے ہوتا ہے۔ چندرا اور موہن سنگھ کی محبت میں جو بات سد راہ بنتی ہے وہ "مذہبی سماج کی روایت پرستی اور جاہلیت ہوتی ہے۔ اور اس روایت پرستی اور جاہلیت کی مضبوط چٹان پنڈت سروپ کشن کی ذات ہوتی ہے جس کے متعلق شیام سوچتا ہے:

"اگر چندرا باغی تھی تو سروپ کشن روایت پرست۔ ایسا کٹر روایت پرست اس نے اپنی زندگی میں بہت کم دیکھا تھا۔ موجودہ تہذیب سے کہیں بھی کسی حالت میں بھی وہ صلح کرنے کو تیار نہ تھا۔ یا وہ شاید سچ مچ ایک وحشی، بیدرد سنگ دل انسان تھا۔ جسے اپنے ہم جنسوں کو ذلیل کرنے اور ستانے میں مزہ آتا تھا۔ وہ کیوں ان دونوں نوجوان دلوں کی رفاقت کو تباہ و برباد کرنا چاہتا ہے۔ اس سے اسے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ شاید زندگی جس دھارے پہ جا رہی تھی وہ اس کی رو میں چٹان بن کر کھڑا ہونا چاہتا ہے اور دنیا کو بتا دینا چاہتا ہے کہ پرانی قدریں اب بھی صحیح ہیں"۔

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ سرمایہ اور محنت کی کشمکش سے "محبت کا خون" نہیں ہوا بلکہ روایت پرستی اور فرسودہ سماجی بندشوں کی وجہ سے ہوا۔ جس طرح موہن سنگھ اور چندرا کی محبت میں سرمایہ اور محنت کی کشمکش کا کوئی ہاتھ نہیں۔ اسی طرح ونتی اور شیام کی محبت میں بھی محنت اور سرمایہ کے تنازعہ کا کوئی ہاتھ ہی نہیں ہو سکتا۔ شیام تحصیل دار کا لڑکا ہے اور ونتی بھی متوسط طبقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ محنت کش طبقے سے تو ان دونوں کا کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔ پھر نہ جانے کیوں عزیز احمد نے "شکست" میں محنت اور سرمایہ کے تنازعہ کی "مہیب شکل" دیکھ لی۔ "شکست" میں نئی اور پرانی قدروں کی ٹکر دکھائی گئی ہے۔ کرشن چندر نے نمایاں طور پر اس بات کو پیش کیا ہے کہ ابھی نوجوان نسل میں اتنی طاقت اور جان پیدا نہیں ہوئی ہے کہ وہ پرانی قدروں کی زنجیروں کو اور فرسودہ سماجی بندشوں کو توڑ پھینکیں۔ یہی اس ناول کا موضوع ہے اور اسی کو

حسن کو ناول میں ہر جگہ پیش کیا ہے۔

"شکست" کی اہمیت اس کی نئی اور پرانی قدروں کی کشمکش کو پیش کرنے کے ساتھ اس کی منظر کشی میں مضمر ہے۔ اس ناول کا سارا حسن اس کے پس منظر کی فنکارانہ پیش کش ہی میں نمایاں ہوتا ہے۔ فطرت کا حسن اور سماج کی بدصورتی اس ناول میں صرف طرح سے نمایاں کئے گئے ہیں۔ ان دونوں چیزوں سے کرشن چندر شدید طور پر متاثر ہوئے تھے اور یہی تاثر ان کے اس ناول میں جا بجا نظر آتا ہے۔ وہ جس طرح سے ان دونوں چیزوں سے متاثر ہوئے تھے اور جس شدت سے اثر لیتے تھے' اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میرا بچپن چونکہ کشمیر میں گزرا ہے اور زیادہ تر فطرت کی آغوش میں گزرا ہے اس لئے زندگی میں سب سے بڑی شخصیت جس نے مجھے متاثر کیا ہے' وہ فطرت ہے۔ سردیوں میں برف گرنے سے لے کر بہار میں پھولوں کے کھلنے تک میں نے فطرت کی گوناگوں کیفیتوں کا قریب سے مطالعہ کیا ہے... زندگی کے علاوہ میرے ادب میں جو احساس جمال کسی کو ملتا ہے اس کا منبع یہی فطرت ہے۔ رومانیت اور حقیقت نگاری کا پہلا درس بھی مجھے ایک طرح سے فطرت ہی نے دیا۔"

کشمیر کا حسن اور کشمیر کی خوب صورت وادیوں اور مرغزاروں میں رہنے والوں کی مجبوری اور بے چارگی' اس ناول کا موضوع ہیں۔ اس موضوع سے کرشن چندر بے حد متاثر تھے۔ اس لئے ان کی تمام تر تاثیر اسی بات میں مضمر ہے کہ مصنف جس موضوع پر لکھ رہا ہے اس موضوع نے اسے کس حد تک متاثر کیا ہے۔ "شکست" کی اہمیت کا راز بھی موضوع سے متاثر ہونے میں چھپا ہوا ہے۔

فطرت کے حسن کو اردو کا کوئی بھی ناول نگار اس ... اس درجہ کامیابی کے ساتھ پیش کرنے میں کرشن چندر سے سبقت لے جانے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔ "شکست" کے مناظر اپنی اثر انگیزی کے لحاظ سے قاری کے لئے عکسی تصویر کا حکم رکھتے ہیں۔ ناول کی ابتدا سے اختتام تک فطرت کے حسن کی رنگینیاں بکھری ہوئی ہیں۔ ناول کا یہ پس منظر ناول کے مختلف کرداروں کا جزو بنا نظر آتا ہے۔ خاص طور پر چندرا اور ونتی کے کردار اس پس منظر سے علاحدہ کر کے نہیں دیکھے جا سکتے۔ بعض واقعات کا تاثر اور اثر انگیزی بھی تمام تر اسی پس منظر سے ہی وابستہ ہے۔ عزیز احمد نے ونتی کی موت کے منظر کے متعلق لکھا ہے کہ یہ اردو کے زندہ جاوید شاہکاروں میں شمار ہوگا۔ اس منظر کا بھرپور تاثر بھی حقیقت میں کرشن چندر کی منظر نگاری میں مضمر ہے۔ کرشن چندر نے "شکست" میں کشمیر کے فرسودہ سماجی نظام کو کشمیر کے حسن کے پس منظر میں ابھارا ہے۔

ڈاکٹر خواجہ علی انجم

غیر اردو داں طبقہ کو اردو سکھانے کے مسائل اور ان کا حل

(یہ مقالہ ناگپور میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام سیمینار مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۷ء میں پڑھا گیا ۔)

کسی نے کیا کہا تھا "شہد و شکر سے شیریں اردو زبان ہماری" لیکن افسوس صد افسوس کہ شہد کی حلاوت اور شکر کی شیرینی کی حامل ہو کر کوثر و تسنیم سے دھلی، نکھری ستھری یہ زبان جس قدر غلط فہمیوں، اقتضائیوں بلکہ عداوتوں کا شکار ہوئی ہے کوئی دوسری زبان ایسی جانگسل مرحلے سے نہیں گزری۔ دانستہ نادانستہ طور پر یہ بات مشہور ہو گئی ہے یا کی گئی ہے کہ اردو ایک بدیسی، غیر ملکی زبان ہے۔ مسلمانوں کی زبان ہے۔ اردو کے نادان دوستوں کے متعلق تو کچھ نہیں کہہ سکتا مگر دانا دشمنوں کے متعلق بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ اردو کے شجر ثمر بار کی تخم ریزی اسی خاک پاک میں کی گئی ہے جسے ہندوستان کہا جاتا ہے، اسی آب و ہوا میں اس کی نشو و نما ہوئی۔ سرزمین دکن اس کا مولد ہے۔ قلی قطب شاہ جیسے شاہوں نے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز جیسے درویشوں نے ولی دکنی جیسے عام فہم شاعروں نے اسے پنگوڑوں میں جھلایا۔ اس کا بچپن دلی کی سلونی گلیوں میں کلکاریاں مارتا پھرا۔ قلعۂ معلیٰ کی چہار دیواری سے نکل کر معصوم لڑکپن نے ادائے دلنوازی سیکھی۔ اس کے خرام ناز شباب نے لکھنؤ جا کر انگڑائی لی۔ چندے آفتاب و چندے مہتاب ہو گئی۔ اب جو ماہ نیم ماہ بنی تو اس کی پاکیزہ چاندنی مسجدوں کے مینار اور مندروں کے کلس پہ بکھرتی رہی۔ محلوں کے فلک بوس کنگورے اور کٹیوں کے جستہ دیوار و در جگمگا اٹھے۔ شاہراہوں کو منور کیا تو گلیوں کو بھی محروم نور نہ رکھا۔

صدر شعبۂ اردو۔ جی ایس کامرس کالج، جسمانی کالونی ۴۴۰۰۰۳ ناگپور ۔ مہاراشٹرا

پُر شہد افزا اور سرود سحر انگیز نے ہندوستان کے باسیوں کو مسحور و مست کر دیا۔ کون تھا جو اس کا شیدائی نہ تھا۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

یہ زبان بہت جلد ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا نشان بن گئی۔ دو عظیم تہذیبوں کے گنگا جمنی سنگم کی مقدس علامت بن گئی۔ اس کا خد و خال حسین اور نقش و نگار اگر ہندو تہذیب نے بنائے ہیں تو اسلامی تہذیب نے اس میں جاذب نظر رنگ بھرے ہیں۔ اس کو سنوارنے اور نکھارنے میں شیخ و برہمن دونوں کی پر خلوص کوششیں شامل ہیں۔ اس زبان کے اُجلے، مصفا آئینے میں ہمیں قومی یکجہتی کا عکس جمیل نظر آتا ہے۔ باقاعدہ کوئی فہرست نہیں بنائی ہے بس جو نام ذہن میں آتے گئے وہی اس دعوے کے ثبوت کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ اگر ایک طرف اس کے دیوانوں میں انیس، دبیر، سودا، میر، غالب، ذوق، ظفر، حالی، اقبال، سر سید، شبلی، سلیمان ندوی، جوش ملیح آبادی اور ابوالکلام آزاد جیسے سخن پرور نظر آتے ہیں تو دوسری طرف اس کے پجاریوں کی صف میں رتن ناتھ سرشار، چکبست، دتاتریہ کیفی، آنند نرائن ملا، جوش ملسیانی، کرشن چندر، پریم چند، مہندر ناتھ، اشک، نانک، جگن ناتھ آزاد، مالک رام وغیرہ جیسے محبانِ وطن اور شناورانِ ادب بھی نظر آتے ہیں۔

ہندوستانی زبانوں کے قدیم خاندان کی اس نو خیز و نو دمیدہ زبان نے مادرِ وطن کی آزادی کی جدوجہد میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا۔ اس ضمن میں اس کے کارہائے نمایاں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ کامیاب انقلاب کے دیگر عوامل میں ایک عنصر یہ بھی ہے۔ یہ اردو ہی ہے جس نے "انقلاب زندہ باد" کا محرکِ حیات نعرہ اور انقلاب بردوش نعرہ قوم و وطن کی نذر کیا۔ اردو تحریر و تقریر نے جس طرز خطابیہ عوام کو جھنجھوڑ کر جگایا اور عمل کی قوتوں کو ابھارا اور آزادی کی امنگ پیدا کی، یہ ایک عظیم باب ہے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ ہمہ گیر زبان ہے غلط ہے سب سے بڑی اقلیت کی زبان کہا جاتا ہے۔ ان اضلاع سے اس برصغیر کی سب سے بڑی زبان ہے کہ یہ کشمیر سے راس کماری اور کنیا کماری تک اور گجرات سے بنگال تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہر کہ و مہ پر اس کی حکومت ہے اور اس برصغیر میں اس کا جواب محال ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ زبان اس برصغیر کی لنگوا فرینکا (LINGUA FRANCA) ہے۔ تمام حالات کے باوجود اردو کا ارتقاء — گو سست رفتار رہا ہی سہی۔ اس بات کا یقین مجھے ہے کہ

پسندہ زبان ہے۔
اگر گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دینا ہے، اگر قومی یکجہتی کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنا ہے اگر
ن نسلی اور مذہبی تعصب کے عفریت کو قابو میں کرنا ہے تو اردو کی ترویج و اشاعت اور ابلاغ و
غ ہی اس کا واحد ذریعہ ہے اور ایک ہندوستانی کا فرض بھی۔
حضرات! یہ تو ہوئی وجہ کی بات کہ آخر اردو کی اہمیت کیا ہے؟ اور غیر اردو داں لوگ اردو کیوں
سیکھنا چاہیئے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس نکتہ پر بھی بات کر لی جائے کہ غیر اردو داں اردو کی
تعلیم کیوں کر حاصل کر سکیں۔
ملک گیر اردو دشمنی کے تناظر میں حکومت مہاراشٹر کی اردو دوستی تپتے ہوئے جلتے ہوئے صحرا میں
نخلستان جیسی ہے۔ ایسا بھی ہوگا اگر اس ضمن میں حکومت مہاراشٹرا کی خدمات جلیلہ کا اعتراف اور
اظہار تشکر نہ کیا جائے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ جس قدر اردو دوستی اور تعلق خاطر کا ثبوت ریاستی حکومت دے
رہی ہے۔ اس سے زیادہ دیرپا اور دور رس نتائج پیدا کرنے والا ثبوت ریاستی حکومت کے لیے ممکن ہے۔
ریاستی حکومت اردو کی سرپرستی کر رہی ہے۔ درست، بجا، یہی حکومت سرپرست کی بجائے مربی بن سکتی
ہے اگر حکومت بہار کی طرح یہ بھی اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دے دے۔ اس طرح غیر اردو داں
لوگوں میں اردو کی ترویج و اشاعت کے امکانات روشن ہو جائیں گے اور غیر اردو داں طبقہ کو اردو کی
واقف ہونے کا ایک مضبوط جواز مل جائے گا۔ میں نے آگے کہیں کہا ہے کہ غیر اردو داں افراد کو تعلیم
تکمیل اور امتحان میں کامیابی کے بعد سرٹیفکیٹ دیا جائے۔ سرکاری ملازمت میں اہمیت کے بغیر ایسا
سرٹیفکیٹ محض ایک پر تصنع تکلف ہوگا۔ اگر اردو دوسری سرکاری زبان قرار دے دی گئی تو اس قسم
اسناد کی قدر و قیمت متعین ہو جائے گی اور اس سلسلے میں بھی پیچیدہ مسائل حل کر۔
غیر اردو داں طبقہ کو اردو کی طرف راغب کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اردو ادب
بالخصوص ادب الاطفال اور ہلکی پھلکی شاعری کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا جائے تاکہ اس طرح
شخص اس کی کشش سے حاصل کرنے کا شوق اردو خوانی کی منزل تک لے آئے۔ اس لسانی خدمت کی
انجام دہی کے لیے بے شمار مختلف مسائل درپیش ہوں گے ان مسائل کا حل میری نظر میں یہ ہے:
مسئلہ نمبر ۱: اردو کے مختلف حروف مختلف اشکال میں لکھے جاتے ہیں جس سے غیر اردو داں
لوگوں کو اردو سیکھنے میں دشواری ہوتی ہے، جیسے
جیسے: احباب۔ باغ۔ خود بخود۔ بولا

ع : شمع - عادت - مسعود - شمع

غ : باغ - مرغوب - بالغ - شفیق

ک : کتاب - کاغذ - کاک

گ : آگ - گائے - گھر - گل

ہ : تباہ - بہادر - بیچ - ہاتھ

حل : غیر اُردو والی حضرات کو اُردو سکھانے میں سب سے پہلے حروف تہجی کی پہچان ان کو سکھنے اور پڑھنے کی مشق کرائی جائے - ایسے حروف جو ایک سے زیادہ اشکال میں استعمال ہوتے ہیں ان حروف کا استعمال الفاظ میں کیا جائے اور ایسا مشق کے ذریعے ان کی پہچان کروائی جائے

مسئلہ نمبر ۲ - (ا) کچھ حروف ایسے ہیں جو لفظ کی ابتدا میں آنے پر اپنی شکل بدل سکتے ہیں - جیسے :

(ا) : امید - اگر - ابر

د : دن - دار - درمیان

ڈ : ڈر - ڈرامہ - ڈھال

ذ : ذرا - ذکی - ذمہ دار

ر : رب - رس - رضا

ز : زبردست - زیادہ - زیارت

و : وہ - واہ - وعدہ

(ب) یہی حروف بیچ میں دوسرے حروف میں مل کر ملتے ہیں لیکن اپنے سے کسی حرف کو ملتے نہیں دیتے - ان کی پہچان اور استعمال کرانا ضروری ہے ...

[illegible]

د : [illegible]

ڈ : [illegible]

ذ : لذیذ - حذف - مجذوب

ر : زمیر - پتھر - کمرہ

و : ثواب ۔ موجودہ ۔ خوب صورت

حل : مثلہ نمبر ۲ کے بعد مثلہ نمبر ۳ میں پیش کئے گئے مشکلات کو لکھ کر ذہن نشین کرایا جائے۔

مسئلہ نمبر ۳ : اردو میں کچھ حروف ایسے ہیں جن کی آواز ایک ہے لیکن الفاظ میں استعمال ہوتے ہیں

(ت اور ط) تارہ ۔ ترنم ۔ تیاری ۔ طوطا ۔ طبیب ۔ طالب

(ث ۔ س ۔ ص) ثابت ۔ ثواب ۔ ثریا ۔ سلطنت ۔ صحیح ۔ صابن

صادق ۔ صفائی ۔ صداقت

(ذ ۔ ز ۔ ض ۔ ظ) ذرہ ۔ ذخیرہ ۔ ذرا ۔ زر ۔ زرخیز ۔ ضمیر

ضمیر ۔ ضعیف ۔ ضمانت ۔ ظالم ۔ ظہیر ۔ ظلم

ہندی اور مراٹھی جاننے والوں کے پاس "ت اور ط" کے لیے (ت) (ث ۔ س ۔ ص)

کے لیے (س) ۔ (ذ ۔ ز ۔ ض ۔ ظ) کے لیے (ز) یہ تین حروف ہیں۔

حل : ہندی اور مراٹھی جاننے والے غیر اردو داں حضرات کو اردو پڑھاتے وقت مخرج کی صحیح

معلومات دینا ضروری ہے اور یہ بتلانا بھی ضروری ہے کہ کون سے حرف کی آواز کہاں سے نکلتی ہے

جس کی وجہ سے ان حروف کا فرق آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔

مسئلہ نمبر ۴ : اردو میں بہت سے حروف ساکن ہوتے ہیں جو لکھنے میں آتے ہیں اور پڑھے

نہیں جاتے ہیں۔ جیسے

خود ۔ خوش ۔ خویش ۔ بالکل ۔ بالخیر ۔ عبداللطیف وغیرہ ۔

حل : اردو پڑھاتے وقت ان ساکن حروف کو اچھی طرح ذہن نشین کرایا جائے اور اس

کی بار بار مشق کرائی جائے تاکہ املا کی غلطی نہ ہو۔

مسئلہ نمبر ۵ : اردو میں جملے کے خاتمے پر (۔) دیا جاتا ہے۔ (۔) دوسری زبانوں مثلاً

انگریزی میں نقطہ (.) اور ہندی میں کھڑی لکیر (।) مروج ہے۔ جس کی وجہ سے یہ غیر

اردو داں طبقہ اکثر اردو جملے کے اختتام پر بھی نقطہ دے دیتا ہے یا لکیر کھینچ دیتا ہے۔

حل : اردو کے چھوٹے چھوٹے جملے لکھ کر وقفہ دینے کی مشق کرائی جائے۔ غیر اردو داں

غیر اردو داں طبقہ کو اردو سکھانے میں مندرجہ ذیل تجاویز پر بھی عمل کیا جا سکتا ہے :

تجویز نمبر ۱ : نصاب : ایسا نصاب تیار کیا جائے جو غیر اردو داں طبقہ کی دلچسپی کا باعث ہو

اور اس کی مدت تقریباً ایک سال ہو ۔ اور اسے اعلیٰ قسم کی اردو یا اسی قسم کے امتحان سے مربوط کر دیا جائے ۔

تجویز نمبر ۲ : ذخیرۂ الفاظ بڑھانے کے لیے چھوٹی چھوٹی چارٹ تیار کی جائیں ۔ جن میں مثالیں اور کہاوتیں محاورے وغیرہ ہوں ۔ اور کتابیں مفت تقسیم کی جائیں ۔

تجویز نمبر ۳ : یہ تمام اخراجات اردو اکیڈمی برداشت کرے اور ساتھ ہی ساتھ ریاستی حکومت بھی مالی تعاون دے ۔ نیز ضلع پریشد ، میونسپل کونسلیں اور دیگر ادارے بھی اپنا حق ادا کریں ۔

تجویز نمبر ۴ : مہاراشٹر اردو اکیڈمی ہر تعلقہ کے مقام پر اپنی شاخ قائم کرے جو اس کام کی نگرانی کرے ۔

تجویز نمبر ۵ : محکمۂ تعلیم سے تعلق رکھنے والے اساتذہ کی رضاکارانہ اور جہاں تک ممکن معاوضتہً خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں ۔

تجویز نمبر ۶ : غیر اردو داں ملازمت پیشہ لوگوں کو اردو سکھانے کیلئے شبینہ مدارس چلائے ۔

تجویز نمبر ۷ : اردو تعلیم یافتہ طبقہ مشاعرے ، ادبی نشستیں اور سیمینار وغیرہ منعقد کر کے غیر اردو داں طبقہ میں اردو سے دلچسپی پیدا کر سکتا ہے ۔

تجویز نمبر ۸ : اردو داں طبقہ کو چاہیے کہ اردو زبان کو صحیح تلفظ اور صحیح مخرج کے ساتھ ادا کرے تاکہ غیر اردو داں طبقہ تک اردو زبان صحیح انداز میں پہنچ سکے ۔

■ ہر شخص دن بھر میں اوسطاً ۳۰ ہزار لفظ بولتا ہے ۔
بیداری کے وقت کا ۱/۵ حصہ ہم بولنے میں گذارتے ہیں یعنی ۲۴ گھنٹے میں تقریباً ۳ ۱/۲ گھنٹے بولتے رہتے ہیں ۔
گفتگو کی رفتار (۱۵۰) لفظ فی منٹ ہوتی ہے یعنی ۲ ۱/۲ لفظ فی سکنڈ یا (۹۰۰۰) لفظ فی گھنٹہ ۔
عورتیں مردوں کی نسبت زیادہ بولتی ہیں ۔

انیس چشتی

مراٹھی ادب شناسی (مسلسل)

لکشمن مانے کی اُپرا

اسی دوران مصنف کے خاندان والوں کو اس کی شادی اور شاردا سے میں قیام کی اطلاع لکشمن مانے خط کے ذریعے دیتا ہے۔ اپنے ماں باپ کا رویہ خود مصنف کی زبانی سنیے۔ فرقہ واریت اور تعصب کی ایک ہی مثال:

"اسی بیچ میں گاؤں سے ماں، باپ، چچا اور پھوپھا سب لوگ آپہنچے۔ خط میں پتہ لکھا ہی تھا۔ وہ آئے اس وقت سہ پہر کے چار بجے ہوں گے۔ میں باہر گیا ہوا تھا۔ وہ راستے پر ہی بیٹھے تھے۔ ایک دکان کی چھاؤں میں۔ مجھے آتا ہوا دیکھ کر وہ میرے پیچھے پیچھے دروازے پر پہنچے۔ جیسے ہی میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ ساری فوج میرے پیچھے کھڑی تھی۔ میں نے [illegible] لیا تھا ویسے ہی ماں، بابا اور چچا اور پھوپھا اندر آئے۔ جیسے میت میں آئے ہوں۔ ماں دہلیز پر کھڑی تھی۔ میں نے نہایت انکسار سے ماں کو اندر آنے کے لیے کہا۔ شنتی خاموش بیٹھی تھی۔ ان میں سے کسی کو بھی اس نے دیکھا نہ تھا۔ اور انھوں نے بھی اسے دیکھا نہ تھا۔ مرکھنی بھینس کی طرح سب اسے دیکھ رہے تھے۔ سبھی خاموش تھے کوئی کچھ نہ کہتا تھا۔

اور سب جیسے بجلی گر پڑے۔ ماں ہاتھ پیر مَسل مَسل کر بلبلا کر رونے لگی،

"ہمارا ستیاناس کر دیا رے بابا۔ تجھے جنم دینے کی بجائے پتھر جنتی تو اچھا تھا..."

اس نے سُر تال میں رونا شروع کر دیا۔ میں نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ حجت میں تماشہ ہو خاموش تھا۔

"ارے پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مرگیا۔ ہماری ناک کاٹ ڈالی۔ ہمیں انسانوں میں سے اٹھا دیا۔ تجھے خود کا پیشاب پلاؤں۔ تیرا مُردہ جلانے لے جاؤں"

ماں گندی گندی گالیاں بک رہی تھی۔ میری طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہ تھی۔ اس میں ماں نے خود چائے کا کہا تھا۔ بابا اور سیہ پیا اسے خاموش کر رہے تھے۔ لیکن اس کی زبان کی قینچی برابر چل رہی تھی۔

"تجھے چھوٹے سے بڑا کیا۔ سب سے سیدوٹی بنائی۔ بھیک مانگ کر پڑھایا اور تو نے ہمارے منہ میں پیشاب کر دیا۔"

میں اور ششی پتھر کی طرح ساکت و خاموش تھے۔ ششی نے چائے بننے کے لیے رکھ دی۔ اس کے چائے رکھتے ہی ماں بولی

"چلے چڑیل! ہمارے گھر میں سوراخ کیا۔ برادری میں سے اٹھایا اور چائے بنانے چلی ہے۔ ارے ہمیں سے کھر چائے پیٹ گئے، لیکن تیرے ہاتھ کا پینے سے رہے۔"

میں نے ششی کو چائے بنانے سے روکا۔ اس نے اسٹوو بند کر دیا۔ ماں، باپ میری تعلیم پر کئے گئے خرچ کا حساب لگا رہے تھے۔ احتساب ادا کرنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ میں اب تک خاموش تھا۔ اب غصہ ناقابلِ برداشت ہو گیا اور میں نے ماں سے کہا،

"ماں! اب کالی گلوچ سے فائدہ نہیں۔ تیرے سب پیسے واپس کر دوں گا۔"

"ہاں رے بابا! تو نے نہ دیا تو کیا میں بھوکی رہوں گی۔ تو نے کچھ نہ لیا تو کیا ننگی بیٹھوں گی۔"

جب بابا نے ماں کو ڈانٹ پلائی تو اس کی چرچر ختم ہوئی۔ بابا نے پوچھا،

"کس کی ہے یہ لڑکی؟"

میں نے کہا "خط میں لکھ دیا تھا میں نے۔"

بابا نے کہا "ایسے خط کیسے پڑھنا آتا ہے؟"

میں نے جواب دیا "مراٹھا کی لڑکی ہے یہ۔"

چھوٹتے ہی چچا نے کہا "کیا ثبوت کہ یہ مراٹھا ہے۔ مہار کی کیوں نہیں ہو گی!... کس نے دیکھا ہے! تو نے دیکھا ہے کیا۔ اور کیا برادری مر گئی تھی؟ ماں باپ زندہ تھے یا مر گئے تھے؟ ہم سے کہتا... چھوڑ جانے دے۔ تو اپنا جس طرح چاہے کر۔ کھاٹ کا گھڑا بیچ ایک مرتبہ کھل جائے تو کیا وہ دوبارہ بند ہوتا ہے؟ اور تو کس ذات کا ہے؟ اس لڑکی کو معلوم ہے؟"

میں نے گردن سے حامی بھری۔

"لے! یہ نیچ ذات کی ہو گی، یوں کہہ... اسی لیے تیرے ساتھ بھاگ آئی۔ اچھی ذات کی عورتیں بھلا اس طرح کا کام کرتی ہیں؟"

کالکھ دیے بیٹھی تھی — باپ نے کہا

"اب برادری باہر کرنے کی چٹھی کھولے گی۔ اس کے لیے کیا کریں۔۔ اپنا ہی گو دنیا اپنے منہ میں ملے گی، اس سے کیا کہوں؟ کس منہ سے پنچوں میں بیٹھوں؟ اب ساری پنچایت ہونے کی کمتیا اور باہر جھکانے ملی کر رہا کا۔ تیرے چار لڑکیاں ہیں۔ اب انہیں کیسے دوں؟ اب ان کا کیا ہو گا" کہتے ہوئے باپ بھی رونے لگا۔ سچ پوچھیے تو مجھے بھی اندر سے پھوٹ پھوٹ کر رونا آ رہا تھا۔ میری صحت خراب تھی۔ پھوپھا کو چھوڑ کر میں، ماں، باپ، چچا اور ششی سبھی رو رہے تھے لیکن سب الگ الگ وجوہات کی بنا پر۔ "میں ذات پات کا قائل نہیں تھا" یہ کہنے پر پھوپھا بولا

تو مت مان! ہم کیا کریں۔ تیرے بال بچوں کو کون لڑکی دے گا؟ تیری میت میں کون آئے گا؟ باپ کو کون اٹھائے گا؟ یہ اگر ششی سے میں نہ ہٹا کٹیا، تو سمجھ لے اگر تیرا باپ مر گیا تو کوئی اسے تو بھی نہ نکالے گا۔ ارے کیا کر دیا تو نے لڑکے۔۔۔ سارے خاندان کو بٹہ لگا دیا!

پہلی نشست ختم ہو چکی تھی۔ رات کافی بیت چکی تھی۔ ششی کو میں نے کھانا تیار کرنے کو کہا، ویسے ہی سارے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ باپ ماں کہنے لگے۔

"ہم چلے۔ تیری مہمان نوازی قبول کرتے نہیں آئے۔ ہمارے میں کہیں بھیک مانگ کر کھا لیں گے لیکن تیرے گھر میں پانی کا قطرہ تک نہ پئیں گے۔"

میں نے بہت منت سماجت کی لیکن کوئی نہ رکا۔ سارے لوگ گیٹا وارڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب تک دبا کر رکھا ہوا دکھ باہر نکلنے کی حد تک میں روتا رہا۔ ششی کے جذبات کو بہت ٹھیس پہنچی تھی۔ وہ کہنے لگی۔

"میں تو سمجھتی تھی ہم ہی اصلی خاندانی۔۔۔ لیکن یہ سب کچھ تو بہت ہی بھیانک دکھائی دیتا ہے!۔۔۔

ابھی بس نہیں۔ دوسرے دن صبح یہ لوگ پھر نازل ہوتے ہیں۔ اس بار ان کے ساتھ پورا پکاواڑہ — عورتوں اور مردوں کا ہجوم غضب ہے جو محض برادری باہر کی عورت کو دیکھنے کے لیے بارے شش کے آیا ہوا ہے۔ ہر عورت ششی کو دیکھ کر ایک نہ ایک فقرہ کستی ہے۔ بعض عورتیں بیٹھ کر بنگالی زبان میں نہایت فصاحت کے ساتھ ششی کو گالیاں دیتی ہیں۔ جنہیں ششی کی خوش قسمتی سے وہ سمجھ نہیں پائی۔ مصنف نے ان گالیوں کو اپنی کتاب میں لکھنے سے گریز کیا ہے۔ اور نمونۃً ان سے بچنا ہیں تھی ہم انہیں نقل کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

اوپر کا اقتباس شاید اس بات کو سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ ہندوستانی سماج میں چھوٹی ذاتیں بھی

ذات انفرادیت قائم رکھنے میں کتنی متشدد ہیں۔ چند دنوں بعد جب مصنف کی دو چھوٹی بہنوں کی شادیاں طے پاتی ہیں تو 'برادری باہر' کا مسئلہ سر اٹھاتا ہے۔ سکھن لال نے 'برادری' اور ماں باپ میں صلح صفائی کرانے کے لیے چند لوگ آگے بڑھتے ہیں۔ یہ کتاب کا آخری حصہ ہے اور سکھن لال نے جن مسائل میں الجھت ہوا اور برادری اور پنچایت جو سزا مقرر کرتی ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بڑے بڑے مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ سکھن لال کی دوبارہ اسی لڑکی کے ساتھ شادی رچائی جاتی ہے۔ عین شادی کے وقت پتہ چلتا ہے کہ کشتی دو مہینے کی حاملہ ہے۔ بچے کے ماں باپ تو ہیں لیکن ذات کہاں؟ اور پھر حاملہ کی شادی — بڑا ٹیڑھا مسئلہ ہے۔ مصنف کے سر میں کیڑے پڑنے لگتے ہیں۔ سارے خاندان کا مسئلہ ہے۔ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ بہنوں کی شادیاں ہیں۔ مہمان آچکے ہیں۔ کشتی کی لاتعداد قربانیاں ہیں۔ وہ نہایت عسرت کے دن گزار رہی ہے۔ پہلے کاریں گھومتی تھی اور اب نان شبینہ کے لیے محتاج ہے۔ اس نے اپنے شوہر کے لیے سب کچھ تج دیا ہے۔

عین اس خطرناک موڑ پر دتو کیکاڑی کو ایک ترکیب سوجھتی ہے وہ ایک تدبیر بتاتا ہے۔ سکھن لال کی کمر میں سپاہی کی ڈولی باندھی جاتی ہے' جو بجائے عورت کے ہے۔ پنچایت اجازت دے دیتی ہے۔ ان تمام مراحل سے گذرنے کے بعد ہونے والا بچہ اور اس کے ماں باپ ذات برادری میں شامل کر لیے جاتے ہیں۔ جس ذات برادری کا دھبہ پونچھنے کے لیے مصنف نے اتنا کچھ کیا وہ اور گہرا ہو جاتا ہے۔

اس ذات کا پنچایتی نظام بھی بڑا دلچسپ اور عجیب و غریب ہے۔ کتاب میں جا بجا پنچایت کے فیصلوں پر مبنی ایسے دلچسپ شذرات ملتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک پنچایتی منظر کیکاڑیوں کے مندر کی یاترا میں مصنف نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔ اس کا ترجمہ قارئین کی دلچسپی کے لیے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اس سے اس فرقے کی معاشرت پر بھی روشنی پڑے گی۔

" وہاں (پنچایت کی چاوڑی کے سامنے) لوگوں کی بھیڑ جمع تھی۔ عورتیں آئی ہوئی تھیں۔ مرد آئے ہوئے تھے۔ دونوں منصف بوڑھے بیٹھے تھے۔ جو اپنے پنچ رنگے صافوں کے ذریعے پہچانے جاتے تھے۔ دونوں پارٹیوں کے پانچ پچیس لوگ آئے ہوئے تھے۔ ان دو بوڑھوں میں سے جو زیادہ بوڑھا تھا اس نے کہا'

"کورٹ کا خرچ لاؤ"

رقم وہ کہتا تھا اور مدعی اور مدعا علیہ پیسے پنچوں کے سامنے رکھے جاتے تھے اور پھر جھے" یعنی ضمانت دار اپنی اپنی کیفیت بیان کرتے تھے۔ مدعی اور مدعا علیہ کچھ نہ کہتے۔ ان کی جانب سے ضمانت داری

پیش کرتا ۔ میں اور میرا الیہ اگر عورت محسوس کریں، یا انھیں کوئی بات کہنی ہو سمجھانا ہو تو ایسے ضمانت دار کو ایک طرف لے جا کر بات کریں۔ لیکن پیش کرنے کا ہی۔

جب میں وہاں پہنچا ایک شخص بول رہا تھا۔۔۔

"میں نے اپنی بیوی دھرمیا کے پاس چار برس ہوئے رہن رکھی تھی۔ اس نے پچاس پچاس روپے پانچ مرتبہ دیے۔ میں نے کہا چار برسوں میں لوٹا دوں گا۔ اب میں پیسے لوٹا رہا ہوں لیکن یہ میری بیوی لوٹانے کے لیے تیار نہیں ہے۔۔۔" بولنے والا ضمانت دار تھا لیکن وہ بیان اس طرح کر رہا تھا جیسے خود کی بپتا سنا رہا ہو۔ اس علاقے میں اسی طرح کہنے کا رواج ہے۔

دوسرا ضمانت دار کہہ رہا تھا:

"جنتا جناردن پانچ پنچ تم پرمیشور ہو۔ تم جو انصاف کرو گے اسے ہم مان لیں گے۔ چھونیا جو کہہ رہا ہے وہ سب سچ ہے۔ اسے پیسے چاہیے تھا۔ اس نے عورت رکھی۔ عورت اچھی تھی۔ میں نے رکھ لی۔ آگ پر دودھ رکھیں تو اُبال جائے گا یا نہیں کہیے؟۔۔۔۔ بزرگو! چار برس جانور "عادت" کے بغیر رہ سکے گا کیا؟ میں نے اسے صرف کھانا کھلانے کے لیے رکھا تو تھا نہیں۔ پیر میں چپل بیٹھ گئی۔ میں نے پہن لی۔ اس میں میں نے گناہ کون سا کیا؟ چار برس ہو چکے اب، اسے میرے پیٹ سے ننھا بچہ بھی ہے وہ پیسہ دے دے میں عورت واپس لوٹاتا ہوں۔ مجھے کب نامنظور ہے۔"

چھونیا کہہ رہا تھا،

"مالک پرمیشورا، میں نے محض بھروسے پر اپنی دولت اس کے پاس رکھی۔ اب کیوں رکھی تو غرض ہے کہ مجھے ضرورت تھی۔ میں غرض مند تھا میں نے عورت رکھی وہ کام کے لیے۔ سونے کے لیے نہیں اور اس نے ایک بچہ نکال دیا۔ مجھے بچہ نہیں صرف عورت چاہیے۔"

اس کی بیوی کا ضمانت دار کہہ رہا تھا:

"مہاراج میں گونگا جانور، ہری گھاس دکھائی دی۔ چرلی۔ ریت رواج کیوں بنایا گیا ہے؟ چار برس مجھے رہن رکھ کر یہ بھاڑ کھائے۔ جس کی سیج اس کا پہلو، وہ کیا مفت میں کھلائے گا؟ اس میں عورت کی ذات اور ڈھور ڈنگر کی ذات برابر۔ اس نے مجھے اس کے دروازے میں باندھا۔ یہی قصہ ہے۔ مہاراج مجھے ماں پنڈھری انصاف نصیب کرے۔ میں اب ایک لڑکا لے کر اس کے ساتھ کیوں کر جاؤں آپ سب پرمیشور ہیں۔ مجھے اور زیادہ ذلیل نہ کریں۔ میں تمہاری بیٹی کی طرح ہوں۔"

ہر شخص اپنی اپنی بات پیش کرتا۔ سب کا سن لیا گیا۔ سارا شور ختم ہو گیا۔ پنچ اٹھے۔ کمرہ [illegible]

جاکر بحث کی۔ سرگوشیاں جاری تھیں۔ سارے حل پر ٹوٹ گئے۔ اپنی اپنی بات ان دونوں بڈھوں کے سامنے رکھی۔ پنچ اپنی اپنی بات پر اصرار کرتے تھے۔ سارے پنچوں کی بھی بات سن لی گئی۔ اور سوچ بچار کے لیے نشست ختم ہوئی۔ شام میں پھر بیٹھنے کا طے پایا۔ طرفین کے گواہ اور ثبوت کے ساتھ بحث ختم ہو چکی تھی۔ ضمانت داروں نے کافی منطقی بحث کی تھی۔

یہاں مجمع کا سارا دھیان اس عورت پر تھا۔ اس کی گود میں ننھا سا بچہ تھا۔ جو بڑے اطمینان سے ماں کے سینے سے چمٹا ہوا تھا۔

شام میں فیصلہ سننے کے لیے باسکے ساتھ گیا۔ وہ دونوں بوڑھے فیصلہ سنانے والے تھے۔ ان میں جو کم بوڑھا تھا وہ اٹھا اور اس نے فیصلہ صادر کیا۔

"جانور جس کا ہے اسی کے کھونٹے سے بندھا رہنا چاہیئے۔ لیکن ـــ مسئلہ تکمیل چکا ہے۔ رفیق ہو چکا ہے۔ پانی بہنے کے قریب ہے۔ اب پونیا کو کھنی دی جائے۔ پلٹیا سود اور اصل زر دونوں پنچوں کو دے۔ یہ رواج ہے۔ جانور جس کے پیچھے جائے وہ دوسرے کی کھنی دے۔ (کھنی سے مراد شادی کا تمام خرچ ادا کیا جائے) مثلاً (ماول کھنڈ) ماموں کو دیا جائے۔ وہ بھی یہیں، اسی وقت ـــ سارا پیسہ جس کی کھونٹی سے جانور بندھا ہے، وہ دے۔ عورت کا کوئی قصور نہیں۔ وہ گونگا جانور ـــ جس طرح سے ہانکا گیا وہ چلا گیا۔ پیر کی جوتی پیر میں رکھی جائے۔ لیکن یہ بات پونیا کو بھی نہیں۔ یہ فیصلہ مذہب اور رواج کی بنیاد پر ہے۔"

فیصلہ سنایا جا چکا تھا۔ اب سو پانچ سو پنچوں کو ملنے والے تھے۔ اس کی شراب چلنے والی تھی۔ اسے تہدیکی ([illegible]) کہتے ہیں۔ جاتا کے سر پیا آور وہ لوگوں کے مزے تھے۔ انصاف ہو چکا تھا۔ ناانصافی کا سوال کسی نے اٹھایا نہیں۔ یہاں انصاف جاری تھا اور وہاں مندر میں آرتی اتاری جا رہی تھی۔

"سماج وادی یووک دل" کے مقاصد میں عورتوں اور مردوں کی مساوات بھی ایک بڑا مقصد ہے۔ سادھنا اور ستیہ شودھک کے پلیٹ فارموں سے اکثر مسلم معاشرے اور خاص طور پر اسلام پر حملے ہوتے رہتے ہیں۔ اور ہمیشہ یہ یاد کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام میں عورت بنیادی حقوق سے محروم اور سماجی طور پر مظلوم ہے۔ پردہ اور طلاق سے متعلق واقعات کو اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے کہ مسلمان مرد ایک ظالم قصائی اور اسلام اس قصائی کا محافظ لگتا ہے۔ کاش یہ عورتوں کا بھلا چاہنے والے اپنی کوششیں مسلمانوں سے زیادہ اس سماج میں تیز کر دیں جس کی ایک مثال اوپر بیان کی گئی ہے۔

قاضی جلیل احمد

البدر

نہرِ سویز کے کنارے

گذشتہ قسط میں شام کے محاذِ جنگ کا منظر پیش کیا گیا تھا اب ہم آپ کو صحرائے سینائی کے محاذ پر لیے چلتے ہیں۔

۶ر اکتوبر کی صبح بس ایسی ہی تھی جیسے عام طور پر صبحیں اس نہر کے کنارے ہوا کرتی ہیں۔ ح کی نرم نرم دھوپ صحرائے سینا کی باریک اور شفاف ریت کو منور کر رہی تھی۔ اس انعکاسِ نور نے صحرا کے اجالے میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ ہوا میں بلا کی تازگی اور خنکی تھی اور سینائی کی سیاہ ٹانیں اس باران نور میں نہا کر کسی الھڑ سیاہ فام حسینہ کے گداز بدن کی تابناکی لیے یوں کھڑی تھیں یے انہیں عرصے سے کسی کا انتظار ہو۔ انہی پہاڑیوں پر کبھی رَبِّ اَرِنی اور لن ترانی کی صدائیں نجی تھیں۔ رَبِّ اَرِنی جو تقدیرِ انسانی کا مظہر ہے۔ یہی وہ وظیفۂ حیات ہے جو ابتدائے آفرینش سے سان کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔ اسی کے زیرِ اثر انسان ہمیشہ سے ناممکن کے حصول کے لیے کوشاں رہا ہے ور ہمیشہ رہے گا۔ لن ترانی کا جواب اُسے راہِ طلب سے ہٹا سکا ہے اور نہ ہٹا سکے گا۔ بلکہ اس سے قوائے عمل ر اور مہمیز کرتا رہے گا۔ ناممکن کے حصول کی ایک اور کوشش ان ریگ زاروں اور سنگی چٹانوں پر شروع ہونے جانے والی تھی۔ سب تیار تھے، صرف کُن کا اشارہ ملنے کی دیر تھی۔

سینائی کے بنکروں میں اسرائیلی کچھ محوِ خواب تھے اور جو بیدار ہو چکے تھے ان کے اعصاب پر ابھی نیند کے اثرات باقی تھے۔ آج یہودیوں کی عید تھی۔ جو مذہبی خیالات کے حامل تھے وہ گذشتہ شام سے عبادات اور ذکر اذکار میں مصروف تھے جو ۶ر اکتوبر کی شام میں ختم ہونے والے تھے، لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو ان عبادتوں کے جھمیلے میں پڑتے ہی نہ تھے۔ غالباً وہ بس نام کے یہودی تھے

۴- ... روڈ - فارسٹ گیٹ - لندن ای/۷ (یوکے)

نہر کے جنوبی کنارے بھی بظاہر یہی حال تھا۔ لوگوں کی آمد و رفت معمول سے قدرے کم تھی۔ لیکن اگر کوئی ریت کے ان طویل اور اونچے پشتوں کے پیچھے جھانک کر دیکھتا جو نہر کے کنارے کنارے مصریوں نے اسرائیل کے کسی اچانک حملے سے بچاؤ کے لیے بنا رکھے تھے تو اسے کچھ اور ہی منظر دکھائی دیتا۔ سیکڑوں کی تعداد میں ٹینک، آرمرڈ کارز اور راکٹ لانچرز ان پشتوں کے پیچھے یوں چھپا دیے گئے تھے کہ جب تک کوئی ان پشتوں کے پیچھے نہ جھانکتا انہیں دیکھ لینا ممکن نہ تھا۔ اسلحہ کے اس ذخیرہ کو خاص طور پر شمال میں قنطرہ، وسط میں اسماعیلیہ اور جنوب میں شالوفہ کے گرد و نواح میں اکٹھا کر دیا گیا تھا۔ ان سب کی حفاظت کے لیے ملٹری پولیس کا کڑا پہرہ لگایا ہوا تھا۔ تاکہ کوئی اجنبی میلوں تک اس نواح میں داخل نہ ہو سکے۔

انہی پشتوں کے پیچھے سام ۲ اور سام ۳ میزائیلوں کے لانچنگ پیڈز، یوکلپٹس اور شاہ بلوط کے بلند چھتناروں کی طرح استادہ تھے۔ مصر کا یہی وہ ایئر ڈیفنس سسٹم تھا جس نے اسرائیلی طیاروں کے مصری فضا میں داخلہ کو بڑی جان جوکھم کا کام بنا دیا تھا اور کافی نقصانات اٹھا لینے کے بعد اسرائیلی طیاروں نے مصری علاقوں پر اپنی اڑانیں بند کر دی تھیں۔

اور کنال ایریا کی بیسیوں فوجی طیران گاہوں کے زیر زمین بنکروں کے اندر مصری فضائیہ کے طیارے مکمل طور سے لیس کھڑے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ بہار تو ان ہیلی کاپٹروں کے گرد تھی جن کے آس پاس مصری کمانڈوز طرح طرح کے آلات اور ہتھیاروں سے لیس اپنی تیاریوں کی دوبارہ جانچ پڑتال میں مصروف تھے۔ انہیں ان ہیلی کاپٹروں میں بیٹھ کر دشمن کی صفوں کے پیچھے اترنا تھا۔ اور اس کے بعد اپنے وائرلیس سیٹوں کی مدد سے اپنے ہیڈ کوارٹرز سے رابطہ قائم رکھنا تھا۔ اور ساتھ ہی دشمن کے ایمونیشن اور پٹرول کے پوشیدہ ذخیروں کا کھوج لگا کر ان کو تباہ کرنا بھی تھا۔ دشمن کی نقل و حرکت اور [illegible] کا پتہ چلانا اور اس سے اپنے ہیڈ کوارٹرز کو باخبر رکھنا تھا۔

قاہرہ میں آپریشن کمانڈ سنٹر کی برقی گھڑی ہموار رفتار سے اپنا سفر طے کر رہی تھی اور آپریشن بدر میں حملے کے لیے گھڑی کا آغاز ہو چکا تھا۔ ایک بج کر ۵۹ منٹ ۵۹ سکنڈ، ۵۸ سکنڈ، ۵۷ سکنڈ...۔ ۵، ۴، ۳، ۲، ۱، صفر اور چشم زدن میں قنطرہ، اسماعیلیہ اور شالوفہ پر مصری فیلڈ کمانڈروں کو حملہ کا مقررہ کوڈ موصول ہو گیا۔ نہر کے کنارے دو ہزار مصری توپوں کے دہانے کھل گئے۔ اور ایک ہی سکنڈ میں بارلیو لائن کے سارے قلعوں میں ہلچل مچ گئی۔ صحرائے سینا کی خاموش فضا گولوں کے فراٹوں اور دھماکوں سے گونجنے لگی۔ گولوں کے پھٹنے سے صحرا کی ریت گرد و غبار کے طوفان میں تبدیل ہونے لگی [illegible]

تک کوئی دیکھنے والا بھی صاف دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بار لیو دلیف کے قلعے بھی ہیکل کی مانند بنے ہوئے تھے اور ان کے لئے تیار کئے گئے تھے۔ اسرائیلی سپاہی دوڑ دوڑ کر ان میں پناہ لیتے تھے۔ اتنے میں مصری ہوابازوں نے بھی اڑانیں کر کے ان قلعوں پر بمباری شروع کر دی۔ اس دوہری مار سے ان قلعوں میں پناہ گزین سپاہیوں کا زہرہ آب ہونے لگا۔ وہ اپنی فوجوں کی طرف دوڑے اور ٹیلی فون پر ہیڈ کوارٹر میں مصری حملے کی اطلاع بمبر طیاروں کی ہوائی چھاؤنی کو دی۔ حملے کی اطلاع پاتے ہی اسرائیلی برق آسا تیزی سے دشمن پر پہنچے۔

ساتھ ہی مصری سپاہیوں نے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر اپنی کارروائیاں شروع کر دیں۔ دس سپاہیوں کی ٹولیاں اپنے ہاتھوں پر ربڑ کی ایک ایک کشتی اٹھائے ریت کے پشتوں کے پیچھے نکلیں اور دوڑتے ہوئے نہر کے کنارے پہنچ گئیں۔ اور پانچ منٹ کے اندر اندر سینکڑوں قطار در قطار کشتیاں پانی میں اتار دی گئیں۔ اور پہلے ہی مرحلے میں آٹھ ہزار سپاہی نہر کے پار اتر گئے۔ کشتیاں بڑی تیزی سے نہر کے دونوں کناروں کے چکر کاٹنے لگیں تاکہ اسرائیلی طیاروں کی آمد سے پہلے پہلے جتنے سپاہیوں اور سامان کو ممکن ہو سکتا تھا دوسرے کنارے پر پہنچا دیا جا سکے۔ اسرائیل کی ہوائی طاقت کا اندازہ تھا۔ اور اس کی اعلیٰ کارکردگی سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ کشتیوں کی یہ ساری نقل و حرکت ایک مبسوط پلان کے تحت ہو رہی تھی جس کی پہلے سے بار بار ریہرسل کی جا چکی تھی۔ اتنی کہ اب یہ سارا کام ایک لمحہ کے توقف کے بغیر بالکل آٹومیٹک طریقے سے انجام پا رہا تھا۔

اتنے میں ایک ٹولی نے ایک عجیب و غریب انجن کو جو دیکھنے میں کسی طرح بھی کوئی جنگی ہتھیار نہیں تھا، نہر کے کنارے نصب کرنا شروع کر دیا۔ اس انجن سے سینکڑوں کے سینکڑوں فٹ لمبے دو دو فٹ کے پائپ نکلے جن میں ایک پائپ کا سرا نہر کے پانی کے اندر چھوڑ دیا گیا۔ اور دوسرے پائپ کو سپاہی اس طرح تھامے کھڑے تھے جیسے آگ بجھانے والے فائر بریگیڈ کے سپاہی پانی کا رخ کرتے ہیں۔ پائپوں کا رخ ریت کے چالیس فٹ بلند اس پشتے کی جانب تھا جو اسرائیلیوں نے بار لیو لائن کی حفاظت کی غرض سے نہر کے شرقی کنارے پر تیار کیا تھا۔ گویا ریت کی ایک فصیل کھڑی تھی۔

دفعتاً انجن نے بڑی آواز کے ساتھ چلنا شروع کر دیا گویا بیک وقت کئی مشینیں چل رہی ہوں اور دیکھتے ہی دیکھتے پائپ سے پانی کی تیز دھار نکلی جو ریت کی دیوار پر پڑی اور ریت بہنے لگی

گل اور ریت میں بہا کر لے جانی شروع کر دی ۔ انجن ایک منٹ میں ایک ہزار گیلن کے حساب سے پانی پھینک سکتا تھا ۔ ایسے سو انجن اسی غرض سے بطور خاص آرڈر دے کر جرمنی سے منگوائے گئے اور مصری ہائی کمان کو زبردست اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ اتنے انجنوں کے یکمشت آرڈر سے راز طشت از بام نہ ہو جائے لیکن ایسا کچھ نہ ہوا ۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر اس فصیل کے آر پار ایک اتنا بڑا راستہ بن گیا جس میں سے بڑے سے بڑا ٹینک بھی آسانی سے گزر سکتا تھا اور آ ایک گھنٹے میں [illegible] ایسے راستے بن گئے ۔ یہی کام اگر بارود او ڈائنا مائٹ سے لیا جاتا تو کم از کم چھ تا آٹھ گھنٹوں کی مدت درکار تھی ۔ اور خرچ بھی اس سے سو گنا زیادہ آتا ۔ ایک مصری انجینئر کی ذہنی اپج نے مصر کو وقت اور روپیہ کے زبردست خرچ سے بچا لیا

اس وقت جب کہ مصری فوجوں کے کچھ دستے آبی توپوں کی مدد سے ریت کی ان فصیلوں میں سے راستہ نکالنے میں مصروف تھے ۔ کچھ اور دستے نہر پر پل بنانے کے کام میں لگے ہوئے تھے ۔ پلوں کی تعمیر بے حد ضروری تھی تاکہ مصری آرمر نہر کو عبور کر سکے ۔ اس کام کے لیے روس سے ایسی چھوٹی چھوٹی کشتیاں حاصل کی گئی تھیں جن کو ایک دوسرے سے جوڑ کر بہ آسانی کم وقت میں نہر پر پل بنایا جا سکتا تھا ۔ طریقہ یہ تھا کہ نہر کے کنارے ہی کنارے ان کشتیوں کو آنکڑوں اور قلابوں کی مدد سے کس کر ایک مضبوط آہنی پل کی شکل میں ڈھال لیا جاتا تھا ۔ پھر اس پل کے ایک سرے کو چھوٹے انجنوں کے ذریعہ کھینچ کر اور ڈھکیل کر نہر کے دوسرے کنارے پہنچا دیا جاتا تھا ۔ اس کے بعد پل کے دونوں کناروں کو نہر کے دونوں کناروں سے اچھی طرح فکس کر دیا جاتا تھا ۔ اس طرح آٹھ تا دس گھنٹوں میں نہر پر پل کی تعمیر مکمل ہو سکتی تھی ۔ ایسے پل کی خاص خوبی یہ تھی کہ بمباری سے اگر چند کشتیوں کو نقصان بھی پہنچ جاتا تو ان کو بآسانی تبدیل کر کے ان کی جگہ دوسری کشتیاں فٹ کی جا سکتی تھیں ۔ لیکن پل سازی کا کام جس قدر مہارت سوجھ بوجھ اور جان جوکھم کا تھا اس کی پوری کیفیت بیان کیے بغیر مصری فوج کے اس کارنامے کی قدر و قیمت واضح نہ ہو سکے گی ۔ پلوں کی تعمیر کا ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ اسرائیلی طیارے سروں پر آ دھمکے ۔ بمباری سے سیکڑوں لوگ زخمی اور [illegible] ہوئے ۔ باقی نے بھاگ کر کسی نہ کسی آڑ میں پناہ لے لی ۔ اسرائیل کا پہلا حملہ محض حالات معلوم کرنے کے لیے تھا ۔ لیکن اس کی ان کو بڑی قیمت ادا کرنی پڑی اور متعدد طیارے سام میزائیلوں کا نشانہ بنے ۔ [illegible] طیاروں کے اسکواڈرن آتے اور اپنے بم اور راکٹ برسا کر [illegible] واپس ہو [illegible] جاتے ۔ اس دوران مصری پل سازوں نے [illegible]

ان طیاروں کی آخری ٹولی جب اپنا وزن ہلکا کر کے واپس لوٹی تو ان مقامات سے جہاں پلوں
شروع کی گئی تھی دو دو اور تین تین میل کے فاصلوں پر انجینیئر کور کے کارکنوں نے نئے سرے سے پلوں
پر کا آغاز کیا اور تیزی سے کام کرنے لگے۔ دراصل اس سے پہلے جن مقامات پر پل سازی کا کام
تھا وہ محض دشمن کو دھوکہ دینے کے لیے تھا۔ وہ نہ تو اصلی پل تھے اور نہ ہی وہ لوگ جو ان
ت پر کام کر رہے تھے انجینیئر تھے۔ لیکن تمام مصنوعی انتظامات ایسے ہی کر کے رکھے گئے
سی کو ان کے نقلی ہونے کا گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد دوبارہ طیاروں کی
روع ہو گئی۔ اس بار وہ تیر کی طرح سیدھے اپنے نشانوں کی طرف بڑھے اور پوری شدت سے
اور راکٹوں کی بارش شروع کر دی۔ نیچے سے مصر کی ایئر ڈیفنس کے عملے نے ان کی خبر لینی
لی اور اس بار بھی کافی طیاروں کو نقصان پہنچا لیکن جب یہ طیارے بمباری کے بعد واپس
ہے سلے تو انھوں نے دیکھا کہ جس مقام پر انھوں نے بمباری کی تھی اس سے کچھ ہی فاصلے
، نیا پل وجود میں آ گیا ہے۔ انھوں نے ایک منٹ کا توقف کیے بغیر پھر اپنے شکموں کو
ور راکٹوں سے بھر لیا اور برق آسا تیزی سے اپنے نشانے پر جھپٹے۔ یہ اب پہلی مرتبہ ان پل
، اور طیارہ بازوں کے درمیان حقیقی مسابقت شروع ہو گئی۔ مصری انجینیروں نے جگہ جگہ
ر کر دیا۔ اور دھوئیں کی گہری چادر اوڑھ کر اپنے کام میں جٹ گئے۔ ادھر مصری میزائیلوں کی
اسرائیلی جہازوں کے لیے نہر کے قریب پہنچنے کو ناممکن بنا رہی تھی۔ لیکن اسرائیل کے ماہر اعلا
طیارچی کسی نہ کسی طرح کترا کر اپنے ٹارگٹ تک پہنچ ہی جاتے اور اپنی بمباری سے
ی کے کام کو دشوار سے ناممکن بنانے کی کوشش کرتے۔ دوپہر سے شام تک درجنوں طیارے
تنش میں تباہ ہو گئے لیکن پلوں کے کام کو روک نہ سکے۔ بم گرتے رہے۔ راکٹ برستے رہے۔
زخمی ہوتے اور مرتے رہے لیکن کام جاری رہا۔ موت دیوانہ وار چیختی چنگھاڑتی رہی لیکن ہمت
ی نے ہار ماننے سے انکار کر دیا۔ پشتوں کے بیچ راستے بن گئے۔ پل مقررہ مدت سے پہلے تیار
ر موت کو اپنا رقص بند کرنا پڑا۔ چند گھنٹوں میں درجنوں طیاروں کا نقصان ایسا نہ تھا کہ
سے غیر معینہ مدت کے لیے برداشت کر سکتا۔ شمالی کے اسرائیلی کمانڈر نے تاحکم ثانی نہر پر ہوائی
نے کا حکم جاری کر دیا۔

یوسف ناظم

شیرو کا خط جبّو کے نام!

جبّو ڈارلنگ! تمہیں ٹھیک سے بولنا بھی نہیں آتا اور پھر تمہاری آواز بھی کافی کرخت ہے لیکن پھر بھی میرا خیال ہے کہ اب تم اپنا ایک کیسیٹ تیار کروالو (اسے بھروانا بھی کہا جاتا ہے) کیسیٹ اب ضروریاتِ زندگی میں سرِفہرست ہے۔ خط و کتابت کو آدھی ملاقات مانا گیا ہے۔ کیسیٹ کا درجہ اس سے آگے ہے اور اسے یقیناً دو تہائی ملاقات کا رتبہ ملنا چاہیئے۔ اسی حساب سے ٹیلی فونی گفت و شنید کو تین چوتھائی ملاقات اور ایسی ٹیلی فونی بات چیت جس میں مخاطب اور سامع دونوں کی صورتیں ایک دوسرے کو نظر آئیں، نوے فی صد ملاقات کہی جاسکتی ہے۔ تمہاری طرف تو شاید ایسے فون نمودار ہو چکے ہیں اچھا ہوا کہ یہ فون ادھر رائج نہیں ہوئے۔ جب یہ ادھر رائج ہو جائیں گے تو ہر بار رانگ نمبر یا غلط چہرہ کہہ کر آلۂ سماعت رکھ دینا پڑے گا۔ کچھ چہرے ایسے بھی نظر آئیں گے کہ فون سے ہٹنے کو جی نہیں چاہے گا — خدا کے لیے تم کبھی کسی فون پر درشن نہ دینا۔ میرے لیے تو تمہارا کیسیٹ ہی بہت ہوگا۔ اب میں تفریح کے لیے کم ہی باہر جاتا ہوں۔ یہ کیسیٹ بزبانِ اُردو ہونا چاہیئے۔ جب تم یہاں تھے تو تمہاری اُردو غضب کی تھی۔ اور جو بھی سنتا تھا تم سے پناہ مانگتا تھا۔ اب تو تم اُردو میں اور بھی ستمگر ہو گئے ہوگے لیکن اب یہاں ایسے ہی کیسیٹ مطلوب و مرغوب ہیں۔ تمہاری چاندی ہو جائے گی بس شرط یہ ہے کہ یہ اصلی جبّو کے ہوں۔ کسی دوست کے ہاں جاکر اپنی صدا بندی کروالو کیونکہ گھر میں تو تم بولتے ہی نہیں۔ بیوی کی موجودگی میں تمہاری آواز نہیں نکل سکے گی۔

کیا تم اب بھی اُردو کے مشکل الفاظ استعمال کرتے ہو؟ اگر نہیں کرتے تو ٹیپ کرواتے وقت اپنا صحیح بلیغ اُردو ضرور بولو۔ پتہ نہیں تمہیں یاد ہے یا نہیں — کیوں نہیں یاد ہوگا ضرور ہوگا — پٹائی کون بھول سکتا ہے۔ تم نے اپنے پڑوسی سے اِستری مانگی تھی، وہی پڑوسی جو ڈرامے لکھا کرتے تھے اور تم ان پر رعب ڈالنے کے لئے اُردو کے موٹے موٹے الفاظ رٹا کرتے تھے۔ تم نے اس دن اُن سے اِستری مانگتے وقت کہا تھا۔ "کیا آپ اپنی زوجہ تھوڑی دیر کے لیے مجھے عنایت کر سکتے ہیں؟" اس وقت تمہاری خوب

پشانی ہوئی تھی اور ان کی نوجہ سے اس کام میں اپنے شوہر کا ہاتھ بٹایا تھا ۔ پٹنے کے فوراً بعد تم ہمارے گھر آئے تھے اور ہم سب نے مل کر تمہاری مرہم پٹی کی تھی ۔ پھر تمہارا وہ واقعہ جب تم اپنے ایک دوست (کیا نام تھا اس کا غالباً لطف اللہ) کی عیادت کے لیے دواخانے گئے تھے اور تم نے ڈاکٹر سے پوچھا تھا "ڈاکٹر صاحب! اب آپ ان کی طرف سے مطمئن ہوں گے اور ان کا آخری وقت آگیا ہوگا — کب لے جانا ہے انھیں؟" — وہ تو کہو دواخانہ تھا تم بچ گئے ۔ ڈاکٹر کے گھر پر اگر تم نے یہ باتیں کہی ہوتیں تو لطف اللہ کا تو نہیں تمہارا آخری وقت ضرور آجاتا ۔ جبّو! تم نے اچھا کیا جو باہر چلے گئے۔ ان دنوں تمہاری اُردو یہاں برداشت نہیں کی جاسکتی تھی لیکن اب تمہارے لیے ماحول ٹھیک ہے ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم یہاں ٹپک ہی پڑو ۔ بس وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے کیسٹ بھیجتے رہو ۔ تمہیں شعر تو یاد ہوں گے، شعر نہ سہی مصرعے بھی چلیں گے بلکہ سچ پوچھو تو سالم مصرعے بھی ضروری نہیں ہیں ۔ دو چار الفاظ کافی ہیں، بس اتنا معلوم ہونا چاہیے کہ تم نے کبھی یہ شعر پڑھا تھا — ہاں تم پوچھوگے، تمہاری بات چیت کس عنوان پر ہونی چاہیے ۔ ایسے ہی بقرعید کا موضوع ٹھیک رہے گا ۔ معلوم تو ہو کینیڈا میں تم بقرعید پر کیا کرتے ہو ۔ قربانی کرتے ہو یا کولڈ اسٹوریج سے مرغی منگا کر پکا لیتے ہو ۔ مرغی کے حصے کیسے کرتے ہوگے ۔ میں تو سمجھتا ہوں تم ایک درجن انڈوں ہی سے کام نکال لیتے ہوگے حالانکہ بھابی قربانی کی قائل ہیں ۔ یہاں تو بہت پابندی سے قربانی کرتی تھیں اور ایک مرتبہ تو جب تم بقرعید کے دن غیر حاضر ہوگئے تھے وہ تمہاری ہی قربانی پر تل گئی تھیں ۔ یعنی کمر بستہ ہوگئی تھیں ۔ اپنی بات چیت میں وہاں کے جانوروں کے احوال بتاو ۔ گوشت کے ذائقے کے بارے میں اپنی رائے پیش کرو ۔ بکریوں کے حسن و جمال کی بھی تعریف اپنی فصیح اُردو میں کرو اور کہو کہ ان کے دست و بازو کو کسی کی نظر تو نہیں لگتی ہے ۔

گوشت کے معاملے میں یہاں دو اسالیب رائج ہیں ۔ چھوٹے کا گوشت — بڑے کا گوشت ۔ اس سے مراد چھوٹا جانور اور بڑا جانور ہے ۔ تمہارے ہاں اس فرق کو کیسے ظاہر کیا جاتا ہے ۔ اس کے کیا رموز و نکات ہیں ضرور لکھنا ۔ یہاں تو دعوتوں میں کچھ لوگ پرہیزی کھانا طلب کرتے ہیں اور پرہیزی سے مراد نرم کھچڑی یا بغیر نمک مرچ کا سالن وغیرہ نہیں بلکہ مراد بکرے کا گوشت ہے ۔ جو لوگ پرہیزی کے لغوی معنی جانتے ہیں نقصان میں رہتے ہیں ۔ کون شخص ہے جو ولیمے کی دعوت میں جاکر پرہیزی کھانا کھائے اب وہ تو اسے بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ کیا چیز اس کے ہاتھ سے نکل گئی ۔ کچھ دعوتوں میں تو پرہیزی کے اتنے طلب گار پیدا ہو جاتے ہیں کہ بڑے کی دیگیں شاعروں کے مجموعہ کلام کی طرح توجہ کی محتاج ہو جاتی ہیں ۔

یہاں تمہارے ہاں کے مشہور و معروف اور مقبول عام جانور یعنی بھینس کی بڑی تعریفیں سنتی ہیں
ہے اس کے نام کی طرح اس کا گوشت بھی تو لذیذ ہوتا ہے اور دودھ بھی لذیذ۔ اس بیچارے کے
ہم نے دیکھے ہیں لیکن یہ کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑتے۔ ہماری بھینسوں کی بھاری بھرکم ضعیف کے
مقابلے یہ جانور دوسرے درجے کے شہری نظر آتے ہیں۔ اگر یہاں ایڈیٹر صاحب یا کسی دوسرے ایڈیٹر میں
دوست پیدا کرو اور جرمنی کا کچھ حصہ بقر عید کے دن ضرور بھجواؤ۔ دیکھیں تو سہی کہ تم اپنے کام و دہن
طرح کام میں لاتے ہو۔ اس کا دودھ مت بھیجنا۔ یہاں ہر قسم کا دودھ مل جاتا ہے اور کچھ دودھ
سے ہوتے ہیں کہ ان کے پینے سے بچوں کے دودھ کے دانت فوراً گر جاتے ہیں اور عقل داڑھ بہت
پہلے طلوع ہوتی ہے۔

تم نے بہت دن سے کوئی خط نہیں لکھا۔ بس پچھلے وقت عید کارڈ بھیجا تھا وہ بھی کچھ زیادہ اچھا
تھا۔ تم دن بدن کنجوس ہوتے جا رہے ہو۔ وہاں کے چھپے ہوئے عید کارڈ میں نے کچھ لوگوں کے پاس دیکھے ہیں
بے القدر اور طلسماتی کارڈ ہیں۔ دائیں طرف کھڑے رہ کر تصویر دیکھو تو معلوم ہوتا ہے لڑکی تمہیں دیکھ
رہی ہے۔ بائیں طرف کھڑے رہ کر مطالعہ کرو تو معلوم ہوتا ہے لڑکی کچھ کچھ خفا ہو گئی ہے۔ ایک تصویر میں تو لڑکی
ہولتی بھی ہے اور منہ بھی کرتی ہے۔ لوگ گھنٹوں اس عید کارڈ سے دل بہلاتے اور عید مناتے ہیں
عید ملنے آتا ہے اُسے یہ تصویر ضرور دکھاتے ہیں۔ اب عطر کم استعمال ہونے لگا ہے۔
بھابی سے عید مبارک کہو اور کہو کہ کباب میں مسالے ذرا کم ڈالیں۔ خاص طور پر لال مرچ بہت کم
ناک یوں بھی بہتی رہتی ہے دریائے ستلج کی طرح۔ (یہ دریائے ستلج کہاں ہے اب تمہیں کیا معلوم ہوگا)
سے کباب کھاؤ گے تو تمہارے ساتھ بیٹھ کر کوئی اور کھانا نہیں کھا سکے گا۔ گندے کہیں کے۔ !!

تمہارا

شیرو۔

▬▬

▬ ایک بادشاہ نے خواب دیکھا کہ اس کے سب دانت گر گئے ہیں۔ صبح کو ایک معبّر
سے تعبیر پوچھی۔ اس نے کہا آپ کی اولاد و ازواج سب آپ کے سامنے مر جائیں گے۔
بادشاہ ناخوش ہوا اور اسے قید کر دیا۔ پھر دوسرے شخص سے تعبیر پوچھی اس نے کہا
آپ کی عمر آپ کی اولاد و ازواج سے زیادہ ہوگی۔ بادشاہ خوش ہوا اور انعام دیا۔
کا مطلب دونوں کا ایک ہے مگر طرزِ ادا میں فرق ہے۔ پوچھا تو نے یہ دانش کہاں
سے سیکھی؟ وہ بولا پہلے معبّر سے۔ ▬

حسینی جاوید

ضرورت رشتہ

"ضرورت رشتہ" کے اشتہارات کی اہمیت و انفرادیت سے انکار ممکن نہیں کہ ہم بھی ا بھرپور استفادہ کر چکے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ رفتہ رفتہ ہماری ازدواجی زندگی اس موڑ پر ہے کہ ہم دوبارہ ضرورت رشتہ کے اشتہارات میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔

ضرورت رشتہ کے یہ اشتہارات بڑے ہی سود مند ثابت ہوتے ہیں۔ ہمیں ہی دیکھئے ا بھی اسی اشتہار کے توسط سے اپنا پیغام پہنچایا تھا۔ اور آج ایک عدد تعلیم یافتہ ملازم کے شوہر ہیں۔ ہماری زندگی میں تلخی محض یوں پیدا ہوتی گئی کہ ہماری اکلوتی بیوی کو اپنے اعلیٰ اور ملازم سرکار ہونے پر کچھ غیر واجبی سا فخر محسوس ہونے لگا۔ بالآخر یہ فخر، تکبر اور غرور کے یہاں تک پہنچا کہ حقارت سے دیکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا، اور ہم احساسِ کمتری کا شکار ہو گئے اور اب یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ غیر تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کر کے اس غرور و تکبر کا انتقام عقدِ ثانی سے متعلق ضرورت رشتہ کے تمام اشتہارات آج کل ہماری توجہ کا مرکز ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ بے پڑھی لکھی بیوی کو لا کر لوہے سے لوہا ٹکرا دیں۔ پڑھے لکھوں کے سامنے بے پڑھے ہی ٹک سکتے ہیں۔ عورت جاہل ہوتی ہے تو اس میں از خود بہت ساری خصوصیات پیدا ہیں۔ جن میں بہادری بھی شامل ہے۔ ایک جاہل عورت ہی تو چرب زبان ہو سکتی ہے۔ ایسے ہم نے دیکھے ہیں یہاں بے پڑھی لکھی عورت بلا شرکتِ غیرے ایک بہترین ہوم ڈپلومیٹ کی طرح راج شوہر صاحب چاہے فادر ریٹرن ہی کیوں نہ ہوں وہ ایسی بیویوں کے سامنے بھیگی بلی بنا ضرورت رشتہ کے اشتہارات پڑھ پڑھ کر ہم پر یہ حقیقت بھی ظاہر ہونے لگی ہے کہ

معرفت خواجہ شاہد۔ مقابل آر۔ٹی۔او۔آفس اسٹیشن روڈ۔ اورنگ آباد

کرنے والوں کی بھی اس زمانے میں کافی مانگ ہے ۔ عقدِ ثانی کے بعد شوہرِ ثانی کو باہر بھیجنے کے انتظامات بھی کیے جا رہے ہیں۔ اس طرح بے روزگاری کا مسئلہ خود بخود حل ہو رہا ہے ۔ ہم چونکہ ملازمِ سرکار نہیں ہیں، اس لیے ایسے اشتہارات چھاپنے کی کافی کشش رکھتے ہیں ۔ ہم چاہتے ہیں کہ ثانی رشتہ فوری ہو جائے اور ہمارے خسرِ ثانی یا برادرِ نسبتی ثانی ہمارے باہر بھیجنے کا فوری انتظام کر دیں۔

اس حقیقت سے کبھی انکار ممکن نہیں کہ ضرورتِ رشتہ کے اشتہارات میں کبھی کبھی مبالغہ آرائی سے بھی کام لیا جاتا ہے ۔ پچھلے برسوں ہمیں اس کا تلخ تجربہ بھی ہو چکا ہے ۔ وہ اشتہار یوں تھا کہ "ایک خوب صورت، نیک سیرت، اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی کے لیے رشتہ مطلوب ہے ۔ ہمارے سرپرست چونکہ پرانے خیالات کے دلدادہ ہیں، انہوں نے اشتہار میں درج "نیک سیرت" کو بطورِ خاص نوٹ کیا اور ہماری شادی کی بات آگے بڑھا گئے ۔ آج ہم اسی مبالغہ آرائی کے ناقابلِ برداشت نتائج بھگت رہے ہیں ۔ سچ پوچھیے تو اچھے بھلے گھر میں کسی نے بیر کا جھاڑ لگا لیا ہے ۔ ورنہ ہمیں کیا پڑی تھی کہ دوسری کی فکر کرتے ۔ اس طرح کی مبالغہ آرائیوں کے کئی واقعات سے ہم بہت اچھی طرح واقف ہیں ۔ اور امیدواروں کو یہ مشورہ دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ اہلیات کی تاریخ، جغرافیہ اور اخلاقیات کے بارے میں پوری طرح مطمئن ہو کر ہی کوئی قدم اٹھائیں ۔ ہماری اشتہاری اہلیۂ اول کا یہ حال ہے کہ اگر ہم دن کہیں تو وہ رات کہیں گی اور رات کہیں گے تو دن ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بات کو کاٹ کرنا ہی اس تعلیم یافتہ خاتون کا اسپیشل رہا ہوگا ۔

الغرض اب ہم ایک ایسی اشتہاری اہلیۂ ثانی کی تلاش میں ہیں جو ہماری امیدوں کو روبعمل لانے کی اہلیت رکھتی ہو ۔ امیدوں کی مختصر فہرست یوں ہے کہ وہ ہمارے حکم پر چلے کہ ہمارے دل میں حکم بجا لاتے رہنے کے دوران اس طرح کی خواہش پیدا ہو چلی ہے ۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے ہم صرف حکم بجا لاتے رہے ہیں ۔ صبح سے شام تک کوئی لمحہ ایسا نہیں کہ ہم نے محترمہ کی رائے کے خلاف کوئی کام کیا ہو فطری تقاضوں کے تحت ہماری بھی یہ خواہش ہے کہ کوئی ہماری بات سنے اور عاجزی سے اس پر عمل کرے ۔ دوسروں کی بیویوں کو دیکھتے ہیں تو رشک ہونے لگتا ہے ۔ ہمارے اس طرح رشک سے دیکھتے رہنے سے شوہرو غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ کسی بھی "فہمی" سے پہلے پہلے خوابِ نو اہلیۂ ثانی کو گھر لائیں ۔ اب تو بس یہی انتظار ہے کہ ہمارا من پسند اشتہار کب شائع ہوگا، اور کب ہم اپنی مراد پائیں گے ۔ عزیز رشتہ داروں سے گزارش ہے کہ براہ کرم وہ ہمارا یہ مضمون اس وقت تک ہماری اہلیہ اول کی نظروں سے بچائے رکھیں جب تک ہم اہلیۂ ثانی کے دامن سے وابستہ نہیں ہو جاتے، ورنہ ہمارا یہ عقدِ ثانی ایک معمولی غلطی کے تعبیر میں عقدِ فانی بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

■■

غزلیں

بیگم عائشہ یوسف الدین رباب

بگڑی کیسے بنائیں، مشکل ہے
کس کو کیوں کر منائیں، مشکل ہے

خاک ہی خاک اڑتی ہے ہر سُو
کیسے محفل سجائیں، مشکل ہے

جب اندھیروں سے دوستی ٹھہری
شمع کیسے جلائیں، مشکل ہے

ہم شکل سے ہیں رہبر و رہزن
کس کے ہمراہ جائیں، مشکل ہے

سارے چہروں پہ نا امیدی ہے
کیا ہنسیں، کیا ہنسائیں، مشکل ہے

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں
کیسے قسمت آزمائیں، مشکل ہے

موت جس کی بنے رفیقِ حیات
انہیں کیسے جگائیں، مشکل ہے

چھیڑیئے کیا شکستہ تارِ رباب
ہم غزل کیا سنائیں، مشکل ہے

۱۔۵۔۲۔۱۵۲/۱ [illegible] حیدرآباد 4 اے پی

جناب غنی رانچوی

حُسن کو زعم! کہ شیشے کا بنا ہو جیسے
عشق کا حوصلہ! مرنے پہ تُلا ہو جیسے

یوں جھکا رکھا ہے سر ہم نے سرِ راہِ وفا
کسی محبوب کا نقشِ کفِ پا ہو جیسے

مُردنی چھائی ہے یوں آج دلوں پر سب کے
کوئی شیشے کا محل ٹوٹ گیا ہو جیسے

اپنی ناکام تمنّا کو دعا دیتا ہوں
یوں پشیماں ہے کوئی جرم کیا ہو جیسے

بیٹھ کر آج غنیؔ قربتیں ان کے ہر دم
یوں ہے نازاں! کوئی اعزاز ملا ہو جیسے

نزد نور مسجد مادھوکیلا ۔ کالاپیٹ

آمیر قریشی مرحوم اکوری

غزل

حضرت امیر قریشی کا برار کے اساتذہ میں شمار ہوتا تھا۔ پہلے امیر تخلص فرماتے تھے بعد میں قریشی فرمانے لگے۔ ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے اور وہیں انتقال فرمایا۔

ابھی حقیقت ہے میری ہستی ابھی نہ کہئے کوئی فسانہ
ابھی رگوں میں لہو ہے رنگیں ابھی گل و مُل کا ہے زمانہ

یہ دورِ کیف و نشاطِ پیہم یہ میکشوں کا خراب خانہ
یہاں پلٹتی نہیں فضائیں یہاں بدلتا نہیں زمانہ

نگاہِ صیاد باغباں میں ہے خار و خس میرا آشیانہ
چمن میں رہتے ہوئے بھی اب زندگی گزرتی ہے باغیانہ

خیال وصل و فراق سے دردِ دل کی تسکیں کبھی نہ ہوگی
یہ چند روزہ ہوس نہیں ہے غمِ محبت ہے جاودانہ

کسی کی نظروں میں کیا چھپے دل کشی ہیں جلوے کئی مناظر
ہر ایک گوشہ ریاضِ رنگیں ہر ایک پہلو نگار خانہ

خزاں کے برباد آنسوؤں پر بہارِ نو مسکرا رہی ہے
کسے خبر تھی کہ موت بھی زندگی کا ہو جائے گی بہانہ

یہ تشنہ کاموں کی مے پرستی یہ چشم ساقی کی میگساری
بہک رہا ہوں میں نشہ میں یا بہک رہا ہے شراب خانہ

سروشِ ہستی سے اعتمادِ خودی کا پیغام سن رہا ہوں
شہود بالغیب میرا ایماں پرستش میری غائبانہ

لٹے ہوئے ہے ہر ایک میونش دامنِ تر میں اپنا حاصل
نگاہ ساقی لٹا رہی ہے شرابِ پر کیف کا خزانہ

نگاہِ قاتل کا وار اب تک نہ کوئی خالی گیا اے قریشی
کبھی ہدف بن گئے دل و جاں کبھی جگر بن گیا نشانہ

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاؔ

فردوسِ ارضی

یہ کشمیر، یہ لالہ زاروں کی دنیا
گلابوں کی وادی چناروں کی دنیا
نگاہوں کو دیتا ہے سامانِ عشرت
یہ صد رنگ و نکہت بہاروں کی دنیا
زمیں پر ہے خلدِ بریں کا نمونہ
یہ رنگین و دلکش نظاروں کی دنیا
یہاں کے ضیاپاش ذروں کے آگے
خجل ہوتی ہے چاند تاروں کی دنیا
دل و جاں کو مسرت کرتی ہے کیا کیا
گل اندام و گل رخ نگاروں کی دنیا
تڑپتے دلوں کو سکوں بخشتی ہے
مچلتے ہوئے آبشاروں کی دنیا
جلال و تقدس کا ہے خاص مظہر
یہ پھیلے ہوئے کوہساروں کی دنیا
لبھاتی ہے انساں کو کرتی ہے راحت
لہکتے ہوئے سبزہ زاروں کی دنیا
عطا کرتی ہے جلتی روحوں کو ٹھنڈک
یہ خنکی بھری جوئباروں کی دنیا
نہیں اس کا ثانی ہے صنعت گری میں
انوکھی ہے یہ حسن کاروں کی دنیا

~~~~~~~~~~~~~~~~

ہر اک سمت ملتے ہیں شاداب منظر
جنوں خیز منظر، ضیا تاب منظر
یہ جھرنوں کا سرگم پرندوں کی تانیں
یہ خوش رنگ چہرے یہ معصوم جانیں
ہے ارزاں یہاں جلوۂ حسنِ فطرت
ہر اک گوشہ اس کا ہے صد رشکِ جنت
نمایاں ہے ہر سو کمالِ خدائی
جلالِ خدائی، جمالِ خدائی

اسی پیارے خطے پہ نازاں ہے دھرتی
یہی ہے حقیقت میں فردوسِ ارضی

[illegible] ٹاؤن — ناگپور
~~~~~~~~~~~~~~~~

غزل — حافظ شیرازی

اے فروغِ ماہِ حُسن! از روئے رخشانِ شما
آبروئے خوبی، از چاہِ زنخدانِ شما

عزمِ دیدارِ تو دارد، جان بر لب آمدہ
باز گردد، یا بر آید؟ چیست فرمانِ شما

کے دہد دست ایں غرض یارب! کہ ہمدستاں شوند
خاطرِ مجموعِ ما، زلفِ پریشانِ شما

کس بہ دورِ نرگست، طرفے نہ بست از عافیت
بہ کہ بفروشند مستوری بہ مستانِ شما

در گذار از خاک و خوں دامن چو بر ما بگذری
کاندریں رہ، کشتہ بسیار اند قربانِ شما

بختِ خواب آلودِ ما، بیدار خواہد شد، مگر
زاں کہ زد بر دیدہ آبے روئے رخشانِ شما

اے شہنشاہِ بلند اختر! خدارا ہمتے
تا ببوسم ہمچو گردوں خاکِ ایوانِ شما

گرچہ دوریم، از بساطِ قرب، ہمت دور نیست
بندۂ شاہِ شمائیم و ثنا خوانِ شما

دل، خرابی می کند، دلدار را آگہ کنید
زینہار اے دوستاں! جانِ من و جانِ شما

عمرتاں باد و مراد اے ساقیانِ بزمِ جم
گرچہ جامِ ما نہ شد پُر مے بہ دورانِ شما

می کند حافظ دعائے بشنو و آمیں بگو
روزیِ ما باد، لعلِ شکر افشانِ شما

آزاد ترجمہ: رشید انصاری

فروغِ ماہ قائم ہے تمہارے روئے تاباں سے
ہے باقی آبروئے حسن اُس چاہِ زنخداں سے

لبوں پر دم ہے، لیکن حسرتِ دیدار باقی ہے
نکل جائے کہ ٹھیرے، انتظارِ حکمِ ساقی ہے

نہ جانے زندگی میں کب یہ دونوں ایک جا ہوں گے
ہمارا خاطرِ مجموع، تیرے گیسوئے برہم

نہیں ہے امن میں کوئی تری آنکھوں کی گردش سے
مناسب ہے کہ پردے میں رہیں یہ تیرے دیوانے

ذرا دامن بچاکر آپ میری لاش سے گذریں
کہ تم پر ہو گئے اس راستے میں سیکڑوں قرباں

رُخِ پُر نور سے آنکھوں میں میری اشک بھر آئے
کہ شاید بختِ خوابیدہ مرا بیدار ہو جائے

خدا کے واسطے ہمت عطا کیجے شہ والا
کہ ایوانِ فلک پایہ کو چوموں اپنی آنکھوں سے

بظاہر دور ہوں، لیکن نہیں ہوں یاد سے غافل
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں، کرتا ہوں ثنا خوانی

خدارا یار سے حالِ دلِ بے تاب کہہ دینا
قسم تجھ کو دلِ بے تاب کی، اے چارہ سازِ دل

دعا دیتا ہوں میں، اے بزمِ جم کے ساقیو! تم کو
تمہارے دَور میں خالی رہا ہے میرا پیمانہ

دعا کرتا ہے یہ حافظ، کہیں آمین سب مل کر
لبِ شیریں کا بوسہ میرے حق میں رزق ہو جائے

عربی کا سبق

مذکر و مونث

جنس GENDER کے اعتبار سے اسم کی دو قسمیں ہیں ۔
مذکر MASCULINE وہ اسم ہے جو بطور نر استعمال کیا جائے ۔ جیسے :
رَجُلٌ (مرد) طبیبٌ (حکیم) حاکمٌ (افسر) بیتٌ (گھر) مسجدٌ. کتابٌ. کرسیٌّ (کمرہ)
مونث FEMININE وہ اسم ہے جو بطور مادہ استعمال ہوتا ہے ۔ جیسے
مَرأۃٌ (عورت) مَرِیضَۃٌ (بیمار عورت) بنتٌ (لڑکی)

اکثر اسم مذکر کے آخر میں "ۃ" لگا دینے سے اسم مونث بن جاتا ہے ۔ اسی لیے "ۃ" کو علامت تانیث کہتے ہیں ۔ جیسے :
مَلِکٌ مَلِکَۃٌ (ملکہ) خادمٌ خادمۃٌ (خادمہ)
کاذِبٌ کاذِبَۃٌ (جھوٹی) سارِقٌ سارِقَۃٌ (چور عورت)
۲۔ جس اسم کے آخر میں علامت تانیث "ۃ" پائی جائے وہ مونث ہوتا ہے ۔ جیسے :
مَدرَسَۃٌ (مدرسہ) الصَّلٰوۃُ (نماز) غِشَاوَۃٌ (پردہ)
تجارۃٌ (تجارت) ظُلمَۃٌ (تاریکی) لَیلَۃٌ (رات) شَجَرَۃٌ (پیڑ)
سُورَۃٌ (سورت) بَعُوضَۃٌ (مچھر) جَنَّۃٌ (جنت)
۳۔ بعض اسماء کے آخر میں تاء تانیث یعنی چھوٹی ۃ ہوتی ہے لیکن وہ اسماء چونکہ مردوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں اس لیے مذکر شمار کیے جاتے ہیں ۔ جیسے طلحۃ (نام ہے)

طُرْفَہ (شاعر کا نام ہے) خَلِيفَةٌ (خلیفہ)

۴. اسم کے آخر میں الف مقصورہ یا الف ممدودہ ہونا بھی مونث کی نشانی سمجھا جاتا ہے

جیسے : حُسْنٰی (بہت اچھی) بُشْرٰی (خوشخبری دینے والی) دُنیا (دنیا)

عُقْبٰی (آخرت) اُنثٰی (مونث) صَحْرَاءُ (جنگل)

۵ تمام حروفِ تہجی مونث ہیں۔

۶. جسم کے وہ اعضاء جو "دو دو ہیں" مونث ہیں۔ مثلاً:

عَيْنٌ (آنکھ) اُذنٌ (کان) يَدٌ (ہاتھ) رِجلٌ (پیر)

۷. شہر، ملک اور قبیلہ کے نام مونث ہیں مثلاً بغداد، لاہور، دمشق، حیدرآباد،

مصرُ (مصر) قُرَيشُ (قبیلہ قریش)

۸. چند اسما ہیں جو خود مونث جنس کو بتلاتے ہیں۔ مثلاً

اُمٌّ (ماں) بِنتٌ (لڑکی) عَروسٌ (دلہن)

۹. غیر ذوی عقل اسماء کی جمع عربی میں "واحد مونث" سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً

زَهرٌ (پھول۔ واحد مذکر) اَزهَارٌ (واحد مونث)

عِنَبٌ (انگور۔ واحد مذکر) اَعنَابٌ (واحد مونث)

حَدِيقَةٌ (باغ۔ واحد مذکر) حَدَائِقُ (واحد مونث)

۱۰. بعض اسماء بلا کسی وجہ کے عام استعمال میں مونث سمجھے جاتے ہیں۔ گو ان کے آخر میں علامت تانیث نہیں ہوتی جیسے دارٌ (گھر) اَرضٌ (زمین) ریحٌ (ہوا) نفسٌ (جان) شمسٌ (آفتاب) نارٌ (آگ) جحیمٌ (جہنم) سوقٌ (بازار) کاسٌ (پیالہ) خمرٌ (شراب) سماءٌ (آسمان)

حرفِ آخر

شاداب کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ دلچسپ و معیاری مضامین نے شاداب کی شادابی اور تر و تازگی کو اور بڑھا کر خوب سے خوب تر بنا دیا ہے۔ ماہنامے نے مختصر عرصہ میں جو مقبولیت حاصل کی ہے قابلِ قدر اور قابلِ تعریف ہے جس کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔
افسانے کی اشاعت کے لیے مشکور ہوں۔

طفیل سیماب۔ کھام گاؤں۔ مہاراشٹرا

گذشتہ تین چار مہینوں سے "شاداب" نظروں سے گزر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ شاداب دن بدن ترقی کی طرف گامزن ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ "شاداب" ہر ہر گام پر ترقی کے بلند مینار پر چمکتا رہے۔ جولائی ۸۲ء کے "شاداب" میں میر لائق علی صاحب کا مضمون دکن کے پہلے صوفی شاعر و ادیب حضرت خواجہ بندہ نواز رحمۃ اللہ علیہ پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ واقعی اس قسم کے مضامین دینی معلومات کے علاوہ اولیائے کرام کے حالاتِ زندگی سے واقف کرواتے ہیں۔ اس کے بعد "شاداب" کے اگست ۸۲ء کے شمارہ میں بھی جناب لائق علی صاحب کا ایک دوسرا مضمون "داغ — شخصیت" پڑھ کر ہماری خوشی میں مزید اضافہ ہو گیا وہ یہ کہ موصوف کو نہ صرف اولیائے کرام کے حالاتِ زندگی اور تصانیف سے دلچسپی ہے بلکہ شعرائے کرام پر بھی آپ کا قلم اٹھتا ہے۔ شعرائے کرام جو قوم و وطن کے لیے ایک ورثہ کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کا تعارف بھی فرماتے ہیں۔ اس موقع پر جناب لائق صاحب سے ہماری گزارش ہے کہ اپنے معلومات آفریں مضامین سے "شاداب" کو مستفید فرماتے رہیں۔ آخر میں جلیل باری تعالیٰ سے دعا ہے کہ "شاداب" کو ترقی و کامرانی عطا فرمائے۔

سید عارف ایڈیٹر ہفتہ وار "سورج" حیدرآباد

تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ بہت شکریہ۔ ماہنامہ شاداب بے شک علمی و ادبی مجلہ ہیں

[illegible] ہے۔ نیا دور [illegible] ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور صاحب کا مقالہ "زبانوں میں زبان اردو زبان ہے" بے حد جاندار ہے۔ غزلوں میں ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خاں منشا کی غزل [illegible] شائستگی کی علامت ہے۔ غفار شاکر کی کاوشیں بھی سراہنے کے لائق ہیں۔ انتخابی حیثیت سے پرچہ بہت عمدہ ہے۔

غنی رانچوی۔ راؤرکیلا۔ اڑیسہ

■ شاداب کا آٹھواں شمارہ نظر نواز ہوا۔ سارے کے سارے مضامین اعلیٰ ادبی و تحقیقی مضامین ہیں۔ شاداب کے ادبی معیار کا پتہ دیتے ہیں۔ مضامین پڑھنے کے بعد بقول مجاز "ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے لوچ لوں"۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کا انٹرویو جس ادبی سلیقہ سے اسحٰق جلیس ندوی نے لیا، لاجواب ہے۔ نیز ڈاکٹر حسن الدین احمد صاحب کا تحقیقی مضمون "عرب اور جنوبی ہند کے تعلقات" شاداب کے قارئین کے لیے ناقابلِ فراموش ہے۔ ایڈیٹر کا سلیقہ انتخاب شاداب کے مستقبل کے لیے اور شاداب کے قارئین کے لیے خود شاداب ضامنِ معیار بنا ہوا ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ شاداب ادبی افق پر ہمیشہ درخشاں رہے۔

ساحر شفیع یادگیری۔ حیدرآباد

نیاگرا ہوٹل

بشیر باغ میں ہے جو نیاگرا ہوٹل — وہی ہے جنتِ ارضی ہیں وہیں کے چل
اک اور شاخ ہے اس کی مقام پیاڈر گھاٹ — خود آکے دیکھئے سرکار آپ اس کے ٹھاٹ
یہ اشتہار نہیں ہے یہ اک حقیقت ہے — کہ جیسے خلد ہے فردوس اور جنت ہے
لذیذ مرغ کا سالن، لذیذ بریانی — جنھوں نے کھائی ہے لذت انھوں نے جانی

■

عوام الناس کو کھانوں کی لذت کھینچ کر لائی
یہاں ہر بات میں، ہر چیز میں پاکیزگی پائی
خدارا غور سے سنیے یہی ہے نیاگرا ہوٹل
کہ گر آپ [illegible] ہے "تو پھر وہیں لے چل
سنا ہے ہم نے لوگوں کو یہی کہتے ہوئے اکثر
بلند اس کا ہے معیار اور سلیقہ مند ہیں نوکر

Regd. No. H/HD 593.

Monthly **SHADAAB** Hyd.

11-5-147, RED HILLS, HYD-500 004.

Vol I No 11 OCTOBER 1984.

مرے افکار کے گلشن میں جو جھانکے کوئی
دور تک منظرِ شاداب دکھائی دے گا

علمی، ادبی، دینی، تہذیبی اقدار کا ناشر

سہ ماہی نامہ

شاداب حیدرآباد

جلد (1) نومبر 1990ء شمارہ (12)

مجلس مشاورت

ایڈیٹر

محمد عمر الدین صابری

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	50 روپے	150 روپے	55 ڈالر	21 پونڈ	185 پاکستانی روپے
دوسالہ	90 روپے	275 روپے	65 ڈالر	36 پونڈ	225 "
تاحیات	1000 روپے	2500 روپے	450 ڈالر	300 پونڈ	2000 "

خط و کتابت کا پتہ: 11-5-147 ریڈ ہلز حیدرآباد 500004

[illegible]

حرفِ اوّل

انجمن اساتذۂ اردو جامعاتِ ہند کا دسواں سالانہ اجلاس اس سال ۳۰ ستمبر اور یکم اکتوبر کو ملاپورم گورنمنٹ کالج، ملاپورم (ملحقہ یونی ورسٹی کالی کٹ، کیرالا) میں منعقد ہوا۔ انجمن اساتذۂ اردو جامعاتِ ہند، اردو کا ایک فعال، معتبر اور اعلیٰ ادارہ ہے جس کا دائرۂ عمل اردو تعلیم، تدریس اور تحقیق کے مسائل، نیز اساتذۂ اردو کے تحفظ و تنظیم اور طریقۂ کار تک محیط ہے۔ انجمن نے اپنے دائرۂ عمل میں جس انہماک، خلوص اور تندہی سے اردو کی خدمات انجام دی ہیں وہ لائقِ فخر اور قابلِ مبارک باد ہیں۔ چونکہ انجمن کا دائرہ صرف جامعاتِ ہند کے اساتذہ تک محدود ہے اس لیے اس کے ارکان کی تعداد، ان کے وسائل، ان کے مسائل نیز انجمن کی آواز اور ترجمانی بھی ایک محدود دائرے تک ہی ہے۔

مختلف جامعات میں اب پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے ایک سے زیادہ مراکز قائم ہو جانے کی وجہ سے اب جامعات کا دائرہ بھی وسیع ہو رہا ہے۔ جب کالجوں کی سطح پر اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا جانے لگا ہے تو ایسی صورت میں پوسٹ گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ سطح کے اساتذہ میں بُعد کی جگہ قرب اور فصل کی جگہ وصل ضروری ہے۔ چنانچہ ملاپورم کالج میں انجمن کے اس اجتماع نے یہ مبارک قدم اٹھا کر اساتذۂ اردو کے دائرہ کو مزید وسعت دی ہے۔ اور اس کے حلقۂ اثر کی توسیع کی طرف جو قدم اٹھایا ہے ہم اس کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ہیں۔

اساتذۂ اردو کے مسائل اور اردو کی تعلیم کے مسائل ایک دوسرے سے وابستہ اور پیوستہ ہیں۔ تعلیم کا پہلا قدم اور مرحلہ دراصل ابتدائی تعلیم کا مسئلہ ہے۔ ادب کا ذوق اور زبان سے دلچسپی کا پہلا قدم ابتدائی تعلیم کی منزل ہے۔ اگر ابتدا ہی میں لائق اور مستعد اساتذہ کی رہنمائی حاصل ہو تو اعلیٰ تعلیم کا معیار بلند ہوگا اور ایک مضبوط اساس پر طلبا کی فکر و نظر کی جو عمارت تعمیر ہوگی وہ بہتر اور مضبوط تر ہوگی۔

اسی لیے انجمن کے فعال صدر، نامور اور فاضل پروفیسر محمد حسن صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں

اساتذہ اُردو کو خصوصیت سے اس طرف توجہ دلائی کہ وہ اپنی اپنی جامعات کے علاقے میں نہ صرف کالج کے اساتذہ بلکہ ثانوی اور ابتدائی مدارس کے اُردو اساتذہ سے بھی اپنا رابطہ رکھیں اور اپنی اپنی تنظیم اور ان کے مسائل سے واقف کرائیں۔

ہم انجمن کے اس کامیاب اجلاس پر اساتذہ کو مبارکباد دیتے ہیں اور انجمن کے اراکین کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ ساتھ ہی اس کانفرنس کے منتظم [illegible] ثاقب صاحب کا ان کی مساعی کی کامیابی پر خصوصی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ نہ صرف اُردو اساتذہ بلکہ اُردو دنیا کے لیے یہ ایک مژدہ ہے کہ کیرالہ جیسی سب سے جنوبی ریاست میں اُردو کے طلبا کی مجموعی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز ہے اور اُردو اساتذہ کی تعداد ۱۸۰۰ کے قریب ہے۔

کالی کٹ یونیورسٹی کے چار کالج ہیں اور چاروں طرف اُردو زبان و ادب کی تدریس کا انتظام بی اے کی سطح تک ہے۔ انجمن نے مطالبہ کیا ہے کہ اب کالی کٹ یونیورسٹی میں اُردو کی اعلیٰ تعلیم اور تحقیق کا انتظام کیا جائے۔ اور اس غرض کے لیے شعبہ کا قیام عمل میں لایا جائے۔ ادارہ شاداب انجمن کے اس مطالبہ کی پرزور تائید کرتا ہے اور جنوبی ہند کی اس ریاست میں اس کانفرنس کی مساعی پر پورے اعتماد اور اطمینان کا اظہار کرتا ہے۔

زیر نظر شمارے میں ادارہ پروفیسر رضی الدین احمد صاحب ڈین شعبۂ علوم مشرقیہ [illegible] یونیورسٹی، نائب صدر انجمن اساتذہ اُردو جامعات کا خطبۂ صدارت قارئین کو پیش کر رہا ہے جو موصوف نے استاذ مخدوم الہی، کڑپہ کے چالیسویں سالانہ مشاعرے میں ارشاد فرمایا ہے۔ ادارہ ان کے [illegible] منشاء الرحمٰن خان منشا کا ممنون ہے کہ موصوف نے اسے اشاعت کے لیے فراہم کیا۔

ماہ ستمبر کے شمارے سے شاداب میں ادبی معمہ شروع کیا گیا۔ اس خصوص میں قارئین سے مشورہ کی خواہش کی گئی۔ اکثر قارئین نے بتایا کہ معمہ قدرے مشکل ہے، اسے مزید آسان بنایا جائے۔ اس ادبی معمہ کا مقصد قارئین شاداب کی ذہنی ورزش ہے کہ ان کا ادبی ذوق صیقل ہو اور مطالعہ کی عادت بھی پڑے۔ تاہم اس شمارہ کے معمہ میں کافی آسان اشارے دیے گئے ہیں۔ امید کہ قارئین شاداب پسند کریں گے اور اپنے تاثرات سے مطلع کریں گے۔

لیڈی ایولین کوبولڈ زینب

سفر نامہ حرمین

مصری محمل کی ابتداء: محمل کی ابتدا تیرھویں صدی عیسوی میں [illegible] میں ہوئی تھی۔ اس وقت شجرۃ الدر کے حکم سے محمل تیار کیا گیا تھا۔ اور وہ اس میں بیٹھ کر حج کے لئے گئی تھیں۔ ملکہ موصوفہ کا نام اور خطاب شجرۃ الدر (موتیوں کا جھاڑ) تھا۔ اسی مناسبت سے اس نے محمل کی تیاری میں دل کھول کر پیسہ صرف کیا۔ اور اس محمل کو دیکھ کر وہ اس قدر خوش ہوئی کہ اپنے حج کی یادگار میں اس نے دوسرے سال روانہ کیا۔ اس کے بعد غلاف کعبہ و رقوم خیرات مبارک کے ساتھ مصر سے سال بسال محمل مکہ معظمہ بھیجے جانے لگے اور پھر رفتہ رفتہ ممالک یمن و عراق و ہندوستان وغیرہ سے بہت سے محمل مکہ معظمہ بھیجے جاتے تھے۔ چونکہ عرصے سے تمام اقتصادی کساد بازاری اور مصارف کی بیشی کی وجہ سے محمل آنا موقوف ہو گئے ہیں اور [illegible] رسم [illegible] کی رسم ختم ہو گئی ہے۔ تمام محملوں میں مصری محمل بڑا شاندار ہوا کرتا تھا اور مصر کا خرچ غلاف کعبہ اور دوسرے خلعتوں کو ملا کر ساڑھے سات لاکھ روپے سالانہ سے کم نہیں ہوتا تھا۔ اور یہ تمام خرچ سرکار برداشت کیا کرتا تھا۔ یہ محمل ایک پالکی کی سی شکل کا ہوتا تھا۔ جس پر تحریری مخمل کا زریں غلاف پڑا رہتا تھا۔ اور اس کی چوٹی اور چاروں کونوں پر سنہری کلس ہوتے تھے اور [illegible] موتی [illegible] یاں [illegible] کے ہر طرف [illegible] کی طرح لٹکتی رہتی تھیں۔

روانگی محمل کا جلوس قاہرہ میں: کئی برس ہوئے ایک دفعہ میں اتفاق سے محمل کے وقت قاہرہ میں تھی۔ اس وقت قلعہ کے سامنے کا سارا میدان تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ محمل کے اونٹ کو اس چبوترے کے پاس لائے جس پر خدیو اپنے وزراء علماء و امراء کے ساتھ کھڑے تھے۔ اس اونٹ کی مہار اول خدیو کو دی گئی انہوں نے اسے چوم کر وزیر اعظم کو دیا اور پھر دوسرے افسروں نے اسی طرح اسے بوسہ دیا اور بالآخر امیر الحج کو سپرد کر دی گئی۔ [illegible] سبز [illegible]۔ اور پھر یہ جلوس خاموشی و متانت کے ساتھ میدان سے [illegible] گیا۔ [illegible] سفر تھا [illegible] کے لئے [illegible] روز قیام کیا۔ اس مدت میں [illegible]

محمل یہاں آکر جمع ہو گئے۔ جب تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں یہ جلوس ایک اسپیشل ٹرین میں سویز گیا جہاں سے جہاز میں جدے روانہ ہوا۔ اور پھر مکے پہنچا۔ وہ اونٹ پر محمل پر سبز غلاف اُٹھا دیا جاتا تھا۔ مکے میں محمل کا استقبال بڑی دھوم دھام سے ہوتا تھا۔ غلاف کعبہ اور دوسری چیزیں علما و امرا کے سامنے کلید بردار کعبہ کے حوالے کی جاتی تھیں۔ محمل کو باب السلام اور باب النبی کے درمیان بیت اللہ میں رکھ دیا کرتے تھے۔ اور نیا غلاف عید قربان کے دن تک کعبے پر چڑھا دیا جاتا تھا۔ ان دنوں سب لوگ منیٰ میں ہوتے تھے۔ جب حج ختم ہو جاتا اور حاجی احرام اتار کر دوسرے کپڑے پہن لیا کرتے تھے تو وہ کعبہ کو اس کے نئے خوب صورت لباس میں دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ پرانا غلاف ٹکڑے ٹکڑے ہو کر حاجیوں کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا تھا۔ حرم کے ... پرانے غلاف کی دکانیں لگی رہتی تھیں۔

اب محمل اگلے زمانے کی ایک کہانی ہو گئی۔ غلاف کعبہ اور دوسرے غلاف خود مکے میں تیار ہونے لگے۔ پرانا غلاف اب بھی کاٹ کر فروخت کر دیا جاتا ہے۔ میں نے بہت سے حاجیوں کو پرانے سیاہ غلاف کعبہ کے ٹکڑے بڑے شوق سے خریدتے دیکھا ہے۔

منیٰ سے واپسی ہم عید قربان کے لیے جو تین دن تک ہوتی رہے گی، مکے سے منیٰ واپس ہو گئے۔ کل سے عید شروع ہو گی اور جب تک وہ ختم نہ ہو جائے سلطان کی اجازت کے بغیر کسی کو یہاں سے جانے نہیں دیتے۔ یہاں منیٰ میں اس وقت کوئی ایک لاکھ حاجی جھونپڑیوں میں، تنبوؤں میں، شبریوں میں اور زمین پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں اور ان کے اونٹ پہاڑیوں میں پھرتے ہوئے ہیں۔ کیا ایک چھوٹے سے حاجی کے یہاں نہ رہنے سے سلطان کے ہاں کمی ہو جائے گی۔ میں ان سے درخواست تو کرتی ہوں۔

۷ اپریل ۱۹۳۲ء۔ مصطفےٰ اطلاع دیتا ہے کہ سلطان نے مجھے روانگی کی اجازت دے دی۔ ابھی جانتی ہی تھی ہوں کہ یہ عنایت آمیز پیغام مجھے ملا۔ میں جلدی جلدی اپنا سامان درست کرتی ہوں، سیڑھی سے نیچے اترتی ہوں اور اپنی میزبان، دوسری عورتوں، ملازموں اور نوکروں سے رخصت ہوتی ہوں۔ میری موٹر دروازے پر آ گئی ہے۔ میرے میزبان اور ان کے لڑکے موٹر کے قریب کھڑے ہیں۔ میں ان کی مہربانیوں اور مہمان نوازیوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ اور مصطفےٰ اور ایک چھوکرے کے ساتھ جس کے پاس مکے کے مکان کی کنجیاں ہیں، میں موٹر میں سوار ہوتی ہوں۔ مکے کے مکان سے مجھے اپنا سامان لینا ہے۔

موٹر ڈیروں اور حاجیوں کے بیچ میں سے آہستہ آہستہ چل رہی ہے، لوگ احرام کھول کر رنگ برنگے کپڑے پہنے عید منا رہے ہیں۔ مزے دار کھانوں کی خوشبوئیں آ رہی ہیں۔ اونٹ ڈکرا رہے ہیں، بچے

کھلیاں اُڑا رہے ہیں۔ حاجی چیخ چیخ کر اپنے ساتھیوں کو پکار رہے ہیں۔ [illegible] اس وقت بہت [illegible] لوگوں کے [illegible] اسلام کی [illegible] پر [illegible] دیکھنا بہت ہی [illegible] ہے۔

جب ہم [illegible] آگے بڑھے تو [illegible] تھا۔ صرف چند [illegible] ہم سلیمان شہر میں داخل ہوئے۔ [illegible] صرف کچھ [illegible] رہ گئے ہیں۔ اس [illegible] میں [illegible] سلطان [illegible] ہیں۔ مصطفیٰ بیت المقدس [illegible] سلیمان [illegible]۔ مصطفیٰ کہتا ہے [illegible] کی آواز [illegible]۔ اس [illegible] مکان میں [illegible] رہ جاتی ہوں [illegible] ہوا۔ اس [illegible] کی باندھا باندھی کی [illegible] مصطفیٰ کا انتظار کیا۔ اب [illegible] یہاں سے چل [illegible] ہے۔

[illegible] میں [illegible] اور مصطفیٰ کے انتظار میں سلیمان [illegible] دیکھنے لگی ۔۔۔ پھر قرآن کھولا [illegible] نور [illegible]

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِىْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّىٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِىْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ

اللہ تعالیٰ نور (ہدایت) ہے آسمانوں کا اور زمین کا۔ اس کے نور (ہدایت) کی حالت ایسی ہے جیسے [illegible] اس میں ایک چراغ ہے۔ وہ چراغ ایک قندیل میں ہے۔ وہ قندیل ایسا صاف [illegible] جیسے [illegible] ستارہ ہو۔ وہ چراغ ایک مبارک درخت [illegible] زیتون [illegible] جو نہ پورب کی طرف ہو نہ پچھم کی طرف۔ جس کا تیل [illegible] آپ ہی آپ [illegible] اس کو [illegible] آگ نہ لگے۔ [illegible] روشنی پر روشنی [illegible] تمام اسباب [illegible]

[illegible] آگے پڑھتی رہی۔ یہ ناممکن ہے کہ ترجمہ میں اس کے معنی کی [illegible] اور [illegible] کے روح افزا [illegible] ادا کیا جاسکے۔

میرے نزدیک قرآن اپنی [illegible] فصاحت، تشبیہات کے تنوع اور [illegible] کے [illegible] آسمانی کتابوں سے [illegible] ہے۔

[illegible] میری یہ رائے [illegible] قرآن کے بارے میں [illegible] مشرق [illegible]

[illegible]

[illegible] سے وہ بہت بالاتر ہے ۔ وہ کوئی تاریخ یا سوانح عمری بھی نہیں ہے ۔ [illegible]

[illegible] نہیں ہے ۔ وہ [illegible]

[illegible] کتاب بھی نہیں ہے ۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] قرآن [illegible]

[illegible]

[illegible]

یہی ان خیالات میں گم [illegible] کرتے ہیں [illegible] باہر [illegible] کی [illegible] کوئی تین گھنٹے تک میں اس بڑے سنسان مکان میں قیدی کی طرح بند رہی ۔ [illegible] اور [illegible] سے مجھے [illegible] ۔ [illegible] یہ بیان کیا [illegible] کہ ساری دنیا [illegible] کس [illegible] آیا ہے ۔ [illegible] اس [illegible] کی [illegible] میرے لیے کھانے کا سامان [illegible] ۔ چونکہ میں [illegible] سے پہلے [illegible] جانا چاہتی ہوں ۔ اس لیے ہم نے جلدی جلدی کھانا کھایا ۔

[illegible] [illegible] ایک [illegible] ۔ [illegible] ہماری اسلامی دنیا [illegible] ہے ۔ [illegible] سال [illegible] والوں سے خالی رہتا ہو ۔ سعی میں جلدی کے مارے ایک ڈھلوان سیڑھی [illegible] کے لیے [illegible] مگر تکلیف کے مارے سعی کرنا دشوار تھا ۔ چار چکر میں کر چکی تھی ، سات [illegible]

[illegible]

ڈاکٹر حسن الدین احمد

مسجدِ قرطبہ

تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل

سات سو اٹھائیس سال بعد مسجدِ قرطبہ کو (جس کو مسجد الحمرا بھی کہتے ہیں) مسلمانانِ عالم کے حوالے کیا گیا ہے۔ یہ طویل مدت حساس دل رکھنے والوں کے لیے جیسی کچھ تکلیف دہ رہی ہوگی اس کی ترجمانی اقبال نے

آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

کہہ کر کی تھی۔ اس طویل عرصہ میں خود مسجدِ قرطبہ بھی یقیناً بڑے کرب سے گزری ہوگی۔ لیکن میری رہین سات صدیوں کے کرب کا احساس اتنا تکلیف دہ نہیں ہے جتنا تکلیف دہ اس غیر معمولی اہمیت کی حامل خبر کے بعد کا سکوت ہے۔ سید غلام ربانی [illegible] کی خوبصورت نظم اور چند انفرادی تاثرات کے سوا ہر طرف ایک سناٹا ہے۔ اس تغافل کی وجہ کیا ہو سکتی ہے یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ بہت غور کیا۔ محسوس ہوا کہ شاید ہم کھونے کی چیزوں سے اتنے مانوس اور غمخوار ہو گئے ہیں کہ ہم کھونے کے بجائے ملنے یا پانے کی خبر ہمارے لیے اجنبیت رکھتی ہو۔ کیونکہ یہ تو مسلمہ ہے کہ ایسی خوش خبری مسلمانانِ عالم کو صدیوں سے نہیں ملی تھی یا پھر یہ وجہ ہو کہ ان طویل صدیوں کے حائل ہونے کی وجہ سے خود اس تاریخی مسجد کی عظمت ہمارے ذہنوں سے اوجھل ہو چکی ہو۔ اگر ایسا ہے تو یہ زیادہ تکلیف دہ بات ہے۔ میرے ذہن میں فوراً [illegible] ہی بات تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اقبال نے جب مسجدِ قرطبہ میں [illegible] خواب دیکھا ہی تھا اور خود اقبال جس عالم کی سیر کر رہے تھے حجاب دیکھ رہے تھے [illegible] ہو چکی۔ اگر واقعی ایسا ہے تو ہم خاموش تماشائی کیوں بنیں؟

مدیر اعزازی ۔ نونہال ماہنامہ ۔ حیدرآباد ۔ اے پی

اس خوش خبری کے مضمرات کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم تقریباً ۱۳۰۰ سال پیچھے جائیں۔ مسلمان ۷۱۱ء میں ایک بہادر جرنیل طارق بن زیاد کی سرکردگی میں اسپین پہنچے اور اس شان سے کہ طارق نے وہاں پہنچتے ہی ان جہازوں کو جن سے آئے تھے آگ لگا دی اپنے ساتھیوں کو مخاطب ہوکر کہا کہ تمہارے پیچھے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور تمہارے آگے دشمن ملک ہے۔ اس طرح مسلمانوں نے یورپ کی سرزمین پر قدم رکھا اور اسپین کو اپنا وطن بنایا۔

اسی سال اسپین کا ایک بڑا حصہ مسلمانوں نے فتح کر لیا۔ یہ خلیفہ ولید بن عبدالملک کا دور تھا۔ یہ علاقہ ایک عرصہ تک خلافت بنی امیہ کے زیر تسلط رہا۔ جب ۷۵۰ء میں خلافت بنی امیہ کا خاتمہ ہوا تو اندلس میں طبقاتی ہیجان اور اختلافات کا پیدا ہونا فطری عمل تھا۔ بنی امیہ کے ایک فرد عبدالرحمن الداخل کچھ عرصہ شمالی افریقہ میں گزار کر ۷۵۵ء میں اسپین میں وارد ہوئے اور دوسرے ہی سال امیر قرطبہ مقرر ہوئے۔ اس طرح انہوں نے ایک عظیم سلطنت کی بنیاد ڈالی جو آئندہ چار سو اٹھارہ سال تک قائم رہی اور جس نے یورپ میں علم و ہنر کو پھیلایا اور یورپ کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر اہل یورپ کے ذہنوں کو صاف کیا اور بیداری پھیلائی۔ اس طرح نشاۃ ثانیہ کے سامان فراہم ہوئے۔

امیر عبدالرحمن نے اپنے دورِ خلافت کے آخری حصہ میں مسجد بنانے کا منصوبہ بنایا اور ۷۸۵ء میں یعنی آج سے تقریباً بارہ سو سال پہلے قرطبہ کے مشہور دریا وادی الکبیر کے کنارہ اس کی بنیاد رکھی۔

یہ خیال کہ اس مسجد سے قبل اس جگہ ایک کلیسا تھا اور مسلمانوں نے اس کلیسا کے نصف حصہ کو حاصل کر کے اس پر مسجد تعمیر کی محض افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سلسلہ میں جو تفصیلات بیان کی جاتی ہیں وہ بعینہ وہی ہیں جو حضرت خالد بن ولیدؓ کے ہاتھوں دمشق کی فتح کے بعد وہاں کے کلیسا کی جگہ مسجد تعمیر کرنے سے متعلق ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس جگہ بہت پہلے کوئی کلیسا رہا ہو۔

امیر عبدالرحمن نے ۷۸۶ء تک اس مسجد کے بڑے حصہ کی تعمیر مکمل کروا دی البتہ اس زمانہ میں کوئی مینار تعمیر نہیں ہوا تھا۔ عبدالرحمن کے بعد خلیفہ ہشام کے زمانہ میں ایک مینار تعمیر ہوا اور تکملہ کام کے متعلقہ امور کی جانب توجہ دی گئی۔ اس کے بعد خلیفہ عبدالرحمن ثانی کے زمانہ میں مسجد کی توسیع عمل میں آئی ان کے فرزند خلیفہ محمد نے مغربی باب الاعظم کی تعمیر کی۔ خلیفہ عبداللہ نے اپنے محل سے مسجد تک مسقف راستہ تعمیر کیا اور آخر میں خلیفہ عبدالرحمن ثالث نے جدید مینار تعمیر کیے۔ خلیفہ ہشام ثانی کے زمانہ میں ان کے وزیر المنصور کے زیر انتظام ۹۸۷ء میں مسجد کی وسیع پیمانہ پر توسیع عمل میں آئی۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس کی تعمیر کا سلسلہ دو سو برس تک جاری رہا۔

ان کی مزید تفصیلات تاریخی کتب میں ملتی ہیں۔ المقری اور دوسرے مورخین نے اس بارے میں وضاحت کی ہے۔

اس وقت مسجد کی یہ کیفیت ہے کہ یہ ایک مستطیل شکل کی عمارت ہے جس کا طول ۱۸۰ میٹر اور عرض ۱۳۰ میٹر ہے۔ اطراف میں ایک فصیل ہے جس سے یہ مسجد باہر سے قلعہ نظر آتی ہے۔

اس مسجد کی تعمیر میں عربوں نے کلیتاً مقامی انجینیروں اور فن کاروں سے کام لیا۔ لیکن ان کے سامنے جو مقصد اور منصوبہ رکھا اور پھر اس منصوبہ کو بروئے عمل لانے کا جو اہتمام کیا اس سے ان کی اولوالعزمی ظاہر ہوتی ہے اور ساتھ ہی جذبہ خلوص و عقیدت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ حکمران عربوں نے خانہ خدا کی شاندار پیمانہ پر تعمیر کے اعلیٰ مقصد کو زندگی کا نصب العین بنایا اور عشق الٰہی کو اپنا مطمح نظر۔ اسی کی طرف علامہ اقبال نے اپنی مشہور نظم مسجد قرطبہ میں ذکر کیا ہے۔ یہ نظم اتنی ہی خوب صورت ہے جتنی خوبصورت خود مسجد قرطبہ۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم کو اردو کی بہترین نظموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔ ع

اے حرم قرطبہ عشق سے تیرا وجود — عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت — معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

وہ "خون جگر" جس کے متعلق فرماتے ہیں۔ ع

قطرۂ خون جگر سل کو بناتا ہے دل

یہ خون جگر وقت کے شاہجہانوں نے فراہم کیا۔ اپنے بلند حوصلوں کو دوام بخشا۔

یقیناً مسجد قرطبہ کو دل سے مشابہت دی جا سکتی ہے۔ کائنات میں دل سب سے عجیب و غریب اور بیش بہا چیز ہے جو حسین ہے اور جس سے خالق کائنات کی صناعی ظاہر ہوتی ہے۔ پھر جس دل میں نور ایمان ہو یقیناً وہ بہترین شے ہوگا۔ مسجد قرطبہ کے حسن کا بیان کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں۔ ع

ہے تہ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر — قلب مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں

یہ عمارت مسلمانان عالم کے لیے باعث فخر تو ہے لیکن فن تعمیر کی باریکیوں، نزاکتوں اور عملی گہرائیوں کا جو اظہار اس عمارت کی تعمیر میں ہوا ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ آج بھی دور دور سے انجینئر اور آرکٹکٹ اپنے شاگردوں کو یہاں درس دینے کے لیے لاتے ہیں۔ اس کی تعمیر کے دوران دو صدیوں میں فن تعمیر میں جو ارتقا رہا، اس کو سمجھاتے ہیں۔ فن کار اس کے نقوش کی خوبیوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اسی لیے تو اقبال نے اس کو "کعبہ ارباب فن" کہا ہے۔ ع

کعبۂ ارباب فن سطوت دین مبیں — تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں

[illegible] مسجد نے ان کی تعمیر کرنا شروع کیا اور بعد میں یہ عظیم اور خوبصورت عمارت تعمیر ہوگئی جو ۱۲ سے کافی متاثر ہوئی۔

اس مسجد میں قرآن شریف کا وہ نسخہ محفوظ رہا ہے جس کی حضرت عثمانؓ بوقت شہادت تلاوت فرما رہے تھے۔ اور جس کے چار صفحوں پر ان کے خون کے نشانات موجود ہیں۔

اس مسجد میں خلافت اندلس کے زمانے میں صرف پانچ وقت ہی نماز نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ مسلمانوں کا ایسا مرکز تھا جہاں تمام اہم امور انجام پاتے تھے۔ فوجوں کو کوچ سے پہلے یہیں سے روانہ کیا جاتا تھا۔ اور دعا دی جاتی تھی اور واپسی پر یہیں ان کا خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ اہم تصفیے اور فیصلے ہوتے تھے۔ درس کا یہاں انتظام تھا۔ مسجد قرطبہ کی مرکزی حیثیت اس وقت تک رہی جب تک مسلمانوں کا اقتدار اندلس میں باقی رہا۔

تقریباً پانچ صدیوں کے جاہ و جلال کے بعد سرزمین اندلس میں مسلمانوں کے اقتدار کو زوال آیا۔ ۲۹ جون ۱۲۳۶ء کو فرڈیننڈ سوم قرطبہ میں فاتحانہ داخل ہوا۔ اس کے بعد اس مسجد کو گرجا میں تبدیل کیا گیا اور اس وسیع مسجد کے اندر وقتاً فوقتاً گرجا بنائے گئے۔ ۱۵۲۶ء میں ایک اور بڑا گرجا تعمیر کیا گیا۔ ۲۱ نومبر ۱۸۸۲ء کو اس مسجد و کلیسا کی مخلوط حیثیت کو تبدیل کرکے قومی میوزیم بنا دیا گیا۔ ستمبر ۱۹۷۲ء میں اسپین کے ارباب حل و عقد نے اسلامی سیکرٹریٹ کی مساعی کے زیر اثر مسجد قرطبہ کو واگزاشت کر دیا۔ عبادت گاہوں پر ناجائز قبضے یا ان کی بازیافت میں ہمیشہ جھگڑوں یا مادی قوتوں کا دخل رہا ہے۔ اس مرتبہ اس مسجد کو طویل عرصہ بعد بذریعہ گفت و شنید سے حاصل کیا گیا۔ لیکن اس مسئلہ کی کامیابی حکومت کی تبدیلی کی وجہ سے بھی ممکن ہو سکی۔ اس سے قبل کی ہسپانوی حکومتیں تنگ نظر، متعصب اور سامراجی ذہنیت کی حامل تھیں۔ موجودہ حکومت کا رویہ ان سے مختلف ہے اور یہ حکومت وسیع النظر ہے۔

پروفیسر رضی الدین احمد

مشاعرہ تصوف اور اردو

حضرت خواجہ سید شاہ امین اللہ محمد محمد الحسینی چشتی قادری سجادہ نشین آستانۂ مخدوم الٰہی، سرپرست آستانہ قبلہ مرشدی و مولائی حضرت خواجہ سید شاہ یداللہ حسینی محمد محمد الحسینی چشتی القادری معتمد صاحب سالار مشاعرہ ! اراکین و منتظمین امین ایجوکیشن ٹرسٹ کڑپہ، شعرائے کرام، ابنائے آستانہ اور معزز حاضرین۔

میں اتنا گیا گذرا اور ناشکرا نہیں ہوں کہ آپ کے اس خلوص کا جو سدا بہار ہے، آپ کی اس محبت کا جو صداقت سے سرشار ہے اور آپ کے اس بے پایاں اعتماد کا جو خیر و خوبی کا آئینہ دار ہے، اپنی ضمیر کی زبان سے شکریہ ادا نہ کروں۔ سچ تو یہ ہے اگر یہ محض مشاعرہ کی صدارت ہوتی تو شاید میں معافی چاہتا، معذرت کر دیتا کہ اس کے لیے مجھ سے کہیں زیادہ موزوں اور مستحق حضرات اس نشست میں بھی تشریف فرما ہیں۔ مگر مجھے جس کوئے یار کی کشش نے یہاں حاضر کر دیا وہ ایک مرد باصفا بندۂ خدا اور خلیفۂ خدا کے آستانے کی حاضری ہے جس نے خدمت خلق خدا سے مخدوم الٰہی کا برگزیدہ مقام اور بلند مرتبہ حاصل کیا ہے۔ سچ یہ ہے — ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد — خدا اس مخدوم حضرت سید شاہ عارف اللہ محمد محمد الحسینی چشتی القادری رح کی مزار کو اپنے نور سے بھر دے کہ جس نے مجھ جیسے کیسے کیسے ناکاملوں کے ضمیر اور ذہن کے ذرّوں کو خلوص و خیر کی روشنی اور روشنی سے پر نور کیا ہے۔

آپ سب حضرات واقف ہیں کہ اس محترم خانوادہ کا سلسلہ سنجر کے اس سورما اور پیشوا سے جا ملتا ہے جس نے اجمیر میں حق کی وہ شمع روشن کی جو ہزار اندھیروں اور صد ہزار آندھیوں میں آج تک سالکوں کو سچائی اور سلامتی کا سیدھا راستہ دکھا رہی ہے۔ یہ سیدھا اور صاف راستہ ایک اور

صرف ایک ہے جس پر چلنے والے اپنے پالن ہار کے انعام پانے والے ہیں۔ راستے ہزاروں سلامتی اور سچائی کا ہمیشہ سے ایک اور صرف ایک ہی راستہ اور ایک ہی رویہ ہے۔ ابدی سچائی کا یہی وہ چمکتا ہوا چہرہ ہے جو ازل سے باقی ہے اور ابد تک باقی رہے گا۔ شرع قانون نے اس چہرے کے جلال کی گواہی دی ہے اور یہ گواہی بھی بلاشبہ سچائی پر مبنی ہے۔ تصوف نے اس چہرے کے جمال کی شہادت دی ہے اور یہ شہادت بھی سراسر حق ہی حق ہے۔

ایک شاندار آبشار کو ایک عورت نے دیکھ کر کہا کتنا پرجلال منظر ہے اس آبشار کا۔ اس کے ساتھ کھڑے ہوئے شوہر نے کہا کتنا پرجمال منظر ہے اس حسین آبشار کا ۔۔۔ تصوف طریقت کا اپنا حسن ہے۔ شرع اور شریعت کا اپنا حسن ۔ تصوف اور طریقت کا شرع اور سے الگ نہ کوئی وجود ہے نہ وطن ہے

موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

سلطان جی (حضرت نظام الدین اولیاء) نے دونوں کے فرق کو کس خوبی سے یوں بیان کیا ہے کہ سو روپے میں سے ڈھائی روپے راہِ خدا میں خرچ کرنا شریعت ہے اور سو روپے میں سے روٹی کے لئے رکھ کر باقی سب راہِ خدا میں خرچ کرنا طریقت۔ شریعت حسنِ صورت ہے اس کا انکار کور چشم ہی کر سکتا ہے کرتا ہے۔ طریقت حسنِ سیرت ہے اس کا انکار کور ذوق ہی کر سکتا کرتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ تصوف کے ساتھ کبھی تعصب اور توہم جمع نہیں ہوتا۔ نہیں ہوئے۔ تصوف نے تقسیم کو توڑا، تفریق کو چھوڑا اور دلوں کو جوڑا ہے۔ ہندوستان جیسے بڑے اور گھنے ملک میں متحدہ قومیت کا سب سے بڑا ستون تصوف ہے۔ تمام صوفیائے کرام بلکہ آپ سب اجازت دیں تو کہوں اقرار کر دوں کہ تمام سادھوؤں اور سنتوں نے بھی اس اتحادِ قومی کی بہت سی کوششیں کی ہیں۔ کچھ ہوئیں، بہت سی کامیاب بھی ہوئیں۔ لیکن متحدہ قومیت کی اکلوتی اولاد "اردو" ان کی سب سے بڑی اور کارکشا اور کارساز کمائی ہے۔

اہلِ محفل! آج اردو پر جو بےخبری وقت آپڑا ہے جس اس کے بارے میں اس مناسبت پر ایک بات صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ اردو نہ کسی ایک مذہب کی زبان ہے نہ کسی ایک علاقے کی نہ کسی ایک ذات اور پیشے کی نہ کسی ایک طبقہ کی۔ اس کے آغاز و ارتقا میں صوفیائے کرام نے کام کیا ہے اور سادھوؤں اور سنتوں نے بھی۔ بادشاہوں اور امیروں نے بھی۔ لیکن یہ ہے جنتا عوام کی زبان ۔۔۔ ہندوستانی عوام کی حقیقت ایک زندہ حقیقت ہے اور ان کی زندگی کا ادب ہے

رانہ اور سبا ملا ہوا تہذیب ہے ۔ اُردو کا نہ اپنا مذہب ہے نہ ملک نہ پیشہ نہ برادری ۔ مگر اس کی اپنی تہذیب ضرور ہے ۔ پروفیسر محمد حسن نے اس تہذیب اور اس کے ادب و زبان کے کردار کو سیکولر قرار دیا ہے ۔ میرے محترم استاد ڈاکٹر عابد حسین مرحوم نے اسے مشترکہ تہذیب کی اساس قرار دیا ہے ۔ ہمارے ہندوستان کی بہت سی تہذیبوں میں ایک ہندوستان گیر تہذیب کہتا ہوں ۔ ہندوستانی تہذیب کی حیثیت اس مشترکہ اور سیکولر تہذیب و زبان کی طرح تصوف کا مزاج اور موقف بھی سیکولر رہا ہے ۔ خدا کی بنائی ہوئی زمین ایک ہی زمین ہے ۔ اگرچہ انسانوں نے اس زمین کے بہت ٹکڑے کر لیے ہیں ۔ اسی طرح خدا کی بنائی ہوئی انسانیت بھی ایک ہے ۔ مگر انسانوں نے خود کو گروہوں میں تقسیم کر لیا ہے ۔ تصوف ان معنوں میں سیکولر ہے کہ وہ بلا تخصیص سب انسانوں کی خدمت کرتا ہے اور خدا کی ساری مخلوق کو کنبہ خیال کرتا ہے ، ایک امت کہتا ہے ۔

ہندوستان میں صوفیائے کرام نے اپنے اس کردار سے سچائی کی جو شمع روشن کی اس نے اپنے پرائے ، دیر اور حرم ، خاص اور عام میں کوئی تفریق نہیں کی ۔ ان کی تقسیم بھی نہیں کی ۔ لیکن ان کی تکریم اور تعظیم ہر طرح سے کی ۔ اس عمل کا نتیجہ ہے کہ عمارتوں میں تاج محل ، زبانوں میں اُردو اور طریقوں میں تصوف ۔ یہ تینوں ہماری تہذیب کے مشترکہ اور مبارک مظاہر ہیں ۔ مسلمہ مظاہر ۔ لیکن کچھ اِس ہندوستان جنت نشان میں جہاں آنکھوں والوں کے ساتھ اندھے بھی بستے ہیں ۔ جہاں کان والوں کے ساتھ بہرے بھی آباد ہیں ۔ جہاں جان رکھنے والوں کے ساتھ مُردے بھی جمع ہیں ۔ وہاں کوئی اندھوں کو رنگ سے بہروں کو آہنگ سے اور مُردوں کو امنگ سے شناسا اور شاد کرے ۔

اراکین بزم مشاعرہ ! اس خانوادے کے ایک سپوت اور سید نے اپنی والدہ مرحومہ کے چہلم کے موقع پر ایک ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی کی نیو ڈالی اور اس حسن سراپا قدس کے ساتھ مشاعرے کی حسین اور مقبول عام رسم جاری کر دی ۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میری مراد حضرت سید شاہ خلیل امین اللہ محمد الحسینی چشتی القادری رحمۃ اللہ علیہ کی ذات سے ہے ۔ اور آج حسن اتفاق ہے کہ اس مبارک عہد رفتہ مرحوم کی چالیسویں گرہ منائی جا رہی ہے ۔ آپ خود بھی تصوف کے رنگ میں رنگے ہوئے اور ادب کے ڈھنگ میں ڈھلے ہوئے تھے ۔ امین آپ کا تخلص تھا ۔

مشاعرے جو ہماری تہذیب کی تربیت کا ذریعہ اور ہمارے ذوق ادب اور معرفت کی [illegible] تہذیب کی روح اصطلاحات [illegible] سمجھانے بھی ہیں ۔ [illegible]
[illegible] نہیں کرتا بلکہ شاعروں [illegible]

اصطلاحوں کے ساتھ نئے مضامین اور نئے تجربوں کو کیسے اپنا لیا اور کیسے ان کو متوازن اور مستقیم کر کے رکھتا ہے
بلکہ اصطلاحات ہی وہ کشتی ہے جو ہدایت کا کام کر سکتا ہے۔

دنیا کی زبانوں میں مشاعرے خاص اردو تہذیب کے عوامی جشن مانے گئے ہیں جہاں ذوق ادب سے واقفیت اور مسلک محبت کی تشہیر کی صورت عام ہوتی ہے۔ اس کے سلیقے میں رنگ اور رس کی صحبت میں ایک انوکھا ڈھنگ مشاعروں میں معروف رہا اور دکھایا نہیں جاتا بلکہ سکھا اور سکھایا جاتا ہے۔ یہاں ایسے مشاعروں میں فقیروں کے ساتھ بادشاہوں کی شرکت، امیروں کے ساتھ عوام کا اختلاط اور امیروں کے ساتھ مفلسوں کی بیٹھک بھی ہماری تہذیبی روایت ہے۔ مشاعرے صرف شعراء کی امتحان گاہیں ہی نہیں بلکہ سامعین کرام کے ظرف کی آزمائش گاہیں بھی ہیں۔ مجھے اس مشاعرے کے شعرائے کرام کے ذوق پر بھی اعتماد ہے اور گرد و پیش کے سامعین کرام کے ظرف پر بھی اعتماد ہے ان ہے جس پر آپ کو مبارک باد نہ دوں تو اپنے ذوق کی تسکین اور دل کو ترسا دوں گا۔

آخر میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہا جاتا کہ عرس مبارک تو پہلے ہی کیا کم تھا کہ اس میں محفل مشاعرہ کے نغموں کے اضافے نے اس نور کو نور علیٰ نور کر دیا اور خلوص و خیر کی آشتی کو دوآتشہ بنا دیا۔ آپ سب کو یہ سن کر مزید مسرت ہوگی کہ اس خانوادے کے نونہالوں نے اپنے بزرگ حضرت خواجہ سید شاہ عطاء اللہ محمد محمد الحسینی چشتی القادری کی سرپرستی میں (خدایا ان کے بزرگ خیر و خلوص بڑھے جب تک برکہ شمس اور گنگا جمنی میں پانی رہے) ایک ایجوکیشنل ٹرسٹ قائم کیا ہے جو ایک فنی اور صنعتی ادارے کی داغ بیل ڈال رہا ہے۔

اب تک سارے علوم یا تو عقلی تھے یا نقلی لیکن اب صنعت اور ٹکنیکل علوم کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ ان علوم کو عملی کرنا پڑتا ہے۔ بقول ایک بڑے معلم کے "پیشے کی تربیت انسانی تربیت کا حصہ ہے"۔ خدا کرے اس صندل کی خوشبو کے محور اور مشاعرے کی مہک کا یہ سلسلہ یہ صنعتی تعلیم کا ادارہ و خدمت خلق کا مبارک مرکز ثابت ہو۔

آخر میں آستانۂ مخدوم الٰہی کے حسن انتظام کا ممنون احسان اور مشاعرے کی کمیٹی کا شکر گزار ہوں۔ ساتھ ہی اپنی کوتاہیوں پہ اگر محفل مشاعرہ کے موقع پر سامعین کرام ہو گئی ہوں گی تو آپ سب سے شرمسار ہوں۔ آپ جس مشاعرے کے لئے بے چینی سے منتظر ہیں اب آپ کے اور مشاعرے کے درمیان حائل رہنا بے لطفی ہے اور مناسب نہیں۔ سامعین کی طرف سے شعرائے کرام کو خوش آمدید کہتا ہوں اور شعرائے کرام کی جانب سے آپ سب کا استقبال کرتا ہوں۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

اسلامی قانون کا ارتقاء

ایک چیز شروع ہی میں مجھے عرض کرنی ہے، وہ یہ کہ دنیا کی تاریخ میں، قانون تاریخ میں
ملے ہی پرانے بڑے قانون، مذہبی اساس پر مبنی رہے ہیں۔ مثال کے طور پر مجوسیوں (یعنی
رشیوں) کا قانون، ان کی مذہبی کتاب "آویستا" (AVESTA) پر مبنی ہے جس کو وہ خدا کی
ف سے نازل شدہ، وحی شدہ، الہام شدہ کتاب سمجھتے رہے ہیں۔ اگرچہ اس کتاب کا بڑا حصہ
ب غائب ہو گیا۔ ہندوؤں کا قانون دھرم شاستر، وہ بھی ایسی ہی کتابوں پر مبنی ہے جنہیں وہ
دا کی طرف سے الہام شدہ سمجھتے رہے ہیں۔ یہودیوں کا قانون بائبل و توریت پر مبنی ہے جسے
بھی وہ خدا کی نازل کردہ کتاب سمجھتے ہیں۔ یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ زمانہ حال کے مغربی قوانین چاہے
وہ یورپ میں ہوں یا امریکہ میں، وہ دینی اساس پر مبنی نہیں ہیں۔ بلکہ انسان کی اپنی ذاتی رائے
اور استنباط پر۔ لیکن خود ان مغربی قوانین کے متعلق بھی اگر ہم ان کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم
ائے گا کہ ابتداً وہ بھی دینی قانون تھے۔ مغربی موجودہ قوانین رومی قانون پر مبنی ہیں۔ اور وہ رومی
نون ابتداً دینی قانون ہی تھا۔ اور اسے وہ فاس (FAS) کا نام دیتے تھے۔ اور یہ قانون
، (PRIEST) پجاریوں، پادریوں یا مذہبی افسروں کے ہاتھ میں تھا: بادشاہ کا کام صرف اس
نون کو نافذ کرنا ہوتا تھا۔ اور جو مذہبی لوگ تھے وہ قانون کو بناتے یا بدلتے، یا اس کی تاویل
تے اور بیان کرتے تھے۔ کچھ عرصے بعد بادشاہ کو اپنے ان دینی افسروں سے کسی نہ کسی وجہ سے
کچھ اختلاف پیدا ہوا، اور اس نے چاہا کہ کم از کم دینی معاملات کا اختیار اسے حاصل ہو جائے۔
سی نہ کسی طرح وہ اس میں کامیاب ہوا۔ شروع میں چند چیزیں بادشاہ کو دے دی گئیں اور باقی
چیزیں حسب سابق دینی لوگوں کے ذمہ رہیں۔ جو چیزیں بادشاہ کو دی گئیں اس کا نام وکس رکھا گیا
جس (JUS)۔ (J.U.S) آپ اس کو "جس" کہہ سکتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ بادشاہ کے
اختیار بڑھتے گئے اور دینی افسروں کے اقتدار گھٹتے گئے (بالآخر وہ صرف عبادتوں تک محدود ہو گئے

رہ گئے) (کلاز) "جس" بادشاہ کا بنایا ہوا قانون ہے جو یورپ کو وارثت میں ملا اور نتیجہ یہ ہے کہ اسی روایت (TRADITION) کو جاری رکھتے ہوئے اب جدید یورپ میں دین سے قانون کو الگ کر دیا گیا ہے۔ اور یہ تصور ہو گیا ہے کہ دین الگ چیز ہے اور دنیا الگ چیز۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا اگر تاریخ پر نظر ڈالیں تو نظر آئے گا کہ خود یورپ میں بھی یورپی قانون کی اساس رومی قانون تھی۔ اور رومی قانون میں بھی یہی نظر آتا ہے کہ وہ اصل میں دینی قانون تھا۔ ان حالات میں مسلمانوں کا قانون بھی دینی قانون رہا ہے۔ یعنی قرآن اور حدیث پر مبنی ہے اور یہ دونوں الہامی چیزیں ہیں، قرآن خدا کی وحی کردہ کتاب ہے۔ اور پیغمبر کے متعلق خود قرآن کا بیان ہے کہ "وہ اپنی طرف سے کوئی چیز بیان نہیں کرتا بلکہ یہ خدا کی الہام کردہ اور وحی کردہ چیزیں ہیں جنہیں وہ بیان کرتا ہے"[1]۔ لیکن جیسا کہ ہم میں سے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مجید اور حدیث صرف قانونی چیزیں ہی نہیں ہیں یعنی معنی میں کہ وہ مجموعہ قانون ہو اور اس میں اور چیزیں داخل ان میں تو انسانی زندگی کی ساری چیزوں کا ذکر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب مسلمانوں کو قانون کی ضرورت پیش آئی مثلاً قاضی (حاکم عدالت) کو۔ اسے اور چیزوں سے چاہے اپنی نجی حیثیت سے دلچسپی رہی ہو، لیکن مقدمات کے فیصلے کرنے کے لیے اسے صرف قانون کی ضرورت تھی اور یہ قانون سے قرآن اور حدیث کے بعض اجزاء سے ملتا تھا، اسی طرح مفتیوں کو جن سے لوگ مسئلے مسائل پوچھتے تھے۔ فلاں چیز میں کیا احکام ہیں؟ فلاں صورت میں کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے؟ تو ان کو بھی ضرورت تھی صرف قانونی آیتوں کی، صرف قانون سے متعلق حدیثوں کی۔ اور یہ نہیں کہ پورے قرآن مجید اور پورے مجموعۂ احادیث کی انہیں ضرورت پیش آتی رہی ہو۔ میرے پیش نظر اس وقت مختصراً یہ بیان کرنا ہے کہ قرآن و حدیث کے اس عام مجموعے سے کس طرح مسلمانوں نے قانون کو الگ کیا اور اسے ایک مستقل علم بنایا۔

اس سلسلے میں، ہم میں سے ہر شخص واقف ہے کہ ہمارے اصول فقہ کے مولف، بیان کرتے ہیں کہ اسلامی قانون چار چیزوں پر مبنی ہے۔ نمبر ۱ قرآن، نمبر ۲ حدیث، نمبر ۳ اجماع، اور نمبر ۴ قیاس۔ لیکن اگر ہم ان ہی مولفوں کی کتابوں کو مفصل پڑھیں اور فقہ کی کتابوں پر غور سے نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ان چار چیزوں کے علاوہ اور چیزیں بھی ہیں جن سے وہ استفادہ کرتے رہے ہیں۔ اگرچہ

---

[1] وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ

اصولِ فقہ کی کتابوں میں ماخذ ہائے قانون کے باب میں ان کا کوئی ذکر نہ ہو۔ چنانچہ اولاً میں ان کی طرف آپ کی توجہ مبذول کروں گا۔

ہم میں سے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مجید ایک دن میں نازل نہیں ہوا بلکہ (۲۳) سال کے عرصہ میں رفتہ رفتہ، جستہ جستہ، نازل ہوتا رہا۔ اس کا قانونی نتیجہ یہ ہوا کہ فرض کیجیے کہ پہلے دن جب غارِ حرا میں سورۃ اقراء کی ابتدائی پانچ آیتیں نازل ہوئیں اور کوئی قانونی احکام اس میں نہیں تھے۔ تو مسلمانوں کو اجازت تھی کہ اپنے پرانے عمل درآمد کو جاری رکھیں یعنی مکہ معظمہ میں جو قانون رائج تھا عمل درآمد کی بنا پر یا کسی اور وجہ سے، تو وہ مسلمانوں کے لیے بھی ایک قابلِ عمل اور جائز قانون تھا۔ پھر رفتہ رفتہ نئی آیتیں نازل ہوتی رہیں جن سے کچھ پرانی عادات کو منسوخ کیا گیا اور کچھ نئے احکام دیے گئے، تو اس طرح قرآن مجید کے ذریعے سے اسلامی قانون تو بنتا رہا لیکن مکہ معظمہ کی ساری غیر منسوخ شدہ عادتوں اور رسم و رواج کو گویا برقرار رکھا گیا۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی قانون کا اولین ماخذ شہر مکہ کا رسم و رواج کہا جاسکتا ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ اس میں تبدیلی اور تنسیخ کی گنجائش تھی قرآن مجید کی وجہ سے جو خدا کا کلام تھا۔ اور خدا کو اختیار تھا کہ انسانی طرزِ عمل میں اپنی مرضی کے مطابق تبدیلی کا حکم دے۔ میں اس تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ ۲۳ سال کے عرصہ میں قرآن مجید کے ذریعہ سے مکہ معظمہ، پھر مدینہ منورہ اور پھر پورے جزیرہ نمائے عرب کے رسم و رواج میں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق رہا ہے، کس طرح اور کن مسائل کی حد تک رفتہ رفتہ تبدیلی ہوئی۔ میں صرف کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اسلامی قانون کا پہلا ماخذ ملک کا عمل درآمد تھا۔ اس شرط کے ساتھ کہ وہ خدائی احکام کے خلاف نہ ہو اور جب تک خدائی احکام آئے نہیں اور قرآن خاموش رہا اور حدیث خاموش رہی تو سارے رسم و رواج مسلمانوں کے لیے ایک جائز قانون تھے۔

اس کے بعد ایک اور چیز ہمیں نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن کی آیتوں کے ذریعے سے، اور حدیث کے ذریعے سے پرانے رسم و رواج میں بعض وقت تو قطعی تنسیخ کی ایک صورت پیدا ہوگئی۔ فلاں کام کرو، اور فلاں کام نہ کرو۔ مثلاً بتوں کی پرستش نہ کرو۔ لڑکیوں کو زندہ دفن نہ کرو۔ اسی طرح بعض وقت پرانے قانون میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ بلکہ اس میں کچھ اضافہ کیا گیا۔ بعض وقت پرانے قانون میں کچھ ترمیم کی گئی۔ بڑا حصہ باقی رہا کچھ حصہ اس کا بدلا گیا۔ یہ ہے ایک پہلو اسلامی قانون کے ماخذ کا۔ ایک دوسری چیز، جس کا ذکر عام طور پر اصولِ فقہ کی کتابوں میں نہیں ہوتا لیکن بعض پرانے مؤلفین نے اس کا ذکر کیا ہے اور جو مبنی ہے قرآن مجید ہی کے بعض اشاروں پر، وہ یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ

علیہ وسلم سے پہلے کے جتنے انبیاء گزرے ہیں ان کی شریعتوں کو برقرار رکھا جائے۔ چنانچہ قرآن مجید کی ایک مشہور آیت ہے۔

اولٰئک الذین ھدی اللہ فبھداھم اقتدہ

جس میں ایک پیغمبروں کے نام لئے گئے۔ عیسیٰ، موسیٰ، ابراہیم علیہم السلام وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد یہ آیت ہے کہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے راستہ دکھایا۔ پس اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ان ہی کے طرز عمل پر عمل کر۔ فبھداھم اقتدہ۔ اس کے معنی یہ نکلے کہ چونکہ پہلے انبیاء کا قانون خدائی قانون تھا اور وہی قانون ساز خدا ہمارا بھی قانون ساز ہے۔ اس لئے اس کے احکام منسوخ نہیں ہوتے بجز اس کے کہ وہ خود منسوخ کر دے۔ دوسرے الفاظ میں پرانے انبیاء کے سارے قانون خاص کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے آخری نبی کا قانون مسلمانوں کے لیے واجب العمل ہے دو شرطوں کے ساتھ۔ پہلی شرط یہ ہے کہ اس کی صحیح اطلاع ہمیں ملے۔ یہ نہیں کہ یہ کہہ دیا جائے کہ یہ حضرت عیسیٰ کا قانون ہے یا یہ کہ حضرت موسیٰ کا قانون ہے۔ یہ کافی نہیں ہوگا جب تک کہ ایسا ثبوت نہ ملے کہ واقعی یہ پہلے کے نبی کا قانون ہے۔ پہلے نبی پر نازل شدہ شریعت کا جو حصہ ہے یہ پہلی شرط ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اس پرانے نبی کی شریعت کو نئے نبی نے منسوخ نہ قرار دیا ہو۔ یعنی قرآن کے ذریعہ سے یا حدیث کے ذریعے سے پرانے قانون میں کوئی تبدیلی کوئی ترمیم کوئی تنسیخ عمل میں نہ آئی ہو۔ ان دو شرطوں کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پرانے نبیوں کے سارے قانون حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسیٰ تک سارے ایک لاکھ ۲۴ ہزار نبیوں کے قانون مسلمانوں کے لیے واجب العمل ہیں بجز اس کے کہ اسے نبی اسلام نے بدلا یا منسوخ قرار دیا ہو۔

ظاہر ہے کہ پرانے انبیاء کے متعلق ہماری معلومات بہت ہی محدود ہیں۔ اور ان کے معلوم کرنے کا کوئی امکان بھی اب باقی نہیں رہا۔ مثال کے طور پر حضرت آدم کو حدیث میں صراحت سے نبی قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی روایت ملتی ہے کہ ان پر دس صحیفے نازل ہوئے ہیں۔ لیکن آج ہم آدم کے بچوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کتابیں کس زبان میں تھیں چہ جائیکہ اس کے مندرجات سے ہمیں واقفیت ہو۔ اس کے بعد جو انبیاء ہیں ان میں سے چند کے متعلق کبھی کبھی کچھ اشارہ ملتا ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم، ان کے متعلق قرآن مجید میں دو جگہ آدھی آدھی سطر کا اشارہ ملتا ہے۔ مثلاً "صحف ابراہیم وموسیٰ"۔ یعنی حضرت ابراہیم کے صحیفے یا حضرت موسیٰ کی کتاب۔ مگر ہمیں کوئی تفصیل معلوم نہیں۔ کچھ تفصیلیں ملتی ہیں تو توراۃ اور انجیل کے متعلق مگر ان کے متعلق بڑی دشواری یہ

ہو گئی ہے کہ قرآن مجید نے ان کو معروف بھی قرار دیا ہے۔ ایک فرضیہ یہی حکم ہے [illegible]
[illegible]

اور دوسری فرضیہ بھی بیان ہے۔ یعنی یوفون بالکلم [illegible] الٹی کتابیں [illegible]
الگ تعریف کرتے ہیں۔ بہرحال مجھے اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں صرف [illegible] ہے کہ
قبائل کے اندر ون میں ایک عرف عرب کا عمل در آمد عرب کا رسم و رواج ہے [illegible]
[illegible] تھا پرانے انبیاء کی شریعت۔

ان کے علاوہ ایک اور چیز پیش آتی ہے اس کا ابھی ہمارے مؤلف غیر متعلق مقام پر [illegible] تمام
[illegible] کرتے ہیں وہاں ذکر نہیں کرتے۔ لیکن دوسرے مقاموں پر اس کا ذکر کرتے ہیں یعنی [illegible]
معاہدات۔ "اگر اسلامی حکومت کسی اور حکومت سے معاہدے کے ذریعے سے کچھ شرطیں قبول
کر لے تو ہم پابند ہوں گے" تو یہ شرطیں جب تک کہ وہ معاہدہ برقرار رہے، مسلمانوں کے لیے [illegible]
قانون ہوتا ہے۔ میں اشارتاً ذکر کرتا ہوں۔

صلح حدیبیہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے والوں یعنی مکے کے مشرکین سے ایک معاہدہ
کیا جس میں یہ شرطیں تھیں کہ "کوئی مسلمان مکے میں پناہ گزین ہو تو مکے والے اس کو واپس نہیں
کریں گے برخلاف اگر کوئی مکے والا رسول اللہؐ کے پاس حاضر ہو کر پناہ گزینی اختیار کرے اور مکے
والے [illegible] اس کو واپس کر دیا جائے گا"۔ اس سے آپ لوگ واقف ہیں۔

[illegible] کا قانونی پہلو یہ ہے کہ معاہدے کے ذریعے سے ہم کچھ شرطیں اپنے پر عائد کر سکتے ہیں اور وہ
[illegible] اتنا ہی واجب التعمیل ہے جتنا کہ مثلاً قرآن و حدیث کی آیتیں بجز اس فرق کے کہ [illegible] و
[illegible] دائمی ہوں گے اور معاہدے کے ذریعے سے قبول کی ہوئی شرطیں عارضی ہوں گی جب تک
[illegible] برقرار ہے اس پر عمل کریں گے۔

ان کے علاوہ اور بھی کچھ چیزیں ہم کو ملتی ہیں۔ جس کی قدیم ترین مثال ہے حضرت عمرؓ [illegible] نے
[illegible] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اب تک مجھے کوئی مثال نہیں ملی [illegible] رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بھی وہ ممکن ہے کہ پائی جاتی ہو اور اسے میں پرانی فقہ کی کتاب سے [illegible]
٧. [illegible] یعنی (RECIPROCITY) ایک مثال سے اس کا مفہوم آپ کے ذہن نشین [illegible]
[illegible] سے متعلق امام ابو یوسفؒ کی کتاب الخراج میں ہے کہ ایک مرتبہ [illegible]
[illegible] کو [illegible] لکھا اور کہا کہ بیرونی ممالک کے تاجر ہمارے علاقے میں تجارت [illegible]

آتے ہیں؟ ان سے کس مقدار میں چنگی وصول کی جائے؟

حضرت عمرؓ کا جواب دلچسپ ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان تاجروں کے ملک میں اگر مسلمان تاجر جائے تو کس مقدار میں وہ چنگی لیتے ہیں۔ اسی مقدار میں تم ان سے لو۔ یعنی مماثلت (RECIPROCITY) اور اسی تصور کو ترقی دیتے ہوئے امام محمد شیبانی یعنی امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد امام محمد نے بیان کیا ہے کہ اگر غیر ملک میں مثلاً مسلمان عورت تاجر سے کوئی چنگی نہیں لی جاتی ہو تو ہم بھی اجنبیوں کی عورت تاجر سے کوئی چنگی نہیں لیں گے۔ اگر اجنبی ممالک میں مسلمان غلام تاجر سے کوئی چنگی نہیں لی جاتی ہو تو ہم بھی ان کے غلاموں سے چنگی نہیں لیں گے۔ وہ یوں کریں یا یوں کریں تو ہم بھی اسی طرح کریں گے۔ تو گویا مماثلت (RECIPROCITY) بھی اسلامی قانون کا ایک ماخذ بن سکتا ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ قرآن و حدیث کے خلاف نہ ہو۔ نمونے کے طور پر ایک ناممکن چیز کی مثال آپ کو دیتا ہوں۔ فرض کیجئے کہ چنگی میں غیر ملک کے لوگ شراب وصول کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہمارا چنگی کا افسر غیر ملکی تاجروں کے مال پر چنگی میں شراب نہیں مانگے گا۔ غرض اسی طرح کی استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ (RECIPROCITY) جس کے لیے مماثلت کا لفظ امام سرخسی نے استعمال کیا ہے یہ بھی اسلامی قوانین کے ماخذوں میں سے ایک ماخذ ہے۔

ایک چیز کا مجھے اور ذکر کرنا ہے اور وہ یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں ہم کو اسلامی قانون کے تین ماخذ معین طور سے ملتے ہیں۔ یعنی قرآن نمبر ۱، حدیث نمبر ۲ اور قیاس نمبر ۳ لیکن اجماع رسول کریم کی زندگی کی چیز نہیں بلکہ وہ بعد کی چیز ہے۔ ان کی تھوڑی سی اہمیت ہے، اس معنی میں کہ قرآن خدا کا کلام ہے اور خدا کے احکام پر مشتمل ہے اس کی ہم تعمیل کریں گے۔ اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ اسی طرح جو شخص رسول اللہ کو خدا کا رسول مانتا ہے اس کے لیے سنت پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ عام طور پر عوام الناس میں ایک عجیب و غریب خیال پھیلا ہوا ہے کہ قرآن مجید میں ہر چیز موجود ہے۔ اور ایک آیت کا عام طور پر ذکر کیا جاتا ہے اس میں رطب و یابس ساری چیزیں ہیں۔ "ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین" اور اس پر اپنی رائے کو مبنی کرتے ہوئے بعض لوگ اصرار کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں ہر چیز ہے اور اسے عالم لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا استنبول یونیورسٹی میں ایک شاگرد نے مجھ سے ایک سوال کیا، کیا قرآن مجید میں ہر چیز موجود ہے؟ تو میں نے اس طالب علم کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال ایسا نہیں ہے، اس پر وہ حیرت سے دیکھنے لگا، میں نے کہا غالباً آپ حضرت معاذ بن جبلؓ کی مشہور حدیث سے واقف ہوں گے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ انصاری کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا اور رخصت کے وقت
جب بات چیت ہوئی اس میں حضرت معاذؓ سے پوچھا کہ تم کس طرح احکام دیا کرو گے؟ حضرت
معاذؓ نے کہا کہ کتاب اللہ یعنی اللہ کی کتاب قرآن مجید کو میں من وعن نافذ کروں گا۔
اس پر رسول اللہؐ نے تردید نہیں کی، اسے قبول کیا لیکن اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ
پوچھا "فَاِنْ لَمْ تَجِدْ؟" اگر تم اس میں نہ پاؤ۔؟ تو حضرت معاذؓ نے کہا اس
صورت میں فَبِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ (رسول کی سنت، رسول اللہ کے عملدرآمد
اور احکام پر میں عمل کروں گا) اس کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا
لیکن اس پر اکتفا نہیں فرمایا اور کہا کہ "فَاِنْ لَمْ تَجِدْ؟ (اگر حدیث میں بھی تمہیں
نہ ملے تو تم کیا کرو گے؟) تو حضرت معاذؓ نے کہا جیسا کہ آپ سب لوگ واقف ہیں
"میں اپنی مرضی کے مطابق کوشش کروں گا اور اجتہاد کروں گا اور کوئی کوتاہی
نہیں کروں گا" میں آپ کی توجہ اس پہلو پر مبذول کراتا ہوں جس طرح میں نے
اپنے ترک شاگرد کی توجہ مبذول کرائی۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
فرماتے ہیں اگر تم قرآن مجید میں کوئی چیز نہ پاؤ تو کیا کرو گے یعنی قرآن مجید میں
ساری چیزیں نہیں ہیں اور اس کا اعتراف خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر تم نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟

حدیث کو ہم قرآن کی شرح کہتے ہیں۔ اس میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں
جو قرآن میں نہیں ہیں، لیکن اس کو بھی رسول اللہ نے آخری حرف قرار نہیں دیا اور کہا کہ
اگر اس میں بھی نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟ حضرت معاذؓ کا جواب "اِجْتَهِدُ بِرَاْيِیْ"
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر پسند آیا کہ آپؐ نے آسمان کی طرف
ہاتھ اٹھائے اور کہا "اے خدا! تو نے اپنے رسول کے رسول کو جو ہدایت دی ہے
میں اس سے بہت خوش ہوں" یعنی اس تجویز سے کہ قرآن وحدیث کے سکوت کے وقت
اجتہاد کیا جائے۔ اسے رسول اللہؐ نے پسند بھی فرمایا اور دعا بھی دی۔
اور میری رائے میں یہ وہ چیز تھی جو اسلامی قانون کو گویا ناقابل عمل ہونے سے بچاتی ہے
اس کے ذریعہ وہ ساری چیزیں جو قرآن وحدیث میں نہ تھیں مگر جن کی ضرورت پیش آسکتی
تھی اور پیش آتی رہیں ان کے متعلق مسلمانوں نے اس اجازت کی بنا پر قانون معلوم

سمجھنے کی کوشش کی ، معلوم کیا ، ترقی دی ۔ یہ ہے راز اسلامی قانون کی ترقی کا ، ورنہ اسلامی قانون ایک ناقابل عمل اور جامد چیز بن جاتا ، کیونکہ خود رسول اللہ فرماتے ہیں تم قرآن میں نہ پاؤ تو کیا کرو گے ؟ غرض اسلامی قانون کے بنیادی عناصر جن پر اسلامی قانون مبنی ہے وہ عہد نبوی میں قرآن مجید ، سنت یا حدیث نبوی اور اجتہاد ہے ۔

اجتہاد کے متعلق مجھے کچھ کلمات عرض کرنے ہیں ۔ سب سے پہلی چیز تو یہی ہے جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یعنی قرآن و حدیث کے سکوت کی صورت میں اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے کسی دوسری صورت میں نہیں ۔ دوسرے الفاظ میں اگر قرآن مجید یا حدیث شریف میں صراحت ہے کہ فلاں کام نہ کرو ، تو آج اجتہاد کے ذریعے سے ہم اس کے خلاف نہیں جا سکتے ۔ گویا اجتہاد کی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے استفادہ ہم صرف اسی وقت کر سکتے ہیں جب وہ قرآن و حدیث کے صریح احکام کے خلاف نہ ہو اور قرآن و حدیث کے سکوت کی صورت میں اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

سکوت کے دو معنی ہو سکتے ہیں ۔ یا تو یہ کہ بالکل اس کا ذکر نہیں ہے ۔ مثال کے طور پر میں مذاقاً کہتا ہوں کہ لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کا قرآن مجید میں کوئی ذکر نہیں ہے کہ آیا اس کی اجازت ہے یا نہیں ، تو قیاس یا اجتہاد سے ہم جائز قرار دے سکتے ہیں ۔ لیکن اگر قرآن مجید میں کسی چیز کا ذکر آیا ہے البتہ تفصیل نہیں ہے ، یا چند پہلوؤں کا ذکر ہے بعض نئے پہلو پیدا ہو گئے ہیں تو ایسی صورت میں بھی اجتہاد کیا جا سکتا ہے اور اس سے استفادہ کر کے ہم نئے پہلو کا قانون اور نئی تفصیلیں معلوم کریں گے ۔

(باقی)

مراٹھی ادب شناسی [illegible]

لکشمن مانے کی "اُپرا"

پسماندہ طبقوں میں عورتوں کی مظلومیت کے کئی واقعات لکشمن مانے نے اپنی کتاب میں بیان کئے ہیں۔ جب اس کی چھوٹی بہن کسی کی شادی ہو جاتی ہے تو ماں باپ اطمینان کا سانس لیتے ہیں کہ چلو کھانے والا ایک منہ کم ہوا۔ اس کے برعکس لڑکی جہاں بیاہ کر جاتی ہے وہاں اس بات پر خوش ہوا جاتا ہے کہ چلو کام کرنے والے دو ہاتھ بڑھے۔ اس میں یقیناً غربت کو بھی دخل ہے اپنے بچپن کا ایک واقعہ نقل کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے:

"صبح باکو نظر ہی نہ آیا۔ ماں بھی نہ تھی۔ صرف پاری ڈیرے پر تھی۔ اور باقی ہم سب بچے۔ چائے نہ تھی۔ پانی نہ تھا۔۔۔ روٹی نہ تھی، ٹکڑا نہ تھا۔۔۔ میں سارے سامان کی رکھوالی کرتا بیٹھا تھا۔ دن اوپر چڑھ آیا۔ پاری نے گدھے چھوڑ دیے۔ ڈیرے پر نگاہ رکھتے ہوئے میں گدھے سنبھال رہا تھا:

عورتیں سروں پر ٹوکریاں رکھے کھیتوں کی جانب رواں دواں تھیں۔ جانور چھوٹ چکے تھے۔ مرد بھی جلدی جلدی گاؤں سے جنگل کی جانب جا رہے تھے۔ گاؤں میں صرف بوڑھے اور بچے باقی بچ رہے تھے۔ ہمارے ڈیرے کے اطراف کتے منڈلا رہے تھے۔ دھوپ کا چبھنا محسوس ہونے لگا۔ پیٹ میں کچھ نہ تھا۔ ماں باپ کا پتہ نہ تھا۔ ماں دوسرے گاؤں بیچنے گئی ہوئی تھی۔ بابا [illegible] اور بابا لکڑیاں جمع کرنے۔ چولہے میں پانی اُبلتا ہوا۔ ہم پانی سے پیٹ بھر رہے تھے۔

سُمی، لالی، پلشی، کسنیا ڈیرے کے قریب کھیل رہے تھے۔ انھیں بھوک لگی تھی۔ سُمی میرے پاس آئی، بولی، "بھیا بہت بھوک لگی ہے نا۔"

پسلیاں چیر وے دیتا۔ ملنے وہ ملنے میں ہرن بھر گیا۔ دیگچی سالن سے بھری۔ کتوں کی فوج پیچھے لگی ہوئی تھی۔ انہیں پتھر مارتا، اٹھی کھاتا میں ڈیرے پر پہنچا۔ بچے بھوک سے بے کل ہو چکے تھے گاؤں سے الگ کر لایا ہوا ہم سب نے کھایا۔ بچا ہوا ڈھانک کر رکھ دیا۔

دن آدھا بیت چکا تھا۔ ماں باپ آئے۔ میں نے تمسی کو گدھوں کے پیچھے جانے کے لیے کہا پھٹی ہوئی تھیلی ہاتھ میں لی اور ٹھاٹ سے اسکول کی طرف روانہ ہوا۔

عورتوں کی مظلومیت کی کئی ایک داستانیں مصنف نے نقل کی ہیں۔ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی ہر کاروبار میں برابر کی شریک رہتی ہیں۔ بعض حالات میں وہ مردوں سے زیادہ کام کرتی ہیں۔ سختیاں جھیلتی ہیں اور اپنے بال بچوں کے لیے ہر ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتی ہیں۔ عورتیں مردوں کیلئے نرم چارہ ہیں۔ ان پر کئی پابندیاں عاید ہیں۔ عورتیں روٹی روزی کمانے کے لیے کہیں جائیں لیکن شام ہونے سے پہلے گھر لوٹ آئیں ورنہ انہیں دھکے دے کر شوہر گھر سے باہر نکال دیتا ہے اور ایسے گھر کو برادری باہر کر دیا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس صورت میں عورت کا کردار مشکوک ہو جاتا ہے۔ شام تک گھر پہنچنے کے لیے وہ ہیبت زدہ رہتی ہیں اور جس دوڑ دھوپ کا مظاہرہ کرتی ہیں، وہ ان کی مظلومیت کی عکسی تصویر ہے۔

عورتوں کی اس سماجی پوزیشن کا تذکرہ کر کے مصنف نے اپنی کتاب کے بعض حصوں کو حزنیہ ناول بنا دیا ہے۔ عورتیں پڑھنے والوں کی ہمدردی کی مستحق قرار پاتی ہیں۔ چاہے وہ ناچنے والی ہی کیوں نہ ہوں۔ لکشمن مانے نے عورتوں کی اس حالتِ زار سے اپنی کتاب کے لیے الم پرستی کا کام لیا ہے۔ مندر کی ایک جاترا میں ایک بوڑھے کلاونت (جس کی بیٹی ناچ کر اپنا اور اپنے بوڑھے باپ کا پیٹ بھرتی تھی) کا الم ملاحظہ فرمائیے:

" با وہاں سے کلوانتی کے اڈے کی طرف گیا۔ کوٹ ڈالے ہوئے ایک بوڑھا گنگناتا بیٹھا تھا ڈونباری ذات کا۔ چھوٹی لڑکی کو سامنے کھڑا کیے کچھ بول رہا تھا۔ بانے چلم نکالی۔ اس میں تمباکو بھری بوڑھے نے دیا سلائی روشن کی اور دونوں دھواں اگلنے لگے۔

بانے خیریت پوچھی۔ سب ٹھیک ہی ہے بولا — " باپو، شاردی مر گئی رے "۔ اتنا کہا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہنے لگیں۔ اس کے لیے کچھ کہنا دوبھر ہو گیا۔ بانے پوچھا " ارے شنکر دادا! کیا ہوا، وہ تو بولے گا یا روتا ہی رہے گا؟ کیسے ہوا آخر شاردی کو"؟ بوڑھے نے آنکھیں پونچھیں، اور بولا " باپو لڑکی کیسی بانکی تھی۔ ہونٹ نیچے پڑتے تو دودھ ٹپک آتا تھا

بڑھاپے میں یہ دیکھنا نصیب ہوا، ورنہ آج جاترا کمائی جاسکتی تھی۔"

باخاموش بیٹھا دھواں نکالتا سُن رہا تھا۔ بوڑھا کہہ رہا تھا "اس جگہ ڈیرا تھا۔ دن بھر دن میں ناچتی پھری۔ بہت ناچی۔ رسّی پر اچھل کودی، چوٹی سے پتھر اٹھایا۔ رات کے وقت میں گھر آیا۔ شاردی نے روٹی پکائی۔ چھوٹی لڑکی کو سُلایا۔ میں نے چلم پی۔ اور کب آنکھ لگی پتہ بھی نہ رات گئے اچانک آنکھ کھلی، دیکھا تو شاردی غائب۔ بابو میں رات بھر ڈھونڈتا پھرا..... سارے گاؤں میں چیختا چلاتا پھرا۔ لیکن شاردی ملی نہیں۔ صبح کے وقت تالاب کے کنارے ریت پر۔ صرف سانس چل رہی تھی....."

بوڑھا کہے جا رہا تھا۔ با متعجب ہو کر سُن رہا تھا۔ آنکھیں پونچھ رہا تھا۔ جاترا اپنے پورے شباب پر تھی۔ رتھ کو لوگ کھینچ رہے تھے۔ ہلدی، ناریل لٹائے جا رہے تھے۔ "جانگ بھلن ([illegible]) نعرے گونج رہے تھے۔ اور بوڑھا کہے جا رہا تھا:

"... بابو، پورا بدن خون میں لت پت تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں پر بولی کچھ نہیں۔ کچھ دکھایا ہوا ہوگا بھلا اسے بابو؟ دو دن وہ زندہ رہی۔ پانی کا گھونٹ تک حلق سے نہ اترا بابو — اس نے کیوں کر برداشت کیا ہوگا..." بوڑھا پھر رونے لگا۔

بوڑھے کی گریہ و زاری میں جہاں بیٹی کی موت کا غم شامل ہے وہیں اس کے لیے اپنے مستقبل کا غم بھی شریک ہے۔ وہ با سے کہتا ہے کہ اب میرا کیا ہوگا؟ اس چھوٹی لڑکی کو اب میں کیسے سنبھال پاؤں گا۔ شاردی دراصل اپنے باپ کے بڑھاپے کا سہارا تھی۔ وہ ناچتی تھی اور گھر کا خرچ چلتا تھا۔ اب وہ مرگئی تو گھر کے افراد کا مستقبل تاریک دکھائی دے رہا ہے۔ اوپر کے بیان کئی اور باتیں بھی قابلِ غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاردی کی موت کیسے واقع ہوئی۔ اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔ یہ ایک معمہ ہے جو دراصل غریبوں کے عدمِ تحفظ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اوپر کا قصہ کوئی فرضی داستان نہیں یا کسی ناول سے لیا گیا کوئی اقتباس نہیں۔ یہ آپ بیتی ہے جس میں مصنف نے صرف حقائق پیش کیے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ بوڑھا گاؤں میں چیختا چلاتا پھر رہا ہے۔ اس کی کوئی داد شنوائی نہیں۔ یہی معاملہ اگر کسی اونچی ذات کی ہندو لڑکی کے ساتھ پیش آتا آسمان سر پر کھڑا کر لیا جاتا اور مصنف کو اس ہنگامے کو مزید ایک واقعے کی شکل میں نقل کرنا پڑتا۔ اس کے برعکس اس قسم کی کوئی آپ بیتی اگر کسی اور ملک میں چھپتی اور جہاں کا مصنف اگر کسی ناگہانی موت کا تذکرہ کرتا تو اب تک اس ملک کا مرکزی ادارۂ تفتیش حرکت میں آ جاتا۔ لیکن غریبوں کی

ہمارے یہاں کسی موت کی تفتیش تو درکنار پسماندہ طبقات اور اقلیتوں کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اگر شاردی کو بروقت طبی امداد پہنچائی جاتی تو وہ بچ بھی سکتی تھی لیکن یہ غریبوں کے بس کی بات کہاں؟

پسماندہ طبقات کی عورتیں بے پناہ کام کرتی ہیں۔ گھر کے اخراجات کی وہ بھی برابر کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ اپنے بچوں کا اور بعض حالات میں اپنے شوہر کا پیٹ پالنے کے لیے انہیں کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ بکشن سامنے رکھتا ہے:

"گھر میں دانہ نہیں۔ ٹوکریوں اور کرنڈوں کے لیے گاہک نہیں۔ ماں چھوٹی چھوٹی ٹوکریاں بنتی انہیں بیچنے کے لیے ساتن کال، بساڈلی، سورن واڑی، چرک واڑی اور دودھ باڑے تک جاتی۔ دھوپ سے جنگل اس طرح تپ جاتا کہ پیروں چھالے پڑ جاتے۔ ماں شام میں انہیں تیل لگاتی۔ دن بھر جان الٹ پلٹ ہوتی رہتی .... باکسی کام کو ہاتھ نہ لگاتا۔ اس کا سارا دھیان بیڑی، جوں کا بیانہ لینے میں لگا رہتا۔"

پیٹ کی خاطر کبھی کبھار جان پر بھی بن آتی۔ اپنے ماں باپ پر بیتے ہوئے ایک نہایت ہی سخت واقعے کا بکشن نے تذکرہ کیا ہے۔ طویل ہے لیکن اس سے حالات کے کئی پہلو سامنے آئیں گے:

"صبح سویرے ہی ماں اور باپ بیچنے کے لیے جا چکے تھے۔ ہم بچے گھر میں ہی تھے۔ دن شدید گرمی کے تھے۔ گھر سے باہر منہ نکالنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ گاؤں پر موت کا سناٹا طاری تھا۔ پرندہ تک دکھائی نہ دیتا تھا۔ میں نے باسی روٹی املی کے پانی میں بھگونے کے لیے رکھ چھوڑی تھی۔ پیٹ میں آگ لگی تھی۔ باہر کی آگ میں اندر کی آگ کی لپٹیں شامل ہو رہی تھیں۔ آنکھوں سے پانی کی دھاریں رواں تھیں۔ گھر میں کچھ بھی نہ تھا۔ سب بھوک سے بے تاب تھے۔ ماں باپ کی پنچھی کی طرح راہ دیکھ رہے تھے۔ ابھی ماں آئے گی ... ابھی باپ آئے گا۔ دونوں آئیں گے تو روٹی لائیں گے۔ لیکن ان کا پتہ ہی نہ تھا۔ کسنیا — جو سب سے چھوٹا تھا اس نے جو رونا شروع کیا تو کسی صورت بہلنے کے لیے تیار ہی نہ تھا۔ اسے کوئی پانی پلا رہی تھی۔ وہ بے تاب تھا۔ ماں باپ کو میں دل ہی دل میں گالیاں دے رہا تھا۔ اور اچانک ایک شور مچ گیا۔ باپ سب سے آگے تھا اس کے پیچھے ماں۔ ماں کے جسم پر چولی نہ تھی۔ اس نے باپ کا انگرکھا پہن رکھا تھا۔ ساڑی کی دھجیاں لٹک رہی تھیں۔ باپ صرف دھوتی پہنے تھا۔ دونوں کے بدن پر زخم نیل پڑے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے چار پانچ بھلے کے مرد تھے۔ ماں چلا رہی تھی [illegible]

رہنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

...ہم بھی چلانے لگے۔ زار و قطار روتے ہوئے دوڑے۔ ماں نے کسنیا کو اٹھا کر پیٹ سے چمٹا لیا
...س کے سر پر سے ہاتھ پھیرنے لگی۔ میں ماں کے پاس گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ خون میں لت پت تھے
...نیچے سیاہ منہ سوجا ہوا تھا۔ میں چلا چلا کر رونے لگا۔ با کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ با
...نے گردن نیچے جھکالی۔ ماں کو، با کو گھر نہیں لایا گیا۔ سیدھے چاوڑی کے سامنے لے گئے۔ اس وقت
...ت دیکھنے والوں کی بھیڑ جمع ہو گئی۔ میری ماں کی عزت ..... با کے انگرکھے کے نیچے چھپی ہوئی
...تی وہیں اندر ہی اندر جلس رہا تھا۔ عمر زیادہ نہ تھی لیکن اچھی طرح سمجھنے لگا تھا۔ ماں چاوڑی
...سے "گھر جانے دیجے" کی رٹ لگائے مُردوں کے پیر چھو رہی تھی۔

ایک کہہ رہا تھا "کیوں گئی تھی وہاں مرنے..."

کیا کیا جائے۔ مجھے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے گاؤں میں بات پھیل گئی۔
...ؤں چاوڑی کے سامنے اکٹھا ہو گیا۔ ہماری گلی کے بوڑھے بڑوں نے دامن پسارے۔ جرمانہ قائم کرنے
...ے لیے کہا۔ لیکن گاؤں میں غصہ پھیل چکا تھا۔

"ان کی ماں.....! (ذلیل لوگ) بہت سر چڑھ گئے ہیں۔ نہ مینڈھ پر ہری ٹہنی رہنے
...یں نہ جنگل میں تِنکا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اٹھا لیتے ہیں۔ کوئی چیز رکھنے کی مجال نہیں۔ باندھو
...آم خوروں کو جھاڑ سے اور انڈیلو گڑ کا پانی!"

سارا گاؤں آپے سے باہر ہو چکا تھا۔ کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ۔ چوری سے لے کر تو ماں کا
...کس کے ساتھ لفڑا ہے یہاں تک سلسلہ جا پہنچا تھا۔ سارا کیکاڑا واڑہ حاضری کرتا پھرتا تھا
...ن کسی کے دل میں رحم نہ آتا تھا۔

یہ سب کچھ جاری تھا۔ اور ہم آہ و زاری کر رہے تھے۔ با نیچی گردن کیے پیر کے انگوٹھے سے
...ا کرید رہا تھا۔ گاؤں کا پٹیل آیا۔ پنچ جمع ہو گئے..... سون واڑی کے لوگ کہہ رہے تھے...
"چار دن ہو گئے، گاؤں میں ببول کا ایک کانٹا تک نہیں رہنے دیا۔ رات میں آتے ہیں اور ہری
ٹہنیاں اور کانٹوں کے ڈھیر اٹھا لے جاتے ہیں۔ آج یہ دونوں ہاتھ لگے ہیں۔ بھاگے جا رہے تھے
...ا میں بھی یہ کم بخت..... نکلا جا رہا تھا۔ لیکن جب اس رنڈی کی ساڑی پھٹتی دیکھی تو بھاگ کر
...پس آیا۔ یہ زیادہ مارا نہیں ہے۔ آپ تک لائے ہیں۔ آپ جو فیصلہ کریں کیجے۔ دوبارہ ہماری سرحد
...پر نہ دکھنا ایسی بس اتنا کیجے۔ ورنہ زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ پھر نہ کہنا یوں ہوا اور توں ہوا...

... ان کی وجہ سے ہمارے آپس میں برائی نہ آنے پائے۔"

"ان سے کھر گرا لو۔ ان چوروں کے جھون کو گاؤں میں سے بھگادو۔ ان کی وجہ سے سون واڑی والوں نے ہماری آبرو لی ہے۔ ابھی اسی وقت انہیں ہاتھ بتادو!"

ہر ایک کا ہاتھ مونچھوں پر تاؤ دے رہا تھا۔ اب ہمیں اپنا (آبائی) گاؤں چھوڑنا ہوگا۔ اب یہ ماں باپ کو زندہ مار ڈالیں گے۔ اس تصور سے ہی میں بے چین رہا تھا۔ بے سنگیا، پاری، پھوپھا، چچا سارے لوگ میت میں شریک لوگوں کی طرح چہرہ اتارے ہوئے بیٹھے تھے۔

یہ سب کچھ ایک سرخ و سفید چہرے کا نوجوان سن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک طرح کی چمک تھی۔ بڑی بڑی مونچھیں، پاجامہ، کرتا، سر میں مانگ کاڑھے ہوئے۔ پڑھا لکھا بانکا نوجوان۔ رام بھاؤ اس کا نام۔ وہ تلملا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بولنے والوں کے گلے خشک ہوگئے۔ سارے لوگ رام بھاؤ کی طرف دیکھنے لگے۔ رام بھاؤ تیز قدم اٹھاتا ہوا آیا اور اس نے ایک جھٹکا دے کر ماں کا ہاتھ چھڑا لیا۔ ماں کے جسم کے نیل دیکھ کر اس کی آنکھیں پونچھیں، اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا،

"آ نوری تو جا۔ میں نے چھوڑ دیا ہے تجھے۔ تو جا"۔ ماں جان مٹھی میں لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سارے شیطان خاموش۔ لیکن سب حیرت زدہ ہوکر تک رہے تھے۔ گاؤں کے پاٹیل کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

"رام بھاؤ۔ یہ تم نے کیا کیا؟ سمجھ ہے کیا تمہیں؟ تم سرکاری کاموں میں دخل اندازی کر رہے ہو۔ مجھے چالان کروا کے تمہیں گرفتار کرنا ہوگا"۔ —— رام بھاؤ غصے سے بے قابو ہوکر بولا،

"اس عورت کی آبرو کی بجائے تمہاری بہن کو اس طرح کھڑا کیا گیا ہوتا تو کیا تم برداشت کر لیتے۔ تمہاری بھی ماں بہن ہے کہ نہیں؟ میں دیتا ہوں تمہاری ککڑیاں، کتنی ککڑیاں لائے تھے یہ سون واڑی کی؟ اور ککڑیوں کی خاطر سزا دینے کا تمہیں کس نے اختیار دیا ہے؟ تم شکایت درج کرواؤ۔ تمہاری بیوی کو یہاں چاوڑی پر لایا جائے تو کیسا لگے گا؟"

پاٹیل چڑ گیا۔ اس نے غصے میں پیر کی جوتی نکالی اور رام بھاؤ کے دے ماری۔ رام بھاؤ کے بھائی بند بے قابو ہوگئے۔ ہنگامہ بڑھتا گیا۔ لوگ چاوڑی سے گاؤں کی طرف بھاگنے لگے اور گاؤں کے لوگ کیا ہنگامہ ہے دیکھنے کے لیے چاوڑی کی طرف۔

"کیا ہوا، کیا ہوا؟"

"رام بھاؤ کو مارا"۔ ... ایک ہی غل مچ گیا۔ رام بھاؤ کے بھائی بند لاٹھیاں لیے چاوڑی پہ دوڑ آئے۔ سارے گاؤں میں فساد ہوگیا۔ اس لیے ایا جہار پولس کی طرف فرار ہوگیا۔ ادھر کچھ...

... مار ماری ... کون کسے مار رہا تھا کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ سب ایک دوسرے کے سینوں پر سوار تھے۔ دیر تک گاڑیوں کی اور جھگڑا گاؤں کا۔ جہاں رواج سے میں خبر پہنچی کہ رام بھاؤ کو مارا گیا۔ پیچھے سے چلے کے جہاں ہاتھ لگے وہ چیز لیے دوڑے۔ آگ لگ گئے۔ رام سی آئے اور اوپر کے چلے والوں نے پسپائی اختیار کی۔ پٹیل پاؤں لٹکا کر کب کا فرار ہو چکا تھا۔

رام بھاؤ کے کافی چوٹیں آئی تھیں۔ سر سے خون بہہ رہا تھا۔ ماں نے جسم پر کا قمیص پھاڑ کر زخم پر باندھا۔ ایک ہنگامہ بپا تھا۔ سمجھ دار لوگوں نے بیچ میں پڑ کر لڑائی رکوائی۔ لوگوں کو اپنے اپنے گھر بھیجا۔ سب طرف امن ہو گیا۔

ماں، بابا، پھوپھا، چچا سب رام بھاؤ کے مکان میں پناہ گزیں ہوئے۔ سون وڑی والے کہاں غائب ہو گئے، پتہ ہی نہ چلا۔

جب ہر طرف امن ہو گیا تب پولس کی گاڑی گاؤں میں آئی۔ آٹھ دس لوگ ہوں گے۔ گاؤں کے پٹیل نے ساری چغلیاں کھائی تھیں۔ پولس رام بھاؤ کے مکان کے سامنے آئے۔ رام بھاؤ زخمی حالت میں باہر آئے۔ پولس کی اور ان کی بات چیت ہوئی۔ بس پوچھ تاچھ کرتے ہوئے پولس کیا کچھ کہہ رہے تھے مجھے سمجھ میں نہ آتا تھا۔ رام بھاؤ، ماں، بابا، پٹیل کی جانب کے چار پانچ آدمی۔ اس طرح آٹھ دس لوگوں کو پنجرے میں بٹھایا گیا اور موٹر پھلٹن کی جانب روانہ ہوئی۔

میں، اسمی، لکشمی، کسیبا، لالی چچا کے گھر گئے۔ چچی نے ہمیں پیٹ سے لگا لیا۔ رونے لگی۔ "کیوں آگ لگانے گئے تھے ککڑیاں لانے" کہہ کر وہ ماں باپ کو گالیاں دینے لگی۔ چچا، پھوپھا، جے سنگیا، سدیا، چندنیا، مانتیا سارے پیدل ہی پھلٹن کی جانب نکل کھڑے ہوئے۔ رام بھاؤ کے خاندان کے کچھ دار لوگ پھلٹن کے لیے روانہ ہوئے۔ عورتیں کہہ رہی تھیں، رام بھاؤ کو کیا پڑی تھی؟ ان ذلیلوں کے منہ کیوں لگے؟ اپنی سطح رام نے چھوڑ دی۔ آخر پانی کیوں مرتا ہے ...

جس کے منہ میں جو آرہا تھا بکے جا رہا تھا۔ میری جان اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ اٹھیا کو تو ال کہہ رہا تھا " انہیں کچھ نہ ہوگا۔ ضمانت پر چھوڑ دیے جائیں گے۔ بابو پر اس سے پہلے کوئی کیس نہیں ہے۔ رام بھاؤ ساتھ ہیں۔ تم لوگ خاموش رہو"

ہنگامہ فرو ہو گیا۔ صبح سے منہ میں پانی کا قطرہ تک نہیں پہنچا تھا۔ چچی نے لالی، لکشمی، اسمی مجھے ہم سب کو کور کور روٹی دی۔ گاؤں کی طرف دیکھ کر تھوک تھوک کر گالیاں دیے جا رہی تھی۔ جو منہ میں آتا بکے جا رہی تھی۔

رات اندھیرے کمرے میں چادر میں لپٹی تھی۔ دادی (چچی) نے سب کو سُلا دیا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کمرہ اندھیرا۔ ... سے ... تھا لیکن آنکھوں کے سامنے سے ماں باپ ہٹتے نہ تھے۔ چھوٹے بچے سو گئے، لیکن میری آنکھوں میں نیند کا دور دور پتہ نہ تھا۔ ماں باپ کے ساتھ نہ جانے پر افسوس ہو رہا تھا۔ ساری دوپہر ایک جلاہر کی نذر ہو چکی تھی۔ لوگوں کی نظریں نہ اگل رہی تھیں۔ ہماری ماں نے آخر ایسا کون سا گناہ کیا ہے۔ سکرٹری کی کار بھی آخر بعد لاتے ہیں پھر چاچی انہیں کیوں مارا؟ باہیں بھی جلتا ہے لیکن پولس کبھی آئی نہیں۔ یہ لوگ آپس میں کیوں لڑے؟ بیوں بیٹا ماں کو؟ ... منظر آنکھوں کے سامنے سے ہٹتا نہ تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری تھی۔ کروٹیں بدل رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا۔

دوسرے روز کی صبح نمودار ہوئی۔ ماں باپا رات میں لوٹ آئے ہوں گے۔ اس خیال سے اٹھتے ہی گھر ڈھونڈنے لگا۔ چچی سے پوچھا، کوئی لوٹا نہ تھا۔ دوپہر ہو گئی۔ سارا دھیان سڑک کی جانب لگا تھا۔ دوپہر ڈھل گئی۔ دل بیتاب تھا۔ اب ہمارے ماں باپ نہیں آئیں گے اس خیال سے رہ رہ کر رو رہا تھا۔ آخر گھر میں اس ٹوکری کے پاس پہنچا جس میں مورتیاں رکھی تھیں۔ گلال چھڑکا، پیر چھوئے۔ ماں باپا آنے دے، اس خیال سے کتنی ہی دیر کھڑا رہا۔

شام ہو چکی تھی۔ ماں ۔ باپا سارے لوگ لوٹ آئے۔ آتے ہی ماں نے سب کو قریب کر لیا۔ بلائیں لیں۔ وہ رو رہی تھی۔ میں نے پوچھا،

"ماں! تجھے بہت مارا کیا رے؟"

ماں نے گردن ہلا کر نفی میں جواب دیا۔ اور مجھے قریب کر لیا۔ پھر کیا ہوا ..... معاملہ کیسے نمٹا ..... پتہ نہیں۔ میں نے بعد میں پوچھا ہی نہیں۔ سب کچھ بھول گیا۔

باپا چار آٹھ روز بات ہی نہ کرتا تھا۔ ماں کو ہنستا ہوا میں نے کبھی نہ دیکھا۔ دن گذر رہے تھے۔ فاقہ کشی کی عادت ہو چکی تھی۔ سالن ہوتا ہی نہ تھا۔ نمک کے پانی میں یا پھر املی کے پانی میں روٹی مسل کر کھاتے تھے"۔

(جاری ہے) ——

مسعود ابدالی

پولینڈ کی تحریک آزادی کے مسلمان بانی سے ایک ملاقات

پولینڈ کی تحریک آزادی سالیڈیریٹی اور اس کے سربراہ لخ ولیسا سے تو قارئین اچھی طرح واقف ہوں گے۔ لیکن آج کی نشست میں ہم آپ کی ملاقات ایسی شخصیت سے کرا رہے ہیں جو جناب ولیسا کے الفاظ میں سالیڈیریٹی کی حقیقی قائد و بانی ہے۔ یہ ہیں ڈاکٹر پگیلان کوپانسکی جن کا اسلامی نام علاء الدین [illegible] ہے۔ ڈاکٹر کوپانسکی جو روسی ادب و زبان کے مستند ماہر اور مشرقی یورپ کے دانشور سمجھے جاتے ہیں آج کل امریکہ میں جلا وطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ راقم الحروف کی ڈاکٹر کوپانسکی سے ملاقات حلقہ اسلامی شمالی امریکہ کے ایک حالیہ اجتماع میں ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب محض سیاست کے ماہر اور مصنف ہی نہیں بلکہ بہت ہی عمدہ مقرر بھی ہیں۔ مخصوص یورپی لہجے میں آپ نے جس روانی سے انگریزی میں تقریر کی اسے سن کر یہ یقین کرنا بڑا مشکل ہے کہ موصوف نے انگریزی حال ہی میں سیکھی۔

اجتماع کے دوران کھانے کے وقت میں مجھے ان کے ساتھ بیٹھنے کا اتفاق ہوا تو میں نے انٹرویو کی خواہش ظاہر کی۔ اور موصوف نے میرے سوال کے جواب میں بے تکلفی کے ساتھ مسکرا کر فرمایا "سوال کیجئے"۔ میں اس وقت قرطاس و قلم سے غیر مسلح تھا۔ اور ذہنی طور پر باقاعدہ انٹرویو کے لئے تیار نہیں تھا لہذا میں نے عرض کیا کیوں نہ کسی وقت بیٹھ کر تفصیل سے گفتگو ہو۔ جواب میں ڈاکٹر صاحب زور سے ہنسے اور کہنے لگے۔ بھائی میں نے تو آج تک بیٹھ کر تفصیل سے انٹرویو نہیں دیا۔ اسی طرح چلتے پھرتے گفتگو کا عادی ہوں۔ شریعت لینن میں ہم مزدوروں کے [illegible] سے بیٹھنا [illegible] ہے۔ اور پھر ملنے کی اجازت لئے بغیر انٹرویو دینے کی [illegible] پتا لگ گیا ہے۔ میں نے انہیں یاد دلایا کہ اب وہ پولینڈ میں نہیں امریکہ میں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے [illegible] جواب دیا کہ جو یہاں میرے ملک کی بات کہنے کی اجازت نہیں [illegible]

باب (۲۲)

خوش نصیبی

میں مسلمان کیوں کر ہوا؟ یہ جاننے کے لئے میں ... انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے آپ تشریف رکھیے بیٹھیے۔ تفصیل سے لکھوں گا۔ یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لئے فکر میں مشغول ہو گئے اور شاید ذہن میں سوالات مرتب کرتے رہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اللہ نے ... ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ خدا کے لئے اگر چہ وقت ... دل کی بات ... اور پریس کانفرنس تو رسمی چیز ہوتی ہے میں تو چاہتا ہوں کہ آپ اپنے غم بیان کیجئے میں اپنے زخم دکھاؤں۔ میں سالہا سال سے ... نہیں تحریک اسلامی کا معمولی سا کارکن ہوں۔ اپنا ہم سفر جان کر دل کی بات کیجئے۔ دنیا کو تبدیل کرنے کا عزم یہی خواہش اللہ کی حکومت قائم کرنے کا دیرینہ خواب، راہ کی رکاوٹیں، مسائل، مشکلات، گفتگو کے لئے موضوعات کی کیا کمی ہے؟

میں نے کہا ٹھیک ہے آپ نے میری مشکل آسان کر دی۔ سنائیے دل کی بات، ڈاکٹر صاحب نے حالات تفصیل بیان کرنے شروع کر دیئے۔

"میں جنوبی پولینڈ کے ایک گاؤں KAROWICE میں پیدا ہوا۔ یہ گاؤں کوئلے کی کانوں کی بنا پر مشہور ہے۔ میں نے انتہائی مذہبی کیتھولک گھرانے میں آنکھ کھولی۔ اور لڑکپن ہی سے پابندی سے ہر اتوار چرچ جایا کرتے تھے مجھے بھی مذہب سے گہرا لگاؤ تھا۔ ہمیں تعلیم دینے والے پادری ہم لوگوں پر بہت مہربان تھے اکثر بسکٹ مٹھائی اور پھل وغیرہ کھانے کو دیتے تھے۔ لیکن ایک دن ایسا واقعہ ہوا کہ مجھے مذہب سے شدید نفرت ہو گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری بارہویں سالگرہ تھی چنانچہ میں نے چرچ کے چمن سے گلاب کا ایک پھول توڑ کر اپنے کوٹ کے کالر میں لگا لیا۔ پادری صاحب نے مجھے پھول توڑتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ کیا تم نے یہ پھول چرچ سے توڑا ہے۔ انہوں نے یہ سوال اتنے سخت لہجے میں کیا کہ میں ڈر گیا اور ڈر کر میں نے سفید جھوٹ بول دیا کہ نہیں یہ تو میری اماں نے مجھے میری سالگرہ پر دیا ہے میرا جواب سن کر پادری صاحب نے مجھے پیٹنا شروع کر دیا۔ اور وہ مسلسل کہتے جاتے کہ تجھے پھول کا غم نہیں بلکہ تجھے جھوٹ بولنے کی سزا دے رہا ہوں۔ مختصر یہ کہ میری اچھی طرح مرمت ہوئی۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر مجھے ملامت کی اور کہا جاؤ ایک پھول اور توڑ لاؤ ... ہوتا۔ دوسرے دن جب میں اپنی والدہ کے ساتھ پڑھنے کے لئے چرچ آیا تو میری والدہ نے پادری

سے چھپ کر تبلیغ کا اس کی پتا لگا لیتے تھے۔ پادری صاحب صاف مکر گئے کہ وہ [illegible]
تمام طلبہ پادریوں کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ میری والدہ پادری کی سخت مخالف تھیں [illegible]
[illegible] کہ مجھ سے [illegible] ہے۔ بات [illegible]
اس وقت میرے دل میں مذہب کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو گئی۔ میرے چچا [illegible]
سے [illegible] کہ مطالعہ کی عادت پڑ گئی تھی۔

ہائی اسکول آ کر میں نے کمیونسٹ لٹریچر پڑھا۔ اور اس کے بعد مجھے کمیونزم کا جنون ہو گیا۔ میں ۱۴ سال کی عمر میں اپنے اسکول کی کمیونسٹ پارٹی کا رکن بنا اور دو سال کے اندر اسکول یونین کا صدر منتخب ہوا۔ اسکول اور کالج کی تعلیم کے خاتمہ پر میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ریسرچ و تحقیق کا کام شروع کیا اور پی ایچ ڈی مکمل کی۔ میرے شوق سے متاثر ہو کر مجھے کمیونسٹ پارٹی کی پولیٹیکل برانچ میں بطور ڈائریکٹر نامزد کیا گیا۔ تیسری دنیا میں کمیونزم کی تبلیغ و اشاعت میری ذمہ داری تھی۔ واضح رہے کہ اس عہدہ پر میرا تقرر پولینڈ کے وزیر اعظم جیروسکی نے کیا تھا جو اس وقت کمیونسٹ پارٹی کے جوائنٹ سیکرٹری تھے۔

میں نے مراکش، ایران، شام اور لیبیا میں کمیونزم کے امکانات کا جائزہ لینا شروع کر دیا اور کئی مرتبہ رباط، فیض، تہران، قم، دمشق اور طرابلس کا دورہ کیا۔ مجھے ان دوروں میں جو بات سب سے عجیب محسوس ہوئی وہ ان ملکوں کی بعض عورتوں کے لباس تھے۔ سر سے پیر تک حجاب میں لپٹی ہوئی شرم و حیا کی ان پتلیوں کو دیکھ کر میری نگاہیں خود بخود جھک جاتی تھیں۔ سلسلۂ ریسرچ کے سلسلے میں اسلامی لٹریچر کی سخت ضرورت تھی۔ چنانچہ میں نے اخوان المسلمین کے افراد سے ربط قائم کیا۔ ان افراد کے توسط سے میں نے شام کی سکریٹ سروس سے [illegible] حاصل کئے۔ ۱۹۹۹ء کے دورہ میں میری ملاقات مفتی اعظم شیخ کفتارو اور مشہور عالم دین سعید رمضان سے ہوئی۔ ان حضرات کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ میں جاسوس ہوں اور وہ مجھے طالب حق سمجھتے تھے۔ ان لوگوں نے پورے خلوص کے ساتھ اسلام کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیں۔ اخوان المسلمین کے [illegible] نے مجھے مریم جمیلہ کی کتاب اسلام اینڈ ماڈرنزم اور مولانا مودودی کی کتاب [illegible] اسلام پڑھنے کو دیں۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا [illegible] کے خلاف [illegible] [illegible] بات ہے نہیں تو یہ ہمارے ملک کی روایت ہے۔ [illegible]

[illegible] نے قرار دیکر عالم میں اس کتاب کو [illegible] [illegible]
اس وقت میرے دل پر جو کیفیت طاری ہوئی اس کا اظہار [illegible]
یہ قرآن کو انسانی ترتیب تھا جو سے آیات کے چند ... [illegible]
اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ [illegible] آیات [illegible]
فکر کو بدل دیا۔ یقین جانیے کہ سورہ فاتحہ سے اختتام پر میں ذہنی طور پر [illegible]
مطالعہ کر چکا ہوں لیکن قرآن کے انداز بیان نے میرے ذہن پر جو اثرات مرتب کئے ہیں ان
کا اظہار ناممکن ہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا اللہ کی آیات [illegible] اور ہر کوئی [illegible]
لئے ذاتی طور پر مخاطب ہے اور یہ قرآن مجھ پر نازل ہو رہا ہے۔ [illegible] قرآن [illegible]
[illegible] دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے کہ اکثر لوگ اسے ناولوں کی طرح پڑھتے جاتے ہیں۔ [illegible]
کے معنی و مطالب پر غور کرتے ہیں۔ اور نہ ہی کسی مقام پر رک کر اس کی عظمت کو سمجھنے کی کوشش
کرتے ہیں۔

بہر حال قرآن کے مطالعے سے میرا انداز فکر بالکل تبدیل ہو گیا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی
کا مرکزی اس تبدیلی کو بھانپ رہے تھے۔ چنانچہ تبدیلی آب و ہوا کے لئے مجھے ترکی بھیج دیا گیا
مگر اب معاملہ کافی آگے بڑھ گیا تھا۔ میرے پاس مزید غور کی فرصت نہ تھی۔ جس دن میں انقرہ
پہونچا اس کے دوسرے دن جمعہ تھا۔ ساری رات میں نے بے قراری کے عالم میں گذاری
اللہ سے ثابت قدمی کی دعا کرتا رہا۔ صبح کو ہوٹل کے بیرے نے میرے ساتھ [illegible]
دیکھ کر مجھے مسلمان سمجھا اور ہیلو کہنے کے بجائے بہت محبت سے السلام علیکم کہا۔ اگرچہ اس
وقت اسلام کے بارے میں میرا مطالعہ بہت مختصر تھا لیکن عرب دنیا میں کافی عرصہ رہنے
سے السلام علیکم، انشاء اللہ اور ماشاء اللہ جیسے الفاظ سے میرے کان مانوس تھے۔ خود
بیت کے مطابق اسلام کا تقاضا کر رہی تھی۔ دل میں بھی احساس تھا کہ مسلمان ہی [illegible]
میں اسے مایوس نہیں کروں گا۔ میں نے وعلیکم السلام کہہ کر اسے گلے لگا لیا۔ اور کہا کہ میں
آج سے مسلمان ہوں۔ میں نے اس سے جمعہ کی نماز کا وقت اور مسجد کا پتہ پوچھا۔

میں جمعہ کے وقت سے کافی پہلے پہونچ گیا جونکہ [illegible]
[illegible] میں [illegible] میں بیٹھا رہا [illegible]
[illegible] [illegible]

جہاں کے [illegible] ہو گیا۔ [illegible]
[illegible] ... امام صاحب [illegible]
[illegible] امام صاحب [illegible]
اور کہ جانے کو کہا۔ میں نے وہیں کئی ہزار مسلمانوں کے سامنے کلمہ شہادت ادا کیا۔ اس کے بعد [illegible]
[illegible] ایک شخص نے [illegible] کر کے گلے لگا لیا۔ پھر [illegible]
محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کوئی بہت قریبی عزیز بہت عرصہ لاپتہ ہونے کے بعد گھر واپس آگیا ہو۔

ایمان لانے کے فوراً بعد میں دمشق چلا گیا۔ اور اپنی بیوی کو اسلام لانے کی خوشخبری سنائی۔ اس پر وہ [illegible] ایک افغانی ساتھی کی کوشش [illegible] میری شریک حیات بن گئیں۔ [illegible] صاحب نے میرا نکاح پڑھایا۔

اس کے بعد میری بیوی [illegible] واپس آ گئے۔ اور میں نے اپنی شریک حیات سے اسلام کا علم حاصل کرنا شروع کر دیا۔ میری بیوی عربی زبان کی عالمہ ہے۔ اور اسلامی تعلیم پر مکمل عبور رکھتی ہے۔ چنانچہ ہم دونوں نے خفیہ طور پر اسلام کی تبلیغ شروع کر دی اور خفیہ طور پر [illegible] قائم کی۔ دیہاتوں کی جانب سے اسلامی کتب کی تقسیم کا کام شروع ہوا۔

میں نے ١٩٦٩ء میں اسلام قبول کیا اور اس کے بعد [illegible] سالوینیا کی تجویز کی۔ میں شروع میں تحریک کے خلاف تھا [illegible] سیاسی [illegible] اسلام پر مرکوز رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن میری شریک حیات نے کہا کہ ہر قسم کے ظلم و تشدد کے خلاف اور حق و انصاف کی بے لاگ حمایت مسلمانوں کا فرض ہے۔ [illegible] کی صورت میں ہمیں تبلیغ اسلام کے لئے ایک بڑا پلیٹ فارم میسر آ جائے گا۔ چنانچہ ہم لوگوں نے [illegible] میں [illegible] کی بنیاد رکھی۔ میری ذمہ داری پمفلٹ وغیرہ کی [illegible] تھی۔ اس مقصد کے لئے ہم لوگوں نے خفیہ چھاپہ خانہ قائم کر لیا تھا۔ [illegible] کے دو [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] سب سے [illegible] بات یہ تھی کہ [illegible] قسم کی [illegible]
[illegible]

جب تک کہ بڑی تعداد میں مسجدیں اور مدرسے ہر جگہ تشدد کی زد میں ہیں باقاعدہ ... صورت ... جیل میں تبلیغ کا کام جاری رکھا۔ جیل میں ملاقات کے دوران ... جیل سے ... سب کر دیا گیا۔ اب یہ ... کی حیثیت سے ... مقیم ہیں۔

ڈاکٹر ... سے ... مشرقی یورپ میں تبلیغ اسلام کا کام کس طرح ہو رہا ہے ... کی حکمت عملی کیا ہے؟

ڈاکٹر ... نے کام کا ... ذکر نہ کیا اور ... کر جواب دیا۔ حکمت عملی کی تفصیل بیان کرنا تحریکی مفادات کے خلاف ہے۔ البتہ یوں سمجھئے کہ البانیہ کے سوا روس سمیت تمام کمیونسٹ ملکوں میں تبلیغ اسلام کا کام بہتر طریقے پر جا رہا ہے۔ مقبوضہ مسلم علاقوں آذربائیجان، ... اور دوسرے شہروں میں ... مسلمان کے ... کے ہاتھوں قتل ہو رہے ہیں۔ اس کے باوجود تحریک اسلامی زندہ ہے۔ مسلمانوں کے خفیہ حلقے قائم ہیں۔ یہ باتیں محض خوش فہمی نہیں بلکہ ... شعبہ تحقیق میں کام کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ میں صورت حال کا دو اور دو چار کے اصول پر تجزیہ کرتا ہوں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے تاشقند، المان اور روسی خوزستان میں مساجد کے باہر نوجوانوں کی لمبی قطاریں دیکھی ہیں۔ ایران، افغانستان کے بعد مسلمانوں کا جوش و جذبہ اور بڑھ گیا ہے۔ بلکہ سوویت میں تمام اسلامی رہنما ... جیلوں میں بند ہیں۔ اس کے باوجود نئے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہاں البانیہ میں اسلامی تحریک نہ ہونے کے برابر ہے۔ بلکہ ... کی کیفیت ہے۔ پولینڈ میں تقریباً تمام شہروں میں اسلامی مراکز قائم ہیں۔ سالیڈیریٹی کی تحریک کی بیداری ... اور اسلامی تحریک کے ... کسی حد تک ختم ہو چکا ہے۔ اور اسلام کو قدم جمانے کا موقع مل رہا ہے۔ کیونکہ ... قوت کی بنا پر ہر وہ تحریک جو روسی مفادات کے خلاف ہو پولستانی عوام میں مقبول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پولش عوام کو افغان مجاہدین سے ... عقیدت ہے۔ سالیڈیریٹی کی تحریک کے ... نے ... بڑی تعداد میں اسلامی لٹریچر تقسیم کیا۔ ... پولینڈ میں ... سالیڈیریٹی کے ... کے ساتھ ... زبان میں اسلامی کتب ... کیونکہ سالیڈیریٹی تحریک کے ... تبلیغ دین کا ... ہم ... استعمال کر رہے ہیں۔

... پولستانی اور ... زبان میں اسلامی لٹریچر ... ہیں۔

پاکستان کے [illegible] کے سیاسی [illegible] ہے یا نہیں ؟

[illegible]

[illegible] بھی [illegible] کے [illegible] ہیں۔ [illegible] سے [illegible] اپنے [illegible] [illegible] نہیں [illegible] ہے۔ [illegible]

[illegible] جڑیں [illegible] زیادہ [illegible] اور [illegible]

[illegible] ملک کے [illegible] سے پہلے [illegible] قبضہ کر لیا ہے۔ [illegible]

سالوں کے [illegible] نہیں [illegible] ہوں۔ انشاء اللہ [illegible]

نکلے گا۔

ڈاکٹر صاحب! اسلامی دنیا میں کمیونزم کا مستقبل کیا ہے؟

مولانا [illegible] صاحب نے گہرا سانس لیا اور کہا کہ اس سوال کے جواب میں [illegible] بھی لکھی جا سکتی ہیں۔ مختصراً میں اپنے تجربہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی دنیا [illegible] ہے [illegible] جڑیں پیدا کرنا چاہتا لیکن [illegible] مستقبل قریب میں کئی اسلامی ملکوں میں کمیونسٹ [illegible] خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ بلکہ مجھے اندیشہ ہے کہ تمام اسلامی ممالک کمیونزم کی [illegible] انقلاب [illegible] ہو رہا ہے۔ تقریباً تمام اسلامی ملک آمروں کے شکنجے میں ہیں [illegible] خصوصاً فوجی حکومتوں نے تو اپنا اندھیر مچا رکھا ہے کہ عام آدمی [illegible] نا دوبھر ہے۔ افریقی ملک میں فوجی انقلاب [illegible] ہوئے ہیں۔ [illegible] کے ماحول میں کمیونزم خوب پروان چڑھتا ہے۔ کمیونسٹ [illegible] عوام میں [illegible] پیدا کی جائے تاکہ کمیونسٹ انقلاب کی راہ ہموار ہو [illegible] تمام اسلامی ملک میں موجود ہے۔ [illegible] حکمران طبقے کے ہاتھوں عام آدمیوں کی تذلیل [illegible] غربت اور ظالمانہ تقسیم دولت سے کمیونسٹ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ کمیونزم [illegible] دشمن [illegible] طاقت کے طور پر سامنے آ رہا ہے۔ یہ بہت ہی خطرناک بات ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ [illegible] جلد یا بدیر بہرحال ختم ہونا ہے۔ ان آمروں کے خلاف عوامی نفرت بڑھتی جا رہی ہے مگر اسلامی تحریکات [illegible] ڈر ہے کہ دشمن [illegible] کا فلسفہ غالب آ جائے گا [illegible] کمیونسٹوں کے ہاتھ آ جائے گی۔ کمیونزم کا مقابلہ بہت آسان ہے [illegible] ہے۔ [illegible]

[illegible] کمیونزم [illegible] آتی ہے جب [illegible]
ہے [illegible] پیچوں کو اڑانا ہے۔ وہ ملک کمیونزم سے بچے ہیں جہاں [illegible] ہیں

[illegible] کمیونزم کی حکومت قائم ہو جاتی ہے [illegible] کمیونزم کی حکومت قائم ہو جاتی ہے جس بات پر زور دیتا ہے تو اس نقطہ نظر کو اختیار کیا جاتا ہے جس میں عوام لوگوں میں [illegible] ہے۔ [illegible] سیاسی [illegible] غلط [illegible] کی شکل میں۔ [illegible] حالات [illegible] جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کمیونسٹ بدلی ہوئی عام آدمی کو [illegible] شعور [illegible] میں کمیونزم کے لئے ایک عربی لفظ استعمال کرتا ہوں۔ اور وہ ہے [illegible] یعنی کمیونسٹ انقلاب [illegible] کا [illegible] ہوتا ہے۔ اور اس مقصد کے لئے عوام الناس کی بجائے گاؤں کے مکھیا، ایشیا کے لیڈر، چوہدری، فوجی جرنیل، وکلاء اور تاجر پیشہ طبقے کے لوگوں کو پہچانا جاتا ہے۔ [illegible] سے پر کمیونزم کا [illegible] آسان ہے۔ عوام کے بنیادی مسائل حل کر دیئے جاتے ہیں۔ جن [illegible] آزادی [illegible] ضروری ہے۔ ترقی پذیر معاشرے میں کمیونزم کو پنپنے کا موقع [illegible] نہیں مل سکا۔

آزاد معاشرے میں فوج کے ذریعے انقلاب بپا کرنا مشکل ہے۔ اس لئے کہ جمہوری معاشرے میں فوجی جرنیلوں کی عوامی مزاحمت کا ڈر رہتا ہے۔ فوجی انقلاب خواہ دائیں بازو کا ہو یا بائیں بازو کا اس کی حکمت عملی ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ خاموشی کا عنصر تیزی کے ساتھ اقتدار پر قبضہ کر لیا جائے۔ اگر عوامی مزاحمت کا خطرہ ہی موجود ہو تو اقتدار کے بھوکے جرنیل تختہ الٹنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بلکہ جمہوری حالات [illegible] ہوں تو مقبول جرنیل بھی بیرکوں میں بند رہتے ہیں۔ اور [illegible] پر چڑھ کر [illegible] کرنے کے بجائے وردی اتار کر کوچہ سیاست کے راستے کا انتخاب کرتے ہیں۔ (جاری)

ایس اے رحمٰن ثاقب

عورت کا سفر
مظلومیت سے بغاوت تک

قدسیہ عصمت چغتائی کی ناولٹ "دل کی دنیا" کا مرکزی نسوانی کردار ہے۔ عصمت کے نسوانی کرداروں کا موضوع مجموعی طور پر پرانے عہد کی عورت کی مظلومیت اور نئے عہد کی عورت کا باغیانہ رویہ ہے۔ پرانی عورت کی نمائندگی "مندی" کی آشا، "سوانح" کی اوشا، "باندی" کی منور، "چوتھی کا جوڑا" کی کبری، "لحاف" کی بیگم جان، "گھونگٹ" کی گوری بی وغیرہ کے کردار کرتے ہیں۔ اور نئے عہد کی عورت کی نمائندگی میں ہم "ٹیڑھی لکیر" کی شمن، "جنگلی کبوتر" کی بانو، "بھابی" کی رفیعہ اور خالدہ "بے کار" کی ہاجرہ بی، "ڈسیٹ" بھول بھلیاں" کا فر وغیرہ کے نسوانی کرداروں کو پیش کر سکتے ہیں۔ مگر "دل کی دنیا" کی قدسیہ کا واحد نسوانی کردار ہے جس کا سفر پرانی عورت کی مظلومیت سے شروع ہو کر نئی عورت کی بغاوت تک ختم ہوتا ہے اور یہ سفر قدسیہ کے حق میں کامیاب اور کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ یہ عصمت کی کردار نگاری کی کارسازی اور کارکردگی ہے۔

عصمت کی ابتدائی تحریروں میں یوپی کے مسلم متوسط طبقے کے خدوخال صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ عصمت نے ان مسلمان گھرانوں کی پردہ دار عورتوں کی روایت پرستی، ضعیف الاعتقادی، گھر گھلی ذہنیت اور جنسی گھٹن کو بڑے ہی حقیقی اور موثر پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ وہ خاص طور پر مسلمان عورتوں کو ماحول کی اس گھٹن سے نجات دلانا چاہتی ہے جس میں ان کی زندگیاں جہنم بنی ہوتی ہیں۔ "دل کی دنیا" کا موضوع بھی ایسی ہی ایک شادی شدہ مظلوم

صدر شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج، ملاپورم - ۹ - ۵ - ۶۷۶۵۰۵ کیرالم

عورت قدسیہ کی زندگی ہے جس کا شوہر اسے پنجرہ قفس بنا کر عیش کرتا رہتا ہے اور وہ اس ماحول میں جنسی ہیجان کی وجہ سے گھٹ گھٹ کر دم توڑتی رہتی ہے۔

قدسیہ کے کردار کی تخلیق میں عصمت نے ماہرین نفسیات نیز مارکس کے نظریات سے استفادہ کر کے اس کردار میں جنسی خواہشات کی عدم تسکین کے ساتھ ساتھ ان سماجی عوامل کا بھی لحاظ رکھا ہے جو اس کے ذمہ دار ہیں۔ قدسیہ کے حالات دیکھ کر کلیجہ کٹنے لگتا ہے جب بڑھیا کی مرلی کا رنگ پھیکا پڑتا ہے تو اس کو دورے پڑنے لگتے ہیں۔ کوئی درد بھرا گیت سنتی ہے تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ یہ سب قدسیہ کی جنسی خواہشات کی عدم تسکین کا اظہار ہیں۔ جس کا مظاہرہ عصمت نے علم النفس کی مدد سے کیا ہے۔ اس غم کو قدسیہ اپنے سینے میں دبائے رکھتی ہے۔ عصمت نے قدسیہ کی مظلومیت کا ذمہ دار اس سماج کو ٹھہرایا ہے۔ جو جھوٹی اخلاق قدروں، ذات پرستی اور ضعیف الاعتقادی میں بری طرح پھنسا ہوا ہے۔ یہ وہ سماجی عوامل ہیں جس کی وجہ سے قدسیہ کو جنسی گھٹن، ذہنی ناآسودگی اور انتہائی کرب سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ فرار قدسیہ کیلئے چیلنج بن جاتا ہے۔

قدسیہ ایک سیدھی سادی نیک صفت نیک مزاج عورت ہے۔ اس کے شوہر کو لکھے ہوئے خطوط اس کے کردار میں پرانی عورت کی مظلومیت کی داستان ایک دستاویز بن جاتی ہے جب وہ شہادت دیتی ہے کہ

> "مجھے میم صاحب کی آیا بنا کر ہی ایک کونے میں ڈال لیجئے۔ آپ دونوں
> کی خدمت کروں گی۔ جھوٹن کھاؤنگی، اترن پہنوں گی اور منہ سے اُف
> کر جاؤں تو جو چور کی سزا سو میری۔ آپ مالک ہیں میں آپ کی لونڈی میرے
> لیے اس سے بڑھ کے کیا خوش نصیبی ہوگی کہ آپ کے قدموں میں دم نکلے" [1]

یہ داستان خونچکاں اس کی غمازی کرتی ہے کہ قدسیہ ایک ٹھیٹ مشرقی شوہر پرست خاتون ہے جو اپنے خاوند کے لاکھ ٹھکرانے اور دھتکارنے پر بھی اسکو اپنا مجازی خدا ظاہر کرتی ہے۔ یہ اس کا عجز ہے یا اسکی مجبوری ہے۔ مگر قدسیہ کا کردار عصمت کے عام کرداروں کی طرح ارتقاء پذیر کردار ثابت ہوتا ہے اور اپنے سماج کے مادی حالات کے زیر اثر تبدیل ہوتا رہتا ہے جو ارتقاء کی سمت تعین کرتا ہے۔ مارکس کے فلسفے کے مطابق

---

[1] دل کی دنیا ص

فرد کا اخلاق اصل میں سماج میں اس کی مادی حالات سے متعین ہوتا ہے۔ جیسے جیسے مادی حالات بدلتے ہیں اس کے طور طریقے اور سوچنے کا ڈھنگ بھی بدلتا ہے۔ [1] اس ناول میں عصمت نے بھی ان چند مادی حالات کی نشاندہی کی ہے۔ جو قدسیہ کے کردار کی تبدیلی کا باعث بنتے ہیں۔ اور قدسیہ ان حالات کے زیر اثر نئی وضع کی عورت کی باغیانہ روش کی جانب سفر شروع کر دیتی ہے۔ یہ تبدیلی ہر لحاظ سے بڑی اہم تبدیلی ہے واقعہ یہ ہے کہ اس سماج میں جہاں دادی اماں اور نانی بی کے بعد بھیجت کردار پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے ساری فضا ذہن پر ضعیف الاعتقادی اور تنگ نظری طاری کرتی ہے۔ وہاں یہ پٹھانی بوا کا کردار بھی ہے جو سماج کی تمام پابندیوں کو ٹھکرا کر آزادانہ زندگی بسر کرتا ہے۔

یہاں عصمت نے قدسیہ اور پٹھانی بوا کے کرداروں کا ایک طرح سے تقابل کر کے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سماج کے بوسیدہ اور انسانیت کے دشمن اصولوں کو ٹھکرا کر عورت پٹھانی بوا کی طرح آزاد اور خوش رہ سکتی ہے۔ جو عورت ان اصولوں کو ٹھکرا نہیں سکتی اسے قدسیہ کی طرح اپنے جذبات کی جہنم کی آگ میں جلنا پڑتا ہے۔ چنانچہ قدسیہ اس کردار کا فوری اثر ضرور قبول کرتی ہے۔ دوسرے اس ماحول میں شبیر حسن جیسا عاشق بھی ہے جو قدسیہ کو ٹوٹ کر چاہتا ہے اور اس کی زندگی سنوارنے کا متمنی رہتا ہے۔ اس ضمن میں ایک اور اہم واقعہ در پیش ہوتا ہے یعنی قدسیہ کی سوت کی اولاد ہوتی ہے جس کی وجہ سے قدسیہ کو اپنے شوہر سے ملنے کی امید جاتی رہتی ہے۔ ان تمام وجوہات کے علاوہ ایک اہم اور بنیادی وجہ جو اس کردار کو تخلیق کرنے اور تبدیل کرنے کا باعث بنتی ہے۔ اس کے جنسی جذبہ کی ناآسودگی ہے۔ یہ جنسی ناآسودگی سارے اخلاقی نظام اور مذہبی قدروں کو چور چور کر دیتی ہے۔ اب قدسیہ کے کردار کا نیا باغیانہ پہلو خود بخود سے کھلنے لگتا ہے۔ ماں کی پیر بہت اشتو بیٹو کھا رہیو بیر" اچھالی اماں" کہنے والی بے زبان قدسیہ ماحول سے الجھنا شروع کر دیتی ہے۔ اس کی بے زبانی اب

---

[1] بحوالہ مسز راج بہر: ترقی پسند ادب ایک جائزہ

احتجاج بنے ملتی ہے۔ یہاں تک کہ پشیمانی ہوا کے تاثر سے اس کے احتجاج میں باغیانہ
عناصر ابھرنے لگتے ہیں۔ راشد الخیری کی "صبح غم" اور "شام زندگی" پڑھ کر آنسو
اور ہچکیاں [illegible] جانے کی بجائے اب "مثنوی زہر عشق" چھپا کر پڑھا کرتی ہے۔
بھی قضا کرنے لگتی ہے۔ ہر وقت بن ٹھن کر رہنا، آہیں بھرنا، مسکرا کر خلاؤں میں د
اس کا معمول بن گیا ہے۔ غرض شبیر حسن کے عشق میں وہ معشوقانہ انداز اختیار کر لیتی
قدسیہ کے تیور دیکھ کر گھر کی خواتین پر جو ردعمل ہوتا ہے اس پر طنز کرتے ہوئے عصمت
لکھتی ہیں کہ

"ان کے بدلے ہوئے رنگ ڈھنگ دیکھ کر گھر کی ذمہ دار خواتین کو فکر
سہنے لگی تھیں، خالہ کو دورے پڑتے تھے وہ تو برحق تھے۔ ہر بدنصیب
میاں کی ٹھکرائی عورت کا یہی مشغلہ ہوا کرتا ہے۔ مگر سولہ سنگھار کر کے
ہار پھول پہننا اس عورت کو زیب نہیں دیتا جس کا خدائے مجازی اس
سے روٹھ چکا ہے، اب تو بس اللہ کا شکر کر کے جو پھٹا پرانا ملے تن ڈھانک
لیا جائے اور روکھی سوکھی سے پیٹ کی دوزخ بجھائی جائے۔ دنیا
دیکھے گی یہ چوچلے تو کیا کہے گی۔؟ یقیناً جنم میں تھوکے گی۔" [۱]

دراصل عصمت نے یہاں سماج کی اس روایت پر طنز کیا ہے جس کی رو سے۔
شوہروں کی ٹھکرائی ہوئی عورتیں بن ٹھن کر رنگین انداز میں رہتی ہیں تو معاشرہ انہیں شک
نگاہ سے دیکھتا ہے۔ البتہ یہ مظلوم عورتیں ظلم سہہ کر بھی خدا کی شکر گزار رہتی ہیں تو
انہیں پتی ورتا، دیوی، باوفا جیسے الفاظ سے بے وقوف بنا سکتا ہے۔ عصمت نے
جیسی مظلوم عورتوں کی ایسی پرزور ترجمانی کی ہے کہ انسانیت احساس کرب سے
آشنا ہے یہ احساس ان کے طنز نگارش میں جان پیدا کر دیتا ہے۔ عصمت کا یہ
بھرپور اور متاثر کن ہے۔ اور پڑھنے والوں کو مسرور، متحرک اور مشتعل کر دیتا ہے۔
شبیر حسن اور قدسیہ کی آنکھ مچولی سے تنگ آکر ایک دن قدسیہ کی ماں آ

۱؎ چوٹیں کی دنیا ص ۶۵

شوہر پر بھٹکارتی ہیں اور اسے دنیا داری کی باتیں سمجھانے کی کوشش کرتی ہیں۔ تو قدسیہ کہتی ہے "جلتی پہ جلتی ہوں اس دنیا کو دس برس سے جو الٹا رگ چلا رہا ہے اسے دنیا کو پھیں کہتی ہا لے" غرضیکہ اب قدسیہ کو نہ فرنگی کی پروا ہے۔ نہ سماج کی۔ قدسیہ کی ماں نے شبیر حسن کا گھر آنے سے روک دیا تھا قدسیہ کو اس بات کا پتہ چلنے پر وہ ماں سے بھرپور بدلتی ہے۔ جب ماں نے قدسیہ کو املتاس کی دوا پلانے کی کوشش کی تو چپ چاپ ماں کے کہنے پر عمل کرنے والی قدسیہ بڑے اطمینان سے دوا کو موری میں پھینک کر اپنے شوہر کو گالیاں دینے لگتی ہے۔ اس کی ماں شرع کا حوالہ دیکر کہتی ہیں کہ مرد کو چار نکاح جائز ہیں۔ تو قدسیہ لاجواب ہو کر خود کو کوسنے لگتی ہے۔ وہ اس منزل پر شرع سے بغاوت نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہ پٹھانی بوا کی طرح ابھی ماحول سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئی ہے۔ حالانکہ عصمت کو ذرا بھی شرع کا پاس نہیں ہے۔ وہ چاہتیں تو قدسیہ سے بھی اس منزل پر شرع سے بغاوت کرا سکتی تھیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عصمت کو کردار نگاری کی فنی باریکیوں اور خوبیوں کا اندازہ ہے وہ اپنے نظریات کو اپنے کرداروں پر جبراً لاگو کر کے کردار نگاری کی خوبیوں کو نظر انداز نہیں کرتیں۔ بلکہ ان کے مزاج حالات اور موقف کے مطابق انہیں آزادانہ ارتقاء کا موقع دیتی ہیں جو ان کا فن ہے۔

ایک دن قدسیہ اپنے سسر کو جو ماموں بھی تھے گالیاں دیتی ہے۔ ماں سے برداشت نہ ہو سکا۔ انہوں نے جوتی اٹھا کر قدسیہ کے ہونٹ کچل دیئے پھر کیا تھا قدسیہ نے جنتی کی طرح ماں کی کلائیاں مروڑ کر رکھ دیں۔ عصمت کے الفاظ میں "وہاں ان کی عزیز از جان بیٹی قدسیہ بانو نہیں تھیں۔ چوٹ کھائی شیرنی تھی کہ پھن کھیلی ناگن! جنگلی بلی کی گرفت میں ان کی جان کھنچنے لگی"[1] یہ واقعہ قدسیہ کے کردار کی بغاوت کا نقطۂ عروج ہے۔ اس واقعہ کے بعد یہ صورت حال پوری طرح آشکار ہو جاتی ہے کہ قدسیہ پر پٹھانی بوا کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ اس کے بعد قدسیہ کے عیش ہونے لگے اب شبیر حسن کا گھر میں حسب معمول آنا جانا عام ہو گیا اور ان کے عشق کا سفر تیزی سے طے ہونے لگا۔ یہ نئی صورت کا خاص سبب ہے۔[2]

شبیر حسن کے … قدسیہ کو اس کے خاندان کا ایک فرد سمجھ کر بیاہ چاہتا

---

[1] دل کی دنیا ص ۴۰ [2] دل کی دنیا ص ۴۱

رہتا ہے مگر قدسیہ کی چاہت شبیر حسن جیسے باہوش نوجوان سے [illegible] خواب دکھلاتی ہے جبکہ مستقیم خاندان بھر میں عیاش اور بدچلن شخص ہے۔ اس لیے قدسیہ مستقیم سے نفرت کرتی ہے۔ مستقیم کی چاہت کا یہ عالم ہے کہ وہ ہر حال میں قدسیہ کی زندگی سنوارنے کے خواب دیکھتا ہے۔ چاہے قدسیہ شبیر حسن کے ساتھ اپنی زندگی گزار کر کے خوش رہے۔ چنانچہ مستقیم کی ہی بنائی ہوئی اسکیم کے تحت قدسیہ شبیر حسن کے ساتھ گھر چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔ لیکن عین وقت پر اس کی ہمت جواب دے جاتی ہے۔ یہاں اس کے کردار میں ایک کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ یہ کشمکش قدسیہ کی قدامت پرستی اور باغیانہ پن کی کشمکش ہے۔ اس کشمکش میں باغی قدسیہ پر قدامت پرست قدسیہ غالب آجاتی ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ قدسیہ کے کردار سے اپنے تاریک ماحول کے اثرات پوری طرح زائل نہیں ہوتے ہیں۔ یہاں وہ سوچتی ہے کہ ایک شادی شدہ عورت کی ایک غیر مرد کے ساتھ فرار ہونے کی سزا موت کے سوائے کچھ نہیں ہے۔ اس لئے وہ کنویں میں چھلانگ لگا کر جان دینا چاہتی ہے۔ مگر عین وقت پر مستقیم اس کو بچا لیتا ہے اور اس کے کردار میں باغیانہ پن کو ابھرنے اور قدامت پرستی کو دفع کرنے میں مدد دیتا ہے۔ آخرکار قدسیہ فرار ہو جاتی ہے۔ مگر قدسیہ اور شبیر حسن کی شادی میں کئی رکاوٹیں آن پڑتی ہیں۔ اپنے شوہر سے طلاق لینے کا مسئلہ، طلاق نہ ملنے پر مذہب بدلنے کو کہا گیا۔ قدسیہ شبیر حسن سے شادی کرنے کے لیئے عیسائی بننے کے لیئے بھی تیار ہو جاتی ہے۔ مذہب بدلنے میں بھی رکاوٹیں آن پڑتی ہیں۔ مستقیم کی مدد سے قدسیہ تمام رکاوٹوں کو توڑ کر شبیر حسن کے ساتھ خوشگوار ازدواجی زندگی گزارنے لگتی ہے۔ یہاں اس کا سفر مکمل ہو جاتا ہے۔ یہاں عصمت یہ بتانا چاہتی ہیں کہ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو تمام سماجی، اخلاقی اور مذہبی قدروں سے بالاتر ہے۔ یہ خود ایک مکمل زندگی ہے ایک مکمل عبادت۔ عصمت قدسیہ کے کردار کے بارے میں کہتی ہیں کہ

"وہ کچلی ہوئی عورت ہے جو ہزاروں ایسی بیٹھی ہوئی دکھ اٹھا رہی ہیں
جن کے میاں انہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ دکھ دیتے ہیں۔ میں ان سے
یہ کہنا چاہتی ہوں کہ کسی کی پرواہ نہ کرو اپنی زندگی آپ بناؤ خود جیو۔"

عصمت کو جس نے خود مجبور کیا ہے اس کے زخموں کا ذہنی علاج
کرسکتی ہے ۱ھ

چنانچہ اس نظریہ کو عصمت نے قدسیہ کے کردار میں سمو کر بتایا ہے کہ کیسے وہ سماج سے بغاوت کرکے اپنی زندگی آپ بناتی ہے۔ قدسیہ کی شادی کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ

"میں ایسی شادی میں یقین نہیں رکھتی جیسی کہ قدسیہ کی پہلی شادی ہوئی تھی۔ بلکہ ایسی شادی میں یقین رکھتی ہوں جو کہ محبت سے کی جاتی ہے (یعنی قدسیہ کی دوسری شادی جو شبیر حسن سے ہوتی ہے) اور زیادہ نباہی جاتی ہے۔ خواہ مذہب اسے ناجائز کہے" ۲ھ

کچھ عرصے کے بعد قدسیہ کی جوان لڑکی رقیہ دادی سے ملتی ہے اور اپنے والدین کی بغاوت اور ان کے جذبات کی بہت قدر کرتی ہے۔ ہمارے سماج میں شادی بیاہ اور طلاق کی نوعیت اور اہمیت کا مذاق اڑاتی ہے۔ اور اپنے لئے منتقم جیسے چاہنے والے کی خواہش ظاہر کرتی ہے۔ شرعی لحاظ سے دیکھا جائے تو رقیہ قدسیہ اور شبیر حسن کی ناجائز اولاد ہے کیونکہ قدسیہ اپنے شوہر سے طلاق لئے بغیر شبیر حسن سے شادی کر لیتی ہے مگر عصمت کا کہنا ہے کہ۔

"رقیہ میرے IMAGINATION کی ہیروئن ہے کہ لڑکی کے حرام حلال کو نہیں دیکھنا چاہیئے اس کے پیچھے یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ محبت کی اولاد ہے یا زبردستی کی ۳ھ

یہاں عصمت نے رقیہ کے کردار کے ذریعہ جدید نسل کے ذہن کی نمائندگی کی ہے اور ایک GENERATION — GAP میں خیالات اور تصورات کے ساتھ اخلاقی قدروں میں جو تبدیلی رونما ہوئی ہے اس کا اظہار کر دیا ہے۔ ایک نسل کا اختلاف یہی ہے۔

بحث کے آخر میں اس انکشاف کا اظہار لازمی ہے کہ قدسیہ کا کردار عصمت کی روایت ۴ھ کے مطابق ان کی اپنی حقیقی خالہ کا کردار ہے اس ناولٹ میں ہونے والی رقیہ

۱ھ ۲ھ ۳ھ ۴ھ عصمت سے راقم کا انٹرویو ٹیپ ریکارڈ بمبئی مورخہ [illegible]

کے پٹھانی بوا ' الف ' نانی بی ' بادی ' ساس ' مسلم ' شیریں ' حفیظہ وغیرہ سب کے سب کردار حقیقی ہیں البتہ پٹھانی بوا کے نام میں تبدیلی ہوئی ہے۔

" کاغذی ہے پیرہن " لکھتے ہیں عصمت نے جس کردار کا ذکر شیخانی بوا کہہ کر کیا ہے بمبئی میں ان کے مکان میں راقم موجود تھے وہ تب بحث اس کردار کو پٹھانی بوا کہتا رہا مگر انہیں اصرار تھا کہ انہوں نے حقیقت میں اس کا نام شیخانی بوا لکھا ہے جو غلط ہے۔ نام کی اس تبدیلی سے قطع نظر یہ کردار ہے جو عصمت کے گھریلو ماحول میں رچ بس گیا تھا۔ غرضیکہ یہ ناولٹ عصمت کے خاندانی ماحول، حالات، واقعات، رسوم و رواج، عقائد اور روایات کو سمجھنے میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔

لے عصمت کی آپ بیتی سلسلہ " آجکل " دہلی ' مارچ ۱۹۷۹ء تا مئی ۱۹۸۰ء

شرائط معمہ ۱- معمہ کی کوئی فیس نہیں لی جائے گی

۲- معمہ صرف شاداب میں چھپے ہوئے فارموں پر قبول کیا جائے گا ۳- انعام صرف صحیح حل پر دیا جائے گا

۴- ایک سے زیادہ صحیح حل ہونے کی صورت میں قرعہ اندازی سے انعام پانے والوں کا تعین کیا جائے گا۔ اور انعام میں ایک سال تک شاداب بھجوایا جائے گا۔

۵- صحیح حل بھیجنے والے بقیہ اصحاب کے نام شاداب (۵۰ فیصد رعایت سے) جاری کیا جائے گا۔

۶- اگر انعام یافتگان پہلے ہی سے شاداب کے خریدار ہوں تو ان کے بتائے ہوئے نام پر شاداب جاری کیا جائیگا

۷- زیر، زبر، پیش کا کوئی لحاظ نہ ہو گا۔

۸- مد سے ایک زائد حرف شمار ہو گا جیسے آدم (اادم) مآل (م اال) آیا (اایا)

۹- " و " ارتقا میں شمار نہیں ہو گا لیکن پڑھا جاتا ہے وہاں ایک حرف گنا جائے گا جیسے کہ خورکشی لائی (ل ا و ی) نیز الف مقصورہ ایک حرف گنا جائے گا۔ جیسے رحمٰن (ر ح م ا ن)

۱۱- جو حروف پڑھے نہیں جاتے وہ شمار بھی نہیں ہوں گے جیسے بالکل (ب ل ک ل)

۱۲- لیلیٰ کو (ل ی ل ا) لکھا جائے گا اور مثلاً کو (م ث ل ن)

۱۳- جس حرف پر تشدید ہو اسے دوبارہ لکھا جائے گا جیسے کنا (ک ن ن ا)

۱۴- بہ پہ تہ ٹہ ثہ کہ گہ جہ چہ ایک حرف شمار ہوں گے مگر دھ دکھ دوحرف (ادارہ)

ڈاکٹر عبدالعلی
ایم ڈی ایف اے سی سی

امراضِ قلب کا آپریشن بائی پاس کے ذریعے علاج

امراضِ قلب کے آپریشن کے ذریعہ علاج کو عام طور پر بائی پاس سرجری کہا جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں کینسر کے علاوہ موت کی سب سے بڑی وجہ مرضِ قلب ہے جس کا علاج یا تو ادویات سے کیا جاتا ہے یا پھر آپریشن کے ذریعے۔ سب سے پہلے مرضِ قلب کی صحیح تشخیص ضروری ہے۔ سینہ یا چھاتی کا درد سب سے اہم اور پہلی علامت ہے جس کی بناء پر مرضِ قلب کی تشخیص ہوتی ہے۔ سینہ کا درد عام طور سے جسمانی محنت اور تھکن کے بعد شروع ہوتا ہے۔ یہ درد سینہ سے شروع ہو کر گردن بائیں حصہ یا پیٹ کی طرف پھیلتا ہے۔ اس کے ساتھ عموماً سانس پھولنے کی یا پسینہ آنے کا نیز سر میں چکر ہوگا۔ دل کی حرکت تیز ہو سکتی ہے۔ اگر دو یا تین منٹ سے زیادہ درد کی شدت باقی رہے تو مریض کو چاہیئے کہ وہ فوری لیٹ جائے اور طبی مدد حاصل کرے کیونکہ یہ درد دل کے دورے کی پہلی علامت ہو سکتی ہے۔

مرضِ قلب کو پہچاننے کے لیے حسب ذیل امتحانات کئے جاتے ہیں:

۱) ELECTRO CARDIO GRAM. جس سے کسی پرانے حملۂ قلب اور نبض کی تیز رفتاری یا سست رفتاری کا پتہ چلتا ہے۔

۲) STRESS TEST جس میں مریض کو مشین پر دوڑایا جاتا ہے۔ اس سے قلب کی حرکت کی جانچ ہوتی ہے۔ اگر اس ٹسٹ میں مریض کے قلب کی بیماری نمایاں ہو جائے تو پھر

۳) CARONARY ARTERIO GRAM. کیا جاتا ہے جس سے خون کی نالیوں میں رکاوٹ کا پتہ چلتا ہے۔

ڈپلومیٹ امریکن بورڈ آف انٹرنل میڈیسن اینڈ کارڈیالوجی — ہیوسٹن۔ یو۔ ایس۔ اے

جب کسی مریض کے مرض قلب کا پتہ چل جائے تو اس کا علاج دو طریقوں سے ہو سکتا ہے ۔ ایک طریقہ ادویات کے ذریعہ اور دوسرا طریقہ آپریشن کے ذریعہ ۔

ادویات میں INDEROL - NITROGLYCERINE - SORBITRATE وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے ۔ معمولی جسمانی ورزش اور کھانے میں پرہیز ہو یعنی ایسے کھانے کھائے جائیں جن میں آدمی کا وزن کم ہو جائے ۔ چربی والے کھانوں سے احتراز کیا جائے ۔ شکر، نمک، اور ایسے کھانے جن میں CHOLESTEROL زیادہ ہو، پرہیز کیا جائے ۔ سگریٹ نوشی کی ممانعت، بکرے اور بچھڑے کے گوشت کی بجائے مچھلی اور مرغی کا گوشت کھایا جائے ۔ عوام میں ذیابطیس اور ہائی بلڈ پریشر کی پہچان اور ان کا اچھا و موثر علاج ہو ۔ ذہنی الجھنوں سے دوری رہے اور اختیاری منشی چیزیں نہ استعمال کی جائیں ۔

آپریشن اس وقت کیا جاتا ہے جب کہ ادویات سے کوئی فائدہ نہ ہو ——— آپریشن کو CORONARY ARTERY BY PASS کہتے ہیں ۔

اس آپریشن میں خون کی وریدوں کو پیر میں سے کاٹ کر نکالا جاتا ہے ۔ اور دل میں اس طرح لگاتے ہیں کہ دل کی شریان کی رکاوٹ کے اطراف سے خون پھر بہنے لگ جائے ۔ ایک بار یہ آپریشن کامیاب ہو جائے تب مریض کی چھاتی میں درد باقی نہیں رہے گا ۔ اور آئندہ کسی حملۂ قلب کا بھی خوف نہ ہوگا ۔ اس طرح کے کامیاب آپریشن امریکہ میں بہت عام ہو گئے ہیں ۔ ہندوستان میں بمبئی، دہلی اور ویلور میں یہ آپریشن بڑی حد تک کامیابی سے کئے جا رہے ہیں ۔

حیدرآباد میں بھی NIZAM'S ARTHOPADIC HOSPITAL میں اس آپریشن کی ابتدا کرنے کی سعی کی جا رہی ہے ۔

قلب کے آپریشن کا نیا طریقہ بائی پاس سرجری BY PASS SURGERY امریکہ کے ڈاکٹر ڈیبکی اور ڈاکٹر کولی نے ۱۹۶۶ء میں ایجاد کیا ۔ یہ آپریشن عموماً ۲ یا ۳ گھنٹے کا ہوتا ہے ۔

خلیل اکمل

اِنسَاٹ کیا ہے؟

مواصلاتی نظام کو ترقی دینے کا سہرا (ARTHUR CLARK) آرتھر کلارک کے سر ہے جس نے ۱۹۴۵ء میں یہ پیش قیاسی کی تھی کہ دور دراز مقامات سے مواصلاتی ربط پیدا کرنے کے لیے مصنوعی سیارہ (SATELLITE) سے استفادہ کرنا ناگزیر ہوگا۔ چنانچہ ۱۹۶۰ء میں پہلا امریکی سیارہ فضا میں داغا گیا۔ اور کلارک کی پیش قیاسی کے بیس سال کے اندر ہی ۱۹۶۴ء میں جاپان میں منعقدہ اولمپک کھیل امریکی ٹی۔ وی پر دکھائے گئے۔ لیکن اس جدید ٹیکنالوجی کی ضرورت کیوں پیش آئی جب کہ مواصلاتی روایتی ذرائع اپنی کارکردگی حسب معمول انجام دے رہے تھے۔ حالانکہ پہلا اٹلانٹک ٹیلی گراف ۱۸۶۶ء والے سمندر پار پیام رسانی کا کام کر رہا تھا۔ دراصل کوشش یہ تھی کہ انسانی آواز کو ریڈیو سے مربوط کر کے دوسرے مقامات کو پہنچا کر وقت کی بچت کی جائے۔

ریڈیو کی لہریں جو خط مستقیم میں حرکت کرتی ہیں ان کو زمین پر منعکس کرنے کے لیے (IONOSPHERE) سے مدد لی جاتی ہے۔ جو زمین سے ۹۶ کیلو میٹر اونچائی پر واقع ہے۔ اس طریقے سے ریڈیو کی لہریں زمین پر انعکاس کے دوران ایک سیکنڈ میں ۱۲ ہزار (CYCLES) کی رفتار بڑھ سکتی ہیں۔ اگر انھیں لہروں کو ٹی وی کے لیے استعمال کرنا مقصود ہو تو ان کی رفتار میں ایک ہزار گنا اضافہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے ان لہروں کو MICRO WAVE میں تبدیل کر کے کوئی ایک سو کروڑ تا [illegible] ہزار کروڑ CYCLES کی رفتار حاصل کی جاتی ہے۔ جس سے مواصلاتی نظام کی کارکردگی میں بے پناہ اضافہ ہوتا ہے۔

ہندوستان میں SATELLITE تیار کرنے اور اس کو فضا میں داغنے کی ذمہ داری

سائنٹسٹ - نیشنل ریسرچ لیباریٹری - حیدرآباد

(INDIAN SPACE RESEARCH ORGANISATION) یا ISRO کے محکمہ کو سونپی گئی۔ اس ادارہ کا کام مصنوعی سیارہ کے تمام پہلوؤں جیسے قیمت کا تعین، تیاری اور فنی ٹیکنک کی سہولتیں اور جانچ وغیرہ کا جائزہ لینا ہے۔ چنانچہ ایک سیارہ کی قیمت کا تعین ۱/۲ ۷ کروڑ روپے لگایا گیا۔ جو تقریباً سات سال تک اپنی کارکردگی برقرار رکھ سکتا ہے۔ اس مصنوعی سیارہ کا نام INSAT دیا گیا یعنی INDIAN NATIONAL SATELLITE۔ ترقی یافتہ ممالک جیسے روس، امریکہ اور برطانیہ میں اسی قسم کے مصنوعی سیارے کام کرتے ہیں۔ روس میں MOLNIYA اور ORBITA اور امریکہ میں NTS - 5 ٹی۔وی پروگرام کے لیے جب کہ دفاعی امور کے لیے MANPACK اور برطانیہ میں امریکہ کے تعاون و اشتراک سے SKYNET سیاروں سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

ISRO کے ادارہ نے امریکہ کی مشہور کمپنیوں جنرل الیکٹرک کمپنی اور ایرکرافٹ کارپوریشن کے اشتراک/تجربات سے اس امر کا مطالعہ کیا کہ ہندوستان کے لیے کس قسم کے سٹیلائٹ موزوں ہو سکتے ہیں۔ اور ان کو کن مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس مطالعہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ ہندوستان میں انسات تعلیم عام کرنے کے لیے اچھا ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کو موسمی حالات کی پیش قیاسی اور دور دراز مقامات میں ٹیلی فون رابطہ کی بحالی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یوں تو انسات ان امور کے علاوہ ریڈیو نشریات، دفاع، ڈاک و تار، ریلوے، شہری ہوابازی، جہازرانی اور خبروں کی ترسیل کے لیے بھی مدد و معاون ہے۔

ہندوستان کا پہلا مصنوعی سیارہ INSAT - 1A ۱۰ اپریل ۱۹۸۲ء دوپہر ۱۲ بج کر ۷ منٹ بمقام کینیڈی اسپیس سنٹر فلوریڈا سے داغا گیا جو زمین کے مدار میں صرف ۹ منٹ بعد داخل ہوا۔ اس کی پرواز کا سہرا پروفیسر ستیش دھون کے سر ہے۔ جو خلائی تحقیق کے محکمے کے صدر نشین ہیں۔ اس پہلے مصنوعی سیارہ کا وزن ۱۱۵۰ کیلو گرام تھا جس کو امریکن FORD AEROSPACE CORPORATION نے تیار کیا تھا۔ اس سیارہ کو زمین سے کنٹرول کرنے کے لیے HASAN (کرناٹک) کے مقام پر ایک اسٹیشن قائم کیا گیا۔ اس سیارہ میں چند فنی خرابیوں کے باعث اس کی کارکردگی متاثر ہوئی۔ اس کے بعد دوسرا مصنوعی سیارہ INSAT - 1B ۳۰ اگست ۱۹۸۳ء کو فضا میں داغا گیا جو آج تک اپنی بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اور اسی کی وجہ سے ہم اپنے قومی اور تفریحی پروگراموں سے گھر بیٹھے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

اور اسی سیارے سے اب تک کوئی ۱۲ ہزار ٹیلی فون رابطے دور دراز مقامات سے قائم ہو چکے ہیں اور امید ہے کہ بہت جلد یہ رابطے بہت زیادہ بڑھ جائیں گے۔

ہندوستان میں بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر تعلیم کو عام کرنے میں کئی معاشی مسائل در پیش ہیں۔
مدارس کا قیام، تربیت یافتہ اساتذہ کا انتظام وغیرہ۔ لیکن انسات کی مدد سے ان مسائل کی ایک بڑی
یسوئی ممکن نظر آتی ہے۔ انسات کی مدد سے تعلیم بالغان، زرعی تعلیم، خاندانی منصوبہ بندی، بنیادی
یہ سائنس، ریاضی، حیاتیات وغیرہ کے علاوہ ملک کی مختلف زبانیں بھی سکھائی جا سکتی ہیں۔ اس
تعلیم میں ایک سہولت یہ ہے کہ اس سے قلیل وقت میں کسی بھی مضمون کے مختلف امور کا جائزہ لیا جا سکتا
مثلاً پودوں کے اقسام، ان کی نشوونما اور افزائش سے تعلق ہے کا اس روم میں بیک وقت یہ تمام چیزیں
ناممکن ہے۔ لیکن انسات کی مدد سے یہ سب کچھ پڑھانا بہت آسان ہے۔ انسات تعلیمی معیار میں
رہا ہے، اساتذہ کی کمی کو پورا کرتا ہے۔ خواندگی کو عام کرتا ہے۔ چنانچہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
لیم کے حصول کو آسان بنانے کے لیے ایک باقاعدہ پروگرام شروع کیا ہے جو روزانہ انسات کی مدد سے
پر ۳ تا ۴ بجے شام دکھایا جاتا ہے۔ اس پروگرام کو مزید وسعت اور دیگر مواصلاتی نظام
ن دینے کے لیے INSAT - IC سنہ ۱۹۸۶ء میں داغا جائے گا جس سے ہماری زندگی میں ایک اور
ب کا اضافہ ہوگا۔

صحیح حل شاداب علمی معمہ ۱



قاضی جلیل احمد

البدر

بساطِ سیاست پر مہروں کی گردش

مصر اور شام کی اس متحدہ یلغار نے صدر مقامات عالم میں ہلچل مچا دی۔ گمان غالب یہی تھا کہ اسرائیل نے پہل کی ہوگی۔ چنانچہ کئی گھنٹوں تک کسنجر بھی یہی سمجھ کر اسی غلط فہمی میں رہا۔ جب نیویارک ٹائمز کے مطابق صبح چھ بجے اسٹیٹ سکریٹری جوزف سسکو نے اسے ہوٹل والڈارف ٹاورس میں نیند سے بیدار کر کے یہ خبر سنائی کہ کسی بھی لمحے عرب اور اسرائیل کے درمیان جنگ چھڑنے کا امکان ہے۔ کسنجر نے اس اطلاع کو باور کرنے سے انکار کر دیا اور ٹیلی فون اٹھا کر خود ہی سمت آگاہی سے رابطہ شروع کر دیا۔ [illegible] نے سسکو کی دی ہوئی خبر کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ شام اور مصر کی سرحدوں پر عرب فوجیں جارحانہ انداز میں [illegible] کسی بھی لمحے اسرائیل پر حملہ کر سکتا ہے۔ کسنجر نے وائٹ ہاؤس سے رابطہ قائم کر کے [illegible] ڈاکٹر زیلیات کو طلب کر کے ذیل کی ایسی [illegible] ترین صورت حال پیدا ہو سکتی ہے [illegible] کا اصل یہ تھا کہ عرب حملہ کر کے سخت [illegible] ہو کر چند ہی [illegible] جب ہو جائے گی تو پھر عربوں کو بھاگنے کے لیے بھی جگہ نہیں ملے گی۔ [illegible] ان میں نہیں [illegible] کے الحیات [illegible] بندی قبول کر کے ابتدائے جنگ سرحدوں کو واپس ہونے پر رضامند ہو جائیں [illegible] اندیشہ [illegible] کے تابع ہو جائے گا۔ ڈاکٹر زیلیات نے اس [illegible] جنگ کی [illegible] مصر کی طرف سے نہیں بلکہ اسرائیل کی طرف سے ہوئی ہے [illegible] جنگ چھڑی اس وقت تک [illegible] چند گھنٹے سے پہلے کی سرحدوں کو واپس ہونے پر [illegible] کوشش کے اور اندھیر اسرائیل کی [illegible] فوجیں

جنگ ہو سکتی ہے تو پھر مصر و شام کے لیے مزید قدم جمائے رکھنا ناممکن ہو جائے گا۔ اور وہ دوبارہ ایک بار نمایاں شکست سے دوچار ہو جائیں گے۔ اسرائیل کچھ اور علاقے پر قابض ہو جائے گا۔ اور اس سے ان علاقوں کو خالی کرانا اور بھی مشکل ہو جائے گا۔ عرب اسرائیل تنازعہ بدستور قائم رہے گا اور امریکہ کے لیے عرب ملکوں میں اپنے مفادات کی حفاظت اور مشکل ہو جائے گی۔ دوسری طرف روس عربوں کا دوست بن کر اس علاقے میں اپنی جڑیں اور مضبوط کر لے گا۔

کیسنجر کی دوسری اہم ملاقات اس عہد روسی سفیر دوبرینن سے ہوئی۔ کیسنجر نے ڈیٹانٹ کی بحالی کے بعد روس اور عرب گٹھ جوڑ کی شکایت کی اور کہا کہ روس کی اس حرکت کو امریکہ ڈیٹانٹ کے معاہدے کی خلاف ورزی قرار دیتا ہے۔ اس کے جواب میں دوبرینن نے روس اور عرب گٹھ جوڑ کے الزام کو بالکل غلط اور مہمل قرار دیا اور کہا کہ مڈل ایسٹ میں جنگ کے شعلے بھڑک اٹھنے پر روس کو بھی اتنی ہی تشویش ہے جتنی امریکہ کو ہو سکتی ہے۔ اور جنگ بندی کے لیے امریکہ سے مکمل تعاون کی پیشکش کی۔ ویسے بھی کیسنجر کی یہ شکایت محض بہانہ ہی تھی اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس سلسلے میں روس کی طرف سے مصر و شام کی ہرگز کوئی ہمت افزائی نہیں ہوئی ہے اور اب جنگ بندی میں تعاون کی پیشکش نے رہا سہا شبہ بھی دور کر دیا۔

ادھر دنیائے عرب میں حملے کی خبر نے امید و بیم کی حالت پیدا کر دی تھی۔ سبھی کو اس بات کی خوشی تھی کہ برسوں سے سوئے ہوئے مصر و شام نے پھر ایک بار زندگی کا ثبوت تو دیا۔ لیکن کسی کو امید نہ تھی کہ یہ دونوں جنگ میں کوئی قابل لحاظ کامیابی حاصل کر سکیں گے۔ ہر شخص بس یہی چاہتا تھا کہ فتح نہ سہی ویسی ذلت بھی نہ اٹھانی پڑے جیسی ۱۹۶۷ء کی جنگ میں مصر شام اور اردن نے اٹھائی تھی۔ اسی لیے جب آہستہ آہستہ مصر و شام کی ابتدائی فتوحات کی داستانیں اخبارات میں شائع ہونے لگیں اور معلوم ہوا کہ اسرائیل کے غیر مفتوح اور ناقابل تسخیر ہونے کا تصور بھی دو جنگوں کے ملبے سے زمین بوس کیا جا سکتا ہے تو ان کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ دنیائے عرب سے پیغامات تہنیت و تبریک کا سیلاب امنڈ پڑا۔ سادات کو سب سے پہلا پیغام عراق کے صدر البکر نے بھیجا جس میں پیغام تہنیت و مبارک فتح مندی کے بعد جنگ میں مکمل تائید اور قربانی کی پیشکش کی گئی تھی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے سارے ہی صدور و سربراہان عرب کے پیغامات سادات اور اسد کو پہنچے تھے۔ اگر کہیں سے کوئی پیغام موصول نہیں ہوا تو وہ لیبیا تھا۔ لیبیا نے نہ صرف یہ کہ کوئی پیغام تبریک نہیں بھیجا بلکہ قذافی نے ٹیلی فون پر اس امر کا اندیشہ بھی ظاہر کیا کہ ان ابتدائی کامیابیوں کے باوجود عرب کہیں مہلک شکست سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قذافی اس سلوک سے بے حد ناخوش تھا جو اس کے ساتھ برتا گیا۔ اسے دو طرفہ جنگ کی منصوبہ بندی میں شریک نہیں کیا گیا بلکہ آخر تک بے خبر رکھا گیا

چھپائی گئی۔ ممکن ہے اس خیال میں بڑی حد تک صداقت بھی ہو۔ لیکن بہرحال قذافی نے جو کچھ کہا وہ حرف بحرف پورا ہوا۔ لیکن پیغام مبارک باد بھیجنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ لیبیا اس جنگ میں محض خاموش تماشائی بنا رہا۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قذافی نے اپنی ناراضی کے باوجود جو کچھ کیا اس سے اکثر اہلِ عرب غافل ہیں۔ جنگ کے شروع ہوتے ہی قذافی نے فرانس سے اپنے معاہدات کی پرواہ کئے بغیر میراج طیارے، فرنچ ٹینک اور لیبیا کی فوج کے تربیت یافتہ دستے آرمرڈ کار اور دیگر سامانِ جنگ فی الفور مصر کو روانہ کر دیا۔ ساتھ ہی سیول اور ملٹری ڈاکٹر اور اسٹورز کو دواؤں اور غذائی اشیاء سے خالی کر کے ایک ایک چیز جنگی امداد کے لیے روانہ کر دی۔ مصر کو اختیار دیا گیا کہ جتنا چاہے پٹرول اپنی ضرورت کے لیے لیبیا سے حاصل کر سکتا ہے۔

سعودی عرب اور کویت نے بیش بہا رقمی امداد کے اعلان کیے۔ اسی طرح سارے غیر جانب دار ممالک نے عرب موقف کی تائید کی۔ اور اپنے بیانات میں زور دیا کہ اسرائیل نے ۱۹۶۷ء کی جارحیت کے ذریعہ جن علاقوں پر قبضہ کیا ہے فوری ان کے تخلیہ پر رضامند ہو جائے۔ قاہرہ اور دمشق میں بلا کا جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ لوگ فوجی بھرتی کے مراکز پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ ہر شخص ہر قسم کی قربانی دینے تیار تھا اور جنگ میں عرب فوجیں یکے بعد دیگرے میدان کی کامیابیاں حاصل کرتی چلی جا رہی تھیں۔

لیکن عین اس وقت جب کہ مصری فوجیں کامیابی کے پھریرے اڑاتی نہر سویز کو عبور کر کے بارلیو لائن پر قیامت ڈھا رہی تھیں، روس کا باقی سیول اور ملٹری ٹیکنیشینس کا عملہ تیزی سے ملک کے تخلیہ میں مصروف تھا۔ روسی بحری اور ہوائی جہاز پوری مستعدی کے ساتھ اس تخلیہ میں سرگرم عمل تھے۔ ہوا یہ کہ آغاز جنگ سے کچھ روز قبل سادات اور اس کے مصلاح کاروں نے طے کیا کہ روس کو اس معاملہ میں بالکل ہی اندھیرے میں رکھنا مناسب نہ ہوگا۔ چنانچہ بریژنیف کے نام ایک خط روانہ کیا گیا کہ پر امن ذرائع سے اسرائیل کو علاقوں کی واپسی پر آمادہ کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ اس لیے مصر نے طے کیا ہے کہ سویز کے محاذ پر دوبارہ جنگی سرگرمیاں تیز کی جائیں۔ جواب میں روس نے کہا کہ مصر ہمیشہ سوویٹ یونین کی بھرپور تائید اور مدد پر بھروسہ کر سکتا ہے۔ البتہ جس کام کے لیے روسی ماہرین روانہ کیے گئے تھے وہ پورا ہو چکا ہے اس لیے ان کی واپسی متعین کیا جائے۔ چنانچہ تخلیہ شروع ہو گیا۔ اور جنگ کی ابتدائی کامیابیوں کے بعد سادات کے پیام تشکر کے جواب میں مبارک باد کے ساتھ ہی ساتھ تاکید دہرائی گئی کہ روسی ماہرین کے مصر سے تخلیہ میں پوری مدد کی جائے۔ اور سادات ایک سکتے میں پڑ گیا کہ تخلیہ میں اس عجلت کی وجہ کیا ہے؟ کیا سوویٹ یونین مصر کا ساتھ منجدھار میں چھوڑ کر خود الگ ہونا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر غلام کبریا خاں شبلی

جو دُم ہوتی تو کیا ہوتا !؟

خالق احسن کی مخلوقات میں شاید ہی کوئی مخلوق نسیان کاری اور خود فراموشی میں
ف المخلوقات سے بازی لے جا سکے ۔ ذرا سوچئے کانوں کو حرکت دینے کی صلاحیت کتنی
رتھی ۔ مگر ہم نے یہ صلاحیت کھو دی ۔ صدیاں گذر گئیں مگر ہمارے کانوں پر جوں تک نہ رینگی
نا کا محض صرف گوشمالی رہ گیا ہے ۔ اسی طرح ہم سے جلد کو حرکت دینے کی مفید
حیت بھی چھین لی گئی ہے ۔ کان اور جلد کو حرکت دینے والے عضلات موجود آج بھی
مگر عدم استعمال کی وجہ سے ناکارگی کی میٹھی نیند سو گئے ہیں مگر ہم غفلت کی نیند سے
نکلے ۔ آنکھوں میں ایک تیسرا پپوٹا بھی تھا ۔ جھلی جیسا ' بڑی حد تک شفاف ' پرندوں
نکھوں میں یہ آج بھی پایا جاتا ہے Nictitating Membrane اسے
جاتا ہے ۔ یہ آنکھوں کو گرد و غبار سے بچایا کرتا تھا ۔ مگر آج ہماری آنکھوں میں اسکے
ے باقی ماندہ آثار ہی ہیں ۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے بمصداق حضرتِ انسان نے اپنی
"لیا پر پردہ ڈالنے کیلئے ان اعضاء اور عضلات کو " ناکارہ اعضاء Vestigeal
Organs " کا نام دیا ہے ۔ غرض کس کس محرومی کا رونا رویا جائے مرورِ زمانہ
ردش ایام نے حضرت انسان کو بے بنانے تساہل اہمیت من عظیم نعمتوں سے محروم کیا ہے
ں ایک " دُم " بھی ہے ۔ آپ ذرا دل کو اکم تھیاں دیں گر تشریح الاعضاء کے علمی
ں آپکو بتائینگے کہ آپ کی ریڑھ کی ہڈی کا آخری فقرہ ' دم " ہی سے متعلق ہے اسلئے
ے Caudal Vertebr کہا جاتا ہے تعصب سے پاک کھلے ذہن سے

انجمن جونیر کالج ۔ کھامگاؤں ۔ ضلع بلڈانہ ۔ مہاراشٹرا

سوچیے کہ "دم" کے چھن جانے سے بشر کیسی نعمت عظمیٰ سے محروم ہو گیا ہے۔ دم کے ادبی، ثقافتی، تہذیبی، معاشی، معاشرتی بلکہ تاریخی اثرات کتنے گہرے ہوتے۔ آئیے ذرا جائزہ لیں۔

آج کے محاوراتی ادب میں ناک کو جو مقام حاصل ہے وہ دراصل دم کا جائز حق تھا، جو اسکے نہ ہونے کی وجہ سے ناک دبا بیٹھی۔ بات بے بات میں، فرد، خاندان، ملک و قوم کی اجتماعی طور پر جو ناک کٹتی رہتی ہے، شائد یوں ہوتی کہ فلاں صاحب/صاحبہ نے خاندان دیا دیے بیمانہ پہ ملک و قوم کی دم کٹوا دی۔ اسی طرح دم ہلانا یا دم دبا کر یا دم پہ پیر دینا صرف محاورے نہ ہوتے۔ سر کی آنکھوں سے دیکھے جانے والے حقائق ہوتے۔ دم کسی لومڑی کی طرف تمثیل نہ ہوتی ایک ٹھوس حقیقت ہوتی۔ کسی معاملے میں ٹانگ اڑانا یا ناک گھسیڑنا (To poke nose) بری بات ہے۔ دم کی موجودگی ٹانگ اور ناک دونوں کو اس زحمت سے بچالیتی۔ دم اڑانا یا دم گھسیڑنا محاورہ سر کو بھی اٹھانے یا جھکانے کے بوجھ سے نجات مل جاتی۔ یہ بوجھ دم کے سر جاتا کہ

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ دم تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

سر اٹھا کر چلنا کی بجائے دم اٹھا کر چلنا علو ہمتی کی علامت ہوتی۔ اظہار ندامت یا اظہار اطاعت کے طور پر کسی کے حضور سر جھکانا ضروری نہ ہوتا دم جھکانا کافی ہوتا۔ یا مراد کہتا "دم تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے" اسی طرح کہیں آتش زیر پا کی بجائے آتش زیر دم کا محاورہ چل نکلتا تو ادب لیا آتش آشنا ہوتا کہ بھاگنے کو ہے۔

شعرا حضرات طول شب ہجراں کو زلف محبوب کی بجائے دنبالہ معشوق سے نا نرگسی چشم سرمگیں یا کنول جیسے نین کٹوروں میں سرمہ یا کاجل کی دنبالہ دار تحریر ہی دامن د نہ کھینچتی۔ دنبالہ محبوب ہی طائر دل کو پھنسا کر بھاگتی اور زلف گرہ گیر بخشش پا لیتا سو فیصد یعنی بر حقیقت شعر یہ تو ہو پاتا کہ

بلکہ میاں کا دم جو پکڑتی ہے بات کو
سب دیکھ دیکھ اسکو بجاتے ہیں تالیاں

اور شعرا کے یہاں ہمارے مستقیف ہونے کے فرق سے پھول کر لائیں بن جاتے۔ فخر شیراز
زلف کے لہرانے کی بجائے دُم کے لہرانے کو خوشبو کہتے۔ مجاز کہتے ہیں تو اپنی دم کٹا کر
پرچم بنا لیں تو اچھا تھا دُم کی موجودگی میں چند مشاہیر شعرا کے اشعار کچھ یوں ہوتے۔

غالب:۔ تماشا کہ اے محوِ آئینہ داری
تیری کس تمنا سے دُم دیکھتے ہیں

جب تک کہ نہ دیکھا تھا دُمِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

مر گیا لیک جنبشِ دم سے مجنوں
ناتوانی سے حریفِ دُمِ لیلیٰ نہ ہوا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیئے
جامۂ انساں سے باہر ہے دُم انساں کی

کیا ہی حوروں سے لڑائی ہوگی
دم تری خلد میں گر یاد آئی

میر:۔ ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے دمداری کی
چاہیں جسے آپ ہی موڑیں دم کو عبث بدنام کیا

نازکی اس کی دم کی کیا کہیے
ریشمی زلفِ یار جیسے

مظہر جانِ جاناں:۔ یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتی تمہی زلف اپنی دم اپنی جانِ جاں اپنا

درد:۔ سر تا بہ دم زباں ہیں جوں شمع گو کہ ہم
پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں

ظفر:۔ سکے یوں تو ہزاروں ہی تیرِ ستم، کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
ولے دم کے ناوکِ کرشمہ کی تیغ لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

داغ:۔ مجھے یاد کرنے سے یہ مدعا تھا
کہ کٹ جائے دم ہچکیاں آتے آتے

حسرت:۔ ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت
اب آگے تیری خوشی ہے جو دم ملا کرے

میر حسن:۔ کوئی دم کو اپنی پٹخنے لگی
کوئی دُم کو پیچ اپنی دینے لگی

جگر:۔ دل گیا رونقِ حیات گئی
دُم گئی ساری کائنات گئی

اقبال:۔ کچھ قدر دم کی تم نے نہ جانی
یہ بے سوادی یہ کم نگاہی

اگر معتبر یا منزہ ہونے کے لیے طلوع کی شرط ہوتی جیسی کہ ہے مگر چونکہ اس کا

تمام تر ذمہ دار عمر ہے اسی لیے ایسی دو چار سال کا گھپلا بھی چل جاتا ہے اصل بالغ ووٹر کا عمر تک بن جاتا ہے، اور بلوغ کا ثبوت دم کی نمود ہوتی۔ الیکشن سے قبل جیتنے والے منسٹر اپنے ووٹروں کے سامنے اور الیکشن کے بعد ووٹر اپنے منتخب کردہ منسٹروں کے سامنے دم ہلا سکیں اور ناگفتہ حالات میں بشرط ضرورت دونوں دم دبا کر بھاگ سکیں تو ووٹر اور منسٹر کی اہلیت سے جو دانشمند جو اپنے بلوغ کا یہ اظہر من الشمس ثبوت مہیا کرنے سے ہنوز قاصر ہوں کچھ محروت اور کچھ بعالم جھلاہٹ شائق مرحوم کے شعر کو یوں پڑھتے ؎

دُم بھی کمبخت دے رہی ہے دُم
اب نکلتی ہوں جب نکلتی ہوں

کہتے ہیں قلوپطرہ کی ناک ایک انچ کا سواں حصہ بھی کم و بیش ہوتی تو دنیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ہیلن کی دُم اگر ایک مائکرو ملی میٹر بھی کم یا زیادہ ہوتی تو ٹرائے کی تاریخ کیا ہوتی۔ یا فاتحینِ عالم مثلاً ہلاکو اور چنگیز، سیزر اور سکندر وغیرہم کی دموں کے تاریخ عالم پر کیا اثرات مرتب ہوتے۔ آنجہانی چرچل کی دم کا ہندوستانیوں کی صحت اور ہندوستان کی سیاست اور جغرافیہ پر کیا اثر پڑتا۔

اسی طرح رومیو جولیٹ، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور نل دمن کی دُمیں نہ جانے کیسی کیسی رومانی کہانیاں تصنیف کرتیں جن سے آج کا رومانی ادب تہی دامن ہے۔

دُم آج کی بیروزگاری کا بہترین حل اور علاج ثابت ہوتی۔ دُم کتنی ہی مفید صنعتوں اور حرفتوں کی ماں بنتی۔ مثلاً دم کے لیے طرح طرح کے زیورات بنتے۔ انگشتری یا انگوٹھی کی طرح دنبالری یا دموٹھی اور نیک لیس کی طرح ٹیل لیس بنتے۔ ایئر رنگ کے جواب میں ٹیل رنگ تخلیق ہوتے۔ پازیب کے وزن پر دُم زیب وجود میں آتے، دُم کیلئے نئی تراش خراش اور عجیب وضع قطع کے لباس بنتے، سر کے بالوں کے لیے ہی نہیں دُم کے لیے بھی موباف، ربن اور جھومر تخلیق ہوتے۔ دُم کے بالوں کی آرائش کے نئے نئے اسٹائل جنم لیتے۔ سر کے اوپر پونی ٹیل pony tail کی نقل نہ ہوتی ریڑھ کی ہڈی کے نیچے اپنی اصلیت کے ساتھ جلوہ گر ہوتی۔ گاؤدُم، اسپی، لومڑیہ، بزدُم، گلہری نما اور نہ جانے کیسے کیسے اسٹائل ہیر ڈریسرز تخلیق کرتے۔ اداکار اور اداکارائیں اپنی اپنی دموں کو مخصوص

پیرا شائل کی بناء پر شناخت ہوتے اور فطرے ان کی نقل کرتے ۔ رقاصہ کے پیروں میں گھنگرو جل ترنگ سے بجتے گئے اس فن میں کمال فن کے لیے ضروری ہوتا کہ جھکتے اعضاء کے ساتھ ساتھ دُم بھی موسیقی کے سر تال سے ہم آہنگ ہو ۔ مغنی کے فن کی معراج یہ شرط کر اس کے حلق سے نکلے راگوں کو جو سر نکل رہے ہیں ان کی لہر دُم کی نوک تک پہنچے ۔ آرکسٹرا میں بھی دُم سے بجایا جانے والا کوئی نہ کوئی ساز حضرت امیر خسرو ضرور ایجاد کرتے ۔ اس طرح زرگری و زیور سازی ، پارچہ بافی ، پیرفیومنگ اور علم و موسیقی کی صنعتوں میں عظیم انقلاب آجاتا اور روزی روٹی کا مسئلہ حل ہو جاتا ۔

چوپایوں میں توازن کا مسئلہ اتنا نازک نہیں ہوتا جتنا دو پایوں میں ۔ انسان نے ایک حماقت تو یہ کی کہ چاروں پیروں کی بجائے دو پیروں پر چلنا شروع کر دیا اور اس پر مزید حماقت یہ کی کہ دُم کو طلاقِ مغلظہ دیدی اسطرح جسمانی (اور شاید ذہنی) طور پر بہت ہی غیر متوازن ہو گیا ہے ۔ دُم کی موجودگی بہتر توازن کی ضامن ہوتی ہے ۔ ہمارا انسان طویل اور اونچی چھلانگیں لگانے پر قادر ہوتا ۔ دم کے ساتھ لانگ جمپ اور ہائی جمپ کے اولمپک عالمی ریکارڈ موجودہ بے دُمی ریکارڈوں سے بہتر ہوتے ۔ والی بال ، فٹ بال ، ہاکی اور باسکٹ بال کی طرح اولمپک میں ٹیل بال نام کا بھی کوئی کھیل شامل ہوتا ۔ روایتی ناردن کو اگر دم بھی ملتی تو وہ اور زیادہ شاندار کارنامے انجام دے سکتا تھا ۔ انسان دوڑ کر درختوں پر چڑھ سکتا اور طویل چھلانگ لگا سکتا ۔ لفٹ اور سیڑھیوں کی ضرورت نہ ہوتی ۔ دنیا کی رونق اور حسن فزوں ہو جاتا ۔ ہمارا انسانی چھلانگ ہی کی طرح تمنا نے بشر کی چھلانگ بھی بڑھ جاتی اور غالب کو دشت امکاں والے مضمون سے دستبردار ہونا پڑتا کیونکہ یہاں نقش پا والی بات پیدا نہ ہوتی ۔ ہمارا تمنا کی چھلانگ تو دم کے ایک سرے سے دوسرے سرے ہوتی جس کے بیچ دشت امکاں واقع ہے یہ بیچارا تو نقش پا کیلئے بھی ترستا رہ جاتا ۔

شادی بیاہ کے موقعوں پر ناک نقشہ رنگ روپ کا قد کے ساتھ دم بھی موضوع بنتی اور کچھ اس طرح کے مکالمے سنائی دیتے "لڑکا سب ٹھیک ہے لیکن دم ذرا چھوٹی دکھائی دیتی ہے ۔ اس سب کچھ دینے کیلئے لڑکی والے کیسی دم بنا کے

ہوا - میں تو کیوں یونہی سوچ رہی ہوں مگر دم بہت پیاری ہوتی ہوگی

ملنے سے بچتا! آ گیا قیامت ٹوٹ پڑی اس سے زیادہ مضحکہ خیز صورت حال
کرچکی ہیں یا نہیں۔ پھر اس کا علاج بھی ممکن ہے۔ "داغ تو چاند میں بھی ہوتا ہے"
یہ سچ ہے مگر داغ ایسے کہ گہن بن جائے تو چاند کا حسن کہاں! اگر کالجوں میں رکھنے
کے باوجود بھی کہ دم سیدھی نہ ہوئی تو طلبا سے ... خاطر کی دم کٹ جائیگی کہ
نہیں۔ اللہ رکھے میرے لال کو لڑکیوں کا کیا کمی ہے۔ لیکن ایک معیار ضرور موجود
ہے" یا یہ کہ "بعض لڑکے کی شخصیت کو دم کے کنگھی پن نے گھٹا دیا" کنگھی کرنے کے گرد
برہمن کے شلوکوں کی جاپ کی تال پر سات پھیرے لگاتے وقت دولہا دلہن کے دامن ایک
دوسرے سے باندھنے کی بجائے ان کی دموں کو باہم باندھنا زیادہ مناسب اور معنی خیز
ہوتا۔ ضرورت رشتہ کے اشتہاروں میں دم کے متعلق تفصیلات ضروری ہوتیں۔ اس قسم کے
اشتہار بھی نظر افروز ہوتے کہ دم درازی کے لئے بہترین کورس، پانچ ہفتوں میں اپنی دم
میں پانچ انچ کا اضافہ کیجئے۔ یا "دم کے کنگھی پن کا شرطیہ علاج" یا "دم بھی لاغر اگر
نہ ہو غالب تو۔ تندرستی ہزار نعمت ہے"۔ فربہ اور صحت مند دم کے لئے استعمال کیجئے۔
آزمودہ مشہور عالم دنبالہ پرور ٹانک" وغیرہ وغیرہ۔

پولیس، فوج اور سول سروس کیلئے جہاں سینہ، قد، وزن اور تعلیمی قابلیت کا ایک
معیار مقرر ہے۔ دم کی لمبائی کا بھی ایک خاص معیار ضروری ہوتا۔ کسی چیز کو باندھنے سے
گٹھری بنائی ہے۔ رسی دستیاب نہیں۔ دم لپیٹ لیجئے، کسی محفل میں فرش یا کسی قسم کی نشست
کا انتظام نہیں اور نفاست پسندی فرش خاک پر بیٹھنے میں مانع ہے۔ کوئی فکر نہیں
اپنی دراز دم کا مرغولہ بنا کر بیٹھ لیجئے۔ صوفے پر یہ آرام کہاں۔ محفل ختم ہوئی دم جھاڑ کر
اٹھ کھڑے ہوئے۔ دراز دم تو ایسے مواقع پر نشست کی قائم مقام ہوتی۔ اسی لئے صدر
اسکو بنایا جاتا جس کی دم سب سے لمبی ہو۔ چاہے عقل کوتاہ ہی کیوں نہ ہو۔ جماعت میں
تختہ سیاہ صاف کرنے کا کوئی معقول یا نامعقول انتظام نہیں۔ استاد پریشان نہیں ہوتے
دم اٹھا کر تختہ پر جھاڑو پھیر دی۔ دم کو میز پر دو تین مرتبہ جھٹکا کر صاف کر لیا۔ اسی طرح
شروع۔ ایک ... جو ... بیکار ہوتا تھا قلم اٹھاتا ہے اور ... کے سامنے

RESOURCE FUL کاریکارڈ پڑھتا ہے۔

تحقیقات سے ثابت ہے کہ ہاتھ والے نہیں بلکہ دم والے آدمی کی علامت جو کر دستی اور دم میں مخصوص مناسبت رکھتا ہے۔ خودکشی کرنے والوں کے لیے دم نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ ہوتی۔ پھر کا احسان کیوں اٹھاتے۔ اپنی ہی دم کا پھندا اپنی گردن میں ڈال کر آرام سے مر گئے اور گنگناتے جاتے کہ ؎

مرگ منت کشِ زہر نہ ہوئی
موت یوں نہ ہوئی، برا نہ ہوا

لاش نقّالوں پر طنز سے مسکرا رہی ہے اور زبانِ حال سے کہہ رہی ہے ؎

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ زہر نے کام کیا
دیکھا ہماری دم ہی نے آخر اپنا کام تمام کیا

بے شمار وہ کام جو دو ہاتھ اور دو پیر کے باوجود انجام نہیں دیئے جا سکتے۔ دم کی موجودگی میں ممکن ہوتے، شاہنامہ فردوسی کے ہیرو رستم کے زمانے کی کوئی جنگ ہو رہی ہے۔ سپاہی کے ایک ہاتھ میں تلوار ہے دوسرے میں ڈھال نیزہ ہے مگر گنجائش استعمال نہیں۔ دم ہوتی تو ڈھال تھامنے کے کام آتی اور ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں نیزہ سنبھالا جا سکتا۔ کشتوں کے پشتے لگ جاتے اور جتنے سپاہی کام آتے اس سے دگنی تعداد میں کم آتے۔ دنیا کی آبادی خطرناک حد تک نہ بڑھتی۔ Population Explosion نہ ہوتا۔ فیملی پلاننگ دردِ سر نہ بنتی۔

چند مشینوں مثلاً موٹر چلانے میں چاروں ہاتھ پاؤں مصروف ہوتے ہیں۔ دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر، ایک پیر ایکسیلیٹر پر تو دوسرا بریک پر۔ اب اگر موٹر مڑنے کے لیے یا پیچھے آنے والی گاڑی کو آگے بڑھنے کا اشارہ کرنا ہو۔ ہارن بجانا ہو یا گیر بدلنا ہو تو مجبوراً سے ایک ہاتھ ہٹا کر یہ کام انجام دینے پڑتے ہیں۔ اب اگر اکلوتا ہاتھ اسٹیئرنگ نہ تھام سکے بہک جائے تو قیامت کے دن بھلا کیسے اٹھیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ اس دن دونوں ہاتھ اور سارا بدن بھی شکوہ فریاد کر رہے ہوں کہ اپنے ساتھ ہمیں اس قدر ذلیل زیرِ بار کیوں کیا تھا۔ پھر اگر دم موجود ہو تو اس قسم کے مشکلات کم ہو جائیں۔ دم سے کوئی بھی اشارہ کر دیتا۔ دم سے ہارن بجا دیا۔ دم سے گیر بدل لیا۔ دونوں ہاتھ

بہ حق اسپیشرنگ دُنیا محفوظ ۔

تقسیم محترم تلمیذ انتقال فرمانے کے بعد تقریباً فرماتے ہیں۔ مگر سین کی دُم پر کچھ لاتی دھوپ بشنوانی کی ہیں۔ یہ تعقبات بھی اس دور کے مطابق ہیں فرق یہی ہیں۔ ایک بالکل یہی نکتہ ہے دوسرے سے مونگ پھلیاں پھانک رہی ہیں۔ دُم میں پنکھا۔ نہ دبانے پر شور پہنادار پر جس ہوئی ہیں ہوا بھی چل رہی ہے مگس رانی بھی ہو رہی ہے۔ ایسے میں کوئی شریر بچہ شور مچاتا گزرا تو دم کے چار کوڑے اس پر تازیانہ برسا دیئے۔ نہ مطالعہ کا تار ٹوٹا نہ مونگ پھلی سے شغل میں رخنہ پڑا۔

خلاء میں دُم کے لیے نہ جانے کیسے کیسے وسیع امکانات ہوں۔ اس ضمن میں خلا بازوں کی معلومات ہی مستند ہو سکتی ہیں۔

غرض یہ کہ انسانی محرومیوں کی طویل فہرست میں جلی قلم اور سرخ روشنائی سے سرِ فہرست "دم" لکھا ہوا ہے مگر ہم کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے۔

واحسرتا !!

دُم کو ہم شرفِ بشر سمجھے تھے کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ ارتقاء ہو جائے گی

ہائے !!!

ڈھونڈیا دُم نہ ہونے سے ... جو دم ہوتی تو کیا ہوتا۔

□□

ضیاء الدین

سراب

زندگی کی سنگلاخ راہوں پر چلتے چلتے اس کے پیر شل ہو چکے تھے ۔ اُسے فقط سکون کی تلاش
جو نہ جانے زندگی کی کس اجنبی راہ پر چلتے چلتے اس سے چھن گیا تھا ۔ اب تو اُسے یوں
ہونے لگا تھا کہ جیسے اُس کا جسم ہی نہیں روح بھی تھک چکی ہو ۔ جیسے اب وہ کسی بھی لمحے
بکھرنے والا ہو ۔ لیکن اس سے پہلے کہ ایسا ہوتا اُسے اچانک یوں لگا جیسے آسمان کی بلندیوں
سے سورج لڑھک کر اس کے آنگن میں اُتر آیا ہو ۔ اس نے دیکھا کہ اس کے سامنے ایک ہیرا
ہے جس کی چمک اس کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہے ۔ زندگی کے ریگستان نے ایک نایاب
کی طرف اچھال دیا تھا ۔ وہ اس نایاب ہیرے کو اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھنے لگا ۔ ہر پل
وہ اسے سینے سے لگائے رکھتا ۔ وہ اب جلد سے جلد ریگستان سے نکل جانا چاہتا تھا ۔ اُسے
تھا کہیں اس کی ذرا سی غفلت اُسے اس سے محروم نہ کر دے ۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اب ایک
وہ پہلے کی سے کرب مسلسل کا شکار ہو کر بھٹکنے کے لیے مجبور ہو جائے ۔ وہ نامراد مرنا نہیں چاہتا
اس لیے اس کے قدم جلد سے جلد بستیوں کی طرف اٹھنے لگے ۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی اچھے جوہری
سے کو جو کہ اس کی خوشیوں کا ضامن ہے، ترشوا کر اپنے گلے کی زینت بنائے تاکہ اس کی
دہ زندگی اس کی حفاظت اور چاہت میں بسر ہو جائے ۔ جوں جوں بستی قریب آتی گئی ن کے
اندر یہ خوف جاگنے لگا کہ کہیں یہ ہیرا کوئی اس سے چھین نہ لے ۔ مگر ہر بار وہ اپنے اس
جھٹک دیتا ۔ اور آگے ہی آگے بڑھتا جاتا ۔ بالآخر وہ ایک جوہری کے پاس پہنچ گیا
جیب سے ہیرا نکالتے وقت اس کے چہرے پر بلا کا سکون تھا اور ہوتا بھی کیوں نہ ۔ اس
دو جہاں کی دولت اس کی جیب میں تھی ۔ اور پھر کچھ یوں ہوا کہ ہیرا جیب سے نکالتے ہی

ایم۔ اے۔ ایم فل۔ اُردو ڈپارٹمنٹ۔ جموں یونیورسٹی ۔ جموں توی۔

اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اُسے یوں لگا کہ جیسے ہیرے کی چمک بجھ کر رہ گئی ہو۔ شاید یہ تھکان کا اثر ہو۔ اس نے خود کو سمجھاتے ہوئے ہیرا جوہری کی طرف بڑھا دیا۔ جوہری کبھی اس کے چہرے کی طرف اور کبھی اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں موجود شے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ جوہری اس سے کچھ کہتا وہ خود ہی بول پڑا،

"یہ ایک نایاب ہیرا ہے جس کے لیے میں صدیوں سے بھٹکتا رہا ہوں۔ اس کی تلاش میں زندگی کے نہ جانے کتنے ریگستان میں نے پار کئے ہیں۔ نہ جانے کتنی بار میرے پاؤں شل ہوئے ہیں۔ اس قیمتی مگر ناتراشیدہ ہیرے کو اپنی فن کارانہ مہارت سے تراش دیجئے"۔

جوہری نے ہیرا اس کے ہاتھ سے لیا۔ کئی بار الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اور پھر حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ تھکان کی وجہ سے اس کے لیے کھڑا رہنا مشکل تھا۔ اس لیے وہ جوہری کے پاس ہی بیٹھ گیا ــ نیند سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ مگر جب اس نے جوہری کی آنکھوں میں حیرت کے سائے منڈلاتے ہوئے پایا تو اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے پھر کہنے لگا،

"مجھے آپ کی حیرانی پر کوئی تعجب نہیں ہے۔ آپ غالباً یہ سوچ رہے ہوں گے کہ مجھ جیسے فقیر کے پاس یہ نایاب ہیرا کہاں سے آگیا؟ یہ ہیرا میری زندگی بھر کی محرومیوں کا صلہ ہے ــ یہ میری لازوال محبت کا انعام ہے۔ اس ہیرے کا قدر دان اور مالک میں اور صرف میں ہوں"۔

تھکان سے اس کی آنکھیں پھر بند ہونا شروع ہوگئیں۔ اس کی بات سن کر جوہری کے ہونٹوں پر ایک عجیب طرح کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ جس میں طنز بھی تھا اور رحم و ہمدردی بھی۔

پھر تھوڑے توقف کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوا، "جسے تم ہیرا سمجھ کر زندگی کی جیب میں چھپائے پھر رہے ہو، ایک معمولی پتھر ہے۔ اس کے لیے تمہیں زندگی کے ریگ زاروں میں بھٹکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایسے پتھر تو تمہیں اپنے گھر کی دہلیز پر ہی مل جاتے"۔

اس کی طرف سے جواب نہ پاکر جوہری نے اس کو جھنجوڑ کر اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا ــ وہ ایک بے جان پتھر کی طرح لڑھک گیا۔ جوہری اس کی نبض کو خاموش پاکر گھبرایا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اور پہلا کام جو اس نے کیا وہ یہ تھا کہ اپنی مٹھی میں دبے ہوئے پتھر کو گندی نالی میں پھینک دیا۔

■■

یہ شعاع محکم، مکمل یہ فیض ہے استوار
اس کی تابش ہے تری ہستی کا الماس مبین
خود کو کر سکتا ہے تو اس وقت زندوں میں شمار
زندگی کیا، اپنی منزل پر پہنچ جانے کا نام
مرد مومن کے لئے منزل نہیں وصل صفات

حیّ و قایم اس کا منبع اس کا مبدا کردگار
خود منوّر مثل قادر، ہو کے رہتا ہے نگیں
اور پائندہ مثال نور ذات کردگار
ذات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا جینا تمام
مصطفےٰ راضی ہوئے جب تو وہی اللہ کی ذات

(باقی آئندہ)

غزل

سکندر عرفان

اس قدر اشک بداماں کبھی پہلے تو نہ تھی
زندگی اتنی پریشاں کبھی پہلے تو نہ تھی

ہے جو موہوم سی امید تجھے پانے .... کی
وہ مرے درد کا درماں کبھی پہلے تو نہ تھی

لوگ جلتے ہوئے گھر دیکھ کے یوں کہنے لگے
یہ زمیں محوِ چراغاں کبھی پہلے تو نہ تھی

شب کی تنہائی میں رہ رہ کے خیال آتا ہے
زندگی مجھ سے گریزاں کبھی پہلے تو نہ تھی

جانے کیا حسنِ تجلی نے کیا ہے جادو!!
چشمِ بینا میری لرزاں کبھی پہلے تو نہ تھی

جانے کس بات پہ مائل بہ کرم ہے اتنی
مہرباں گردشِ دوراں کبھی پہلے تو نہ تھی

وہ گزار دلِ آشفتہ میں عرفان کہیں
شمعِ الفت کی فروزاں کبھی پہلے تو نہ تھی

عربی کا سبق

ضمیر متصل منصوب و مجرور

ضمیر Pronoun وہ اسم معرفہ ہے جو کسی اسم (NOUN) کے بجائے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور متکلم مخاطب یا غائب کو بتاتا ہے۔
عربی میں ضمیر کی دو قسمیں ہیں۔
۱۔ ضمیر منفصل ۲۔ ضمیر متصل
ضمیر منفصل ایسی ضمیر ہے جو کسی کلمہ سے مل کر نہ آئے بلکہ علٰحدہ استعمال کی جائے۔
ضمیر منفصل اگر فاعل یا مبتدا کی حیثیت سے استعمال ہو تو اسے "ضمیر منفصل مرفوع" کہتے ہیں۔ کیونکہ مبتدا یا فاعل حالت رفعی میں ہوتا ہے۔ مثلاً
هُوَ صَالِحٌ (وہ نیک ہے) اَنتُم مُسَافِرُونَ (تم سب مسافر ہو)
"ضمیر منفصل اگر مفعول کی حیثیت سے استعمال ہو تو اسے "ضمیر منفصل منصوب" کہتے ہیں۔ یہ عموماً فعل سے پہلے آتا ہے اور اس میں تخصیص کے معنیٰ پیدا کرتا ہے مثلاً
اِیَّایَ کَلَّمَ الاُستَاذُ (مجھ ہی سے استاد نے بات کی)
ضمیر اگر مستقل کلمہ کی طرح استعمال نہ ہو۔ بلکہ کسی دوسرے کلمہ کے ساتھ مل کر استعمال ہو تو اسے "ضمیر متصل منصوب" یا "ضمیر متصل مجرور" کہتے ہیں۔
ضمیر متصل اگر فعل کے ساتھ ملاکر مفعول کی حیثیت سے استعمال کیا جائے تو "ضمیر متصل منصوب" کہلائیگا۔ جیسے نَحمَدُهُ (ہم اس خدا کی تعریف کرتے ہیں)
ضمیر متصل اگر اسم یا حرف کے ساتھ مل کر مضاف الیہ یا مجرور کی حیثیت سے استعمال ہو تو اسے "ضمیر متصل مجرور" کہتے ہیں جیسے بیتِی (میرا گھر)
ضمائر متصلہ و منفصلہ میں بعض لفظ [illegible]

معنوں میں فرق ہوتا ہے۔ کیونکہ ضمائر منفصلہ حالت رفعی میں ہوتی ہیں۔ اور ضمائر متصلہ حالتِ نصبی اور حالتِ جری ہیں۔ مثلاً "ھُم" دونوں قسم کی ضمائر میں اور تینوں حالتوں میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً

ھُمْ کِبَارٌ = وہ بڑے ہیں (ضمیر منفصل مرفوع۔ بطور فاعل)
رَاَیْتُھُمْ = میں نے ان کو دیکھا (ضمیر متصل منصوب۔ فعل کے ساتھ بطور مفعول)
کُتُبُھُمْ = ان کی کتابیں (ضمیر متصل مجرور۔ اسم کے ساتھ بطور مضاف الیہ)

گردانِ ضمائر متصل منصوب و مجرور

		واحد	تثنیہ	جمع
غائب	مذکر	هُ	هُمَا	هُمْ
	مونث	هَا	"	هُنَّ
حاضر	مذکر	كَ	كُمَا	كُمْ
	مونث	كِ	"	كُنَّ
متکلم	مذکر	ى ، نِى	نَا	نَا
	مونث	"	"	"

۱۔ ضمیر متصل منصوب میں فعل کے بعد متکلم واحد مذکر و مونث میں "ی" سے پہلے ن مکسورہ بڑھا کر "نِی" لگاتے ہیں۔ جیسے ضَرَبَنِیْ (اس نے مجھے مارا)

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہٖ — ہم اس (خدا) کی تعریف کرتے ہیں اور اس کے پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں
ھُنَّ یُعَلِّمْنَ اَوْلَادَھُنَّ — وہ عورتیں اپنے بچوں کو تعلیم دیتی ہیں۔
اِفْتَحْ بَابَ بَیْتِکَ — تو اپنے گھر کا دروازہ کھول۔
دَعَوْتُکُمَا اِلَی الْخَیْرِ — میں نے تم دونوں کو بھلائی کی طرف بلایا۔
ھَلْ تُحِبُّنِیْ فِی اللّٰہِ — کیا تو مجھ سے اللہ کے لئے محبت کرتا ہے۔
اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ — اے اللہ میری اور میرے ماں باپ کی مغفرت فرما۔
خَلَقَنَا اللّٰہُ مِنْ تُرَابٍ — اللہ تعالیٰ نے ہم کو مٹی سے پیدا کیا۔
لَنَا اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ — ہمارے لئے ہمارے عمل ہیں اور تمہارے لئے تمہارے عمل۔
[illegible] — تم (عورتو!) اپنی زینت کو ظاہر نہ کرو

سکندر توفیق

ترجمانی جاوید نامہ

(مولانائے روم کی روح سر کوہسار نمودار ہوتی ہے)

روح رومی بڑھ کے کر دیتی ہے پردہ چاک چاک چہرہ شاداں، آنکھ روشن، فرق پاک
طلعت رخشندہ، مثل مہر تاباں، پر شکوہ اس کی پیری میں شباب عزم و ہمت تازہ رو
پیکر رومی سے نور سرمدی تھا آشکار اور سرور سرمدی کی وہ بہار پر بہار
اس کے لب تھے گویا مصروف نوا ساز وجود حرف موزوں پارہ تھا جیسے خود راز وجود
آئینہ الفاظ سارے گرد لاعلمی سے پاک اور سوز اندروں کرتا تھا جن کو تابناک
عرض کی میں نے میاں کچھ کیجئے راز وجود اس کی تشریح کے سلسلہ واضح کوئی خط عمود
لفظ "ناموجود" کا مفہوم ہو کیوں کر بیاں اس حقیقت کو کریں ہم کس طرح آخر میاں؟
کونسی شئے کے لئے "محمود" کا اطلاق ہو کیا ہے "نامحمود" اس کا فیصلہ ایزد ہو

عارف رومی نے میرے سن لئے سارے سوال پھر کہا "محمود چاہتا ہے نمود حسب حال
آشکارائی تقاضا، آشکارائی حصول اس شجر کی شاخ پر کھلتا ہے تنہا ایک پھول
زندگی کچھ ہے تو بس خود کو اَنَا دینے کا نام اور اَنَا کو اپنی منوانے کا سارا اہتمام
انجمن روز الست آراستہ ہو کر رہی اور اَنَا حق کی شہادت خواستہ ہو کر رہی

منزل سہ گونا رکھتا ہے وجود با صفات یا ہے زندہ، یا ہے مردہ، جاں لب ہے ورنہ کو ذات
ہے شہادت جن کی حق تین ہیں ایسے گواہ فیصلہ دو ٹوک کرتا ہے تو ان سے واہ واہ!

شاہد اول ہے آگاہی خود اپنی ذات سے دیکھنا اپنے کو اپنے نور کے ذرات سے
شاہد دوم، شعور غیر میں کیسا ہے تو؟ دیکھ لے اپنے کو ان کے نور کے ذرے سے تو
شاہد ثالث، شعور ذات حق ہے برملا دیکھنا اپنے کو نور اللہ سے لیکر ضیا

محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاؔ

غزل

اجیالوں کا چولا پہنے ہر سُو اندھیرے پھرتے ہیں
مکر کے پتلے کوچہ کوچہ شام سویرے پھرتے ہیں

اپنے اپنے مال متاع کی آپ حفاظت کرتے رہو
قدم قدم پر سینے تانے چور لٹیرے پھرتے ہیں

چپکے چپکے ڈس کر فوراً آنکھ سے ہوتے ہیں اوجھل
انسانوں کے روپ میں ایسے سانپ سپیرے پھرتے ہیں

اہلِ نظر کو آخر کب تک دھوکے دیتے جائیں گے
کالے منہ پر ڈالے ہوئے جو پردے سنہرے پھرتے ہیں

بات تو جب ہے برس برس کر دھرتی کو سیراب کریں
افق افق پر یوں تو کتنے ابر گھنیرے پھرتے ہیں

کس کو اپنا دوست کہیں اور کس کو دشمن، لوگ یہاں
چہروں پر سو چہرے سجا کے مارتے پھیرے پھرتے ہیں

قدرِ ہنر کی آس لگائے منشاؔ کتنے ہی فن کار
ایوانِ ایوان، محفل محفل۔ ڈیرے ڈیرے پھرتے ہیں

[illegible]

جگن ناتھ آزاد

غزل

اپنے دل کی بات اے آزاد کیا تجھ سے کہوں
یہ عجب دل ہے جو پیغمبر بھی ہے کافر بھی ہے

قائلِ توحید بھی، جاں دادۂ اصنام بھی
ساجدِ حق بھی، بتانِ دیر کا چاکر بھی ہے

علم و فن کا یوں تو ٹھاٹھیں مارتا دریا ہے یہ
غور سے لیکن جو دیکھا جہل کا دفتر بھی ہے

کار فرما ہے تجلّی ظلمتوں کے ساتھ ساتھ
نور کا پیکر بھی ہے انبارِ خاکستر بھی ہے

شاخِ گل بھی ہے، تبر بھی، صلح بھی، پیکار بھی
پھول بھی ہے دھول بھی کنکر بھی ہے گوہر بھی ہے

راز کچھ کھلتا نہیں مجھ پر بڑی مشکل میں ہوں
یہ عجب دل ہے کہ برگِ گل بھی ہے پتھر بھی ہے

غزلیں

اسدؔ کھنڈوی

نہ صبح دم نہ کبھی شام گھر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے ہر دم سفر میں رہتا ہے
جو خاک چھانتا پھرتا تھا ریگ زاروں کی
یہی وہ شخص ہے اب اپنے گھر میں رہتا ہے
بہت حسین تھا جو چھوڑ کر گیا روتا
وہ آج تک بھی مری چشم تر میں رہتا ہے
جو کانٹا بن کے کھٹکتا تھا سب کی آنکھوں میں
وہ پھول بن کے ہماری نظر میں رہتا ہے
نکلتا ہے جو کبھی شہر میں اک آن کے ساتھ
پھٹے لباس میں وہ اپنے گھر میں رہتا ہے

جو جانتے نہیں مجھ کو یہ پوچھتے ہیں اسدؔ
یہ دل گرفتہ بھلا کس نگر میں رہتا ہے

●

اسد اللہ خاں اسدؔ۔ پردیسی پورہ۔ کھنڈوہ۔ ام۔ پی

محمد حسن شرارؔ

نگاہوں نے تیری وہ دھوکا دیا ہے
زمانے کو ہنسنے کا موقعہ دیا ہے
چھلکتا نہ ہرگز یہ جام محبت
نگاہِ غلط نے جو بہکا دیا ہے
مرا رازِ دل کیوں کسی پر عیاں ہو
زمانے کے صدموں نے چونکا دیا ہے
نگاہوں کو اپنی اجل سے ملا کر
محبت تجھے میں نے دھوکا دیا ہے
تری اک نگاہِ محبت کی خاطر
دوانہ مجھے سب نے ٹھہرا دیا ہے
جہاں میں قدم ڈگمگائے جہاں بھی
تمہیں نے تو بڑھ کر سہارا دیا ہے
شرارؔ ان سے پوچھوں تو کس منہ سے پوچھوں
وفاؤں کے بدلے میں یہ کیا دیا ہے

●

10-1-589 سیف آباد۔ حیدرآباد 4 اے پی

حرفِ آخر

شاداب کا شمارہ (۷) مجھے قدرے تاخیر سے ملا۔ اور "احسان دانش" کے متعلق خطوط بعض احباب کی طرف سے پہلے مل گئے تھے۔ اس مقالے میں کہیں کہیں کچھ اغلاط رہ گئی ہیں۔ مثلاً "لو وقت ہمارا آپہنچا" کی جگہ" اور وقت ہمارا آپہنچا" چھپا ہے۔ "احسان اس زمانے میں فرنگ میں رہتے تھے" کسی جگہ چھپ گیا ہے "احسان اس زمانے میں ترنگ میں رہتے تھے"۔ فرنگ لاہور کے ایک محلہ کا نام ہے۔ بلکہ ایک بہت بڑی کالونی ہے۔ "ترنگ" سے تو قاری یہ سمجھے گا کہ شاعر شراب یا بھنگ کے نشے میں رہتے تھے۔ لیکن یہ کاتب کے لئے نیا لفظ تھا۔ بہر طور مقالہ بڑی حد تک اغلاط سے پاک ہے۔

شروع کے شماروں میں تو کاغذ آپ بہت دبیز لگاتے تھے۔ غالباً اس صورت میں خرچ زیادہ آتا ہوگا۔ آج کل اردو کے رسائل اپنے وسائل کے اندر رہیں تو اچھا ہے۔ مقصد تو یہ ہے کہ رسالہ معیاری ہو۔ اور اچھا چھپا ہوا ہو۔ اور یہ دونوں خوبیاں "شاداب" میں موجود ہیں۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد

[شاداب کی سخت کوشش ہوتی ہے کہ کتابت کی صحت قائم رہے۔ مگر پرنٹرز ڈیول نے اپنا رنگ دکھایا۔ اور فرنگ" کو "ترنگ" بنا کر بڑی تشویشناک صورتحال پیدا کر دی۔ گو آپ نے "کاتب کے لئے نیا لفظ" لکھ کر رعایت ملحوظ رکھی۔ مگر ادارہ شاداب اس سہو نظر پر نادم ہے۔]

✱ آپ کے ماہنامہ "شاداب" کی شادابی کا تعارف میرے ایک دوست رضوان نقوی صاحب نے یوں کرایا ؎

میری گھروالی کے آنگن میں نہ جھانکے کوئی

دور تک روتے ہوئے بچے دکھائی دیں گے

بس کیا تھا میں نے پانچ روپیہ قربان کر دئے۔ اور اکتوبر ۸۴ء کا

شمارہ نمبر ۱۱ میرے ہاتھ میں آگیا۔ گھرا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ کوئی غلطی نہیں کی واقعی شاداب لایا ہوں۔ آپ نے علمی ادبی، دینی وسماجی اقدار کی نمائندگی کا دعویٰ کیا ہے جو بہت حد تک تو نہیں ہاں! کچھ حد تک صحیح ہے۔ ان تمام موضوعات ومسائل کو یکجا کرنا واقعی کمال ہے اور اس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ تنقیدی مضامین کی کمی کا احساس ہو رہا ہے۔ امید ہے اسے پوری کرکے شاداب کی شادابی کو بڑھاتے ہوئے ادبی رسالوں میں منزل کمال سے آشنا کریں گے۔
دست بہ دعا ہوں کہ "شاداب" کی شادابی گھر گھر پہنچے۔ آمین

وجیب الرحمٰن (مظفر پور)

* ماہنامہ "شاداب" — کی لال پری' لال جوڑے میں ملبوس ہے۔ جو گل رنگین سے عکسِ رنگین بکھیر رہی ہے۔ جو ہر سو (دور تک ہی نہیں) منظرِ شاداب کی جھلک نظر آرہی ہے۔ یہ شعر جو 'شاداب' کے سرورق آپ نے پیش کیا ہے۔ پتہ نہیں کن کا ہے؟ اس میں داخلیت کا وہی رچاؤ ہے۔ جو دہلی اسکول کا طرۂ امتیاز ہے۔ شعر کے آخر میں شاعر کا تخلص بھی ضرور شائع کریں۔ یہ میرا ایک اپنا ذاتی مشورہ ہے۔

اس دفعہ رسالہ کی ضخامت کم ہی سہی۔ لیکن جو بھی معیاری تخلیقات شامل پرچہ ہیں سبھی انتہائی مقصدی اور عصری لب ولہجہ سے مزین اور تاثر انگیز ہیں۔ بیگم عائشہ رباب کی غزل از حد یاس و درد سے لبریز ہے۔ اردو کے شاعروں میں میر اور فانی دونوں غم پسند اور غم پسند شاعر ہیں۔ ہاں بیگم عائشہ رباب کی غزل میں قنوطیت انتہا زیادہ ہے۔ ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خاں منشاء کی منظر کشی مناظر کے اعتبار سے اعلیٰ شاعری کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان کے اشعار گنگا جمنی امتزاج کی بڑی حسین اور دلکش تصویر پیش کرتے ہیں۔ مثلاً یہ چند شعر —

یہ جھرنوں کا سرگم پرندوں کی تانیں	یہ خوش رنگ چہرے یہ معصوم جانیں
ہے ارزاں یہاں جلوۂ حسنِ فطرت	ہر اک گوشہ اس کا ہے صد رشکِ جنت
اسی پیارے خطے پہ نازاں ہے دھرتی	یہی ہے حقیقت میں فردوسِ ارضی

چہ خوب!

بیان کی سادگی، لہجہ کا تصنع، سلسل بیان، خالص ہندوستانی زبان۔ ان تمام چیزوں نے ملک غازی کا بالکل نیا اور اچھوتا نمونہ پیش کیا ہے۔ منشا کے ذہن رسا کو داد ملنی چاہیے۔ میر لائق علی صاحب کا بیباک تبصرہ کرشن چندر کا مقبول ناول شکست پر ادبی بصیرت کا آئینہ دار ہے ناقد کا مطمح نظر اپنی انفرادیت لئے ہوئے ہے۔!

میری غزل آپکو پسند آئی۔ اس کی اشاعت کے لئے اور خاص کر اہم مدیرانہ فریضہ کی ادائیگی کے لئے مزید شکریہ!

جبار غمنی راجپوری (رسیار)

* پچھلے دو مہینے کے وقفہ کے بعد اکتوبر کا شمارہ ملا۔ شکریہ۔ اداریہ ٹھیک ہی ہے لیکن آپ نے اس میں لکھا ہے کہ اردو اکیڈیمی کی گرانٹ حکومت نے بند کردی ہے۔ نہیں بلکہ ڈھائی ڈھائی لاکھ روپے کی دو قسطوں میں اکیڈیمی کو وصول ہو چکی ہے۔ پیام انسانیت مضمون خوب ہے۔ "خطرہ مول لینا پڑا ہے" میں انہوں نے ظالم کے ظلم پر جب بھی رہنا چاہیے کہا ہے تو پھر سدباب ذریعہ نہیں بتایا ہے صرف ڈرایا ہے۔ البدر واقعات انداز نگارش لندن سے اتنی بلیغ اردو کا لکھا جانا باعث صد آفریں ہے اور یہ مضمون بھاری ہے۔ بیک نظر پرچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہاراشٹرا کا ہے صرف حیدرآباد سے چھپ کر نکلتا ہے میں کیرالا اور اہل کیرالا کے بارے میں کچھ نگارشات شاداب کے لئے بھیجتا رہونگا پچھلے دنوں یونیورسٹی میسور کی کل ہند اردو کانفرنس' ملاپورم میں ہوئی تھی۔ اسکی رپورٹ بھیجتا ہوں جو زیر ترتیب ہے علاوہ ازیں ایک رباعی روانہ کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ پسند آئیگی اور شاداب میں جگہ پائے گی۔ میں نومبر کے پہلے ہفتہ حیدرآباد آرہا ہوں پچھلے دنوں میں بوجہ کرفیو دورہ حیدرآباد کے موقع پر آپ سے ملاقات نہ کر سکا لیکن پچھلے مہینے مسلسل کرفیو میں ایک ہفتہ حیدرآباد میں پھنسا رہا جو شعر کرفیو ہوئے ملاحظہ ہوں (۱) کرفیو کے شب و روز یہاں یوں بسر ہوئے

قاتل کے انتظار میں آنکھوں لہو ہوئے

(۲) کرفیو کی صبح و شام کی کچھ انتہا بھی ہے؟ اس مرض کی دوا کی کوئی اک دوا بھی ہے؟

رباعی۔ اے مسلم کربلا دھوتی نہ تو اوپر چیز دھا

دیکھو تو خدا سے سوا، مو کچھو نہ اپنی بڑھا

ہاں نہ اس کا برا کہتا ہوں میں برملا

لے کے عمر ہڑتال کا مت کام سے تو بھی چرا۔

پیام انسانیت میں مولانا نے "خطرہ مول لینا پڑتا ہے" میں صرف ڈرایا نہیں ہے۔ بلکہ موجودہ صورتحال کو بیان کر کے بھلے شریف آدمیوں کو اکسایا ہے اور ترغیب دی ہے کہ اپنی اپنی

شاداب علمی معمہ نمبر ۲

اشارے (آڑے) ۱۔ دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا (۷)

۲۔ بات تو جب ہے برس برس کر دھرتی کو سیراب کریں = افق افق پر لہراتے کتنے ...... گھنیرے چھپر ہیں (۴)

۳۔ وہ صدقہ تربیت کا تھا کہ مکتب کی کرامت تھی = سکھایا ہے کس نے ...... کو آداب فرزندی

۵۔ ۱۸۵۷ء کی .... آزادی ہند کی ناکامی نے کچھ عرصہ کیلئے اہل ہند کے قوائے عمل کو مفلوج کر کے رکھ دیا (۵)

۷۔ مکہ کا ایک معزز قبیلہ جس میں رسول اکرم ؐ نے جنم لیا تھا (۴)

۱۰۔ ...... میں جامۂ تن میں گیا پھول = وہ اقرار و قسم دل سے گیا بھول (۴)

۱۲۔ ایک مشہور عرب سیاح جس نے کئی سال ہندوستان میں قیام کر کے سنسکرت کے علمی خزانوں کو عربی میں منتقل کیا (۸)

۱۳۔ یہ داغ داغ ...... یہ شب گزیدہ سحر = وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں (۵)

۱۴۔ گورے کی ضد (۴) ۱۸۔ ...... پربت ہندو عقیدہ کے مطابق شیو جی کا استھان ہے (۵)

۱۹۔ آیات قرانی کی تشریح کرنے والوں کو .... کہا جاتا ہے (۵) ۲۰۔ جنت کی ایک نہر (۶)

اشارے (کھڑے) ۱۔ کہتے ہیں کہ مثنوی ...... وہ معافی نامہ ہے جو غالب نے کلکتہ میں اپنی پنشن کی کارروائی پر آنچ آنے کے ڈر سے ارادت مندانِ قتیل کی خدمت میں پیش کیا تھا (۸)

۴۔ ہم اپنے ایک دل بے خطا کے ساتھ آئیں = تم اپنے .... دار و رسن کے ساتھ آؤ (۴)

۶۔ کرشچیف کے زمانہ سے اسٹالن گراڈ کا نام بدل کر ...... رکھا گیا ہے (۹)

۷۔ ..... مرداں جان دارد (۳)

۸۔ چندر گپت موریا کا وزیر با تدبیر جسے عہد قدیم کا میکاولی بھی کہا جاتا ہے (۶)

۹۔ گھبرائی کہیں کدھر گیا گل ...... کہ کون دے گیا جل (۷)

۱۱۔ ...... ہے کہ ہو گے کہ مدعی کا ہم سفر غالب وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے (۵)

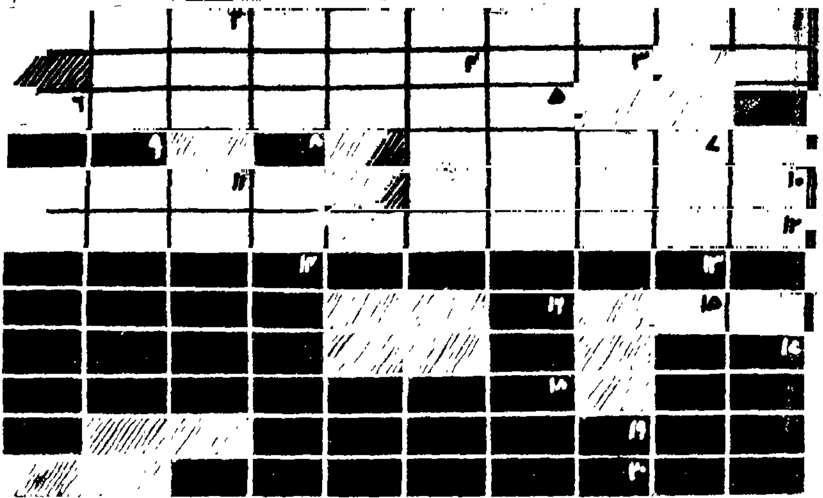
۱۵۔ یاد ہے کہ ہم گرم خون والوں کی آمد سے پہلے دنیا مور قسم کے انگنت ٹھنڈے خون والے جانوروں کی ایک پوری نسل تبدیلی موسم کا شکار ہو کر صفحہ ہستی سے .... ہو چکی ہے (۵)

۱۶۔ ایک پیغمبر جن کے بارے میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان میں مبعوث ہوئے

۱۷۔ دلی نازاں تھی خالص اردو پر وہ بھی لیکن نہ رہ سکی .... (۴)

۱۹۔ .... خام کو جس نے کندن بنایا کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا (۴)

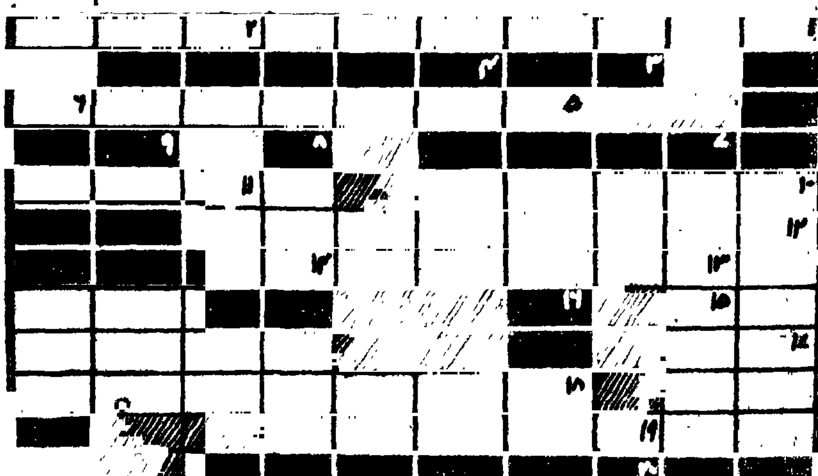
خاکہ شاداب علمی معمہ نمبر ۲



میں اقرار کرتا ہوں کہ اس معمہ کے تعلق سے شاداب کا ہر فیصلہ مجھے منظور ہے

نام .... پتہ ....

خاکہ شاداب علمی معمہ نمبر ۲



میں اقرار کرتا ہوں کہ اس [illegible] شاداب کا ہر فیصلہ مجھے منظور ہوگا

نام .... پتہ ....

کو صاف کرنے کی مشین بنائی ہے۔

اور صحت مند گردہ حاصل کر کے اس کو پیوند کرنے کی تکنیک بھی دریافت کی ہے۔

اگر پتھری، چھوٹی کنکری کی جسامت کی ہو تو اس کو سوئی سے توڑ کر پیشاب کی راہ خارج کر دیا جاتا ہے۔ یونانی اور ایورویدک طریقہ علاج میں ایسی ادویات معلوم ہیں جو چند اقسام کی پتھریوں کو توڑ کر خارج کر سکتی ہیں جیسے میگنیشیم، امونیا اور فاسفیٹ کی پتھریاں۔

اگر پتھری خوب بڑھ کر پورے گردے پر چھا جاتی ہے تو پھر گردہ کو نکالنا ضروری ہوتا ہے ورنہ اس کے پھٹ پڑنے کا اندیشہ ہو جاتا ہے۔

ڈیالی سس کے مسائل

۱۹۶۰ء میں یونیورسٹی آف واشنگٹن کے ڈاکٹر بلڈنگ۔ ایچ۔ اسکر بنر نے گردہ کی جگہ پر کام کرنے والی مشین ایجاد کی۔ ۱۹۴۰ء میں ہالینڈ میں مصنوعی گردہ بنایا گیا تھا لیکن اس کو صرف سرجری کے دوران عارضی طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اسکر بنر کی مشین کو ڈیالی سس کی مشین کہا جاتا ہے۔ اس مشین کو کسی الگ سے جوڑ کر بار بار استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ڈیالی سس مہنگا عمل ہے۔ لیکن ایک کم خرچ اور کم ٹیکنیکل طریقہ بھی ہے جس کو [illegible] TONEAL DIALYSIS کہتے ہیں۔ اس میں غذا کی پابندی نہیں ہوتی جیسی کہ ڈیالی سس میں ہوتی ہے۔ کہ نمک اور پانی کم استعمال کریں تاکہ مشین پر بار کم پڑے۔ اس میں ڈاکٹر یا نگہداشتی کی ضرورت بھی نہیں ہوتی اس میں ایک پلاسٹک کی تھیلی کو دھڑ کے اندرونی حصہ سے جوڑ دیا جاتا ہے جس میں ایک محلول ہوتا ہے۔ جو جسم میں داخل ہوتا جاتا ہے پھر چار تا چھ گھنٹوں میں اس کو واپس تھیلی میں حاصل کر کے بدل دیا جاتا ہے۔ یہ عمل روز چار بار کم از کم کرنا پڑتا ہے۔

گردہ کی پیوند کاری

لیکن یہ عمل مستقل نہیں ہیں اور مسائل سے خالی نہیں ہیں۔ چونکہ مردہ گردہ پھر بھی جسم میں موجود ہوتا ہے اس لئے بہتر طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ مردہ گردہ نکال کر صحت مند گردہ ہی پیوند کر دیا جائے۔

اس طریقہ میں اس وقت چند مسائل ہیں پہلا مسئلہ گردہ کا عطیہ دینے والوں کی کمی ہے۔ گو ایک گردہ دان کرنے کے بعد، ایک گردہ، دو گردوں کا کام فوراً انجام دے لیتا ہے لیکن بہر حال ایک طرح کی معذوری ہو جاتی ہے۔ چونکہ ایک گردہ اگر بیمار ہو جائے تو دوسرا گردہ کام کرتا ہے اور ایک ہی گردہ ہو تو مسائل پیدا ہونا فطری بات ہے۔

کہنا غلط ہے۔ حتیٰ کہ حیدرآباد سے دس برس پہلے اعلان کیا کہ دو سو برس کے حاکم آج غلام ہیں۔ واپس مگر محمد مشرقی کو تحریر دیکھی تو انہیں لکھا کہ خاکسار تحریک کے بنیادی اصولوں سے کامل اتفاق کے باوجود مجھے آپ کی قیادت پر قطعاً اعتماد نہیں تھا۔ مسلم لیگ کے چیدہ عہدیداروں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ اسلامی ملت نا مسلمان کے قائل ہیں جیسے دعوئے اسلام ہو۔ پاکستان کے تعلق سے کہا کہ پاکستان بننا اتنا مشکل نہیں جتنا پاکستان کو پاکستان بنانا مشکل ہوگا۔

بہادر یار جنگ ملت اسلامیہ کے مفاد کی خاطر ساری دنیا سے اختلاف کر سکتے تھے لیکن شخصی طور پر کسی کے دشمن نہیں تھے۔ عبدالرحمان رئیس "وقت" کے بموجب سر مرزا اکبر علی خاں سے جو ایک دیدار والے قوم پرست ہے۔ شخصی دوستی تھی لیکن مسلک کا اختلاف تھا۔ بعض صاحبین نے مشورہ دیا کہ سر مرزا صاحب سے نہ ملیں۔ نواب صاحب فرماتے۔ قومی معاملات میں اختلافات کا جہاں تک تعلق ہے میں بھی اتنا ہی سخت ہوں جتنا کہ تم ہو۔ لیکن میں ایک دوست کے گھر چائے پیتا ہوں تو کیا کیا ہے۔ جب کوئی مسائل میں اختلاف آتا تو فرماتے وہ ہمارا دوست ہے لیکن میں یہاں دوستی ان سے نہیں کرسکتا۔

سروجنی نائیڈو کو "ماں" کہہ کر پکارا۔ جب ڈاکٹر لطیف سعید نے ان سے کہا کہ آپ نے اپنی خدمت کے دائرے کو صرف ایک گوشے تک کیوں محدود کر دیا ہے۔ آگے بڑھیے ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے قائد بنیے۔ اس پر نواب صاحب نے کہا "ابھی مسلمان پیچھے ہیں ان کو تھوڑا اور منظم کر لوں تو پھر ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے کام کروں گا۔

بہادر یار جنگ کی تقاریر شاہکار تھیں۔ جنہوں نے ان تقاریر کو سنا ہے وہی ان کی عظیم خطابت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ افسوس کہ تمام تقاریر کو محفوظ نہ کیا جا سکا۔ مختار مسعود نے اپنی فکر انگیز کتاب "آواز دوست" میں لکھا ہے کہ بہادر یار جنگ کی صرف دو چار تقاریر محفوظ ہیں۔ لیکن جناب نذیر الدین احمد جنہوں نے آثار بہادر یار جنگ پر قابل قدر کام کیا ہے اور سید احمد قادری کی کوششوں سے ان کی (۵۰) تقاریر کے اہم اقتباسات محفوظ ہو چکے ہیں۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے